



پٹھان مورچہ

پٹھان

تصنیف

سر اولف کیرو

ترجمہ

سید محبوب علی

مقدمہ

مولانا عبدالقادر

پشتو اکیڈمی۔ یونیورسٹی آف پشاور

سلسله مطبوعات پشتو اکیڈیمی نمبر ۳۲

پہلی بار ——————— جولائی ۱۹٦۷ء

تعداد ——————— ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

قیمت مجلد ——————— ۳۵۰۰ روپے

به اهتمام خیال بخاری

خیبر میل پریس پشاور میں چھپا

انتساب

محمد ایوب خان

صدر پاکستان

کے نام

جو خود ترین قبیلے سے ہیں اور جنہوں نے اپنے قول و عمل کے ذریعہ یہ سعی کی ہے کہ پٹھان پاکستان کی وسیع تر سرزمین میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں حالات جس کے متقاضی ہیں اور تاریخ جس کا انہیں حقدار گردانتی ہے -

اولف کیرو

فہرس

حصہ اول

نسلی ابتداء

۵۵۰ ق م — ۱۰۰۰ عیسوی (۳۹۱ ھجری)

حصہ دویم

مسلمانوں کا درمیانی دور

۱۰۰۰ء — ۱۷۰۷ء

(۳۹۱ھ — ۱۱۱۹ھ)

حصہ سویم

درانی اور سکھ

۱۷۰۷ء — ۱۸۴۹ء

(۱۱۱۹ھ — ۱۲۲۶ھ)

حصہ چہارم

انگریزوں کا عہد اور بعد کے واقعات

۱۸۳٦ء — ۱۹۵۷ء

(۱۲٦۳ھ — ۱۳۷۷ھ)

ضمیمے

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ۔ امابعد

سر اولف کیرو کی مشہور و معروف کتاب ''دی پٹھانز،، پشتونوں کی تاریخ پر ایک نہایت اہم اور تازہ دستاویز کی حیثیت رکھی ہے ۔ جو دنیا کے اکثر و پیشتر ملکوں کے علماء فضلاء اور تاریخ و سیاست کے طالب علموں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے ۔ سر اولف کیرو غیر منقسم ہندوستان میں حصول آزادی اور نقل اقتدار سے کچھ ہی مدت قبل سابق شمال مغربی سرحدی صوبہ کے انگریز گورنر تھے اور انہوں نے انڈین سول سروس کے ایک عہدیدار کی حیثیت سے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بھی اسی سرحد اور قبائلی علاقوں میں گزارا تھا ۔ سر اولف کیرو حکومت برطانیہ کے ایک بہت ہی قابل اعتماد نمائندہ تھے ۔ جو اپنی حکومت کے استحکام کیلئے کم و بیش تیس برس تک اس علاقے میں خدمات انجام دیتے رہے ۔ پشتونوں کے علاقے میں رہنے اور پشتونوں کے ساتھ اس طویل تعلق کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ پشتون اور انگریز کی اس روایتی دشمنی یا کشمکش کے باوصف ، جو ایک آزادی پسند مغلوب قوم کے افراد اور حکومت کے درمیان جاری رہتی ہے ۔ سر اولف ان گنے چنے چند انگریز افسروں میں ایک مشہور یا نامور انگریز ہیں ۔ جو پشتون قوم کے ساتھ حقیقی محبت اور سچی لگن رکھتے تھے ، ناظرین کو شاید علم ہوگا کہ سرحدی علاقوں پر فرنگی اقتدار و غلبہ تقریباً ۱۸۴۸ء سے شروع ہوا تھا ۔ لیکن اس وقت سے لیکر پاکستان کے قیام تک بمشکل چند سال ہی ایسے مل سکیں گے جن میں برطانوی حکمران پشتون قبائل کے کسی نہ کسی علاقے میں برسر پیکار نہ رہے ہوں ۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ غیر ملکی حکومت ہمہ وقت یہاں کے آزادی پسند عوام کی گردن میں حلقۂ غلامی ڈالنے اور اسے سخت تر کرنے میں لگی

رھتی ، لیکن اس علاقے کے غیور و سرفروش عوام نے اپنی آزادی و خود مختاری کو قائم و برقرار رکھنے کی خاطر اپنے سر و مال کی قربانی دینے سے کبھی درنگ و دریغ نہیں کیا - یہی وجہ تھی کہ انگریز کی حکومت کو اس قرب و جوار میں امن و چین سے حکومت چلانا نصیب نہ ھوا - کبھی تیراہ پر لام بندی ھوتی تو کبھی مہمند علاقے پر حملہ بولا جاتا - کبھی وزیرستان پر چڑھائی ھوتی تو کبھی دوسرے قبائل کے ساتھ پنجہ آزمائی ھوتی - غرضیکہ انگریزوں کی حکمت عملی گو ایک حد تک مؤثر اور کامیاب رھی ، لیکن پشتونخوا کو پوری طرح زیر کرنے اور یہاں کے قبائل کو مطیع بنانے یا اُن پر اپنی مرضی سے حکومت چلانے میں کبھی کامیاب نہ ھوئے - آزادی کی تحریک اور حصول اقتدار کی جنگ کے سلسلے میں سرحد کے پشتونوں نے جو زبردست قربانیاں دی تھیں - حاکمِ وقت انگریز کا اس سے ناک میں دم آگیا تھا - اسی جنگ آزادی اور سیاسی کشمکش کے دوران سر اولف کیرو ھی پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے - ظاھر ھے کہ ایسے وقت میں حاکم قوم کے ایک افسر اعلیٰ اور جنگ آزادی کے متوالوں کے درمیان کیا کیا کچھ نہ ھوا ھوگا - ایک عرصہ تک میرا یہ خیال تھا اور شاید میں ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی تھا کہ سر اولف اور پشتونوں کے درمیان اگر کوئی تعلق ھوسکتا ھے ، تو وہ محبت کا نہ ھوگا ! لیکن سر اولف نے جب حکومت ھند کی وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کا منصب سنبھالا اور بعد میں وہ سابق صوبہ سرحد کے گورنر بنائے گئے ، تو دونوں حیثیتوں میں اس علاقے کے عوام کی فلاح و بہبود کیلئے جو مخلصانہ کوششیں کیں اُنہوں نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا -

بے جا نہ ھوگا اگر اس موقع پر مرحوم نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم کا ایک مقولہ دھرا دوں - صاحبزادہ صاحب لندن کی گول میز کانفرنس سے لوٹ کر آئے تو ۱۹۳۱ء میں صوبہ سرحد کی طرف سے اُن کو واحد وزیر مقرر کیا گیا - یہ پہلا قدم تھا جو اصلاحات کے ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ء کے تحت اُٹھایا گیا تھا اور جس کے ذریعے انگریز نے اس علاقے کے عوام کو کچھ تھوڑے سے اختیارات دے دئے تھے - اُن ھی دنوں سر اولف کچھ سرکاری کاغذات لیکر نواب صاحب مرحوم کے گھر پہنچے ، صاحبزادہ صاحب نے پشتو میں ”ستڑے مشے،، یعنی خوش آمدید کہا اور پھر دونوں اُٹھکر دفتر کے اندر

جا بیٹھے، کام شروع ہوا ۔ عصر کے وقت میں بھی چائے نوشی کے موقع پر حاضر ہوا ۔ نواب صاحب نے مجھ سے فرمایا ۔ ''کیرو صاحب کو جانتے ہو؟ ان کو پشتو سے بڑی محبت ہے'' ۔ میں نے کچھ بے دلی سے کیرو کیطرف دیکھا۔ کیرو نے نواب صاحب کو مخاطب کرکے کہا : ''نواب صاحب! مجھے نوجوان پشتونوں کی یہی ادا بھاتی ہے کہ یہ مجھے پسند نہیں کرتے''! سر اولف نے یہ بات نہایت صاف اور رواں پشتو میں کہی ۔ خیر ان کے رخصت ہونے کے بعد صاحبزادہ صاحب مرحوم و مغفور نے فرمایا ۔ ''کیرو نے جو کچھ کہا ، سچ کہا ۔ اس شخص کے دل میں پشتونوں کیلئے بڑی محبت ہے ۔ یہ سر جارج روس کیپل اور سر جارج کننگھم اور چند دوسرے انگریزوں کیطرح پشتون اخلاق کے بڑے مداح ہیں ۔ لیکن ٹھہرو ، تمہارے کسی اعتراض سے پہلے میں تمہیں یہ بتادوں کہ ''اپنی قوم سے کم''! تم نوجوانوں کو بھی لازم ہے کہ اگر کبھی ایسا موقع آئے کہ تمہاری قوم کی فلاح و بہبود کا سوال پیش نظر ہو تو اسی جذبۂ اخلاص اور مردانگی سے اپنی قوم کی خدمت کرو، جس جذبہ سے روس کیپل، کیرو اور کننگھم باوجود پشتون سے طبعی لگاؤ اور محبت کے اپنی قوم کی خدمت کرتے ہیں ۔ فرنگیوں کو میری بہت سی باتیں نا پسند ہوتی ہیں ۔ لیکن جب پشتون قوم کی فلاح و بہبود کی بات آتی ہے تو وہ میری بات کو کان دھر کر سنتے اور خلوص سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مانتے بھی ہیں ۔ اپنے لئے تو میں کچھ مانگتا نہیں لیکن اپنی قوم کیلئے میری باتیں وہ نہایت خندہ پیشانی سے سنتے ہیں ۔ کیرو کی اصل قدر و قیمت کو مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی جانتا ہوگا ۔ کیونکہ میں اس کی مخالفت کرتا رہتا ہوں اور وہ میری مخالفت کرتا ہے ۔ لیکن ہم دونوں خوب سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کرتا ہے اور میں ہر بات میں اپنی قوم کی فلاح ڈھونڈھتا ہوں'' ۔

سر اولف کی ''دی پٹھانز'' کی اشاعت کے بعد کون ایسا ہوگا جس کو اس امر کے ماننے میں ذرا بھی تأمل ہو کہ سر اولف کیرو واقعی پشتون قوم کے ساتھ گہری محبت اور اس علاقے کے لوگوں کیلئے پُرخلوص جذبات رکھتا ہے انتقال اقتدار کے بعد جونہی اس کی اپنی قوم اور پشتون ملت کے درمیان دشمنی یا سیاسی کشمکش کا دور ختم ہوا ، اس نے اس قوم سے اپنی محبت اور لگاؤ کا اظہار اس کتاب کی صورت میں کر دیا اور اپنے زمانۂ اقتدار کے دوران اونچ نیچ کی تلافی کافی حد تک کر دی ۔ پشتون

بلاشبہ تاریخ کے صفحات میں ایک ارفع مقام کا حامل ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم کے نمائندہ کے قلم سے ایک ایسے محققانہ اور عالمانہ تاریخی پس منظر کا منظر عام پر آنا، جس کے ساتھ اُس قوم کا ہمیشہ معرکہ و پیکار کا بازار گرم رہا ہو، دراصل حقیقی لگاؤ کی بیّن علامت ہے۔ تیس برس تک اس خار زار میں کنجکاوی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ پشتون قوم کی تاریخ، زبان اور اصل نسل مؤرخین اور محققین کیلئے ابھی تک بحث و تمحیص کا موضوع بنا ہوا ہے۔ لیکن سر اولف کی کتاب ''دی پٹھانز،، اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب حرفِ آخر نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کتاب میں سر اولف کے اخذ کئے ہوئے نتیجوں اور منطقی دلائل کے ساتھ فراہم کردہ معلومات اور استنباط سے دوسرے محققین کو کوئی اختلاف نہ ہو، لیکن علمی میدان میں اس قسم کے اعتراضات اور اختلافات ہمیشہ علمی تحقیق و تدقیق کے اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات جو سر اولف کی اُس دور کی پالیسیوں کے مخالفین میں شمار ہوتے تھے، اب یہ اعتراف کرنے لگے ہیں کہ سر اولف نے بڑی اچھی اور محققانہ کتاب لکھی ہے۔ پس لازم ہے کہ ہم اپنی شاندار قومی روایات کے مطابق وسیع القلبی سے کام لیکر دورِ محکومی میں انگریز حاکموں کی زیادتیوں اور سختیوں کو دل سے نکال ڈالیں اور یہ تسلیم کرلیں کہ سر اولف نے اپنے طویل قیام کے سبب، پشتونوں کے ساتھ مؤدت و موانست کا اظہار جس انداز سے کیا ہے، ہم اُن کے بیان کو تسلیم کر لیں اور اُن کی اس کاوش کا خلوص دل سے شکریہ ادا کریں۔

پشتو اکیڈیمی کی طرف سے ''دی پٹھانز،، کا اردو میں ترجمہ کیا جانا، اگرچہ اس بات میں بظاہر کچھ زیادہ موزونیت نظر نہیں آتی، لیکن بڑے غور و خوض اور صلاح و مشورے کے بعد اکیڈیمی نے یہی فیصلہ کیا کہ سر اولف کیرو کی اس تاریخی دستاویز کو پہلے اردو کا جامہ پہنایا جائے یا صاف لفظوں میں یہ کیوں نہ کہوں کہ ہمارا مدعا ملک میں ایسے علم و ادب کا پھیلانا ہے، جس کے ذریعے پاکستان کے مختلف علاقوں کے باشندے بالخصوص اور دیگر ممالک کے بالعموم ہمارے اصلی و حقیقی حالات اور ہماری تاریخ، تہذیب، رسوم و روایات سے آگاہ ہوں۔ ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھ سکیں اور زیادہ سے زیادہ سمجھیں پہچانیں تاکہ آپس میں اُنس و مواخات بڑھے اور قرب ہی نہیں، کامل یکجہتی پیدا

ھو اور یک‌دل و یک‌زبان ھوجائیں ۔ اس لئے کیوں نہ اس کتاب کو جو پشتونوں سے متعلق ھے، زیادہ لوگوں تک پہنچائی جائے ۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ھوگا کہ اپنے وطن میں ایک علمی اور تحقیقی دستاویز تعلیم یافتہ اردو دان طبقے تک پہنچ جائیگی اور اس طرح بہت حد تک وہ لایعنی، بے بنیاد اور لغو قصے جو اس قوم کے سر تھوپے گئے ھیں یا وہ بے سروپا نظرئے جو اس قوم سے منسوب کئے گئے ھیں دھل جائیں گے اور پشتون کی اصلی شباھت و مشادہ کے خد و خال اور نقوش ابھر آئیں گے اور اس کا اصلی عکس اجاگر ھو کر سامنے آجائیگا ۔

''دی پٹھانز،، کی انگریزی عبارت اتنی عالمانہ اور مطالب کی ادائیگی کچھ ایسی مشکل اور پیچیدہ ھے کہ انگریزی‌دان نوجوانوں کی بھاری اکثریت اس کی زبان اور انداز بیان کے کماحقہ سمجھنے سے قاصر رھتی ھے اور اکثر اوقات ھم سے یہ تقاضا کیا جاتا رھا ھے کہ اس کا ترجمہ پشتو یا اردو میں کیا جائے ۔ یہ بھی حقیقت ھے کہ اس قسم کا تقاضا کرنے والوں میں اردو پڑھنے اور سمجھنے والے زیادہ تھے ۔ ھم نے کچھ تو اس بات کو ملحوظ رکھا کہ اگر ترجمہ اردو میں ھو تو اس سے پاکستان میں دور دور تک استفادہ ھو سکےگا اور کچھ اس خیال سے بھی کہ اتنی ضخیم کتاب کے ترجمے اور اس کی چھپائی پر اتنا خرچ آئیگا کہ اگر یہ نہ بکی تو نقصان ھوگا اور پشتو اکیڈیمی کا مختصر سا ادارہ ابھی خسارے کا متحمل نہیں ھو سکتا ۔ پس ان تمام وجوھات کی بناء پر قرار پایا کہ پہلے اردو ترجمہ شائع کر دیا جائے ۔ پھر اگر ضرورت محسوس ھوئی اور پشتو کے شائقین حضرات نے تقاضا کیا، تو اس کا پشتو ترجمہ بھی شائع کر دیا جائیگا ۔

ھماری ایک دیرینہ آرزو یہ بھی ھے کہ اس خطے کی تاریخ اور دیگر روایات وغیرہ جہاں کہیں اور جس زبان میں بھی ھوں جمع کر کے شائع کر دی جائیں ۔ تاکہ جو لوگ مستند حالات اور تاریخی معلومات سے محروم ھیں ۔ اُن تک صحیح اور مستند مواد پہنچ جائے ۔ اکثر یہی دیکھا گیا ھے کہ موجودہ دور کی ترقی یافتہ اقوام اپنی تاریخ و ثقافت کے سلسلے میں دنیا کی مختلف زبانوں میں کتابیں لکھتی اور شائع کرتی رھتی ھیں ۔ لیکن ھمارا ادارہ مختصر اور اس کے وسائل محدود ھیں ۔ اگر اپنی ملی زبان میں ایسی دستاویز تمام ملتِ پاکستان کے سامنے پیش کر سکیں ۔ تو امید

ہے کہ ہماری اس کوشش کو پڑھنے والے نہ صرف سراہیں گے بلکہ اس کی قدر بھی کریں گے -

اس سلسلے میں جب ہم نے کتاب کے مصنف سے رابطہ قائم کر کے صلاح و مشورہ کیا - تو انہوں نے بھی یہی پسند کیا کہ اردو ترجمے کے فوائد ہمہ گیر ہوں گے- دوسرے یہ کہ پشتونوں کی اکثریت اتنی اردو ضرور جانتی ہے کہ وہ میری کتاب کے مطالب کو اپنا سکے- کتاب کے اردو ترجمے کا ایک فائدہ یہ بھی ہمارے مدِ نظر تھا کہ بہت سارے لوگ جو اصلاً پشتون ہیں اور جن کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں پشتونخوا کو چھوڑ چھوڑ دوسرے ممالک خصوصاً ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے ہیں اور پھر وہیں رہ بس گئے - ایسے حضرات جب یہ تاریخ پڑھیں گے تو ممکن ہے کہ ان کے گھروں میں کچھ اسی موضوع کی علمی دستاویزیں اور نادر قلمی ذخیرے موجود ہوں یا کچھ پرانی روایات ہوں ، تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور ان روایات کو منصّۂ شہود پر لاکر دوبارہ زندگی بخشیں گے -

سر اولف کیرو کی اس کاوش اور ضخیم دستاویز کے متعلق کچھ باتیں تو کہنے کی ہیں - بعض کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی معلوم ہوتا ہے اور کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں ہم پڑھنے والوں کی اپنی فہم و فراست پر چھوڑتے ہیں کیونکہ اتنے طویل عریض دور کے تاریخی میدان کو عبور کرتے وقت لازماً راستے میں کچھ نشیب و فراز اور پیچ و خم بھی آئے ہوں گے - جو اہل نظر سے چھپے نہیں رہ سکے ہوں گے - ہمارے مؤرخین کو بعض باتوں سے اختلاف ہے اور بعض توضیحات اور نتائج جو مصنف کے کے قلم سے نکلے ہیں ان کیلئے قطعاً قابل قبول نہیں - کچھ دوسرے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مصنف کی نظر اور احاطۂ علم سے بہت سی اہم باتیں رہ گئی ہیں - ہم اپنی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے مصنف نے اختصار کی خاطر بعض امور سے قصداً صرفِ نظر کیا ہو - یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف کی رسائی عربی اور فارسی ماخذوں تک اس آسانی سے نہ ہوئی ہو جس آسانی اور اعتماد کے ساتھ وہ انگریزی ، یونانی یا فرانسیسی وغیرہ ماخذ سے استفادہ کر سکے ہوں گے - بلکہ یونانی ماخذ کے ترجموں میں فاضل ڈاکٹر بیور کی وساطت سے مصنف نے استفادہ کیا ہے -

اس لئے اگر سر اولف کیرو کے استدلال میں کہیں کمی یا کمزوری نظر آئے یا ان کے منطقی نتائج قابلِ قبول نہ ہوں تو اُن کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہیے - بلکہ مصنف کی کسی رائے یا نتیجے کے ساتھ اختلاف یا اعتراض کو علمی تحقیق و تجسس کے ایسے انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہیے کہ پوشیدہ حقائق بھی آشکارا ہوجائیں اور فاضل محقق کی حوصلہ شکنی بھی نہ ہو -

میں نہ تو تاریخ نویس ہوں اور نہ ہی میں نے کبھی تاریخی مسائل و نتائج پر تنقید یا خوردہ گیری کی ہے - لیکن فاضل مصنف کی کتاب کے اردو ترجمے کی جانچ پرکھ اور اُس کی نوک پلک کی درستی کے موقع پر اکیڈیمی کے ایک ریسرچ سکالر محمد نواز طائر کے مطالعے کے دوران چند نکتے ایسے سامنے آئے کہ لازماً اُن پر اکیڈیمی کی طرف سے ایک گہری نگاہ ڈالی جاتی - اسی لئے ہم نے ان مسائل کو متن سے نکال کر اپنے قارئین کے سامنے علیحدہ پیش کرنا مناسب سمجھا - ہم اپنی طرف سے اُن پر نہ کوئی تنقید کرتے ہیں نہ ان سے کچھ مزید نتائج اخذ کرتے ہیں - ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ یا تو فاضل مصنف خود یا دوسرے محققین حضرات ان مسائل کی وضاحت کر دیں - اس طرح ایک عالمانہ اور محققانہ تصنیف کی افادیت میں مزید چار چاند لگ جائیں گے اور ہمارے ریسرچ سکالر کے شکوک و شبہات بھی رفع ہوجائیں گے -

فاضل مصنف نے اپنی کتاب ''دی پٹھانز'' کے نام کے سلسلے میں کچھ زیادہ توجہ سے کام نہیں لیا ہے - باوجود اس کے کہ انہوں نے اس سلسلے کا سر رشتہ دو ڈھائی ہزار برس پہلے سے لیا ہے - حال یہ کہ اُس وقت لفظ ''پٹھان'' اور ''افغان'' کا تصور بھی نہ تھا - اُس وقت اگر کوئی تصور موجود تھا یا کسی نام کا کوئی وجود ممکن تھا تو اُس کی ابتدائی شکل ''پکھت'' یا ''پکھتین'' تھی - جس نے بعد میں ''پشتون'' یا ''پختون'' کی صورت اختیار کی اس بناء پر ہزاروں برس کی پرانی قوم کو ایسے نام سے یاد کرنا، جس نام کو وضع ہوئے ابھی چند سو سال ہی ہوئے ہیں، کچھ موزوں و مناسب نہیں معلوم ہوتا - فاضل مصنف نے بڑی ریاضت، وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور انتہائی تحقیق و تدقیق کے بعد یہ کتاب لکھی ہے - لیکن لفظ پٹھان کے غلط العام استعمال نے اُنہیں مغالطے میں ڈالدیا یا غالباً

انگریزوں کی سیاسی پالیسی کے پیش نظر ڈیورنڈ لائن کے اس پار یعنی برطانوی ہند کی شمال مغربی سرحد پر بسنے والے پشتون انگریزوں کی اصطلاح میں پٹھان کہلاتے تھے اور اس حد بندی کے اُس پار حکومت افغانستان کے زیر سایہ رہنے والے پشتونوں کو افغان کہا جاتا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ پشتونوں نے اپنے لئے نہ تو پہلے کبھی لفظ پٹھان یا افغان استعمال کیا نہ ہی اب کرتے ہیں ۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے آر پار دونوں طرف پشتون قبائل بستے ہیں ۔ کہیں کہیں یوں بھی ہوا ہے کہ اس حد بندی نے ایک ہی قبیلے کو اس طرح منقسم کیا ہے کہ کہیں زیادہ حصہ اُدھر چلا گیا اور کم حصہ ادھر رہ گیا اور کہیں اس کے برعکس ۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی قبیلہ کے افراد حد بندی کے اُس پار تو افغان ہوگئے اور اس طرف کے پٹھان بن گئے ؟ ظاہر ہے کہ ناموں کا یہ گورکھ دھندا صرف حکومتوں کی سیاسی حکمت عملی یا تاریخی مجبوریوں کے سبب بنایا گیا ہے ۔ پس مناسب تھا کہ اس کتاب کو پٹھان یا افغان کی بجائے ''پشتون،، کے نام سے موسوم کیا جاتا ۔

میاں ضیاء الدین صاحب بارایٹ لاء نے بھی اپنے ایک مضمون میں فاضل مصنف کیرو کے لفظ پٹھان پر نکتہ چینی کی ہے ۔ انہوں نے مجلہ ''پښتو،، کے شمارہ اول جلد پنجم مطابق ۶۳ - ۱۹۶۲ء میں اپنے ایک مفصّل اور مدلّل مضمون میں ''پٹھان،، ، ''افغان،، اور ''پشتون،، ناموں کا تاریخی تجزیہ کیا ہے ۔ میاں صاحب لکھتے ہیں :

> جب پشتونوں کے علاقے سے لوگ سیر و سیاحت کی غرض سے یا سپاہیوں اور لشکریوں کی حیثیت سے ہندوستان جاتے تو ان میں اکثر وہیں آباد ہو جاتے ۔ ایک دو نسلوں کے بعد وہ اپنی زبان بھول جاتے اور مقامی زبانیں اپنا لیتے ۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اپنی نسل پر فخر کرتے اور کسی نہ کسی صورت سے اپنی پشتو زندہ رکھتے ، اس لئے ایک الگ طبقہ بن جاتے ، بلکہ ہندوستان کے رسم و رواج کے مطابق وہ ایک جدا ذات یا برادری کی صورت اختیار کر لیتے تھے ۔ وہ یہی پشتون تھے جو پٹھان کے نام سے مشہور ہوئے ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

ہر وہ شخص جس کا باپ دادا پشتون علاقے سے تعلق رکھتا ،
وہ پٹھان مشہور ہو جاتا اور اب تک یہی نام چلا آرہا ہے ۔
جس طریقہ سے یہ ''ذات،، وجود میں آئی ہے اس طرح تمام
پشتون پٹھان کہلاتے ہیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر پٹھان پشتون
نہیں ہوسکتا ، ہم نے یہ فرق نظر انداز کر دیا ہے ۔

یہی کچھ کیفیت لفظ افغان کی بھی ہے ، میاں صاحب لکھتے ہیں :

افغانستان میں آدھی آبادی پشتونوں کی ہے ۔ باقی آدھی آبادی
میں زیادہ لوگ فارسی اور اوزبکی زبان بولتے ہیں ۔ لیکن یہ لوگ
خود کو افغان کہتے ہوئے بھی پشتو نہیں بولتے اور بعینہ وہ
لوگ جن کی مادری زبان پشتو ہوتی ہے ۔ لیکن وہ دوسری
زبان بولتے ہیں سب ، افغان کہلاتے ہیں ۔

میاں صاحب آگے لکھتے ہیں : ''تمام پشتون جو افغانستان میں
رہتے ہیں افغان ہیں لیکن تمام افغان پشتون نہیں ہیں،، ۔

ہم نے میاں صاحب موصوف کے مضمون کا اقتباس یہاں اسلئے پیش کیا
کہ انہوں نے ''پٹھان،، ، ''پشتون،، اور ''افغان،، تینوں ناموں کی کیفیت
علیحدہ علیحدہ بالوضاحت بیان کی ہے ۔ لیکن اب ہمارے لئے یہ ایک مشکل
در پیش ہوگئی کہ جب فاضل مؤرخ کیرو کی کتاب کے نام کا اطلاق غلط ثابت
ہوا تو اس کے نتیجے میں برِ صغیر ہند و پاک کے تمام پشتون باشندے جو
وہاں صرف ''پٹھان،، کہلاتے ہیں بیچ میں سے نکل جاتے ہیں دوسری طرف
پٹھان کا لفظ آن کو احاطہ کرلیتا ہے تو یہاں کے پشتون اس احاطے سے باہر
رہ جاتے ہیں ۔ علیٰ ھذالقیاس لفظ افغان کا اطلاق بھی بہت حد تک افغانستان
کے باشندوں پر بحیثیت مجموعی تو ہوسکتا ہے لیکن پشتون پر خصوصی طور
سے نہیں ہوتا ۔ برِ صغیر پاک و ہند میں پٹھان کا غلط استعمال اتنا عام ہوگیا
ہے کہ آج کل بعض اچھے مانے ہوئے پشتون بھی اپنی نسلی نسبت کیلئے یہی
لفظ استعمال کرتے ہیں ۔ فوج میں پشتون سپاہیوں نے پٹھان لفظ کو عام
رواج دیا ۔ ہر پشتون جو انگریز کی فوج میں بھرتی ہوا ، وہ پٹھان ہی
کے نام سے بھرتی ہوا ۔ الگ رجمنٹیں پٹھان کے نام سے بنائی گئیں ۔ اسکا نتیجہ

یہ ہوا کہ تمام پشتون اپنے آپ کو پٹھان کہلوانے پر مجبور ہوگئے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اب وہ اس نام پر راضی بھی ہیں - یہ تو ظاہر ہے کہ انگریز اپنے زیر دست علاقے کے لوگوں کی نسبت، نہ تو ایک خاص قوم یا قبیلے سے کرتے اور نہ ہی ایک پڑوسی ملک کے لوگوں کے نام یعنی افغان سے اپنی رعایا کو منسوب کرنا پسند کرسکتے تھے - اس بناء پر نہ تو فقط پشتون یا پختون کو رواج دیا اور نہ ہی لفظ افغان کو، یہ بھی ممکن ہے کہ انگریز نے اپنے دورِ اقتدار میں ہندوستان میں آباد تمام اقوام کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا چاہا ہو - اس وجہ سے راجپوت، سکھ، پنجاب، بلوچ، گورکھا اور پٹھان رجمنٹوں کے نام سے جدا جدا پلٹنیں قائم کی ہوں - انگریز کی اس سیاسی حکمتِ عملی کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کی غیر ہندو آبادی بھی ہندوؤں کی طرح جدا جدا ذاتوں میں بٹ گئی - ہندی میں یہ گوت کہلاتی ہے - مسلمانانِ ہند نے بھی اس اثر کے تحت اپنی برادریاں بنا ڈالیں - آج بھی اگر دیکھا جائے تو برادریاں اسی انداز سے قائم چلی آرہی ہیں - حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے - ذات پات کے قائل ہندوؤں کی طرح ان کا طرزِ عمل بھی ویسا ہی ہو چلا ہے - ہندوستان میں آباد پشتون جو آہستہ آہستہ زبان بھولتے گئے اور آباؤ اجداد کی زمین سے ان کا رشتہ کمزور ہوتا گیا، بالاخر ایک مضبوط اور مفتخر برادری میں ڈھل گئے - آج ان کی برتری بھی اسی برادری کی بدولت ہے، چاہے وہ اپنے آباؤ اجداد سے کتنے ہی دور جا پڑے ہوں - پھر بھی انہوں نے اپنی سابقہ روایات اور قومی خصوصیات کو ہندوؤں کی سرزمین پر زندہ و برقرار رکھا اور دوسرے فرقوں کے اختلاط کی اثر پذیری کے باوجود ان کے ہر کس و ناکس میں جس کا اس علاقے کے ساتھ کچھ بھی نسلی تعلق تھا - بلاتمیز افغان، پشتون یا پٹھان اپنے نام کے ساتھ ''خان'' کا لفظ اتنی سختی سے چسپاں کیا کہ اپنے نام کا ایک جزو لازم بنا لیا - اس طرح اس نے اپنے آپ کو دوسرے طبقوں میں محو و مدغم ہونے سے بچایا، دوسرے انہوں نے اپنی صلاحیت اور احساس برتری کو بھی زندہ و قائم رکھا - ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں خان کا خطاب کسی بڑے پشتون قبیلے کے ایسے بڑے، بوڑھے یا سربراہ کیلئے مخصوص تھا - جس کو متفقہ طور پر اس قبیلے کے سارے افراد اپنا بڑا یا پیشوا مانتے تھے - ایک طرف تو قبیلہ ایسے شخص کو خان مانتا تھا - دوسری طرف خود وہ شخص حیا چشمی اور جذبہ اخوت و مساوات کے زیر اثر نہ تو خود کو خان کہتا تھا اور نہ ہی خان کہلوانے میں کوئی

غیر معمولی برتری محسوس کرتا تھا ۔ خان کی تعریف خوشحال خان نے یوں کی ہے ؎

چہ گټل، خوړل، بخښل کا ځوان هغه
چہ توره لری د تورے خان هغه

جو کمائے، کھلائے اور بخشے جوان وہی ہے
جس کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہو خان وہی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ ذات پات اور برادری کے عقائد و روایات نے جو ہندوستانیوں کا خاصہ ہے، پشتونوں یا افغانوں کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ خان کا اضافہ کریں ۔ جیسے سکھ اپنے نام کے ساتھ سنگھ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں ۔ اس علاقے کا ہر شخص بلا تخصیص حسب نسب، پیشہ ور ہو یا خانوادہ، دھقان ہو کہ زمیندار اس لفظ کے غلط استعمال کی وجہ سے پاک و ہند میں خان کہلاتا ہے ۔ پشتون علاقوں سے تلاش روزگار کے سلسلے میں گئے ہوئے ہر کس و ناکس کو ''خانصاحب'' کے خطاب سے نوازا جاتا ہے ۔ حقیقت میں یہ اس قوم کی تذلیل ہے کیونکہ اگر ایک ایسے شخص کو جس کی اصالت کا کوئی ثبوت نہ ہو ایسے نام سے یاد کیا جائے، جو ایک قبیلے کے سردار کا خطاب ہو تو وہ لازماً اپنی حیثیت بھول جاتا ہے ۔ بڑائی اور سرداری کی روایات تو اس کو ورثے میں نہیں ملی ہوتیں، نہ ہی اس کے خون و خمیر میں خانی کی روایت اور اخلاق رچے بسے ہوتے ہیں ۔ تو قدرتی طور پر اس کی بات چیت سے، اس کے رویے اور عادات و اطوار سے وہ کچھ ظاہر ہوتا ہے ۔ جس کو وہ خود تو برا نہیں سمجھتا لیکن ایک حقیقی پشتون، خان، بلکہ تمام پشتون یا پٹھان قوم کی روایات پر بدنما دھبہ بن جاتا ہے ۔ جس سے ساری قوم کی تذلیل ہوتی ہے ۔

میری بات کا کوئی بُرا نہ مانے، میرا مدعا خدا نخواستہ کسی کی توہین کرنا نہیں ہے ۔ بحیثیت ایک مسلمان کے میں تمام مسلمانوں کو اپنا کلمہ گو بھائی سمجھتا ہوں لیکن ایک غلط بے بنیاد اور قوم کی توہین و تذلیل کا پہلو جس کیفیت سے ظاہر ہو، اس کے متعلق صاف بات کہہ دینا ہر منصف مفکر کا فرض اولین ہونا چاہیے ۔ اسی بناء پر میں یہ فرض سر انجام دے رہا ہوں ۔

جہاں مذہب اور انسانیت کا سوال ہو، وہاں ایک مسلمان کا عقیدہ واضح ہے - قرآن کریم نے اس کیفیت کو وضاحت سے بیان کیا ہے - ''یا یھا النـاس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ'' سے مراد تخلیق آدم کی نسلی یگانگت ہے - لیکن وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا میں وجود شعب و قبیلہ تسلیم کیا گیا ہے اور لفظ تعارفوا میں وہ مدعا بھی مذکور ہے جو آیتہ کریمہ کا مقصود ہے - ''آپس کی جان پہچان'' میں الگ الگ قبیلے کی حیثیت اور کیفیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے - میری یہ معروضات اسی لفظ تعارفوا کی تفسیر ہے - ورنہ کرامت انسانی کا معیار تو تقویٰ ہے - جو بنی نوع انسان کہ تمام مختلف الانواع اقوام اور قبائل وغیرہ سب کو حاوی ہے - اس میں رنگ، نسل، منصب اور دولت کے کوائف کا لحاظ رکھا گیا ہے -

چنانچہ پیش نظر کتاب کا نام پڑھتے ہی فوراً یہ خیال ذہن میں آجاتا ہے کہ پٹھان قوم کی اس تاریخی دستاویز میں اس قوم کی اُن نوآبادیوں اور وہاں کے عوام کی مفصّل تاریخ درج ہوگی - جو یہاں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جاکر آباد ہونے کی وجہ سے پشتون تو نہیں رہے، لیکن پشتونوں کی ہندوستانی نسل ''پٹھان'' کے نام سے برِ صغیر کے بنگال، حیدر آباد دکن، روہیلکھنڈ، سندھ، جالندھر، قصور، رامپور اور ٹونک وغیرہ میں پھیل گئے تھے -

پٹھان لفظ میں نہ تو پشتون پوری طرح سما سکتا ہے اور نہ ہی افغان - پھر بھی اس لفظ کی حقیقی تعریف جن پر صادق آتی ہے، سر اولف کیرو نے اُن لوگوں کا ذکر اتنے اختصار سے کیا ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ نام ''پٹھان'' رکھا اور ذکر کیا بیشتر پشتونوں یا افغانوں کا - یعنی صرف دو فصلوں نہم اور دہم میں ہندوستان کے پشتون بادشاہوں اور ان کے خاندانوں کا مختصر سا ذکر کیا ہے - لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ محمود غزنوی اور غلجی و سوری خاندانوں کا ذکر بھی دراصل پشتونوں کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اُس وقت لفظ پٹھان کا تصور بھی نہ تھا - ایک بات جو مجھے بار بار کھٹکتی ہے، یہ ہے کہ اگرچہ پشتون خاندانوں نے ہند میں باری باری سلطنتیں قائم کیں - مگر ہر خاندان سے عموماً دوسری یا تیسری پشت میں سلطنت چھنتی چلی گئی - اس کی کوئی بنیادی وجہ

ضرور ہونی چاہیے - میرے ناقص خیال میں جس پشتون سردار نے جب بھی ملک فتح کیا وہ پشتونوں کی جمہوری فطرت اور ذہنیت کا بذاتِ خود ایک اچھا نمونہ ہوتا ، وہ اگر بادشاہ بھی بن جاتا تب بھی ایک قبیلے یا اپنی قوم کے سربراہ یا سردار ہی کی حیثیت برقرار رکھتا ، جبکہ پشتون قوم کی سرداری بالکل عوام کی پسند پر مبنی ہوتی ہے اور اس کی حکومت جرگے، یعنی پنچایت کی حکومت ہوتی ہے - لیکن جب اسی خاندان کی دوسری پشت کو اقتدار منتقل ہوتا تو جمہوری قدروں کی یہ کیفیت اتنی بدل جاتی کہ جمہوریت کی بجائے اس سے بادشاہت کی بو باس آنے لگتی اور جب بات تیسری پشت تک پہنچتی تو پشتونولی کا بندھن اتنا کمزور ہوچکا ہوتا کہ جمہوریت پسند پشتون عوام بادشاہ کو خود ہی بیچ میں سے آڑا دیتے - غوری بادشاہوں سے لیکر لودھیوں کے وقت تک پورے ہندوستان میں پشتون خاندانوں کی بادشاہت کی یہی کیفیت رہی ہے - یہ کیفیت صرف برِ صغیر ہی میں نہیں تھی ، دیکھا جائے تو میر ویس ، احمد شاہ ابدالی ، امیر عبدالرحمان اور ہر پشتون خاندان پر یہی کیفیت گذری ہے کہ ایک قبیلے کو جب اچھا قابل اور بہادر سردار ملا تو زیادہ سے زیادہ تیسری پشت تک اقتدار اس کے ہاتھ میں رہا اور پھر دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہوتا چلا گیا - اگر شاذ و نادر کہیں اس کے خلاف ہوا بھی تو زوال پذیر اور غیر مؤثر -

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پہلا سردار تو قبیلے کا مسلم اور بڑا سردار ہوتا - وہ روہ کے علاقے سے اپنے قبیلے کے جوانمرد ساتھیوں کو لیکر ہندوستان پر یورش کرتا اور وہاں اپنی حکومت قائم کر دیتا - لیکن دوسری پشت کا تعلق پشتونخوا کے ساتھ ظاہر ہے کہ بہت کم ہوتا اور جتنا جتنا یہ پدری رشتہ کمزور ہوتا ، اُن کی حکومت بھی کمزور پڑتی اور بالفرض دوسری پشت میں کچھ خاصیتیں رہ بھی جاتیں تو تیسری میں بالکل سرد پڑ جاتیں - کیونکہ تیسرے درجے میں خون کا وہ اثر برائے نام رہ جاتا اور وہ ایسا رشتہ نہیں ہوتا جس پر پشتون اپنے سر کی بازی لگاتا ہے - تیسری پشت کا پشتون مشر ، بادشاہ بن جاتا - مگر وہ مشر نہ رہتا اور پشتون اپنی فطری خاصیت کی بناء پر آسانی سے اپنے عزیز یا بھائی کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کرتا - کوئی اور بادشاہ ہوجائے تو اُس کو بہ امرِ مجبوری برداشت کر بھی لیتا ہے - کیونکہ وہ اُس کا ”تربور“ تھوڑے ہی

ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ہندوستانی پشتون بادشاہ ہردلعزیزی کے اس رتبے کو نہ پہنچ پاتا کہ تمام پشتون اُس کے سامنے سر جھکا دیتے اور نہ خود اُس میں وہ شجاعت و دلاوری باقی رہتی جو اُس کے باپ دادا کی کامیابی کی ضامن تھی۔ جائے پیدائش کی تبدیلی کے ساتھ اُس کا ماحول، اُس کی تہذیب، اُس کا پہناوا اور اُس کا عمل بھی بدل جاتا، روہ کے پشتونوں کے دلوں پر حکومت کرنا اُس کے بس کی بات نہ رہتی، اس لئے تیسری پشت میں حکومت کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ سے چھن جاتی، وہ صحیح پشتون کو اپنے اعتماد میں نہ لے سکتا۔ کیونکہ اُن کی نظروں میں اُس کی وہ وقعت نہ ہوتی جو اُس کے باپ دادا کی ہوا کرتی تھی۔ پشتون من حیث القوم، اپنی قوم کے ایسے بادشاہ کو قطعاً پسند نہیں کرتے، جو شاہی آداب و خصائل قدیم ایرانی تکلف پسند بادشاہوں جیسے رکھے۔ یعنی اپنے اصلی وطن کے ساتھ سوائے خون کے پرانے رشتے کے اور کوئی تعلق نہ رکھے اور زبان و دیگر ملی روایات وغیرہ کو پسِ پشت ڈال دے۔

سیاسی اور ملکی تحولات سے سبق سیکھنا کچھ آسان کام نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی سبق لے تو بلاشبہہ اس کا فائدہ بہت ہوتا ہے۔ انگریزوں نے برِ صغیر پاک و ہند پر کم و بیش دو صدیوں تک حکومت کی ہے۔ ان دو صدیوں میں ایک معمولی سے افسر سے لیکر گورنر اور وائسرائے تک کسی انگریز نے کبھی اپنے وطن، یعنی انگلستان، نیز اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ تعلق میں خفیف سا فرق بھی نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے اس سر زمین پر مستحکم حکومت بنا کر مدتوں اُس کو چلایا۔ لیکن اس سر زمین کی سابقہ تاریخی اور سیاسی روایات کو نہیں اپنایا اور نہ ہی اُس کا کوئی اثر قبول کیا۔ ورنہ ہندوستان کی مٹی نے ہزاروں سال سے بیشمار خاندانوں اور شاہی گھرانوں کو ہڑپ کیا ہے۔ انگریز اپنے طویل عرصے کے قیام اور حکومت چلانے کے باوجود انگریز ہی رہا اور جس وقت وہ سمجھ گیا کہ اس ملک کے رہنے والوں میں سیاسی سوجھ بوجھ آگئی ہے اور آج ہے یا کل یہ وطن یہاں کے رہنے والوں کا ہونے والا ہے، جلد یا بہ دیر اس کو بہ یک بینی و دوگوش جانا پڑے گا۔ تو اُس نے اس کا ایسا حل نکالا کہ خود تو صحیح سالم نکل گیا مگر یہاں والوں کیلئے اپنی زبان اور تہذیب کا ایک ایسا بُتِ کافر چھوڑ گیا کہ آج تک اس سرزمین پر اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو انگریزوں کا چھوڑا

ہوا تعلیمی ، لسانی اور تہذیبی اثر آج بہ نسبت اُس دور کے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے ۔ جبکہ وہ اس سر زمین پر حکومت کرتے تھے ۔ یہ سبق میرے خیال میں انگریز قوم نے پشتونوں اور مغلوں کے انجام کو دیکھکر حاصل کیا تھا ۔ بلا شک و شبہہ کوئی بھی حکومت چاہے کیسا ھی نظامِ تمدن کیوں نہ رکھتی ہو، اُسے دوام حاصل نہیں ہوتا ، لیکن ایک محقق جب یہ سب کچھ دیکھتا ہے تو انگریز قوم کی سیاست کی تعریف و ستائش کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

ہندوستان کے پٹھانوں کے آباؤ اجداد اپنے وقت میں بلاشبہہ پشتون تھے ۔ لیکن وہ ھند کی سر زمین پر رہ بس گئے اور اُن کی اولاد کا اپنے آبائی وطن سے ناتا اور تعلق صرف تاریخی حد تک باقی رہ گیا تو اُنہوں نے پٹھان نام بھی اپنے اُوپر چپکا لیا ۔ لیکن قدرت کا اصول ہے کہ جو قوم اپنی اصلیت کو اور خاص طور پر اپنی زبان کو پسِ پشت ڈال دے ۔ وہ قوم اپنی ملی روایات ، تہذیبی اور تمدنی عنعنات کو تا دیر زندہ و برقرار نہیں رکھسکتی ۔

زبان ، تہذیب اور تمدن کو زندہ رکھنے کی مثالیں بکثرت موجود ھیں ۔ امریکہ ، کینیڈا ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں مختلف یورپی اقوام بس گئی تھیں ۔ لیکن ان میں صرف انگریز ھی تھے، جنہوں نے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے رکھا ۔ اگرچہ امریکہ کی زمین پر پرورش یافتہ عوام نے اپنے اجداد کے وطن کی سیاسی گرفت سے آزاد ھونے کیلئے بڑی بڑی لڑائیاں بھی لڑیں ۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود امریکہ اور انگلستان آج بھی ایک دوسرے کیلئے پرائے نہیں ۔ کل جب ان کے آباؤ اجداد کے وطن پر جنگ کے بادل چھا گئے تھے تو انگلستانیوں کا بسایا ھوا وھی امریکہ خم ٹھونک کر انگلستان کے دشمن جرمن کے مقابلہ پر آ کھڑا ھوا تھا اور دونوں علمگیر لڑائیوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا ۔ عرب بہ حیثیت قوم کے جہاں کہیں بھی آباد ھوئے اُن کی زبان نے مقبوضہ علاقوں کے عوام میں نفوذ کیا ، جس کا نتیجہ تبدیلئی مذھب یا قبول اسلام ھوتا ۔ اس کے مقابلے میں مغل بھی ھندوستان آئے ، سینکڑوں برس حکومت کی ۔ لیکن وہ اپنی روایات ، زبان ، تہذیب اور تمدن یکسر بھول گئے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اقتدار چھن جانے کے بعد برِ صغیر پاک و ھند میں بحیثیت مغول ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رھا ۔ پشتو کی ایک مشہور

ضرب المثل ہے ”د پښتو کانړے په اوبو کښې نه ورستیږی“۔ مطلب یہ کہ پشتون کی ”پشتو“ یعنی پشتوں کا مکمل نظامِ حیات اور ضابطۂ اخلاق و تہذیب بھی جس میں شرم، غیرت و حمیت، ننگ و ناموس، شجاعت و دلیری یا اخلاق و کردار کے تمام دوسرے پہلو شامل ہوتے ہیں، پتھر کیطرح سخت ہوتا ہے جو پانی میں پڑے پڑے نہ کبھی گلتا ہے نہ گھلتا ہے۔ وہ پشتون جو ہندوستان جاکر پٹھان کہلائے۔ جن کے ہاتھ میں حکومت بھی نہیں رہی تھی۔ مگر انکی رگ حمیت میں پشتون خون جوش مارتا رہا اور چاہے کوئی کچھ ہی کہے اب بھی ہندوستان کا پٹھان فخر و مباہات کے موقع پر بے ساختہ کہہ آٹھتا ہے۔ ”کیا میں پٹھان نہیں! یا مجھ میں پٹھان کا خون نہیں!“ اس میں شک نہیں کہ اقتدار کے چھن جانے کے بعد قوم قعر مذلت میں گر پڑتی ہے۔ زبان اور روایات مسخ ہو جاتی ہیں، مگر فطرت کا بدلنا مشکل ہے۔ اگر ہندوستان کے پشتون اپنی زبان اور دوسری روایات کو بھی محفوظ رکھتے تو یقیناً مسلمانانِ ہند کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ فاضل کیرو نے برطانوی سیاست کی خاص پالیسی کے تحت پشتون کو ایسے انداز سے دکھایا کہ وہی انگریزوں کا پسند کیا ہوا نام اور تعریف تو یاد رہ جائے اور وہ قوم جس کی تاریخ لکھی گئی ہے، پوری طرح آجاگر نہ ہو۔ خیر اب لازم ہے کہ ہم اس سلسلے میں صفائی اور دیانتداری سے یہ بتا دیں کہ لفظ پٹھان، افغان اور پشتون کو ایک سمجھنا یا پشتون کے لئے پٹھان اور افغان کا نام استعمال کرنا سہو ہی نہیں بلکہ ایک بڑی غلطی ہے۔ یقین ہے کہ ناظرین اب اس سے مغالطہ میں نہیں پڑیں گے۔

یہ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے پٹھان بھائیوں کو حالات نے ایک سازگار موقع فراہم کر دیا تھا۔ جس سے وہ خاطر خواہ استفادہ کرسکتے تھے لیکن آنہوں نے ایسا نہ کیا۔ تاریخ کے اوراق میں غالباً اپنی قسم کی یہ پہلی مثال تھی کہ کسی قوم کے افراد کو صدیوں بعد اپنے آبائی وطن کو لوٹنے کا نادر موقع ہاتھ لگا ہو۔ کاش! ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے والے پٹھان جو پاکستان کے دوسرے حصوں میں آباد ہوئے ہیں، پشتونخوا میں آکر رہائش اختیار کرتے۔ اس مٹی میں یقیناً اب بھی اتنا کچھ باقی ہے کہ وہ مہاجر پٹھانوں کو پشتون بنا لیتی۔ میں نے متعدد بار اپنے چند ہندوستانی پٹھان بھائیوں سے اس سلسلہ میں گفتگو کی ہے۔ متأسفانہ، پشتونوں کے اس خطہ کو گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے انگریزوں کے ایجنٹوں

اور ھندوؤں نے کچھ ایسا بدنام کر رکھا ھے کہ ان کو آج بھی یہ علاقہ اور یہاں کے لوگ دیو بھوت دکھائی دیتے ھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ھمارے پٹھان بھائی بجائے یہاں کا رخ کرنے کے اُن اطراف میں جا بسے جو اُن کے چھوڑے ھوئے علاقوں سے کچھ زیادہ نسبت رکھتے تھے - میں یہ مضمون لکھ ھی رھا تھا کہ میرے ایک دوست آئے، میں نے اُن کی رائے پوچھی، وہ بولے، ''میری رائے تو خیر کیا پوچھتے ھو، آپ اٹک کے اس پار نامی کتاب کے صفحہ ۳۰۴ پر فکر تونسوی صاحب کا مضمون پڑھئیے، جس کا عنوان ھے ''وحشی اور اجڈ، فکر تونسوی نے آپ سے زیادہ سخت الفاظ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ھے کہ تنگ نظر مخالفین نے پشتون جیسی بہادر، ایماندار اور نڈر قوم کو دنیا کے سامنے وحشی اور اجڈ پیش کیا ھے!،، - بہر حال میرا مدعا اُس کیفیت کو واضح کرنا ھے جو اس قوم کی تاریخ اور اُس کی حیثیت سے تعلق رکھتی ھے - بلا شبہہ افغان اور پٹھان ایک عظیم اور قدیم قوم کے دو مختلف حصے یا شاخیں تو ھو سکتی ھیں، لیکن ان کی اصل کیا اور کہاں ھے؟ لازم ھے کہ اس بات کی پوری طرح تحقیق کی جائے خود بخود معلوم ھو جائیگا کہ اُن کی اصل پشتون ھی ھے -

یہ بات بھی قابلِ ذکر ھے کہ ھندوستانی پٹھان اگر خود کو پٹھان نہ کہلواتا، تو پھر کیا کہلواتا؟ کیونکہ وہ پشتون رھا تھا نہ افغان اور نہ ھی اُس نے خود کو روھی یا کوھستانی یا ولایتی کہلوانا پسند کیا - جس نام سے وہ ھندوستان میں رہ کر موسوم ھوا، صحیح تھا یا غلط، بہرحال وہ اُسی نام کو قبول کرتا - کیونکہ ھند کی زمین پر کسی خاص ذات یا برادری کی نسبت کے بغیر اُسے زندگی گزارنا مشکل تھی - خود وہ بھی مجبور تھے کہ اپنے اپنے لئے برادریاں بنا کر کسی خاص نام سے موسوم کر لیتے - یہی وجہ ھے کہ باھر سے آئے ھوئے غیر ھندی عوام کی برادریاں، قزلباش، صدیقی، بخاری، گردیزی، بلخی ھاشمی وغیرہ جیسے ناموں سے بن گئیں - ھندوستان میں بود و باش رکھنے والے پشتون الاصل پٹھانوں نے بھی مجبوراً پٹھان کا نام اپنایا اور بجائے اپنے خیل یا قبیلے کی نسبت کو زندہ رکھنے کے انھوں نے پشتون نسل کی نشاندھی اور امتیاز کیلئے صرف لفظ ''خان،، کا استعمال شروع کیا اور دیگر برادریوں کیطرح یہ بھی ایک خاص برادری میں منسلک ھوگئے - فرنگیوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں اپنی نوازشات اور خوشنودی کے اظہار کیلئے ''خانصاحب،، اور ''خانبہادر،،

کے الفاظ سے کام لیا اور اس قسم کے خطابات سے ہر قبیل کے مسلمانوں کو نوازا اور بلا امتیاز رنگ و نسل یا برادری ، جو بھی مسلمان اپنے آقاؤں کی خدمت کے صلہ میں خطاب کا حقدار قرار پاتا ۔ اسکو نسل و خون کی تمیز کے بغیر ''خانصاحب،، اور ''خانبہادر،، کے خطابات سے ممتاز کر دیا جاتا ۔ اسطرح ایک طرف خطاب یافتہ حضرات حکومت میں عزت پالیتے اور دوسری طرف انکی اصل نسل چاہے وہ کچھ بھی ہوتی ''خانصاحب،، یا ''خانبہادر،، کے لقب سے کافی حد تک ڈھک جاتی ۔ حتیٰ کہ پارسی فرقے کے افراد کو بھی ''خانصاحب،، اور ''خانبہادر،، ہی کے خطابات دئے جاتے رہے ۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر ہندوستان میں بسنے والے پٹھان بڑی حد تک مجبور تھے کہ وہ اپنی ایک الگ برادری ایک خاص نام سے قائم کرتے ۔ اس حد تک میں آن کو بالکل حق بجانب سمجھتا ہوں ۔

مؤرخین ، ماہرین لسانیات اور محققین نسلیات کے درمیان کچھ مدت سے بڑی گرما گرم بحث چل نکلی ہے کہ پشتون کی اصل نسل کیا ہے؟ آیا یہ 'آریا' ہے ، سامی النسل بنی اسرائیل ہے ، منگول ہے یا کچھ اور؟ فاضل کیرو نے پشتونوں کے حسب و نسب پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے اور اپنی تحقیق سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پشتون عوام کی اصل نسل مخلوط ہے ۔ افغانستان کے تاریخ دانوں اور موجودہ دور کے بعض محققین کا عقیدہ ہے کہ پشتون آریا نسل ہے ۔ اس نظرئے کے اثبات کے سلسلے میں آنہوں نے کافی دلائل اور شواہد اکھٹے کئے ہیں ۔ پشاور اور پشتونخوا کے دوسرے محققین ، مؤرخین ، علماء اور ماہرین نسلیات یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پشتون بنی اسرائیل ہے ۔ فاضل کیرو اس سلسلے میں ''ستھانہ،، کے سید عبدالجبار شاہ مرحوم کو کافی حد تک سند مانتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء اور تاریخ نویسوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے ۔ پشتونوں کو آریائی نسل سے ماننے والے ایک بڑی دلیل یہ دیتے ہیں کہ پشتونوں کی زبان پشتو ، حقیقت میں آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے ۔ کیرو کی رائے ہے کہ یہ ''ھن،، قوم کی میراث ہے جو اس قوم کے پاس رہ گئی ہے ۔ پشتون کو سامی النسل ماننے والوں کی نظر میں ان کی تہذیب ، ثقافت ، تمدن اور کردار سامی النسل اقوام سے ملتا جلتا ہے ۔ میں یہاں دوسروں کے نظریات کی تائید یا اختلاف سے بالکل علیحدہ ہو کر اپنا ایک نیا خیال قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ۔

قدیم تاریخ و آثار کے ماہرین وسطِ ایشیا کو بنی نوع انسان کی پیدائش اور ظہور کا اولین گہوارہ کہتے ہیں ۔ علم الانسان کے ماہرین کے قول کے مطابق بنی نوع انسان نے پہلے پہل اسی خطے پر تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی تھی ۔ ماہرین طبقات الارض کا کہنا ہے کہ تیسرے دور میں پہاڑوں کے نمود کی ابتداء ایسی ہوئی تھی کہ زمین کی شمالی اور جنوبی سمتوں میں جو برِ اعظم موجود تھے، اُن کے درمیان شرقاً غرباً ایک بڑا سمندر تھا ۔ زمین کی اندرونی تہوں میں آگ اور لاوا ہے ، جس کا وزن مخصوص اُوپر کی خشک تہہ یا سطح کے وزن سے زیادہ ہے ، اسلئے ظاہری حصے زمین کے اندرونی سیّال مادے کے اُوپر شرقاً غرباً حرکت میں رہا کرتے ہیں ۔ لاکھوں برسوں کے Tethys اور باد و باران نیز دوسرے عوامل کے اثر سے ، پہاڑوں کی مٹی ، پتھر اور چٹانیں آہستہ‌آہستہ اس وسیع سمندر میں تہہ نشین ہوتی رہیں اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ پتھر اور مٹی زمین کی اندرونی تہوں کے مرتعش حصوں کے راستے میں مضبوط دیواروں کی طرح حائل ہوگئی ۔ لیکن اس عمل سے یہ حرکت بالکل بند نہیں ہوئی ۔ جب بھی دو سمتوں سے دباؤ پڑتا رہا ، سمندر کی تہہ میں جمع شدہ مٹی ، پتھر آہستہ آہستہ اُبھرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ سمندر کے اُن حصوں کا پانی وہاں سے ہٹ کر دوسری اطراف میں پھیلتا رہا ۔ اس عمل کے نتیجے میں تیسرے دور کے یہ بلند و بالا پہاڑ ، وسیع میدان اور وادیاں وجود میں آگئیں ، جن کو آج مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ۔

یہ قانونِ قدرت ہے کہ پانی ، حرارت اور مٹی کے آپس میں عمل اور رد عمل سے حیات کی ابتداء ہوتی ہے ۔ بہ الفاظ دیگر نباتات اور حیوانات کی زندگی کا سبب بنتا ہے ۔ ماہرین کی رائے میں سمندر کی تہہ کے اُبھرنے ، وہاں سے پانی کے ہٹنے اور ان اُبھاروں پر سورج کی تپش اور بخارات کے اثر سے اُس کے حالات ، کوائف کے نباتاتی اور حیوانی زندگی کیلئے مناسب و سازگار ہونے میں کروڑوں سال کا عرصہ لگا ۔ چنانچہ اپنی اثرات کی بناء پر زندگی کی نشو و نما کیلئے وسط ایشیا کے اس خطے کی آب و ہوا اُس دور میں بڑی سازگار تھی، سندھ اور گنگا کے میدان ابھی تک زیرِ آب ہی تھے۔ اسیطرح عراق عرب ، بابل اور عرب افریقی علاقے ، جو بحیرۂ روم کے زد میں تھے ، سب ابھی پانی کے نیچے تھے ۔ زمین کے اس حصے کے جغرافیائی مطالعے سے

اندازہ ہوتا ہے کہ اس گرد و نواح میں حیات کی نشو و نما کے تمام اجزاء موجود تھے - پہاڑ ، میدان ، زمین اور دریا سب ایک دوسرے سے پیوست تھے - اس لئے ایک ماحول سے دوسرے ماحول تک پھیلنے میں نباتات اور حیوانات کو آسانی میسر تھی اور شاید ماحول کی اسی سازگاری کے سبب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پیدائش اور اس کی پرورش کیلئے یہی خطہ چنا -

بحث نے دوسرا رخ اختیار کر لیا ، لیکن میں موضوع زیرِ بحث کی طرف واپس آرہا ہوں - بنی نوع انسان کی ارتقاء کا آغاز اسی خطۂ زمین سے ہوا - اسی گہوارے میں ابتدائی انسان نے تربیت حاصل کی ، پلتا بڑھتا رہا اور یہیں سے پھیلا - لیکن ترک سکونت کرنے والوں نے اس علاقے کو کبھی یکسر خالی نہیں کیا - ان کی ہجرت کرنے یا پھیلنے کا یہ عمل عرصۂ دراز تک جاری رہا - یہاں سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں خوراک کی تلاش میں ، جو اولین دور میں شکار ہوا کرتا تھا ، کسی ایک سمت کو نکل پڑتے - ان میں سے کچھ افراد وہیں رہ جاتے اور کچھ واپس آجاتے موجودہ زمانے کے جغرافیہ دانوں اور علم الانسان کے ماہرین نے اس طویل عمل کی تشریح نقشوں اور اٹلسوں کے ذریعہ ، بڑی وضاحت کے ساتھ کی ہے - چونکہ انسان فطرتاً نطق سے بہرور پیدا کیا گیا ہے ، اس لئے اس دور کا انسان ضرور کوئی نہ کوئی بولی بولتا ہوگا - جو حیوانات سے یقیناً زیادہ واضح اور قابلِ فہم و تفہیم بھی ضرور ہوگی - یہ کونسی بولی تھی ؟ اس کے بولنے والے کون تھے ، اور وہ لوگ کیا ہوئے ؟ بس ، پشتو زبان اور پشتون قوم کی قدامت اور ان کی اصل نسل کے سلسلہ میں میرے نظرئیے کے یہی اہم اجزاء ہیں - انسانی زندگی کی ابتداء اسی گرد و پیش میں ہوئی - یہیں انسان نے نشو و نما پائی اور یہیں سے دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلے - اس علاقے کے اصلی باشندوں کی ارتقاء ، نشو و نما اور ترقی کے متعلق چاہے ہماری تاریخی معلومات کتنی ہی محدود ہوں ، لیکن یہاں سے ہجرت کرنے والی اقوام کا ، جنہوں نے دور و دراز علاقوں کی طرف کوچ کیا جن سے بعد میں دنیا کی بڑی بڑی قومیں اور نسلیں وجود میں آئیں ، مغرب مشرق شمال اور جنوب کو کوچ کرنے والی مخلوق ، کوئی سفید ، کوئی زرد اور کوئی کالے رنگوں کی نسلیں بنیں اور مختلف ناموں سے مشہور ہوئیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے ہجرت کرنے والے قبائل میں سے بعض کا آپس میں رابطہ و تعلق قائم رہا - بعض کا مرکز سے تعلق منقطع ہوگیا - نتیجہ یہ

ہوا کہ انڈو ایرئین اور انڈو یورپین اقوام کا تو آپس میں میل جول اور رفت و آمد کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں قائم رہ گیا - لیکن منگول یا سامی اور کالے رنگ والی اقوام کا تعلق مسدود ہوگیا - اس وجہ سے آن کے رنگ ، آن کی زبان ، اخلاق اور کردار وغیرہ نے نئے ماحول کی مناسبت سے پرورش پائی - لیکن جو قبائل مرکز ہی میں رہتے چلے آئے - آن کے خارجی و داخلی کوائف کی نشو و ارتقاء اپنے انداز میں رہی - اس مرکزی خطے کی سب سے پرانی زبان کونسی ہے ؟ یہاں کے خاص باشندے کون ہیں جن کی زبان ، تاریخ اور نسل نے اسی سر زمین پر ہزاروں لاکھوں برس سے جڑیں پھیلا رکھی ہیں اور آج تک موجود ہیں ؟ میرا خیال ہے کہ اگر وسطِ ایشیا کے اس علاقے کے رہنے والے لوگوں کی پراکرتی زبانوں سے پہلے کوئی زبان تھی تو اس کی دعویدار صرف پشتو ہوسکتی ہے - اس بات کی دلیل یہ ہے کہ پشتو زبان کا رشتہ اور ریشہ سامی ، انڈو ایرانی ، چینی ، سنسکرت ، اوستا اور دیگر بہت سی زبانوں سے ہے - یہاں سے جا جا کر باقی دنیا میں پھیلنے والی اقوام اگر مختلف ناموں سے یاد ہوتی رہیں تو یہاں کے اصلی باشندوں کا بھی کوئی نہ کوئی نام ہونا چاہیے - چنانچہ جیسے کہ یونانی مؤرخین نے لکھا ہے - یہ لوگ پکت (پکتیان) یا پکتین تھے - اسی پکتین یا پکتیا یا پختو یا پشتو نے اس خطے کے اصلی باشندوں کی زبان ، نسل اخلاقی قوانین اور عوامی روایات ، سب کو یکجا کرکے ایک ہی نام میں سمو دیا تھا - اس سے متبادر نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی زندگی کے ابتدائی مرحلوں کے تعین کے سلسلہ میں پکت ، پکتین یا پختون یا پشتون نسل اور قبیلے کی قدامت اور مرکزیت کو لازماً ماننا ہوگا - یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ اس خطے کے عوام جو بولی بولتے تھے وہ بھی پکتین یا پکتی زبان تھی - کیونکہ آج بھی یہاں کے بعض دور دراز علاقوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ پکتی ہی کے نام سے موسوم ہے - جس کو محققین ادوار ماضی کے کسی انتہائی دور اور پرانے موڑ سے آئی ہوئی پرانی زبانوں سے متعلق سمجھتے ہیں -

اس خیال کی مزید تحقیق و تفتیش کیلئے لازم ہے کہ مؤرخین دیگر علوم و فنون سے بھی استفادہ کریں - یہ نظریہ بہ ظاہر بودا کیوں نہ معلوم ہو، لیکن علمی تحقیق و تدقیق کے نتیجے اکثر ایسے ہی نظریات سے وجود پاتے ہیں - آہستہ آہستہ نئی راہیں اور نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں -

بالآخر مرور و امتداد زمانہ کے باعث ایک وقت میں تسلیم کرلئے جاتے ھیں -

پشتون نسل اور زبان کی قدامت تو مسلم ہے ، مگر ''مؤرخین '' اس حقیقت کو ماننے کے باوجود کبھی ان کو ایک رنگ و نسل سے منسوب کرتے ھیں اور کبھی دوسری سے - ایسے ھی ان کی زبان کو بھی کبھی زبانوں کی کسی نسل سے مانتے ھیں اور کبھی کسی سے - لیکن اگر اس نظرئیے کی بنیاد پر علمی تحقیق کی گئی تو صرف اُمید ھی نہیں ، یقین ہے کہ محققین اسی نتیجے پر پہنچیں گے اور پشتون کے بنی اسرائیل سامی النسل یا آس کے آریہ، منگول یا کسی اور نسل سے ھونے کے تمام مسئلے بیچ میں سے نکل جائیں گے اور محققین یہ کہنے میں حق بجانب ھوں گے کہ بنی نوع انسان کی مہذب زندگی کی ابتداء پشتون نسل اور پشتو زبان سے ھوئی ہے -

پکتی نسل اور زبان کی قدامت کے سلسلے میں اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ھوتا ہے کہ اس معاشرے یا دنیا کے کسی بھی دوسرے معاشرے کے حق میں یہ دعویٰ بڑی مشکل سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ فلاں نسل ملاوٹ سے بالکل پاک ہے - سکیمو لیپس (Laps) یا افریقہ اور آسٹریلیا کے اصلی قدیم باشندوں کے متعلق اگر کہا جائے تو ایک بات ہے - لیکن مہذب دنیا میں کسی معاشرے کے متعلق یہ دعویٰ جائز نہ ھوگا - اس لئے ہم اس موقع پر یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتے ھیں کہ پکتی معاشرہ بھی شروع سے آخر تک خالص پکتین قبائل پر مشتمل نہیں چلا آرھا - کیونکہ اس مرکز سے ھجرت کرکے دور دراز علاقوں میں بسنے والے بعض قبائل نے پھر اسی مرکز کی طرف رجوع کیا ہے اور وہ اپنے ساتھ دوسرے معاشروں سے نیا نیا رنگ لا کر پھر پکتی معاشرہ میں شامل ھوتے رھے ھیں - جس سے اس معاشرے کی کیفیت کچھ کچھ بدلتی رھی ہے - یہی وجہ ہے کہ پکتی قوم کا خون ھمیشہ تر و تازہ اور جوش زن رھا - تاریخ کے بعض ادوار میں صرف پکتین یا پشتون نسل کے لوگ ھی نہیں بلکہ یونانی، ھن ، ساکا ، کوشان ، سامی اور دیگر آریائی طبقے، جن میں شینائی اورگوجر بھی شامل ھیں ، یہاں آ کر خلط ملط ھوتے رھے ھیں - اس وجہ سے پکتین قوم کے خد و خال ، آن کی چال ڈھال اور عوامی رسم و رواج میں ایک حد تک اشتراک اور یگانگت پائی جاتی ہے جیسا کہ میں پہلے ذکر کرچکا ھوں - یہی وجہ ہے کہ پشتون قوم دنیا کی بیشتر اقوام کے ساتھ کسی نہ کسی طرح مماثلت رکھتی ہے - اگر کہیں خد و خال کی یکسانیت پائی جاتی ہے تو کہیں

زبان کی ، کہیں لباس میں مشابہت پائی جاتی ہے تو کہیں رہن سہن کے طور طریقے اور رسم و رواج مشابہہ ہوتے ہیں - یہ بات یقیناً دنیا کی ہر قوم کے لئے کہی جاسکتی ہے لیکن کہیں یہ اشتراک کم ہوتا ہے اور کہیں زیادہ - بہرحال پکتین نسل کی قدامت اور مرکزیت کے سبب اس قوم کی موجودہ نسل میں یہی مسائل بڑی شدّ و مد سے زیر بحث آتے ہیں -

فاضل کیرو نے اپنی کتاب کے شروع کی چند فصلوں میں پٹھان قوم کی اصل نسل، شجروں اور مختلف مؤرخوں کے بیانات اور اُن کے نظریوں کے نتائج بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں اور ساتھ ھی پشتونوں کی پیدائش پر بھی کافی طویل بحث کی ہے - اس ضمن میں اُنہوں نے چند قدیم نسلوں مثلاً ساکا ، کوشان ، ساسانی ، سفید ھُن ، ھفتالی وغیرہ وغیرہ کے متعلق کافی معلومات اکٹھی کی ہیں - لیکن جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ان سے ہزاروں سال کا پرانا دور ہے - یہ دور بنی نوع انسان کی عوامی یا اجتماعی زندگی کے آغاز کا ہے - اُس وقت قوم ، قبیلہ یا خیل وغیرہ نہیں بنے تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ نوع انسان کی تہذیب کے گھٹنیوں چلنے کا دور تھا - اسی خطے میں وہ پل کر بڑا ہوا ، یہیں سے اُس کی اجتماعی زندگی کی ابتداء ہوئی اور اُسی کی زبان کو اولیت حاصل ہوئی -

یورپ کے چند دیگر علماء اور محققین نے زبانوں کی اصل اور ریشے کے سلسلے میں ”سنتم“ اور ”سیتم“ کی دو بڑی شاخیں متعین کی ہیں اور تمام دنیا کی انڈو ایرئین زبانوں کی تقسیم اسی مفروضہ کے مطابق کی ہے - بالفرض اگر زبانوں کے یہ دو مآخذ سنتم اور سیتم تسلیم کر بھی لئے جائیں پھر بھی اس کا اطلاق بہت بعد کے دور پر ہوتا ہے - لیکن ان مآخذوں سے سنسکرت اور اس کی دوسری ہمعصر زبانیں یکبارگی تو پیدا نہیں ہوئی ہوں گی - سنسکرت اور اوستا اگر مہذب اور سمجھدار لوگوں کی زبان مانی جاتی ہے تو ان کی یہ حیثیت بھی جبھی ممکن ہوسکتی ہے جب یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ قدیم تر زبانیں ضرور کسی قدیم ترین زبان سے نکلی ہوں گی -

فاضل عبدالحی حبیبی نے ”تاریخ ادبیات پشتو“ میں عمدہ تحقیق پیش کی ہے - اُنہوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اصل آریائی زبان کا کوئی پتہ

نہیں لگتا کہ وہ کیا تھی اور کب تک زندہ رہی۔ فاضل حبیبی ڈاکٹر ''گاستاؤلیبان،، کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ زبان تین ہزار سال قبل مسیح تک بولی جاتی تھی۔ لیکن خود ان کی رائے یہ ہے کہ اصلی آریائی زبان کا تخمینہ پانچ سو قبل مسیح سے پانچ ہزار قبل مسیح تک ہے۔ فاضل حبیبی لکھتے ہیں کہ: ''وید چودہ سو قبل مسیح کے لگ بھگ لکھے گئے ہیں۔ اسی زمانے کے چند آریائی کتبے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کی زبان وید سے ملتی جلتی ضرور ہے لیکن بالکل ایک نہیں،،۔ اس سے معلوم ہوا کہ وید کی زبان بھی اصل آریائی زبان نہ تھی بلکہ اس سے پہلے بھی کوئی اور زبان موجود تھی۔ یہ زبان جو کچھ بھی تھی، غالباً آریائی اس لئے کہلائی کہ اس زبان کیلئے کوئی اور نام وضع نہیں ہوا اور آریا، آریانہ، یا آر جیسی اصطلاحات نے، جو ہزاروں برس بعد معرضِ وجود میں آئیں، اس قدیم ترین زبان اور اولین قوم کے سلسلے میں تحقیق و تجسس کی ضرورت کو کم کیا بلکہ ختم کر دیا۔ اسی لئے سب نے آر، آر، آریک اور آریانہ نیز سنسکرت اور اوستا وغیرہ زبانوں کو ہی زبانوں کی ماں سمجھا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر باختر، جس میں پورا پشتونخوا بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ بنی نوع انسان کے ابتدائی دور کا گہوارہ تھا اور نسل انسانی اسی مرکز سے روئے زمین پر دور دور تک پھیلی ہے۔ تو پھر صرف ہندی، اروپائی، سامی، اوستائی یا اس خاندان کی دوسری زبانوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ وہ بےشمار زبانیں جو کہیں دراوڑی کہلائی، کہیں چینی، کہیں شینا اور منگولی وغیرہ لازماً مختلف اوقات میں مختلف گروہوں کے اس مرکز سے ہجرت کرکے دوسرے دوسرے مقامات پر جانے کے بعد بنیں، جن کے بنیادی ریشے اسی قدیم مرکزی زبان سے ملتے ہیں۔

فاضل حبیبی نے لکھا ہے، ''اگرچہ اس اصلی زبان کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کیا تھی۔ لیکن اس سے دوسری زبانوں کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آگے بیان سے ثابت ہو جائیگا کہ پشتو، سنسکرت اور اوستا کی طرح اس اصل زبان کی بیٹی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا مرکزی آریا بلخ یا باختر میں رہ گئے۔ انہی کا ایک بڑا قبیلہ 'بخت' پکت یا پشتون تھا۔ اسی بناء پر اصلی آریائی زبان بھی انہی کے حصے میں آئی،،۔ فاضل حبیبی کی اس تحریر سے یہ بات ظاہر

ہے کہ اصل آریائی زبان کچھ اور تھی - وہ سنسکرت ، اوستا اور پشتو کو نہیں مانتا ہے میرا یہ دعویٰ ہے کہ بلخ یا باختر میں زمانۂ قدیم سے رہنے بسنے والی نسل بخت یا پکت یا پشتون تھی - تو اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ وہ اصل اور پرانی زبان بھی اس قوم کی تسلیم کی جائے اور آریہ قوم سے اس زبان کی نسبت یا آریاؤں کی معلوم زبانوں سنسکرت یعنی ہندی ، ایرانی اور ہندی اروپائی وغیرہ کو اس اصلی زبان کی بہن کے رشتے سے وابستہ کرنا ، درحقیقت اس عظیم اور قدیم ترین نسل اور اس کی زبان پشتو کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا - اگر اس عظیم نسل کی اصل قدیم تھی تو اس کی زبان بھی لازماً قدیم مانی جائے گی - اس سبب سے پشتو کو دنیا کی قدیم زبانوں کی ماں یا نانی ماننا پڑیگا -

سنتم اور سیتم کی تقسیم ایک ایسی اختراع ہے کہ زبانوں کی اصل اور قدامت کے سلسلے میں اگر اس کو نہ مانا جائے تو کوئی عیب کی بات نہیں ہوگی - لفظ ''سل،، سو کی بنیاد گرداننا تو صاف اس بات کی دلیل ہے کہ اس دور میں بنی نوع انسان ارتقاء کی اس منزل میں تھا جب گنتی کے اعداد سو تک پہنچ گئے تھے - لیکن ماہرین علم الانسان کے قول کے مطابق بلکہ عام انسانی مشاہدے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان نے گنتی کا تصور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے لیا - پہلے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں سے گنتی شروع کی ، پھر دوسرے ہاتھ کی پانچ انگلیاں بھی اس میں ملا کر دس تک پہنچایا اس طرح آہستہ آہستہ پانچ ، دس ، بیس اور تیس تک دن اور مہینوں کا حساب سیکھا اور وقت کے ساتھ ساتھ کہیں ہزاروں برس بعد جب انسان تہذیب و ارتقاء کے اونچے منازل پر پہنچا تو گنتی کے اعداد بھی سو تک پہنچے ہوں گے - اس لحاظ سے اگر ''سو،، کی بجائے پانچ یا دس کے اعداد سے گنتی کی ابتداء مانی جائے تو نوع انسان کی تہذیب و ارتقاء کے سلسلہ میں یہ اندازہ زیادہ قدیم اور زیادہ قرین قیاس رہیگا - پس اگر سنتم اور سیتم سے قبل اسی اختراع کی بناء پر پنځم (پنجم)، لسم ، لستم ، دسم ، دھم یا اسی طرح دوسرے الفاظ اختراع کئے جائیں تو یہ اس زبان کے وجود کو جو سنسکرت اور اوستا سے پہلے تھی ، معین کرنے کے سلسلے میں زیادہ قرین قیاس یا حدث ہوگا - اس قیاس یا حدث کے لحاظ سے پشتو یا ہوسکتا ہے کہ اس سے قریبی زمانے میں پیدا شدہ دیگر زبانوں کا وجود بھی ماننا پڑ جائے جن کے متعلق ابھی ہماری معلومات نہیں کے برابر ہیں - اس طرح فاضل

حبیبی کی تحقیقات کو زیادہ تقویت ملے گی۔ تخمین یا حدث کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ خصوصاً ایسے میدان میں، جہاں تاریخ کے اوراق ہماری امداد سے قاصر ہوں۔ اس قسم کی تاریخ اور دیگر علوم میں ایسے حدثیات پائے جاتے ہیں۔ طبقات الارض، علم الانسان اور آثار قدیمہ یا اسی نوع کے دیگر علوم یہاں تک کہ علم تاریخ خود بھی بڑی حد تک جب قیاس و حدث پر ہی مبنی ہے تو پھر ایک یہ حدث بھی سہی۔

یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ ماقبل التاریخ کے اس دور میں مذہب اور معاشرے کی تشکیل اور ارتقاء کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی تصور ضرور موجود ہوگا۔ نوامیس قدرت اور مظاہر فطرت لازماً اس دور کے عوام پر کچھ نہ کچھ اثرات رکھتے ہوں گے۔ سورج، چاند، ستارے، آسمان، زمین، پہاڑ وغیرہ ایسے حقائق تھے کہ اس دور کے انسان نے خواہ مخواہ ان چیزوں کے متعلق کوئی نہ کوئی تصور قائم کیا ہوگا جیسے جیسے زندگی کا تانا بانا پختہ ہوتا گیا اور بنی نوع انسان روئے زمین پر پھیلتا رہا اور درختوں اور غاروں کی زندگی سے جس وقت انسان زراعت کے میدان میں آنکلا تو زندگی اور معاشرے کے نئے نئے تقاضوں سے اسے واسطہ پڑتا گیا۔ ان تقاضوں اور مشکلات کا حل ہر دور کے ساتھ مخصوص تھا۔ ان مشکلات کے حل کے سلسلہ میں یقیناً بعض سمجھدار اور تجربہ کار بزرگوں نے کچھ نہ کچھ اصلاحی، معاشرتی، ابتدائی قوانین وضع کئے ہوں گے۔ یہ قوانین آہستہ آہستہ پھیلتے رہے ہوں گے اور جوں جوں تجربے سے ان کی افادیت ثابت ہوتی گئی۔ تو ان روایات نے عوام کی زندگی کی تشکیل اور تکمیل میں اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کرلی اور غالباً یہیں سے مذہب کا تصور بھی جنم لیتا نظر آتا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ وان من امة الاخلافیہا نذیر ہ ''ایسی کوئی قوم نہ تھی جس میں ڈرانے والا نہ گزرا ہو'' یقیناً انسان کی اس بالکل ابتدائی زندگی کے دور میں بھی ایسے بزرگ اور سمجھدار مصلح ضرور گزرے ہوں گے۔ جنہوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات اور ضروریات کے مطابق عام لوگوں کے بعض اعمال اور افعال کے بُرے نتائج سے ان کو آگاہ کیا ہوگا۔ انہی ناصح اور سمجھدار لوگوں کا سلسلہ بڑھتا رہا اور آخر ایک وقت ایسا آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح و تربیت اور رشد و ہدایت کیلئے ان میں سے بعض مقتدر پیغمبر شریعت لیکر مبعوث ہوئے۔ چنانچہ بخت، پکت یا پشتون قوم میں بھی ضرور کوئی

نہ کوئی مصلح پیدا ہوئے ہوں گے - جنہوں نے اس ابتدائی انسان کی فلاح و بہبود کیلئے کچھ قوانین اور اصول وضع کئے ہوں گے - بعض لوگ مصلحین اور پیغمبروں کی پھیلائی ہوئی تعلیمات کو آسمانی صحیفے سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سے قبل اور پھر آن کے بعد بھی دنیا کے ہر حصے میں معاشرے کی اصلاح و تربیت کا کام انہی مصلحین اور چھوٹے بڑے پیغمبروں نے اپنے محدود دائروں میں سرانجام دیا ہے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں اصلاح و تربیت کی خاطر راستی و راستبازی پھیلانے آئے ہیں - پشتو کا ''رشتیا''، فارسی کا راست و راست گوئی اور ہندی کا ''رشی'' یعنی ''رشتیاویونکے''، بمعنی ''سچ کہنے والا''، آپس میں کافی مشابہہ الفاظ ہیں اور رشتیا کے حامل 'رشی'، روئے زمین پر ہر جگہ میں، ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے اور اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق معاشرے کی اصلاح اور رهنمائی کرتے رہے -

یہ بھی لوازمات و مقتضیات ارتقاء میں شامل ہے کہ اقوام و ملل اپنے اپنے ماحول ، ضروریات و احتیاجات کے مطابق اپنے لئے زندگی کے کچھ ضابطے، قاعدے اور اصول وضع کرتی ہیں - اس طرح متعدد تہذیبیں ، مختلف عقائد اور گوناگوں مذاہب پیدا ہوتے رہے - اسی قدرتی قاعدے کے مطابق پشتونوں نے بھی اپنے لئے تہذیب و اخلاق اور تمدن و معاشرت کے کچھ آئین و آداب مقرر کئے اور جیسے پشتون نے اپنی مرزبوم کا نام پشتونخوا رکھا - ایسے ہی اپنے آئین و دستور اور ضابطہ حیات کا نام پشتونولی یا پشتو رکھا - اس پشتونولی کا پشتونوں کی زندگی اور زبان دونوں میں نفوذ تھا جو ہزاروں برس کے مشاہدے اور تجربے کا نچوڑ تھا - اس آئین ، طور طریقے یا دستور کو زبان کی وسعت ، پختگی اور قدامت نے دوام بخشا اور آج تک اس قوم نے اسی زبان اور ضابطۂ اخلاق کو اپنی زندگی پر حاوی کر رکھا ہے - اس دور کے بہت بعد جب زمین کے دوسرے حصوں یعنی عراق ، عرب ، مصر، ہندوستان اور چینی خطوں میں مخصوص تہذیبیں ابھریں اور ترقی و ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگیں ، تو اس وقت بھی اس قدیم نسل کے افراد اپنے اسی قدیمی پشتو کے آئین و قانون کو اپنائے رہے - یہ بات بھی واضح ہے کہ یہاں سے پھیلی ہوئی انسانی برادریوں میں ان کی زبان اور اخلاق کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور باقی رہا ہوگا - کیونکہ کہیں زبان کا

اور کہیں اخلاق کے اشتراک کا ثبوت بھی ملتا ہے ۔ عراق ، عرب ، فلسطین اور کنعان کے خطوں میں پروان چڑھی ہوئی تہذیبوں کا یہ اشتراکِ اخلاق و عادات تو تاریخ سے ثابت ہے ۔ باختر اور وسطِ ایشیا کے اُس دور کے پشتون اگرچہ ایک طویل عرصے تک بابل اور آسوری اقوام اور اُن کے علاقوں سے دور رہے ۔ لیکن ایک تو اسی اشتراک ، دوسرے سوداگروں کی آمد و رفت کے سبب اکثر لوگوں نے باختری قبائل کو انہی کا جزو سمجھا ، حالانکہ حقیقت میں بابلی اور آسوری اقوام ان کی اولاد تھیں ۔ بالکل جیسے ہندی اور اروپائی اقوام ان کی اولاد تھیں اور یہاں سے پھیلی تھیں ، بلکہ روئے زمین پر جہاں کہیں بھی انسانی آبادی ہے وہ سب اگر اپنی نسبت اسی پشتونخوا کی مٹی ، اس کی قدیم نسل اور پشتون ، اُس کی زبان پشتو سے کریں تو بیجا نہ ہوگا ۔ چاہے یہ نسبت بظاہر کتنی بعید اور کمزور کیوں نہ معلوم ہو ۔ مگر تحقیق و تلاش کے میدان میں علم الانسان ، علم الالسنہ اور اسی قبیل کے دوسرے علوم کے ماہرین کیلئے نئی نئی تحقیقات کے نئے نئے خزانے پیدا ہوجائیں گے ۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے :

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّنَ ...... الخ يا هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ...... اور يا يُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا، ...... اس سلسلے میں ایک قوی دلیل ہے کہ انسان کی عوامی زندگی کی ابتداء جس قدیم ترین فرقے یا قبیلے سے ہوئی ہے ۔ قیاس اس کو بخد ، پکھت اور پشتون (پختون) مانتا ہے اور وہ جس اولین مرزبوم یا جائے پیدائش میں مقیم تھا ۔ وہ بلخ ، بلھیکا، پکتیکا یا پشتونخوا (پختونخوا) تھا ۔ یہیں سے عالم انسانیت کی تمام اقوام پیدا ہو ہو کر دنیا میں پھیلی ہیں ۔

اس قدیم النسل مخلوق کی زندگی کے آئین کا اصول ، جس کو وہ پشتو یا پشتون ولی کے نام سے پکارتے تھے ، مذاہب کی ترقی کے ہر دور میں مصلحین کی تلقین و ہدایت اور پیغمبروں کی تعلیمات اور شریعتوں میں موجود چلا آرہا ہے ۔ اس بناء پر جب انسانوں کے لئے خدا کا بھیجا ہوا آخری اور مکمل دین و آئین شریعتِ اسلامی کے نام سے اس علاقے میں پہنچا

اور اس قوم کے افراد نے اسلامی اخلاق و آداب کی اہمیت کو سمجھا تو اُن کو اسلامی آئین اور اپنی پشتو میں بڑی یکسانیت اور مماثلت نظر آئی ۔ چنانچہ اس قوم کے تمام افراد نے اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے اس دین کو بہ تمام و کمال قبول کیا ۔ کیونکہ پشتونی آئین اور اسلامی آئین میں اختلاف کم اور یگانگت زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ پشتون قوم میں اسلام کے بغیر کسی دوسرے مذہب کا تصور کسی بھی شکل میں مقبول نہیں ہوا ۔ جو پشتون پیدا ہوا ہے وہ خواہ نخوا مسلمان ہوگا ۔ دینِ اسلام کے اخلاق اور عقائد سے روگردانی گویا پشتو سے روگردانی ہے ، اسی لئے آج بھی اگر کوئی دینِ اسلام ترک کرتا ہے ۔ تو اُس کو پشتون ولی سے یکسر نکال دیا جاتا ہے ۔ اُس کے بعد وہ ایک عیسائی ، ہندو یا سکھ کی طرح تو رہ سکتا ہے ، مگر پشتون کی حیثیت سے معاشرے میں جگہ نہیں پا سکتا ۔ پشتون ہندو ، پشتون سکھ ، پشتون عیسائی یا پشتون یہودی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ ''پشتون،، قوم کو آریا ، سامی یا منگول نسلوں سے منسوب کرنا میرے اس مختصر تبصرے میں یقیناً بے جا ہوگا ۔ بلا شبہہ اس قوم کا تعلق بعض دوسری اقوام کے ساتھ رہا ہوگا ۔ لیکن اس کو آریا یا ہندی آریا یا دوسرے تیسرے سے منسوب کرنا خود اس نسل کی اصل کو مٹانے کے مترادف ہے ۔ پشتون قوم بس پشتون نسل ہے ۔ چاہیے کہ اس نسل کی قدامت اور عوامی روایات کے لحاظ سے اس کو کسی دوسری نسل کی دم سے نہ باندھا جائے ۔ اس خیال میں کوئی عیب نہیں ہے اور اگر مؤرخین یا مفکرین اس خیال کی تائید یا طرفداری نہ بھی کریں یا اس کی مخالفت بھی کریں تب بھی اس سے پشتونوں کی نسل ، ان کی قدامت ، ان کے اونچے مقام اور ان کی اعلیٰ روایات میں کوئی فرق نہیں آسکتا ۔

پشتونوں نے جس ماحول میں زندگی گزاری ہے ، بیشک اس میں انہیں اپنی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کے بہت کم مواقع میسر آئے ۔ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ اقوام چاہے کیسے ہی ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کی حامل کیوں نہ ہوں ، پشتون اُن کی وجہ سے اپنی اصل نسل اور تاریخی مقام کو نہیں کھو سکتا ۔ تہذیب و تمدن اور ترقی کے یہ ادوار اسی طرح آتے اور جاتے رہیں گے ۔ بمصداق اس پشتو کہاوت کے ''وار دے وار دے ۔ کله د ادے کله د پلار دے،، (باری ہے باری ہے ۔ آج اگر ماں کی باری ہے تو کل باپ کی ہے) اس قوم کے قویٰ ابھی ثابت و سالم ہیں ۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ اسلامی اور پشتونی اخلاق کا مظہر، جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے ویسا آج وہ ہے نہیں ۔ لیکن ابھی اُس کی باری ختم نہیں ہوئی ، جیسا کہ دنیا کی اکثر اقوام گزار چکی ہیں ۔ زمانے کے تحولات نے اس کے اسلامی اخلاق اور پشتونی آئین پر ہر سمت سے حملے کئے ہیں ، اس کا جوڑ جوڑ زخمی ہے ۔ لیکن ابھی اس کا جوہر اُجلا اور تخم بے داغ ہے ۔ صحیح تعلیم اچھی تربیت سائینسی علوم و فنون سے استفادہ ، اسلامی عقائدو ایمان اور پشتونی اخلاق و کردار ، یہ سب باتیں اگر وہ اب بھی کماحقہ اپنالے تو یہ تمام عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام آسکتا ہے ۔ آج دنیا کی نگاہیں اسی کی زمین پر مرکوز ہیں ۔ علامہ اقبال[رح] اسی قوم سے ''فطرت کے مقاصد کی نگہبانی'' کا تقاضا کرتے ہیں ۔ اس وجہ سے میں اپنی قوم کے خوش آیند مستقبل کی آرزو رکھتا ہوں ۔ پیشین گوئی نہیں کرتا کیونکہ دنیا میں ہر قوم اس منصب کو اپنا سمجھتی ہے اور سمجھنے میں ہر کوئی حق بجانب بھی ہے ۔ لیکن اگر اس ایٹمی دور کے آفات و مصائب تمام دنیا کی اقوام بلکہ کل انسانیت کیلئے ایک خطرہ کی دھمکی ہے ۔ تو انسانی عقائد اور اخلاق کے اصلی جوہر کا حامل پشتون اس خطرے کا توڑ اور اصلاح و رہنمائی کا جواب ہو سکتا ہے ۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے اور اس کا منصب دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا ہے ۔ پشتون کا ایمان اسلام ہے اور آئین پشتو ہے ۔ جو کہ اسلامی اخلاق و ضوابط ہی کا دوسرا نام ہے ۔ اس لئے پشتون ہی تمام انسانیت کی فلاح اور سلامتی کا یہ بھاری بوجھ اپنے مضبوط ایمان اور پشتونی اخلاق کے برتے پر اُٹھانے اور اس کام کو سرانجام دینے کی اہلیت رکھتا ہے ۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ پشتون قوم کے موجودہ دور کے بعض مفکرین میرے اس قسم کے خیالات سے موافقت کریں گے بھی یا نہیں ۔ کیونکہ موجودہ دور کی ہوا کا رخ دوسری طرف ہے ۔ اقتصادیات اور سیاسی عقائد نے اکثر لوگوں کے اذہان میں ایسا گھر کر رکھا ہے کہ مذہب یا خاص قسم کے اخلاقی آئین اور ضابطوں کی پابندی ان کے خیال میں کوئی مفید چیزیں نہیں ہیں ۔ دوسروں کی مادی ترقی ، سیاسی غلبہ اور اقتصادی خوشحالی ایسے اشخاص کے نزدیک اصلی نصب العین ہے ۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاھد ہے کہ عالم انسانیت کے بعض سیاسی بالا دستیوں نے انجام کار ان کو فنا کے گھاٹ اُتارا ہے ۔ بقاء تو صرف پختہ عقائد ، مضبوط ایمان اور

بلند اخلاق کو ہے ۔ میری یہ دعا ہے ، خدا نہ کرے کہ پشتون بھی دیگر مادہ پرست اقوام کی طرح صرف مادہ کا اور اقتصادی ترقی کا خواہاں ہو کر رہ جائے ورنہ یہ جو تھوڑا بہت جوہر اُن میں باقی ہے وہ بھی فنا ہوجائیگا ۔ سیاسیات اور اقتصادیات وقتی چیزیں ہوتی ہیں ۔ بلاشک ان سے صرفِ نظر بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن انسانیت کی فلاح ، نجات اور سلامتی محض ان باتوں کے حصول پر منحصر نہیں ۔ جس قوم کے عقائد مضبوط نہ ہوں اور ایمان متزلزل ہو جائے اُس میں اخلاقی جوہر باقی نہیں رہتا ۔ چاہے وہ مصری ہوں یا عرب ، یونانی ہوں یا انگریز ، فرانسیسی ہوں یا چینی ، مغل ہوں یا روسی اس جوہر کے بغیر لازماً وہ اپنی خودی اور انفرادیت کھو بیٹھتے ہیں اور ان پر دوسری اقوام کا تسلط قائم ہوجاتا ہے ، غالب ہونے والی قومیں خواہ افرادی طاقت میں کتنی ہی کم اور مادی یا اقتصادی لحاظ سے بظاہر کیسی ہی بدحال کیوں نہ ہوں ۔ لیکن انہوں نے مضبوط عقیدوں اور اخلاقی جوہر کو محفوظ رکھا ہوا ہوتا ہے ۔

اسلام سے قبل ، دورِ جاہلیت میں عرب ، تہذیب و تمدن اقتصادی آسودہ حالی اور ترقی کے دیگر لوازمات سے بالکل بے بہرہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس صحرا نشین قوم کی فطرت میں چونکہ غیر متزلزل اعتقاد اور مضبوط اخلاق کی تربیت حاصل کرنے کا جوہر موجود تھا ۔ اس لئے جس وقت عربوں کو اسلامی نظام حیات کی دعوت دی گئی تو انہوں نے اس دینِ فطرت کو بہ تمام و کمال اپنایا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہی غیر مہذب بادیہ نشین اخلاق و کردار کے علمبردار بن کر دنیا کی اصلاح اور رہنمائی یا اخلاق کی تعمیر کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ روئے زمین کے ایک بڑے حصے پر چھا گئے اور اپنی طرح اوروں کی بھی کایا پلٹ کر رکھ دی ۔

اس موقع پر قارئین کے سامنے ایک اور فکر انگیز خیال پیش کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ موجودہ سائنسی ترقی کے بعض نتائج اور علامات بے انتہا دہشت ناک ہیں ایٹم بم ، ہائیڈروجن بم ، مہلک گیسوں اور خونکار شعاعوں کی ایجاد نے تمام انسانیت کے اعصاب پر ہیبت اور ڈر کی کپکپی طاری کر رکھی ہے ۔ علم اور سائنس کی ترقی کا یہ مظاہرہ انسانیت کو فنا کرنے کا ایک یقینی ذریعہ ہے ۔ اس قسم کے مہلک ہتھیار بنانے

والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ھیں کہ اگر انھوں نے دوسروں کا گھر برباد کیا تو خود بھی اس کے ردِ عمل سے محفوظ نہ رہ سکیں گے - ترقی یافتہ اقوام میں آپس کی یہ چپقلش ایک دوسرے کے خلاف دھمکی آمیز بیانات اور پھر خود ھی اپنے دل میں یہ ڈر کہ ھماری تہذیب یا اقتصادی ترقی عنقریب جنگ کی آگ میں بھسم ھوجائے گی - اس وجہ سے یہ ایک دوسرے کے خلاف اسلحہ سازی کے دوڑ میں مصروف ھونے کی باوجود بین الاقوامی امن ، سلامتی اور مہلک ھتھیاروں پر پابندی عائد کرنے کیلئے جرگے اور کانفرنسیں منعقد کرتے ھیں - ایسی دنیا میں اگر امن اور سلامتی کی کیفیت قائم نہ ھو سکے تو انسان آخرکار اپنے بنائے ھوئے مہلک ھتھیاروں سے فنا ھوجائیگا - قرآن کریم میں ارشاد ھوتا ھے :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ

لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِىْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ٥

یہ اپنے ھاتھ کا بنایا ھوا اسلحہ خود اپنے اوپر آزمانا ھوگا - یہ منصب انسان کا نہیں ھونا چاھیے - پشتون قوم کو چاھیے کہ وہ ان تمام خطرات کو خاطر میں نہ لائے اور نہ ان سے ڈرے - اس قوم کی یہ کوشش ھونی چاھیے کہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رھے - عقائد کو کمزور نہ ھونے دے اور اس کی پشتو میں جو رخنے پڑ چکے ھیں اس کو تعلیم و تربیت کے ذریعے از سرِ نو جِلا دے اور اپنے آپ میں وہ علمی اور عملی جوھر پیدا کرے جس کے ذریعے وہ ھر قسم کے آفات و مصائب سے محفوظ رہ سکے - اقتصادی طور پر اسکا پیچھے رہ جانا ھی اس کے کام آئیگا - اس کی سر زمین پر اب تک نہ تو بڑے بڑے شہروں کا وجود ھے ، نہ بڑے بڑے کارخانے تعمیر ھوئے ھیں - اس کے پہاڑوں اور میدانوں کو اگر کوئی ایٹم بموں کا نشانہ بنا بھی دے تو اس قوم کے افراد کو بہت کم اس سے نقصان پہنچے گا - اس لئے ایٹم بم کے خطرے سے زیادہ اس کو فاسد اور باطل سیاسی اور اقتصادی عقائد سے بچنا چاھیے - اشتراکیت (کمیونزم) ھو یا سرمایہ داری (کیپٹل ازم) یا کوئی بھی دوسرا ازم جو دینی عقائد کو کمزور، ایمان کو متزلزل اور اخلاق کو تباہ کرنے کا باعث ھو، لازم ھے کہ یہ قوم اس راہ میں مضبوط بند باندھے - تہذیب و تمدن اور سائنس و ٹیکنالوجی یا اقتصادی و مادی ترقی

کے دعویدار جب ھی اس قوم کی رھنمائی اور اخلاقی جوھر کے ماننے پر مجبور ھوں گے -

میں نے کچھ باتیں ایسی کہیں ھیں کہ بعض ناقد حضرات اگر چاھیں تو یہ اعتراض ضرور کر سکتے ھیں - کہ فاضل کیرو کی کتاب سے بظاھر اس کا کوئی تعلق معلوم نہیں ھوتا - لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ فاضل مصنف نے اپنی کتاب کے آخری حصہ میں پشتون یا پٹھان کے مستقبل کے بارے میں اپنے جو نظریات پیش کئے ھیں ، مجھے اُن سے بطور خاص دلچسپی تھی -

اپنی قوم کے مستقبل کے بارے میں اظہار رائے کا مجھے پورا پورا حق حاصل ھے - تاکہ میں اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق اس کیلئے ایک اونچا و ارفع نصب العین معین کردوں - جس کے واسطے بلند و دور رس فکر و نظر کی ضرورت ھے تاکہ اس نظریاتی وسیع میدان سے گزرتے وقت محقق کو جو نیک و بد نظر آئے ، بطور احوال واقعی، وہ بھی بلا کم وکاست بیان کر دے - بس اسی کو فاضل کیرو کی اس کتاب پر میرے اس مقدمے کے لئے وجہ جواز سمجھ لینا چاھیے -

تاریخ نے پٹھان یا پشتون قوم کے ساتھ ھمیشہ زیادتیاں کی ھیں اور اگر آج میں اُن کی نشان دھی نہ کروں تو خدا جانے پھر کب کسی کو اُن کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملے - یہ زیادتی میری طرف سے ھوگی کہ تاریخ دانوں ، سیاست مداروں اور بعض مذھبی علماء کی سختگیریوں بلکہ بہتان تراشیوں کی جانب توجہ نہ دلاؤں - پشتونوں کے گھر باختر کے متعلق آوستا زبان کی ایک مذھبی کتاب ''مزدستا،، میں لکھا ھے - ''در مزدستا باختر بمعنی آرامگاہِ اھرمن و دیوھا و جائے دوزخ خواندہ شدہ،، - (لغت نامہ دھخدا جزء ب صفحہ ۱۸۵ بحوالہ خورد اوستا تفسیرِ آستاد پور داؤد) یعنی ''باختر شیطانی قوتوں اور دیوزادوں کا گھر ھے - جس کو دوزخ کہتے ھیں،، - اسی مناسبت سے اس شمالی خطے کو آستاد پور داؤد نے ''محل آسیب و نحوست دانستہ اند،، لکھا ھے - کم و بیش تین ھزار سال پرانی ایک مذھبی کتاب کا یہ اقتباس سب سے پہلا ثبوت ھے - جس میں اس قوم کے مسکن کی طرف ایسے ناروا الفاظ میں اشارہ کیا گیا ھے - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہی اثرات تاریخ میں تازہ و قائم رھے ھوں گے ، اسی کے نتیجے میں

آج بھی بعض لوگ بلا کسی ثبوت کے پشتو کو دوزخ کی زبان کہتے ہیں ۔ پشتون ایسی سر زمین پر بستا تھا کہ ہزاروں برس سے دنیا کی مختلف اقوام آ آ کر اس سے لڑتی رہیں ۔ جغرافیائی ہیئت کے لحاظ سے اس خطۂ زمین پر ہر قسم کی آب و ہوا پائی جاتی تھی اور مختلف قسم کی آب و ہوا کی عادی مخلوق کے رہنے بسنے یا کچھ عرصہ گزارنے کیلئے اس میں نہ صرف گنجائش بلکہ کشش بھی تھی ۔ فاضل کیرو نے اس کیفیت کی طرف ایک مشہور محقق ''رونالڈشے،، کے الفاظ میں اشارہ کیا ہے ۔ رونالڈشے نے لکھا ہے کہ ''ایک سرحدی باشندے کی زندگی صعوبتوں سے بھری ہوتی ہے اور اس کی روزمرہ کی مصروفیات کے ڈانڈے ابدیت سے جا ملتے ہیں ۔ ان خامیوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ پستیوں سے ابھرنے والی اونچی نیچی پہاڑیوں کے اس لامتناہی سلسلہ میں کوئی ایسی طاقت پنہاں ہے کہ جن لوگوں کو تقدیر اس علاقے میں لے آتی ہے، ان میں غیرمعمولی جوش و جذبہ پیدا ہوجاتا ہے(۱)،، ۔

مؤرخین نے ایشیاء کے اس حصے کو قدیم اقوام کی گزرگاہ یا چوراہہ (Cross Road) کہا ہے ۔ اس مرکز میں آباد لوگ بلند ہمتی ، محنت کشی اور ایسی ہی چند دیگر مردانہ صفات کے حامل تھے انکو دیو یا دیو ھیکل مخلوق قسم کے الفاظ سے یاد کرنا بڑی حد تک ایک دلکش تمثیل معلوم ہوتی ہے ۔ اس قوم کو کبھی کسی نے زیر نہیں کیا ، ہر ایک نے اس کی غیرمعمولی قوت و ہمت سے استفادہ کیا ۔ لیکن استفادہ کر چکنے کے بعد ہر ایک نے دیو، لٹیرا ، راہزن اور دیو ہیکل وغیرہ جیسے الفاظ اور خطابات کا تمغہ اسکے گلے میں ڈالا تھا ۔ داستان امیرحمزہ سے لیکر اقوال زرتشت تک تمام زیر نہ ہونے والی بہادر مخلوق سے قسم قسم کے شیطانی اوصاف منسوب کئے گئے ۔ اس چوراہے سے گزرنے والی اقوام ، جب یہاں کے عوام کو انکی اپنی مٹی سے کسی صورت بے دخل نہ کر سکیں تو یہاں سے بے نیل و مرام جاتے جاتے اس بہادر اور ناقابل تسخیر مخلوق کیلئے الزاموں اور بہتانوں کا تحفہ چھوڑ گئیں ۔ یہ روایت زندہ رہی یہاں تک کہ ایک منور دور جیسا کہ برِ صغیر میں مغلوں کا دور تھا ، آیا لیکن اس دور میں بھی کسی نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ کونسا ایسا برا اور ذلت آمیز لفظ ہے جو اس

۱۔ یہ حوالہ زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں صفحہ ۴ پر دیکھا جا سکتا ہے ۔

قوم کیلئے استعمال نہیں کیا گیا۔ میں تاریخ پر خوردہ گیری نہیں کرتا۔ لیکن ایک ایسی جری اور بہادر قوم کو جن ناروا اور ناشائستہ الفاظ سے یاد کیا جاتا رہا ہے، وہ حقیقت جتلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ باوجودیکہ ہر فاتح کی فتح و کامرانی اسی قوم کے بازوئے شمشیر زن کی مرہون منت رہی ہے۔ تو یہ بات موجودہ دور کے ایک پٹھان یا پشتون طالب علم کو فطرتاً اچھی نہیں لگے گی۔ میں کسی مؤرخ کی تصنیف یا اس کے نام کا ذکر اس موقع پر ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ قریب قریب ہر مؤرخ نے اپنی طرف سے اسے معاف نہیں کیا۔ میرا اس دور کے مفکرین سے بھی یہی تقاضا ہے کہ وہ دنیا کے تاریخ نویسوں کو اس امر پر مجبور کریں کہ وہ جب نئی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو پشتون قوم کے ساتھ انصاف روا رکھیں، سیاسی یا دوسری کیفیات کے آثار چڑھاؤ کی وجہ سے اس کے شاندار ماضی اور روشن مستقبل کو داغدار نہ بنائیں۔

قدیم مؤرخین کے ذکر کو تو جانے دیجئے، حال ہی میں جب بعض لوگ قلم اٹھا کر کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو احمد شاہ ابدالی اور دیگر مسلمان اکابرین ملت اسلامیہ کو لٹیرے اور رہزن جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ہر شخص کو یہ سن کر دکھ ہوگا کہ فقیر وحیدالدین صاحب نے اپنی کتاب (The Real Ranjit Singh) میں پشتون بادشاہوں، فوجی جرنیلوں اور دیگر اکابرین ملت کو ''غاصب'' اور ''لٹیرے'' جیسے نامناسب خطابات سے نوازا ہے۔ میں نہایت صاف الفاظ میں اس حقیقت کو اسلئے آشکارا کر رہا ہوں کہ یہ قدیم تاریخی یا ملی تعصبات، ملت اسلامیہ کے مستقبل کی تابناکی کیلئے نقصان دہ ہیں۔ اگر کوئی مؤرخ عدل و انصاف سے کام نہیں لینا چاہتا تو کم از کم دوسروں پر کیچڑ تو نہ اچھالے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اگر فاضل کیرو نے بعض پشتون قبائل کی اصل نسل کی تلاش میں انہی فرسودہ اور بے بنیاد روایات و مفروضات سے استفادہ کیا ہے تو اس سلسلے میں ان کو زیادہ قصوروار اس لئے نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ ان کو جو مواد ہاتھ آیا لازماً وہ اسی سے استفادہ کرنے پر مجبور تھے۔ البتہ عدل و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ فاضل کیرو روایات ماضی کے ساتھ ساتھ حال کے بیانات سن لیتے اور جدید تحقیقات کا جائزہ بھی لیتے تو نتائج کے اخذ کرنے میں زیادہ صحیح

راستہ اختیار کر سکتے ۔ اس کی ایک واضح مثال بایزید انصاری کی ذات اور اُس کی تحریک پیش کی جا سکتی ہے جو روایات میں پیر تاریک تھے مگر خیر البیان کی دریافت اور اُس کی اشاعت کے بعد جب مستند حالات محققین کے ھاتھ آجائیں گے تو شاید کہ حقیقت اُس کے برعکس ثابت ھو ۔

لفظ افغان یا کرلانڑی اور غلزئی قبائل کے متعلق جو بیان فاضل کیرو نے سپرد قلم کیا ھے ، میں اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاھتا ۔ اس بارے میں سب سے بڑا الزام درحقیقت خود پشتونوں کے سر عائد ھوتا ھے ۔ کیونکہ اکثر قبائل نے خود ھی ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالی ھے اور تربورولی کے جوش میں خود اپنے ھی بھائیوں اور اعزہ و اقرباء کو بدنام کیا ھے ۔ اگرچہ یہ کیفیت دوسری اقوام کی تاریخ میں بھی کسی حد تک پائی جاتی ھے ۔ لیکن پشتون اس سلسلے میں دوسروں سے کئی قدم آگے ھیں ۔ یہ اسی کا خمیازہ ھے جو ھم بھگت رھے ھیں ۔ جس نے تاریخ کا رنگ ھی بدل کر رکھ دیا ھے ۔ پشتو کہاوت ھے کہ ''چا کڑی ، پخپلہ ۔ گیلہ څہ لہ کړے د بلہ،، یہ کس نے کیا ؟ خود ، تو پھر دوسروں سے کیا گلہ !۔ خود کردہ را علاجے نیست ۔

فاضل کیرو کی اس قلمی کاوش میں بہت کم باتیں ایسی ھیں جس کے متعلق تاریخ کا کوئی انصاف پسند طالب علم اُن سے زیادہ کا تقاضا کرے ۔ بہ حیثیت ایک محقق اور مؤرخ کے انہوں نے پورا پورا حق ادا کر دیا ھے ۔ میرے ایک باریک بیں ساتھی نے مجھ سے کہا کہ تم نے اپنے مقدمہ میں اپنے افکار اور نظریات کو تو جگہ دی ھے ۔ لیکن کیرو کے دھرائے ھوئے واقعات اور بیانات یا تحقیق اور نتائج کے بارے میں بہت کم تبصرہ کیا ھے ۔ مثلاً فاضل کیرو نے لکھا ھے کہ تواریخ حافظ رحمت خانی بڑی مستند اور معلوماتی کتاب ھے ۔ جو فارسی میں لکھی ھے ۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ھے ۔ اگرچہ اس کتاب میں جا بجا فارسی کے جملے اور عبارتیں ضرور آتی ھیں ۔ مگر اس کی زبان پشتو ھے ۔ دوسری مثال ، اُس دور کے سوات کے سلطان اُویس اور ملک احمد خان کی بہن کی شادی اور اُس کی موت کے واقعات کا بیان ھے تواریخ حافظ رحمت خان میں لکھا ھے ''سلطان اُویس نے اپنی اس بیوی کو اس خیال سے قتل کر دیا تھا کہ اس طرح یوسف زئیوں کا سوات آنا جانا رک جائے گا،،۔ لیکن فاضل کیرو نے ملک احمد خان کی بہن

کی موت کو طبعی سمجھا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود فاضل کیرو نے تواریخ حافظ رحمت خانی اچھی طرح نہیں پڑھی - بلکہ شاید صرف راورٹی، بیلیو، برنارڈ ڈورن اور الفنسٹن وغیرہ کے اقتباسات پر اعتماد کیا ہے - اسی طرح شیخ تپور کی اہم جنگ کے محل وقوع کے سلسلے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے -

میں نے ان سے کہا کہ تمہاری یہ بات اور اسی نوع کے دیگر نکتے، ہوسکتا ہے صحیح ہوں - لیکن تاریخ و تحقیق کے میدان میں یہ کیفیت اکثر پیش آتی ہے - اسی لئے میں خود تو اس قسم کی باتوں کا جتلانا لازمی نہیں سمجھتا - البتہ تم یا تمہاری طرح کے کوئی اور باریک بین اگر چاہیں تو اس سلسلے میں لکھ سکتے ہیں - مجھے یقین ہے کہ فاضل کیرو بھی اس قسم کی تحریر سے استفادہ کر سکیں گے اور مجھ جیسے کم بضاعت طالب علم بھی اس کو شوق سے پڑھیں گے -

ناظرین سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ''دی پٹھان'' کے اس آردو ترجمے کے سلسلے میں فاضل کیرو نے بےحد خلوص اور ایثار سے کام لیا ہے - آردو میں ان کی اس مغلق انگریزی عبارت کا ترجمہ جب خود انہوں نے سنا تو وہ اس سے بڑے محظوظ ہوئے - یہ وہ وقت تھا جب فاضل کیرو پشاور میں موجود تھے - پشاور سے رخصت ہونے کے موقع پر انہوں نے بڑے خلوص اور محبت کے ایک خاص جذبے سے میرے مونڈھے کو پکڑ کر مجھ سے کہا - آردو ترجمے کے پہلے ایڈیشن کی رائلٹی آپ اس کے مترجم سید محبوب علی کو بطور حق الزحمت دے دیجئے - اس کے ساتھ ہی انہیں نے کہا، نہ میں اور نہ سر ایویلن ہاول ہی خوشحال خان خٹک کے منتخب کلام کے انگریزی ترجمہ سے ذاتی طور پر کوئی منفعت لینا چاہتے ہیں - ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کتاب کی رائلٹی سے آپ دو پشتون طالب علموں کو یا تو وظیفہ دیں یا پھر ایسے دو طالب علموں کو تمغے دیں جو خوشحال خان پر کوئی تحقیقی کام کریں - ورنہ امتحان میں نمایاں کامیابی پر بطور انعام یہ رقم دے دیں -

اس کے علاوہ سر اولف نے انگلستان میں بیٹھے بیٹھے اس کتاب کے ترجمے اور طباعت کے سلسلے میں برابر ہم سے رابطہ قائم کئے رکھا - کبھی خط و

کتابت کے ذریعہ اور کبھی کسی آئے گئے دوست کی زبانی - اکثر ایسا بھی ہوا کہ اگر میری طرف سے جواب میں دیر ہوئی (یا جواب نہیں دیا گیا) تو انہوں نے اپنے کسی دوست کو لکھ بھیجا کہ ''مولانا،، نے تو جواب نہیں دیا - لیکن آپ مہربانی کر کے ذرا تحقیق کر لیجئے اور بواپسی مجھے مطلع کر دیجئے - اس ضمن میں سردار عبدالرشید خان (سابق وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان) خان بہادر شاہ عالم خان (سابق ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات صوبہ سرحد) اور جسٹس شیخ عبدالحمید (پرنسپل لاء کالج ، پشاور یونیورسٹی) سے فاضل کیرو کبھی کبھی پوچھ لیتے تھے - خان بہادر شاہ عالم خان اور شیخ عبدالحمید سے تو فاضل مصنف نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ آردو ترجمے پر نظر ثانی بھی کر دیں - اکیڈیمی کے ایک ممبر قاضی ہدایت اللہ کے ساتھ بھی سر اولف نے ترجمے کے تقابل اور ہئیت وغیرہ کے سلسلہ میں برابر خط و کتابت جاری رکھی - اس کے ساتھ ھی فاضل مصنف نے پشتو اکیڈیمی کی طرف سے اس کتاب کے ناشرین یعنی میکملن اینڈ کمپنی کے ساتھ بھی گفت و شنید کی - میکملن اینڈ کمپنی کے ارباب حل و عقد نے بڑے خلوص سے ھماری مدد کی - یہاں تک کہ ''دی پٹھان،، کی جلد پر چھپی ہوئی ڈائی کا بلاک بھی آردو ایڈیشن میں استعمال کرنے کیلئے ھمیں بھیج دیا - انگلستان جیسے دور دراز ملک سے ھمارے لئے بلاک کا بھجوانا بلاشبہہ ان کے کمال اخلاص ، رواداری اور ھمکاری کا بین ثبوت ھے - تجارتی لحاظ سے بھی میکملن اینڈ کمپنی نے ھمیں بہت زیادہ رعایت دی ھے - اصل انگریزی کتاب کی کاپی رائٹ کی حفاظت کے خیال سے ایک معمولی رقم ھم سے طلب کی گئی - اتنی کم رقم کہ کل پچھتر روپے ! اس لحاظ سے سر اولف ، آن کے خوبصورت وطن کے علم دوست اداروں ، کتب خانوں ، برٹش کونسل اور برٹش میوزیم اور میکملن اینڈ کمپنی کی ھمکاری اخلاص رواداری کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی -

کتاب کے مترجم سید محبوب علی نے بڑی محنت سے ترجمہ کیا ھے - اردو آن کی مادری زبان ھے اور لڑکپن لکھنؤ میں گزارا ھے - بحیثیت ایک صحافی اور مترجم کے طویل تجربہ حاصل ھے - باوجود اس کے بھی اصل انگریزی متن کی بعض مغلق عبارتوں کے ترجمے کا وہ معیار قائم نہیں رہ سکا ھے ، جو پشتو اکیڈیمی اپنی مطبوعات کے سلسلے میں ھمیشہ پیش نظر رکھتی ھے - اشخاص ، مقامات اور بعض تاریخی ناموں میں جگہ جگہ سہو

ہو گئی ہے ، کہیں کہیں لفظی ترجمہ بھی غلط ہوا ہے ۔ ایسی فروگذاشتیں ترجمہ کرتے وقت ہو ہی جاتی ہیں ۔ لیکن وسیع القلب عالم اور نیک دل مؤرخ مسکرا کر اس قسم کی غلطیوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں ۔ سید محبوب علی نے بڑی تندہی اور گرمجوشی سے ترجمے کا کام سر انجام دیا ۔ لیکن جب اشاریہ (انڈکس) مرتب کرنے کی نوبت آئی تو بیچارے دل چھوڑ بیٹھے ۔ باوجود تقاضوں پر تقاضوں کے وہ تاریخیں ہی بدلتے رہے اور ان سے یہ کام نہ بن پڑا ۔ درحقیقت یہ کام ہے بھی بڑا مشکل ، اس کی دقتوں کا اندازی کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کو کبھی کسی کتاب کا اشاریہ مرتب کرنے کا تجربہ ہوا ہو ۔ بالآخر یہ کام اکیڈیمی کے ممبروں کو خود ہی ہاتھ میں لینا پڑا ۔ کتاب کی طباعت کی تاخیر کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے ۔ اگرچہ وقت زیادہ لگا اور ہمارے کئی کام کے آدمی مہینوں اس میں مصروف رہے ، لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اپنی کتابوں کے اشارئیے مرتب کرنے کا تجربہ بھی حاصل ہو گیا ۔

کتاب کے متن کے ساتھ ترجمے کے تقابل کا کام اکیڈیمی کے ایک ممبر قاضی ہدایت اللہ کے ذمے تھا ۔ انہوں نے سید محبوب علی کے ساتھ ملکر بڑی کاوش سے ترجمہ کو نوک پلک سے درست کرنے میں مدد دی ۔ جو قابلِ ستائش ہے ۔ اتنی ضخیم کتاب کی طباعت کے سلسلے میں اکثر کافی دشواریاں پیش آتی ہیں ۔ ان دشواریوں کا اندازہ بھی نشر و اشاعت کا کام کرنے والے ہی لگا سکتے ہیں ۔ پروف کا بار بار پڑھنا غلطیاں نکالنا ، ان کی اصلاح کرنا کافی محنت اور تجربے کا کام ہے جو سیف الرحمان نے سر انجام دیا ہے ۔ سیف الرحمان ایک محنت کش اور اپنے کام میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے ذوق کا نوجوان ہے ۔ اس نے پروف پڑھنے میں کافی محنت سے کام لیا ہے ۔ اس کے باوجود کتاب پڑھتے وقت ناظرین کو کچھ غلطیاں ضرور نظر آئیں گی ۔ اس لئے میں ایک طرف تو اس کی محنت کی ستائش کرتا ہوں لیکن دوسری طرف پڑھنے والوں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس قسم کی غلطیوں پر از راہ کرم چشم پوشی سے کام لیں گے ۔ سیف الرحمان نے کتاب کے آخر میں ایک مختصر سا اغلاط نامہ اسی وجہ سے شامل کر دیا ہے ۔

جیسا کہ پہلے میں عرض کر چکا ہوں ایک اتنی ضخیم کتاب کے ترجمہ، تقابل ، تصحیح اور اشاریہ بنانے نیز مطالب پر بحث کرنے کا کام ایک آدھ

شخص کیلئے مشکل کام تھا ۔ محمد نواز طائر نے کتاب کے مطالب پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور کئی مقامات پر بڑے اچھے نکتے نکالے ۔ جو میرے لئے کافی فائدہ مند ثابت ہوئے ۔ طائر نے یہ بات تسلیم کی کہ ''اگرچہ اس کتاب کو بغور مطالعہ کرنے اور مطالب پر سوچ بچار کا کام کافی مشکل تھا لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس مشکل کام کا عوض مجھے تاریخ کے نکتوں کو سمجھنے اور بالخصوص پٹھانوں کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں اور باریکیوں کو سمجھنے کی شکل میں مل گیا ۔ اس کی برکت سے مجھے بےشمار تاریخی دستاویزات اور کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا ''۔ طائر نے یہ بھی کہا کہ ''اس مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ سر اولف کیرو نے پشتون ، پٹھان یا افغان تاریخ کے ایک پھیلے ہوئے میدان کو عبور کرنے کیلئے کتنی جگرسوزی اور کاوش سے کام لیا ہے اور جب آپ فاضل کیرو کی اس کاوش کے سلسلے میں ممنونیت کا اظہار کریں تو میری طرف سے بھی اُن کے کام کی تعریف میں چند الفاظ شامل کر دیجئے ''۔

میں نے فاضل مصنف کی تحقیق، کاوش، پشتونوں یا پٹھانوں سے محبت اور کوشش کا ذکر اس مقدمہ میں دوسرے موقع پر کیا ہے لیکن طائر کے ذکر کے سلسلے میں اچانک مجھے یاد آیا کہ فاضل کیرو کے اس ذاتی کمال اور علمی دنیا پر احسان کا بطورِ خاص ذکر کرنا لازمی ہے ۔ پشتون قوم کی قدیم تاریخ جو بمصداق اس گتھی کے ہے جس کے سر پیر کا پتہ نہیں چلتا ۔ اگر تار کا ایک سرا کہیں مل جاتا ہے تو ذرا آگے چل کر وہ پھر ایسا اُلجھ جاتا ہے کہ سلجھنے کا نام نہیں لیتا اور صحرا میں بہتے ہوئے اس پانی کی طرح جو بہتے بہتے اچانک زمین میں غائب ہو جائے کچھ فاصلے پر نکل آئے اور پھر غائب ہو جائے ۔ فاضل مصنف نے گتھی کا سرا کہیں پر گمنے نہیں دیا اور ۱۹۵۵ء تک اس کو صحیح سلامت پہنچا کر ہی دم لیا ۔ دوسری بات یہ کہ سر اولف نے پشتون یا پٹھان کے تاریخی کردار ، اس کے صحیح چہرے اور اس کے خد و خال کو مستند اور صحیح انداز میں پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے ۔ یہ بات واقعی ممنونیت اور شکر گزاری کی ہے کہ انہوں نے ایک ایسی قوم کی ، جس پر اپنے اور پرائے ہمیشہ کیچڑ اُچھالتے رہے ہیں ۔ نہ صرف صفائی کی ہے بلکہ اس کو صیقل بھی کیا اور خود مؤرخین کی اپنی تحقیقات اور اقوال کی روشنی میں پشتون کو دنیا کے سامنے اصلی روپ اور حقیقی رنگ میں لا کھڑا کیا اور اس کے کردار پر لگائے ہوئے

داغ دھبے جو مدتوں سے چلے آرہے تھے دھو ڈالے - میں سر اولف کے اس علمی کارنامے کا بے انتہا احسانمند ھوں - اگرچہ میں نے اس مقدمے میں اپنی دیانتدارانہ اختلافِ رائے کا اظہار کرتے وقت سر اولف سے کوئی رعایت نہیں برتی - لیکن اختلافِ رائے کی اپنی جگہ ھے اور کسی کی کاوشوں کا عوضِ دینا یا اعتراف کرنا الگ بات ھے - ایک دیانتدار طالب علم سے یہی توقع رکھنی چاھیے -

اشاریہ کا کام جیسے کہ قبل ازیں میں عرض کر چکا ھوں دل تھکا دینے اور حوصلہ پست کر دینے والا کام ھوا کرتا ھے - اس کام میں اکیڈیمی کی مطبوعات کی شاخ کے انچارج خیال بخاری اور ان کے ساتھیوں قاضی ھدایت اللہ اور مشتاق احمد نے کافی حد تک ھاتھ بٹایا - لیکن اس کام کا اصل بوجھ سیف الرحمان ، طائر اور پور دل خٹک کے ذمہ تھا - اکیڈیمی کے لائبریرین محمد اسحاق نے بھی خاموشی سے اتنا کام کیا کہ اکثر بیمار ھو جانے تک نوبت آجاتی تھی - اکیڈیمی کے پاک نویس میاں سناء الدین نے بھی سیف الرحمان کے ساتھ بڑی مدد کی اور اشاریہ کے اُردو متن کو بار بار صاف لکھنے میں ھاتھ بٹایا -

یہ مقدمہ جو آپ پڑھ رھے ھیں اس کا اصل متن پشتو ھے - اس کا اُردو میں ترجمہ سیف الرحمان نے کیا اور ترجمے کی اصلاح اور درستی اکیڈیمی کے شعبۂ تحقیق کے انچارج سید انوارالحق نے کی - خیال بخاری شعبۂ مطبوعات کے انچارج نے تاریخی حوالوں کی تحقیق و تلاش میں میرا ھاتھ بٹایا - بہ حیثیت ممبران اکیڈیمی بیشک ان تمام حضرات کا یہ خیال نہ ھوگا کہ میں ان کے کام کا ذکر کروں یا ان کے کئے ھوئے کاموں کو یہاں دھراؤں ، لیکن ایمانداری کی بات یہ ھے کہ میں محسوس کرتا ھوں کہ ان تمام نے اکیڈیمی کی اس خاکسارانہ کوشش میں مجھ سے بڑھ چڑھ کر کوشش کی - اخلاقاً میں اپنے آپ کو جوابدہ سمجھوں گا اگر میں کسی اھل کار کے کام کی تعریف اور اس کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا نہ کروں -

میں ''خیبر میل پریس'' کے مالک شیخ ذکاء اللہ اور ان کے عملے کے تمام کارکنوں کا بھی یہاں ذکر کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں ۔ ہمارے اس گرد و پیش میں ایک اتنے بڑے کام کو ہاتھ میں لینے کیلئے (جہاں وسائل محدود اور ذرائع کم ہیں) واقعی بلند ہمت اور جذبہ ایثار کی ضرورت تھی ۔ شیخ ذکاء اللہ نے ہمارے ساتھ ملکر بذات خود بڑی محنت سے یہ کام کیا ہے ۔ حق تو یہ ہے کہ شیخ صاحب نے اکیڈیمی کی مختلف مطبوعات کے سلسلے میں بھاگ دوڑ بھی کی ہے ۔ بڑی سے بڑی رقم بھی خرچ کی ہے اور ممکن حد تک ہمارے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا کرنے سے دریغ نہیں کیا ۔ طباعت و اشاعت کے اس کام میں جس ذوق و شوق سے شیخ صاحب نے ہمارا ہاتھ بٹایا ۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ ایک کاروباری ادارہ کے مالک نہیں بلکہ اکیڈیمی کے سٹاف کے ایک ممبر ہیں ۔ میں شیخ صاحب کے اخلاص و ایثار کیلئے دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے جذبۂ اخلاص و ایثار کو اسی طرح قائم رکھے ۔

مجھے یقین ہے کہ اس اہم تاریخی دستاویز کا حشر وہ نہ ہوگا جو ہماری دوسری مطبوعات کا ہوتا ہے ۔ مملکتِ خدا داد پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہے ۔ حکومت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اُردو کو پاکستان میں وہ مقام جلد ملنا چاہیے جس کی وہ مستحق ہے ۔ بلا شبہہ یہ ادارہ پشتو اکیڈیمی کے نام سے مشہور ہے ۔ لیکن اکیڈیمی کا بنیادی کام علوم و فنون کا احیا اور تجدید ہوتا ہے ۔ اس لئے نہ تو پشتون ہمیں اس بات پر ٹوکیں کہ کیوں اکیڈیمی نے اُردو کی کتاب چھاپی ہے اور نہ ہی اُردو والے ہماری اس کاوش کی بےقدری کریں ۔ مجھے اُمید ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں، اس اہم تاریخی دستاویز کو ملّی زبان میں قوم کے سامنے پیش کرنے کو قوم کے دور و نزدیک حصوں میں ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا کرنے کا باعث سمجھیں گی ۔ ہم نے اس سے قبل بھی اُردو میں کتابیں شائع کی ہیں اور آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ شائع کریں گے ۔ لیکن ہمارا یہ گلہ جبھی رفع ہوگا

جب حکومت اور ملت ہماری ان محنتوں اور کاوشوں کو قدر و استحسان کی نظر سے دیکھے اور سراہے اور پشتو اکیڈیمی کی بھرپور مدد کرے۔

مقدمہ طویل ہوگیا ہے۔ جن مطالب کا اس میں ذکر ہوا ہے یا جو نظرئیے زیرِ بحث آئے ہیں ناظرین کی سہولت کی خاطر میں ان کا خلاصہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ امید ہے قارئین کیلئے بار خاطر نہیں ہوگا۔

انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا محض اس غرض سے ہے کہ یہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ جس میں تاریخ کے اعتبار سے پوری قوم کو، جس میں سب اردو دان اور خصوصاً پٹھان قبیلہ شامل ہے، کو یہاں کے عوام کا تاریخی پسِ منظر آسانی سے معلوم ہوسکے۔

اس مقدمہ میں لفظ پٹھان، پشتون اور افغان کا مختصر تجزیہ ہوا ہے مدعا یہ تھا کہ اگرچہ یہ تینوں الفاظ عوام میں ہم معنی سمجھے جاتے ہیں لیکن ان میں جو فرق ہے۔ اس کو واضح کیا جائے۔

پشتو زبان، پشتون ثقافت، تہذیب و تمدن کے متعلق میں نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے میرے عقیدے کے مطابق، پشتون نہ آریا ہیں، نہ سامی اور نہ منگولوں سے ان کے ڈانڈے ملانا درست ہے۔ پشتون ان سب سے قدیم ایک قوم ہے۔ اس طرح اس کی اصل نسل اور زبان بھی ما قبل التاریخ کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر وسط ایشیا بنی نوع انسان کی پیدائش اور تہذیب کا گہوارہ ہے، تو پشتون قوم، ان کی زبان اور ان کی تہذیب کو بھی لازماً تمام نسلوں اور زبانوں سے قدیم ہونا چاہیے۔ یہ بھی ہمیں ماننا پڑیگا کہ گرد و نواح میں پھیلے ہوئے لوگ چاہے وہ آریا کہلائیں یا سامی یا کچھ اور، بہرحال وہ یہیں سے اور انہی سے پھیلی ہوئی نسلیں ہیں۔

میں نے یہ عقیدہ بھی پیش کیا ہے کہ پشتون ایک خاص فلسفۂ حیات کا حامل ہے، جس کو میں نے فلسفۂ پشتو کہا ہے۔ یہ فلسفۂ پشتو اور

اسلامی نظریہ حیات قطعاً ایک ہی چیز ہے - اس وجہ سے پشتون قوم کو شروع سے اسلام میں دراصل اپنا ہی فلسفۂ حیات نظر آیا - اس وجہ سے اس نے اسلام کو اس طور سے قبول کیا کہ پشتون، افغان یا پٹھان آج بغیر مسلمان کے اور کچھ متصور ہی نہیں - میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ پشتونوں ، افغانوں یا پٹھانوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا اور آج تک وہ اس پر قائم ہیں - کیونکہ اس میں فرق واقع ہونا اُن کے پشتونی اخلاق اور فلسفے کو چھوڑنے کے مترادف ہوگا - (پشتون سب کچھ کرتا ہے لیکن اپنی پشتو کو بہرصورت برقرار رکھتا ہے) -

میں نے اس عقیدے کا اظہار بھی کیا ہے کہ اس قوم کی نسلی اور لسانی قدامت اور اس کا فلسفۂ حیات یا فلسفۂ پشتو اس امر کا متقاضی ہے کہ اگر اس قوم کی جس کی، قوتِ نمو ابھی صحیح و سالم ہے - اسلامی اصولوں کی روشنی میں تربیت ہو جائے تو یہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیائے اسلام کیا کہ عام عالم انسانیت کی اور دنیا کی آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرسکے گی -

(مولانا) عبدالقادر

۸- مئی ۱۹۶۷ء

ڈائرکٹر پشتو اکیڈیمی

یونیورسٹی آف پشاور

دیباچہ

یہ وہ کتاب ہے جس کا لکھنا میرے لئے ناگزیر تھا کیونکہ میری نصف زندگی پٹھانوں میں گزری ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا یادیں دھندلی ہوتی گئیں اور عزم کمزور ہوتا گیا۔ اس عزم کے دوبارہ زندہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس معاملہ میں حکومت پاکستان نے پہل کی، اور از راہ اخلاص مجھے جانے پہچانے مقامات دوبارہ دیکھنے، پرانے دوستوں سے ملنے اور نئے دوست بنانے کا موقع دیا۔ اور اس طرح میں نے تیس سال سے زائد عرصے میں جو تاثرات لئے تھے اور جو معلومات حاصل کی تھیں میں انھیں نئے پیش منظر کے ساتھ مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس تحریر کی پوری ذمہ‌داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ جو بھی رائے قائم کی گئی ہے اور جس بات پر بھی زور دیا گیا ہے وہ بلاشرکت غیرے میری اپنی ذمہ‌داری ہے۔

سفر طویل ہے اور بیشتر راستہ ایسا ہے جس پر مجھ سے پہلے کوئی نہیں گزرا۔ مثال کے طور پر میں نے پٹھانوں کے اسلام لانے سے پہلے جتنی صدیوں کی تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی ہے ان کی تعداد بعد کی صدیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر کہیں کہیں مضمون پر گرفت کمزور ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک محقق کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ڈھائی ہزار سال کے پورے عرصہ پر حاوی ہونے کے لئے تمام متعلقہ زبانوں اور اس بحر کے شناساؤں سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔

زمانۂ قبل اسلام اور ابتدائی اسلامی صدیوں کے بیان میں مجھے ڈاکٹر اے۔ ڈی۔ ایچ۔ بیوار کی مخلصانہ مدد حاصل رہی ہے۔ جو کسی زمانے میں میرے اے ڈی سی تھے اور کچھ عرصے کارپس کے سکالر رہ چکے ہیں

اور آج کل کرائسٹ چرچ آکسفورڈ میں قدیم تاریخ کے ریسرچ لیکچرار ھیں - ان کی گہری دلچسپی اور ماھرانہ علمیت کے بغیر کتاب کا یہ حصہ اتنی وضاحت کے ساتھ قلمبند نہیں کیا جا سکتاتھا۔ میں ان کی مدد سے بہت سی یونانی، عربی اور فارسی عبارتوں کا مطلب اخذ کرنے، اور ان کے ساتھ سکوں اور کتبوں کے مطالعہ کے نتائج منطبق کرنے میں کامیاب ھوا ھوں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی (جیسا کہ ان کی بھی خواھش ھوگی) جو بھی رائے قائم کی گئی ھے وہ میری اپنی ھے جو ھر حالت میں علمی تنقید کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی اعتراض ھوا تو میں یہی عذر پیش کرونگا کہ اول تو میں اس علم کا خصوصی ماھر نہیں ھوں اس کے علاوہ میں یہ عزم کر چکا ھوں کہ جزئیات اتنی تفصیل کے ساتھ بیان نہ کروں کہ اصل تصویر ھی نظروں سے اوجھل ھوجائے۔

میں رسمی شکریہ سے کہیں زیادہ خلوص نیت سے جن لوگوں کا شکر گزار ھوں ان میں یہ لوگ شامل ھیں۔ میرے دوست ایویلین ھاول جن کی پہلی تصنیف (میز) کی بنیاد پر میں نے وزیرستان کے قبائل کے بارے میں اپنا تذکرہ مکمل کیا ھے - رالف گرفتھ جو پختون ولی کا مفہوم سمجھتے تھے اور سر جارج کننگھم جو دس سال تک پشاور میں گورنر رھے جنھوں نے پوری کتاب قلمی شکل میں پڑھی اور اسے ایسی تنقید سے نوازا جو پڑھنے والے کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرتی۔ مجھے ایسے بہت سے پٹھانوں سے واسطہ رھا ھے جو روایات اور دانشمندی کا مجسمہ ھیں - ان میں ''ستانا،، کے سید عبدالجبار شاہ جو ۱۹۵۶ء میں فوت ھوگئے اور اکوڑے کے بڑے میاں محمد زمان خان شامل ھیں جو سب سے مشہور پٹھان شاعر کی اولاد میں سے ھیں۔

میں پشاور کے کمشنر مسرت حسین زبیری صاحب اور راجر بیکن اور ان کے مردان کے سٹاف کا شکر گزار ھوں جنھوں نے اس پٹھان شاعر کے مطالعہ میں میری مدد کی۔ میں پاکستان کے ھائی کمشنر مقیم لندن جناب اکرام اللہ صاحب کا بھی شکر گزار ھوں کیونکہ انہوں نے تاریخ کے بعض تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور مشکلات اور شکوک میں برابر میرا حوصلہ بڑھاتے رھے۔

ایک طرح سے یہ کتاب وہ چنگاری ہے جو ایک صدی تک پٹھانوں اور انگریزوں کے باہمی تصادم اور ربط کی وجہ سے وجود میں آئی۔ اگر یہ تصنیف پٹھان مصنفوں کو پسند آئے اور انہیں اس مثال کی تقلید پر اکسا سکے تو میں سمجھونگا میرا کتاب لکھنے کا اصل مقصد پورا ہو گیا ہے۔

سٹیننگ، سسیکس — اولف کیرو

مئی ۱۹۵۷ء

نوٹ:

جو لوگ صوبۂ سرحد سے ناواقف ہیں ان کے لئے پٹھانوں کے قبائلی ڈھانچے کو سمجھنا مشکل ہے اس کتاب کے آخر میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں قبائلی حدود اور محلات وقوع دکھائے گئے ہیں۔

ان بہت سے حکمراں خاندانوں کے نام اور عہد جو اس علاقہ پر حکومت کر چکے ہیں یورپی قارئین کے لئے بالکل نامانوس ہیں اور زمانہ قبل از اسلام کے نام مسلم قارئین کے لئے نامایوس ہیں۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ حکمرانوں کا گوشوارہ (الف) بھی کتاب میں شامل کردوں۔

چند مواقع کے سوا عبارت پر اعراب نہیں لگائے گئے تاکہ صفحات صاف ستھرے معلوم ہوں۔ جو حضرات اس سلسلے میں زیادہ چھان بین کے خواھشمند ہیں انہیں اشاریہ سے مدد مل سکتی ہے۔ مشہور مقامات کے لئے انگریزی میں مروجہ ھجے استعمال کئے گئے ہین مثلاً اٹک، دھلی، قندھار، ایک جگہ کے سوا جہاں یونانی عبارت کی پابندی کا سبب واضح ہے یونانی نام لاطینی انداز میں لکھے گئے ہیں ایک استثناء اور بھی ہے اور وہ ہے سر آریل اسٹین کی یاد میں اورناس (AORNOS)

اس کتاب کی جلد پر مہر کا نمونہ انڈین جنرل سروس میڈل سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس میں خیبر کی پہاڑیوں کے پس منظر کے ساتھ قلعہ جمرود دکھایا گیا ہے۔

مقدمه

پٹھانوں کے ساتھ رہنے میں عجب دلکشی ہے اس تاثر کو ٹھوس شکل دینے اور بیان کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں لیکن یہ ایسا تاثر نہیں جو بہ آسانی گرفت میں آسکے۔ صوبہ سرحد کی گہری اثر آفرینی کا ایک راز اس وسیع ماحول میں پنہاں ہے جس میں پٹھان اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ماحول آب و ہوا کی اچانک اور گہری تبدیلیوں کی وجہ سے بڑا واضح ہے کبھی کبھی یہ ماحول روح پر بھیانک اور تکلیف دہ اثر چھوڑتا ہے۔ مثلاً جان گداز گرمی، پشاور کے میدان کی آندھیاں، اور خیبر، یا وزیرستان کی کٹی پھٹی پہاڑیاں۔ لیکن عام طور پر ایسی خوبصورتی کا تاثر پیدا ہوتا ہے جو اس سے پہلے گزرے ہوئے روکھے پھیکے ماحول کے برعکس اپنی وضاحت اور تضاد کی وجہ سے ناقابل بیان ہے۔ اس ماحول کا تانا بانا ان لوگوں کے رگ و پے میں سمویا ہوا ہے جو یہاں رہتے ہیں اس ماحول میں بہت کچھ شدت بھی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ پوری تصویر اتنی بھرپور ہے کہ انسان حیرت سے دم بخود رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی شدت احساس سے اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔

رونالڈشے(۱) نے لکھا ہے کہ'' ایک سرحدی باشندے کی زندگی صعوبتوں سے بھری ہوتی ہے اور اس کی روزمرہ کی مصروفیات کے ڈانڈے ابدیت سے جا ملتے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ پستیوں سے ابھرنے والی اونچی نیچی پہاڑیوں کے اس لا متناھی سلسلہ میں کوئی ایسی طاقت پنہاں ہے کہ جن لوگوں کو تقدیر اس علاقہ میں لے آتی ہے ان میں غیر معمولی جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا ہے،،۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک عام انسان بھی جو گردو پیش پر گہری نظر ڈالنے کا عادی نہیں ہوتا یہی محسوس کرتا ہے۔

---

(۱) RONALDSHAY موجودہ LORD ZETLAND کا نام ہے۔ یہ حوالہ انکی تصنیف سے ہے جس کا نام ہے INDIA, A BIRD'S-EYE VIEW

لیکن اس کا ماحول اس قسم کا بن جاتا ھے۔ کہ وہ روح میں بالیدگی محسوس کرتا ھے۔ وہ بالیدگی جو شاندار مناظر قدرت کے درمیان تنہائی کی پیداوار ہوتی ھے۔ اس قسم کے تجربے کو صوبہ سرحد کی اثر آفرینی میں بڑا دخل ھے۔

لیکن یہ خطہ اس کے مکینوں کے لئے بنایا گیا ھے، نہ یہ کہ مکین خطہ کے لئے بنائے گئے ھیں۔ کیونکہ ایک نووارد جس کے پاس دیدۂ بینا اور گوش ہوش نیوش ھے، جب بھی راولپنڈی سے تھوڑی دور شمال میں درۂ مارگلہ سے گزرا ھے۔ اور اٹک کا بڑا پل پار کرنے کے لئے آگے بڑھا ھے اس کے دل میں ایک ولولہ پیدا ہوا ھے اور اس پر یہ حقیقت روشن ہو گئی ھے، کہ کام کتنا ھی دشوار اور پرخطر کیوں نہ ہو وہ ایسے لوگوں میں آگیا ھے جو اس سے آنکھ ملا سکتے ھیں اور اسے یہ محسوس کرا سکتے ھیں کہ وہ اپنے ھی گھر آگیا ھے۔ لیکن انگریزوں کے ساتھ ایکسو سال سے زیادہ عرصے کے قریبی ربط کے باوجود پٹھان پوری دنیا کے لئے اور خود اپنے لئے ایک معمہ بنا ہوا ھے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے اور اس کے وطن کے بارے میں بہت کچھ کہا ھے، اور لکھا ھے۔ لیکن یہ مشکل سطح کو کھرچا گیا ھے۔ ابھی کافی گہرائی میں جانے کی ضرورت ھے۔ حقیقت یہ ھے، کہ پٹھانوں کی تاریخ کبھی منظرعام پر نہیں لائی گئی۔ اس سلسلے میں قبائلی روایات، قصے، کہانیاں اور حکایتیں ملتی ھیں۔ پٹھان سپہ سالاروں اور بادشاھوں نے اپنے وطن سے دور جو کارنامے انجام دئے ھیں، جن میں دھلی کی بادشاھت کا حصول بھی شامل ھے۔ ان کی وسیع تفصیلات موجود ھیں۔ درانیوں کی ڈانوا ڈول افغان سلطنت بھی موجود ھے لیکن اسے قائم ہوئے صرف دو سو سال گزرے ھیں، اور یہ طویل کہانی میں ایک چھوٹے سے واقعہ کی حیثیت رکھتی ھے۔ پٹھان صدیوں سے بر صغیر اور خراسان کے درمیان تنگ سر زمین میں اس مقام پر موجود رھے ھیں جہاں بڑی بڑی تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرائی ھیں اور ایک دوسری کا سامنا کیا ھے ان کے پہاڑی مکانوں پر فاتح فوجوں نے ساحل سے سر پٹکتی ہوئی سمندری موجوں کی طرح بار بار یورش کی ھے۔ اگر چہ فاتح بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کے لئے اس راستے سے گزرے ھیں لیکن پٹھانوں کو جو دربان کی حیثیت رکھتے ھیں ظاھری تنا سب کے ساتھ اپنی تاریخ پر نظر ڈالنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ پٹھانوں کے اپنے وطن

کی کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جسے دور جدید میں مسلسل تاریخ کہا جائے۔ ایسی تاریخ خود پٹھانوں نے اور نہ ان میں سے کسی نے لکھی جو اتنی صدیوں کے دوران میں اس علاقہ سے گزرے ہیں۔

مثال کے طور پر افغان اور پٹھان میں کیا فرق ہے۔ وہ کون ہیں اور کیا ہیں اور ان کی اصل کیا ہے؟ گزشتہ صدیوں میں ان کی معاشرتی اور سیاسی تنظیموں کی کیا نوعیت تھی اور کیا وہ ایک مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں؟ ان کی زبان اور ان کا ادب کیا ہے؟ اور انھوں نے ان طاقتوں اور ریاستوں کا کس طرح سامنا کیا، جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ان پر دباؤ ڈالا۔ وہ ماضی میں واقعات پر کس حد تک اثر انداز ہوئے اور مستقبل کے بارے میں ان کی امنگیں کیا ہیں؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے سوالات ہیں جو ابھی تک جواب طلب ہیں۔ میں یہاں قبل از وقت نتائج پر پہنچنا نہیں چاہتا۔ جوں جوں تاریخ بیان ہوگی۔ امتیازات اور تعریفیں خود بے نقاب ہوتی جائیں گی۔ لیکن میں پٹھان اور افغان کی اصلاحیں جن مواقع پر استعمال کرونگا ان کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے کیونکہ یہ لوگ خود بھی ان دونوں لفظوں کو عام طور پر مترادف ہی سمجھتے ہیں۔

جب اس قوم کی اصل پر کھنے کا وقت آئیگا تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف کھلے میدانوں اور مرتفع علاقوں میں بسنے والوں اور دوسری طرف پہاڑیوں پر رہنے والوں کے درمیان واضح امتیاز موجود ہے۔ اول الذکر کو ہمیشہ پوری نسل کی پہلی شاخ قرار دیا جاتا رہا ہے، اور وہ خاص طور پر افغان کہلانے کے مستحق ہیں۔ پھر انہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ مغربی افغان جن میں سے اہم ترین ابدالی (جو اب درانی کے نام سے مشہور ہیں) اور غلجی یا غلزئی اور ۲۔ مشرقی افغان یعنی یوسف زئی اور ان کے قرابت دار قبیلے جو پشاور کے میدان اور اس کے شمال کی وادیوں میں رہتے ہیں۔

تاریخ میں مغربی افغانوں نے کچھ فارسی اثرات قبول کئے ہیں، یہاں تک کہ ان کی زبان پر بھی فارسی کا اثر نمایاں ہے۔ ان کا رابطہ اور تعلق ایران کی صفوی بادشاہت کے ساتھ رہا ہے اور ہرات اور قندھار

ان کے ثقافتی مرکز رہے ہیں۔ مشرقی افغانوں نے جنہیں الفنسٹن (۱) اور دوسرے ابتدائی مصنفوں نے ''بر دورانی،، لکھا ہے فارسی روایات کا بہت کم اثر قبول کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق مغل بادشاہت سے رہا ہے جو دارالحکومت دہلی سے پشاور اور کابل پر حکومت کرتی تھی۔ لیکن مشرقی اور مغربی افغان مساوی طور پر افغان لقب کے حقدار ہیں جس کا مفہوم موجودہ افغان مملکت کے باشندہ سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہ مملکت تو صرف ۱۷۴۷ء میں قائم ہوئی ہے۔

مشرقی اور مغربی افغانوں کے درمیان اور ایک حد تک دونوں کو ایک دوسرے سے علحدہ رکھنے کے لئے پہاڑی قبائل آباد ہیں۔ ان میں سرحد کے بیشتر مشہور قبیلے شامل ہیں یعنی آفریدی، خٹک، اورک زئی، بنگش، وزیر، محسود، توری۔ یہ سب نام بے شمار یادوں میں زندہ ہیں۔ ان قبائلیوں کی بولیاں ایک حد تک مشترک ہیں (۲) اور خاندانوں کے متعلق روایات میں ان سب کو ایک لاوارث بچے کرلانی کی اولاد بتایا جاتا ہے جو صحیح افغان نسل سے نہیں تھا۔ یہ لوگ بدیہی طور پر پختون (۳) یا پشتون ہیں۔ یہ وہ قبیلے ہیں جنھوں نے پوری تاریخ میں کسی شہنشاہیت کی اطاعت پوری طرح قبول نہیں کی اور جو اب قبائلی علاقہ کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

ان پہاڑی پٹھانوں نے (لفظ پٹھان کی اصطلاح پختون کی جمع پختانہ کی ہندوستان میں بگڑی ہوئی شکل ہے) ہمیشہ ان شہروں اور قصبوں کے ساتھ تجارت کی ہے جو دریائے سندھ کی طرف واقع ہیں۔ انہوں نے مغرب میں کابل یا غزنی کے ساتھ کبھی تجارت نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ درانیوں اور ان دوسرے قبائل کے مقابلہ میں جو مغرب میں رہتے ہیں اور جن کا علاقہ خراسان کے نام سے مشہور ہے پہاڑی پٹھانوں کا رشتہ وادی پشاور کے مشرقی افغانوں سے زیادہ مضبوط رہا ہے۔ دوسری طرف مشرقی افغان بھی پہاڑی قبائل کے ساتھ یگانگت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی یگانگت ہے جو اتحاد کی حد تک نہیں پہنچی لیکن قبائلی امتیاز کی حدیں پار کر

---

(۱) ELPHINSTONE برطانوی ایلچی جو ۱۸۰۹ء میں شاہ شجاع کے دربار میں بھیجے گئے تھے۔

(۲) مثال کے طور پر الف واؤ سے بدل جاتا ہے

(۳) جب لفظ کی جمع بنائی جاتی ہے تو دونوں حروف علت بدل جاتے ہیں۔ مثلاً پختون کی جگہ پختانہ

چکی ہے - کچھ مقامی مستثنیات کو چھوڑ کر اور وسیع معنی پیش نظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی افغان اور ان کے بھائی پہاڑی پٹھان سب کے سب ڈیورینڈ لائن کے مشرق میں پاکستان کی حدود میں رہتے ہیں (۱) جو برٹش انڈیا کا جانشین ہے -

میں نے اس کتاب میں خاص طور پر ان ہی مشرقی افغانوں اور پہاڑی پٹھانوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے افغان رشتوں کو نظر انداز نہیں کیا - سولھویں صدی میں دھلی کے پٹھان شہنشاہ شیر شاہ اور سترھویں صدی میں خٹک شاعر خوشحال خان نے ان لوگوں کو روہ (۲) کے باشندے قرار دیا ہے -

ابتدا ھی میں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے - موجودہ سیاسی اصطلاحات کا ہر طالب علم پختون اور پشتون کے فرق میں الجھ جاتا ہے - یہ ایک عام لیکن الجھاؤ پیدا کرنے والا طریقہ ھے کہ پشتو کو ایک ایسی زبان قرار دیا جاتا ھے جو مفروضہ پشتونستان میں پختانہ بولتے ھیں - پٹھانوں اور ان افغانوں کی جو فارسی نہیں بولتے ایک ھی زبان ھے جو دو طرح بولی جاتی ہے - شمال مشرقی قبیلے پختو اور جنوب مغربی قبیلے پشتو بولتے ھیں (خ اور ش کے علاوہ پختو اور پشتو میں اور بھی بہت زیادہ فرق ھے) دونوں کے درمیان حد فاصل قریب قریب شرقاً غرباً اٹک کے جنوب میں دریائے سندھ سے کوھاٹ اور وادی میران زئی، ھوتی ھوئی ٹل تک اور وھاں سے دریائے کرم کے جنوب میں ھریوب اور درہ شترگردن تک جاتی ہے - اس حد کے شمال مشرق میں کرخت زبان بولی جاتی ہے - یہ پشاور کے تمام قبائل دیر، سوات، بنیر اور باجوڑ کی زبان ھے جسے افریدی، اورک زئی، شنواری، بنگش اور توری بولتے ھیں -

اس حد کے جنوب مغرب میں جو قبائل ملائم زبان بولتے ھیں ان میں سب کے سب درانی قریب قریب سب کے سب غلجی (جلال آباد کے

---

(۱) نوشوارہ ب ملاحظہ فرمائیے -

(۲) اصل میں یہ لفظ ملتانی اور بلوچی میں پہاڑ کیلئے استعمال کیا جاتا تھا - ملتان اور ڈیرہ جات کے لوگ یہ لفظ سلسلہ تخت سلیمان کیلئے استعمال کیا کرتے تھے اور اس سے پٹھانوں کا علاقہ مراد لیتے تھے -

قریب کچھ لوگوں کو چھوڑ کر) خوست اور وزیرستان کے سارے قبائل اور بنوں اور ڈیرہ جات کے قبائل شامل ھیں- جن میں سے بہت سوں کی رشتہ داریاں غلجیوں کے ساتھ ھیں- ژوب اور بلوچستان کے ان دوسرے علاقوں کے پٹھان بھی جو قندھار کے قریب واقع ھیں، ملائم زبان بولتے ھیں-

صرف ایک قبیلہ یعنی خٹک زبان کے لحاظ سے دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا ھے- اس قبیلہ کا اصل حصہ جو کوھاٹ کے جنوب میں آباد ھے پشتو بولتا ھے لیکن اکوڑہ اور مردان کے خٹک خوشحال خان کے قریبی زمانہ میں یوسف زئیوں میں شامل ھوگئے، اور اب وہ پختو بولتے ھیں- مشہور ترین پٹھان شاعر خوشحال خان کی بیشتر نظموں کی اشاعت و طباعت پشاور میں ھوئی- اس لئے وہ پختو میں ھیں- لیکن شاعر کے اخلاف اس بات کی تصدیق کرتے ھیں کہ خوشحال نے اصل میں اپنی نظمیں پشتو میں لکھی تھیں- اس روایت کی اس تاریخی واقعہ سے بھی تصدیق ھوتی ھے، کہ شاعر کا قبیلہ مغلوں کے دور سے پہلے نہ تو یوسف زئی علاقہ پر قابض ھوا تھا، اور نہ اس نے یوسف زئیوں کے رسم و رواج اپنائے تھے- ھم خٹک قبیلہ کی اپنی یہ روایت تسلیم کئے لیتے ھیں کہ شروع میں وہ پشتانہ تھے- اور ملائم زبان بولتے تھے- پھر بھی یہ واقعہ اپنی جگہ اھم ھے کہ بعد میں شمالی خٹک قبائل پختانہ کی حیثیت سے ابھرے- اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ پختو میں اپنے اندر پشتو کو سمو لینے کی صلاحیت موجود ھے-

زبان کی دونوں شکلوں کی جغرافیائی تقسیم کا یہ نتیجہ نکلا ھے کہ پشاور کا رجحان پختو کی طرف ھے- حقیقت یہ ھے کہ یہ شہر پیخاور کہلاتا ھے- لیکن جب درانی قبیلے یہ زبان بولتے ھیں تو وہ پشتو ھوتی ھے- اس دعوے میں وزن موجود ھے کہ چونکہ درانی ملائم زبان بولتے ھیں اس لئے ان کی اس ترجیح کو اس علمی مباحثہ میں خواہ مخواہ اھمیت حاصل ھو گئی کہ دونوں میں سے زبان کی کون سی شکل عالی اور قدیم تر ھے- چونکہ اس بات کا پٹھانوں کی ابتدائی تاریخ سے تعلق ھے اس لئے اسے ذھن میں رکھنا ضروری ھے- میں نے اس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا ھے کہ یہ دیکھتے ھوئے کہ پختو پشاور کی زبان ھے اسے اسی نام سے ظاھر کیا جائے تاوقتیکہ سیاق وسباق کا تقاضا اس کے خلاف نہ ھو-

ایک اور بھی قبائلی امتیاز ھے جس کی حدفاصل بھی کر لانی قبائل

میں پختو اور پشتو کی حدفاصل کے قریب قریب ساتھ ساتھ ہے۔ پختو بولنے والے اپنے سر کے بال کتراتے ہیں یا منڈاتے ہیں۔ شہروں کے فیشن کو چھوڑ کر پشتو بولنے والے دوسرے قبائلی کانوں تک پٹے رکھتے ہیں۔ اس کی بھی کئی شکلیں ہیں، مثلاً خٹک سپاہی اپنے گھونگریالے بال بڑی صفائی سے کنگھی کر کے رکھتا ہے، جبکہ محسود اور وزیر میلی کچیلی زلفیں رکھتے ہیں۔ لمبی لٹوں کے اس فیشن کو ''سنڑے،، کہتے ہیں۔ یعنی کان کے پاس بڑی صفائی کے ساتھ بال کٹے ہوئے لیکن کانوں سے اوپر چمکدار اور گھونگریالے بال رکھے ہوئے بیچ میں مانگ نکلی ہوئی اور کبھی کبھی بالوں کو جمائے رکھنے کے لئے چھوٹے کنگھے لگائے جاتے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہی لمبے بالوں والے اور پشتو بولنے والے قبائلی ہیں، جو صحیح معنی میں ناچ جانتے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے پٹے بھی گردش کرتے ہیں۔ پیٹر مین (۱) کی حالیہ تصنیف میں ایسا ہی ایک منظر بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''ڈھول کی دھمک، اڑتی ہوئی دھول، دہشتناک آنکھیں، بھڑکتی ہوئی آگ اور چمکتی ہوئی تلواریں، یہ سب روح میں بالیدگی پیدا کرتی ہیں۔ خٹک محسود اور خوست کے قبیلے اس فن کے ماہر ہیں،،۔

جغرافیائی اعتبار سے پٹھانوں کی سر زمین کا، نقشے کی مدد سے بھی بیان کرنا مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک تنگ اور لمبی سی فصیل ہے جو دو متوازی پٹیوں کی شکل میں دور تک چلی گئی ہے۔ یہ شروع میں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جو اس علاقہ میں قریب قریب شمالاً جنوباً بہتا ہے۔ پہلے خندق اور پھر فصیل کی شکل میں جاتی ہے، اور آخر میں قدرے مغرب کی طرف مڑ گئی ہے۔ جنوب میں یہ فصیل دریا سے بہت دور رہ جاتی ہے۔ اس فصیل کے عقب میں ایران کی سطح محدب شروع ہوتی ہے جہاں سے کوئی ندی نالہ کوہ سلیمان کے سوا اور کسی راستے سے سمندر تک نہیں پہنچتا۔

پہلی پٹی میں دریا کے ساتھ ساتھ کے میدان اور وادیاں شامل ہیں دوسری پٹی جو ان وادیوں کے اوپر ہے، کوہ سلیمان کا عرضی حصہ ہے، جو اپنی چوٹی سے جنوب کی طرف ہندو کش کے سلسلوں میں چلا گیا ہے،

---

(۱) THE NARROW SMILE BY PETER MAYNE

جو ترچ میر (۱) پر ختم ہوتے ہیں۔ کئی مقامات پر پہاڑ کا یہ عرضی حصہ انگلیوں کی شکل میں دریائے سندھ کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ اور کئی جگہ یہ انگلیاں دریائے سندھ کے پار تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ان انگلیوں کے درمیان وادیاں واقع ہیں، جن میں سب سے زیادہ خوبصورت سب سے زیادہ زرخیز اور سب سے بڑی وادی پشاور ہے۔ اس سے آگے جنوب میں دوسرے میدانی علاقے یعنی کوہاٹ، بنوں، مروت اور ڈیرہ جات واقع ہیں جو کبھی کبھی دامان کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ پشاور کے شمال میں کوئی میدانی علاقہ نہیں ہے، بلکہ ایک پہاڑی سلسلہ اور وادی ہے، جو ہندو کش کے برفانی علاقہ تک چلی گئی ہے۔

کوہ سلیمان کا سلسلہ وسیع معنی میں شمال مشرق اور جنوب مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن کئی مقامات پر پہاڑیاں اس سلسلہ سے آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ اہم ترین تجاوز اس کے بلند ترین حصے کوہ سفید میں ہے، جہاں کرم کے شمال میں سکارم کی چوٹی پندرہ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہ تجاوز جو شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے، ڈیورنڈ لائن کا ایک حصہ ہے۔ کوہ سلیمان کا یہ حصہ ہندوستان کی طرف دنیاء ایران کی جغرافیائی مشرقی سرحد ہے اس سرحد کے آر پار بہت سے مدوجزر آئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ ایرانی منظر اور ایرانی شخصیتیں اس سرحد کے پار دریائے سندھ تک بلکہ اس سے بھی آگے بعض حضرات کے دعوے کے مطابق لاہور تک پھیل گئی ہیں۔ لیکن لاہور کی سمت سے آنے والوں کیلئے ماحول کی واضح تبدیلی جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں سندھ پار کرنے سے چالیس میل پہلے اور ٹیکسلا کے قریب مارگلہ کے مقام پر محسوس ہوتی ہے۔ یہاں نووارد کو وطن کی مہک اسی طرح محسوس ہونے لگتی ہے جس طرح فرانس سے رودبار انگلستان میں سفر کرنے والا ڈوور کی چٹانیں دیکھتے ہی یہ جان لیتا ہے کہ وہ انگلستان میں آگیا ہے۔ یہ پختون خوا ہے۔ پٹھانوں کی سر زمین۔

بعد میں شاندار دریا کو اٹک کے مقام پر پار کرتے ہوئے جہاں یہ دریا تنگ گھاٹی سے گزرتا ہے، نووارد یہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک پھیلتی ہوئی وادی میں آگیا ہے جو بہت سے چشموں سے سیراب ہوتی ہے اور پہاڑوں کے مکمل دائرہ سے گھری ہوئی ہے۔ پشاور کے ارد گرد کی پہاڑیاں صرف بظاہر ہی ایک دائرہ کی شکل میں نظر نہیں آتیں بلکہ نقشے میں

---

(۱) دنیا کا ایک بہت اونچا پہاڑ جس کی بلندی ۲۵۴۲۶ فٹ ہے۔

بھی ایک حلقہ کی شکل میں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ حلقہ قریب قریب مکمل ہے سوائے جنوب مشرق میں اس چھوٹے سے ٹکڑے کے جہاں وادی کی ڈھلوانیں دریائے سندھ کے کنارے تک چلی گئی ہیں۔ اس وادی کے چار دروازے ہیں۔ ایک وہ جس سے ہم کوئی درہ عبور کئے بغیر داخل ہوئے ہیں۔ اور باقی تین پہاڑوں سے ہوکر گزرتے ہیں۔ یہ تینوں خیبر، کوہاٹ اور ملاکنڈ کہلاتے ہیں۔ خیبر بالکل سیدھ میں مغرب کی طرف ہے جو تاترہ کی پہاڑیوں کی نمایاں چوٹی لکاسر کے نیچے تک پہنچتا ہے۔ یہ راستہ کابل ہوتا ہوا ماسکو تک جا پہنچتا ہے۔ درۂ کوہاٹ جو محض درہ کے نام سے مشہور ہے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ درہ اس انگلی کی پور کو کاٹتا ہے جو جنوب مغرب میں پوری مٹھی کا حصہ ہے اور اس درہ سے وہ چھوٹی سڑک گزرتی ہے جس کے راستے سرحد کے جنوبی ضلعوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ملاکنڈ شمال میں ہے۔ یہ پہلے پہاڑی سلسلے میں سے گزرتا ہے۔ اور جنتِ سوات کا راستہ کھولتا ہے۔ یہ راستہ دیر اور چترال کے جنگلوں اور تیز رو ندیوں کے کنارے کنارے پامیر اور چین تک جاتا ہے۔

دو بڑے دریا، کابل اور سوات دائرہ بناتی ہوئی پہاڑیوں کے مغربی حصہ کو کاٹتے ہوئے گھاٹیوں سے گزرتے ہیں۔ لیکن یہ گھاٹیاں اتنی تنگ ہیں کہ ان میں سڑک نہیں بنائی جاسکتی۔ وادی میں داخل ہو کر دونوں دریا پانچ دھاروں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو نیچے کی طرف کچھ دور تک بہہ کر پھر مل جاتے ہیں اور لنڈائے (چھوٹا دریا) بن جاتے ہیں۔ اور اٹک سے قدرے اوپر کی طرف وسطی ایشیا سے لایا ہوا پانی سندھ میں انڈیلتے ہیں۔ پانچوں دھاراؤں کا پانی خود سندھ کے پانی سے کم نہیں ہے۔ دریائے سوات کی گزرگاہ ایک جغرافیائی مسئلہ ہے۔ ملاکنڈ سے تھوڑا سا شمال میں جہاں اس دریا اور پشاور کے میدان کے درمیان ایک نیچا پہاڑی سلسلہ حائل ہے یہ دریا مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے۔ لیکن اس مقام پر پہاڑی کو پار کرنے میں ناکام رہنے کے بعد دریا کئی تنگ گھاٹیوں میں سے گزرتا ہے اور نعل کی شکل میں بہتا ہے اور راستہ میں پنجکوڑہ کو اپنے ساتھ ملاتا ہوا مغرب کی طرف سے میدان میں داخل ہوتا ہے اور مخالف سمت کو بہتا ہے۔ جس کام میں فطرت ناکام رہی اسے انسان نے کر دکھایا۔ ملاکنڈ کو ایک سرنگ کے ذریعہ پار کیا گیا ہے جس کے

راستے دریائے سوات کا پانی وادی میں لایا جاتا ہے۔ اس سے آبپاشی کی جاتی ہے اور صوبہ سرحد کے کارخانے چلانے کے لئے بجلی مہیا کی جاتی ہے۔

اس سر زمین میں آب و ہوا اور ماحول کی تبدیلیاں انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ سردیوں اور موسم بہار میں نشیبی وادیاں اور میدان اپنی دلکشی میں جواب نہیں رکھتے۔ سردیوں کی دھوپ بڑی پیاری لگتی ہے اور برف کو چھو کر آنے والی ہوا بھی بڑی صاف اور خستہ ہوتی ہے۔ ان دنوں جینے میں لطف آتا ہے۔ چشموں اور دریاؤں کی اس سر زمین میں دیہات سایہ دار درختوں میں چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مختلف موسموں میں یکے بعد دیگرے حد نظر تک پھیلے ہوئے گیہوں اور جو کے کھیت اور گنے اور مکئی کی فصلیں دیہات کی خوشحالی ظاہر کرتی ہیں ممکن ہے یہ منظر کہیں اور بھی دکھائی دے سکے لیکن کم از کم ایشیاء کے طول و عرض میں اس کا جواب نہیں مل سکتا دیکھنے والا ان مناظر میں کچھ ایسی فرحت محسوس کرتا ہے جو بار بار دیکھنے سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

شمال میں یوسف زئی سمہ(۱) جو کبھی بے برگ و گیاہ تھا اب نہروں کی بدولت زرخیز علاقہ بن گیا ہے، اور وہاں اب مکئی بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ پہاڑیوں سے ذرا نیچے اور نہروں کے ساتھ ساتھ کنوؤں سے آبپاشی کا طریقہ بھی رائج ہے کنوؤں کے پاس کی ٹھنڈی چھاؤں، رہٹ کی چرخ چوں، ہل جوتنے والے بیل یہ روز مرہ کی ایسی چیزیں ہیں جن کی بدولت کھیتی باڑی کے پرانے طریقے میں دل لبھانے کا خاصا سامان موجود ہے۔

جنوب میں خٹک علاقہ کا پہاڑی دامن بے برگ و گیاہ اور بے رونق ہے۔ لیکن دنیا کے وسیع ترین پہاڑی منظر کیلئے ایک پلیٹ فارم کا کام دے سکتا ہے۔ پشاور کا ساٹھ میل لمبا میدان جو پیش منظر میں یونانی اسٹیج کی طرح پھیلا ہوا ہے پورے منظر کو مناسب فاصلہ اور بھر پور نظروں سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اور یہاں سے برف پوش پہاڑی سلسلہ اسٹیج کے عقبی پردے کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر سردیوں میں کسی

(۱) سمہ پختو میں میدان کو کہتے ہیں۔ سمہ سے مراد وادی پشاور کا وہ حصہ ہے جو لنڈے دریا کے شمال میں واقع ہے۔

ایسے دن جب کہ مطلع صاف ہو چراٹ سے نظارہ کیا جائے تو پشاور کا بڑا میدان جس میں جا بجا دریا اور نہریں بہتی ہیں اور ان کا پانی چاندی کی طرح چمکتا ہے، اس میدان کے چاروں طرف پہاڑیوں کے دائرہ کا بنا ہوا یونانی اسٹیڈیم اور ان پہاڑیوں کے عقب میں شمال کی طرف سربفلک پہاڑ ایک ایسی شان اور عظمت پیش کرتے ہیں جو بہ آسانی دل سے محو نہیں ہو سکتی۔ دور شمال میں ترچ میر پھیلا ہوا ہے، شمال مشرق میں قریباً ایکسو تیس میل کے فاصلہ پر نانگا پربت کی مضبوط او چمکتی ہوئی چھاتی نظر آتی ہے جو آسمان سے باتیں کرتی ہے۔

گرمیوں میں ہر طرف مکئی، باجرہ، دھان اور گنے کی فصلیں سر سبز و شاداب ہوتی ہیں، لیکن پوری وادیاں شدید گرمی سے تپتی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور اس تکلیف دہ موسم کا بھی دنیا میں جواب نہیں۔ اس موسم میں پانی سے محروم اور دھول سے اٹے ہوئے راستے اور پہاڑیوں سے نیچے خاردار جھاڑیوں سے بھرے ہوئے علاقوں میں لق و دق میدان جہنم کا مزا چکھا دیتے ہیں۔ لیکن یہ تضاد بھی اتنا گہرا ہے کہ انتہائی شدید گرمیوں میں چند گھنٹوں کا سفر موسم کی سختی سے عاجز آئے ہوئے انسان کو پہاڑی سبزہ زاروں اور ٹھنڈی چھاؤں کے علاقہ میں پہنچادے گا جہاں وہ انگلستان کی گرمی کے موسم کا لطف لے سکتا ہے۔

مزید تقابل کے لئے بہت سے علاقو میں سال کے ایک خاص حصہ میں پورا ماحول ہولناک ہوتا ہے۔ پیٹرمین کی کتاب میں اس کا نقشہ بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ ”بےزار کن نفرت، ایسی نفرت جو ناقابل بیان ہے۔ اور جس سے کوئی لطف نہیں لے سکتا...... ۔ جھلسے ہوئے پہاڑ اور دس دس ہزار فٹ کے بڑے بڑے ٹیلے ان میں سے سانپ کی طرح بل کھا کر گزرتا ہوا راستہ جس پر ایک ایک میل کا سفر دوبھر ہے“۔ یہ بیان کابل کی سڑک کا ہے۔ لیکن یہی بیان وزیرستان یا ژوب کے علاقہ میں بھی سفر پر ٹھیک چسپاں ہوتا ہے۔ لیکن پھر اچانک منظر کشادہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں رستے ہوئے چشمے درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ اور باغ نظر آنے لگتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدتوں کی تمنا پوری ہو گئی۔ اس مسرت کو محسوس کرنے کے لئے زیریں کرم میں ٹل کے مقام سے جھلستی ہوئی اور چٹانوں سے بھری ہوئی پہاڑیوں اور ندیوں میں سے گزر کر شمال کی طرف سفر کرنا پڑے گا۔ دو ہی گھنٹہ میں سر سبز میدانوں اور

چنار اور بید کے درختوں کو دیکھ کر جو پاڑاچنار کے اوپر پہاڑی سے آتے ہوئے چشموں کے کنارے قطار باندے کھڑے ہوئے ھیں جنت کے خواب نظر آجائیں گے۔

جن دو پٹیوں کو ملا کر سرحدی علاقہ بنتا ھے۔ ان میں سے مغربی پٹی پوری کی پوری زیر حکومت علاقہ اور اس سیاسی سرحد کے درمیان واقع ھے جو ڈیورنڈ لائن کہلاتی ھے۔ البتہ اس کا کچھ حصہ ڈیورنڈلائن کے پار تک چلا گیا ھے۔ یہ سلسلہ کوہ سلیمان کے اس تجاوز سے شروع ھوتا ھے۔ جس کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ھے اور اونچی پہاڑیوں تک چلا گیا ھے۔ جن کی بلندی دس ہزار فٹ سے سولہ ھزار فٹ تک ھے۔ قریب قریب ھر جگہ نیچی نیچی پہاڑیاں بے کیف غیر دلکش سخت اور ناھموار ھیں۔ یہ پہاڑیاں سردیوں میں پالے سے شق ھوجاتی ھیں۔ اور گرمیوں میں تپتی ھوئی دھوپ سے تڑق جاتی ھیں۔ لیکن ان ھی پہاڑیوں کے دامن میں حسین اور زرخیز وادیاں بھی ھیں جو کشمیر کا سامنا کرسکتی ھیں۔ اس علاقے میں سات بڑے درے ھیں جو تاریخ میں حملوں کے راستوں اور سندھ کے طاس اور وسطی ایشیا کے درمیان تجارت کے راستوں کے نام سے مشہور ھیں۔ ان میں سے دو دروں، خیبر اور ملاکنڈ سے ہم اچھی طرح واقف ھیں۔ دوسرے درے شمال سے جنوب کی طرف یہ ھیں۔ مہمند کے علاقے سے گزرنے والا درہ گنداب، کرم سے گزرنے والا درہ بنگش یا درہ پیواڑ، وزیرستان سے گزرنے والے گومل اور ٹوچی کے درے اور کوئٹہ سے گزرنے والا درہ بولان۔ آخری درے کے سوا باقی سب درے قبائلی قافلوں کے استعمال میں تو آتے رھے ھیں لیکن بین الاقوامی آمدورفت کے لئے مسدود ھیں۔ مہمند بنگش اور ٹوچی کے دروں تک میدانوں سے سڑکیں آتی ھیں اور وادی سے کافی اوپر تک جاتی ھیں لیکن ان دروں کے پار افغانستان تک نہیں جاتیں۔ ملاکنڈ کی سڑک بھی جو چترال تک جاتی ھے بین الاقوامی سڑک نہیں کہلائی جاسکتی کیونکہ اس پر موٹر گاڑی میں روس یا چین نہیں پہنچ سکتے۔

جن حکمرانوں نے ماضی میں اس سرحدی علاقہ پر حکومت کا دعویٰ کیا ھے در حقیقت ان کا حکم صرف میدانوں اور ان کے علاوہ ایک دو پہاڑی راستوں پر چلتا تھا۔ مغلوں میں سے بھی صرف عظیم المرتبت حکمرانوں نے پہاڑی قبائل کو اپنے زیر نگیں لانے کی کوشش کی ھے لیکن جیسا کہ

ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا وہ بھی اس کوشش میں ناکام ہوگئے۔ یہاں تک کہ بڑے راستوں پر سے بھی گزرنے کے لئے جو اس وقت سرکش قبائلیوں کے استعمال میں تھے طاقت استعمال کرنا پڑی اور اس کام میں بڑی دشواری پیش آئی۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ ظاہر ہو جائے گا کہ پوری قبائلی پٹی پر کوئی بیرونی طاقت اب تک کیوں حکومت نہ کر سکی۔ اس آزادی کا اظہار یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ آج تک قبائل سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسی سر زمین میں، جس سے تاریخ کے نامور ترین فاتح سکندر اعظم، چنگیز خان اور تیمور لنگ گزرے ہیں ابھی تک قبائلی نظام زندگی رائج ہے۔

لیکن اسی تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ یہی آزادی جو صدیوں سے پٹھانوں کو حاصل ہے تاریخ کے لئے سواد ڈھونڈنے والے کو محروم رکھتی ہے۔ ۱۷۴۷ء تک اس علاقہ میں کوئی ریاست قائم نہیں ہوئی۔ لہذا ان بادشاہوں کے سوا جن کی سلطنتوں کے کنارے پر قبائلی علاقہ واقع ہے اور کوئی تحریر یا سکہ نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی سے پہلے پٹھانوں کی زبان بھی کبھی معرض تحریر میں نہیں آئی تھی۔ اور آج ہمیں سترھویں صدی سے پہلے کی لکھی ہوئی کوئی پشتو ادبی تصنیف نہیں ملتی (۱) لہذا نسبتاً موجودہ دور سے پہلے کے ذرائع ہمیں میسر نہیں ہیں۔ پٹھانوں نے اپنے ملک میں نہ کوئی یادگار بنائی نہ کوئی کتبہ چھوڑا لہذا یہی چارہ کار رہ جاتا ہے کہ مورخ ادھر ادھر سے ہاتھ لگنے والا مواد اکٹھا کرے جو ان حکمراں خاندانوں اور قوموں کی تحریروں، ادب، یادگار عمارتوں اور سکوں سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ جو ان علاقوں سے گزری ہیں جہاں اب افغان اور پٹھان رہتے ہیں۔ پھر اپنی محنت کے نتیجے کو پٹھانوں کی روایات اور قصے کہانیوں سے ملائے جن میں سے بیشتر صرف زبانی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ ایک راستہ بتا دے جس پر آئندہ آنے والے روزافزوں علم کی بدولت گامزن ہوسکیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے ہموار بھی کر سکیں۔

تعارفی مکالمہ ختم ہوگیا ہے اور اب پردہ اٹھتا ہے۔ میں اصل ڈرامہ کے آغاز میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا۔ صرف ایک بات کہنا باقی ہے۔

---

(۱) اس موضوع پر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں MORGENSTIERNE کا مضمون 'افغانستان' ملاحظ فرمائیے

پٹھانوں میں قبائلی روایات جس مضبوطی کے ساتھ قائم ھیں ان کی بدولت ایک ایسی سوسائٹی وجود میں آئی ھے جس میں ارتقا کی تمام تہیں موجود ھیں - یعنی خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے مرحلوں سے لے کر مضبوط قبائلی زندگی، ایشیائی طرز پر خاندانوں کی تقسیم اور پھر موجودہ دور کے وکیل، انجنیئر، ڈاکٹر، حاکم اور سیاست دان- قبائلی گاؤں اور قافلوں کے خیموں کے پیش منظر میں اب وہ لوگ نظر آتے ھیں- جن کا ایکسو سال سے مغربی طرز فکر سے گہرا رابطہ رھا ھے اور فکر و خیال کا وہ امتزاج نظر آتا ھے جو پاکستان کا مطمح نظر ھے- کوئی بھی شخص پشاور اور اس کے ارد گرد بیس میل کے دائرے میں گھوم پھر کر معاشرتی اور سیاسی ارتقا کے یہ تمام مرحلے ایک ساتھ اور ایک دوسرے میں پیوست دیکھ سکتا ھے- اس طرح روزانہ انسانی معاشرہ اور زندگی کے گزشتہ مرحلوں کا ٹھوس لطف اٹھایا جا سکتا ھے- بشرطیکہ تاریخ سے صحیح لگاؤ ھو- مورلے کے قول کے مطابق صوبہ سرحد میں انسانوں کا ایک ایسا ھجوم ھے جو پانچویں صدی سے بیسویں صدی تک کے مراحل طے کرتا نظر آتا ھے- ان تمام مراحل کا نظارہ جن پر ھماری پیچیدہ زندگی کا کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑا بڑا ھیجان خیز ھے-

سرحد کی سحر آفرینی کا یہ بھی ایک حصہ ھے-

حصه اول

نسلی ابتداء

۵۵۰ ق‌م — ۱۰۰۰ عیسوی

(۳۹۱ هجری)

فصل اول

نسب نامے

پٹھان جہاں کہیں بھی آپس میں ملتے ہیں خواہ وہ گاؤں کا حجرہ ہو یا شہر کی سرائے، کالج یا یونیورسٹی میں کلاس کا کمرہ ہو یا دسترخوان یا راہ گیر ساتھ ساتھ جا رہے ہوں تو جس مسئلہ پر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ بحث ہوتی ہے وہ ہے پٹھانوں کی ابتدا اور مختلف قبیلوں کا باھمی تعلق۔ یہ بحث ھنسی مزاح کے ساتھ لیکن پوری شدت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ بحث دو زمانوں کے متعلق ہوتی ہےایک زمانۂ قبل اسلام اور دوسرا وہ عہد جو ۶۲۲ عیسوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ کو ہجرت سے شروع ہوا۔

جہاں تک زمانۂ قبل اسلام کا تعلق ہے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ ان لوگوں کے درمیان جو اسلامی روایات کے شدت سے پابند ہیں یہ بحثیں جن کے تاریخی ہونے کا دعوی کیا جاتا ہے مذہبی رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں اس لئے کہ خود قرآن مجید کی طرح ان میں بنی اسرائیل کے قصے شامل ہیں۔ وہ نامعلوم ابتدا کو نیم تاریخی اور نیم افسانوی انداز میں عظیم عبرانی شخصیتوں حضرت داؤد (ع) اور حضرت سلیمان (ع) کے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی صدیوں کے بعد اس قصہ میں بخت نصر کا نام آتا ہے اور یہ روایت مشہور ہے کہ جب بنی اسرائیل میں افرا تفری پھیلی، تو افغانوں کے یہودی النسل اسلاف محکومی کے دور کے بعد مشرق ھی میں رہ گئے۔ اور بیت المقدس واپس نہیں گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے غور کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ یہ علاقہ آج کل ہزارہ جات کہلاتا ہے۔ اور کچھ عرب میں مکہ معظمہ کے قریب جا بسے۔ یہ دونوں نو آبادیاں بنی اسرائیل یا بنی افغانہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔

اس روایت کو مزید تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ سنجیدہ مزاج قارئین اسے محض من گھڑت قصہ سمجھ کر مسترد کردیں اس لئے میں ان کی اہمیت واضح کئے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کابل کے چند جدید مصنفوں کو چھوڑ کر جو ایک زمانہ میں ہٹلر کے اثر کی وجہ سے قدیم جرمن نسل (NARDIC) نظریہ کے قائل نظر آتے تھے۔ بیشتر افغان اور پٹھان مفسروں کے نزدیک یہ روایات صداقت پر مبنی ہیں۔ خاص طور پر قبائلی شجروں کے بارے میں جن کا افسانوی رنگ اسلامی دور کے آغاز کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ الفنسٹن (۱) جیسا قابل انسان جو بائبل کے ابتدائی قصہ کو نصیحت آموز کہانی قرار دیتا ہے اس بات پر زور دیتا ہے کہ افغانوں کے قبل تاریخ کے اسلاف اور ان کے خاندانوں کے بارے میں کتنا ہی شک وشبہ کیوں نہ ظاہر کیا جائے لیکن خاندانی شجروں میں ان کا تذکرہ ضرور آتا ہے اور ان شجروں پر قبائلی تقسیم اور داخلی نظام آج بھی منحصر ہے۔ خود انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں جس جدید ترین باب کا اضافہ کیا گیا ہے اس میں بھی ان شجروں کی اہمیت اس لحاظ سے تسلیم کی گئی ہے کہ یہ ان روایات کی آئینہ دار ہیں جو سترھویں صدی میں اس وقت جبکہ پہلا شجرہ مرتب کیا گیا تھا پختو اور پشتو بولنے والوں میں رائج تھیں۔ اور ان خیالات کی تائید کرتے ہوئے میں یہ جتائے دیتا ہوں کہ ان قبائلی شجروں کے محتاط مطالعہ سے ایسے رشتے اور ایسی تقسیم واضح ہوتی ہے جس کا خود لوگوں میں اپنی اصل کے بارے میں شدت سے احساس پایا جاتا ہے۔ مزید بر آں جو شخص سالہا سال تک ان قبائل میں رہا ہو وہ یہ دیکھ کر ضرور چونکتا ہے کہ ان شجروں میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے افغانوں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے مرتب کی ہوئی وسطی ایشیا کی زمانۂ قبل اسلام کی تاریخ سے تاریخی امکانات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اور آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان شجروں سے عام طور پر ان امتیازات کی تصدیق ہوتی ہے جو ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

ان روایات کا سب سے بڑا ماخذ ایک کتاب مخزن افغانی ہے جو مغل شہنشاہ جہانگیر کے درباری مورخ نعمت اللہ نے لکھی ہے۔ غالباً یہ کتاب ۱۶۱۲ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ روس کی

---

(۱) ملاحظہ ہو الفنسٹن کی تصنیف ACCOUNT OF THE KINGDOM OF CAUBUL.

خارکوف یونیورسٹی کے ایک مستشرق پروفیسر برنہارڈ ڈارن (BERNHARD DARN) نے ۱۸۲۹ء میں کر دیا تھا۔ ہو سکتا ھے ھمیں آج شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلیوں کے متعلق سوویٹ حکومت کے ایما پر لکھی ہوئی کوئی کتاب نظر آجائے جس کا مصنف تاشقند یونیورسٹی کا کوئی نام نہاد ڈاکٹر پختونوف ہو۔ نعمت اللہ کی کتاب کا مواد بعد میں متعدد اور مختلف شکلوں میں شائع ہوتا رہا۔ ان میں خلاصتہ الانساب بھی شامل ھے جو اٹھارویں صدی کے آخر میں شائع ہوا۔ یہ تمام نسب نامے ان افغانوں کے لکھے ہوئے ھیں جنہوں نے ہندوستان میں مغل حکمرانوں کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور بڑی حد تک اپنے ماخذ سے جدا ہو گئے تھے۔ یہ حقیقت اس بات سے واضح ہوتی ھے کہ یہ لوگ پختو سے بخوبی واقف نہیں ھیں یہ ناواقفیت ان کے قلم سے نکلی ہوئی پختو عبارتوں اور الفاظ سے جھلکتی ھے۔ انہیں اس سرحدی علاقہ کی معلومات بھی تفصیلات کے ساتھ حاصل نہیں تھیں جسے وہ سر زمین روہ (۱) کہتے ھیں۔ ان کی سب تصانیف فارسی میں ھیں۔ پختو میں کوئی تصنیف نہیں۔

ان تمام خامیوں کے باوجود روایات اور قبائلی نسب ناموں کے تذکرے عام طور پر معنی خیز ھیں۔ مثال کے طور پر لفظ افغان یا پٹھان غیر محتاط طریقہ سے استعمال کیا جاتا ھے لیکن اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں کہ ان قوموں کی ایک پرانی شاخ تھی جس کا میں آگے چل کر تذکرہ کرونگا جو سڑبنی کہلاتی ھے جو کھرے افغان اور دوسروں کے مقابلہ میں اصلی بنی اسرائیل کہلاتے ھیں۔

میں پھر روایات کے بیان کی طرف لوٹتا ہوں۔ یہ روایات انجیل میں بیان کی ہوئی تاریخ میں عجیب وغریب اضافہ ھیں۔ ان روایات میں پرانی انجیل کی تمہید کچھ ردو بدل کے ساتھ شامل ھے یعنی حضرت ابراھیم(ع) سے لے کر شاہ ساول تک جنھیں طالوت یا سارول کا نام دیا گیا ھے یہودیوں کے پورے واقعات موجود ھیں۔ یہاں تک تو پورا بیان درمیان میں آنے والی سبق آموز کہانیوں

---

(۱) بہت سے مصنفوں نے غلطی سے یہ لکھ دیا ھے کہ روہ پختو یا پشتو لفظ ھے جس کے معنی پہاڑ ھیں۔ پہاڑ کیلئے پختو لفظ غر ھے۔ روہ جنوبی پنجاب کے علاقہ میں پہاڑ کیلئے استعمال ہوتا ھے۔ یہ لفظ ملتان اور ڈیرہ جات کے پنجابیوں میں مستعمل ھے جنھیں اپنے علاقہ سے سلسلہ کوہ سلیمان کی مغربی دیوار نظر آتی ھے۔ ڈیرہ جات کے بلوچ قبائل میں بھی یہ لفظ مستعمل ھے۔ الفنسٹن نے، جو اس موضوع پر قدیم ترین انگریز مصنف ھیں اس لفظ کو صحیح طور پر استعمال کیا ھے۔

سے قطع نظر عام طور پر وهی هے جو دوسرے مسلمان بیان کرتے هیں۔ اور بنیادی طور پر عبرانی صحیفه سے مختلف نہیں هے۔ لیکن ساول کے زمانه سے غلامی کے دور تک نئی باتیں شامل کرلی گئی هیں۔

افغان مورخوں کا دعویٰ هے که حضرت ساول کے صاحبزادے ارمیا (جرمیا) تھے جن کے بیٹے کا نام افغانه تھا۔ یه دونوں نام عبرانی صحیفوں میں درج نہیں هیں۔ حضرت ساول کی وفات کے دنوں میں ارمیا بھی فوت هوگئے اور ان کے بیٹے افغانه کو حضرت داؤد (ع) نے پالا۔ افغانه حضرت سلیمان علیه‌السلام کے زمانه میں فوج کا سپه سالار بنا دیا گیا۔ اس کے بعد غلامی کے دور تک تقریباً چار سو سال کا وقفه آتا هے۔ چونکه تذکره میں بخت‌نصر کا بھی نام آتا هے اسلئے خیال پیدا هوتا هے که یه بیت‌المقدس سے یہود کی دوسری هجرت کا بیان هے جو چھٹی صدی قبل مسیح کے اوائل میں هوئی اور ایکسو سال پہلے سماریا سے بابل کے بادشاه شالمانصر (۱) کے هاتوں اسرائیل کی پہلی هجرت کا تذکره نہیں هے۔ اگر واقعه یہی هے تو پھر اس نظریه کی جو عام طور پر پیش کیا جاتا هے کوئی گنجائش نہیں رهتی که بنی اسرائیل یعنی بنی افغانه، کسی نه کسی طرح ان گم شده قبیلوں سے تعلق رکھتے هیں۔ بہر حال ان گم شده قبیلوں کے نظرئے کو ماننے والوں میں پایه کے لوگ شامل هیں سب سے پہلے وارن هیسٹنگز کے زمانے میں مشرقی علوم کے پیش رو سر ولیم جونز نے یه خیال ظاهر کیا تھا که افغان وهی دس گم شده اسرائیلی قبائل هیں جن کے متعلق پیغمبر عذرا نے کہا هے که وه قید سے بھاگ گئے اور انھوں نے ارساراتھ کے علاقه میں پناه لی (۲)۔ سرولیم جونز کے قول کے مطابق یه علاقه جدید هزاره جات کا تھا جسے افغان مورخ غور کا نام دیتے هیں لیکن افغان وقائع میں نمرود کے تذکره سے یه دعویٰ باطل هوجاتا هے که افغان گم شده دس قبیلے هیں۔ حقیقت یه هے که سترهویں اور اٹھارویں صدی کے مسلم مفسروں کی معلومات یہودیوں کی تاریخ کے بارے میں محدود تھیں۔ وه اسرائیل اور یہود میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور بظاهر انہیں یه بھی معلوم نہیں که یہودی دو مرتبه غلام بنائے گئے۔

---

(۱) تاریخ بابل سے یه ثابت هو گیا هے که بخت نصر سماریه پر قبضه سے پہلے فوت هو چکا تھا۔ اس شہر کو سرغون (۷۲۲-۷۰۵ق م) نے فتح کیا تھا۔

(۲) الفنسٹن اور بیلیو دونوں نے یه روایت نقل کی هے لیکن دونوں میں سے ایک بھی اسے صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ البته بہت سے پٹھان اسے صحیح سمجھتے هیں۔

بہر حال ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔ افغان مورخوں نے لکھا ھے کہ غلامی کے بعد بنی افغانہ میں سے کچھ نے غور کی پہاڑیوں میں پناہ لی جو آجکل کے افغانستان کے وسط میں واقع ھے اور کچھ عرب میں مکہ معظمہ کے آس پاس چلے گئے ۔ الفنسٹن اس تضادبیانی کو نظرانداز کرتے ہوئے جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ھے لکھتے ھیں۔ کہ افغان مورخوں کا بیان صداقت کے امکان سے محروم نہیں ھے کیونکہ جہاں تک غور کے پناہ گزینوں کا تعلق ھے سب جانتے ھیں (یہ الفنسٹن کا دعویٰ ھے) کہ بارہ میں سے دس قبیلے اپنے بھائیوں کے جودیہ واپس چلے جانے کے بعد بھی مشرق ھی میں رہ گئے۔ اور یہ مفروضہ کہ افغان ان ھی کی نسل ھیں ایک قوم کے غائب ہو جانے اور دوسری قوم کی اصل کو بہ آسانی اور قدرتی طور پر واضح کر دیتا ھے ۔ مکہ معظمہ کے قریب جا کر بسنے والوں کے بارے میں وہ یہ بات دلیل کے طور پر پیش کرتے ھیں کہ ''نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں عرب میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اور ان کا سب سے بڑا قبیلہ خیبر کہلاتا تھا جو اب بھی افغانستان کے ایک علاقہ کا نام ھے البتہ کسی افغان قبیلہ کا نام نہیں ھے (۱)۔ الفنسٹن آگے چل کر یہ بھی لکھتے ھیں کہ روایت سمجھ میں آنے والی ضرور ھے لیکن اس میں بہت سی متضاد باتیں بھی شامل ھیں ۔ مثال کے طور پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ھے کہ کیا کسی یہودی کے بارے میں بھی یہ سنا گیا ھے کہ اس نے اپنا مذھب تبدیل کر لیا ھو۔ روایت کے مطابق جو بنی افغانہ مکہ چلے گئے تھے وہ اپنے مذھب پر قائم رھے ۔ لیکن غور میں پناہ لینے والوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی ۔ ابھی تک کسی نے یہ خیال ظاھر نہیں کیا کہ غور کے افغان اسلام لانے تک یہودی رھے یا اس علاقہ میں آنے کے بعد کسی بھی وقت یہودی مذھب پر عمل پیرا رھے ۔

صاف ظاھر ھے کہ الفنسٹن کے ذھن میں کافی شبہات موجود تھے۔ لیکن الفنسٹن کے علاوہ اس نظریے کو ماننے والے کچھ اور بھی لوگ ھیں جن پر پشاور اور مردان کے حجروں میں بحث کرنے والے اب تک اعتبار کرتے ھیں ۔ یہ لوگ خود پٹھان نہیں ھیں لیکن پٹھانوں کی روایات کے مفسر ھیں ۔ ان میں سب سے پہلے بدقسمت الیگزینڈر برنس کا نام آتا ھے جن

(۱) الفنسٹن نے اپنی کتاب ۱۸۱۴ء میں لکھی تھی جب درۂ خیبر درانی افغانوں کے زیر نگیں تھا

کی تحریر خوشنما ضرور ھے لیکن دانشمندی اور صیابت رائے سے خالی ھے (۱) وہ کہتے ھیں اور کم از کم یہ بات صحیح کہتے ھیں کہ پٹھان یہودی قوم سے شدید نفرت کرتے ھیں۔ اس سے کم از کم یہ بات ضرور ظاھر ھوتی ھے کہ افغان کسی معقول وجہ کے بغیر یہودی النسل ھونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ وہ الفنسٹن کی بات دوھراتے ھوئے کہتے ھیں کہ کچھ یہودی قبیلے مشرق کی طرف آئے تھے اس لئے ھم کیوں یہ اعتراف نہ کریں کہ افغان ان ھی قبیلوں کی نسل سے ھیں اور بعد میں مسلمان ھو گئے۔

انگریز مصنفوں میں بنی اسرائیل کی روایات کے آخری حامی ریورٹی (۲) ھیں جن کی بات میں بڑا وزن ھوتا ھے۔ ایرانی اخامنشی خاندان کے پہلے فرمان روا کسریٰ کا تذکرہ کرتے ھوئے وہ لکھتے ھیں کہ اس بادشاہ کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ پورے قبیلہ اور کبھی کبھی پوری قوم کو ایک ملک سے نکال کر دوسرے ملک میں بھیج دیتا تھا۔ یہودی ھمیشہ سرکش رھے ھیں۔ ریورٹی ھمیں اس امکان پر اعتبار کرانا چاھتے ھیں کہ یہودیوں میں سے جو قبیلے سب سے زیادہ سرکش تھے انہیں ایرانی سلطنت کی کم آبادی والی اقلیم میں بھیج دیا گیا جہاں وہ درمیانی فاصلہ کی وجہ سے حکومت کے لئے درد سر نہیں بن سکتے تھے۔ ریورٹی دریافت کرتے ھیں کہ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ جو یہودی بچ کر نکل سکتے تھے وہ کسریٰ کے جانشینوں اور ان کے صوبیداروں کے ظلم و ستم سہنے پر ایک پہاڑی علاقہ میں خانہ بدوش لیکن آزاد زندگی کو ترجیح دے کر مشرق کی طرف بھاگ نکلے۔ در حقیقت وہ مشرق کے سوا کسی اور سمت میں بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔۔۔۔“

برنس کا استدلال محض قبائلی روایات کی تکرار ھے اس میں کوئی تاریخی مواد نہیں ھے۔ جہاں تک ریورٹی کا تعلق ھے وہ پٹھان روایات پر پورا عبور رکھتے ھیں اور اس شاخ در شاخ علم میں سے کام کی باتیں چھانٹ نکالنے میں ماھر ھیں۔ لیکن اس میدان میں ان کا دماغ بھی ایک ھی دائرہ میں چکر لگاتا ھے اور وہ باھر سے آنے والی کسی ایسی روشنی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ھیں جس کی بدولت وہ اس گتھی کا اور اچھی

---

(۱) TRAVELS INTO BOKHARA BY ELEXANDER BURNES

(۲) ریورٹی نے یہ خیال اپنی کتاب پختو گرامر کے دیباچہ میں ظاھر کیا ھے۔

طرح جائزہ لے سکتے جیسے سلجھانے کا انہیں اتنا شوق ہے۔ اس خاص واقعہ کے بارے میں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہودی یہودی ہی رہتا ہے اور یہ کہ تمام عبرانی کتابوں میں کسریٰ اور اس عظیم المرتبت بادشاہ کے نظم و نسق کی تعریف کی گئی ہے کیونکہ وہ یہودیوں کے حق میں تھا۔ وہ یہ حقیقت بھی نظر انداز کر گئے کہ افغانی روایات کے مطابق جس بادشاہ نے بنی اسرائیل کو غور میں پناہ لینے پر مجبور کیا وہ کسریٰ نہیں بلکہ نمرود تھا۔ وہ عظیم المرتبت بادشاہ جس کی حمایت کی بدولت زاب بابل(۱) بیت المقدس واپس آئے اپنے ہم وطنوں کو ہرگز غور کی بے برگ و گیاہ پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایسا کرتا تو ہمیں یقین ہے کہ عبرانی مورخ اس تلون پر خاموش نہ رہتے۔

اس کے بعد بابل کی غلامی کے وقت سے لے کر وقائع نگار کے الفاظ کے مطابق آفتابِ رسالت کے طلوع تک بارہ سو سال کا وقفہ آتا ہے۔ اس تمام عرصہ کے متعلق کوئی تذکرہ موجود نہیں سوائے اس کے کہ جلاوطن بنی اسرائیل غور کے آس پاس کے علاقہ میں، جس میں وقائع نگار نے مناسب سمجھتے ہوئے کابل، قندھار اور غزنی بھی شامل کردئے، پھولتے پھلتے رہے اور آس پاس بسنے والے کافروں کے خلاف جہاد کرتے رہے اور بیشتر کفار کو ہلاک کردیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس پہاڑی علاقہ میں اپنا عمل دخل محمود غزنوی کے زمانہ تک رکھا جو نبی کریم (ص) کے زمانہ سے تقریباً چار سو سال بعد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ لیکن یہ بیان قبل از وقت ہے۔ ابھی افغانوں کے اسلام لانے کا تذکرہ باقی ہے۔

افغان وقائع نگاروں کا کہنا ہے کہ خالد بن ولید جو پیغمبر اسلام (صلعم) کے سرکردہ صحابیوں میں سے تھے اور پہلے عظیم المرتبت عرب فاتح گزرے ہیں ان بنی افغانہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ (مسلمانوں کی باقی تمام روایات کے مطابق خالد بن ولید عربی النسل تھے اور نبی کریم (صلعم) کے قبیلہ قریش کی مخصوص شاخ سے تعلق رکھتے تھے) جب وہ اسلام لے آئے اس وقت پیغمبر اسلام (صلعم) حیات تھے اور خالد نے ابھی شام اور عراق کو فتح نہیں کیا تھا۔ خالد اپنے رشتہ

---

(۱) ایک یہودی قبیلہ کے سردار جو بیت المقدس میں اپنے قبیلہ کے ساتھ آئے اور بیت المقدس کی از سر نو تعمیر کی۔ (مترجم)

داروں کو جو بنی اسرائیل میں سے تھے اور غور میں آباد ہوگئے تھے۔ اسلام لانے اور نبی کریم (ص) کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کی دعوت دینے کے لئے یا تو خود تشریف لائے یا انہوں نے ایک خط بھیجا۔ نتیجہ میں غور کے افغانوں کے بہت سے نمائندوں کا ایک وفد قیس نامی (۱) ایک شخص کی قیادت میں مدینہ منورہ پہنچ کر پیغمبر اسلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ قیس کا سلسلۂ نسب سینتیسویں پشت میں حضرت ساول سے جا ملتا ہے۔ سترہ سو سال کی مدت کو دیکھتے ہوئے پشتوں کی یہ تعداد بہت کم ہے۔

اس کے بعد قیس اور اسکے ساتھیوں نے پیغمبر اسلام کے لشکر میں شریک ہو کر لڑائیوں میں زبردست شجاعت کا ثبوت دیا۔ آگے چل کر وقائع نگار لکھتا ہے۔

''پیغمبر اسلام نے ان لوگوں کو ہر طرح کی خیر و برکت سے نوازا ان میں سے ہر ایک کا نام دریافت کیا اور فرمایا کہ قیس عبرانی نام ہے اور ہم عرب ہیں۔ لہذا پیغمبر اسلام نے قیس کا نام عبدالرشید رکھا اور ان سب لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم ملک طالوت کی نسل میں سے ہو اس لئے یہ بہت مناسب اور حق بجانب ہے کہ تم بھی ملک کہلاؤ..... اور خدا کے پیغمبر نے پیش گوئی کی کہ خداوند تعالیٰ قیس کی نسل میں اتنا اضافہ کرے گا کہ وہ تعداد میں دوسری تمام قوموں سے بڑھ جائے گی اور دین کے ساتھ ان کا رشتہ اتنا مضبوط ہوگا جتنی وہ لکڑی مضبوط ہوتی ہے جس پر جہاز بناتے وقت پیندے کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جسے ملاح بطان کہتے ہیں۔ اس طرح پیغمبر اسلام نے عبدالرشید کو بطان کے لقب سے سرفراز کیا۔

اور آخر میں یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ان کے یہ نئے پٹھان مزاح سے لطف اٹھا سکیں۔ خواہ یہ خود ان ہی کے خلاف کیوں نہ ہو محمد (ص) نے فرمایا کہ پٹھانوں کی زبان دوزخ کی زبان ہوگی جس طرح عربی جنت کی زبان ہے''۔

یہ پوری کہانی ایک بہت بڑا لطیفہ ہے۔ لیکن اس سے دهلی کا

---

(۱) قیس لفظ کش کی عربی شکل ہے۔ حضرت ساول کے والد کا نام کش بتایا جاتا ہے۔ کسی عرب مورخ نے اس قیس کا تذکرہ نہیں کیا۔

رنگ جھلکتا ھے۔ یہ رنگ ایسے درباری کا ھے جس کے باپ دادا پٹھان تھے لیکن جو خود صرف فارسی بولتا اور لکھتا ھے اور جو مغل دربار کو ھنسانے کے لئے جاھل پٹھان سپاھیوں کا مذاق اڑاتا ھے۔ یہاں یہ خیال پیدا ھوتا ھے کہ دربار دھلی کے ایک مصاحب نے جو اپنی پختو بھول گیا ھے لطیفہ گھڑنے اور ھنسنے ھنسانے کے لئے نسلی لقب پٹھان کو بحیرۂ احمر کے عرب ملاحوں کے ایک نامانوس لفظ سے جا ملایا ھے۔ یہ بات اسے بھی معلوم ھوگی کہ کسی افغان، پختو یا پشتو بولنے والے نے کبھی اپنے آپ کو پٹھان قرار نہیں دیا اور یہ لفظ ھندوستانی ھے۔ وادی پشاور کی معیاری پختو میں اس کا ھم معنی لفظ پختون ھے جسکی جمع پختانہ ھے اسی لفظ کو ھندی میں بگاڑ کر پٹھان بنا لیا گیا ھے یہ بھی صحیح نہیں ھے کہ اس علاقہ میں جو اب پاکستان کہلاتا ھے ملک کے لقب کا استعمال صرف پٹھان سرداروں تک محدود ھے۔ ملک ایک عام عربی لفظ ھے جو بادشاہ یا شاھزادہ کے لئے استعمال ھوتا ھے۔ یہ درست ھے کہ تمام افغان قبائلی سردار یہ لقب استعمال کرتے ھیں لیکن یہ لقب وسطی ایشیا کے اور بہت سے علاقوں میں بھی، جن میں پنجاب بھی شامل ھے رائج ھے(۱)۔

ھم پھر قیس عرف عبدالرشید عرف پٹھان کے قصہ کی طرف آتے ھیں وقائع نگار پوری قوم کو اسی کی نسل بتاتے ھیں۔ کہا جاتا ھے کہ قیس پیغمبر اسلام سے رخصت ھو کر غور واپس آیا جہاں اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ نئے دین کی تبلیغ کی۔ اور ۴۱ ھجری میں ستاسی سال کی عمر میں فوت ھو گیا۔ اس کے تین بیٹے تھے، سب سے بڑا سڑبن دوسرا بیٹان (بٹنی) اور تیسرا غورغشت۔ یہ تینوں پختو اور پشتو بولنے والے لوگوں کے مختلف قبیلوں کے جد امجد ھیں۔ اس مرحلہ پر وقائع نگار زمانۂ قبل اسلام کے متعلق اپنا بیان ختم کر دیتے ھیں۔ مناسب ھے کہ نسب ناموں کی تفصیل میں جانے سے پہلے ان وقائع نگاروں کے بیان کی کچھ اور چھان بین کی جائے۔

جو کچھ کہا گیا ھے اس سے پورے واقعہ کی افسانوی حیثیت صاف

---

(۱) مثال کے طور پر پنجاب کے ضلع شاھپور میں نون اور ٹوانہ گھرانو میں ملک کا استعمال ھوتا ھے یہ گھرانے پٹھان نہیں ھیں۔ دنیائے خراسان میں چھوٹے سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں کا شاھی لقب استعمال کرنا عام بات ھے۔ مثلاً سادات، بادشاہ اور تاجک سردار مہتر (شہزادہ) کہلواتے ھیں خان کا لقب بھی جو اب کوئی بھی استعمال کر سکتا ھے قبیلہ کے خاندانی سربراہ کیلئے ھوتا تھا۔ اور سلطان کے لقب بھی اسی طرح عام ھو گئے۔

ظاہر ہے۔ یہ دعویٰ بھی جھٹلایا جا سکتا ہے کہ قیس اور اس کے ساتھی ظہور اسلام کی ابتدا میں مسلمان ہوگئے جیسا کہ آگے چل کر قابل اعتبار مسلم مورخوں کی تحریروں سے ظاہر ہوگا۔ ان میں سیاح البیرونی(۱) اور درباری وقائع نگار العتبی شامل ہیں۔دونوں نے اپنی کتابیں محمود غزنوی کے دور یعنی گیارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں لکھی ہیں۔ ان مؤرخوں کے بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ قیس کے زمانہ سے چار سو سال بعد بھی کابل کے صوبہ میں اسلام نہیں پھیلا تھا اور یہ کام غزنوی دور میں انجام کو پہنچا۔ جے پال کی ہندو شاہیہ سلطنت قریب کابل تک پھیلی ہوئی تھی اور محمود غزنوی کو کوہ سلیمان کے کافر افغانوں کے ساتھ جنگ کرنی پڑی۔ اس سے بھی بعد کے زمانہ یعنی ۱۱۹۲ عیسوی میں مسلمان حملہ آوروں اور شمالی ہندوستان کی ہندو سلطنت کے درمیان لڑائی میں جس میں معزالدین محمد غوری بن سام نے پرتھوی راج کو شکست دی، ہندو حکمران افغان سواروں کی پوری فوج میدان میں لایا تھا۔ اور افغان دونوں فریقوں کی فوجوں میں شامل تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی (چھٹی صدی ھجری) کے آخر تک تمام افغان مشرف به اسلام نہیں ہوئے تھے حالانکہ خاندانی قصوں میں یہی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خالد بن ولید کے زمانہ میں جوق درجوق اسلام کی صفوں میں شامل ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ عبرانی تاریخ میں بھی تحریف اور قطع و برید کی گئی ہے جو اسیریائی اور بابلی غلامی کو خلط ملط کرنے اور حضرت ساول کا فرزند فرض کر لینے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور پورے بیان میں ایک ہزار سال کا جو وقفہ آتا ہے اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟۔ الفنسٹن اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ افغانوں کا یہ دعویٰ کہ وہ یہودیوں کی نسل سے ہیں ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہا جائے کہ روما یا برطانیہ کے باشندے ٹروجنوں کی نسل سے ہیں۔ برطانیہ میں بسنے والے اسرائیلی بھی اسی قسم کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مجھے اپنے پٹھان دوست (۲) سیدعبدالجبار

(۱) البیرونی کی مشہور تصنیف تاریخ الهند ہے۔

(۲) سادات، حضرت محمد صلعم کی صاحبزادی فاطمه (رض) اور حضرت علی (رض) کی اولاد ہیں ۔ کچھ ہی سادات اصلی ہیں۔ البتہ تمام سادات کسی نہ کسی بزرگ کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں ۔

شاہ کے ساتھ ایک بحث یاد آ گئی۔ سید عبدالجبار(۱) ستانہ کے رہنے والے ہیں جو سندھ کے کنارے اٹک سے تقریباً تیس میل اوپر اس مقام کے قریب واقع ہے جہاں یہ دریا پہاڑی علاقہ چھوڑ کر نیچے اترتا ہے۔ سید عبدالجبار بڑے عالم اور بڑے نیک طینت ہیں انھیں گزشتہ دو صدیوں کے متعلق پٹھانوں کی پوری تاریخ پر عبور حاصل ہے۔ اس سے زیادہ پرانی روایات کے بارے میں ان کا یہ پختہ یقین ہے کہ افغان اور پٹھان نسلیں اپنی اصل کے اعتبار سے سامی ہیں آریائی نہیں ہیں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ پختو زبان فارسی کی بہن ہے اور اس کی بالائی سطح پر عربی الفاظ شامل ہوگئے ہیں (جیسے انگریزی میں لاطینی الفاظ) لیکن بنیادی طور پر پختو آریائی زبان ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ زبان نسلی ابتدا کا ثبوت نہیں ہے اور سامی نسل کے جو باشندے افغان علاقہ میں آئے انہوں نے وہی ایرانی زبان اپنا لی جو ان دنوں اس علاقے میں رائج تھی۔ اس دعوے میں کافی وزن ہے۔

لیکن مسئلہ کے مختلف پہلو زیر بحث آنے اور بنی اسرائیل کے متعلق واقعات میں تضاد بیانی اور بوداپن ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ سید صاحب کا اس بات پر زور دینا کہ وہ یہودی‌النسل ہیں ان کے اس خیال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ اچھے پٹھان کے مورث اعلیٰ یقیناً توحید پرست ہوں گے اور بہت سے خداؤں کی پوجا نہیں کرتے ہوں گے۔ اور اس دعوے کا بھی کہ وہ سامی‌النسل ہیں اس عقیدہ کے ساتھ گہرا ربط ہے کہ ایک سید کے اسلاف یقیناً عربی‌النسل ہوں گے۔ بنی اسرائیل کی نسل کے عقیدہ کی پشت پر ایک طرف بدکار اور کافر نسل سے فطری نفرت اور دوسری طرف یہ فخر و مباہات کار فرما ہیں کہ وہ پیغمبر اسلام کی نسل میں سے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کہ جن عرب فوجوں نے ۶۴۲ء میں نہاوند کے مقام پر ایران کے ساسانی خاندان کا تختہ الٹ دیا تھا اس کے ساتھ مسلمان مبلغ بھی ہوں گے۔ یہ عرب فوج ساتویں صدی کے آخر تک عرب جنرل قطیبہ کی قیادت میں فتوحات کرتی ہوئی اور دین پھیلاتی ہوئی ماوراءالنہر تک چلی گئی تھی۔ در حقیقت اس وقت پورا افغان علاقہ نظر انداز کردیا گیا اور

(۱) سید عبدالجبار شاہ ۲۱ نومبر ۱۹۵۶ء کو فوت ہو گئے جب یہ بیان معرض تحریر میں آ چکا تھا۔

اس علاقہ کے لوگ اس کے بعد کئی صدیوں تک مسلمان نہیں ہوئے۔ لیکن ابتدائی دور کے مبلغوں کی روایات برقرار ہیں۔ ان مبلغوں میں سے بہت سے عرب تھے اور ممکن ہے کچھ مبلغ پیغمبر اسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ پٹھانوں کے علاقہ میں بہت سے خاندان جو سید یا قریش ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان ہی مبلغوں کی نسلوں سے ہوں گے۔ یہ بات یقینی ہے کہ جو لوگ سامی النسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور توحید پر مضبوط ایمان رکھنے کی وجہ سے اپنے زمانۂ قبل اسلام کے اجداد کو یہودی قرار دیتے ہیں وہ انہی مبلغوں کی اولاد ہیں۔ اس تفسیر کے پیش نظر بنی اسرائیل کے قصہ میں بھی تھوڑی بہت صداقت پیدا ہوجاتی ہے اور کم از کم یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایک ایسے عقیدہ کی، جو بظاہر کتنا ہی نا قابل قبول ہو لیکن مٹایا نہیں جاسکتا، وجہ کیا ہے۔

آخر میں یہ بتا دینا بھی بےجا نہ ہوگا کہ یہ عقیدہ اس نظریہ سے زیادہ جاندار ہے کہ پٹھان قدیم جرمن نسل(۱) سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نظریہ کسی زمانہ میں کابل سے پھیلایا گیا تھا۔

قصہ پٹھانوں کے مورث اعلیٰ قیس عرف عبدالرشید تک آپہنچا ہے۔ اور اب مناسب ہے کہ نسب ناموں کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا جائے۔ یہاں جیسا کہ الفنسٹن اور دوسرے مصنفوں نے لکھا ہے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پٹھانوں کے اسلاف کے نام اور شخصیتیں بظاہر کتنی ہی افسانوی حیثیت کیوں نہ رکھتی ہوں یہ قبائلی گوشوارے جنھیں اسلامی روایات میں شجرہ کہا جاتا ہے کچھ حقیقی باتیں ظاہر کرتی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ پٹھانوں کا اپنی اصل اور اپنے رشتوں کے بارے میں کیا عقیدہ ہے اور وہ نسلی اور دوسرے رشتوں اور اختلافات کی درجہ بندی کس طرح کرتے ہیں۔ یہ اختلافات آج بھی شکل و صورت، عادت، لباس، زبان اور اس بڑی پٹھان سوسائٹی کی تاریخ سے ظاہر ہیں جو شمال مغربی سرحدی صوبے کے طول و عرض میں اور اس کے پار افغانستان میں آباد ہے پٹھانوں کے لئے شجرے سائنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ممکن ہے دوسرے لوگ ان شجروں میں کوئی دلچسپی نہ لیں۔

میں نے ان شجروں کو کم سے کم دائرہ میں رکھا ہے۔ یہ بات

---

(۱) ناردی یا NORDIC

سمجھ لینی چاہئے کہ ان میں بہ آسانی توسیع کی جا سکتی ہے ایک تو اس طرح کہ دئے ہوئے شجروں میں مزید تفصیلات شامل کر لی جائیں یا پھر جس شخص کی معلومات وسیع ہوں وہ ہر قبیلہ، ہر خاندان اور ہر گھرانے کا تذکرہ شجروں میں شامل کرلے۔ پٹھان قبیلہ کے آپس کے تعلق اور چھوٹی سے چھوٹی شاخ تک پورے شجرے میں جو ربط اور نظم و ضبط پایا جاتا ہے اس کی مثال پوری قبائلی دنیا میں مشکل ہی سے ملے گی۔ شجرے کی تمام تفصیلات تمام ملکوں اور معتبروں کو معلوم ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان شجروں کا کسی ایک خاندان اور کسی قبیلہ کے مردوں اور عورتوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ پورے قبیلہ کے نفع نقصان میں ہر خاندان کا حصہ قبائلی طرز زندگی کا جز ہے اور امن اور جنگ میں قبائل کے لئے گائڈ کا کام دیتا ہے اس موضوع پر مزید تفصیلات کسی اور موقع پر بیان ہوں گی۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ آئندہ درج ہونے والے گوشواروں میں نسبتاً جو سادگی اختیار کی گئی ہے اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ شجرہ میں اس وقت معنیٰ پیدا ہوتے ہیں جبکہ آپ کسی خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں ورنہ یہ شجرے عام طور پر بکسوں میں بند پڑے رہتے ہیں لیکن پوری بات سمجھانے کے لئے شجروں کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضروری ہے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ روایت کے مطابق قیس کے تین بیٹے تھے سڑبن، بیٹان اور غورغشت۔ اس طرح اس کی بھی تین خاص نسلیں ہونی چاہئیں۔ لیکن حقیقت میں چار نسلیں ہیں۔ چوتھی نسل کے جدامجد کا نام کرلان یا کرلانی(۱) بتایا جاتا ہے۔ چونکہ کرلان بیشتر پہاڑی قبائیلوں کا جدامجد ہے اس لئے اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ نعمت اللہ کے مخزن افغانی میں اس کی نسل کا تذکرہ باقی تین بیٹوں کی نسلوں سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن کرلانی کو لاوارث بچہ کی حیثیت سے سڑبنی نسل میں شامل کردیا گیا ہے۔ دوسرے نسب نویسوں نے اسے غورغشت نسل کے ساتھ شامل کیا ہے۔ صرف الفنسٹن نے قیس کے چار بیٹے بتائے ہیں جن کے

---

(۱) لفظ کر لانی میں حرف ی سے پہلے پختو اور پشتو کا ایک حرف نڑ شامل ہے جو نون غنہ اور ڑ کا مرکب ہے۔ کبھی کبھی اس حرف کا تلفظ اس طرح کیا جاتا ہے کہ ڑ کی آواز پہلے اور نون غنہ کی آواز بعد میں نکالی جاتی ہے۔ کرلانڑی کے تلفظ میں نونِ غنہ ادا کرنا چاہئے۔ البتہ کر لانی اردو کے مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ ایک اور لفظ ترکلانڑی کے تلفظ میں بھی یہی اصول کار فرما ہے۔

نام بالترتیب سرابون، غورغشت، بٹنی اور کورلہ ھیں - خواہ کچھ بھی ترتیب کیوں نہ ھو یہ بات قابل غور ھے کہ نسب ناموں میں کرلان کی حیثیت واضح نہیں ھے - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اس کی نسل میں کوئی عیب ضرور تھا - میں اس کا تذکرہ آگے چل کر کروں گا -

سب سے بڑے بیٹے سڑبن کے دو بیٹے تھے ایک کا نام شرخبون (اور بعض کتابوں میں شرکبون یا شکربون یا شرجیون بھی لکھا ھے) اور دوسرے کا نام خرشبون (یا بعض تحریروں کے مطابق کرشیون) تھا - خلاصہ یہ ھے کہ شرخبون ھی افغانوں یعنی ابدالیوں کا جو اب درانی کہلاتے ھیں اور ان کے قرابت دار قبائیلوں کا جد امجد ھے- اور خرشبون وادی پشاور اور اس کے قریب شمالی پہاڑیوں میں بسنے والے مشرقی افغانوں یعنی یوسف زئیوں (ان میں مندڑ شاخ بھی شامل ھے) مہمند خلیل داؤد زئی اور محمد زئی (۱) قبیلوں کا جد امجد ھے- سڑبن کے دونوں بیٹوں کے شجرے حسب ذیل ھیں -

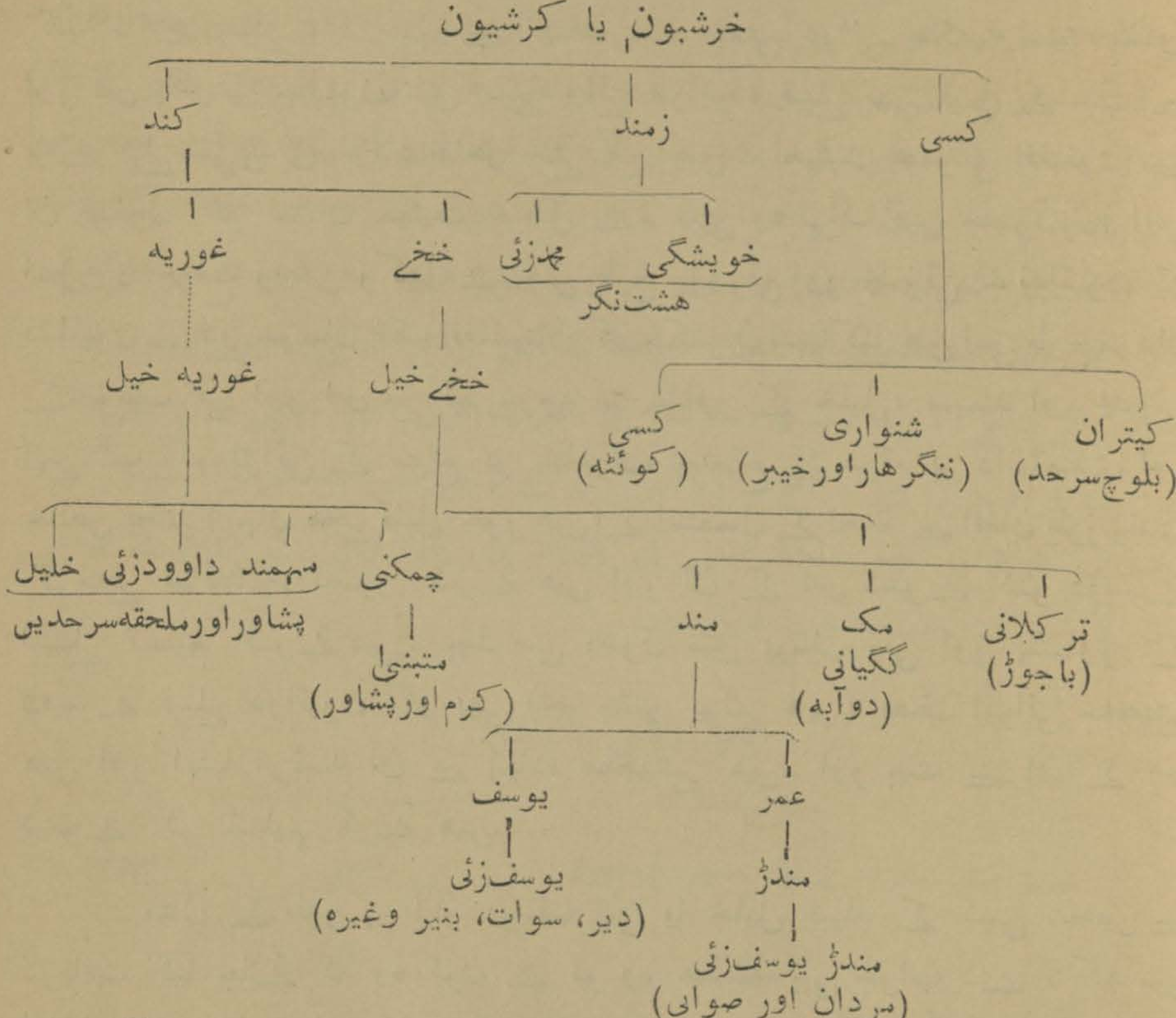
سڑبنی اول —— مغربی افغان

شرکبون (یا شکربون یا شرجیون)

- آرمڑ (متبنیٰ)
  - آرمڑ (کانی گرم لوگر پشاور) نوٹ:- آرمڑ پٹھان نہیں ھیں
- ترین
  - ابدال
    - ابدالی یا درانی (افغانستان)
      - پنج پاؤ
        - نورزئی
        - علی زئی
        - اسحاق زئی
        - (افغانستان، علاوہ ازیں ملتان کے پٹھان بھی اسی شاخ سے تعلق رکھتے ھیں)
      - زیرک
        - اچکزئی (پشین اور توبہ)
        - بارکزئی
          - محمدزئی (ایک شاخ ۱۸۲٦ سے تا حال افغانستان کی حکمران ھے)
        - علی کوزئی
          - (افغانستان)
        - پوپلزئی
          - سدوزئی (ایک شاخ نے ۱۷۴۷ءتا۱۸۱۸ء افغانستان پر حکومت کی)
  - تور (سیاہ)
    - تور ترین (پشین بلوچستان)
  - سپین (سفید)
    - سپین ترین (ڈکی بلوچستان)
- شیرانی (کاکڑ عورت کا بیٹا تھا اس لئے غورغشت قبیلہ سے جاملا جس کی ایک شاخ کاکڑ ھے)
  - شیرانی (کوہ سلیمان)

(۱) ھشت نگر کے محمد زئیوں کا ان قبائل سے کوئی اور تعلق نہیں ھے جن کے نام گوشوارہ نمبر ایک میں درج ھیں - البتہ محمد زئی بھی سڑبنی ھیں -

سڑبنی شاخ دوئم— مشرقی افغان



سڑبن کے دونوں بیٹوں کے ناموں خاص طور پر شرجیون اور کرشیون کی شکل میں ان کے غیراسلامی انداز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ان ناموں کا اسلامی شکل اختیار کر لینا تعجب خیز نہیں ہے۔ وقائع نگار کے قول کے مطابق افغان جسے شرکبون کہتے ہیں وہ شرف الدین ہے اور جسے خرشبون کہتے ہیں وہ خیرالدین ہے۔ لیکن بیلیو کا دعویٰ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے ”یہ بظاہر راجپوتوں کے عام ناموں سرجن اور کرشن کی بدلی ہوئی شکل ہیں،، وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ سڑبن دراصل سوریہ بن تھا جس کے معنی ہیں سورج کی اولاد اور اس کا پوتا شیرانی دراصل ہندو شیورام تھا۔ چونکہ یہ دعویٰ بڑا انوکھا اور پٹھانوں کے تمام روایتی نسب ناموں کے خلاف ہے اس لئے ہم اس پر بعد میں بحث کریں گے۔

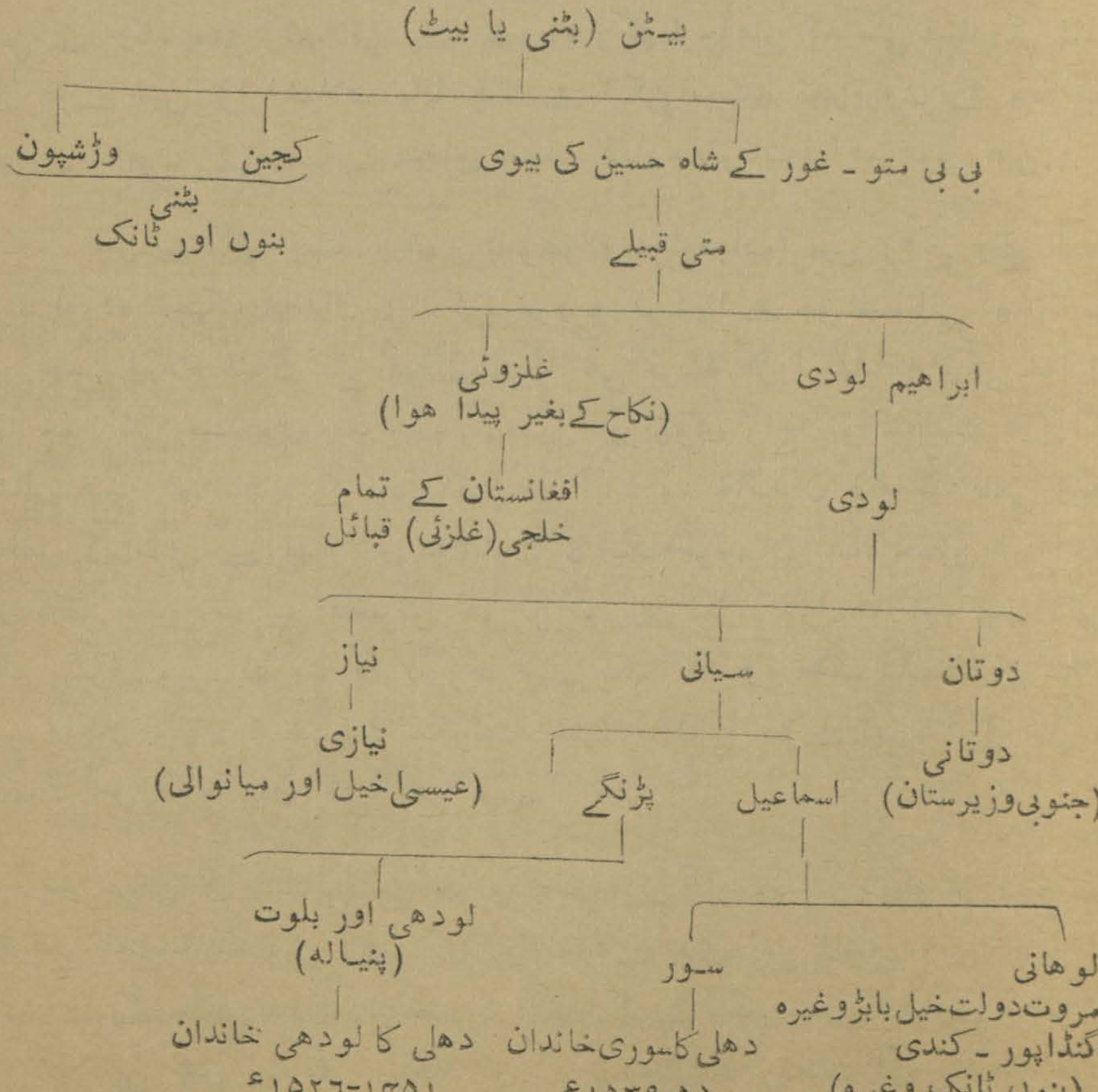
اوپر کے شجرے میں ان تمام قبیلوں کے نام جو آج کل مشہور ہیں خط نسخ میں لکھے گئے ہیں اور انکی موجودہ سکونت بھی درج کی گئی

ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف اس علاقہ میں جو آجکل افغانستان کہلاتا ہے بسنے والا سب سے زیادہ قبیلہ یعنی درانی بلکہ وادی پشاور اور آس پاس کی پہاڑیوں میں بسنے والے سرکردہ قبیلے بھی قیس کے سب سے بڑے بیٹے سڑبن کی اولاد ظاہر کئے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی افغانوں میں ان قبیلوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی نسل کا چراغ روشن رکھا ہے۔ جس طرح سدوزئی اور محمد زئی خاندانوں کے درانیوں نے دو سو سال تک افغانستان کو حکمران مہیا کئے ہیں اسی طرح مردان کے یوسف زئی اور اس سے کم درجہ پر پشاور کے خلیل، مہمند اور محمد زئی اپنے آپ کو لڑائی کے موقع پر بہادری، اجتماع کے موقع پر دانشمندی اور خالص پختو (یہاں ہجے قابل غور ہیں) کے استعمال کے لحاظ سے افغان طرز زندگی کے سچے نمائندے تصور کرتے ہیں اور ان کے اس دعوے کو دوسرے قبیلے تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سی باتوں میں یوسف زئی اور پشاور کے دوسرے قبیلے درانیوں کو بھی (جو پشتو بولتے ہیں) نصف ایرانی سمجھتے ہیں اور اپنا مرتبہ ان سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اور بہت سے ان کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر یوسف زئی یا خلیل قبیلہ کے کسی شخص سے دریافت کیا جائے کہ وہ کون ہے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دے گا کہ میں افغان ہوں۔ ان قبیلوں کا کوئی شخص کبھی یہ نہیں کہے گا کہ میں پختون ہوں۔ وہ پختو بولتا ہے لیکن اپنے آپ کو نسل کے اعتبار سے افغان سمجھتا ہے۔ روایتی طور پر وہ درانیوں کا قریبی رشتہ دار ہے اور اپنی نظر میں وہ خود کو پشتو بولنے والے درانیوں سے افضل سمجھتا ہے۔ اگر نسل کے متعلق زیادہ کرید کی جائے تو وہ آپ کو بتائے گا کہ پختو بولنے والوں میں وہ اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے اور صحیح افغان ہے اس کی بولی کرخت ہے اور وہ دعویٰ کرے گا کہ اسی طریقہ کی بولی بہترین ہے اور شریفوں میں رائج ہے۔ وہ یہ رائے ظاہر کرے گا کہ پہاڑی قبائل مثلاً خٹک، آفریدی، وزیر اور دوسرے قبیلے بجائے خود کھرے پختون باشندے ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ مشکوک ہے کہ وہ افغان ہیں۔ وہ کہے گا کہ پہاڑی قبیلے کرلانی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک زمانہ میں غلجیوں (۱) نے دھلی اور

(۱) فارسی میں غلزئی استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں اس لفظ کے ہجے غلجی لکھے گئے ہیں کیونکہ غلجی قبائل بھی اپنے لئے لفظ غلجی ہی استعمال کرتے ہیں۔ الفنسٹن نے غلجی کا لفظ استعمال کیا ہے جو قریب قریب صحیح ہے۔

ایران کو فتح کر لیا تھا لیکن بہر حال وہ گھونگھوں کی طرح اپنا گھر اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرتے ھیں۔ وہ خانہ بدوش ھیں اور انھیں سچا افغان ھونے کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں ھے۔ وہ اسی طرح کی اور بھی باتیں کریگا اور وہ تمام لوگ جن کی ایک عمر ان قبیلوں میں گزری ھے اس بات کے شاھد ھیں کہ سڑبن کے بیٹے خرشبون کی اولاد ھیں۔ یہ احساس شدّت کے ساتھ پایا جاتا ھے کہ وہ افغان نسل سے تعلق رکھتے ھیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ لوگ غلطی پر ھیں جو افغان کا لقب افغانستان میں رہنے والے مغربی قبیلوں تک محدود کر دیتے ھیں۔ مشرقی علاقہ کے غوریہ خیل اور خخے خیل بھی اس لقب کے دعویدار ھیں۔ خود ان لوگوں کے ذھن میں یہ تفریق مشرق اور مغرب کی بنیاد پر نہیں بلکہ نسل کی بنیاد پر ھے۔ قیس کے دوسرے بیٹے بیٹان کا شجرۂ نسب حسب ذیل ھے۔



شجرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بیٹان کے بیٹے کی نسل سے صرف ایک ہی قبیلہ بٹنی ہے جو کافی مشہور ہے۔ لیکن تعداد میں تھوڑا ہے۔ اور وزیر اور محسود علاقہ کی مشرقی سرحد پر اس جگہ آباد ہے۔ جہاں پہاڑیاں ڈھلتی ہوئی بنوں اور ڈیرہ جات کے میدانوں سے ملتی ہیں۔ باقی تمام قبیلے اور ان میں پشتو بولنے والا سب سے بڑا قبیلہ غلجی اور دہلی کے دو پٹھان حکمران خاندانوں یعنی لودھیوں (۱۴۵۱ تا ۱۵۲۶ء) اور سوریوں (۱۵۲۹ تا ۱۵۵۵ء) کے اسلاف بھی شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ سب بیٹان کی بیٹی کی نسل سے ہیں اور ان میں سے بھی غلجی خاندانی نجابت سے محروم ہیں۔ یہ کہانی وقائع نگار کے الفاظ میں زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

''پٹھان (قیس) کے بیٹے بٹنی نے اپنی عبادت اور پرہیز گاری کی وجہ سے ولایت کا درجہ حاصل کرلیا تھا اور اسی وجہ سے وہ شیخ بیٹ کہلاتا تھا۔ خداوند تعالیٰ نے اسے کئی بیٹے اور ایک بیٹی بی بی متو عطا کی تھی جس کی اولاد متی کہلاتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ متی قبیلہ کی نسل کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن مستند تحریروں کے مطالعہ سے اس خاتون کے نسب کے متعلق حسب ذیل معلومات فراہم ہوتی ہیں...

اس سے آگے مصنف، غور (موجودہ ہزارہ‌جات) میں رہنے والے ایک سر برآوردہ تاجیک خاندان کا تذکرہ شروع کر دیتا ہے جو شنسبانی کہلاتا تھا اور جسے اسلام قبول کئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ یہ وہی خاندان تھا جو کئی صدیوں بعد (۱۱۹۲ء میں) پرتھوی راج کو شکست دے کر شمالی ہند کو اسلام کے زیر نگین لے آیا۔ یہ خاندان ضحاک نامی ایک شخص کی نسل سے تھا، اس خاندان کا ایک نوجوان شاہ حسین اپنے باپ کے بعض معاملات سے ناخوش ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا اور بہت دنوں تک مشرق میں گھومتا پھرتا رہا یہاں تک کہ وہ تخت سلیمان کے علاقہ میں آنکلا جہاں شیخ بیٹ سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔ آگے چل کر واقعات اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

حسین کی پیشانی سے خوش بختی کے آثار ہویدا دیکھ کر شیخ بیٹ نے اسے اپنے قبیلہ میں رہنے کی اجازت دے دی اسے اپنا دوست بنا لیا اور اس کے ساتھ پدرانہ شفقت کا اظہار کرنے لگا۔ حسین دنیاوی معاملات سے دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ بلکہ اس کا تمام وقت ریاضت اور تلاوت قرآن

میں گزرتا تھا۔ اس کی دانشمندی اور فہم و فراست کی وجہ سے سب کام ٹھیک ہو جاتے تھے۔ ادھر شیخ کی ایک بیٹی تھی جو نہایت حسین و جمیل تھی۔ تقدیر نے اپنا شعبدہ دکھایا شاہ حسین انسانی فطرت، جوانی اور حسن کے ھاتھوں مجبور ہوگیا اور اس کی طبیعت اس حسین لڑکی پر مائل ہوگئی جس کا نام متو تھا۔ معاملات نے اس قدر طول پکڑا کہ وہ ماں باپ کو بتائے بغیر باہم شیر و شکر ہوگئے یہاں تک کہ تھوڑے ھی دنوں میں حمل کے آثار ظاھر ہونے لگے اور بھید چھپانے کی کوئی گنجائش باقی نہ رھی۔ جب اس حسینہ کی ماں کو یہ واقعہ معلوم ھوا تو پہلے تو اس نے اپنی بیٹی کو بہت لعنت ملامت کی لیکن پھر یہ سوچتے ھوئے کہ فوری قدم اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ھے مناسب موقع دیکھ کر بی بی متو کی شاہ حسین کے ساتھ شادی کردی۔ تھوڑے دنوں کے بعد متو کے بطن سے ایک پیارا بیٹا پیدا ھوا۔ یہ بچہ ناجائز تعلقات کی پیداوار تھا اس لئے اس کا نام غلزئی پڑ گیا۔ افغانوں کی زبان میں غل کی معنی چور اور زئی کے معنی بچہ کی پیدائش ھیں(۱)۔

حسین کو دین اور دنیا دونوں حاصل ھوگئے۔ لیکن کہانی کا ایک ٹکڑا باقی رہ گیا۔ اس سے آگے واقعات یوں بیان کئے ھیں۔

''اس کے بعد بی بی متو کے بطن سے ایک اور بیٹا ابراھیم لودی پیدا ھوا۔ اسے لودھی کا لقب ملنے کی وجہ یہ ھے کہ ایک سال اس پہاڑی پر جہاں شیخ کا قیام تھا اتنی کثرت سے برف پڑی کہ شیخ اپنا گھر بار چھوڑ کر سردی گزارنے کیلئے پہاڑ سے نیچے آ گئے جہاں موسم اتنا تکلیف دہ نہیں تھا۔ جب برفباری اور بارشیں ختم ھو گئیں تو وہ اپنے پہلے گھر واپس آ گئے اور اپنی بیوی سے کہا بسم اللہ پڑھو اور چولھے سے آگ لے آؤ (چولھے میں چار مہینے سے آگ نہیں جلی تھی) بیوی نے تذبذب کے عالم میں لیکن ھمیشہ کی طرح فرماں برداری کا ثبوت دیتے ھوئے اپنا ھاتھ بڑھایا تو ایک معجزہ رونما ھو گیا۔ اسے چولھے میں آگ مل گئی اس پر شیخ نے اپنی بیوی سے کہا ایسے سخت سفر کے بعد بچے بھوک سے تنگ ھو رھے ھیں۔ روٹیاں لے آؤ کیونکہ میں آج خود یہ دیکھنا چاھتا

---

(۱) پشتو کے الفاظ ھیں غل بمعنی چور اور زوئے بمعنی بیٹا۔ بگڑے ھوئے لفظ سے ظاھر ھوتا ھے کہ وقائع نگار نہ تو پشتو جانتا تھا اور نہ قبیلہ کے اصل نام غلجی سے واقف تھا۔

هوں کہ قسمت کون سے بچے پر سب سے زیادہ مہربان ہے۔ جب پہلی روٹی پکی تو ابراہیم جو بڑا تیز اور پھرتیلا تھا روٹی لے کر دوڑتا ہوا شیخ کے پاس پہنچ گیا۔ شیخ نے بے ساختہ کہا ابراہیم لوئے دے جس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم بڑا ہے۔ افغانوں کی زبان میں لوئے دے(۱) کے معنی ہیں عمر میں دوسرے سے بڑا۔

یہ کہانی جس میں الفرڈ اور روٹیوں کے قصہ کی سادگی اور یسوع کے مقابلہ پر یعقوب کی چالاکی کے واقعات یکجا ہیں اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کا ماخذ وہ ذرائع ہیں جن کے تاریخی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس کی تہہ میں کیا ہے۔

پہلا نمایاں نکتہ یہ ہے کہ افغانوں کی ابتدائی روایات کے مطابق جیسا کہ یہاں ظاہر ہو گیا ہے۔ غلجیوں کو صحیح النسب افغان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان کا مبینہ جدامجد غیر ملکی ہی نہیں ہے بلکہ اس نے ایک افغان دوشیزہ کو ورغلایا اور نکاح کے بغیر ایک بچہ کا باپ بن گیا۔ رواج کے مطابق اس جرم کی یہ سزا ہوتی کہ دوشیزہ کے خاندان والے اسے ہلاک کر دیتے۔ حسین کو تاجیک خاندان کا یعنی ایرانی نسل سے بتایا جاتا ہے لیکن قصہ گو یہ بھول جاتا ہے کہ غوری جنہوں نے ۱۱۹۲ء میں معزالدین محمد غوری کی قیادت میں شمالی ہندوستان کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا تھا وہ بعض مؤرخوں کے خیال میں، اور ان میں افغان مورخ بھی شامل ہیں، ترک تھے۔ یقیناً انھوں نے جن فوجوں کی قیادت کی ان میں بیشتر افغان شامل تھے لیکن خود انہوں نے کبھی افغانی النسل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور ان کے بعد دھلی پر جس غلام خاندان نے حکومت کی اس کا ہر حکمران ترک تھا۔ اس دلیل کی بنا پر حسین جو اسی غوری قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا ایک ترک ہوگا جو زبردستی شیخ بٹنی کے خاندان میں شامل ہو گیا۔ یہ کہانی اس پرانی روایت کا ایک پرتو ہے کہ غلجیوں میں غیر ملکی خون شامل ہے۔ یہ غیر ملکی عنصر زبردستی افغانوں میں شامل ہوا ان کی بیٹیوں سے شادیاں کیں اور اس طرح افغانوں کے

(۱) کہا جاتا ہے کہ شیخ بیٹن نے یہ کہا تھا کہ ابراہیم لوے دے جس کی معنی ہیں ابراہیم مرتبہ میں بڑا ہے یا ابراہیم بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے یہ معنی کہ ابراہیم عمر میں بڑا ہے۔ عمر میں بڑائی ظاہر کرنے کیلئے یہ کہا جاتا کہ ابراہیم مشر دے۔ یہاں بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وقائع نگار پشتو سے نابلد ہے۔

طور طریقے اور زبان اپنا لی۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ عنصر ترک ہو۔

میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ یہ روایت صحیح ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بےجا نہ ہوگا کہ اسی روایت نے ریورٹی کو الٹی سیدھی باتیں کہنے پر مجبور کیا۔ ریورٹی، قیس اور اس کے بیٹوں کے قصہ کو پورے یقین کے ساتھ تاریخ سمجھ بیٹھے ہیں اور ایسے موقعوں پر بھی جبکہ مبہم صداقت اور من گھڑت افسانے میں تمیز کی جا سکتی ہے وہ اس تفریق میں ناکام رہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ یہ کہانی ایک ایسی حقیقت کا اظہار کرتی ہے جسے عام طور پر لوگ تسلیم کرتے ہیں وہ یہ کہ لودیوں کے علاوہ پشتو بولنے والے اس شاخ کے دوسرے قبیلے بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس سے افغانستان کے غلجیوں کا تعلق ہے۔ قبائلی قصہ کے مطابق ماں اور باپ کی طرف سے دونوں کے اسلاف ایک ہیں لیکن بڑے بیٹے کی پیدائش کے متعلق ایک بد نام کن کہانی مشہور کر دی گئی ہے۔ چھوٹے بیٹے کے موجودہ نمائندے یعنی لوہانی، مروت، نیازی، دوتانی، بلوت (۱) وغیرہ بھی غلجی ہیں جو آباد ہوگئے ہیں۔ بہت سے غلجی خانہ بدوش ہیں۔ وہ بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان ضلعوں میں رہتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو غلجی سمجھتے ہیں اور ان کے طور طریقوں اور بولی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ نسب ناموں میں اصل غلجیوں، لودی اور لوہانی قبیلوں میں جو امتیاز روا رکھا گیا ہے اس کا ایک واضح مقصد ہے۔ جن درباری مورخوں نے یہ نسب نامے مرتب کئے ہیں وہ دھلی اور آگرہ کے درباروں کے مصاحب تھے۔ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر یہ ظاہر کیا کہ جن لودی اور سور خاندانوں نے شمالی ہند پر حکومت کی وہ غلجی نسل سے ضرور تعلق رکھتے تھے لیکن ایک حیثیت سے دوسرے غلجیوں کے مقابلہ میں زیادہ شریف النسب اور ممتاز تھے۔ نعمت اللہ اور دوسرے درباری مورخ (۲) اس زمانہ سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں جب غلجیوں نے میر ویس کی قیادت میں ایرانیوں سے قندھار چھین لیا اور اس کے بیٹے اور بھتیجے کی قیادت میں

(۱) یہ لوگ بلوچ نہیں ہیں اور انہیں بلوچ نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ لوگ سادات ہیں اور انکا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔

(۲) خلاصۃ الانساب کے مصنف حافظ رحمت اور جنابی۔ DORN نے ان دونوں کا حوالہ دیا ہے۔

خود ایران پر چڑھائی کی (۱)۔ نعمت اللہ کے زمانہ میں یہ واقعات ابھی بطن گیتی میں پنہاں تھے۔ یہ اس کا کام نہیں تھا کہ بحیثیت مجموعی غلجیوں کی عظمت کا شہرہ بلند کرے۔ اس کا کام تو صرف اتنا بتا دینا تھا کہ اس نسل کے جن لوگوں نے ہندوستان کو ایک صدی تک زیر نگین رکھا وہ باقی نسل سے مختلف تھے۔

یہاں ایک اور دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ریورٹی کی تحریروں کے باوجود لودیوں اور سوریوں کے علاوہ غلجی نسل کے ایک اور خاندان نے بھی دہلی پر حکومت کی ہے۔ تاریخ میں یہ حکمران خلجی یا غلجی کے نام سے پکارے جاتے ہیں (۱۲۹۰-۱۳۲۱ء) ان میں سب سے مشہور علاءالدین ہے جس نے دہلی میں قطب مینار کے قریب کچھ عمارتیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اس دعوے پر بڑی گرما گرم علمی بحثیں ہوئی ہیں کہ دہلی کے خلجی حکمرانوں کے اسلاف بھی غلجی نسل سے تعلق رکھتے تھے میں پھر اپنی دلیل کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے صرف اتنا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ سرحد کے پٹھان عام طور پر خلجی خاندان کو غلجی نسل ہی سے سمجھتے ہیں۔ اس کا ثبوت خوشحال خان خٹک کی ایک نظم سے ملتا ہے جو تین صدی پہلے لکھی گئی تھی۔

تمام افغان قبیلوں میں غلجی غالباً تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بہادر قبیلہ ہے اور صوبہ سرحد کی اسٹیج پر انہوں نے درانیوں کے مقابلہ میں زیادہ کردار ادا کیا ہے اس لئے کہ سالہاسال سے ان کی ایک بڑی تعداد ان میدانوں میں جو اب پاکستان کا حصہ ہیں بلکہ ان سے بھی آگے کلکتہ تک اور اس سے بھی آگے آسٹریلیا تک سردیوں کا موسم بسر کرتی رہی ہے۔ ان کا تذکرہ پھر کیا جائے گا (۲)۔

قیس کے تیسرے بیٹے غورغشت کا شجرہ نسبتاً مختصر اور غیر دلچسپ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

---

(۱) یہ واقعات ۲۹-۱۷۰۷ء میں پیش آئے۔ سولھویں فصل ملاحظہ فرمائیے

(۲) غلجی قبیلہ جن شاخوں اور گھرانوں میں بٹا ہوا ہے اس کتاب میں اس کی تفصیل درج نہیں کی جا سکتی۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ جے اے رابنسن کی کتاب NOMAD TRIBES OF EAST AFGHANISTAN

غور غشت

- دانے
- بابے
- مندو
  - مندوخیل (ژوب)

دانے، بابے:
- کاکڑ (پورا شمالی بلوچستان)
- پانڑی
- داوے

پانڑی:
- پانڑی (سبی)
- گدون یا جدون (مردان اور ہزارہ)
- موسیٰ خیل (بلوچ سرحد)
- صافی (پشاور اور باجوڑ کی سرحد)

بلوچستان میں ژوب لورالائی اور سبی کے کچھ علاقوں کے کاکڑ تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن یہ علاقہ بڑا غریب ہے اور جنگ یا امن میں ان قبائل کا مرتبہ کبھی بلند نہیں سمجھا گیا بلوچ قبائل کے ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے بلوچیوں کی طرح وہ بھی اپنے حاکموں کا احترام کرنا جان گئے ہیں اور وہ عام پٹھانوں کے مقابلہ میں قانون کی زیادہ پابندی کرتے ہیں۔

وہ گدون جو ابھی تک پختو بولتے ہیں تعداد میں بہت کم ہیں اور مہابن پہاڑ کی جنوبی ڈھلوانوں پر ستانا اور ٹوپی کے قریب آباد ہیں جہاں دریائے سندھ پہاڑوں سے اترتا ہے۔ دریائے سندھ کے دوسرے (بائیں) کنارے پر ہزارہ میں اسی قبیلہ کی زیادہ تعداد پائی جاتی ہے یہ لوگ جدون کہلاتے ہیں اور ایبٹ آباد کے پاس رش کے میدان اور آس پاس کی پہاڑیوں میں رہتے ہیں یہ لوگ اپنے اجداد کی زبان اور طور طریقے بھول چکے ہیں اور ہزارہ کی پنجابی بولتے ہیں۔

صافی قبائل مہمندوں اور باجوڑ کے ترکلانیوں کے درمیان باجوڑ کی وادی کے گوشوں میں آباد ہیں وہ اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ افغان قبیلوں میں وہ غالباً سب سے بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں اور آج کل کے زمانہ میں بھی اس قبیلہ میں بڑے کٹر مسلمان پیدا ہوئے ہیں۔

یہاں تخت سلیمان کے شیرانیوں کا بھی تذکرہ ضروری ہے جو غورغشت کی شاخ سے سمجھے جاتے ہیں کیونکہ شیرانی نے (شجرہ نمبرایک

کےمطابق) سڑبنیوں کو چھوڑ دیا اور ایک کاکڑ عورت سے شادی کرلی- قبیلہ سے باہر شادی کرنا یا باہر کے آدمی کو لڑکی دینا پٹھانوں میں رائج نہیں ھے جب ایسا ھوجاتا ھے تو بیرونی شوھر سے توقع کی جاتی ھے کہ وہ اپنی بیوی کے قبیلہ میں شامل ھو جائے چنانچہ شیرانیوں نے جو کاکڑوں کے قریب ھی رھتے ھیں ایسا ھی کیا-

اس بیان پر قیس کے تینوں بیٹوں کے شجرے ختم ھو جاتے ھیں لیکن افریدی خٹک اور اورک زئی جیسے مشھور قبیلے کہاں گئے؟ یہ وہ نام ھیں جو ایک نووارد کے ذھن میں بھی لفظ پٹھان کے ساتھ ضرور ابھرتے ھیں- بنگش قبیلہ کہاں ھے اور محسود اور وزیر قبائل کا کیا بنا؟ خیبر اور وزیرستان اورکوھاٹ کی پہاڑیوں اور خٹک ناچ والوں کا تذکرہ کہاں گیا؟ وھی رقاص جو تلوار ھاتھ میں لے کر آگ کے گرد تیزی کے ساتھ گھومتے ھوئے ناچتے ھیں- کیا ان سب کو فراموش کردیا گیا؟

اس کا جواب یہ ھے کہ شجروں میں یہ تمام قبیلے جنھیں غالباً دنیا دوسرے قبیلوں کے مقابلہ میں زیادہ جانتی ھے- بعد میں سجھائی دینے والی بات کی طرح شامل کئے گئے ھیں - ان سب کا مشترکہ لقب کرلانی ھے - دھلی کے درباری مورخ ان قبائل سے ناواقف تھے- وہ صرف اتنا ھی جانتے تھے کہ وہ روہ کے علاقے میں رھنے والے جنگلی پہاڑی ھیں- چنانچہ ان مورخوں نے بدنیتی کے ساتھ اور کسی چھان بین کے بغیر انھیں شجروں کے آخر میں ایک گمنام سی جگہ دے دی - اس طرح بعض مورخ جن میں نعمت‌اللہ بھی شامل ھے انھیں کترانی (۱) کے لقب سے یاد کرتے ھیں اور اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ اگر دوسرے قبیلوں کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ ھے تو اس کی نوعیت کیا ھے- دوسروں (۲) نے غورغشت کا ایک اور بیٹا برھان ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ ان قبیلوں کو غورغشتی شاخ سے ملا دیا- اس طرح برھان کو کرلان یا کرلانی کا باپ قرار دے دیا گیا- کرلانیوں کی زیادہ باعزت لیکن روایتی ابتدا اس طرح ھوئی-

ارمڑ(۳) قبیلہ کے دو بھائی ایک کھلے میدان میں گئے اور ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں فوج رات کے وقت پڑاؤ کرنے کے بعد آگے بڑھ گئی

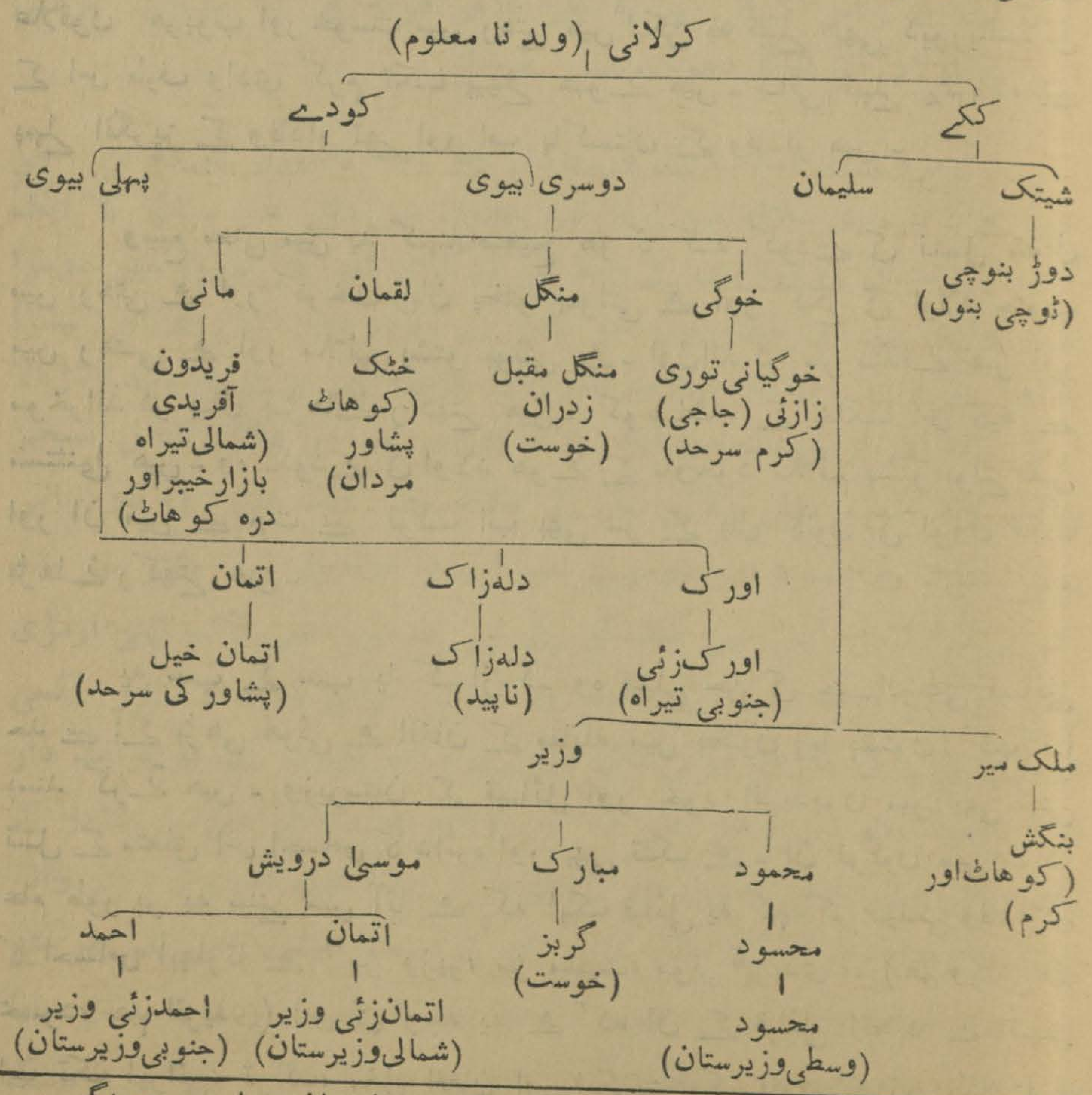
---

(۱) کرلانی کی بگڑی ھوئی شکل -

(۲) بحوالہ SIR HENRY McMAHON'S *TRIBES OF DIR, SWAT and BAJAUR.*

(۳) گوشوارہ اول ملاحظہ فرمائیے - ارمڑ شرخبون کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اس کے کچھ اخلاف آج بھی جداگانہ زبان بولتے ھیں -

تھی ۔ ایک بھائی کو جو بے اولاد تھا ایک کلھاڑا (بعض کہتے ہیں کڑھائی) اور دوسرے کو نوزائیدہ بچہ ملا ۔ جس بھائی کو کلھاڑا یا کڑھائی ملی تھی اس نے دوسرے سے کہا اے بھائی میں اولاد سے محروم ہوں۔ یہ مجھے دے دے میں اسے اپنی اولاد کی طرح پالونگا اور اس طرح دنیا میں میرا نام باقی رہے گا۔ خدا تجھے نیکی دے میں تمام عمر تیرا مرہون احسان رہوں گا ۔ یہ کلھاڑی (کڑھائی) لے لے اور بچہ مجھے دے دے۔ اس کے بھائی نے ایسا ھی کیا ۔ پشتو میں کلھاڑی اور کڑھائی کا تلفظ ملتا جلتا ھے ۔ چنانچہ بچہ کا نام کرلانی پڑگیا ۔ جب وہ بڑا ھو گیا تو اس کے لے پالک باپ نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی ۔ پھر زندگی ھنسی خوشی بسر ھونے لگی اور ان کی اولاد خوب پھلی پھولی(۱) ان کا شجرہ یہ ھے۔



(۱) ریورٹی نے اس کہانی کی تمام شکلیں نقل کی ھیں اور ان پر ایسی سنجیدگی سے بحث کی ھے گویا وہ بھی تاریخ کا حصہ ھیں ۔

اس طرح یہ مشہور قبیلے جن کے نام ڈیڑھ سو سالہ انگریزی تحریروں میں گونجتے ہیں غیر یقینی اجداد اور ایک لےپالک مورث اعلیٰ کے ذریعہ یکجا کردئے گئے ہیں۔ یہ وہی قبیلے ہیں جن کے نام بےجگری اور شجاعت کے مترادف ہیں جو وفا سرشت اور بےقابو طبیعت کے عجیب وغریب مرکب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ پشاوری قبائل جو خرشبون کی اولاد ہیں (شجرہ نمبر ۲) اور آباد غلجیوں (شجرہ نمبر ۳) کو چھوڑ کر کرلانی گروپ میں صوبہ سرحد کے تمام مشہور نام شامل ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شیتک شاخ کے سوا (دوڑ اور بنوچی) جو زرخیز اور سیراب وادی میں رہتے ہیں باقی ہر قبیلہ پہاڑی ہے۔ ان میں سے صرف چند قبیلے منگل، مقبل زدران اور جاجی ڈیورینڈ لائن کے پار لیکن قریبی علاقوں ہریوب اور خوست میں رہتے ہیں لیکن یہ قبیلے بھی ڈیورینڈ لائن کے اس طرف وادی کرم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ باقی قبیلے ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریز کے وفادار تھے اور اب پاکستان کے وفادار ہیں۔

وسیع معنی میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ کودے کی نسل شمال میں رہتی ہے اور کرخت زبان پختو بولتی ہے اور ککے کی اولاد جنوب میں رہتی ہے اور ملائم پشتو بولتی ہے۔ اول‌الذکر سر منڈاتے ہیں اور موخرالذکر بال بڑھائے رکھتے ہیں۔ کوہاٹ کے خٹک اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ کودے کی اولاد ہونے کے باوجود ملائم پشتو بولتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ اب بھی سر کے بال کانوں کی لووں تک بڑھائے رکھتے ہیں۔

یہ سب کے سب یا کم از کم وہ قبیلے جن کی حب‌الوطنی قبائلی حد سے آگے بڑھی ہوئی ہے افغان کے مقابلہ میں پختون (یا پشتون) کہلانا پسند کرتے ہیں۔ وزیرستان کے قبائل اور خود افریدیوں میں بھی اپنی نسل کے متعلق اس احساس کا دائرہ اور بھی تنگ ہے۔ ان لوگوں میں رہ کر عام طور پر یہ سننے میں آتا ہے کہ ایک قبائلی یہ کہہ کر سیاسی وفاداری کا احساس ابھارتا ہے ”مژ وزیر، مژ مسیت، مونږ آپریدی،، (ہم وزیر، ہم محسود، ہم افریدی) اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قبائلی اتحاد نے انہیں اب تک ایرانی، ترک، مغل افغان اور انگریز حکمرانوں کے زیر نگین آنے سے محفوظ رکھا ہے۔ تمام حکمرانوں نے دانشمندی اسی میں سمجھی کہ

ان قبائل کے ساتھ نرمی کا سلوک اختیار کیا جائے۔ اور قبائل اپنی زبان اور کردار سے اس حقیقت پر فخر کرتے ھیں۔

کرلانی نسل کے شجرے کی بین السطور سے ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ھیں؟ ہم یہ دیکھتے ھیں کہ مشہور ترین قبائل یعنی وہ قبیلے جو کبھی کسی سلطنت میں شامل نہیں ہوئے اور جو پیشہ ور سپاھیوں کی حیثیت سے بہت مشہور ھیں بعد میں سجھائی دینے والی تفصیل کی طرح افغانوں میں شامل کر لئے گئے ھیں۔ ان کا جد امجد ارمڑ بھی جس کے نام سے یہ قبیلے مشہور ھیں نسب ناموں میں متبنیٰ ظاھر کیا جاتا ھے اور آج کل کے ارمڑ بھی افغان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک ارمڑ قبیلہ ایک بچے کو گود لے لیتا ھے۔ اس کہانی سے یہ یقین ظاھر ہوتا ھے کہ پہاڑی کرلانی قیس کی اولاد ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے

ارمڑوں کے اسلاف کے بارے میں جو قصہ مشہور ھے وہ بڑا معنی خیز ھے۔ سرحدی علاقہ میں ارمڑ تین خطوں میں ملتے ھیں۔ ان کا ایک گروہ وزیرستان کی پہاڑیوں کے وسط میں مرکزی شہر کانی گورم، میں دوسرا لوگر وادی کے اس حصہ میں جو کابل سے زیادہ دور نہیں ھے اور تیسرا پشاور سے قریباً دس میل جنوب مشرق کی جانب تین بڑے دیہات ارمڑ بالا ارمڑ میانہ اور ارمڑ پایان میں آباد ھے۔ ان میں سے جو قبائلی ناقابل تسخیر وادی کانی گورم یعنی بالائی بدر کے علاقہ میں آباد ھیں وہ دو زبانیں بولتے ھیں۔ وہ محسود اور دوسرے غیر ارمڑی قبائلیوں سے پشتو میں بات کرتے ھیں لیکن آپس میں گفتگو کے لئے ان میں ابھی تک اپنی ارمڑی رائج ھے جو درجہ بندی کے لحاظ سے مشرقی ایرانی زبان ھے اور کسی دوسری زبان کی بگڑی ہوئی شکل نہیں ھے۔ ان قبیلوں کے جو قرابت دار لوگر اور پشاور میں رھتے ھیں وہ اپنی زبان بھول چکے ھیں۔ پشاور کے پاس رھنے والے ارمڑ جنھیں میں اچھی طرح جانتا ہوں آس پاس رھنے والے پٹھانوں یعنی اکوڑہ کے خٹک اور باڑہ کے مہمند قبیلوں میں ضم ہو گئے ھیں اور صرف پختو بولتے ھیں۔ لیکن ان میں اب بھی یہ احساس پایا جاتا ھے کہ وہ دوسروں جیسے نہیں ھیں۔ اور ان کی نسل آس پاس کے دوسرے قبائل کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ھے۔

کانی گورم میں ارمڑ قبائل کے چار سو گھرانے اور کل آبادی قریباً تین ہزار ہے - ان کے ساتھ بہت سے سید بھی رہتے ہیں جو ارمڑی زبان بولتے ہیں اور سادات ہونے کے دعوے کے باوجود ان ہی ارمڑوں کے بڑے خاندان ہیں - ارمڑ قبیلہ کی علاحدہ ثقافت ہے اور وہ اس علاقہ کا تاجر طبقہ ہے - وہ دوسرے علاقوں میں بسنے والے ارمڑوں سے اپنا رشتہ بھی ظاہر کرتے ہیں جس طرح ان علاقوں کے ارمڑ قبائل ان سے قرابداری کا دعویٰ کرتے ہیں - کانی گورم صوبہ سرحد کی پہاڑی کے ایک بہت ہی دشوار گزار گوشے میں واقع ہے اور پشتو بولنے والے محسود اور وزیر قبائل کے درمیان ان ارمڑوں کا باقی رہ جانا بڑا اہم ہے - اس کے علاوہ وزیرستان پشاور اور لوگر جہاں ارمڑ آباد ہیں دور دور پھیلے ہوئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں ان لوگوں کو بڑی اہمیت حاصل رہ چکی ہے ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے کہ ایک ارمڑ نے کرلانی پٹھانوں کو متبنیٰ کی حیثیت سے اپنا لیا تھا - روایات سے سمجھ میں آنے والی حد تک یہ صداقت ظاہر ہوتی ہے کہ کرلانی بھی اسی علاقہ کی ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو پشتو نہیں بولتی تھی - بعد میں یہ لوگ پشتو یا پختو بولنے والوں میں ضم ہوگئے یا ان سے مغلوب ہوگئے اور انھوں نے غلبہ پانے والی نسل کی زبان بھی سیکھ لی - کم از کم روایت سے اس عقیدہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے کہ کرلانی صحیح النسب افغان نہیں ہیں بلکہ ہو سکتا ہے ان کی نسل زیادہ قدیم ہو -

حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن آج کل کے کرلانی قبیلے یعنی وزیر بنوچی خٹک بنگش اورک زئی افریدی اور دوسرے قبائل بڑے فخر کے ساتھ پٹھان کہلاتے ہیں اور دوسرے قبائل کے مقابلہ میں پختون ولی یعنی پٹھان طرز زندگی کے سچے مظہر ہیں - اور شاید یہی وجہ ہے کہ دوسرے قبائل مثلاً یوسف زئیوں کے برخلاف وہ افغان لقب پر پٹھان کو ترجیح دیتے ہیں - اس طرح روایات سے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ افغان اور پٹھان ایک ہی زبان دو مختلف شکلوں میں بولتے ہیں اور ملے جلے رہتے ہیں لیکن وہ دونوں دو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں - افغان اپنی فتوحات کے ذریعہ زرخیز میدانوں قندھار ہرات کابل اور پشاور

پر قابض ہیں جبکہ پٹھان پہاڑی باشندہ ہے - (۱)

اور تیسرا طبقہ غلجیوں کا ہے جس کی روایات بھی غیر ایرانی ہیں اتنی بات تو نسب ناموں سے بھی ظاہر ہوتی ہے - ابھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ نتائج ان تھوڑے بہت حقائق پر کہاں تک منطبق ہوتے ہیں جو شمال مغربی راستے سے سندھ کے طاس میں داخل ہونے والی قوموں کی تحریر شدہ تاریخ سے ظاہر ہوتے ہیں -

---

(۱) MORGENSTIERNE کی تصنیف *ETYMOLOGICAL VOCABULARY OF PUSHTU* سے اس نظریہ کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے کہ ابتدا میں پختون یا پشتون کالقب صرف پہاڑوں میں رہنے والے قبائل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پختون یا پشتون کا اوستا میں استعمال کئے ہوئے لفظ 'پارستا، سے جس کے معنی ٹیلہ یا پہاڑی ہیں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ آدھر ریورٹی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لفظ پشتون کی اصل تاجک (فارسی) لفظ پشت ہے جس کے معنی ہیں کمر - یہ لفظ پہاڑی یا ٹیلہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دوسرے معنی کسی لغت میں درج نہیں ہیں۔ البتہ یہ خیال اس لئے پیدا ہوا ہوگا کہ ایک پہاڑ جو ایران اور عراق کی سرحد پر واقع ہے پشت کوہ کہلاتا ہے۔

فصل دویم

یونانی مورخین

اب تک زمانہ قبل اسلام میں افغانوں اور پٹھانوں کے متعلق ہم نے ان روایتی حوالوں کا جائزہ لیا ہے جو فارسی کی مختلف کتابوں میں دستیاب ہیں اور جو مغل دربار میں لکھی گئیں - یہ حوالے سترھویں صدی کی ابتدا سے پہلے معرض تحریر میں نہیں آئے تھے - اس جائزہ سے اس واضح احساس کا پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کم از کم تین مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ایک دوسرے سے قریب آگئے ہیں - یہ سب کے سب مختلف لہجوں میں ایک ہی زبان بولتے ہیں لیکن قبائل میں یہ رواج ہے کہ اپنے قبیلہ سے باہر شادی نہ کی جائے اس لئے ان کی حیثیت آج بھی شہد کے ایک ہی چھتہ میں مختلف خانوں جیسی ہے - ہمیں قبائل کی آپس کی قرابت داری کے بارے میں وہ تمام معلومات حاصل ہوگئی ہیں - جو خود ان قبائل کو حاصل ہیں -

لیکن نسلی ابتدا کے بارے میں اس نتیجہ سے مفر نہیں ہے کہ روایات کی حیثیت دیوؤں پریوں کی کہانی سے زیادہ نہیں ہے - در حقیقت یہ مفروضہ کہ افغانوں اور پٹھانوں کا گروہ جس کی بوقلمونی اظہر من الشمس ہے ایک صاف شفاف چشمہ ہے جس کی واحد اصل بابلی محکومی کے دور کے عبرانی ہیں اپنی تکذیب آپ ہے - دوسری تحریروں سے جو نسبتاً زیادہ معتبر ہیں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ علاقے جو اب افغانستان اور پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہیں تاریخ میں ایشیا بلکہ پوری دنیا کے ہر ملک کے مقابلہ میں زیادہ حملے دیکھ چکے ہیں - ہر حملہ آور اس علاقہ سے گزرتے ہوئے یہاں کی آبادی پر اپنے اثرات ضرور چھوڑ گیا ہوگا اور ایک طرز زندگی پر دوسرے طرز کی تہ چڑھتی گئی ہوگی - ایک اور بھی

نکته قابل غور ھے۔ ایک طویل زمانہ تک دریائے سندھ یا اسکے مغرب میں پہاڑوں کے پشتے آئے دن بدلنے والی سلطنتوں کی سرحد کا کام دیتے رھے ھیں اس طرح کے سرحدی علاقہ میں بسنے والوں پر ایک دوسرے سے خلط ملط ہونے والی تہذیبوں کا اثر ضرور پڑنا چاھئے۔ اس لئے ھمارا آئندہ کام یہ ہوگا کہ غیر ملکی مورخوں کی تحریروں اور اس زمانہ کے کتبوں کی چھان بین کریں۔ ھو سکتا ھے ان میں اس علاقہ کا تذکرہ ھو جہاں آج کل پٹھان آباد ھیں۔ یہ کام شروع کرنے کے لئیے ھم تاریخ کا ایک سرا پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ صوبہ سرحد میں تاریخ کے ابتدائی دور میں بسنے والے پٹھانوں نے نہ اپنی کوئی تحریر چھوڑی نہ کوئی یادگار عمارت بنائی۔ ھمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ آس پاس کے علاقوں میں ڈھلنے والے یا چلنے والے سکوں سے اصل کہانی کی کہاں تک تشریح ھوتی ھے۔ کم از کم ابتدا میں تو ھمیں غیر ملکی ذرائع ھی تلاش کرنے پڑیں گے۔

افغان روایات واضح طور پر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابلی محکومی سے شروع ھوتی ھیں۔ آئیے ھم بھی قریب قریب اسی زمانہ سے اپنی چھان بین کا آغاز کریں جبکہ کسرائے اعظم نے ۵۵۹ قبل مسیح میں ایران کی اخامنشی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس سال کسریٰ تخت پر بیٹھ گیا۔ حال آنکہ وہ شمال مغربی صوبوں کو ۵۵۰ قبل مسیح تک شکست نہ دے سکا۔ اخامنشی خاندان کی ابتدا در اصل ۵۵۰ قبل مسیح سے ھوتی ھے۔ یہ خاندان ۳۳۱ ق م تک حکمران رھا جبکہ اسکندر اعظم نے اس کا تختہ لٹ دیا۔ ان دو صدیوں سے زیادہ عرصہ میں افغانستان اور دریائے سندھ تک شمال مغربی سرحدی صوبہ اور دارا کے بعد پنجاب کے بھی کچھ حصے وسیع و عریض ایرانی سلطنت میں شامل رھے۔ (۱)

میں نے اس خطہ میں، جو ایرانی دنیا کہلایا جاسکتا ھے بارھا سفر کیا ھے اور مجھ پر یہ حقیقت روشن ھوئی ھے کہ ان تمام علاقوں پر ایران کا اثر اسلام سے کہیں زیادہ گہرا اور کہیں زیادہ قدیم ھے۔ اگر یہ اثر محض اسلامی ھوتا تو ایرانیوں کی طرح پٹھانوں میں بھی شیعہ مذھب رائج ھوتا۔ حقیقت یہ ھے کہ چند مستثنیات سے قطع نظر پٹھان کٹر حنفی سنّی ھیں۔ یہ حقیقت کہ ایرانی

(۱) TARN نے اپنی تصنیف ALEXANDER THE GREAT میں لکھا ھے کہ گندھارا اخامنشی خاندان کے آخری فرماں رواؤں کے عھد میں ایرانی سلطنت سے علحدہ ھو گیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ھے۔

فرقه بندی کی وجه سے وہ رشتے منقطع نہیں ہوئے جو پوری ایرانی دنیا کو منسلک کئے ہوئے ہیں اور یه دنیا دنیائے عرب سے مختلف ہے اس بات کو ظاہر کرتی ہے که یه رشتے مذہبی اثرات کے نہیں بلکه ان سے بھی زیادہ قدیم اور مختلف اثرات کے قائم کئے ہوئے ہیں۔ ایک لحاظ سے دریائے دجلہ سے لےکر دریائے سندھ تک ایشیا کے تمام بالائی علاقے ایک ہی خطه ہیں۔ اس خطه میں ایران کی روح طاری و ساری رہی ہے اور پورے علاقه میں ایک پس منظر ایک ثقافت ایک طریقۂ اظہار اور روحانی یگانگت پائی جاتی ہے جو پشاور اور کوئٹہ تک محسوس کی جاسکتی ہے۔ جس شخص نے اس روح کو محسوس کیاہے اس نے گویا ایک بہت بڑا راز پالیا ہے جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

جو شخص پنجاب سے پشاور یا بنوں کے علاقه میں داخل ہوتا ہے یا ان سے مغرب کی جانب پہاڑیوں پر چڑھتاہے وہ یه محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا که وہ دنیا کے ایک خطه کو چھوڑ کر دوسرے خطه میں داخل ہو گیا ہے اور وہ ایرانی سطح مرتفع کے کنارے پر پہنچ گیا ہے وہ دیکھتا ہے که یہاں کے پہاڑ مختلف ہیں۔ پودوں پر شگوفے کھلے ہیں موسم تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں چنار اور شاہ بلوط کے درخت نظر آنے لگتے ہیں صاف شفاف دریا زندگی سے بھر پور معلوم ہوتے ہیں۔ پرندوں کو دیکھ کر مغرب یاد آجاتا ہے دھوپ اور ہوا میں ایسی تیزی اور شوخی ہے جو روح میں بالیدگی پیدا کرتی ہے اور یہاں کے باشندے بھی وسطی ایشیا کے لوگ ہیں اس بر صغیر کے لوگ نہیں جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ زمانۂ قبل اسلام کے ایران کے متعلق پروفیسر غرشمین کی حالیه کتاب (ایران قبل از اسلام) کا لب لباب یہی ہے که وہ ثابت کرتے ہیں که ایرانی تہذیب اسلامی اثرات سے کہیں زیادہ پرانی اور کہیں زیارہ وسیع ہے۔ اس تہذیب نے ان اثرات سے مغلوب ہوئے بغیر انہیں اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں که دور دراز صوبوں خاص طور پر گندھارا (وادی پشاور) اور سیتھیوں(۱) پر اخامنشی حکمرانوں نے کتنے گہرے اور مفید اثرات چھوڑے ہیں۔ اخامنشی آرٹ اور فن تعمیر نے ہندوستان کے موریه خاندان کو بھی (۳۲۳-۱۰۹ قبل مسیح) یه ترغیب دلائی که وہ اپنے محلوں میں اصطخر کی عظمت دوبارہ زندہ کریں ادھر ابتدائی دور کی

(۱) SCYTHIANS

ہندوستانی ابجد جو خروشتی کہلاتی ہے ایرانی سلطنت کی درباری ابجد آرامی سے اخذ کی گئی ہے۔ فارسی زبان کے ساتھ وادی سندھ کے باشندوں کا رابطہ پیدا ہونے سے فاتحوں اور مفتوحوں کے استعمال کے لئے اردو کے طرز پر ملی جلی بولی معرض وجود میں آگئی۔

ماوراءالنہر افغانستان اور پاکستان کا وہ حصہ جو دریائے سندھ کے مغرب میں ہے اپنی ثقافت کے اعتبار سے آج بھی خراسانی ہے اس کا سبب اسلامی فتوحات نہیں بلکہ اس سے پہلے کے اخامنشی پارتھی اور ساسانی حکومتوں کے اثرات ہیں جو ایران سے پھیل کر ان ملکوں میں رونما ہوئے ایرانی اثرات میں سے سب سے پہلا اور سب سے گہرا اثر کسریٰ اور دارا کی حکومتوں نے چھوڑا۔ اور اس زمانہ کے بارے میں بھی جو تحریریں ملتی ہیں اور جو قریب قریب اسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں وہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس (۱) کی نگارشات اور سوسا، بےستون (بہستان) اور نقش رستم پر جو ایرانی صوبہ فارس میں اصطخر کے قریب واقع ہے دارا کے مزار پر لکھے ہوئے کتبے ہیں۔

مناسب یہ ہے کہ سب سے پہلے دارا کے کتبوں کا تذکرہ کیا جائے جو چٹانوں یا صاف کی ہوئی پتھر کی سلوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان کتبوں کی عبارتوں میں جو خودستائی اور تعلّیٰ سے بھری ہوئی ہیں اور اس زمانہ کے منکسرانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تمام اقالیم کی مکمل فہرست دی ہوئی ہے۔ مشرقی اقالیم میں ایریا (ہرات) باکتریہ (بلخ) کوراسمیا (خوارزم یا خیوا) ستا گودیا (یقینی طور پر شناخت نہیں کی جاسکتی) سوغویانا (آمو اور سردریا کا درمیانی علاقہ) اراکوسیا (قندھار) گندھارا (وادی پشاور) اور ہند کے نام گنوائے گئے ہیں۔ ان تین اقلیموں کے لئے جو ہماری موجودہ تحقیقات سے تعلق رکھتی ہیں قدیم فارسی میں تھتاگوش (ستاگدائے) گدارا (گندھارا) اور ہندوش (ہندوستان) کے نام استعمال کئے گئے ہیں۔ بےستون کے کتبے میں جو دارا کے دور سلطنت کے اوائل میں ان فتوحات کی یادگار کے طور پر تیار کیا گیا تھا جن کی بدولت اسے اقتدار حاصل ہوا ہندوستانی اقلیم شامل

(۱) HERODOTUS غالباً ۴۸۶-۴۶۶ قبل مسیح میں حیات تھا اور خیال ہے کہ اس نے ایتھنز کے باشندوں کو اپنی لکھی ہوئی تاریخ ۴۴۶ ق م میں پڑھ کر سنائی۔

نہیں ہے لیکن یہ اقلیم اصطخر کے محل اور نقش رستم کے مقام پر دارا کی قبر کے کتبوں میں شامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند پر دارا کے دور حکومت میں قبضہ ہوا تھا۔ گندھارا یا وادی پشاور ایک اقلیم کی حیثیت سے تینوں کتبوں میں شامل ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس بحث میں پڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کیا گندھارا واقعی وادی پشاور ہی کا نام ہے۔ اس لئے کہ موریہ، یونانی باختری، کشان اور اس کے بعد کے زمانوں، یہاں تک کہ البیرونی کے زمانہ میں بھی جس نے اپنی کتاب گیارھویں صدی میں محمود غزنوی کے متعلق لکھی ہے گندھارا اور وادی پشاور ایک ہی خطہ تھا اور اسے سب تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا ہیروڈوٹس کی تحریروں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ عین ممکن ہے کہ گندھارا دریائے سندھ تک اخامنشی دور کی ابتدا میں کسریٰ نے فتح کیا ہو اور یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر گندھارا اس وقت ایرانی سلطنت میں شامل نہیں تھا تو ایران میں اس کی شمولیت کی توثیق دارا کے برسراقتدار آتے ہی کر دی گئی تھی۔ گیمبیس نے جو کسریٰ اور دارا کے درمیانی عہد میں گزرا ہے اور جو ایک یونانی نژاد بادشاہ تھا صرف سات سال حکومت کی اور وہ مشرق کی طرف نہیں آیا۔ وہ مصر کی فتح، حبشہ پر ناکام چڑھائی اور قرطاجنہ پر حملے کا منصوبہ بنانے میں جو کبھی پورا نہیں ہوا بری طرح مصروف رہا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان جس سے غالباً سندھ اور جہلم دریاؤں کا درمیانی علاقہ مراد ہے فتح کرنے کے لئے دارا نے اس وقت تک کارروائی نہیں کی جب تک کہ اس نے راستہ کا اندازہ لگا، اور جغرافیہ معلوم کرنے کے لئے یونانی سائیلکس کی قیادت میں گندھارا سے ایک مہم دریائے سندھ کے راستے نیچے کی طرف نہیں بھیج دی۔ اگر گندھارا میں حالات سازگار نہ ہوتے تو یہ مہم کبھی سر نہ ہو سکتی تھی۔ آیئے ہم یہ دیکھیں کہ اس سلسلہ میں ہیروڈوٹس کیا کہتا ہے۔

ہیروڈوٹس کی ان بہت سی عبارتوں کا جو شمال مغربی سرحد کی تاریخ پر روشنی ڈال سکتی ہیں متعدد انگریزی تصانیف میں تذکرہ آتا ہے۔ ان کتابوں میں بیلیو کی قیاس آرائی سے لے کر جو غالباً یونانی عبارت نہیں

پڑھ سکتے تھے ، ریورٹی کی کڑی تنقید بھی شامل ھے جو اس سلسلے میں تاریخ کے جدامجد کے تمام حوالوں کو ھیروڈوٹس اور ھندؤں کا خلط مبحث قرار دے کر نظرانداز کر دیتے ھیں - بعد میں آنے والے کئی محققوں نے جن میں سرجارج گریرسن ، سر آریل‌اسٹین اور پرفیسر مارگیسٹرین بھی شامل ھیں اپنی اپنی رائے ظاھر کی ھے - ان آرا کا بعد میں حوالہ دیا جائیگا - میرا یہ دعویٰ ھے کہ میں نے جو تجزیہ کیا ھے وہ ھیروڈوٹس کی تمام متعلقہ عبارتوں کے منطقی مطالعہ کا نتیجہ ھے جو پہلی مرتبہ پیش کیا جا رھا ھے - اس تجزیہ کو تاریخی کتبوں اور دوسرے دستیاب ذرائع کی پشت پناھی حاصل ھے

میں عبارتیں اسی ترتیب کے ساتھ درج کرتا ھوں جس میں ان پر غور کرنے کی تجویز ھے - (میں نے یہاں یونانی عبارت کو لاطینی انداز میں نہیں لکھا)

(۱) ھیروڈوٹس باب چھارم - ۴۴

ایشیا کا بیشتر حصہ داریوس نے دریافت کیا - یہ جاننے کے لئے کہ دریائے اندوس جو گھڑیال پیدا کرنے والے ایک اور دریا کو چھوڑ کر واحد دریا ھے اپنا پانی سمندر میں کس جگہ انڈیلتا ھے اس نے بہت سے ایسے آدمی بھیجے جن کی صداقت پر اعتماد کیا جا سکتا تھا اور ان میں کا روانڈا اسکولیکس بھی شامل تھا - یہ لوگ شہر کسپاتوروس اور پکٹویک کے ملک سے روانہ ھوئے اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ مشرق کی طرف دریائی راستے سے سمندر کی طرف چلے - پھر وہ مغرب کی طرف مڑ گئے اور تیس ماہ کے سفر کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں سے مصر کے بادشاہ نے لیبوا (افریقہ) کا چکر لگانے کے لئے فوئینیشیوں کو بھیجا تھا - یہ سفر ختم ھونے پر داریوس نے ھندیوں پر فتح پالی اور ان کے علاقہ میں سمندر کو اپنے استعمال میں لایا -

(۲) ھیروڈوٹس فصل سوئم ۱۰۲

ان کے علاوہ کچھ اور بھی ھندی ھیں جو کسپاتوروس شہر اور پکٹویک ملک کی سرحدوں پر آباد ھیں یہ لوگ دوسرے ھندیوں کے مقابلہ میں شمال کی جانب اور شمالی ھوا کی سمت میں آباد ھیں اور ان کے

بودوباش کے طریقے قریب قریب باختریوں جیسے ہیں - وہ تمام ہندیوں میں سب سے زیادہ جنگجو ہیں -

(۳) ہروڈوٹس فصل سویم ۹۱ (اس عبارت اور اگلی دو عبارتوں میں مورخ اخامنشی اقلیم اور ان کے باشندوں کی تفصیل بتا رہا ہے)

ستاگودے اور گنداریوئے اور دادیکے اور اپارتے نے جنھیں آپس میں ملا کر ایک ہی شمار کیا گیا تھا ۱۷۰ ٹیلنٹ ادا کئے - یہ ساتویں اقلیم تھی -

(۴) ہروڈوٹس فصل سوئم ۹۳
پکٹویک اور آرمینیوں سے ۴۰۰ ٹیلنٹ وصول کئے گئے- یہ تیرھویں اقلیم تھی -

(۵) ہیروڈوٹس فصل سویم ۹۴

ہندیوں نے جو تعداد میں ان سب سے زیادہ ہیں جو آج تک ہماری نظر سے گزرے ہیں دوسروں سے زیادہ یعنی سونے کے برادہ کے ۳۶۰ ٹیلنٹ (جو ۴۶۸۰ معمولی ٹیلنٹ کے برابر ہوتے ہیں) ادا کئے - یہ بیسویں اقلیم تھی -

(۶) ہیروڈوٹس فصل ہفتم ۶۶-۶۷ (کیخسرو کی فوج کی تفصیل بتاتے ہوئے)
گنداریوئے اور دادیکے بھی ہر لحاظ سے باختریوں کی طرح مسلح تھے- پکٹو پوستین کے لبادے پہنے ہوئے تھے اور اپنے ملک کی کمان اور خنجر سے مسلح تھے -

(۷) ہیروڈوٹس فصل اول ۱۲۵
سگاریتوئے جو خانہ بدوش ہیں

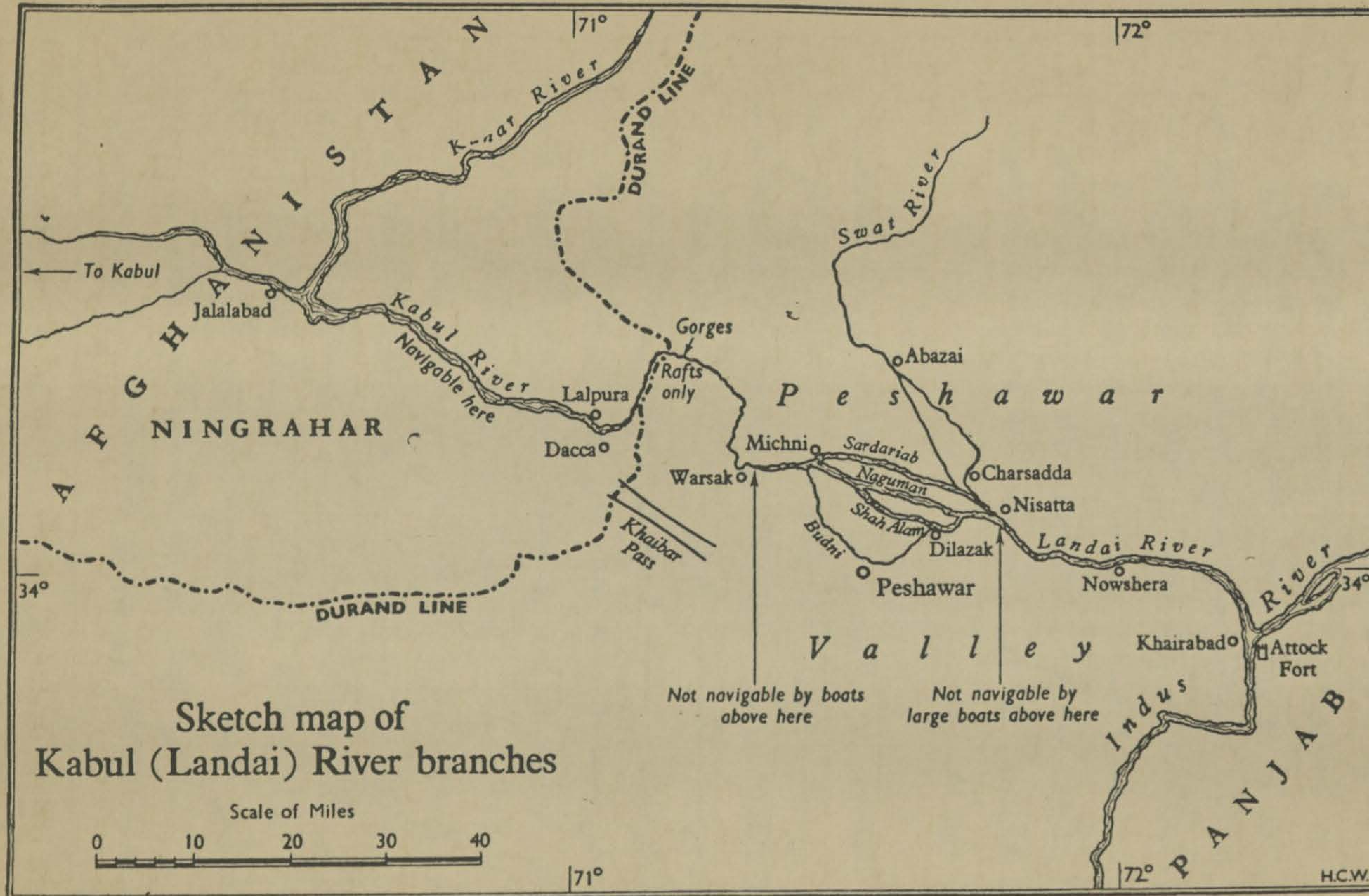
(۸) ہیروڈوٹس فصل ہفتم ۸۵
خانہ بدوش قبیلہ جو سگاریتوئے کے نام سے مشہور ہے- یہ ایک ایسی قوم ہے جو فارسی بولتی ہے اور لباس کے اعتبار سے نصف ایرانی اور نصف پکتوان ہے جس نے فوج کو آٹھ ہزار سوار فراہم کئے -

یہ بات قابل غور ہے کہ پہلی دو عبارتوں میں جن میں مصنف بالکل مختلف اور غیر متعلق نکات کا جائزہ لے رہا ہے شہر کسپاتوروس KASPATUROS کا تذکرہ کرتا ہے (شہر کا نام مفعول کی حیثیت سے استعمال ہونے کی صورت میں لفظ کے آخر سے پہلے حصہ پر زور پڑے گا) اور وہ اسی سانس میں پکٹویک کے ملک کا بھی تذکرہ کرتا ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کے ذہن میں یہ دونوں ساتھ ساتھ آئے ہیں ۔ پرانے محقق جن میں ہندوستان کے لسانی جائزہ کے مصنف گریرسن GRIERSON بھی شامل ہیں، جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ ہیروڈوٹس نے جن علاقوں کو پکٹو PAKTUES یا پکٹویک کا نام دیا ہے وہ قریب قریب وہی ہیں جو اب پختون کہلاتے ہیں ۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بعد کے محققوں نے جن میں اوسلو کے پروفیسر مارگینسٹیرن MORGENSTIERNE اور کیمبرج کے بیلی BAILEY شامل ہیں اس قیاس کی مخالفت کی ہے۔ میں اس صورت حال کو اس انداز میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا جس انداز میں میری سمجھ میں آئی ہے۔

فی الحال پکٹویک کی چھان بین سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ کسپاتوروس کیا تھا اور کہاں تھا ؟ پچاس سال پہلے تک کسی محقق نے اس سلسلہ میں اظہار رائے نہیں کیا تھا ۔ یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ چونکہ سائیلیکس SCYLAX جو اپنے وقت کا کپتان کک تھا دریائی سفر پر مشرق کی طرف روانہ ہوا تھا اس لئے اس نے یہ سفر دریائے کابل میں (جو ضلع پشاور میں لنڈے کے نام سے مشہور ہے) کیا ہوگا ۔ یہ دریا کابل سے مشرق کی طرف بہتا ہے اور جلال آباد کے پاس سے گزرتا ہوا درۂ خیبر سے چند میل شمال میں خیبر کی پہاڑیوں میں بہتا ہوا وادی پشاور میں داخل ہوتا ہے جہاں وہ دریائے سوات کے ساتھ مل کر اٹک کے قریب دریائے سندھ میں آگرتا ہے اس کے بعد دریائے سندھ سمندر تک قریب قریب جنوبی سمت میں بہتاہے ۔ اٹک کے قریب جو سمت بدلی ہے ضروری نہیں ہے کہ ہیروڈوٹس بھی اس سے واقف ہو لیکن جس شخص نے اس زمانہ میں بھی دریا میں سفر کیا ہو اس پر یہ تبدیلی واضح ہوئی ہوگی کیونکہ جغرافیائی تبدیلی اسے فوراً ظاہر کردیتی ہے اور سائیلیکس کو یقیناً اس تبدیلی کا احساس ہوا ہوگا ۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دریائی سفر مشرق کی طرف شروع ہوا ۔ لیکن کسپاتوروس کہاں تھا ؟ یہ کابل کا نام نہیں ہوسکتا کیونکہ اس مقام پر دریا میں کشتی نہیں چلائی جاسکتی۔

یہاں دریائے کابل کے رخ اور اس میں کشتی رانی کے متعلق مقامی معلومات ظاہر کر دینا ضروری ہے - جب تک یہ دریا جلال آباد کے قریب دریائے کونڑ سے آ کر نہیں ملتا اس میں چھوٹی بڑی کوئی بھی کشتی نہیں چلائی جا سکتی - اور اس سے بھی آگے بہاؤ کی طرف کشتی چلانا خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ خیبر کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے لالپورہ اور ورسک کے درمیان اس دریا میں کئی آبشاریں آتی ہیں - اس حصہ میں تختے باندھ کر ضرور بہائے جاتے ہیں لیکن کشتی رانی اس مقام سے پہلے ممکن نہیں ہے جہاں یہ دریا ورسک اور مچنی کے پاس سے گزرتا ہوا پشاور کے میدان میں داخل ہوتا ہے - آج کل اس مقام پر یہ دریا تین دھاروں میں بدل جاتا ہے جن کے نام شمال سے جنوب کی طرف سردریاب، ناگمان اور شاہ عالم ہیں - ایک چھوٹی سی چوتھی دھارا بھی ہے جو بڈنی کہلاتی ہے - یہ تینوں دھاریں چارسدہ سے ذرا نیچے نیستہ کے مقام پر پھر آملتی ہیں - اس اثنا میں شمالی دھارا دریائے سوات کو اپنے اندر ملا لیتی ہے - بڈنی دلہ زاک کے مقام پر شاہ عالم سے آملتی ہے - سنگھم سے نیچے کی طرف مشترکہ دھارا لنڈے کے نام سے مشہور ہے پشاور سے نیستہ کے سنگھم تک کا فاصلہ سولہ میل، شاہ عالم کے قریب ترین نقطہ تک (انتہائی جنوبی دھارا) سات میل اور بڈنی تک کا فاصلہ صرف ایک میل ہے - یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ تمام دھارے ماضی قریب میں بھی اپنا راستہ بدلتے رہے ہیں اور مغلیہ دور میں غالباً دو ہی دھارے تھے - پشاور دریا کے کنارے پر واقع نہیں ہے لیکن تمام پشاوری لنڈے کو اپنا ہی دریا سمجھتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ اب بھی اس میں سفر کرتے ہیں - ایک بات صاف ظاہر ہے وہ یہ کہ سائیلیکس اس دریا میں اپنا سفر پشاور سے اوپر کے مقام سے شروع نہیں کر سکتا تھا اس لئے ہمیں کسپاتوروس کی تلاش اسی علاقہ میں کرنی چاہئے -

کیا اس شہر کا تذکرہ کہیں اور بھی پایا جاتا ہے؟ یقیناً پایا جاتا ہے - یہ تذکرہ ملیٹس (MILETUS) کے جغرافیہ دان اور وقائع نگار ہیکاٹیئس (HECATAEUS) کی تحریر میں ملتا ہے جو ہیروڈوٹس سے بھی پہلے ۵۰۰ قبل مسیح میں لکھی گئی ہے - لیکن اس تحریر میں اسے کسپاپوروس KASPAPUROS لکھا ہے اس کے علاوہ ہیکاٹیئس یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کا کسپاپوروس گندھارا میں واقع ہے جبکہ ہیروڈوٹس اپنے کسپاتوروس KASPATUROS کی جائے وقوع پکٹویک بتاتا ہے -



Sketch map of
Kabul (Landai) River branches

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گندھارا اور پکٹویک ایک ہی علاقہ کے دو نام ہیں۔ میں اس مسئلے کو بعد میں چھیڑوں گا۔ میرا خیال ہے یہاں سے دو محقق جو ہمیشہ ایک دوسرے کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ کسپاپوروس در حقیقت پسکاپوروس ہے جس کے ہجے غلط ہوگئے ہیں اور یہ کوئی غیر معمولی غلطی نہیں ہے۔ اور پسکاپوروس پشاور کا نام ہے۔ اس نام کا موازنہ چینی سیاح 'هوان سانگ، کے دئے ہوئے نام پولوشاپولو، سنسکرت نام پرشاپورا، اور ابتدائی مسلم دور کے پرشاپور یا پشابور سے کیا جاسکتا ہے۔ البیرونی اور دوسرے مورخ اسی کو بشابور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہیروڈوٹس کے کسپاتوروس اور ہیکاٹیئس کے کسپاپوروس(۱) میں بنیادی فرق نہیں ہے اور اگر ایک نکتہ بحث طلب نہ ہوتا تو ہم اس تفصیل میں نہ پڑتے۔

وہ نکتہ یہ ہے:۔ البیرونی کی ایک عبارت میں یہ لکھا ہے کہ ملتان کو ابتدا میں کسیاپاپورا کہا جاتا تھا۔ اس عبارت سے دو مستشرقوں ہرزفیلڈ HERZFELD اور فوچر FOUCHER نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سائیلیکس جس کسپاپوروس سے سمندر تک پہنچنے کے لئے سندھ کے دریائی سفر پر روانہ ہوا تھا وہ ملتان تھا۔ لیکن ملتان سے سندھ کے بہاؤ کی طرف سفر کے متعلق ہیروڈوٹس یا کم از کم سائیلیکس جیسا ملاح یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مشرق کی طرف سفر کر رہا ہے اس کے علاوہ کسپاپوروس کو ملتان کا پرانا نام قرار دیتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ہیکاٹیئس نے کسپاپوروس کی جائے وقوع گندھارا اور ہیروڈوٹس نے پکٹویک بتائی ہے۔ اس ثبوت کے علاوہ خوش قسمتی سے اتھنائیس (ATHENAEUS) نے (۲۰۰ء) خود سائیلیکس کے خود نوشت سفرنامے کے کچھ حصے محفوظ رکھے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائیلیکس کے سفر کے دوران دریا کے متوازی ایک پہاڑ تھا جو کسی کسی جگہ بہت اونچا اور گھنے جنگل اور کانٹےدار جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس عبارت میں جسے بلجیم کے دو محققوں ہونگمان (HONIGMAN) اور مارک (MARICQ) نے بڑی محنت سے ڈھونڈ

---

(۳) پشاور کا تلفظ ادا کرتے ہوئے اس لفظ کے دوسرے حصہ پر خاصا زور دیا جاتا ہے ۔ یونانی لفظ پسکاپوروس کے تلفظ میں بھی اسی حصہ پر زور دیا جاتا ہے جس سے اس نظریہ کی کچھ اور تائید ہوتی ہے کہ پشاور در اصل پسکاپوروس کی نئی شکل ہے ۔

نکلا ہے من و عن ان تنگ گھاٹیوں کا بیان ہے جو اٹک سے نیچے شادی پور اور کالاباغ کے قریب سے بہاؤ کی طرف بلوٹ تک واقع ہیں۔ یہ بیان اس سفر پر منطبق نہیں ہوتا جو پنجاب کے میدان کے وسط میں ملتان سے شروع کیا گیا ہو۔ اس لئے ملتان کا مفروضہ اس قابل ہے کہ اسے مسترد کردیا جائے۔

اس دعوے کی حمایت میں کہ پسکاپوروس پشاور ہی کا دوسرا نام ہے ایک اور بھی شہادت موجود ہے اور یہ شہادت کتبے کی شکل میں ہے۔ نقش رستم کے مقام پر دارا اور اس کے اخلاف کی قبروں کے سرھانے شکاگو اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ماھرین آثار قدیمہ نے دو زبانوں میں لکھی ہوئی ایک بڑی دلچسپ عبارت کا پتہ لگایا ہے۔ یہ عبارت شاپور اول کی طرف سے لکھوائی گئی ہے جو ساسانی خاندان کا دوسرا شہنشاہ تھا اور جس نے ۲۶۰ء میں رومی حکمران ویلرین VALERIAN کو ایڈیسا EDESSA کی لڑائی میں شکست دے کر اسے اپنا محکوم بنا لیا تھا۔ اس عبارت میں جو پارتھی اور یونانی زبانوں میں تحریر ہے پشکبور PSHKBUR، پسکیبورا PASKIBOURA (۱) نامی ایک مقام کو ساسانی سلطنت کی مشرقی سرحد قرار دیا گیا ہے۔ اس مقام کا نام ہیروڈوٹس کے کسپاپوروس سنسکرت کے پرشاپورہ اور دور جدید کے پشاور سے اتنا ملتا جلتا ہے کہ اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اور لسانی شبہات ظاہر کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ ساسانی دور میں جو ہیرو ڈوٹس اور البیرونی کے زمانوں کے تقریباً درمیان میں ہے س نام کا وجود ایک ایسی کڑی ہے جس کی تلاش تھی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کی معقول وجہ موجود ہے کہ ہم ہیروڈوٹس کے کسپاتوروس کو پشاور ہی سمجھیں۔ پھر صاف ظاہر ہوجائے گا کہ سائیلیکس کے دریائی سفر اور اس سفر کے نقطۂ آغاز

---

(۱) اصل عبارت میں پ ش ک ب و ر درج ہے بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ اس لفظ سے پشاور مراد لینا درست نہیں۔ وہ اس سلسلہ میں جو وجوھات پیش کرتے ھیں ان سے مسئلہ سلجھنے کی بجائے اور الجھ جاتا ہے۔ پوری عبارت کا مفہوم ہے پشکیبورا تک پھیلا ھوا علاقہ، غالباً اس سے دریائے سندھ کے کنارے تک کا علاقہ مراد ہے۔ دریائے سندھ کئی بار فارس اور ہندوستان کے درمیان حد فاصل رہا ہے۔ لیکن KRAMERS اور MARICO نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ پشاور کو اس کے محل وقوع کی وجہ سے کسی طرح سرحدی شہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس شخص کے نزدیک جو اس سرحدی صوبہ میں رہ چکا ہو جس کا صدر مقام پشاور تھا یہ اعتراض نادانی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

کی تفصیلات ٹھیک بیٹھتی ھیں۔ پشاور دریائے لنڈے سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ھے اور بظاھر یہی وہ مقام ھوسکتا ھے جہاں سے سائیلیکس مشرق کی طرف دریائی سفر پر روانہ ھوا ھوگا اور پھر دریائی راستہ سے سمندر تک۔ یہ مفروضہ ھیروڈوٹس کے اس جملے پر بھی ٹھیک منطبق ھوتا ھے کہ ”کسپاتوروس اور اس کے آس پاس رہنے والے شمال کے تمام ھندوستانی باشندوں سے زیادہ بہادر اور جنگجو ھیں“۔ اس سلسلہ میں اس علاقہ کے موجودہ باشندوں کا تذکرہ غیر ضروری ھے اگر چہ ھیروڈوٹس کا بیان ان پر بھی صادق آتا ھے۔ موجودہ زمانہ سے قطع نظر ھیروڈوٹس کے جائزہ کی صداقت خود اسکندر اعظم پر بھی اس وقت واضح ھوگئی تھی جب اس نے ھیروڈوٹس سے ڈیڑھ سو سال بعد اس علاقہ پر حملہ کیا تھا۔

یہ سوال طے کرنے کے بعد اب ھمیں یہ معلوم کرنا ھے کہ پکٹویک کہاں تھا جس کا تذکرہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ھوں ھیروڈوٹس نے متعدد بار کسپاتوروس کے ساتھ کیا ھے۔ ان حالات میں پکٹویک وھی علاقہ ھے جس میں کسپاتوروس (پشاور) واقع تھا اور یہ علاقہ گندھارا یعنی وادی پشاور اور آس پاس کا علاقہ ھی ھوسکتا ھے۔ یہ بات تو عام طور پر تسلیم کی جاتی ھے کہ ھیکاٹیئس نے جس کسپاپوروس کا تذکرہ کیا ھے وہ گندھارا میں واقع ھے۔ اس طرح ثابت ھوگیا کہ پکٹویک، گندھارا اور وادی پشاور ایک ھی علاقہ ھے۔

اب تیسری عبارت کی طرف آئیے جس میں ھیروڈوٹس اقلیم کا نام بتائے بغیر یہ بتاتا ھے کہ دارا کی ساتویں اقلیم میں چار قبیلے ستاگودے، SATTAGUDAI گنداریوئے، دادیکے اور آپارتے آباد تھے۔ ان قبیلوں میں گنداریوئے GANDARIOI کو شامل دیکھ کر حیرت نہیں ھوتی کیونکہ بظاھر یہ ساتویں اقلیم گندھارا ھے جسے دارا کے کتبوں میں گدارا اور ھیروڈوٹس کی تحریروں میں پکٹویک بتایا گیا ھے۔ ھم فی الحال اس مسئلہ کو نظرانداز کرتے ھیں کہ باقی تین قبیلے کون کون سے تھے اور ھیروڈوٹس کی چوتھی عبارت کی طرف آتے ھیں۔

اس عبارت میں ھیروڈوٹس بڑے تعجب انگیز طریقہ سے ایک اور پکٹویک کا تذکرہ کرتا ھے جسے وہ آرمینیا کے ساتھ جوڑ دیتا ھے اور یہ لکھتا ھے کہ یہ سلطنت کی تیرھویں اقلیم تھی۔ اب تک یہی فرض کیا گیا ھے کہ یہ اس جگہ سے مختلف ھے جہاں سے سائیلیکس نے اپنا دریائی سفر

شروع کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ مفروضہ بالکل غلط ھے۔ اخامنشی کتبوں میں آرمینیا کے ساتھ کسی اور ملک کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ آرمینیا کو ھمیشہ ایک علحدہ اقلیم دکھایا گیا ھے۔ گمان غالب یہی ھے کہ دارا کی اقلیموں کی فہرست درج کرتے ھوئے مورخ یا اس کے منشی کے قلم نے لغزش کی ھے اور پکٹویک کا نام غلط جگہ لکھدیا ھے۔ دراصل یہ تیرھویں اقلیم نہیں بلکہ ساتویں اقلیم ھے جہاں گنداریوئے وغیرہ رھتے ھیں۔ یہ مفروضہ ھیروڈوٹس کی ان دوسری دو عبارتوں کے عین مطابق ھے جن میں بتایا گیا ھے کہ پکٹویک دریائے کابل کے کنارے پر واقع ھے اور گندھارا کے علاقہ میں ھے۔ پکٹویک جہاں سے سائیلیکس نے اپنا دریائی سفر شروع کیا تھا ھیروڈوٹس کی تاریخ میں اس کا تذکرہ صرف دو صفحوں کے بعد (باب سویم صفحہ ۱۰۲) آتا ھے اگر اخامنشی سلطنت میں اس نام کے دو ملک ھوتے جو بجائے خود ایک عجیب مفروضہ ھے تو ھیروڈوٹس اس کا تذکرہ کئے بغیر نہ رھتا۔ چنانچہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ھوں کہ ساتویں اقلیم جس میں گنداریوئے اور دوسرے تین قبیلوں کی بودو باش بتائی گئی ھے مختلف شکلوں میں پکٹویک یا گندھارا تھی۔

پانچویں عبارت اس لحاظ سے زیر بحث مسئلہ سے متعلق ھے کہ اس کے مطابق گندھارا اور ھند دو الگ اقلیمیں تھیں جیسا کہ اخامنشی کتبوں سے بھی ظاھر ھوتا ھے۔ جیسا کہ ھمیں پہلی عبارت سے معلوم ھوتا ھے ھند اس وقت تک فتح نہیں ھوا تھا جب تک کہ گندھارا سے جو سلطنت کا حصہ بن چکا تھا سائیلیکس کا دریائی سفر پورا نہیں ھوا۔

دارا کی سلطنت کے ھندوستانی صوبہ کی مشرقی سرحد ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ھے لیکن ھم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اسکندر کی مہمات سے ظاھر ھوتا ھے کہ یہ سرحد دریائے جہلم تھی اور کسی حالت میں مغربی اور مشرقی پنجاب کی موجودہ سرحدوں سے آگے نہیں تھی۔ یہ بات دلچسپ ھے کہ ھیروڈوٹس اور اس کے بعد اسکندر اعظم اور یونانیوں اور رومیوں کے زمانوں کا ھندوستان اس علاقہ کا ایک حصہ تھا جسے ھم پنجاب اور سندھ کے نام سے پکارتے ھیں۔ یہ وادی سندھ تھی جو جغرافیائی اعتبار سے سرحدی ضلعوں کو چھوڑ کر آج کا مغربی پاکستان بنتی ھے اس طرح قدیم تاریخ کے پیش نظر ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد بھارت سے زیادہ پاکستان

کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہندوستان کہلائے۔ دارا، ہیروڈوٹس، اسکندر، پامپی، هوریس، اور ٹراجن ہندوستان سے وہی جغرافیائی علاقہ مراد لیتے رہے ہیں جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے۔

چھٹی عبارت میں پکٹوؤں کو جو بدیہی طور پر پکٹویک کے باشندے ہیں کیخسرو کی فوج کا ایک حصہ بتایا گیا ہے اور ہیروڈوٹس یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ کمان اور خنجر سے مسلح تھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ توڑے دار بندوق کے رواج سے پہلے تاریخی عہد کے پٹھان قبائل کا عام ہتھیار کمان تھی اور خنجر آج بھی تمام پہاڑی قبائلیوں کا عام ہتھیار ہے۔ افریدیوں اور وزیریوں کے لئے لمبا خنجر اسی طرح ایک قابل فخر ہتھیار ہے جس طرح گورکھے اپنی ککری پر ناز کرتے ہیں۔

کسپاتوروس کو پشاور اور پکٹویک کو پشاور کے آس پاس کا علاقہ قرار دے کر کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ موجودہ پختون کے ساتھ پکٹویک اور پکٹو کی مشابہت محض ایک اتفاق ہے؟ گریر سن نے ان دونوں کی مطابقت کو تسلیم کیا ہے لیکن بعد میں آنے والے اور زیادہ مشہور مستشرقین نے اس مطابقت کی کوشش پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے۔ ان میں کیمرج کے پروفیسر بیلی اور اوسلو کے مارگینسٹیرن پیش پیش ہیں۔ موخرالذکر کو خاص طور پر اس میدان میں کافی عملی تجربہ ہے اور ان کی رائے اس قابل ہے کہ اسے وزن دیا جائے۔ آئیے ہم دیکھیں وہ کس بنیاد پر مطابقت کی تائید نہیں کرتے۔

پروفیسر بیلی کے دلائل ان کے مضمون 'کوسانیکا، میں درج ہیں جو جرنل آف دی برٹش اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دلائل ۱۹۵۲ء میں پیش کئے گئے تھے۔ ان کا اعتراض اس دعوے کی بنیاد پر قائم ہے کہ لسانی اعتبار سے پکٹو اور پشتون کا آپس میں تعلق نہیں ہوسکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ پختون کا کرخت لب و لہجہ بعد کی پیداوار ہے اور اسے محض ایک لہجہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی مضمون میں آگے چل کر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یونانی مصنف ایرانی خ ت کے لئے KT استعمال کرتے تھے (مثلاً فارسی باختری کے لئے باکترا) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی دلیل کی واحد بنیاد یہی ہے کہ وہ پختون کا تلفظ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ

پکٹو غالباً شمالی چترال کا مقام پٹو PATU ہوگا جس کے متعلق بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔

پروفیسر مارگنسٹیرن کے خیالات ان کے حالیہ مضمون 'افغان، میں ظاہر کئے گئے ہیں جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نئے ایڈیشن کے چوتھے مجموعہ میں شامل ہے۔ وہ بھی پشتو کو زبان کی عالی شکل قرار دیتے ہیں اور پختو کو بجا طور پر اسی زبان کی وہ شکل قرار دیتے ہیں جو شمال مشرقی علاقوں میں رائج ہے۔ بیلی کی طرح وہ بھی یہی دعوی کرتے ہیں کہ خت کا رواج بعد کی بولی میں ہوا ہے۔ اور یہ کہ شت کی آواز یونانی KT سے نہیں نکالی جاسکتی۔ وہ بھی اسی بنا پر یہ دعوی مسترد کر دیتے ہیں کہ پکٹو پختون سے مطابقت رکھتا ہے وہ بڑے دلچسپ طریقہ پر پشتون کا تعلق پارسیتا PARSYETAE سے ظاہر کرتے ہیں جو بطلیموس کے الفاظ کے مطابق پاروپامیسس PAROPAMISUS میں رہنے والا قبیلہ تھا۔ اس قیاس کے بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پارسیتا جو قدیم شکل میں پارسوانا PARSWANA کہلاتا تھا پارس یا فارس کے باشندوں یعنی فارسیوں یا فارسی دانوں سے مطابق ہے پٹھان آج بھی انہیں فارسی وان کہتے ہیں تاجیک یا فارسی بولنے والے دوسرے لوگوں کے لئے جنہیں کھرے پٹھان حقارت سے دیکھتے ہیں فارسی وان یا پارسی وان ایک عام لقب ہے جس میں تھوڑا سا تضحیک کا پہلو بھی شامل ہے۔

مارگنسٹیرن ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ پکٹوؤں کا کیا بنا۔

یہ دونوں محقق وثوق کے ساتھ یہ دعوی کرتے ہیں کہ وضع کے پابند ماہرین لسانیات کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ش کی جگہ خ کا استعمال بعد میں پیدا ہونے والی بولی کی شکل ہے۔ میری نظر سے یہ اظہار خیال بھی گزرا ہے کہ لب و لہجہ کی اس تبدیلی کی مثال کا متلی ھسپانوی زبان میں پائی جاتی ہے جس میں مقابلتاً زمانۂ حال میں ش کو خ سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کابل میں افغان حکومت کے ترجمان بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعوی کرتے ہیں کہ قندھار کی ملائم پشتو جس میں ش بولا جاتا ہے زبان کی اصل اور عالی شکل ہے۔

میں بڑے ادب کے ساتھ اس دعوے سے اختلاف ظاہر کرتا ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پختو اور پختون پر پشتو اور پشتون کو ترجیح دینے کا رجحان ان خیالات کے اثر سے پاک نہیں ہے جو اس زبان کے بولنے والے درانیوں کے ایما پر کابل سے پھیلائے گئے ہیں۔ ہیروڈوٹس نے جن پکٹووں کا تذکرہ کیا ہے وہ قندھار کے آس پاس نہیں رہتے تھے جو اب درانیوں کا وطن ہے بلکہ وادی پشاور میں آباد تھے۔ اور میں اس قیاس کی تائید کے لئے کہ کرخت لہجہ پشاور اور اس کے آس پاس کے علاقہ کے لئے نیا ہے اور زیادہ قابل یقین ثبوت طلب کروں گا۔ اس سلسلے میں کچھ اور باتیں بھی کہنے کی ہیں۔ جو شخص سالہاسال تک پٹھانوں میں رہا ہے وہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ خین (ښ) جو صرف اسی زبان کا مخصوص حرف ہے غیر محسوس طریقہ پر ش سے بدل جاتا ہے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تلفظ اس بات پر منحصر ہے کہ بولنے والے کے حلق میں بلغم کتنا ہے۔

یہ دعویٰ کہ کرخت لہجہ حال ہی کی بولی ہے پشاور کے علاقہ میں بسنے والے ان پٹھانوں کی رائے کو نظر انداز کر دیتا ہے جو مردان اور صوابی کے یوسفزئیوں کی زبان کو بہترین سمجھتے ہیں۔

خ کی قدامت کے بارے میں ایک اور بھی عمدہ شہادت موجود ہے۔ اریان (ARRIAN) اپنی کتاب اناباسیس (ANABASIS) کے باب چہارم میں صفحہ ۲۳ پر لکھتا ہے کہ ایوسپلا دریا (EUASPLA) (جس سے غالباً کونڑ مراد ہے) وہ جگہ ہے جہاں اسکندر کو اسپاسیوں (ASPASII) سے سابقہ پڑا تھا۔ ارسطو (ARISTOTLE) استرابو (STRABO) اور کوئنٹس کرٹیس (QUINTUS CURTIUS) اس دریا کو خواسپس (کواسپس) (KHOASPES CHOASPES) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یونانی زبان میں *ev* کا مطلب 'اچھا' ہے اس لئے یونانی زبان میں 'خو' اس لفظ سے آیا ہے جو اسپاسیوں کی زبان میں اچھا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا کم از کم یہ لفظ اخامنشی سلطنت کے اس حصہ میں استعمال ہوتا ہے۔ دریا کے نام کا مطلب ہوا اچھے گھوڑے کا دریا پختو میں اچھے کے لئے یہی لفظ یعنی 'ښه' (خه) یا 'ښۀ' (خو) استعمال ہوتا ہے۔ اسی معنی کے لئے پشتو کا لفظ 'شو' یا 'شۀ' ہے۔

یہ درست ہے کہ ہیروڈوٹس کے باب اول صفحہ ۱۸۸ نیز باب پنجم صفحہ ۴۹ اور ۵۲ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دریائے کارون (RIVER KARUN) بھی جس پر سوسا (SUSA) آباد تھا یونانی استعمال کے مطابق خواسپس کہلاتا تھا اور اس صورت میں ابتدائی نمونہ کی پختو استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ قدیم فارسی میں 'ہوا' (HUWA) 'اچھا' کے معنی

میں مستعمل تھا اور ہو سکتا ہے یہی لفظ یونانی زبان میں آکر خو سے بدل گیا ہو -

لیکن خو اور پختو کی مطابقت اتنی واضح ہے کہ اس علاقہ سے اس کے تعلق کا انکار کرنا بھی محض کج بحثی سمجھا جائیگا - کم از کم اتنا تو ثابت ہوچکا ہے کہ اسکندر کے دور میں کونڑ کے علاقہ میں ایک ایرانی زبان رائج تھی جو کرخت پختو سے ملتی جلتی تھی - آئندہ باب میں میں نے جدید زبان کرخت لہجہ کے ساتھ بولنے والے ایسپ زئی (یوسف زئی) اور اسپاسی کے ناموں میں یکسانیت کی طرف اشارہ کرکے اس گتھی کو سلجھانے کی ایک اور کوشش کی ہے

مختصر یہ کہ ہمیں لب و لہجہ کے فرق پر اعتراض کرنے والے ماہرین صوتیات کے دعوے مسترد کردینے چاہئیں اور جرآت کے ساتھ پختون اور پکٹوز کے باہمی ربط کا اعلان کردینا چاہئے - یہ تمام تفصیلات آپس میں بڑی مطابقت رکھتی ہیں اور جیسا کہ بیلی سمجھتے ہیں کم‌علمی کا نتیجہ نہیں ہیں -

ابھی کچھ اور پرانے تذکروں کو موجودہ واقعات سے جوڑنا ہے - ہیروڈوٹس نے جن چار قبیلوں کا تذکرہ کیا ہے اور جو مبینہ طور پر پکٹویک یا گندھارا میں رہتے تھے ان میں سے ایک کا نام اپارتے ہے - ان لوگوں کو 'گریرسن'، 'اسٹین'، اور دوسرے مشہور مستشرقین نے افریدی قراردیا ہے - اس معاملہ میں مارگنسٹیرن کو اعتراف ہے کہ کم از کم صوتی اعتبار سے دونوں ناموں کی مطابقت عین ممکن ہے - افریدی اور دوسرے بہت سے پٹھان آج بھی عادتاً ف کو پ سے بدل دیتے ہیں اور اس صوتی تبادلہ کو مسلمہ سمجھا جاتا ہے -

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اپارتے اپریدے کا نام ہے (افریدی اپنے لقب کا یہی تلفظ کرتے ہیں) تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دارا کی ساتویں اقلیم کے اپارتے تیراہ بازار اور خیبر اور کوہاٹ کے دروں میں ان ہی علاقوں پر قابض تھے جہاں آج کل اپریدے رہتے ہیں - لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اپارتے کے بارے میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ وہ قبیلہ ہے جو گنداریوئے سے ملی

ہوئی نہیں تو کم از کم قریبی اقلیم میں رہتا ہے ۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گنداریوئے وادی پشاور کے باشندوں کا نام ہے ۔ اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے آج اپریدیوں کا علاقہ وہیں ہے یعنی وادی پشاور سے ملا ہوا۔ اس کے علاوہ بیشتر اپریدیوں کے گھر پہاڑی گوشوں میں ہیں جہاں پہنچنا مشکل ہے۔ یہاں سے سطح سمندر سے دس ہزار فٹ سے پندرہ ہزار فٹ اونچے سفید کوہ کی چراگاہوں کے سوا اور کہیں نہیں پہنچا جاسکتا۔ کسی سلطنت نے اس علاقہ کو اتنا اہم نہیں سمجھا کہ اسے سلطنت کی حدود میں شامل کیا جائے۔

اپارتے اور اپریدی کی مطابقت کے اضافہ سے ہیروڈوٹس کی تحریروں میں ان ناموں کو تلاش کرنے کی کوشش کو بڑی تقویت پہنچی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ بیلیو ایک قدم اور آگے نکل گئے ہیں اور انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ستا گودے سے مشہور خٹک قبیلہ اور دادیکے سے کاکڑوں کی ایک غیر معروف شاخ مراد ہے جس کا نام وہ دادی بتاتے ہیں۔

میں نے دادی قبیلہ کا نام کبھی نہیں سنا۔ لیکن بیلیو کا ستاگودے اور خٹک میں مطابقت پیدا کرنا فکر کے لئے ایک تازیانہ ضرور ہے۔ ستاگودے دراصل قدیم ایرانی تھتاگوش کی یونانی میں بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اخامنشی کتبوں کے مطابق تھتاگوش بھی ایرانی سلطنت کی ایک اقلیم تھی اس کا صحیح محل وقوع غیر یقینی ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ اقلیم مشرق کی طرف تھی کیونکہ اقلیموں کی فہرست میں اس کا نام اس گروپ کے ساتھ آتا ہے جس میں ہند، اراکوسیا (قندھار) اور گندھارا شامل ہیں۔ گریشمین اس کا محل وقوع دریائے سندھ کے مغرب میں اور گندھارا کے جنوب میں یعنی موجودہ جغرافیہ کے مطابق سر سری طور پر کوہاٹ بنوں ڈیرہ جات اور وزیرستان کے علاقہ میں بتاتے ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جس کے ایک بڑے حصہ میں آج بھی خٹک قبائل آباد ہیں۔ خود ان کی اپنی روایات کے مطابق وہ کسی زمانہ میں وادی ٹوچی پر قابض تھے جہاں سے انہیں خود ان کے قرابت دار شیتک قبائل نے نکال باہر کیا۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کی بدولت ان کا نام اس سے وسیع تر علاقہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے جس پر وہ آج قابض ہیں۔

بیلیو اور ریورٹی میں سے کوئی بھی اخامنشی کتبے نہیں پڑھ سکتا تھا ریورٹی بیلیو کے قیاس کا مذاق اڑاتے میں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بیلیو نے اپنے قیاس کی حمایت میں غلطی سے یہ لکھ دیا تھا کہ پختو کے برعکس پشتو میں قبیلہ کے نام کا تلفظ شٹک ہو سکتا ہے جو ستاگودے سے قریب ہے (اس معاملہ میں ریورٹی حق بجانب ہیں کیونکہ خٹک کا پہلا حرف خ ہے جو تبدیل نہیں ہوسکتا۔ وہ حرف ښ (خیم) ہے جو ملائم بولی میں ش سے بدل جاتا ہے خٹک کبھی خود کو شٹک نہیں کہتے) لیکن ریورٹی اور بیلیو دونوں یہ بات بھول گئے تھے یا سرے سے واقف ہی نہ تھے کہ ایک کرلانی قبیلہ اور بھی ہے جو نسل اور وطن دونوں حیثیتوں سے خٹک قبیلہ کا قرابت‌دار ہے اور وہ شیتک قبیلہ ہے۔ شیتک ان قبیلوں کا مشترکہ لقب ہے جو آج کل وادی ٹوچی اور بنوں کے میدانوں میں آباد ہیں اور عام طور پر دوڑ اور بنوچی کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے خٹک قبیلہ کا یہ کہنا ہے کہ ایک زمانہ میں وہ علاقہ ان کے قبضہ میں تھا جس پر آج کل ان کے قرابت‌دار شیتک قابض ہیں اور بعد میں انہیں کوہاٹ اور پشاور کے ان علاقوں میں دھکیل دیا گیا جہاں وہ آج کل آباد ہیں۔

مغلیہ دور میں نسب ناموں کی اشاعت اور پشاور جانے والی شاہراہ کی حفاظت کے سلسلہ میں خٹکوں کے ساتھ اکبر کے معاملات سے پہلے خٹکوں اور شیتکوں کا ان ناموں کے ساتھ کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں بابر اپنی سرگزشت میں کرانیوں (کرلانی) کا تذکرہ ضرور کرتا ہے جن سے اس کا واسطہ ۱۵۰۵ء میں بنوں کے قریب نیازی اور عیسیٰ خیل قبیلوں کے ساتھ ساتھ پڑا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس کا یہ حوالہ خٹکوں یا شیتکوں یا دونوں کے بارے میں ہو کیونکہ دونوں کرلانی قبیلے ہیں اور جب بابر کا سابقہ اس علاقہ میں رہنے والے دوسرے کرلانی قبیلوں یعنی وزیر اور بنگش سے پڑتا ہے تو وہ ان کا تذکرہ ان ہی ناموں کے ساتھ کرتا ہے۔ بہرحال ہمیں اس بات سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ ابتدائی تحریروں میں ان قبیلوں کے نام نہیں ملتے۔ خود ابدالی بھی جو گزشتہ دو سو سال سے افغانستان پر حکومت کر رہے ہیں ان کا تذکرہ بھی اس زمانہ کے بعد تحریر میں آتا ہے۔ سب سے پہلے ان کا تذکرہ سترھویں صدی میں صفوی سلطنت کے دور میں ملتا ہے۔

خٹک اور شیتک جن کے علاقوں کی سرحدیں بنوں کے قریب ایک دوسرے سے ملتی ہیں دونوں مل کر اتنے بڑے علاقہ پر قابض ہیں جس کا کسی اور افغان یا پٹھان قبیلے یوسف زئی، درانی یا غلجی کے مقبوضات سے موازنہ کیا جا سکتا ہے - درۂ مالاکنڈ کے قریب لوند خوڑ کے آس پاس خٹکوں کی بستیوں سے شیتک قبیلہ کے دیہات تک جو ٹوچی میں بالائی دوڑ کے علاقہ میں واقع ہیں دو سو میل کا فاصلہ ہے۔ ان کے موجودہ علاقہ کی وسعت، ان کی تعداد کی کثرت اور ہر دور میں بنوں اور ٹوچی کے زرخیز نخلستانوں سے ان دونوں قبیلوں کا تعلق قبائلی دنیا میں ان کی اہمیت ظاہر کرتا ہے - وہ راتوں رات آسمان سے نہیں اترے - وہ اصلی سڑبنی افغان نسل سے نہیں ہیں بلکہ کرلانی ہیں - لامحالہ تھتاگوش کا محل وقوع قریب قریب وہی مقرر ہوتا ہے جہاں یہ قبیلے آج کل آباد ہیں - یہ محض اٹکل کے تیر چلانا ہے لیکن خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ اخامنشی تھتاگوش اور ھیروڈوٹسی ستاگودے میں نہ صرف صوتی اعتبار سے بلکہ حقیقتاً اس عظیم المرتبت قبائلی گروہ کی اصل تلاش کی جائے جس کا نام اس وقت سے جبکہ دور مغلیہ میں قبیلوں کی انفرادی شناخت شروع ہوئی صوبہ سرحد کی تاریخ میں جلی حروف میں لکھا ہے (۱) -

ھیروڈوٹس کی محولہ بالا آخری دو عبارتوں میں ایک خانہ بدوش قبیلہ سگارتیائے کا تذکرہ ہے جو کیخسرو کی فوج میں سواروں کی حیثیت سے شامل تھا اور ''وہ ایسا قبیلہ تھا جو فارسی بولتا تھا اور جس کا لباس نصف ایرانی اور نصف پکتوان تھا،،۔ یہ بیان ابدالیوں (درانیوں) پر اس وقت سے صادق آتا ہے جبکہ وہ دو سو سال سے کچھ زائد عرصہ پہلے نادرشاہ کے زمانہ میں پردۂ گمنامی سے باہر نکلے تھے - وہ افغان قوم ہیں جو انتہائی مغرب میں ایران سے بالکل قریب رہتے ہیں اور چونکہ سب سے پہلے انہیں

---

(۱) اس نظریہ کی تائید میں ایک اور اشارہ ملتا ہے - اس بارے میں کہ خٹک قبیلہ کا نام خٹک کس طرح پڑا یہ روایت مشہور ہے کہ اس قبیلہ کے جد امجد لقمان نے چار لڑکیوں کے لئے قرعہ اندازی میں حصہ لیا اور اس کے حصہ میں سب سے بد شکل لڑکی آئی - اسے اس کے ساتھیوں نے یہ کہہ کر چھیڑا کہ 'لقمان پہ خته کنبں لاړ'۔ یعنی لقمان کا پاؤں کیچڑ میں پھنس گیا - اس طرح خٹک دو لفظوں (خته اور کنبں) سے بنا ہے - یہ بات قابل غور ہے کہ دوسرے لفظ کنبں میں اخامنشی تھتاگوش کا ش موجود ہے - اگر تھ بدل کر خ ہو سکتا ہے تو دونوں لفظ ایک ہیں - پختو یا پشتو میں تھ استعمال نہیں ہوتا اس لئے یہ تبدیلی بعید از قیاس نہیں ہے -

شاہ عباس کے زمانہ میں (۱۵۸۷ تا ۱۶۲۹ء) اور پھر نادرشاہ کے زمانہ میں (۱۷۳۰-۴۷ء) میں اہمیت حاصل ہوئی ان سب کا اور خاص طور پر ان کے سرداروں کا رجحان پختو کے مقابلہ میں فارسی کی طرف رہا ہے۔ ابدالیوں پر فارسی تہذیب کا جتنا گہرا اثر ہے اتنا کسی اور افغان قبیلہ پر یہاں تک کہ غلجیوں پر بھی نہیں ہے جنھوں نے پندرہ سال تک ایران پر حکومت کی ہے۔

الفنسٹن نے درانیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے اس موقع پر دوہرانا بر محل ہے وہ لکھتے ہیں کہ درانی فارسی سمجھتے ہیں اور ان کے لباس ہتھیاروں اور گھروں سے قومی خصوصیات ضرور جھلکتی ہیں لیکن یہ چیزیں ایرانیوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ وہ اس قبیلہ کی خانہ بدوشی اور چراگاہی حیثیت پر بھی زور دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کے زمانہ (۱۸۰۹ء) میں یہ قبیلہ اس شرط پر آباد کیا گیا تھا کہ وہ فی ہل ایک سوار مہیا کیا کرے گا۔ الیگزینڈر برنس بھی بیس سال بعد اپنی کتاب میں خیال ظاہر کرتے ہیں کہ کابل کے تمام درانی فارسی بولتے ہیں اور اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو پشتو یاد ہی نہیں ہے یہ حقیقت آج بھی صادق آتی ہے۔ ہر لحاظ سے سگاریتائے کے متعلق ہیروڈوس کے چند فقرے درانیوں پر صادق آتے ہیں۔ درانیوں کا موجودہ نام گزشتہ دو سو سال سے رائج ہوا ہے۔

ایک اقلیم کی حیثیت سے سگاریتائے کا نام دارا کے صرف ایک کتبے میں ملتا ہے جو تخت جمشید کے محل میں نصب ہے دوسرے کتبوں میں یہ نام شامل نہ ہونے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یا تو سگاریتائے کے باشندوں نے بغاوت کر دی ہوگی یا اس اقلیم کو دوسری اقلیموں میں ضم کر دیا ہوگا۔ اس اقلیم کا محل وقوع بھی مشکوک ہے گریشمین اسے مشہد اور ہرات کے درمیان مقرر کرتے ہیں یہ وہ علاقہ ہے جس پر ابدالی اٹھارویں صدی کے اوائل میں اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور نادرشاہ نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنادیا تھا۔

نسب ناموں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ابدالیوں کا جد امجد جس نام سے مشہور ہے وہ شرکبون یا حروف کی ترتیب بدلنے کی صورت میں جو کہ پشتو میں عام ہے شکربون ہے۔ اس قیاس کی گنجائش

ہے کہ لفظ شکربون میں سگارتیائے کی ہلکی سی جھلک باقی رہ گئی ہے۔

ہیروڈوٹس سے رخصت ہونے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ ہم ریورٹی کو بقول ان کے من گھڑت ہیروڈوٹس افسانہ کے خلاف اپنا مقدمہ روبہ کار لانے کا آخری موقع دیں۔ وہ لکھتے ہیں

> اگرچہ افغان متعدد قبیلوں میں منقسم ہیں لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہی نسل ہیں اور ان کی اصل زبان ایک ہی ہے۔ اگر وہ اس ملک کے جو اب افغانستان کہلاتا ہے قدیم باشندے ہوتے تو ہمیں قدیم مورخوں کی کتابوں میں ان کا تذکرہ ضرور ملتا۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہیروڈوٹس کے زمانہ میں بھی دارا نے کاریانڈا کے سائیلیکس اور دوسروں کی قیادت میں ایک معلوماتی مہم دریائے سندھ تک بھیجی تھی۔

مندرجہ بالا عبارت کے بعد وہ اس کی تشریح کے لئے تحت السطور لکھتے ہیں جس میں وہ ہیروڈوٹس کے باب چہارم کا صفحہ ۴۰،۴ نقل کرتے ہیں (اس کی پہلی عبارت موجودہ باب میں نقل کی گئی ہے) ریورٹی اس عبارت کا حسب ذیل ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

> یہ لوگ کسپاتیرس (CASPATYRUS) کے شہر اور پاکٹیک کے ملک سے دریا کے بہاؤ کے ساتھ مشرق میں سمندر کی طرف روانہ ہوئے۔

اوپر لکھی ہوئی دو عبارتوں کا تضاد بہت واضح ہے۔ اپنی عبارت میں یہ خیال ظاہر کرنے کے بعد کہ ان لوگوں کے متعلق جن کی زبان کی وہ پختو گرامر (مشکوک) لکھ رہے ہیں قدیم مورخوں کی کتابوں میں کچھ نہیں ملتا وہ اس منفی نتیجہ کی تشریح کے طور پر ہیروڈوٹس کی جو عبارت نقل کرتے ہیں اس میں پاکٹیک (PACTYICE) کا نام موجود ہے۔ اور انہیں یہ مطابقت یا تضاد بالکل نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد وہ اپنے مقدمہ کو چھوڑ کر افغان وقائع نگاروں کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ قبائل یہودی النسل ہیں۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جو کچھ ریورٹی نے کہا ہے اس کے برعکس ہیروڈوٹس کی عبارتوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کے ساتھ آج کے قبائلی نام مقام اور عادات کی اتنی مماثلت پائی جاتی ہے کہ اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جاسکتا اتفاقات اس کثرت سے ہیں کہ پھر وہ اتفاقات نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ہیروڈوٹس دو مرتبہ پسکابوروس (مناسب ترمیم کے ساتھ) کو دو مرتبہ پکٹویک کا شہر قرار دیتا ہے۔ پکٹوؤں کا خاص ہتھیار خنجر ہے اور اس علاقہ میں رہنے والے قبیلے اپارتے اور گنداریوئے کہلاتے ہیں۔ دریائی سفر مشرق میں پکٹویک کے دریا سے دریائے سندھ کی طرف کیا گیا تھا ستاگودے کا قبیلہ اور سب سے آخر میں یہ بیان کہ یہ لوگ جو پٹکویک میں آباد ہیں شمال میں رہنے والے ھندوستانیوں میں سب سے زیادہ بہادر ہیں۔ یہ تمام تفصیلات دنیا کے اس خطہ کے واحد بیان پر ہو بہو صادق آتی ہیں۔ اس نتیجہ پر پہنچنا غیر مناسب نہیں ہے کہ ان عبارتوں میں شہر پشاور کا تذکرہ کیا گیا ہے جو پختون یا گندھارا صوبہ کا صدر مقام ہے اس میں گندھاری جو بعد میں قندھاری کہلائے افریدی اور غالباً خٹک مراد ہیں اور دریائی سفر دریائے کابل (لنڈے) میں شروع کیا گیا تھا جو دریائے سندھ کے راستہ سمندر پر ختم ہوا۔

یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ ہیروڈوٹس کی تحریر میں کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جسے لفظ افغان کی اصل کہا جا سکے۔ کیونکہ نسب ناموں کے جائزہ کے بعد ہمیں یہی توقع تھی۔ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اخامنشی دور کے بعد بار بار تباہ کن حملے ہوئے جن کی بدولت پرانی قبائلی وحدتیں پارہ پارہ ہو گئیں اور نئے جوڑ پیوند قائم ہوئے۔ لیکن یہ اکھاڑ پچھاڑ بیشتر میدانی علاقوں اور ان وادیوں میں ہوئی ہوگی جہاں آج کل وہ لوگ رہتے ہیں جو صحیح الاصل افغان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مخطوط تاریخ کے دور میں داخل ہونے کے بعد ہمیں اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ سلطنتوں کے بدلنے اور فوجوں کی چڑھائی کا پہاڑی قبائلیوں پر بہت کم اثر ہوا ہے۔ حملہ آور انہیں چھیڑے بغیر گزر گئے۔ چنانچہ نسب ناموں کا یہ اصرار کہ پہاڑی قبائل جن میں افریدی اور خٹک شامل ہیں اور جو سب کے سب ملا کر کرلانی کہلاتے ہیں اپنی اصل کے اعتبار سے غیر افغان ہیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ عام طور

پر یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ قبیلے زیادہ قدیم ہیں اور انھوں نے بعد میں حملہ آوروں کی خصوصیات اپنالیں ۔ اس لئے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ مخطوط تاریخ میں اس علاقہ کے متعلق ابتدائی تفصیلات تلاش کرنے سے ہمیں جو کچھ دستیاب ہوتا ہے وہ افغان کے متعلق نہیں بلکہ پختون کے متعلق ہے ۔

اس سے یہ دعویٰ مراد نہیں ہے کہ آج مماثل ناموں کے قبیلوں کے ذریعہ ان کی نسل اور زبان کی اصل کا پتہ چلایا جاسکتا ہے ۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ بعد میں آنے والوں کا رابطہ پہلے سے آباد قبیلوں کے صرف بالائی طبقہ کے ساتھ ہوا جنھوں نے اس رابطہ کی وجہ سے اپنی زبان بدل لی اور بعد کی ثقافت کو اپنا لیا لیکن دور و دراز مقامات پر پرانے باشندوں نے اپنی اصل خصوصیات اس حد تک قائم رکھیں کہ وہ آج بھی اپنی اصلیت پر فخر کر سکتے ہیں ۔ یہ نظریہ پٹھانوں کی تاریخ کے لئے ایک ایسا نقطۂ آغاز مہیا کرتا ہے جو کم از کم بنی اسرائیل والے نظریہ کے مقابلہ میں زیادہ معقول اور زیادہ ولولہ انگیز ہے ۔

شاید یہ مناسب ہوگا کہ ہیروڈوٹس کی تحریروں کی بنیاد پر پیش کئے ہوئے دلائل، فیر روزامنڈ (FAIR ROSAMOND) کے متعلق سر ونسٹن چرچل کے ان الفاظ پر ختم کئے جائیں ''انتھک محققوں نے اس عمدہ کہانی کو زیادہ وقعت نہیں دی لیکن پھر بھی یہ اس قابل ہے کہ اسے ہر اس تاریخ میں شامل کیا جائے جو تاریخ کہلانے کے لائق ہے،،۔ اگر خود پٹھان بھی اشتباہ میں ہیں اور روایات ہی کو درست ماننے کے لئے بے قرار ہیں تو انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہیروڈوٹس وہ پہلا آدمی ہے جس نے پکٹویک کے آس پاس بسنے والوں کو اس علاقہ کے باشندوں میں سب سے زیادہ بہادر قرار دیا تھا ۔

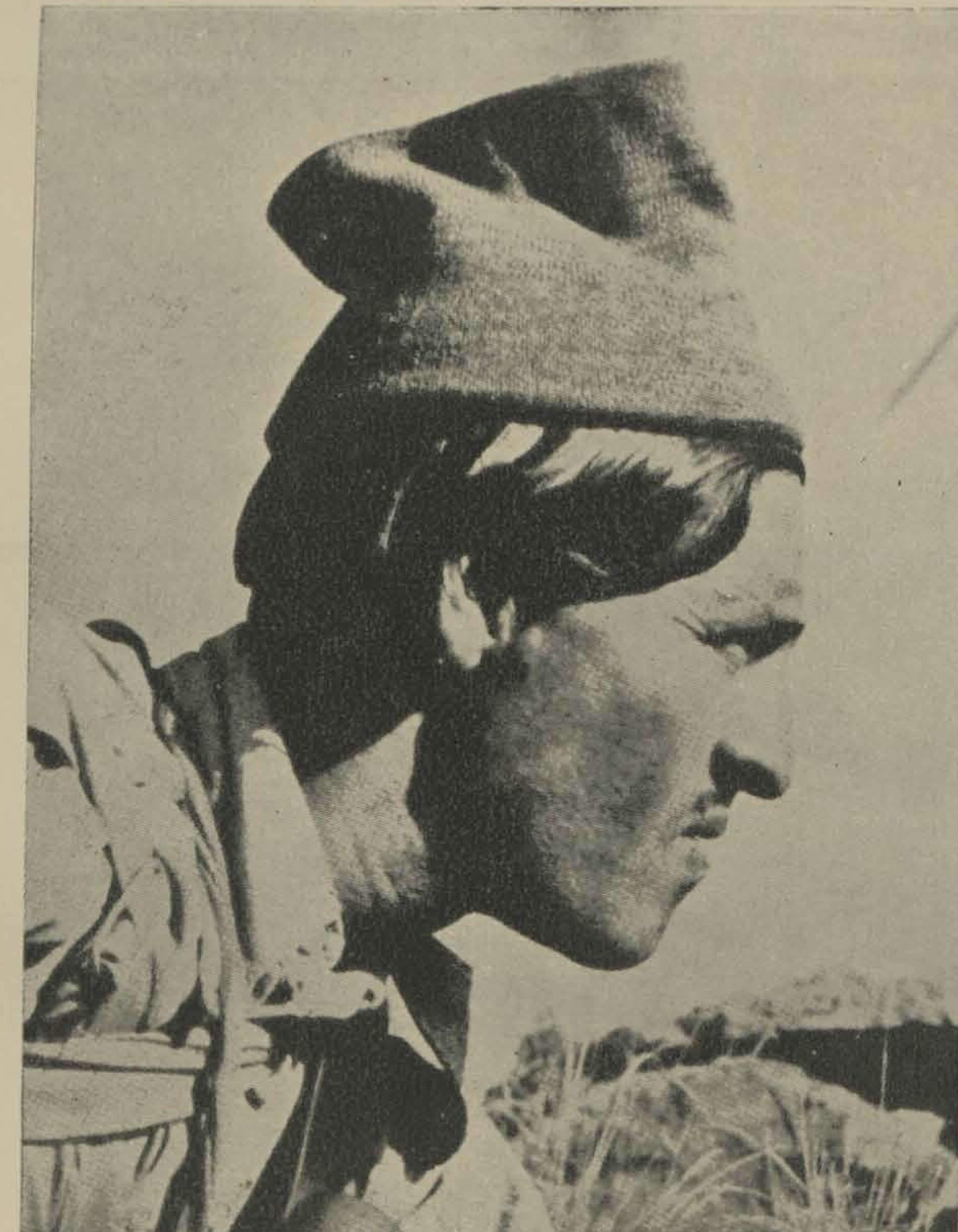
فصل سویم

اسکندر کا گزر

ایران کی اخامنشی سلطنت ۳۳۱ قبل مسیح میں اسکندر اعظم کے قبضہ میں آ گئی جبکہ اربیلا (ARBELA) (موصل کے قریب موجودہ اربیل) کے قریب گاگمیلہ (GAUGAMELA) کے مقام پر آخری اخامنشی فرماں روا دارا کوڈومانس (CODOMANNUS) کی فوجوں کو فاتح فوجوں نے شکست دے دی - یہ لڑائی بڑی سخت تھی اور ایرانی بڑی بے جگری سے لڑے دارا اگباتانا (AGBATANA) (ہمدان) کی طرف فرار ہوگیا - اگرچہ مشرقی ایران کی ساکا (SAKA) اور باختری فوجیں رات ہونے تک مقابلہ کرتی رہیں اور بعد میں اسکندر اعظم کو پوری سلطنت میں امن و امان قائم کرنے میں کئی سال لگے لیکن یہ فیصلہ کن مقابلہ تھا اس کے بعد باقاعدہ جنگ ختم ہوگئی- سر ڈیوڈ ہوگارتھ (۱) یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اریان نے گاگمیلہ کی لڑائی میں ایرانی فوجوں کی جو تفصیل بتائی ہے اس میں پٹھان اور ہندو کش کے پورے سلسلے کے پہاڑی جنگجو شامل ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ ایک ایسا بیان ہے جسے محض ایک قیاس ہی پر محمول کیا جاسکتا ہے - کیونکہ اریان کی کتاب (اناباسیس صفحہ ۸ باب سوئم) کے مطالعہ سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اراکوسیا (ARACHOSIA) کے صوبیدار کی کمان میں جو فوجیں تھیں ان میں دوسروں کے سوا وہ ''ہندوستانی بھی شامل تھے جو پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے،،- ہم محض قیاس کرسکتے ہیں کہ ان میں گنداریوئے، پکٹو، اپارتے اور ہیروڈوٹس کے بتائے ہوئے دوسرے قبیلے شامل ہوں گے لیکن یہ محض قیاس ہے -

---

(۱) HOGARTH کی تصنیف *PHILIP AND ELEXANDER OF MACEDON* ایک پرانی کتاب ہے لیکن اس میں اسکندر کی فتوحات بہترین انداز سے بیان کی گئی ہیں

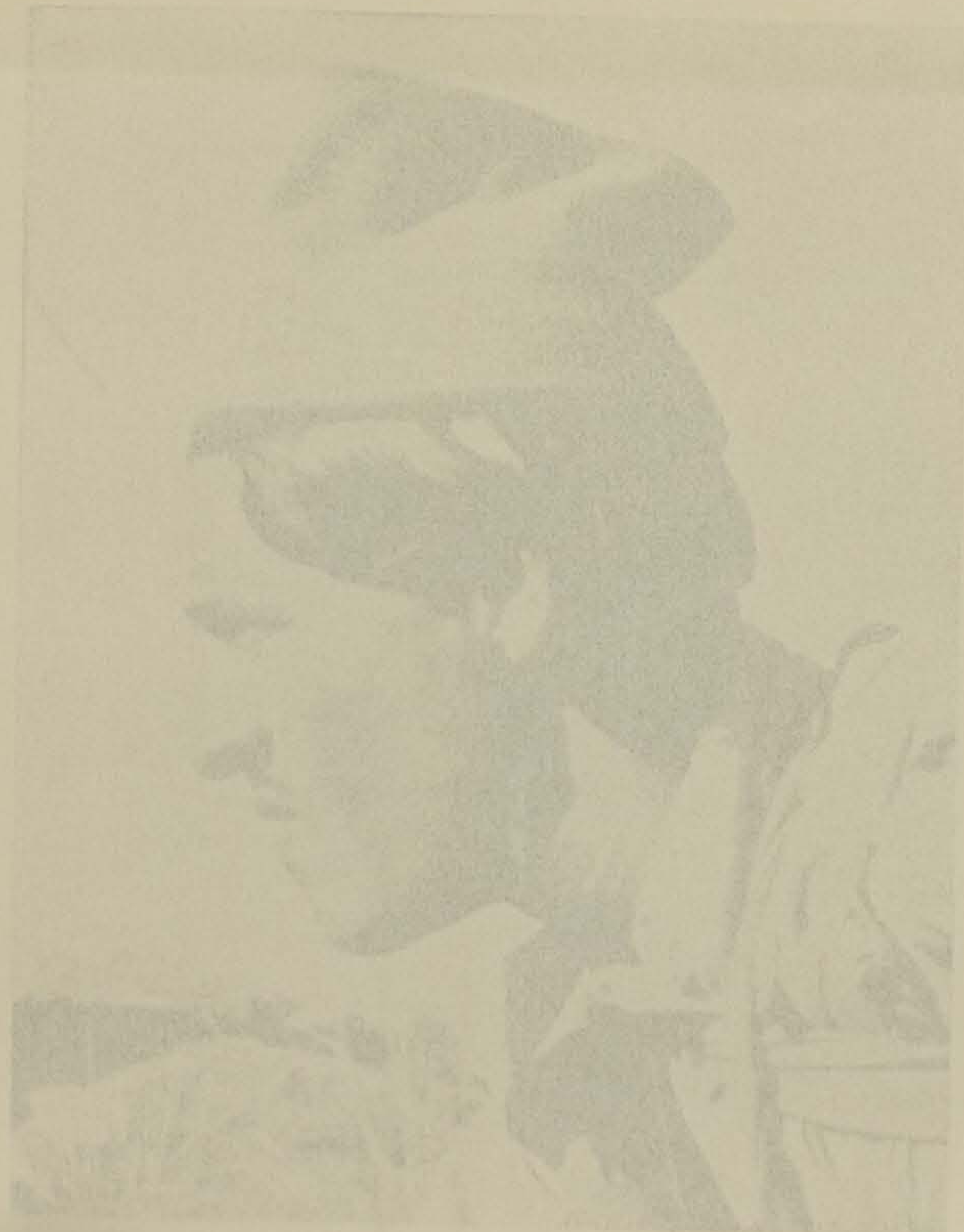


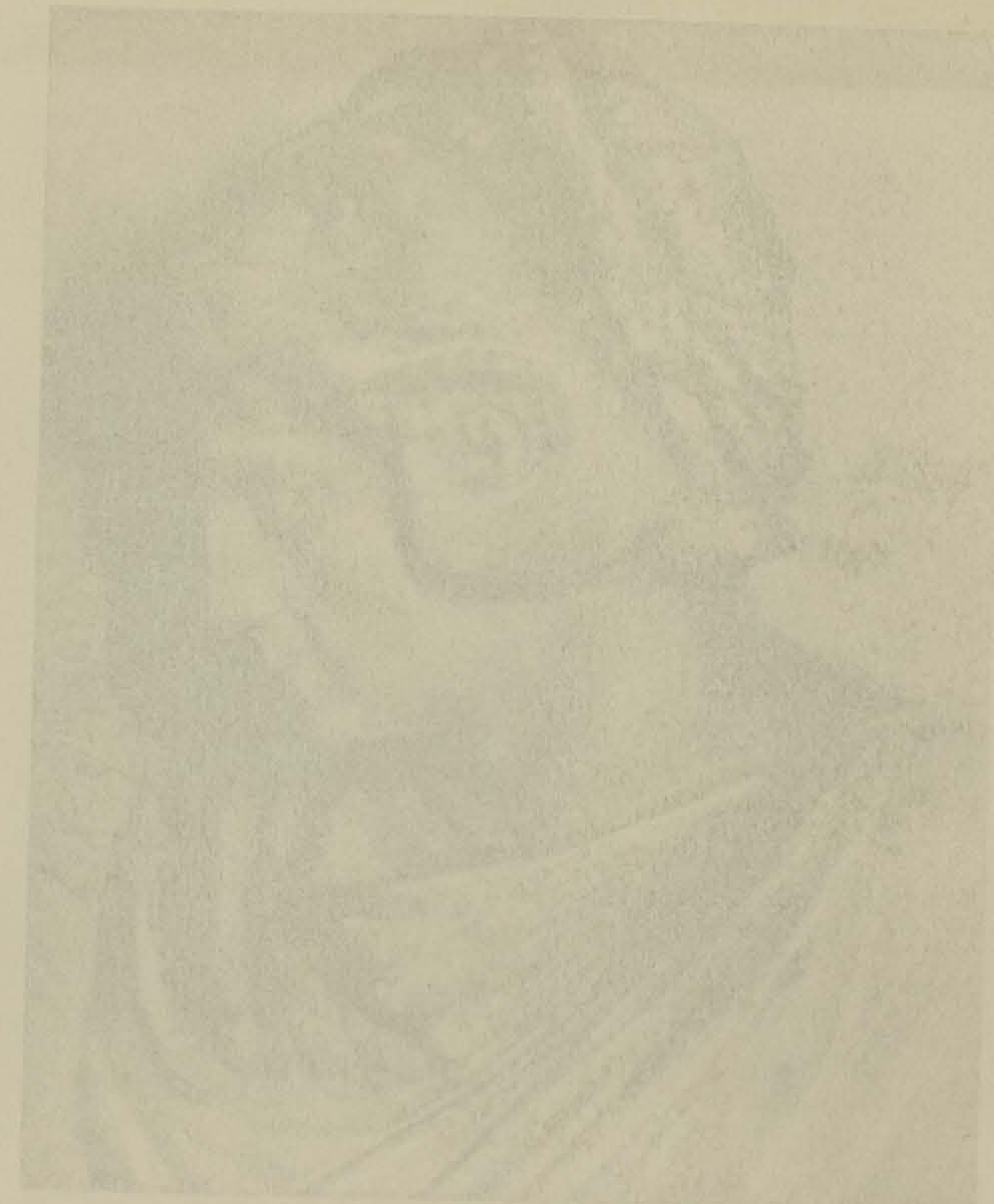
ایک محسود



سکندر اعظم

مشابہت






Sketch-map to illustrate tracks of the armies of
ALEXANDER, BABUR, and AKBAR
on the North-West Frontier
This map covers the geographical limits of "hard" Pakhtu
Scale of miles
0 10 20 30 40 50 60
Alexander's probable route
Hephaistion's " "
Tribes encountered by Alexander in BOLD type
70°
71°
72°
73°
35°
34°
AFGHANISTAN
Kabul
LAGHMAN
(Lamghan)
Jalalabad
NINGRAHAR
Kabul R.
Kama
Lalpura
ASPASIOI
BAJAUR
DIR
Dir
To Chitral
DURAND LINE
Kunar-Choaspes-Euaspla R.
Nawa P.
Nawagai
Bohai Dag
Gandab
Ambahar R.
Jandul R.
GOURAOI
Kohimor 8150'
Gorges
Panjkora-Gouraios R.
SWAT
Katgala P.
Talash R.
Adinzai R.
ASSAKENOI
Chakdarra
Tanra
Birkot
Saidu
Swat R.
L. SWAT
Malakand P.
Shahkot P.
Charat P.
Morah P.
Karakar P.
Ilam 9200'
Pacha
BUNER
Daggar
Barandu
Pajja 6770'
Malandri
Chamla R.
Ambela P.
Malka
Mahaban 7200'
SUDHUM
Katlang
Karamar
Shahbazgarha
Hoti-Mardan
THE SAMAH
HASHT NAGAR
Utmanzai
Charsadda (Peukelaotis)
Shabqadr
Doaba
Michni
Gorges
Shilman
Warsak
Tahtarra 6700'
Khaibar P.
Jamrud
Peshawar (Paskapuros)
3 Urmar villages
Pabbi
Nowshera
Naushahra
Pir Sabak
Sar-i-Maira
Landai R.
Akora
Surai
Khairabad
Attock
Lahor
Hund
Beka
Topi
Swabi
INDUS
RIVER
Mankial 19000
Doura 10000'
Pir Baba Ziarat
Pirsar (Aornos)
Torbela
Abbottabad
Gandghar
Haripur
HAZARA
Hasan Abdal
Taxila
Margalla P.
Rawalpindi
PANJAB
Sikaram 15620'
Peiwar Kotal P.
Parachinar
Sufed Koh
HARIOB
DURAND LINE
Kurram R.
Kurram Valley
Khurmana R.
Rajgal R.
Bazar R.
Bara R.
Maidan
TIRAH
Mastura R.
Sampagga P.
Khanki R.
Samana
Hangu
Kohat
Kohat Toi R.
Darsamand
The Darrah P.
Cherat
Jalalasar 5100'
Thal
Biland Khel
To Bannu and Derajat
KHOST
H.C.W.

اسکندر اعظم اپنی فوجوں کو ۳۲۷ ق م کے موسم بہار سے پہلے وادی سندھ میں لانے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا۔ درمیانی چار سال کی مدت ان حیرت انگیز مہمات میں گزری جن کے دوران میں وہ پہلے بابل، سوسا اور تخت جمشید اور اس کے بعد دارا کے تعاقب میں ایران کو عبور کرتا ہوا موجودہ مشہد کے قریب اور پھر وہاں سے موجودہ افغانستان سے فرح قندھار اور کابل کے راستے ہوتا ہوا (غالباً اس زمانہ میں باقی دو شہروں کی بنیاد بھی نہیں رکھی گئی تھی) ہندو کش کو پار کر کے باختر یعنی موجودہ افغان ترکستان اور پھر سمرقند سے بھی آگے جیکسارٹز (JAXARTES) (سیر دریا) تک جا پہنچا۔ قدیم مورخوں نے لکھا ہے کہ یہ مہمات پہلے تو دارا کے تعاقب میں اور پھر باختر کے صوبیدار بیسس (BESSUS) کو قابو میں لانے کے لئے اختیار کی گئی تھیں جس نے دمغان میں اخامنشی بادشاہوں کے آخری نمائندہ کو قتل کر دیا تھا اور سلطنت کی مشرقی اقلیموں کا فرماں‌روا بن بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن حقیقت میں اسکندر ایرانی سلطنت کی انتہائی مشرقی حدود تک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور اپنی مقررہ پالیسی کے مطابق نئے شہر بسانے میں مصروف تھا۔ اسی پالیسی کی بدولت جہاں ایشیا میں اسکندر کے جانشینوں سلوکی ڈائیڈوچیوں (SELEUCID DIADOCHI) کو شام اور بابل کی ایک ایسی سلطنت میراث میں ملی جو ڈیڑھ سو سال تک قائم رہی وہاں ایران کی سطح محدب پر قائم کی ہوئی اسکندر کی سلطنت چند قرنوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکی اور گندھارا اور ہند پر نظم و نسق کے اعتبار سے اسکندر کے حملہ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ موریوں نے چند سال کے بعد دریائے سندھ کے علاقہ میں اسکندر کے مقرر کئے ہوئے افسروں کو نکال باہر کیا اور جب موریہ خاندان نے گندھارا اور اس کے آس پاس اپنی سلطنت مضبوط کرلی تو اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں ماضی کی جو یادیں باقی رہ گئیں وہ اسکندر کی نہیں تھیں بلکہ ایران کے اخامنشی خاندان کی طویل حکمرانی کی تھیں۔ خود ہند کی موریہ سلطنت جس نے آخرکار سلوکس کو ۳۰۵ قبل مسیح میں شمال مغربی سرحد سے نکال دیا اسکندر کے شاندار لیکن عبوری حملہ کا نتیجہ یا رد عمل نہیں تھی۔ اس کے شہنشاہوں چندرگپت اور اشوک کو سلطنت کا نظام قائم کرنے کے لئے اسکندر کی مثال سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے سامنے ایران کی شاندار سلطنت کا دو سو سال پرانا ڈھانچہ موجود تھا۔ اور یہی وہ سلطنت تھی جس سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا

اور جسے اپنا نمونہ بنایا۔

گندھارا پر اسکندر کا اثر محض اس لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ وہ بڑے پیمانہ پر ایک حملہ آور تھا اور یونانی فکر اور ثقافت پھیلانے کا محض بالواسطہ سبب بنا۔ بعد کی یونانی باختری سلطنت جس کے عہد میں قدیم یونان کے اثرات دریائے سندھ تک پہنچے اسکندر کی قائم کی ہوئی نہیں تھی اور گندھارا اسکندر کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اس سلطنت کی حدود میں نہیں آیا تھا۔ سرحد میں اسکندر کے قیام کی کل مدت اس وقت سے جبکہ وہ ۳۲۷ قبل مسیح کے موسم بہار کی ابتدا میں باختر سے آگے بڑھا اس وقت تک جبکہ اس نے اگلے سال کی ابتدا میں دریائے سندھ عبور کیا بارہ ماہ سے کم ہے۔ وہ اس تمام عرصے میں قلعے فتح کرنے اور لڑ بھڑ کر اپنا راستہ نکالنے میں مصروف رہا۔ دریائے سندھ عبور کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ وہ بیاس تک پیش قدمی کرنے کے بعد دریاؤں میں سفر کرتا ہوا سمندر میں جا نکلتا ہے۔ وہ گندھارا میں ایک راستہ سے آیا اور دوسرے راستہ سے نکل گیا۔

آج کل صوبہ سرحد میں اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں فلاں قبیلہ یا فلاں فلاں گھرانہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی نسل میں اسکندر یا اس کے سپاہیوں کے ذریعہ یونان یا مقدونیہ کا خون شامل ہوا ہے۔ مثال کے طور پر افریدیوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ ان میں یونانی خون شامل ہے۔ وہ اس سلسلہ میں اپنے یونانی خدوخال کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے افریدی نوجوان اپولو (APOLLO) کا ماڈل بن سکتے ہیں جبکہ بوڑھا افریدی زوس (ZEUS) کی سنجیدگی اور بردباری کا مظہر ہوسکتا ہے افریدیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے پٹھان نوجوان ایسے ہیں جن کے چہرے کی یک رخی تصویر اور عقابی آنکھیں دیکھ کر خود اسکندر کا ناک نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اسکندر کی فوج اس علاقہ سے گزری تو اس کے بہت سے سپاہی فوج کو چھوڑ کو بھاگ گئے اور ان بھگوڑے سپاہیوں کا خون بعد میں تیراہ اور خیبر کے باشندوں میں شامل ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس علاقہ سے اسکندر کے گزرنے کے متعلق اخامنشی یا ہندوستانی کوئی بھی تحریر کتبوں یا کسی دوسری شکل میں نہیں ملتی۔ یہاں تک

کہ کسی ایشائی تحریر میں اسکندر کی ہندوستانی مہمات کے متعلق کوئی ایسی تحریر نہیں پائی جاتی جو اسی زمانہ میں یا اس سے قریب کے زمانہ میں لکھی گئی ہو ۔ اگر یونانی اور لاطینی زبانوں میں لکھی ہوئی اریان اور دوسرے مورخوں کی تحریریں موجود نہ ہوتیں تو گندھارا سے اسکندر کا تعلق ایک خواب کی طرح یاد سے محو ہوچکا ہوتا۔ افریدی اور دوسرے قبائل کی روایات کی بنیاد یقیناً مغرب کا وہ ادب عالیہ ھے جس کا بغداد کے عباسی خلفا کے عہد میں عربی ترجمہ ھوا اور یونانی حکایات کا ایک حصہ ھیں جس نے اسلامی علوم پر گہرا اثر ڈالا ھے۔ اس طرح اسکندر ذوالقرنین (دوسینگ والا) کے کارنامے دنیائے اسلام کی حکایات میں شامل ہوگئے ۔ جب تک یونانی اور لاطینی علوم یا ان کے ترجمہ تک رسائی نہیں ھوئی مشرقی ایران اور ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں سے اسکندر گزرا تھا خود اس کا اور اس کی فوجوں کا وجود بھی ذہنوں سے محو ہوئے عرصہ گزر چکا تھا ۔ اور اس نے سرحد کے علاقہ میں اتنا کم عرصہ گزارا کہ کوئی اثر چھوڑا ھی نہیں جاسکتا تھا۔

ان علاقوں میں قدیم یونان کا اثر بعد میں آیا اور یونانی باختری بادشاھوں کے عہد میں کچھ عرصہ قائم رھا۔ یہ زمانہ بھی جس کی تاریخ بڑی محنت کے ساتھ خاص طور پر سکوں کی مدد سے مرتب کی گئی ھے اس علاقہ میں جہاں یونانی باختری فرمان رواؤں کی حکومت رہ چکی تھی کوئی گہری یاد نہیں چھوڑتا اور اس عرصہ میں اسکندر جیسا دنیا کو ہلا دینے والا کوئی نام نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ان روایات میں جو بعد کے یونانی اثر و نفوذ کے زمانہ میں قائم ھوئیں اسکندر کا نام اس وقت شامل کیا گیا جب عرب یونان کی تاریخ سے واقف ھوگئے۔ لیکن سچ تو یہ ھے کہ اس علاقہ میں اسکندر کی آمد ایک موسمی پرندے جیسی تھی خود اس نے سابقہ ایرانی سلطنت کی مشرقی سرحدوں کے واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

اریان جسے ہم خاص طور پر پیش کرتے ھیں رومی شہنشاھوں ھاڈریان (HADRIAN) انٹونینس پائیس (ANTUNUS PIUS) اور مارکس آریلیئس (MARCUS AURELIUS) کا ہم عصر تھا اور ان میں سے دوسرے فرمان روا کا قانونی مشیر بھی رہ چکا تھا ۔ وہ غالباً ۱۷۵ء میں زندہ تھا۔ اس طرح اس نے جو واقعات قلمبند کئے ھیں وہ اس کی تحریر سے پانچسو سال پہلے رونما

ہوچکے تھے اس کے برخلاف ہیروڈوٹس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سے صرف ایک پشت پہلے گزرا تھا۔ اریان کی کتاب اناباسس (ANABASIS) (مہمات) یونانی میں لکھی ہے۔ دوسرے مصنف جو اس سے بہت کم پایہ کے ہیں کوئنٹس کرٹیس روفس (QUINTUS CURTIUS RUFUS) ہیں جن کی تصنیف عمدہ لاطینی لیکن شاعرانہ زبان میں لکھی ہے اور دوسرے پلوٹارک (PLUTARCH) ہیں جنہوں نے بہت سی یونانی شخصیتوں کے بارے میں ایک سلسلہ لکھا ہے۔ یہ دونوں کتابیں پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی ہیں۔ استرابو (۶۳ ق م تا ۱۹ عیسوی) اور اسکندریہ کے ماہر فلکیات بطلیموس (دوسری صدی عیسوی) کی تصنیفات میں بھی کچھ جغرافیائی حوالے ملتے ہیں۔

اریان کو عام طور پر درجہ اول کا فوجی وقائع‌نگار سمجھا جاتا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی کتاب ان مکتوبات کی بنیاد پر لکھی ہے جو اس زمانہ میں دستیاب تھے اور اب نایاب ہیں - ان میں اسکندر کے رفیق اور مصری خاندان کے بانی بطلیموس اول اور میگاستھنیز کی ڈائریاں شامل ہیں - یہ وہی (MEGASTHENES) ہے جسے اسکندر کے جنرل اور مشرق میں اس کے جانشین سلوکس نے سفیر بنا کر موریہ دربار میں بھیجا تھا - اریان کی تصنیف اناباسیس، دریا اور پہاڑ عبور کرنے محاصروں اور لڑائیوں کی تفصیل اسکندر اور اس کے ساتھیوں اور ان کے دشمنوں کی بہادری کے بیانات سے بھری پڑی ہے۔ (۱) اس نے بازیرہ (BAZIRA) اور اورناس (AORNOS) جیسے شہروں کے محاصروں اور حملوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ فوجی مہمات کے متعلق تحریر کا عمدہ نمونہ ہے یہ تحریر جاندار عبارتوں اور متعلقہ علاقوں کے محتاط جغرافیائی حالات سے بھرپور ہے اور اس کی بدولت آثار قدیمہ کے ماہر ان واقعات کو پھر یکجا کرسکتے ہیں جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس فوجی مہم کے تذکرے کے بارے میں توقع کی جا سکتی تھی جس کے نتیجہ میں کوئی مستقل فتح حاصل نہیں ہوئی اور کسی حکومت کا قیام عمل میں نہیں آیا یہ تصنیف دوسرے معاملات میں مایوس کن ہے - اس میں علاقہ سرحد کے ان باشندوں کی قبیلہ بندی اصل یا

---

(۱) W. W. TARN کی تصنیف *ELEXANDER THE GREAT* اس موضوع پر جدیدترین تصنیف ہے لیکن اس میں سرحدی علاقہ میں اسکندر کی آمد کا بہت تھوڑا حال درج ہے۔ ہوگارتھ اور ٹارن دونوں سرحد کے عوام اور جغرافیہ سے ناواقف تھے۔

زبان کے بارے میں جن کے درمیان سے اسکندر گزرا تھا کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ اس معاملہ میں یہ تصنیف ہیروڈوٹس کی تصنیف سے بالکل مختلف ہے اور اس کا سبب مخفی نہیں ہے۔

ہیروڈوٹس اس مواد کو کام میں لایا ہے جو ایک سو سالہ ایرانی اخامنشی سلطنت کے دوران جمع کیا گیا تھا۔ اس سلطنت کے شاندار نظام میں نظم و نسق کا جو ڈھانچہ قائم کیا گیا تھا اس میں خوبیاں اجاگر کر دی گئی تھیں اور خامیاں دور کر دی گئی تھیں۔ ہیروڈوٹس کی تصنیف معرض تحریر میں آنے کے وقت بھی ایرانی نظم و نسق کا ڈھانچہ کافی مضبوط تھا۔ حالانکہ دارا کا جانشین کیخسرو یونان کو فتح کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ ہیروڈوٹس نے اس زمانہ میں قلم اٹھایا جبکہ یادیں تازہ تھیں۔ اس کے برعکس اریان اور اسکندر کے دوسرے وقائع نگاروں نے نہ صرف واقعات گزرنے کے کئی صدیوں بعد قلم اٹھایا (اس فاصلہ نے ان کی نظر میں ہر واقعہ کی اہمیت کا صحیح تناسب ضرور پیدا کردیا ہوگا) بلکہ ان کارروائیوں کے بارے میں لکھا جو اخامنشی سلطنت کے زوال کے بعد پھیلی ہوئی طوائف الملوکی کے زمانہ میں پیش آئے اور جن کا کم از کم گندھارا اور ہند پر دیرپا اثر قائم نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ جہاں ہیروڈوٹس نے جیسا کہ راولنسن (RAWLINSON) نے وضاحت کی ہے اس وقت کی دریافت شدہ پوری دنیا کو اپنی تحریر کے دائرہ میں لانے، ریاستوں اور سلطنتوں کی ابتدا کی طرف اشارہ کرنے اور نظروں کے سامنے تاریخ کا ایک وسیع منظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اریان نے جس کی تحریر پُر زور اور متوازن ضرور ہے محض دنیا کے سب سے بڑے سپاہی کی مہمات کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ ہیروڈوٹس نے ایرانی سلطنت کی مشرقی حدود سے تعلق رکھنے والے معاملات کی جو چھان بین کی ہے وہ اخامنشی خاندان کی سرکاری فائلیں اور دفتر معلوم ہوتی ہیں جبکہ اریان کی تحریر ایک ایسی مہم کی ڈائری ہے جو سلطنت کے زوال اور بعد کے انقلاب کے زمانہ میں لکھی گئی۔ سٹرابو اور بطلیموس نے جو اضافے کئے ہیں ان کی حیثیت محض جغرافیائی ہے اور واقعات کے تسلسل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اسکندراعظم جو چنگیزخان سے پہلے دنیا کا سب سے بڑا سپہ سالار تھا شمال مغربی سرحد سے گزرا ہے اس لئے ہم پر یہ لازم ہے کہ اس سفر میں اس کے نقش قدم تلاش کریں۔ یہ بھی ممکن

ہے کہ اس فاتح نے جو راستہ اختیار کیا اور اس کے بیان میں مقامات اور قبیلوں کے جو نام آتے ہیں ان سے ہمیں پٹھانوں کی اصل کے متعلق کوئی جھلک مل جائے۔

سہل ترین صورت یہی ہے کہ اریان کے بیان کے خلاصہ سے آغاز کیا جائے اور جہاں مناسب ہو اس کی اصل عبارت کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ ''جب (۳۲۷ ق م کا) موسم بہار گزر گیا تو اسکندر نے اپنی فوج کے ساتھ باختر سے ہندوکش کے پار شہر اسکندریہ کا رخ کیا جو اس نے دو سال پہلے پاراپامیسیڈا (PARAPAMISIDAE) کے علاقہ میں بسایا تھا''۔ یہ اسکندریہ آج کل کا جبل سراج ہے جو کابل کے شمال میں کوہ دامان کے علاقہ میں کپیسا (KAPISA) یا بگرام (۱) سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بطلیموس لکھتا ہے کہ پاراپامیسیڈا میں (جسے وہ پاروپانیسیڈا (PAROPANISIDAE) قرار دیتا ہے) پانچ قبیلے آباد تھے ان میں سے ایک پارسیتا بھی تھا جس کے متعلق جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مارگینسٹرین کا خیال ہے کہ اس کا ربط پشتون سے ہے۔ (میں یہ بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک اس کا تعلق فارسی دانوں یا تاجیکوں کے ساتھ کیوں زیادہ موزوں ہے) وہاں سے اسکندر کوفن (COPHEN) دریا کی طرف روانہ ہوا جسے بطلیموس نے کوآ (COA) لکھا ہے اور اس مقام پر پہنچا جس کا نام نکائیا (NICAEA) بمعنی فاتح تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ کوفن سے مراد دریائے کابل یا اس کا وہ حصہ ہے جو خیبر کی پہاڑیوں سے اوپر ہے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ نکائیا کونسی جگہ ہے لیکن یہ جگہ کہیں نہ کہیں لغمان یا اس میدان میں جو جلال آباد کا میدان کہلاتا ہے یا ننگرہار میں ہوگی۔ آگے چل کر اریان لکھتا ہے:

> نکائیا پہنچ کر اسکندر نے ایتھینا دیوی (ATHENA) کو قربانی پیش کی اور اپنا ایک ایلچی ٹیکسیلز (TAXILES) اور دریائے سندھ کے اس طرف دوسرے سرداروں کے پاس بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ اس سے کسی ایسے مقام پر آ کر ملیں جو دونوں کے لئے مناسب ہو .... اس کے بعد اس نے اپنی فوج کو منقسم کردیا اور ہیفائسٹین (HEPHAESTION) اور پرڈیکاس (PERDICCAS) کو گورجیاس (GORGIAS) کلیٹس (CLEITUS) (۲) اور ملیگر

---

(۱) یہاں بگرام یعنی پشاور مراد نہیں ہے۔

(۲) سکندر نے کلیٹس کو باختر میں قتل کردیا تھا لیکن فوج کلیٹس ہی کے نام سے مشہور تھی۔

(MELEGER) کے بریگیڈوں، اپنے ساتھ کے شہسوار دستہ میں سے
نصف دستے اور پورے تنخواہ دار سوار دستہ کے ساتھ
پیوکلاوٹس (PEUCELAOTIS)اور دریائے سندھ کی طرف روانہ کیا۔
اسکندر نے انہیں حکم دیا کہ راستے میں جو بھی بستیاں آئیں
ان پر زبردستی قبضہ کرلیا جائے یا وہاں کے باشندے ہتھیار
ڈالدیں تو ان کی پیش کش قبول کرلی جائے۔یہاں تک کہ یہ
فوجیں دریائے سندھ تک پہنچ گئیں اور پھر دریا عبور کرنے کی
تیاریاں کرنے لگیں۔ اس مہم میں ٹیکسیلز اور دوسرے سردار ان
کے ہمراہ تھے اور سندھ پر پہنچ کر انہوں نے ان ہدایات پر عمل
کرنا شروع کردیا جو انہیں دی گئی تھیں۔ البتہ ایک سردار
آسٹیس (ASTES) نے جو پیوکلاوٹس کا صوبیدار تھا بغاوت کی لیکن
وہ اس کوشش میں مارا گیا۔

اس بیان میں ٹیکسیلز تو یقیناً ٹیکسلا کے راجہ کا نام ہے۔ ٹیکسلا جو مشرق میں سندھ سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر دریا کے پار واقع ہے یونانی باختری، ساکا اور کشان تہذیبوں کے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہے اور وہاں آثار قدیمہ پر تحقیق ہو رہی ہے۔ پیوکلاوٹس کے متعلق ہمہ گیر فیصلہ یہ ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جسے سنسکرت میں پشکلاؤتی اور پراکرت میں پسکلاؤتی کہتے ہیں۔ اس کا محل وقوع جنرل کننگھم کے زمانہ میں وہ بڑا ٹیلہ قرار دیا گیا ہے جو پشاور سے ۱۸ میل شمال مشرق کی طرف چارسدہ اور پڑانگ کے قریب واقع ہے۔ اس لئے پیوکلاوٹس کا علاقہ پشاور کا میدان یا گندھارا قرار پایا۔ ہمیں اریان کی تحریر میں پسکاپوروس یا اس سے ملتا جلتا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ سائیلیکس اور اسکندر کے زمانوں کے درمیان جو دو صدیاں گزریں ان میں گندھارا کے صدر مقام کی حیثیت سے پشاور کی جگہ چارسدہ نے لےلی تھی۔ چارسدہ کے قریب باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی (۱) لیکن سرسری کوشش سے اس علاقہ میں جو ہندوستانی یونانی سکے اور رومی اسکندری فن تعمیر کے جو منقش پتھر ملے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مقام بعد میں گندھارا کے علاقہ میں مغربی اثر کا مرکز بن گیا تھا۔

---

(۱) اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہونے کے بعد چارسدہ میں بالاحصار کے مقام پر سرمارٹیمرو ہیلر کی سرکردگی میں کچھ اور اہم کھدائیاں ہوئی ہیں۔ ان سے پشکلاؤتی کے محاصرہ کے متعلق اریان کے بیان کی کچھ اور تصدیق ہوتی ہے۔

قیاس یہ ہے کہ ٹیکسلا اخامنشی اقلیم ہند کا صدر مقام تھا - اسی طرح جیسے پہلے پسکاپورس (پشاور) اور بعد میں پیوکلاوٹس (چارسدہ) گندھارا یا پکٹویک اقلیم کا خاص شہر تھا یہ حقیقت کہ اسکندر نے اتنی آسانی سے ٹیکسلا کے حکمران کو (کوئنٹس کوریٹس نے اس کا نام اومفس (OMPHIS) بتایا ہے) اپنا باج گزار بنا لیا یہ ظاہر کرتی ہے کہ دارا کوڈومانس کے جانشین کی حیثیت سے اسکندر کا یہ حق سمجھا جاتا تھا کہ وہ اخامنشیی اقلیم ہند کو اپنی وفادار سمجھے - البتہ وہ جب دریائے جہلم تک پہنچ گیا جہاں اس نے ایرانی سلطنت کی مشرقی سرحد کے آگے قدم بڑھا دیا اس وقت پنجاب کے حکمران پورس نے جم کر اس کا مقابلہ کیا - اسکندر وہ پہلا یا آخری شخص نہیں تھا جس پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ ایرانی علاقہ کی سرحد درۂ خیبر یا دریائے سندھ نہیں ہے بلکہ ٹیکسلا کے قریب وہ مقام ہے جہاں آج کل سڑک اور ریل کی پٹری درۂ مارگلہ سے گزرتی ہے - پٹھان آج بھی جب یہاں سے گزرتے ہیں تو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے گھر آرہے ہیں یا گھر سے جا رہے ہیں -

اریان کے بیان میں پیوکلاوٹس اور ٹیکسلا ہی وہ دو مقامات ہیں جنہیں موجودہ نقشے میں ظاہر کیا جاسکتا ہے - عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہیفائسٹین ننگرہار کے مقام نکائیا سے پشاور کے میدان میں داخل ہونے کے لئے درۂ خیبر سے گزرا تھا لیکن اریان کی اصل عبارت میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کی بنیاد پر یہ مفروضہ پایہ یقین تک پہنچ سکے - ہمیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس جنرل کی قیادت ہی اسکندر کی فوج کا میمنہ (یا میسرہ) جلال آباد کے قریب ایک مقام سے کوچ کرکے چارسدہ پہنچا تھا - ہمیں کسی ایسی جگہ کا نام نہیں ملتا جیسے ہم پشاور پر منطبق کرسکیں - اگر پشاور کا تذکرہ کیا جاتا تو پھر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ اس نے ہیفائسٹین کی قیادت میں درۂ خیبر کا راستہ اختیار کیا تھا - اس میں بھی شبہ ہے کہ اسکندر کے زمانہ میں جبکہ دریاؤں پر پل نہیں تھے متذکرہ بالا دونوں مقامات کے درمیان کابل کا راستہ سب سے آسان یا کم از کم سب سے سیدھا ہوتا - ہیفائسٹین نے دریائے کابل کونڑ کے ساتھ اس کے سنگھم سے کچھ اوپر یا نیچے کاما یا لالپورہ کے قریب اور اس مقام سے پہلے عبور کیا ہوگا جہاں یہ دریا خیبر کے شمال میں تنگ گھاٹی میں داخل ہوتا ہے - چنانچہ وہ کڑپہ

اور گنداب کے راستہ اس علاقہ سے گزر کر جو اب مہمند کہلاتا ہے پشاور کے میدان میں آیا ہوگا اور شب‌قدر کے قریب دوآبہ میں داخل ہوا ہوگا ۔ یا جہاں تک ممکن ہوا ہوگا وہ شمالی کنارے پر جہاں آج کل ترک زئی مہمند آباد ہیں یا جنوبی کنارے تہترہ کی چوٹی کی پشت پر شلمان کی وادیوں میں دریا کے ساتھ ساتھ چلا ہوگا ۔ خیبر کی سڑک بننے سے پہلے بیشتر آمدورفت ان ہی دو راستوں سے ہوتی تھی اور یہ خیال کرنا غلط ہے کہ مغرب کی طرف سے پشاور میں داخل ہونے کے لئے خیبر ہی واحد راستہ ہے۔

ابھی اس مسئلہ پر غور کرنا باقی ہے کہ خود اسکندر نے کون‌سا راستہ اختیار کیا تھا ۔ میں یہاں اریان کی اصل عبارت کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں :

> اسکندر نے فوج کے دوسرے حصہ کی کمان خود سنبھالی.... اور پیش قدمی کرتا ہوا اسپاسی (ASPASII) گورائی (GURAEI) اور اساکنی (ASSACENI) کے علاقہ میں داخل ہوگیا ۔ اس نے جو راستہ اختیار کیا وہ پہاڑی اور اونچا نیچا تھا اور کوس (CHOES) نامی دریا کی گزر گاہ کے ساتھ ساتھ تھا ۔ اسے یہ دریا عبور کرنے میں دشواری پیش آئی... (بعد میں) وہ دریائے یوسپلا کی طرف بڑھا جہاں اسپاسی کا سردار تھا... (ضروری کاروائی کے بعد) پھر وہ پہاڑوں کو عبور کرکے ان کی ترائی میں واقع ایری گیون (ARIGAION) نامی شہر میں پہنچا جہاں اسے معلوم ہوا کہ شہری اس جگہ کو نذر آتش کرکے خود فرار ہوگئے ہیں ۔ چونکہ بظاہر اس شہر کا محل وقوع بڑے کام کا تھا اس لئے اس نے کراٹیرس (CRATERUS) کو حکم دیا کہ شہر کے گرد مضبوط فصیل بنائی جائے ۔ (اور مزید لڑائیوں کے بعد جن میں اس نے اسپاسیوں کو شکست دی) وہ وہاں سے اساکینوں (ASSACENI) کے علاقہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آگے بڑھا ۔ کراٹیرس جس نے ایری‌گایوں کے گرد فصیل بنانے کا کام مکمل کر لیا تھا مسلح پیدل سپاہیوں اور منجنیقوں کے ساتھ اس سے آملا ۔ وہ گورائی کے علاقہ سے گزرا جہاں اسے دریائے گرائیس (GURAEUS) عبور کرنا پڑا ۔ اس علاقہ کا نام اسی

دریا کے نام پر مشہور ہے اس کے بعد اسکندر سب سے پہلے مساگا(MASSAGA) پر حملے کے لئے بڑھا جو اس علاقہ کا سب سے بڑا شہر تھا - (اس کے بعد اس شہر کے محاصرہ کے متعلق طویل بیان ہے جس کے بعد) اسکندر نے اچانک حملہ کر کے شہر پر قبضہ کرلیا اور اساکنس کی ماں اور بیٹی کو قید کر لیا -

پھر اس نے کوئینس(COENUS) کو بازیرہ بھیجا - اس کا خیال تھا کہ وہاں کے لوگ مساگا کی شکست کا حال سننے کے بعد ہتھیار ڈال دیں گے - اس نے اٹالس السیتاس(ATTALUS ALCETAS) اور ڈمیٹرس(DEMETRIUS) کو ایک اور شہر اورا کی طرف ان هدایات کے ساتھ روانہ کیا کہ اس کے گرد ایک فصیل بنائی جائے اور جب تک وہ خود وہاں نہ پہنچ جائے شہر پر حملہ نہ کیا جائے - جہاں تک کوئنس کا تعلق ہے حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا کیونکہ بازیرہ بڑی بلند جگہ پر واقع تھا اور اس کی قلعہ بندی ہر لحاظ سے بڑی مضبوط تھی وہاں کے لوگوں نے اپنی مضبوط پوزیشن پر بھروسہ کیا اور هتیار ڈالنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا.... اسکندر نے اپنی فوجوں کا رخ پہلے اورا کی طرف پھیر دیا جسے اس نے پہلے ہی حملہ میں فتح کرلیا - جب بازیرہ کے لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ اورا فتح ہوگیا ہے تو انھوں نے سمجھ لیا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے چنانچہ وہ رات کے سناٹے میں اپنے شہر سے فرار ہوکر اس علاقہ کی ڈھیری پر پہنچے گئے جو اورناس (AORNOS) کہلاتی تھی.... اسکندر کے دل میں یہ بات سمائی کہ اس پہاڑ پر بھی قبضہ کر لیا جائے..... اس نے اورا اور مساگا کی قلعہ بندی اور مضبوط کرلی تاکہ آس پاس کے علاقوں کا راستہ بند کر دیا جائے ساتھ ہی ساتھ اس نے بازیرہ کے دفاع کو بھی مضبوط بنایا -

آدھر فوج کا وہ حصہ جو هیفائسٹین کی کمان میں تھادریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا اور اسکندر کی ہدایت کے مطابق دریا عبور کرنے کی تیاریاں شروع کردیں - پھر اسکندر بھی

دریائے سندھ کی طرف روانہ ہوا اور پیوکلاوٹس والوں کو
اپنا مطیع بنا لیا اور پھر دریائے سندھ کے آس پاس دوسرے
چھوٹے چھوٹے شہروں کو فتح کرنے میں مصروف ہوگیا ....
پھر وہ اورناس کی ڈھیری کی طرف روانہ ہوا۔

سٹرابو کی کتاب میں ایک عبارت (باب پندرھواں صفحہ ۶۹۷) نہ ہوتی تو یہ اشتباہ قائم رہتا کہ اسکندر نے جو راستہ اختیار کیا اس کا ہیفائسٹین کے اختیار کئے ہوئے راستہ سے کیا تعلق تھا۔ اریان کے بیان کی روشنی میں یہ بھی ممکن تھا کہ اسکندر سفید کوہ عبور کرکے کوہاٹ میں داخل ہوا ہو کیونکہ یہ راستہ شمال کے راستے سے بھی زیادہ پہاڑی اور ناھموار ھے۔ لیکن سٹرابو نے ھم پر یہ بات واضح کر دی ھے کہ اسکندر نے یہ سن کر کہ شمالی علاقہ زیادہ زرخیز ھے جبکہ جنوبی حصہ میں یا تو پانی نہیں ملتا یا سیلاب آتے رھتے ھیں اور یہ بات ذھن میں رکھتے ہوئے کہ دریاؤں کو ان کے مخرجوں کے پاس سے عبور کرنا زیادہ آسان ہوگا شمال کا راستہ اختیار کیا۔

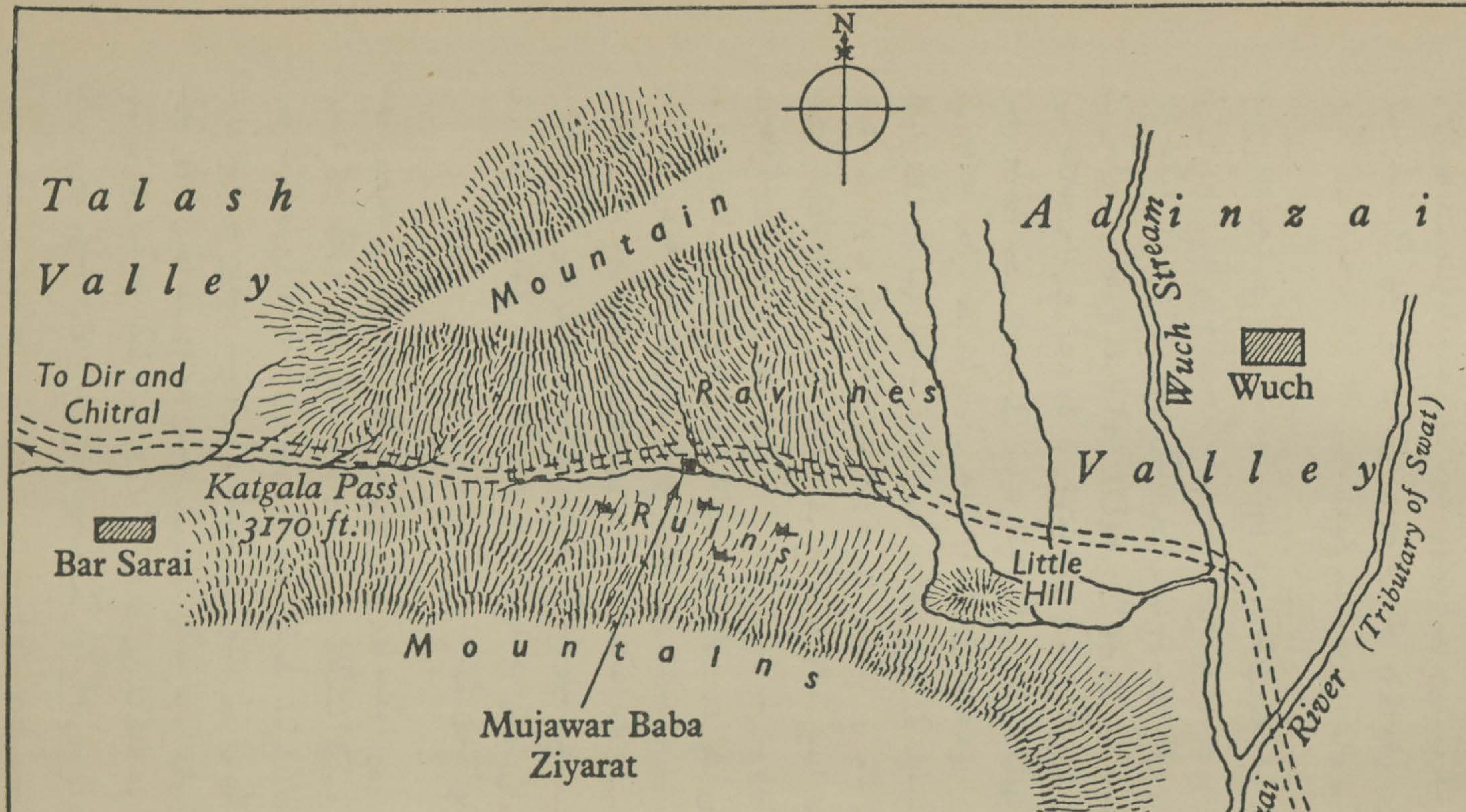
اتنی بات پائیہ یقین کو پہنچنے کے بعد اور پورے معاملہ کا رخ معلوم ھوجانے کے بعد جس سے یہ ظاھر ھوگیا کہ اسکندر ایری گایوں 'مساگا، بازیرہ اور اورا کے پہاڑی قلعہ فتح کرنے سے پہلے پشاور کے میدان میں داخل نہیں ہوا اس علاقہ کے جغرافیائی حالات سامنے رکھتے ہوئے اسکندر کے اختیار کئے ہوئے راستہ کو یقین کرنا کافی آسان ہو جاتا ھے۔ اس نے جو دریا عبور کئے وہ باترتیب کوس، (CHOES) یوسپلا اورگوریس تھے۔ یوسپلا اور گوریس کے درمیان ایک پہاڑی چشمہ تھا۔ یہ صرف کونڑ یعنی پنج کوڑہ کا بالائی حصہ ھو سکتا ھے جہاں سے آج کل ڈیورنڈ لائن گزرتی ھے۔ اس طرح کوس علی شنگ ھوگا اور یوسپلا کونڑ کا نام ھوگا (۱) گوریس پنج کوڑہ ھے جس کا نام مہابھارت کے چھٹے باب میں سنسکرت میں گاؤری (GAURI) لکھا ھے۔ اس صورت میں ایری گایوں باجوڑ کا مقام نواگئی ھوگا جو واقعی بڑے مفید موقع پر واقع ھے اور باجوڑ کی وادیوں پر حاوی ھے۔ پنج کوڑہ عبور کرنے کے بعد اسکندر نے لازمی طور پر تالاش سے گزرنے

(۱) جہاں تک مجھے معلوم ھے یہ شناخت سب سے پہلے میں نے کی ھے۔ میں سمجھتا ھوں یہ شناخت اتنی ھی قابل قبول ھے جتنی سٹین کی یہ تشخیص کہ بازیرہ بیرکوٹ کا پرانا نام ھے۔

والا راستہ اختیار کیا ہوگا تاکہ اسے زیریں پنج کوڑہ اور سوات کی گھاٹیاں عبور نہ کرنی پڑیں - اس طرح وہ درۂ کٹ گلا پار کر کے ادین‌زئی پہنچا ہوگا اور چکدرہ کے مقام پر دریائے سوات کے کنارے آنکلا ہوگا - اس بارے میں کوئی تحریر یا کتبہ نہیں ہے کہ پشاور کے میدان تک پہنچنے کے لئے وہ سوات سے کس راستہ سے روانہ ہوا اور ابھی ہمیں یہ بھی طے کرنا ہے کہ مساگا، بازیرہ اور اورا کہا واقع تھے -

آریل سٹین (AUREL STEIN) نے ۱۹۲٦ء میں جو دریافتیں کی ہیں ان کا مقصد ان مقامات اور اورناس کو متعین کرنا ہے - میرا خیال ہے کہ اس کاوش میں دلچسپی اور جوش اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اچانک ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان گئے گزرے واقعات کی کوئی مقامی یاد تحریری یا کسی اور شکل میں موجود نہیں ہے لیکن اریان اور دوسرے وقائع نگاروں کے جنگ نامے پڑھ کر آج بھی ان چند قلعوں کو پہچاننا ممکن ہو جاتا ہے - جنھیں مقدونیہ کی سپاہ نے فتح کیا تھا - یہ تحریریں پڑھنے سے اسکندر کے میمنہ اور میسرہ کے ہتیاروں میں ڈوبے ہوئے سپاہی ہماری نظروں میں پھر جاتے ہیں اور اس کے پرچم کو سوات کی خوبصورت وادی کی بلندیوں تک لے جانے والے شہسواروں کی آوازیں ہمارے کانوں میں گونجنے لگتی ہیں -

سٹین مساگا کا محل وقوع متعین کرنے کی کوشش نہیں کرتے - وہ یہ کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ مساگا زیرین سوات میں ہوگا لیکن میں نے اس کی تحقیق نہیں کی - ہمیں اریان کے بیان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مساگا پنج کوڑہ (گورائیس) کے مشرق میں تھا - لیکن وہ آس پاس کے علاقہ کی ایسی جغرافیائی تفصیل نہیں بتاتے جس سے اس جگہ کو پہنچانے میں مدد مل سکے - اس علاقہ میں بظاہر فوجی اہمیت کا مقام جس پر انگریز اور ان سے پہلے مغل قابض رہے چکدرہ ہے جہاں دیر اور بالائی سوات کو جانے والی سڑکیں الگ ہوتی ہیں - یہ مقام دریائے سوات کے کنارے واقع ہے - لیکن اگر مساگا اس مقام پر واقع ہوتا تو یقیناً اریان یہ ضرور لکھتے کہ یہ جگہ ہموار علاقہ میں بہنے والے دریا کے کنارے واقع ہے - مساگا کی جغرافیائی تفصیل ہمیں کرٹیئس کی تحریر میں ملتی ہے - وہ اس کا نام مزاگا (MAZAGA) بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس علاقہ کے



Sketch illustrating probable site of
MASSAGA

Scale approximately 1″ to 1 mile

مشرق میں ایک پہاڑی چشمہ ہے جس کے دونوں کنارے ڈھلوان ہیں جبکہ جنوب اور مغرب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے فصیل کا کام لینے کے لئے بڑی بڑی چٹانیں جمع کر دی ہیں جن کے دامن میں دلدلیں اور تنگ گھاٹیاں منہ پھیلائے ہوئے ہیں۔

یہ بیان درۂ کٹ گلا کے تذکرہ پر بہت کچھ صادق آتا ہے۔ جو دیر جانے والی موجودہ سڑک پر چکدرہ سے تقریباً آٹھ میل شمال میں تالاش اور ادین زئی کی وادیوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں درۂ سے بالکل نیچے پہاڑیوں کی ایک چار دیواری ہے ایک چشمہ بھی ہے جو ''آچ خوڑ،، کہلاتا ہے یہ چشمہ کرٹیس کے بیان کے مطابق ہے اور مشرق میں ایک خندق کا کام دیتا ہے۔ اس علاقہ میں بہت سی گہری گھاٹیاں اور پرانی عمارتوں کے بہت سے کھنڈر ہیں جنہیں نقشوں میں بودھوں کے کھنڈر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس علاقہ کے دوسرے نمایاں مقامات کی طرح یہاں بھی ایک مسلم ولی کی زیارت ہے جو 'مجاور بابا، کے نام سے مشہور ہے یہ زیارت درختوں کے جنھڈ سے گھری ہوئی ہے یہ جگہ ایسے مقام پر واقع ہے جہاں سے مشرق اور مغرب کے درمیان اس واحد سڑک کو بند کیا جا سکتا ہے جو اس پہاڑی علاقہ میں فوج کے کام آسکتی ہے اور یہاں سے تالاش اور ادین زئی کے اس پورے علاقہ کا احاطہ کیا جا سکتا ہے جہاں جوار بکثرت پیدا ہوتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسکندر اور اس سے اٹھارہ صدی بعد بابر دونوں اس طرف ضرور آئے تھے۔ چارسدہ کی طرح ان کنھڈروں کی بھی کبھی باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی لیکن یہ قوی امید ہے کہ یہاں کھدائی سے بڑی بیش قیمت یادگاریں ملیں گی۔

اس میدان میں ایک اور بھی چیز ہے جو یہ طے کرنے میں مدد دے سکتی ہے کہ مساگا کٹ گلا ھی کے آس پاس واقع تھا۔ اریان اس محاصرہ کی جو تفصیل بیان کرتا ہے اس میں وہ یہاں کے جغرافیائی حالات نہیں بتاتا البتہ فوجی کیمپ سے تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی کا تذکرہ کرتا ہے جہاں ایک جنگی چال کے تحت اسکندر نے اپنے آدمی چھپا دئے تھے۔ جیسا کہ خاکہ سے ظاہر ہوتا ہے ایک الگ تھلگ چھوٹی سی پہاڑی درہ کے مشرق میں سڑک کے قریب واقع ہے۔ یہ تفصیل بھی اریان کے بیان سے مطابقت رکھتی ہے۔

مساگا کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے میں دو واقعات کا نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن سے پورا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اسکندر ایک گھاٹی کو پاٹنے کے کام کی نگرانی کر رہا تھا کہ اس کے پاؤں میں تیر لگ گیا۔ اریان کے بیان کے مطابق تیر ٹخنے میں لگا تھا اور کرٹیس کا کہنا ہے کہ پنڈلی میں پیوست ہوا تھا۔ جب تیر کا پھل زخم سے نکال لیا گیا تو اسکندر نے اپنا گھوڑا منگوایا اور زخم پر پٹی بندھوائے بغیر پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جب زخمی ٹانگ سہارے کے بغیر لٹکتی رہی اور خون خشک ہونے کے بعد زخم ٹھنڈا ہونے سے تکلیف بڑھی تو بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت اسکندر نے کہا کہ بےشک میں جو پیٹر کا بیٹا کہلاتا ہوں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے لیکن اس زخم نے مجھے انسانوں کی قطار میں لا کھڑا کیا ہے۔ پھر بڑی شان سے مسکراتے ہوئے اس نے درہ کٹ گلا میں کھڑے ہوئے اپنے معالجوں پر نظر ڈالی اور ہومر کا یہ فقرہ دوہرایا "میرے دوست یہ خون ہے خون زہرآب نہیں ہے جو لافانی دیوتاؤں کے بدن سے بہتا ہے"۔

دوسرا واقعہ کرٹیس کے الفاظ میں دوہرایا جائے تو بہتر ہوگا۔ "مساگا کے لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب بچاؤ نہیں ہو سکتا قلعہ میں جا چھپے جہاں سے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انھوں نے بادشاہ کے پاس ایلچی بھیجے تاکہ وہ اپنے لئے معافی حاصل کر سکیں۔ جب معافی مل گئی تو ملکہ عالی خاندانوں کی بہت سی خواتین کے جلو میں باہر نکلی۔ وہ سب کی سب سونے کے پیالوں میں نذرانہ کے طور پر شراب انڈیل رہی تھیں۔ ملکہ نے اپنے ہاتوں سے اپنے شیرخوار بیٹے کو اسکندر کے قدموں پر ڈال دیا اور اس طرح نہ صرف معافی بلکہ پہلی سی شان و شوکت قائم رکھنے کی بھی اجازت حاصل کرلی کیونکہ وہ ایک طرح دار ملکہ تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسکندر نے یہ مشفقانہ برتاؤ ملکہ کی بے بسی پر ترس کھا کر نہیں بلکہ اس کے حسن سے متأثر ہو کر کیا تھا۔ بہرحال بعد میں ملکہ کے ہاں ایک بیٹا ہوا جو اسکندر کہلایا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس کا باپ کون تھا۔

سٹین کا خیال ہے اور یہ خیال قابل یقین ہے کہ بازیرہ در اصل بیرکوٹ ہے جو کبھی کبھی بری کوٹ بھی پکارا جاتا ہے جو وسطی

سوات میں اس جگہ واقع ہے جہاں سے ایک چھوٹی سی سڑک بڑی وادی سے کٹ کر درۂ کڑاکڑ کے پار بنیر تک جاتی ہے۔ یہاں بہت سے آثار قدیمہ ہیں جن میں قدیم یونانی طرز کا بالا حصار، وا۔ی کے وسط میں بڑی اہم جگہ پر واقع ہے ۔ بازیرہ کے متعلق، اریان کا یہ بیان کہ ایک اونچا پہاڑ ہے جس کی چوٹی تک آبادی پھیلی ہوئی ہے بیر کوٹ کی پہاڑی پر صادق آتا ہے۔ اسٹین بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ بازیرہ ھی بدل کر بیر ھو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کوٹ کا اضافہ بعد کی چیز ہے جو عام چیز ہے جس کے معنی ھیں گڑھ یا محصور آبادی ۔ کوٹ کا فقرہ اس علاقہ میں بے شمار دیہات کے ناموں کے ساتھ شامل ہے ۔ اسٹین کا کہنا ہے کہ یونانی حرف زیتا (*Zeta*) تالو سے نکلنے والے حرف علت ’ی، کی بھی آواز دیتا ہے کیونکہ ’ی، یونانی زبان میں رائج نہیں ہے ۔ اس لئے بازیرہ کا تلفظ بائرہ یا بیرا بھی ھوسکتا ہے ۔ اور وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ھیں کہ کرٹیئس نے اس گڑھی کا نام بیرا ھی بتایا ہے بیرا کا بیر بن جانا بعید از قیاس نہیں ہے

اورا کے متعلق اسٹین لکھتے ھیں کہ یہ اس جگہ کا نام ہے جو اب راجہ گیرا کی گڑھی کہلاتی ہے اور وادی سوات میں بیر کوٹ سے چند میل کے فاصلہ پر اودے گرام کے اوپر واقع ہے۔ اس نام کا آخری فقرہ گرام پراکرت میں گاؤں کے معنی میں استعمال ھوتا ہے اور ھندی کا لفظ گاؤں اسی لفظ کی ایک شکل ہے ۔ اور جیسا کہ اسٹین کا کہنا ہے آڈے آڑا یا اوڑا سے بنا ھوگا۔ اسٹین جو مقام متعین کرتے ھیں وہ پہاڑ کے اس ابھار پر واقع ہے جو اصل وادی کو سیدو کی وادی سے جدا کرتا ہے اور یہاں بھی درختوں کے جھنڈ میں گھرا ھوا ایک ولی کا مزار ہے۔ یہ سوات کے حکمرانوں کی شکارگاہ سے تھوڑا سا اوپر ہے اور دفاعی استحکام کے لئے اسے قدرتی آسانیاں حاصل ھیں ۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اورا کے اس تعین کو قطعی نہیں قرار دیا جاسکتا ۔ اورا کو فتح کرنے کے بعد اسکندر نے پڑاؤ سے کوچ کیا اور بہ نفس نفیس پشاور کے میدان میں ھیفاسٹین سے جا ملنے کے لئے روانہ ھوا۔ پشاور کے میدان میں پیوکلاوٹس (چارسدہ) نے اس کی اطاعت قبول کی اس کے بعد اسکندر اورناس کو فتح کرنے سے پہلے دریائے سندھ کے گھاٹ پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف ھو گیا۔ اسکندر بیر کوٹ (بازیرہ) سے جو وادی سوات میں کافی بلندی پر واقع ہے۔ میدانی علاقہ میں کس طرح پہنچا ؟

یونانی کتابوں میں ہمیں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ یا تو وہ دوبارہ وادی میں نیچے اتر کر میدان میں آنے کے لئے مالاکنڈ کے راستے سے گزرا ہوگا یا اس نے تھوڑی دور اور مشرق کی طرف چھوٹے دروں شاہ کوٹ، چڑات اور مورہ میں سے کوئی ایک یا اس سے زیادہ درے عبور کئے ہوں گے۔ لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ سوات میں بیرکوٹ کی بلندی تک پہنچ کر وہاں سے وہ جنوب کی طرف پلٹا ہوگا جہاں سے وہ کڑاکڑ عبور کر کے بنیر آیا ہوگا اور پھر وہاں سے ملندرئی یا امبیلا میں سے کسی ایک یا دونوں دروں کے راستے میدان میں داخل ہوا ہوگا۔ یہی وہ راستہ ہے جو مغل فوج نے ۱۵۸۶ء میں اختیار کرنا چاہا اور چونکہ اس کی کمان مضبوط ہاتھوں میں نہیں تھی اس لئے اسے تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر اسکندر اپنی فوج اس راستہ سے گزارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تو بیرکوٹ کو فتح کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ بیرکوٹ کی تو اہمیت یہی ہے کہ وہ اس راستہ پر اہم چوکی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہمیں اورا کی تلاش سوات میں نہیں بلکہ بنیر میں کرنی چاہئے۔ یہ جگہ ڈگر کے آس پاس ہوسکتی ہے جو بنیر کی وادیوں میں جنگی اہمیت رکھتی ہے۔

اس علاقہ میں اسٹین کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اورناس کی چٹان کا پتہ لگالیا۔ یہ وہ جگہ ہے جو آج بھی آرنا یا انڑا کہلاتی ہے اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر کانا اور غوربند کی وادیوں سے اوپر پیرسر کی آبشار پر واقع ہے وہ جس جغرافیائی اور صوتی مماثلت کی بنیاد پر اپنا دعویٰ مرتب کرتے ہیں وہ قابل یقین ہے لیکن اس کا بیان خود ان ہی کے لفظوں میں مناسب ہوگا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ پیرسر کی پہاڑی پٹھان علاقہ کی بالکل بیرونی سرحد پر واقع ہے (۱) حال آنکہ اب اسے سوات میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اسٹین کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ یقین کو پہنچ جاتی ہے کہ اریان نے جو فوجی مہمات بیان کی ہیں ان میں اس علاقہ کا جغرافیہ بڑی صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے البتہ اس سے پٹھانوں کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

---

(۱) کانا اور غوربند کی وادیوں میں رہنے والے خان یوسف زئی ہیں لیکن عام آبادی گوجروں کی ہے۔

ابھی اسپاسی، گورائے اور اساکنی قبیلوں کے نام باقی رہ گئے جن پر اسکندر نے کونڑ اور سوات کے درمیانی علاقہ میں غلبہ حاصل کیا تھا۔ اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے اتنا ظاہر ہوتاہے کہ اسپاسی اس حد فاصل کے دونوں طرف جو آج کل ڈیورینڈ لائن کا ایک حصہ ہے کونڑ اور باجوڑ میں رہتے تھے، گورائے پنج کوڑہ پر اس علاقہ میں جو اب زیریں دیر ہے اور اساکنی جن کے علاقہ میں مساگا، بازیرہ اور اورا واقع تھے تالاش اور وادی سوات میں رہتے تھے۔

گورائے سے ملتا جلتا کوئی لفظ نہیں ملتا سوائے اس کے کہ ان کے دریا کا تذکرہ مہابھارت میں آتا ہے جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔

اسپاسی کی شناخت کے لئے استرابو جو انہیں ہپّاسی لکھتا ہے ہمیں ایک دلچسپ اشارہ مہیا کرتا ہے۔ اوستا کی فارسی میں گھوڑے کے لئے 'اسپا، جدید فارسی میں اسپ اور پشتو میں آس یا اسپا (گھوڑا، گھوڑی) استعمال ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے کہ استرابو نے اس قبیلہ کے نام کا ترجمہ ہپاسی کیا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس لفظ کی معنوی اہمیت سے واقف تھا۔ اس معاملہ میں گھوڑے اور ایرانی زبان کی کچھ نہ کچھ جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔

یوسف زئیوں کی اصل کے متعلق حال ھی میں ایک بحث کے دوران میں اریان کے گنائے ہوئے قبائلی ناموں کا حوالہ دئے بغیر مجھے بتایا گیا کہ ایک عام یوسف زئی دیہاتی کبھی اپنے آپ کو یوسف زئی نہیں کہتا بلکہ ایسپ زئی یا آسپ زئی کہتا ہے۔ میرے ساتھ اس بحث میں حصہ لینے والے نے جو ھوتی کا ایک خان تھا یہ بھی کہا کہ 'مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد میرے اسلاف نے ایک پرانے مروجہ نام کو قرآن مجید میں آئے ہوئے نام سے بدل دینے کا فیصلہ کیا چنانچہ آسپ یا ایسپ یوسف میں تبدیل ہو گیا'۔

میں نے کئی سال تک عدالت میں یوسف زئی گواھوں کے بیانات سنے ھیں ان سے بھی اس صوتی تبدیلی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی ایک اور مثال ہے کہ یوسف زئی 'ف، کو 'پ، سے بدل دیتے ھیں۔ اس دعوے کو ثابت تو نہیں کیا جا سکتا پھر بھی اریان کے اسپاسی اور استرابو

کے ہپاسی میں آج کے آسپ زئی کی اصل تلاش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا ہمیں اس بات سے الجھن میں نہیں پڑنا چاہئے کہ اسکندر کے زمانہ میں اسپاسی کونڑ اور باجوڑ کی وادیوں میں یعنی اس علاقہ سے اور مغرب کی طرف آباد تھے جہاں آج کل یوسف زئی رہتے ہیں۔ خود یوسف زئیوں کی روایت کے مطابق اس قبیلہ نے پندرھویں صدی میں کابل کی طرف سے آکر موجودہ علاقہ پر قبضہ کیا ہے

یہ حقیقت اپنی جگہ اہم ہے کہ یوسف زئی بڑی پابندی کے ساتھ کرخت پشتو (پختو) بولتے ہیں گزشتہ باب میں ہم نے دلیل پیش کی ہے کہ جس دریا کو کونڑ متعین کیا گیا ہے اس کے قدیم ناموں یوسپلا اور خواسپس(۱) سے یہ ثابت کرنے میں مدد ملتی ہے کہ کونڑ میں ارسطو اور اسکندر کے زمانہ میں ایرانی زبان ایسی شکل میں رائج تھی جس کا تلفظ کرخت تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپاسی ایرانی زبان کرخت لہجہ میں بولتے تھے جیسا کہ آجکل یوسف زئیوں کا تلفظ ہے یہ بات بھی تعجب سے خالی نہیں کہ دونوں قبیلے اور وہ دریا جس کے کنارے وہ رہتے تھے ان کے نام میں اس لفظ کی جھلک تھی جو ایرانی زبان میں گھوڑے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (اسپ)۔

سوات کے اساکنی بھی شہسواری میں کونڑ اور باجوڑ کے اسپاسیوں سے کم مشہور نہیں ہیں۔ سنسکرت میں گھوڑے کے لئے اسوا کا لفظ آتا ہے اور مہا بھارت میں ایک ایسے قبیلہ کا نام آتا ہے جو اسوا کہلاتا تھا اور جو انتہائی شمال میں رہنے والا ایک وحشی قبیلہ تھا۔ سنسکرت کا لفظ اسوا پراکرت میں جا کر اساکا ہو گیا اور وہاں سے براہ راست یونانی میں جا کر اساکنے ہو گیا۔ اس طرح یہاں فارسی کی جگہ ہندوستانی گھوڑوں کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ مناسب بھی ہے کیونکہ جس طرح ایک ایرانی قبیلہ اسپاسی کونڑ اور باجوڑ میں رہتا تھا اسی طرح ایک ہندوستانی قبیلہ اساکنی تالاش اور سوات میں آباد تھا۔ جیسا کہ ہم اس زمانہ میں توقع کر سکتے ہیں ایران اور ہندوستان کی حدفاصل کونڑ اور سوات دریاؤں کے درمیان کسی مقام پر اور غالباً گورائیس یا پنج کوڑہ دریا پر ہو گی۔ بعد کی کتابوں اور کتبوں سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سوات اور پنج کوڑہ کے مشرق میں بسنے والوں کا تعلق اس وقت تک ہندوستانیوں سے تھا

---

(۱) خو(ښه) یا خوه (ښۀ) پختو لفظ ہے جس کی معنی ہیں اچھا۔

جب تک کہ پٹھانوں نے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں اس علاقہ پر قبضہ نہیں کر لیا۔

یہاں شمال مغربی سرحد میں یونانی اور لاطینی اہل قلم کی مداخلت ختم ہوجاتی ہے۔ دارائے اعظم کی ساتویں اقلیم کا قیام (چھٹی صدی قبل مسیح کا آخر) اور اسکندر کا مشہور حملہ (چوتھی صدی قبل مسیح کا آخر) یہ دو ایسے واقعات ہیں جو افغانوں کے وجود کی شہادت دستیاب ہونے سے سینکڑوں سال پہلے رونما ہوئے۔ اور اس علاقہ کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ وہ ظہور اسلام سے پہلے کے زمانہ پر نظر نہیں ڈالتے اور اگر نظر ڈالتے بھی ہیں تو سچے مسلمانوں کی طرح توریت اور زبور کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ یہ طرز فکر اس حقیقت کے مانع نہیں ہے کہ پختون کا لقب اسلام سے کہیں پہلے کے زمانہ سے چلا آرہا ہے اور جو قبائلی نام آج استعمال ہوتے ہیں وھی بدلی ہوئی شکلوں میں اس علاقہ میں ڈھائی ہزار سال پہلے استعمال ہوتے تھے۔ کیونکہ اریان اور هیروڈوٹس کی کتابیں حقیقی تاریخ ہیں۔ ان لوگوں کا عہد زمانۂ جاهلیت نہیں تھا۔ اگر ہم سائیلیکس اور اسکندر کے دریائے سندھ پر پہنچنے کا بیان پڑھیں اور اس علاقہ کو شناخت کر لیں تو ہمیں مقامات اور قبائل کے ناموں کی مماثلت سوچے سمجھے بغیر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس خیال کا مضحکہ اڑائیں گے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نام اور مقامات موجود رہ سکتے ہیں ان کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ ان دور دراز وادیوں میں برطانیہ میں ہاڈریان کی دیوار کی طرح ایک ہزار سال کا عرصہ خواب کی طرح گزر جاتا ہے۔ اگر آج کا کوئی انسان مصروف خواب ہو کر اس عہد میں جاگ سکے جب وادی تالاش میں اسکندر یا بابر اپنی فوجوں کے ہتھیاروں کی جھنکار کے ساتھ گزر رہا تھا تو وہ دیکھ سکے گا کہ اس وقت کے دیہات کے باشندے ویسے ہی ہیں جیسے آج کل کے باشندے ہیں۔ البتہ کچھ عرصہ میں ہتیار ضرور بدل گئے ہیں۔ یہ جنگجو لوگ جو دو ہزار سال سے زائد عرصہ پہلے پکٹویک کی سرحدوں پر رہتے تھے لی انفیلڈ سے پہلے قرابین، قرابین سے پہلے جیزیل اور جیزیل سے پہلے تیر کمان استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔

فصل چہارم

پختو کی پیدائش

۳۲۱ء قبل مسیح میں اسکندر کی موت کے ساتھ وہ روشن شمع گل ہو گئی جس نے تھوڑی مدت تک شمال مغربی سرحد کو منور کر رکھا تھا اور تاریخ بیشتر سکوں اور کتبوں کی مدد سے بکھرے ہوئے واقعات کو جوڑنے کا صبر آزما کام بن کر رہ گئی۔ اس کام میں گنتی کی ان چند تحریروں سے روشنی کی چند کرنیں مہیا ہوتی ہیں جو ایلچیوں اور جغرافیہ نویسوں نے بغیر سلسلہ گاہے گاہے سپرد قلم کی ہیں۔ ان ایلچیوں میں سے ایک تو میگاستھنیز ہے جسے سلوکس نے موریا دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا اور دو جغرافیہ نویس استرابو اور بطلیموس ہیں جن کا پہلے ہی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ دو ہزار سال تک پکٹو کا نام ناپید رہتا ہے اور افغان کا لقب واضح طور پر اس وقت تک نہیں ابھرتا جب تک ہم قریب قریب اسلامی دور میں داخل نہیں ہو جاتے۔ بعد میں پانچویں اور ساتویں صدی میں چینی سیاح فاہیان (۳۹۹-۴۱۴ء) اور ہوان سانگ (۶۲۹-۶۴۵ء) جن کی تحریریں بڑی دلچسپ ہیں واقعات کے رخ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیں اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ گندھارا اور شہر پسکاپوروس (پشاور) کے نام برقرار ہیں۔ اس علاقہ میں اسکندر کی وفات اور ظہوراسلام کے درمیان کا زمانہ شمال کی طرف سے پے در پے حملوں کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کے دوران ایرن اور ہندوستان کے درمیان سرحدی علاقہ کے حکمران بدلتے رہتے ہیں اور کبھی ایرانی طاقت کا پلہ بھاری نظر آتا ہے کبھی وادی سندھ کے حکمران غالب آ جاتے ہیں۔

اس تمام افراتفری کے زمانہ کے متعلق جو تحقیق کی گئی ہے وہ یا تو قدیم ہندوستان یا مغربی ایران کی تاریخ مرتب کرنے کے رجحان پر منتج ہوتی ہے۔ ونسینٹ سمتھ (۱) پہلی صورت کی اور غرشمین (۲) دوسرے رجحان کی مثال ہیں۔ ماضی قریب میں بھی اس طویل زمانہ پر مشرقی ایشیا کے میدانوں یعنی اس وسیع علاقہ کے پس منظر میں جو مجملاً بعد میں ترکستان کہلانے لگا ہے نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میک گورن کی کتاب کا یہی موضوع ہے ان میں سے کوئی بھی مصنف گندھارا یا سرحدی علاقہ حتیٰ کہ افغانستان کو بھی اپنی توجہ کا مرکز نہیں بناتا اور کوئی کتاب اس نیت سے نہیں لکھی گئی کہ مختلف زبانوں میں افغانوں یا پٹھانوں کی اصل کا پتہ چلا جائے۔ پوزیشن وہی ہے جس پر الفنسٹن نے کسی اور موقع پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ مرتب کرتے وقت ہم صرف ان ہی زمانوں کی تفصیلات صحت کے ساتھ فراہم کر سکتے ہیں جب ہندؤں سے دوسری قوموں کا واسطہ پڑا۔ پٹھانوں کی تاریخ مرتب کرنے والے کو اس قسم کی دشواری سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔

نتائج خواہ کتنے ہی حقیر کیوں نہ ہوں ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم ان حکمرانوں کے بارے میں ایک طرح کے خاندانی کارنامے مرتب کریں جو اس طویل عرصہ کے دوران میں شمال مغرب کی سرحد کے لوگوں پر فرمان روائی کے دعویدار ہیں۔ چونکہ اس زمانہ کے متعلق قبائلی روایات خاموش ہیں اور کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں اس لئے ہم پر یہ راز افشا ہوتا ہے جو میرے نزدیک ایک حقیقت ہے کہ اخامنشی خاندان کے زوال کے بعد کبھی بھی ان پہاڑیوں میں رہنے والے قبیلوں پر کسی حکومت کا زور نہیں چلا۔

چونکہ آئندہ بیان ساکاؤں کے تذکرہ کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا اس لئے ہیروڈوٹس کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب ہے کہ اس مسئلہ پر بھی یہی عظیم شخصیت کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ وہ کے خسرو کی فوجوں (۴۸۰ ق م) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

---

(۱) *EARLY HISTORY OF INDIA* مصنفہ VINCENT SMITH

(۲) *IRAN* مصنفہ GHIRSHMAN

''ساکائی، شلوار پہنے ہوئے تھے اور ان کے سروں پر لمبی نوکیلی ٹوپیاں تھیں۔ وہ اپنے ملک کی کمان خنجر اور کلہاڑے سے مسلح تھے جو سگارس کہلاتا ھے۔'' وہ آگے چل کر لکھتا ھے کہ حقیقت میں یہ لوگ اسورجین (AMURGIAN) تورانی تھے لیکن ساکائی کہلاتے ھیں کیونکہ ایرانی تمام تورانیوں کو اسی نام سے پکارتے ھیں۔ ھیروڈوٹس کے بیان کی تصدیق دونوں اخامنشی حکمرانوں دارا کے خسرو کے کتبوں سے ھوتی ھے جن میں اسورجین کا لقب ایک سے زیادہ مرتبہ آتا ھے۔ غالباً اس سے مراد وہ ساکا ھیں جو آمو دریا پر رھتے تھے۔ اپنے قرابت دار پارتھیوں کی طرح جو اور آگے مغرب میں رھتے تھے تورانی ایرانی نسل سے تھے اور وہ زبان بولتے تھے جسے اب پختو کی اصل سمجھا جاتا ھے اور جس کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ھے کہ یہ زبان مشرقی ایرانی گروپ میں شامل تھی اور ہندوستانی یورپی زبانوں کی درجہ بندی میں ہندوستانی شاخ ہ نسبت ایرانی شاخ سے زیادہ قریب تھی ان کا تذکرہ آگے آئیگا

متعلقہ علاقوں کے کلاسیکی ناموں سے واقفیت کے بغیر ایران اور ہندوستان کی سرحد کے آر پار سلطنتوں کے قائم ھونے اور مٹنے کی تفصیلات سمجھنا مشکل ھے۔

گندھارا جیسا کہ ھمیں معلوم ھے ھیروڈوٹس کے پکٹویک سے مطابقت رکھتا ھے اور وادی پشاور کا نام ھے۔ غالباً وقتاً فوقتاً اس میں آس پاس کے کچھ اور علاقے بھی شامل رھے ھونگے۔ اراکوسیا مجملاً غزنی اور قندھار کا نام ھے درنگیانا سیستان ھے اور ایریا ھرات ھے۔ جدروسیا بلوچ علاقہ ھے جو اراکوسیا کے جنوب میں سمندر تک پھیلا ھوا ھے۔ باختریا موجودہ افغان صوبہ ترکستان کا نام ھے جو آمو دریا کے جنوب میں واقع ھے اور پارتھیا باختریا کے مغرب میں بحیرۂ کیسپین کی طرف واقع ھے۔ باختریا کے مشرق میں سوغدیانا ھے جو سر سری طور پر وادی زرفشاں ھے جو سمرقند اور بخارا کو سیراب کرتی ھے۔ پارتھیا، باختریا اور سوغدیانا کے شمال میں ساکاؤں کا وطن واقع تھا۔ اخامنشی دور میں ان تمام علاقوں میں جو ہندوکش کے شمال میں واقع ھیں ایرانی لوگ آباد تھے جو ایرانی زبان بولتے تھے اور سب کے سب جن میں کچھ ساکا بھی شامل ھیں اخامنشی حکمرانوں کی رعایا تھے۔ ھمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں گندھارا کے علاقہ میں کون سی مقامی زبان بولی جاتی تھی۔ لیکن یہ یقین مشکل ھے کہ

وہ اقلیم جو دو سال تک اخامنشی خاندان کے زیر نگین رہی اس میں ایسی بولیاں نہیں بولی جاتی تھیں جو ایرانی گروپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستان سے قربت کی وجہ سے ان بولیوں میں ہندوستانی زبانوں کا بھی اثر آگیا ہو۔ اس وقت تک اس علاقہ پر ہنوں یا ترکوں نے حملہ نہیں کیا تھا۔

اسکندر کے مرتے ہی اس کے جرنیلوں میں اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارا کی سلطنت کا پورا ایشیائی حصہ جو اسکندر نے فتح کیا تھا سلوکس کے ہاتھ آیا۔ شام اور بابل میں سلوکس کا خاندان ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک حکمران رہا لیکن سلطنت کے مشرقی حصوں میں وہ اقتدار قائم نہ رکھ سکا جو اسکندر نے حاصل کیا تھا۔ مقدونیہ کے افسروں کو چند ہی سال بعد ہند اور گندھارا سے باہر نکال دیا گیا اور جب سلوکس نے اپنا زوال پذیر اقتدار بحال کرنے کی کوشش میں بہ نفس نفیس ۳۰۵ ق م میں دریائے سندھ کی طرف پیش قدمی کی تو وہ ہندوستان میں نئی ابھرنے والی طاقت سے شکست کھا گیا اور اس نے ایک سمجھوتہ کرلیا جس کے تحت پانچسو ہاتھیوں کے تحفہ کے عوض وہ نہ صرف گندھارا بلکہ اراکوسیا اور جدروسیا سے بھی اپنے ہندوستانی حریف کے حق میں دست بردار ہوگیا۔

یہ حریف چندر گپت تھا (جس کا نام یونانی زبان میں سنڈرا کوٹوس لکھا جاتا ہے) جس نے ۳۲۳ (ق م) میں موریہ خاندان کی بنیاد ڈالی اور جو اشوکا (۲۷۳-۲۳۲ ق م) کا دادا تھا۔ اشوکا کے بعد موریہ سلطنت پارہ پارہ ہوگئی لیکن ایک سو سال تک وادی پشاور، سرحدی علاقہ اور اس سے بھی آگے غالباً دریائے کابل کی بالائی وادی میں لغمان تک موریوں ہی کی حکومت قائم رہی۔ اشوکا بودھ مت کا بہت بڑا مبلغ تھا۔ اور مردان کے قریب شہباز گڑھی اور اس سے اوپر مانسہرہ کے مقام پر اس کی نصب کی ہوئی لاٹیں اور ٹیکسلا اور لغمان میں اس کے کتبے اس کے مذہب اور اس کی انسان دوست حکومت کا ثبوت ہیں۔ بامیان میں ہندوکش کے غاروں سے دریافت ہونے والے بت اور بخارا تک کے شمالی علاقہ کی بہت سی روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بودھ مت جو ہندوستان سے شروع ہوا تھا ایک زمانہ میں قریب قریب اس پورے علاقہ پر چھا گیا تھا جو کبھی مشرقی ایران کہلاتا تھا۔ لیکن اشوکا کے کتبوں سے ہمیں سرحد کے ان باشندوں

کے طرز زندگی اور قرابتوں کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا جن پر اشوکا حکومت کرتا تھا - اور اپنے بعد میں آنے والے سفیروں کی طرح موریہ دربار میں سلوکس کا سفیر میگاستھنیز دارالحکومت کے معاملات میں اتنا مصروف تھا کہ وہ سرحدی علاقوں پر توجہ نہیں دے سکتا تھا -

وادی پشاور کی پہاڑیوں پر بودھ خانقاہوں کے کھنڈر بڑے دلکش مقامات پر واقع ہیں - ان میں سے ہر مقام ایسا ہے جہاں سے دور دور تک طرح طرح کے مناظر نظر آتے ہیں اور آج بھی ان مقدس ہستیوں کے جذبہ اور تخیل کا مظہر ہیں جنھوں نے ان خانقاہوں کا منصوبہ بنایا اور انہیں تعمیر کیا - ان میں سے سب نہیں تو بیشتر خانقاہوں کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ اشوکا کے زمانہ سے بہت بعد میں بنائی گئی ہیں اور اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گندھارا اسکول جس کا طرۂ امتیاز آرائشی سنگ سازی ہے کشان اور روم کا ہم عصر ہے اور اس پر موریوں یا یونانی مقدونیوں کا اثر نہیں پڑا - پھر بھی یہ اشوکا ہی تھا جو بودھ مت کا پہلا اور سب سے بڑا اور دنیاوی مفسر تھا اور اسی کی بدولت شمال میں بودھ مت کا اتنا پرچار ہوا - لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس علاقہ کے باشندوں کے لئے وہ ماحول بڑا اجنبی تھا - وہ زمانہ ایک خواب کی طرح گزر گیا اور اس کی کوئی یاد باقی نہیں رہی - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پٹھانوں میں اس زمانہ کی یادگار یہ رہ گئی ہے کہ کرلانی قبیلے دو حصوں گار اور سامل میں منقسم ہیں - لوگ اس اختلاف کی اصل نہیں بتا سکتے جو آج سیاسی یا کسی اور اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا البتہ ایک قبائلی کے لئے قبیلہ کا ایک نام چھوڑ کر دوسرے نام سے منسوب ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جس طرح کھیلوں کے مقابلہ کے موقع پر آکسفورڈ یا کیمبرج سے تعلق رکھنے والا مخالف ٹیم کی حمایت نہیں کر سکتا - کہا جاتا ہے کہ یہ امتیاز زمانۂ اسلام سے پہلے کے مذہبی تعلق کو ظاہر کرتا ہے - کچھ لوگ پرانے ایرانی مذہب یعنی زردشت کے پھیلائے ہوئے مذہب کے پیرو تھے اور دوسرے لوگوں نے اشوکا اور بعد کے خاندانوں کی مبلغانہ کوششوں کی بدولت بودھ مت اختیار کر لیا تھا - اس تشریح کے مطابق گار فرقہ ایرانیوں کے 'مغان گبر' اور سامل فرقہ بودھوں کے 'سرامان' کی یادگار ہے - اس ہیجان خیز خیال کی اصل خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گندھارا جیسے ملک میں

جہاں صدیوں تک پہلے تو حکمران 'اھورا مزدا، اور 'اھرمن، کے مذھب کو مانتے رھے اور پھر بودھ مت کے قائل ھو گئے دونوں مذھبوں کا کیسا سخت مقابلہ ھوگا۔

موریہ کتبوں میں بھی قبائل کا کوئی ذکر نہیں ھے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاھئے کہ پوری ایک صدی سے یہ قبائل ایک ھندوستانی سلطنت کی حدود میں رہ رھے تھے۔ اگرچہ اس سلطنت کا حکم دور دراز پہاڑوں پر نہیں چلتا تھا لیکن میدانی باشندوں نے واضح طور پر ھندوستانی ثقافت اپنا لی تھی اس ثقافت کی تہ اس ثقافت پر بیٹھ گئی تھی جو قبائلیوں نے اخامنشی دور میں سیکھی تھی۔ پختو میں جو ایک ایرانی زبان ھے ھند آریائی زبانوں کے الفاظ کا اس کثرت سے شامل ھونا ان زبردست ثقافتی اثرات کو ظاھر کرتا ھے جنھوں نے چندر گپت اور اشوکا کے زمانہ میں گندھارا کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔

اشوکا کی وفات (۲۲۷ ق م) سے تھوڑے عرصہ بعد موریہ سلطنت کے خاتمہ اور غالباً ۷۵ عیسوی میں کشان کی ھند تاتاری سلطنت کے قیام کے درمیان تقریباً تین صدیاں گزر گئیں۔ اس عرصہ میں یونانی باختری، ساکا اور ھند تاتاری خاندان باری باری گندھارا پر حکومت کرتے رھے اور اس طرح انقلاب زمانہ کے ساتھ سرحد کے علاقہ پر پھر ایک ایسی قوم کا اقتدار قائم ھو گیا جو وسطی ایشیا سے آئی تھی۔ ان تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے موریہ سلطنت کے زوال سے چند سال پہلے کے زمانہ میں پہنچ کر یہ بتانا ضروری ھے کہ ایران میں سلوکسی خاندان پر کیا گزری۔ قریباً ۲۵۰ ق م میں جبکہ اشوکا ابھی زندہ تھا سلوکسی طاقت کا دو طرفہ زوال شروع ھوا۔ مشرق میں تو اس کے ھاتھ سے باختری اقلیم جاتی رھی اور مغرب میں پارتھیوں نے بغاوت کر دی۔

ایک آزاد باختری سلطنت کا قیام جس کی سرحدیں بعد میں بیشتر شمالی ھندوستان تک پھیل گئیں خود مختاری کے بتدریج بڑھتے ھوئے رجحان کا نتیجہ تھا اور اس کی قیادت سلوکس کے صوبیدار ڈیوڈوٹس اول اور دویم کر رھے تھے۔ یہ کہانی جسے سر ولیم ٹارن نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ھے درحقیقت گندھارا کی نہیں بلکہ اسکندر کے جانشینوں کے دور کی یونانی تاریخ کا حصہ ھے۔ انٹیوکس اعظم نے ۲۰۶ ق م میں باختر کو سلوکس کے

زیر نگیں رکھنے کی لاکھ کوشش کی لیکن ڈیوڈوٹس دویم اور اس کا داماد یوتھیڈیس آزاد باختر قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ۱۸۰ ق م کے قریب باختریوں نے یوتھیڈیس کے بیٹے ڈمیٹریس کی قیادت میں گندھارا اور پنجاب پر حملہ کیا اور انھیں فتح کر لیا اس طرح ٹیکسلا میں موریہ سلطنت کے کھنڈروں پر ان کی سلطنت تعمیر ہو گئی۔

اس کے بعد سلوکس کے ایما پر شہزادہ یوکریٹائڈس کی قیادت میں مشرقی علاقوں کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کی گئی شہزادہ نے ڈمیٹریس کو شکست دے کر ہلاک کر دیا اور کچھ دنوں کے لئے دریائے سندھ تک گندھارا پر قابض رہا۔ لیکن یوکریٹائڈس کو منانڈر نے گندھارا سے نکال دیا۔ منانڈر ڈمیٹریس کی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے شمالی ہند میں باختری حکومت کا وارث بنا تھا اور ایک جنرل کی حیثیت سے اس نے خود بھی اس حکومت کے قیام میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ یونانیوں کی ان آپس کی لڑائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ نہ صرف گندھارا باختر سے علیحدہ ہو گیا بلکہ اس علاقہ میں جو اب افغانستان اور وادی سندھ ہے یونانی تہذیب بحال کرنے کی امید ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ بہرحال ان حکمرانوں نے جن کا دارالحکومت پہلے ٹیکسلا اور پھر سکالا (سیالکوٹ) تھا بعض بہترین سکے چھوڑے ہیں اور ٹارن کے بیان کے مطابق فن لطیفہ میں بھی ایک ایسی روایت چھوڑی ہے جو گندھارا فن مجسمہ سازی کے بعد کے دور میں ہنایانا بودھ مت کو مہایانا بودھ مت میں تبدیل کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی بودھ مت کو ایک برگزیدہ انسان کی بجائے دیوتا یا خدا ظاہر کیا جانے لگا۔

یونانی باختری خاندان گندھارا پر تقریباً ایکسو سال تک (۱۸۵-۹۰ق م) حکمران رہا یہاں تک کہ بھائی سے بھائی کے حسد نے جو یونان کے سیاسی نظام کا خاصہ تھا ان کی سلطنت کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹ دیا جن پر شہزادے حکومت کرنے لگے اور نئے طوفان یعنی ساکاؤں کے حملے کا مقابلہ نہیں کیا جا سکا جو ایک طرف بلوچستان سے سندھ کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف اور دوسری جانب شمال سے پیش قدمی کر رہے تھے۔ یہ بات معقول حد تک پایۂ یقین کو پہنچ گئی ہے کہ یونانی باختری عہد میں اس پورے علاقہ کی آبادی ایرانی تھی اور برابر مشرقی ایرانی باختری

یا سوغزی (سغزی) بولی بولتی تھی۔ لیکن یونان زدہ بالائی طبقہ جو اسکندر کے آباد کئے ہوئے لوگوں میں سے بچی کھچی آبادی پر مشتمل تھا یا ان سے متأثر تھا اس نے ملک کی تہذیب پر یونانی تہذیب کا رنگ چڑھا رکھا تھا کیونکہ اس طبقہ کے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اس کے علاوہ ساکا خانہ بدوشوں کی پیش قدمی روکنے کی غرض سے سرحدوں کی حفاظت کے لئے یونانی یا مقدونی سپاہی درکار تھے اور شہروں کی منصوبہ بندی بھی یونانی طرز پر ہوئی تھی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسی طرح آج کے پشاور پر انگریزوں نے بھی اپنا اثر چھوڑا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس یونانی خطہ کا دور دراز علاقہ میں واقع ہونا ایرانیوں اور یونانیوں کے لئے ایک ایسی مفاہمت کا سبب بن گیا جو امتداد زمانہ کے باوجود قائم ہے۔ بعد میں ان سے ملتے جلتے حالات میں پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان بھی ایسی ہی مفاہمت پیدا ہوگئی تھی۔

اس کا سبب خواہ کچھ بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ باختری تہذیب کا یونانی عنصر گندھارا میں بھی سرایت کر گیا۔ پٹھانوں کے حلیہ یا روایات میں اس قدیم یونانی تہذیب کی بھولی بھٹکی یاد یا نشانی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک صدی تک پشاور کے میدان میں رائج رہی اور جس کا مرکز ٹیکسلا تھا۔ جیسا کہ پہلے خیال ظاہر کیا جا چکا ہے افریدیوں کا یہ دعویٰ کہ ان کے اجداد یونانی تھے اور اسی قسم کی دوسری روایتیں اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسکندر کے ورود کی چند ماہ کی مدت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ چند مخطوطات جو امتداد زمانہ کے باوجود باقی رہ گئے ہیں، مہروں، سکوں اور چند پتھر کی یادگاروں کے سوا اس عہد کے متعلق کچھ دستیاب نہیں ہے۔ جدید ترین محققوں کا دعویٰ ہے کہ گندھارا مجسموں میں سے بیشتر کا تعلق اس عہد سے نہیں بلکہ دو سو سال بعد کے کشان عہد سے ہے۔ اب گندھارا آرٹ کو یونانی باختری فرماں رواؤں کا فنی ذریعۂ اظہار نہیں سمجھا جاتا (۱) اس عہد کے نشانات نہ ملنے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اس علاقہ میں باختری حکومت اپنی روح کے اعتبار سے ایرانی تھی

(۱) ٹارن کا نظریہ بالکل مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ گندھارا میں مہاتما بدھ کے جو مجسمے بنائے گئے ہیں وہ اس زمانہ کے ہیں جب گندھارا پر یونانیوں کی حکومت تھی۔ وھیلر نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ یونانی باختری حکومت کے قیام نے گندھارا آرٹ کے لئے راستہ ہموار کیا۔

البتہ اس کے اوپر یونانی ملمع چڑھا ہوا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بعد میں اس راستہ سے جو حملہ آور یکے بعد دیگرے گزرے ان کی بدولت بیشتر نشانات مٹ گئے۔(۱)

ٹیکسلا اور سکالا کی یونانی باختری حکومت قریباً ۹۷ ق م میں ساکا حملہ کی نذر ہوگئی۔ لیکن یہ جانچنے سے پہلے کہ ساکا کون تھے یہ ضروری ہے کہ اسکندر کے جانشینوں کے خلاف دوسری بغاوت کی تفصیل بیان کی جائے جو پارتھوں نے ۲۴۹ ق م میں کی۔ باختریوں کے برعکس پارتھیوں کی تہذیب یونانی اثر سے پاک تھی۔ یہ لوگ جفاکش ایرانی تھے جو خانہ بدوش تورانیوں کی نسل سے اور ساکاؤں کے قرابت دار تھے۔ وہ کیسپین اور ارل کے درمیان کے لق و دق میدان میں جہاں اب سوویٹ ترکستان واقع ہے آباد تھے۔ ایران پر ان کی حکومت جو پچاس سال تک لڑائی کے بعد قائم ہوئی اس کے لئے پانچسو سال تک قائم رہنا مقدر ہوچکا تھا ان کی قیادت پارتھی قبیلہ کے پارتھی گھرانے کے ہاتھ میں تھی جس کے سردار ارساکیش کے نام پر ارد شیری خاندان کا نام پڑا۔ یہ خاندان ایک عرصہ تک ایران پر حکومت کرتا رہا یہاں تک کہ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی اس پر غالب آگئے اس طویل عرصہ میں مغربی ایران کی تہذیب نے رفتہ رفتہ تمام یونانی اثرات جذب کر لئے۔ تاریخ میں یہ آخری موقع نہیں تھا جب ایران نے غالب کو مغلوب بنا لیا۔ ارد شیری خاندان نے جسے ان مشہور تیرانداز شہسواروں کی حمایت حاصل تھی جو دوڑتے ہوئے اپنے عقب میں تیر چلاتے تھے، ہر حملہ آور کا مقابلہ کیا۔ ان میں روم کی فوجیں بھی شامل ہیں۔ مغرب میں یہ لوگ اس لئے مشہور ہیں کہ انہوں نے سلطنت روما کی مجلس کے رکن کراسس کو شکست فاش دی خود اسے ہلاک کر دیا اور ۵۳ ق م میں کاریا کی لڑائی میں اس کی فوج کو تباہ کردیا۔

اخامنشی صوبہ پارتھیا کی سرحدیں قریب قریب جدید ایران کے خراسان یعنی صوبۂ مشہد سے ملتی تھیں لیکن پارتھی اور اوپر شمالی علاقہ کے خانہ بدوش تھے اور اگرچہ ایرانی نسل سے تھے لیکن حقیقت میں تورانی تھے اور ان ساکاؤں کے قرابت دار تھے جنھوں نے بعد میں یونانی باختری حکمرانوں کو شکست دے کر گندھارا کو تاخت و تاراج کر دیا۔

(۱) آثار قدیمہ خاص طور پر پشکلاؤتی کی مزید کھدائی سے اس موضوع پر اور روشنی پڑنے کی توقع ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ھے کہ دونوں حالتوں میں وہ خانہ بدش تھے جنھوں نے اپنی ھی طرح کے ایرانی النسل اور آباد لوگوں پر غلبہ پایا۔ پارتھیوں کا ایران پر غلبہ اور ساکاؤں کی گندھارا کی طرف پیش قدمی یہ دونوں تورانی قبیلوں کی جنوب کی طرف ایک وسیع پیش قدمی کا حصہ تھے جس نے ایران اور باختر دونوں علاقوں میں اس یونانی تہذیب کو ختم کر دیا جو سلوکسی اور یونانی باختری حکمرانوں کی قیادت میں دنیائے ایران پر مسلط کردی گئی تھی۔ لیکن ایران پر تورانیوں کا حملہ مشرق میں ساکاؤں کے حملہ سے ایکسو سال پہلے ھوا۔ یہ ایک پیش خیمہ تھا اور اس وقت جبکہ ساکا آباد علاقوں کی طرف بڑھے تورانی حملہ آور ایرانی تہذیب قبول کرچکے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پارتھی ایران کی طرف تورانیوں کی پیش قدمی روکنے کے لئے تیار ھو گئے اور درحقیقت انھوں نے اس پیش قدمی کو روک بھی دیا۔ نتیجہ یہ ھوا کہ ساکا جنوب مشرق کی طرف رخ کرنے پر مجبور ھو گئے اور انھوں نے باختر کو تاخت و تاراج کر دیا۔ وھاں سے کچھ قبیلے گندھارا کی طرف اور کچھ سندھ کی طرف روانہ ھوگئے۔ وہ شروع سے آخر تک سیاست اور ثقافت کے اعتبار سے پارتھیوں کے ساتھ وابستہ رھے۔ مثال کے طور پر یہ لوگ جس شکل کی ایرانی زبان بولتے تھے اس کے بہت سے عناصر خانہ بدوش پارتھی قبیلوں کی زبان کے ساتھ مشترک تھے۔

ھمیں بتایا جاتا ھے کہ ھمیں پٹھانوں کی زبان کی ابتدا اس دور سے سمجھنی چاھئے۔ جدید ترین محققوں کا خیال ھے کہ پٹھانوں کی زبان ساکا بولی ھے جو شمال کی طرف سے رائج ھوئی ھے۔ حکمران خاندانوں کے وقائع کا حوالہ دینے سے پہلے ھمیں یہ جائزہ لینا چاھئے کہ یہ نظریہ کس بنیاد پر قائم ھے۔ آج پختو یا پشتو پٹھان کی واضح ترین شناخت اور پٹھان کے جذبۂ افتخار کی علامت ھے۔ اگر یہ قیاس یقین کی حد تک پہنچ جائے کہ اس زبان کا ابتدائی نمونہ ساکاؤں کے ساتھ آیا تھا تو ھماری تاریخی عمارت کا ایک اور سنگ بنیاد قائم ھو جائے گا۔

جسٹین جو غیر معینہ زمانہ لیکن غالباً دوسری صدی عیسوی کے آواخر کا لاطینی مصنف ھے اس کی کتاب میں پارتھی زبان کو میڈین اور تورانی زبانوں کے درمیان کی زبان اور دونوں کا امتزاج قرار دیا گیا ھے۔

یہ اس غیر ترقی یافتہ ایرانی زبان کا اچھا خاصا بیان ہے جو غالباً پٹھانوں کی زبان کی اصل ہوگی۔ گریرسن پختو یا پشتو کے متعلق اپنے مضمون ''ہندوستان کا لسانی جائزہ،، میں ڈارمیسٹیٹر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ یہ زبان مشرقی ایرانی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس زبان میں بکثرت شمال مغربی ہند کے الفاظ شامل ہوگئے ہیں لیکن وہ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ اس کی اصل اوستا اور اس کی تفسیر ژند ہیں۔ جس طرح جدید فارسی پرانی اخامنشی زبان سے نکلنے والی مغربی ایرانی زبان کی اہم ترین مثال ہے اسی طرح پختو بلوچی اور پامیر کی مختلف زبانوں کا مشرقی اوستا کے ساتھ تعلق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اوستا اور ژند زرتشتی مذہب کی مقدس کتابیں ہیں۔ زرتشت پیغمبر کا زمانہ متعین نہیں ہے لیکن وہ یقینی طور پر بعد کے اخامنشی حکمرانوں سے پہلے گزرے ہیں کیونکہ ان حکمرانوں نے زرتشت کی تعلیمات پر عمل کیا اور سوغدیانا اور دنیائے ایران کے مشرقی حصوں سے ان کے مذہب کی اشاعت کی۔ گریرسن کے بیان کے مطابق پختو اور پشتو کی یہی اصل ہے۔

اس میدان میں ان تمام محققوں کے مقابلہ میں جنھوں نے پٹھانوں کی زبان کے متعلق مستند کتابیں لکھی ہیں مارجنسٹیرن (MORGENS TIERNE) کی تحقیقات جدید ترین ہیں اور وہ پٹھانوں کی زبان سے زیادہ واقف ہیں۔ وہ تحقیق کا مرد میدان ہونے کے ساتھ کتابوں کا بھی کیڑا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل کے اعتبار سے پشتو یا پختو غالباً ساکا بولی ہے لیکن اس کے تعلق کو اوز زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی یہ اپنی اصل اور ڈھانچہ کے اعتبار سے ایک ایرانی زبان ہے جس نے کسی روک ٹوک کے بغیر ہندآریائی زبانوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس استفادہ کے متعاق جو الفاظ کی ساخت کے بارے میں ہے مارجنسٹیرن اہم مثالیں پیش کرتے ہیں جو میں بعد میں نقل کروں گا۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں آوازوں کے بدلنے کی متعدد مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جن سے واقفیت کی بنا پر پشتو اور فارسی الفاظ کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اور آخر میں وہ تالو سے نکلنے والے حروف کی دو واضح مثالیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی مثال ایک ہی زبان کی دو شکلیں ہیں جن میں سے ایک کرخت اور دوسری ملائم ہے اور دوسری اس تفریق کی خلاف ورزی کرنے کی

مثال جس میں (یہ بات بڑی اہم ہے) تمام کرلانی قبیلے شامل ہیں۔ اس کے تحت 'آ'، 'و' سے بدل جاتا ہے 'آو' بدل کر 'ی' ہو جاتا ہے اور 'آو'، 'ای' سے بدل جاتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ساکا زبان سے ان تبدیلیوں کا کیا تعلق ہے۔ پشتو اور فارسی کے ہم اصل الفاظ میں جو واضح اور باقاعدہ صوتی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ فارسی کا حرف 'د' ہے جو پختو میں آ کر 'ل' سے بدل جاتا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کے لئے چند عام الفاظ کا نقل کر دینا کافی ہے۔

فارسی	پدر	باپ		پختو	پلار
,,	دیدن	دیکھنا		,,	لیدل
,,	دارم	میرے پاس ہے		,,	لرم
,,	ده	دس		,,	لس
,,	دختر	بیٹی		,,	لور
,,	دست	ھاتھ		,,	لاس
,,	دیوانہ	پاگل		,,	لیونے

گندھارا کے ساکا حکمرانوں کے نام سکوں کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں اور اس زمانہ کے بہت سے لقب اور اصطلاحیں خروشتی رسم الخط میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ تمام نام بدیہی طور پر ایرانی ہیں اور مشرقی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثالیں یہ ہیں۔ سپالا گاداما (سپادا = فوج، گا۔ مخفف، داما = لیڈر اصل لاطینی ڈومینس) سپالا ھورا (سپادا = فوج، اھورا = روح یا خدا جیسے اھورا مزدا) چستانا (پشتو چشتن پختو سختن مالک، شوھر) ان الفاظ اور ایسے ھی بہت سے الفاظ میں 'د' کی جگہ 'ل' استعمال ہوتا ہے جو پشتو یا پختو زبان کی خصوصیت ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ مشرقی ایرانی نام اور لقب ساکاؤں تک محدود نہیں ہیں بلکہ کشان فرمان رواؤں کے عہد میں بھی جو گندھارا میں ساکاؤں کے جانشین ہوئے مستعمل رہے ہیں۔ کشان خود ساکا نہیں تھے لیکن ان کی رعایا کا بہت بڑا حصہ ساکا ضرور تھا۔ ستھی سکوں

اور کتبوں میں موازنہ کا یہ مواد مل جانے سے پختو زبان کا کم از کم ایک رجحان ثابت کرنے میں مدد مل گئی۔

لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ خانہ بدوش ساکا حملہ آور آس گدھارا میں داخل ہوئے جسے اخامنشیوں نے دو سو سال کی حکمرانی کے بیشتر عرصہ میں ایرانی، پھر موریوں نے تقریباً ایکسو سال تک ہندوستانی اور پھر مزید ایکسو سال تک یونانی باختریوں نے یونانی بنائے رکھا تھا۔ بڑی بڑی تہذیبیں اس علاقہ میں نہ صرف رائج رہی تھیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ متصادم ہوئی تھیں۔ یہ علاقہ بعد کی طرح اس وقت بھی ایران اور ہندوستان کی مشترکہ سرحد پر تھا۔ اس لئے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ آج کے پٹھانوں کی زبان میں بہت سے ہندوستانی عناصر دور تک سرایت کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سب سے واضح مثال مخلوط حروف کی ہے جو فارسی گروپ کی زبانوں میں نہیں ملتے البتہ ہندوستانی زبانوں کا خاصہ ہیں۔ تذکیرو تانیث (۱) کی موجودگی بھی ہندوستانی زبانوں کا خاصہ ہے اور سب سے اہم ماضی کے جملوں کی مجہول ساخت ہے جو ایرانی زبانوں میں ناپید ہے لیکن ہندوستانی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔(۲)

ایک اور پیش بندی بھی ضروری ہے۔ ساکا بولی اور کشانوں کی زبان بھی خانہ بدوشوں کی بولیاں تھیں جو اس علاقہ میں لائی گئی تھیں جہاں وسیع اور زرخیز میدان تھے جو مہذب لوگوں کا مسکن تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ پہاڑی علاقہ مثلاً تیراہ اور وزیرستان بھی تھے جو بڑے دشوار گزار ہیں۔ ان میدانوں پر صدیوں سے عظیم المرتبت سلطنتوں کا غلبہ چلا آرہا تھا جبکہ پہاڑی علاقے اس وقت بھی اس لحاظ سے اہم ہوں گے

---

(۱) جدید فارسی میں تذکیروتانیث نہیں ہوتی۔ میں قدیم فارسی میں بھی تذکیروتانیث کے استعمال کا کوئی ثبوت نہیں پا سکا۔ اوستا اور مشرقی ایران کی بولیوں سغدی اور ختنی میں تذکیروتانیث کا فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستانی بولیوں میں تذکیروتانیث کے وجود سے پشتو کے متعلق زیر بحث دلیل کی توثیق ہوتی ہے۔

(۲) پختو پشتو اور ہندی میں مقصدی مصدر کے فعل ماضی کے ساتھ مفعول اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ فعل صادر ہونے کا ذریعہ معلوم ہو۔ ایسی صورت میں پختو اور پشتو میں مفعول واحد ہے تو فعل بھی واحد اور مفعول غائب حاضر یا متکلم ہے تو فعل بھی غائب حاضر یا متکلم ہو گا۔ اسی طرح دونوں مذکر یا دونوں مؤنث ہوں گے فعل حال کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا۔

کہ قدرتی دشوار راستوں کی وجہ سے ان کا تحفظ یا عام زبان میں پردہ قائم تھا۔ دونوں اپنی اپنی زبان کے سختی کے ساتھ پابند ہوں گے اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ شمال سے آنے والے حملہ آور شہسواروں کی زبان میں ایسی تبدیلیاں آئی ہوں گی کہ وہ اس زبان کو اپنا سکیں جو اس وقت گندھارا اور آس پاس کے علاقہ میں رائج تھی۔ چونکہ مفتوح لوگ صدیوں سے اس ایرانی دنیا میں رہ رہے تھے جس پر ہندوستان کے اثرات بھی رونما ہوئے تھے اور مفروضہ کے مطابق فاتحوں کی زبان بھی مشرقی ایران سے تعلق رکھتی تھی اس لئے یہ کوشش زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوئی ہوگی۔ اس مفروضہ کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں پختو اور پشتو بہت کچھ ساکاؤں کی مرھونِ منت ہے اس کی اصل میں مشرقی ایران کی زبانوں کے بھی بہت سے عناصر شامل ہوں گے۔ جب آرسڑوں کی اصل کا دلچسپ مسئلہ حل ہو جائیگا تو اس سے زبان کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑے گی۔

مختصر یہ کہ پٹھانوں کی زبان کا جس قدر غور سے مطالعہ کیا جائے اتنی ہی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ زبان وہی ہے جس کی ایرانی اور ہندوستانی دنیاؤں کے درمیان اس کے جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر اس کے بارے میں توقع کی جاسکتی تھی یعنی یہ ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندی ایرانی زبانوں کی تمام قابل ذکر خصوصیات شامل ہیں البتہ ایرانی غلبہ نمایاں ہے۔ ان خصوصیات کا مطالعہ نہ صرف الفاظ اور مشتقات کی ساخت بلکہ ترکیب نحوی کی روشنی میں بھی کرنا چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر پختو اور پشتو ایک درمیانی زبان کی بہترین مثالیں ہیں۔

یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطالعہ محض زبان کی اصل، افعال، ہندسوں، رشتوں سورج چاند ستاروں رات دن اور آسمان زمین وغیرہ کے ناموں کی روشنی ہی میں کرنا چاہئے۔ مجرد خیالات کی بالائی تہ جو اسلام کے زمانہ میں قائم ہوئی اس مطالعہ کے دائرہ میں نہیں آتی۔ عرب کے شمال میں ان دوسری زبانوں کی طرح جو مسلمان بولتے ہیں پشتو میں بھی بہت سے الفاظ فارسی کے ذریعہ عربی سے یا براہ راست فارسی سے آئے ہیں۔ لیکن یہ محض بالائی تہ ہے جس کی مثال ترکی میں ملتی ہے یا جس کا موازنہ بڑی آسانی کے ساتھ انگریزی میں لاطینی اور یونانی لغات سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اصل سے کوئی تعلق نہیں ہے بعد کے الفاظ کسی تبدیلی کے

بغیر اپنی اصلی شکل بھی شامل کر لئے گئے ھیں۔ یہ ٹھیک ھے کہ ان لفظوں کا تلفظ پٹھانی لہجہ میں کیا جاتا ھے بالکل اسی طرح جیسے فرانسیسی الفاظ جو تبدیلی کے بغیر انگریزی میں آئے ھیں ان کا تلفظ انگریزی لہجہ میں کیا جاتا ھے - میں جس فرق کی طرف توجہ دلانا چاھتا ھوں وہ un—deux—trois کا موازنہ one, two, three کے ساتھ اور پھر Sympathic کا موازنہ Sympathy کے ساتھ کرنے سے واضح ھو جائیگا۔ پہلی صورت میں موازنہ کے الفاظ ھم اصل ھیں اور دوسری صورت میں ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں آ کر بدل گیا ھے۔

میں نے پختو کے اوپر عربی اور فارسی زبانوں کی چڑھی ھوئی اس تہ کا تذکرہ اس لئے کیا ھے کہ اس کی بنیاد پر بعض مرتبہ غیر معقول خیالات کا اظہار کیا جاتا ھے۔ پختو کی اس بالائی تہ میں مقدس کتابوں کے اسمائے معرفہ مثلاً ابراھیم(ع)، عیسیٰ(ع)، موسیٰ(ع)، ایوب(ع)، یحییٰ(ع)، یعقوب(ع)، یوسف(ع)، اسحاق(ع) اور ایسے ھی دوسرے کچھ ناموں کا اخذ کرنا شامل ھے۔ سنجیدگی کے ساتھ یہ دلیل پیش کی جاتی ھے کہ پٹھانوں میں ان ناموں کے رواج سے اس نظریہ کی تصدیق ھوتی ھے کہ وہ یہودی النسل ھیں۔ حقیقت یہ ھے کہ ان تمام قوموں نے جو مشرف بہ اسلام ھوئیں یہ نام اپنائے۔ یہ خصوصیت پٹھانوں پر موقوف نہیں ھے یہ اسلام کی مشترکہ وراثت کا ایک حصہ ھے اور پٹھانوں کی خصوصیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پٹھانوں میں پیغمبروں کے ناموں کے نسبتاً زیادہ رواج کی وجہ یہ قرار دی جاسکتی ھے کہ مشرق وسطیٰ اور ایران کی قوموں کے مقابلہ میں یہ لوگ جیسا کہ ھمیں آگے چل کر معلوم ھوگا بعد میں مسلمان ھوئے۔ یہ قاعدہ ھے کہ نو مسلم عام طور پر روایات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا ھے۔

اس معاملہ میں شہادت بڑی کمزور ھے لیکن اس سوال کی عمومی حیثیت کے متعلق میں اس نتیجہ پر پہنچا ھوں کہ جہاں تک ھم ساکا بولی سے واقف ھیں اس کے ساتھ پٹھانوں کی زبان کے تعلق کی حمایت میں مضبوط شہادتیں ملتی ھیں اور یہ دونوں بدیہی طور پر مشرقی ایرانی زبانیں ھیں لیکن اس دعوے کی حمایت میں بھی کچھ نہ کچھ کہنے کی گنجائش ھے کہ پختو اور پشتو کی ابتدا ایران کی بعید تر ماضی یعنی اخامنشی

دور میں ہوئی تھی۔ اس دعوے کو اس حقیقت سے تقویت پہنچتی ہے کہ پختو میں بڑی گہرائی تک ھند ایرانی عنصر پایا جاتا ہے جو بذات خود ساکا کی ابتدا سے پرانا ہے۔ اس طرح بہترین اسناد کا تتبع کرتے ہوئے جن میں ساکاؤں کی یادگاریں سب سے بعد میں آتی ھیں ہم گندھارا کے لوگوں کے بارے میں یہ سوچ سکتے ھیں کہ وہ ایک ایسی زبان بولتے تھے جس سے پٹھان کی موجودہ زبان وجود میں آئی ہے۔

فصل پنجم

ساکا، کشان اور ایرانی

ہمیں سکوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب ساکاوں کو ان کے پارتھی قرابت داروں نے ایران سے نکالا تو وہ پہلی صدی قبل مسیح میں گندھارا میں وارد ہوئے اور یہاں ۵ عیسوی تک حکومت کرتے رہے۔ سکوں سے چار ساکا حکمرانوں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے وہ نام یہ ہیں ماویس (MAVES)، آئس اول (AZES I)، آئیلیسیز (AZILISES) اور آئس دوئم AZES II، بازیرہ کی طرح ان الفاظ میں بھی یونانی صرف زیٹا ی کی آواز دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساکاؤں نے مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلہ میں اس گھاٹی کے راستہ سے پیش قدمی کی جو ہرات کے قریب واقع ہے اور سابق اخامنشی اقلیموں درنگیانہ(۱) اراکوسیا پر قبضہ کرلیا انہوں نے ان میں سے پہلی اقلیم کا نام ساکستان(۲) رکھا۔ اراکوسیا میں غزنی تک کے شمالی علاقہ میں ان کی موجودگی سکوں سے ثابت ہوتی ہے اور سکوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ان میدانوں میں جو اب پاکستان کا حصہ ہیں گومل، ٹوچی اور پیواڑ کے راستوں سے داخل ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ بلوچستان اور سندھ کی طرف سے جہاں انہوں نے مغربی علاقہ میں پارتھیوں سے شکست کھا کر اثر و نفوذ حاصل کر لیا تھا دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہوئے جنوب کی طرف سے گندھارا میں داخل ہوئے تھے۔

۹۷ اور ۷۷ ق‌م کے درمیان پنجاب کی طرف پیش قدمی کی قیادت ماویس نے کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ڈرامائی پیش‌قدمی

---

(۱) ہیروڈوٹس نے اس کے لئے لفظ SARANGAI استعمال کیا ہے۔
(۲) بعد میں یہ نام بدل کر سجستان اور اب سیستان ہو گیا۔

میں ان کے نئے طریقۂ جنگ کا بڑا دخل تھا جس میں انہیں پیش رووں کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا اصل ھتھیار ایک لمبا نیزہ تھا جسے رومیوں نے کونٹس کا نام دیا ھے۔ ساکاؤں کا طریقۂ جنگ اس زمانہ سے بہت پہلے بھی لوگوں کو معلوم تھا۔ اریان نے اپنی کتاب میں بتایا ھے کہ ان کی دشمن کو اچنبھے میں ڈالنے والی چالیں اس وقت منظر عام پر آئیں جب انھوں نے ایرانیوں کی طرف سے گاگمیلہ کے مقام پر لڑائی میں حصہ لیا۔ اس موقع پر جنگ کا پانسہ پلٹنے کے لئے اسکندر کو اپنی تمام طاقت بروئے کار لانی پڑی تھی۔

ماویس نے اپنا دارالحکومت ٹیکسلا میں قائم کیا جہاں اس سے پہلے یونانی باختری حکمراں حکومت کر چکے تھے۔ اس کی وفات کے بعد ایک وقفہ آیا جس میں مختلف ساکا قبائل قریباً بیس سال تک اقتدار کے لئے رسہ کشی کرتے رھے اور کوئی لیڈر پیدا نہ ھوسکا یہاں تک کہ آئیس اول نے ۵۸ ق م میں امن و امان قائم کیا اور ساکا عہد کا آغاز کیا۔ یہ عہد اسی سال سے شروع ھوتا ھے۔ ایک عظیم شخصیت کے مرنے کے بعد کم درجہ کے لوگوں کی کشمکش سے یہ بات ظاھر ھوتی ھے کہ قبائل ایک بھروسہ کے لیڈر کی غیر موجودگی میں کوئی متحدہ اور موثر قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اور پٹھانوں کی بعد کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ ھم یہ قیاس کر سکتے ھیں کہ اس علاقہ میں ساکاؤں کی میراث صرف زبان تک محدود نہیں ھے۔

آئیس اول نے ایک خوشحال اور طاقتور سلطنت قائم کی جو بے شمار نقرئی سکوں کی وجہ سے دوسری سلطنتوں سے ممتاز ھے۔ ان سکوں سے اندازہ ھوتا ھے کہ یہ سلطنت طویل عرصہ تک قائم رھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آئیلیسیز اور پھر اس کا پوتا آئیس دویم تخت پر بیٹھا۔ اس زمانے کے سکے تقریباً ۵ عیسوی میں مٹا دئے گئے جبکہ اس علاقہ میں پارتھی خاندان کا اقتدار ھو گیا۔

یونانی مورخ اور ایرانی کتبے ھمیں یہ بتاتے ھیں کہ اپنے پارتھی قرابتداروں کی طرح ساکا بھی شہسواری میں مشاق تھے اور نڈر جنگجو قبیلہ کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت تھی۔ یونانی آرائشی برتنوں پر ان کی جو تصویریں بنائی گئی ھیں ان میں ان کے بال لمبے اور داڑھیاں گھنی

دکھائی گئی ہیں۔ ایک رومی مبصر ستھی قبیلہ کی ایک شاخ الننی (ALANNY) کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ لمبے چوڑے اور خوبصورت آدمی ہیں اور ان کا رنگ گورا ہے ۔ انھیں ایرانی فوج میں جو اہمیت حاصل تھی وہ ہیروڈوٹس اور اریان کی تحریروں سے ظاہر ہے اور بہت سے سکے جو ان کی فتوحات کے بعد ساکستان (سیستان) سرحدی علاقوں اور شمال مغربی ہند میں ڈھالے گئے ان پر ان کے زرہ‌بکتر اور طریقۂ جنگ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں متھرا سے جو کتبہ برآمد ہوا تھا جس پر شیر کا مجسمہ بنا ہوا ہے۔ (جو آج کل برطانوی عجائب گھر میں ہے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس لیڈر پر بھروسہ کرتے ہیں وہ اس کا کتنا احترام کرتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتبہ کسی بادشاہ غالباً ماویس کی تجہیز و تدفین کی یادگار کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تاریخ خاص طور پر سکوں کے مطالعہ کے نتائج پر منحصر ہے۔کیونکہ ان کے بادشاہوں کے عہد اور ان کی فوجوں کی نقل و حرکت کی تاریخیں مختلف ٹکسالوں کے ڈھلے ہوئے سکوں ہی کی بنیاد پر متعین کی جا سکتی ہیں ۔

نام نہاد ہندی تورانی سلطنت جو ساکاؤں کے بعد سرحدی علاقہ میں ستر سال کے مختصر عرصہ تک قائم رہی درحقیقت ایک سلطنت کا دوسری پر غلبہ نہیں تھا بلکہ محض اہمیت ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل ہو گئی تھی اس لئے کہ پارتھی بھی اپنے ساکا قرابت‌داروں کی طرح وسطی ایشیا کے خانہ بدوشوں میں سے تھے اور ان کے برسر اقتدار آنے کا یہ مطلب تھا کہ مغرب سے آئے ہوئے پارتھیوں نے زیادہ زور حاصل کر لیا ہے ۔ ۵ عیسوی تک مداین (CTESIPHON) کا ارساسی پارتھی خاندان اپنے اقتدار کے عروج تک پہنچ چکا تھا اور اس زمانہ میں‌اس کا حکم دریائے سندھ تک چلتا تھا ۔ یہ تمام جدو جہد اس عزم کا نتیجہ تھی کہ ایرانی سلطنت کی حدیں دوبارہ سابق اخامنشی سلطنت کی دور دراز سرحدوں تک بڑھا دی جائیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ساکستان (سیستان) کے راستے سے چلائی گئی۔ اور اس کے ساتھ سورین (SUREN) خاندان کا نام وابستہ ہے جو ارساسی سلطنت کے سرداروں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا ۔ تخت بھائی میں ایک کتبہ ملا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹ عیسوی میں اسی خاندان کا ایک شخص گونڈوفیرس گندھارا اور شمالی پنجاب کا

حکمران تھا۔ قیاس یہ ھے کہ گونڈوفیرس (GONDOPHARES) داخلی طور پر خود مختار تھا اور صرف خارجی معاملات میں ارساسیوں کی بالادستی تسلیم کرتا تھا جن کا دارالحکومت دریائے دجلہ کے کنارے مداین کے مقام پر واقع تھا۔ یہ وھی بادشاہ ھے جس کا تذکرہ نام لے کر اس صحیفہ میں کیا گیا ھے جس میں دریائے سندھ کے علاقہ میں حواری تامس کی مبلغانہ کوششیں بیان کی گئی ھیں۔ یہاں ھم اس قصہ کی صداقت نہیں پرکھ سکتے لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ تاریخوں میں مطابقت ھے۔گونڈو فیرس ۴۸ عیسوی میں فوت ھوا۔ یہ ممکن نہیں ھے کہ تخت بھائی میں دریافت ھونے والے کتبے کو خواہ مخواہ عیسائیوں کی مذھبی کتاب کی عبارت کے مطابق بنایا گیا ھو۔

سورین خاندان کے یہ پارتھی بڑی شان و شوکت کے مالک تھے۔ اگر انھوں نے اپنے ساکا قرابت‌داروں کے ساتھ پٹھانوں کا ڈھانچہ قائم کرنے میں کوئی حصہ لیا ھے تو یقیناً انھوں نے شاندار میراث چھوڑی ھے۔ ان میں سے جو جاگیردار تھے وہ فوج کے لئے مسلح شہسوار مہیا کیا کرتے تھے جو لوھے کی زرہ پہنتے تھے۔ یہ شہسوار ''کیٹا فریکٹی'' (CATA PHRACTI) کے نام سے مشہور ھیں اور جو چھوٹے سردار تھے وہ معمولی شہسوار مہیا کرتے تھے جو ساگیتری (SAGITARII) کہلاتے تھے ان ھی کی بدولت پارتھی فوجوں کی بڑی شہرت تھی۔ ھوریس (HORACE) کی نظموں میں کمانوں سے مسلح اور تیزی کے ساتھ بڑھتے ھوئے نڈر پارتھیوں کا تذکرہ کیا گیا ھے۔ انکے بارے میں یہ تصویر تو عام طور پر ملتی ھے جس میں انہیں پسپائی کی حالت میں عقب میں تیر چلاتے ھوئے دکھایا گیا ھے۔ کاریہ کے مقام پر ۵۳ عیسوی میں جو لڑائی ھوئی تھی اس کے یونانی اور رومی تذکروں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بتایا گیا ھے کہ کس طرح افق پر غبار کے بادل نمودار ھوئے اور اس میں سے سورین قبیلہ کے تقریباً ایک ھزار زرہ پوش شہسوار نکلے جنھوں نے رومی پیدل فوج پر جو اچنبھے میں ڈالنے والی فوجی چالوں سے ناواقف تھی حملہ کردیا۔ نئے ھتھیار کا تذکرہ ایسے ھی رعب کے ساتھ کیا گیا ھے جیسے ھمارے زمانہ میں بکتر بند موٹر گاڑیوں کی ایجاد ایک مرعوب کن ترقی ھے۔ رومی فوج کا قلع قمع کر دیا گیا اور رومی فرات کے پار کے علاقہ پر قبضہ کرنے کا جو خواب دیکھ رھے تھے وہ ھمیشہ کے لئے پریشان ھوگیا۔ کاریہ کی لڑائی ایک فیصلہ کن لڑائی تھی اور اس میں ان لوگوں کی فتح ھوئی جن کے

اخلاف شمال مغربی سرحد میں آباد ہوگئے۔ یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ سورین خاندان ایران میں ارساسی خاندان کے زوال اور تقریباً ۲۲۵ عیسوی میں اردشیر کے زیر قیادت ساسانی خاندان کے عروج کے باوجود برقرار رہا۔

لیکن مشرقی سرحد پر پارتھی خاندان عروج حاصل نہ کر سکا اور تقریباً ۷۵ عیسوی میں آمودریا کے پار سے آئے ہوئے ایک اور گروہ یعنی کشانوں کے ھاتھوں مٹ گیا۔ ان نوواردوں نے گونڈوفیرس کے جانشین کو ٹیکسلا کی فصیل کے قریب ایک خوفناک لڑائی میں شکست دی جس کی تازہ ترین کھدائی سے شہادت دستیاب ہوئی ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہروں کو ٹیکسلا کی آبادی سرکپ کی دیوار میں ایک شگاف اور بہت سے تیروں کے پھل ملے ھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے، ایک شہر کی حیثیت سے ٹیکسلا تباہ ہوگیا تھا۔ بعد میں جو مجسمے اور فنون لطیفہ کے دوسرے نمونے دریافت ہوئے ھیں وہ سرکپ سے نہیں بلکہ شہر کے شمال اور مشرق کے دامن کوہ میں واقع بودھ خانقاھوں سے ملے ھیں۔

جنوب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کشان حملہ آوروں نے ارساسیوں کی پارتھی سلطنت پر، - جس پر مغرب کی طرف سے قیصروں کے زمانہ کی رومی سلطنت کا دباؤ پڑ رہا تھا حملہ کیا اور اسے کمزور کر دیا۔ کشانوں نے آمودریا کے جنوب میں سب سے پہلے باختر کو فتح کیا جہاں سے اپنے پہلے نامور فرماں روا کجلا کدفیسس (KUJULA KADPHISES) کی قیادت میں وہ جنوب مشرق اور مغرب کی طرف بڑھے جس کی بدولت ایک وسیع سلطنت ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں نہ صرف وہ پورا علاقہ جو کبھی مشرقی ایران کہلاتا تھا (موجودہ افغانستان اور مشرق میں دریائے سندھ تک پاکستان) بلکہ پنجاب اور وادی گنگا کا ھندوستان (الہ آباد یا بنارس تک) شامل تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود کجلا نے وادی کابل پر قبضہ کرنے کے بعد تقریباً ۶۰ عیسوی میں گندھارا کو پارتھی حکمران گونڈوفیرس سے چھین کر اپنی سلطنت میں شامل کرلیا ہو۔ فیصلہ کن لڑائی جس کی بدولت وہ اس وقت سے شمالی ہند کا مالک بن گیا پندرہ سال بعد ٹیکسلا کا محاصرہ اور پھر اس پر حملہ تھا۔ لڑائی میں فتح پانے والا یا تو اس کا کوئی جانشین تھا جس کا نام معلوم نہیں یا کدفیسس دوئم تھا جس کا نام سکوں پر ویما کدفیسس (WIMA KADPHISES) کھدا

ہوا ہے۔ ویما کا حکم دریائے سندھ کے دہانہ تک چلتا تھا اور وہ پارتھیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روم سے بھڑ گیا اور موجودہ افغانستان کے پورے علاقہ یعنی اس وقت کے ایریا ساکستان اور اراکوسیا پر قابض ہوگیا۔ ویما کے بعد سب سے مشہور کشان بادشاہ کنشک تخت پر بیٹھا جس کی تخت‌نشینی کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ کنشک کے زمانہ میں کشان سلطنت وادی گنگا میں دور تک پھیل گئی اور متھرا کے مقام پر اس کے ہندوستانی صوبہ کا صدر مقام قائم کیا گیا۔ اس کے تخت نشینی کی صحیح تاریخ کے متعلق بڑا اختلاف ہے۔ جدید محققوں کا خیال ہے کہ کنشک کا عہد دوسری صدی عیسوی کے ربعے ثانی میں غالباً ۱۲۸ء میں یعنی ہجرت سے تقریباً پانچسو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کا شمالی پایۂ تخت سلطنت کے وسط میں تھا اور اس کا نام پرشا پورہ(۱) یا پشاور تھا۔ اس طرح ہم ایک بار پھر وہیں آگئے جہاں سے چلے تھے۔

اس سوال پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ کشان کس نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے محققوں کی یہ رائے ہے کہ کشانوں کی سلطنت کے مغربی حصہ میں بسنے والی ان کی رعایا ایرانی نسل سے اور مشرقی حصہ میں ہندوستانی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن وہ خود قدیم ہنوں یا ترکوں کی نسل سے تھے۔ دوسرے لوگ جن میں غرشیمن اور میک‌گورن بھی شامل ہیں۔ اس دعوے کے پر زور حامی ہیں کہ کشان بھی ستھیوں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور اسی طرح ساکاؤں اور پارتھیوں دونوں کے قرابت‌دار تھے۔ میرے نزدیک بھی یہی خیال زیادہ قابل قبول ہے۔ چینی کتابوں میں ان کا نام یوچی لکھا ہے جن میں گوئی شانگ یا کشان گھرانے کو قائد کی حیثیت حاصل تھی۔

کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزوں اور سکّوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشانوں کا قدیم مذہب مزدکی آتش پرستی سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے نشانات ان یادگاروں میں بھی ملتے ہیں جو انہوں نے دریائے

---

(۱) یہ شناخت مشتبہ نہیں ہے اور اس کی ایک بنیاد یہ ہے کہ چینی سیاحوں فاہیان اور ہیون سانگ نے اسے بالترتیب پولوشا اور پولوشا پولو کے نام سے یاد کیا ہے۔ یونانی پسکا پوروس اور ساسانی پسکی بورا سے اس کی مطابقت بدیہی ہے۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ کشان فرماں روا نے ٹیکسلا کو تباہ کرنے کے بعد پشکلاوتی (چارسدہ) کی بجائے پشاور کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔

سندھ کے کنارے اپنے نئے گھروں میں چھوڑے ھیں۔ لیکن جب وہ وادی سندھ میں پہنچے تو انہوں نے مختلف مذھبی اثرات قبول کرلئے جس کے نتیجہ میں ایک ایسا وسیع القلب امتزاج ظہور میں آیا کہ انکی عبادت گاھوں میں ھراقل (HERACLES) ھیفاستوس (HEPHAESTUS) میتھراس MITHRAS شیو اور مہاتما بودھ کے بت ایک ساتھ رکھے جانے لگے مذھبی وسیع النظری کا یہ وھی راستہ تھا جس پر چل کر کشان خاندان کا عظیم المرتبت شہنشاہ کنشک آخرکار بودھوں کے گیان تک پہنچ گیا اور اس نے باقی تمام بتوں کو اپنی عبادت گاھوں سے ھٹا کر عبادت کا وہ طریقہ اپنایا جو اب گندھارا اور کشان دور کی خصوصیت سمجھا جاتا ھے۔

کنشک نے گندھارا کو جس کا صدر مقام پشاور تھا اپنی سلطنت کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کیا تھا اس لئے اس کی پوری سلطنت گندھارا سلطنت کے نام سے مشہور ھوگئی۔ اور چونکہ کنشک اشوک کے نقش قدم پر چلتے ھوئے جو چار سو سال پہلے گزرا تھا بودھمت کا پیرو ھوگیا تھا یا کم از کم اس نے اس مذھب کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس کی قیادت میں گندھارا کم از کم اپنے فن کے اعتبار سے ایک اھم تہذیب کا گہوارا بن گیا تھا اس لئے یہ نام اس اھم فن کے ساتھ وابستہ ھوگیا جو پشاور سے پھیل کر بہت سے ایشائی علاقوں میں پہنچ گیا۔ کنشک کا عہد بودھ مت کے لئے ایک سنہرا زمانہ بن گیا تھا اسی لئے بعد میں آنے والے چینی سیاحوں فاھیان اور ھیون سانگ نے اسے بھی اپنی زیارت گاہ بنا لیا۔ جدید پشاور شہر کے گنج گیٹ کے باھر سے ۱۹۰۹ عیسوی میں کنشک کا ایک یادگاری صندوقچہ برآمد ھوا ھے جو پشاور کے عجائب گھر میں رکھ دیا گیا ھے جس جگہ یہ کھدائی کی گئی تھی وہ شاہ جی کی ڈھیری کہلاتی ھے۔

کشانی تاریخ کا شیرازہ مرتب کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ھے اس لئے کہ اس کا اصل رابطہ ھندوستانی باشندوں سے رھا ھے جن میں دنیا کی دوسری قدیم تہذیبوں کے مقابلہ میں تاریخ نویسی کا شعور نہیں تھا(۱)۔

---

(۱) میک گورن لکھتے ھیں ”ھندو کبھی اپنی ھی تاریخ نہیں لکھ سکے چہ جائے کہ وہ ان بیرونی قوموں کے حالات پر روشنی ڈالے جنھوں نے ان پر فتح پائی تھی۔ البیرونی اور الفنسٹن اس سے پہلے یہی شکوہ کر چکے تھے۔ بعد میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ھے اور مسٹر پانیکار اور دوسرے کئی ھندو مصنفوں نے مستند تاریخیں لکھی ھیں۔

کشان سلطنت جتنی وسیع تھی اس کے مقابلہ میں اس زمانہ کی تاریخی شہادتیں بہت ہی کم ہیں۔ اگرچہ بعد میں چینی بودھوں کے ادب میں کنشک کی حکایتیں درج ہیں لیکن ان کتابوں میں صحیح صحیح تاریخی تفصیلات درج نہیں ہیں بلکہ ہندوستانی مذہبی قیاس آرائیوں کو دوہرا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو کتابیں ملتی بھی ہیں ان سے گندھارا کے قبیلوں اور لوگوں پر جو کنشک اور اس کے جانشین کی رعایا تھے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ سکے اور فن پارے بکثرت ملتے ہیں اور ان کی مدد سے حکمران خاندانوں کے متعلق جنہیں پوری سوسائٹی میں صرف بالائی تہ کی حیثیت حاصل تھی تفصیلات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان میں محکوموں کی شناخت ان کے طریقۂ زندگی اور زبان کے متعلق کسی تفصیل کی تلاش سعیٔ لا حاصل ہے۔ صرف دارالحکومت کا نام ضرور ملتا ہے لیکن پکٹوؤں، اپاروتائے گنداریوئے اور ان کے اخلاف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ ہمیں یقین کے ساتھ یہ بھی معلوم نہیں کہ خود حکمران کس نسل سے تعلق کے دعویدار تھے۔ یہ بڑی افسوسناک حقیقت ہے کیونکہ یہ کشانی دور ہی تھا جس میں پشاور کو ایک وسیع و عریض شہنشاہیت کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہوئی۔

کشان ہی کے زمانہ میں دنیائے روم اور اس سے آگے ایشیائی علاقوں کے ساتھ تجارت کے راستوں کی رکاوٹیں دور ہوگئیں۔ جب سے سلوکسیوں نے ایران میں ارساسیوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے وہ ریاست جسے سر مارٹیمر و ہیلر نے پارتھیا کا نہ ہٹنے والا سنگ راہ قرار دیا ہے ان تجارتی راستوں پر چھائی ہوئی تھی۔ پارتھیوں کی اکثر روم سے لڑائی رہتی تھی اور انہوں نے بھاری ٹیکس لگا کر یا محض من مانی کاروائی کے ذریعہ مشرق کے تجارتی راستے مسدود کر رکھے تھے۔ لیکن پارتھیا کے مشرقی بازو پر کشان سلطنت کے مقام سے پارتھی حکمرانوں کو دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ ایران جیسا کہ غرشمین نے خیال ظاہر کیا ہے ایک بہت مختصر سی وسطی ریاست بن کر رہ گیا تھا جسے ایک طرف سے روم نے اور دوسری طرف سے ایک نئی سلطنت نے جس کا مرکز گندھارا تھا دبا رکھا تھا۔ سیاست اور تجارت دونوں میدانوں میں کشانوں اور رومیوں کے مفادات یکساں تھے۔ چنانچہ کشانوں نے، جنہوں نے مشرق اور مغرب کے درمیان تجارتی راستوں کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا اب مال لانے

لے جانے کا ایسا راستہ نکال لیا جو پارتھی علاقہ سے نہیں گزرتا تھا۔ اسی زمانہ سے پارتھی عہد کا زوال شروع ہوگیا۔

ہم ٹارن کے اس یقین کی تائید کرتے ہیں کہ اگر گندھارا پر دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں یونانی حکمرانوں کی حکومت نہ ہوتی تو گندھارا آرٹ کبھی وجود میں نہ آتا۔ لیکن اب عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دوسو سال بعد کنشک کا عہد تھا (۷۸-۱۲۸ عیسوی) جس میں مشہور گندھارا آرٹ پتھر کانسے اور استر کئے ہوئے پتھر کے مجسمے، صندوقچے، لوحیں، بڑے پیالے اور دوسرے فن کاری کے نمونے بنانے میں انتہائی عروج تک پہنچا۔ وھیلر کا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کا یہ حیران کن مجموعہ نام نہاد یونانی اثرات نہیں بلکہ مشرقی دنیا پر روم کی عمیق اور پائدار چھاپ ظاہر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے بیشتر فن کار یونانی ہوں لیکن فن کے ان خزانوں کا سرچشمہ رومی سلطنت کے دور کا اسکندریہ ہے۔ جسم اور دیگر اشیا کے نمونے تراشنے میں مغربی طریقۂ اظہار اپنانے سے بودھ مت کی صورت ھی بدل گئی۔ مہاتما بودھ جو نہایانا یعنی صرف اوتار تھے مہایانا یعنی دیوتا بنا دئے گئے۔ جب تک وہ نہایانا تھے ان کا کوئی بت نہیں تراشا گیا وہ دیوتا نہیں بلکہ برگزیدہ انسان تھے۔ مہایانا کے تحت جس کا رواج سب سے پہلے کنشک کے زمانہ میں ھوا اور جس کی نمائندگی گندھارا آرٹ کرتا ہے بودھ کو الوھی حیثیت دے دی گئی اور وہ فن کے ھر نمونہ کی بنیاد بن گئے۔ رومی نامور پرستی اور مردہ پرستی کے فن کی مشرقی فنکاروں نے قلب ماھیت تبدیل کردی اور اس پر بودھ مت کا رنگ چڑھا دیا۔ لیکن جیسا کہ وھیلر نے اس طرف توجہ دلائی ہے بت تراشی اور جمالیات دونوں اعتبار سے تبدیلی انقلابی نوعیت کی ہے اور ایک ایسا امتزاج ظاہر کرتی ہے جو بہت دلچسپ اور اہم ہے(۱)۔

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ گندھارا آرٹ کو جو جلا ملی اسے یونانی اثر سمجھا جائے یا رومی، تو یہ دعویٰ غیر مناسب ہوگا کیونکہ اس علاقہ میں یہ امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا کہ دونوں میں سے کون

(۱) یہ سارے مجسمے مہاتما بودھ اور ان کی زندگی کی عکاسی تک محدود نہیں ھیں۔ ان میں مغربی صنمیات بھی شامل ھیں مثلاً پتھر کی سل پر بنا ہوا ٹروجن کا گھوڑا جو ۱۹۲۳ء میں ھنڈ کے قریب ایک کنویں کے اوپر سے ملا۔

سی تہذیب اثر انداز ہوئی۔ عام طور پر اس خیال سے اتفاق کیا جاتا ہے کہ ان اثرات کا سرچشمہ سکندریہ تھا جو یونان زدہ بطلیموسیوں یا ان کے جانشین رومیوں کے عہد میں نو افلاطونیت اور قدیم یونانی فن کا مرکز تھا۔ اس حقیقت کے اعتراف کے بعد کہ گندھارا آرٹ اس بات کا نتیجہ تھا کہ کشانوں نے تجارت کے ذریعہ رومی سلطنت کے فنکاری کے نمونے اپنے علاقہ تک پہنچا دئے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ گندھارا آرٹ کے زمانہ کا جو تعین کیا گیا ہے وہ شہنشاہ ہاڈریان (HADRIAN) کے عہد (۱۳۸-۱۱۷ عیسوی) سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ بادشاہ فن میں باطنیت کے رجحانات کا دلدادہ تھا جن میں لاطینی سے زیادہ یونانیت جھلکتی تھی۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ جن فنکاروں سے کام لیا گیا وہ لاطینی روایات کے نہیں بلکہ مشرقی بحیرۂ روم کے علاقہ کی روایات کے علم بردار تھے۔ ہم ٹارن کی اس رائے سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ گندھارا میں ابتدائی یونانی باختری سلطنت نے فن کی اس ترقی کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔

بادشاہ کنشک نے اپنی حکمرانی کے آخری زمانہ میں جبکہ وہ بودھ مت کا کٹر پیرو ہو گیا تھا ایک بہت بڑا یادگاری مینار بنوایا تھا جو غالباً پشاور میں گنج گیٹ کے باہر شاہ جی کی ڈھیری پر واقع تھا۔ مینار کے اوپر منقش لکڑی کا کام تھا اور اس کے چاروں طرف لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ تیرہ منزلوں کے اس مینار کی بلندی ۴۰۰ فٹ تھی۔ ونسنٹ سمتھ (VINCENT SMITH) کا بیان ہے کہ چھٹی صدی کے شروع میں چینی سیاح سونگ یون یہ مینار دیکھنے آیا تھا اس وقت تک اس مینار میں تین مرتبہ آگ لگ چکی تھی اور تینوں مرتبہ مذہب پرست بادشاہ اسے دوبارہ بنوا چکے تھے۔ نویں صدی میں جب مشہور بودھ عالم ویرادیوا (VIRA DEVA) یہاں آیا اس وقت تک بودھوں کی ایک بہت شاندار خانقاہ وہاں آباد تھی اور اس میں بودھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن برھمنی عروج جو کشان عہد کے آخری دور میں شروع ہوا بودھوں کی خدا ترسی پر عتاب کا باعث بنا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ برھمنوں کے ھاتھ سے بچ گیا تھا اسے گیارھویں صدی میں محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں نے تباہ کردیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ پشاور کسی زمانہ میں ایسے علم کا گہوارہ تھا جس کی بنیاد پر ایسا مذہب قائم ہوا جو زندگی کی عظمت اس میں سمجھتا

ہے کہ اسے ٹھوس شکلوں میں پیش کیا جائے اور بعد میں ایک ایسے دین کا روحانی مرکز بنا جو بت تراشی، تصویر کشی وغیرہ کی سخت ممانعت کرتا ہے۔ ہمیں ایسی شہادتیں ملی ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناموں کے قبیلے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی رائج ہیں کشان عہد میں بودھ مت کے احیا سے کئی صدی پہلے سے پشاور کے آس پاس رہ رہے تھے اور اس علاقہ میں آج جو زبان بولی جاتی ہے اس کی اصل لازمی طور پر ساکا شہسواروں کے بعد نہیں آئی تھی۔ کشان بھی جو ایرانی نسل کے ساکا حملہ آوروں ہی کا بعد میں آنے والا حصہ تھے ایسی زبان بولتے ہوں گے جو ساکاؤں کی زبانوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ مختصر یہ ہے کہ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ آج کے پختو بولنے والے یا ان کے اسلاف اس وقت منظر عام پر آنے لگے تھے جبکہ کنشک کی بادشاہت تھی۔ آج کا پٹھان یہ سوال کرے گا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے بزرگ بودھ کے بت کی پوجا کرتے آئے ہوں۔

اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہوا کے نئے جھونکے کے ساتھ پرانی خوشبوئیں باسی ہو جاتی ہیں۔ پرانے مذہبوں میں محسوسات کو جو دخل تھا اس سے پٹھان کی شدید نفرت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کے اسلاف ان ہی محسوسات سے قریبی لگاؤ رکھتے ہوں گے ع

(۱)
گفتگوئے کفر و دیں آخر بہ یکجا می کشد ۔ خواب یک خواب است باشد مختلف تعبیر ہا

کشانوں کے بعد ایک اور ایرانی خاندان گزرا ہے جس نے وسطی ایشیا سے نئے حملہ آوروں کی آمد سے پہلے گندھارا پر حکومت کی۔ یہ ساسانی خاندان تھا۔

تازہ ترین اندازے کے مطابق کشان شہنشاہ کنشک تقریباً ۱۵۱ عیسوی میں فوت ہوا اس کے بعد اس کی نسل سے یکے بعد دیگرے وسیشکا (VASISHKA)، ہویشکا (HUVISHKA) اور واسو دیوا (VISUDEVA) تخت پر بیٹھے۔ ان کی حکومت ۲۲۵ ء کے قریب ختم ہو گئی۔ مجسموں اور سکوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قریب

---

(۱) یہ شعر ریاض السلاطین مصنفہ منشی غلام حسین سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ پٹھان تھے۔ یہ کتاب اٹھارویں صدی میں بنگال میں لکھی گئی۔

قریب آخر تک بودھ مت کا اثر چھایا ہوا تھا لیکن آخری بادشاہ کا نام بالکل ہندوانہ ہے۔ 'واسو' وشنو کی دوسری شکل ہے اور 'دیوا' کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس نام سے ظاہر ہوتا کہ ہے دربار پر دوبارہ برہمنی اثرات چھائے نہیں تھے تو ان کی ابتدا ضرور ہوئی تھی۔ اگنی پورنا میں اس وقت کی لکھی ہوئی ایک عبارت ملتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندو نظریات کے حامی کشانوں کے بودھ مت اختیار کرنے کو مملکت کی بقا کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ بودھ مت جیسا مذھب جو عدم تشدد اور نفس کشی کے سبق دیتا ہے کشانوں جیسی جنگجو قوم کی طاقت برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ قوم اپنی فتح کے بل بوتے پر حکومت کر رہی تھی اس کے حکمرانوں کا بودھ مت اختیار کر لینا سیاست کے میدان میں دور رس عواقب کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس عبارت سے ان حملہ آوروں کی تضحیک صاف جھلکتی ہے جن کی فوجی طاقت اس طرح ختم ہوگئی تھی اور عین ممکن ہے کہ تاریخ میں جس آخری کشان فرماں‌روا کا تذکرہ دستیاب ہے اس نے ہندو دھرم اختیار کرکے برھمنیت کے سایہ میں پناہ لینے کی بعد از وقت کوشش کی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موریوں کی طرح تیسری صدی میں کشانوں کی فوجی ناکامی میں بھی اس بات کا بڑا دخل تھا کہ کشان بودھ مت میں غلو سے کام لینے لگے تھے۔ برھمنیت جو اس سے زیادہ حقیقت پسند تھی اختیار کرنے کی کوشش اس وقت کی گئی جب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔

کشانوں کو اس نئی طاقت نے مغلوب کیا جو خاص ایران میں ابھری تھی۔ یہ طاقت ساسانی تھی۔ پہلے کی طرح اس موقع پر بھی گندھارا کی تاریخ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ اس کی طاقت کے سرچشمے ایران کی طرف رجوع نہ کیا جائے کیونکہ گندھارا مختلف ادوار میں ایران کی مشرقی سلطنت رہا ہے اصطخر کے مندر کے پیشوا ساسان کا پوتا ارد شیر فارس کا صحیح النسل باشندہ تھا اور اس بات کا دعویدار تھا کہ وہ اخامنشیوں کی نسل سے ہے جنہیں گذرے ہوئے پانچسو سال ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی قیادت میں فارس کے چھوٹے امیروں کو متحد کرکے پارتھی نسل کے آخری ارساسی ارتبانوس (اردوان) پر غلبہ پالیا اور ۲۲۶ عیسوی میں بادشاہ بن بیٹھا۔ ۲۴۰ عیسوی میں اس کی جگہ اس کا بیٹا شاپور تخت پر بیٹھا جو ولی‌عہد کی حیثیت سے امور سلطنت میں اپنے باپ کا شریک رہا تھا۔ ارد شیر اور

شاپور کی متحدہ کوششوں نے همسایہ ملکوں پر کاریا کی لڑائی کے بعد ایک بار پھر ایرانی سلطنت کی دھاک بٹھا دی۔ وہ سب سے پہلے کشان سلطنت کو ختم کرنے پر متوجہ ہوئے جو روم سے ساز باز کر کے ارساسیوں کے زمانہ میں ایران کے لئے ایک بڑی مصیبت بن گئی تھی۔ اس کے بعد شاپور نے روم کے خلاف کار روائی کی اور ایڈیسہ (EDESSA) کے میدان میں (۲٦۰ عیسوی) میں خود رومی شہنشاہ ویلیرین کو قید کر لیا۔

یہی وہ شاپور ہے جس کا کتبہ تخت جمشید کے قریب نقش رستم کے مقام پر آتشکدہ کی دیواروں پر لکھا ہوا ملتا ہے اس کتبہ میں پسکیبورا یا پشاور کو ایرانی سلطنت کی مشرقی سرحد قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتبہ ۲٦۰ء اور ۲۷۳ء کی درمیانی مدت میں کسی وقت لکھا گیا ہے۔ ۲٦۰ء میں ایڈیسہ کی لڑائی ہوئی تھی جس کی یادگار میں یہ کتبہ لکھا گیا اور ۲۷۳ عیسوی شاپور کا سن وفات ہے۔ کنشک کے کشان خاندان کے بعد کئی پشت تک امیروں کا ایک خاندان حکومت کرتا رہا جو ایران کی بالادستی تسلیم کرتا تھا اور جس کی سلطنت کی حدود سمٹ کر غالباً وادی کابل اور گندھارا تک محدود رہ گئی تھیں۔ وثوق کے ساتھ معلوم نہیں کہ ساسانی خاندان گندھارا میں کشانوں پر کب غالب آیا لیکن واسودیوا کا آخری کتبہ ۲۲٦ عیسوی میں لکھا گیا ہے اور یہ ساسانی خاندان کی سلطنت کے سال آغاز سے مطابقت رکھتا ہے۔ قیاس ہے کہ اردشیر نے ۲۳۰ عیسوی میں شاپور کے تخت نشین ہونے سے پہلے پشاور پر قبضہ کر لیا تھا۔

اپنے پیش رو ارساسی خاندان کی طرح ایران کا ساسانی خاندان بھی چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکمران رہا۔ یہاں تک کہ آخری شہنشاہ یزدجرد سوئم نے نہاوند کے مقام پر ٦۲۴ عیسوی میں عربوں کے هاتھوں شکست کھائی اور آخری اخامنشی بادشاہ دارا کی طرح مشرق کی طرف فرار ہوکر مرو پہنچ گیا جہاں ایک قاتل کے هاتھوں قتل ہوگیا۔ دارا کی طرح اس کی سلطنت بھی پارہ پارہ ہوگئی اور اس کے مغربی حصے خلافت میں ضم ہوگئے۔ لیکن ان واقعات کا تذکرہ قبل از وقت ہے اور همیں پشاور اور مشرق کی طرف توجہ دینی چاهئے۔

ساسانی سلطنت کی مشرقی سرحد دریائے سندھ سے آگے نہیں تھی۔

پنجاب اور کشان سلطنت کا دریائے گنگا کا علاقہ ایک زمانہ تک کشان فرماں رواؤں کے زیر نگین رہا اور آخر کار اس کا بیشتر حصہ گپت خاندان(۱) کی ہندو سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ کشان سلطنت کا جو حصہ ساسانیوں کے ہاتھ آیا اس میں گندھارا ڈیرہ جات اور سندھ کے علاوہ افغانستان کا بھی وسیع علاقہ شامل تھا۔ یہ پورا علاقہ کشان شہر کہلاتا تھا۔ اس کا حکمران شہنشاہ کے بعد سب سے عالی مرتبت ساسانی ہوتا تھا جو کشان شاہ کہلاتا تھا جس طرح ملکہ وکٹوریا کے بعد برطانوی حکمران ہندوستان کا شہنشاہ کہلاتا تھا۔ یہ بات قابل یقین ہے کہ پہلا کشان شاہ شاپور اول تھا جو اپنے باپ اردشیر کے زمانہ حیات میں ولی عہد کی حیثیت سے اس مرتبہ پر پہنچا تھا۔ اس کے بعد ساسانی سلطنت کے مشرقی علاقہ کے ایک سے زیادہ فرماں روا ولی عہد ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ۳۶۵ء تک جاری رہا جبکہ شمال کی طرف سے سفید ہنوں کا دباؤ پڑنے پر ساسانی سلطنت کے مشرقی صوبے عارضی طور پر ناپید ہوگئے۔

ایک استثنا سے قطع نظر ساسانی عہد میں بھی ان کے پیش روؤں کی طرح اس بات کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ مشرقی علاقہ کے لوگ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے کونسی زبان بولتے تھے یا ان کی تہذیب کیا تھی۔ پہلا اشارہ افغان کا لقب استعمال کرنے سے ملتا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پسکیبورا کی طرح لفظ افغان بھی سب سے پہلے نقش رستم کے مقام پر شاپور اول کے کتبے میں ملتا ہے جس میں گونڈیفرا ابگان رسماد (GOUNDIFER ABGAN RISMAUD) کا فقرہ درج ہے اس فقرہ کا دوسرا لفظ یقیناً افغان کی ابتدائی شکل ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شہنشاہ کے ملازموں میں بہت سے مشرقی ایرانی شامل ہوں گے۔ اسپرنگلنگ (SPRENGLING) کا کہنا ہے کہ اس سے ملتا جلتا نام اپاکان (APAKAN) بعد میں آنے والے ساسانی شہنشاہ شاپور سویم کے لقب کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس شہنشاہ نے ستر سال (۳۰۹-۳۷۹ عیسوی) تک حکومت کی۔ صوتی اعتبار سے یہ بات قرین قیاس ہے کہ پہلے یہ لفظ ابگان ہو پھر اپاکان اور اس کے بعد افغان بن گیا ہو اور قیاس کا ایک میدان یہ بھی ہے کہ اصل افغان قبیلوں یوسف زئی یا درانیوں کا جد امجد کوئی ساسانی سردار ہو۔

---

(۱) گپت خاندان کبھی گندھارا حتیٰ کہ دریائے سندھ پر بھی قابض نہیں ہوا۔ اس خاندان نے ۳۲۰ء سے ۵۵۰ء تک حکومت کی۔

ساسانیوں کا دور ختم نہیں ہوا لیکن انہیں دوبارہ گندھارا پر قبضہ حاصل کرنے میں تقریباً دو سو سال لگے۔ اس کے بعد ایک نیا اور بہت بڑے پیمانہ پر حملہ ہونے والا تھا جس کے مقابلہ میں سابقہ جنگ اقتدار اپنی اہمیت کھو بیٹھی اور خاندانی چشمک سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہ رہی۔

فصل ششم

سفید ہن

اسکندر اعظم کو چھوڑ کر اخامنشی خاندان کے بعد جن لوگوں نے چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک گندھارا پر حملے کئے وہ ایرانی تھے، یا تو خاص ایران کے رہنے والے یا دنیائے ایران کی سرحدوں پر رہنے والے خانہ بدوش مثلاً پارتھی، ساکا، اور کشان۔ حد یہ ہے کہ یونانی باختری بھی ایرانی ہی تھے اگرچہ ان پر یونانی تہذیب کا رنگ چڑھا ہوا تھا ۔ لیکن اب براعظم ایشیا کے قلب سے وحشی قبائل کا کوچ شروع ہوتا ہے۔ یہ وحشی قبائل نام نہاد سفید ہن ہیں جنھیں یونانی اور رومی مصنفوں نے افتھالائٹس (EPHTHALITES) یا کیونائٹس (CHIONITES) کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ ثقیل نام درحقیقت چینی زبان کے ''ای تی آئی لی ڈو،، (Ye-ti-i-li-do) اور قرون وسطیٰ کے فارسی لفظ خیون (KHION) کی یونانی زبان میں بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ چینی اور فارسی کے متذکرہ بالا الفاظ ہنوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ قدیم عرب اور ایرانی وقائع نگاروں اور جغرافیہ نویسوں نے انھیں ہیتال (HAYTAL) یا ہیاتلہ (HAYATILA) کے نام سے یاد کیا ہے۔

افتھالیوں یا سفید ہنوں کی ابتدائی نقل و حرکت کے متعلق جو کچھ بھی مواد دستیاب ہے وہ سب کا سب چینی زبان میں ہے اور جب تک سفید ہنوں نے جنوب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ہندوکش پار نہیں کر لیا کلاسیکی یا عربی اور فارسی کی تصنیفوں میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ۔ اگرچہ ونسنٹ سمتھ ان قبائل اور اٹیلا کے ہنوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں لیکن چینی مصنف بڑی احتیاط کے ساتھ ی تی آئی لی ڈو یا افتھالیوں اور ہیونگ نو (HIUNG NU) یعنی اصلی ہنوں کا فرق

ظاهر کرتے ھیں ۔ اس زمانہ کا ایک مصنف پروکوپیئس (PROCOPIUS) اپنی کتاب ڈی بیلو پر سیکو (De bello Persico) میں لکھتا ھے کہ یہ حملہ آور ان ھنوں سے بالکل مختلف ھیں جن سے رومی واقف ھیں ۔ ان کا سفید رنگ اور ھموار خدوخال ما بہ الامتیاز ھیں ۔ چینی تحریروں سے ظاہر ھوتا ھے کہ وہ منگولی اور ترکی میں سے کوئی بھی زبان نہیں بولتے تھے ۔ اس طرح وہ انگاریہ (ZUNGARIA) کے علاقہ میں جہاں سے اصلی ھن اور افتھالی آئے ھیں بسنے ھن گروھوں سے زبان کے اعتبار سے بھی مختلف تھے ۔ میک گورن کا کہنا ھے کہ ایک چینی مصنف نے یہ بھی دعویٰ کیا ھے کہ یہ لوگ بھی اپنی اصل کے اعتبار سے یوچی (YUEH-CHI) یعنی کشان تھے لیکن یہ بات مشتبہ معلوم ھوتی ھے ۔

ان متضاد دعوں اور قیاسات سے جو بہترین نتیجہ نکالا جا سکتا ھے وہ یہ ھے کہ چونکہ افتھالیوں کا علاقہ ترکی النسل ھنوں سے ملحق تھا اس لئے دونوں میں بڑے پیمانہ پر نسلی اور لسانی میل ملاپ ھوا ھو گا اور وہ اس بات پر بھی فخر کرنے لگے ھوں گے کہ وہ ھن خاندان سے تعلق رکھتے ھیں ۔ ساتھ ھی ساتھ ایران اور توران کی سرحد پر شمالی ترکستان میں ان کی حیثیت خانہ بدوش قوم کی سی تھی جس پر دونوں ھمسایہ قوموں کا اثر پڑ رھا تھا اور ھو سکتا ھے یہ لوگ دونوں زبانیں بولتے ھوں ۔ قوی امکان یہ ھے کہ یہ لوگ ترکوں اور ایرانیوں کا مرکب تھے ۔ واقعہ یہ ھے کہ روسیوں کی آمد سے پہلے بخارا اور سمرقند کی تہذیب اس امتزاج کی نمائندگی کرتی تھی ۔ تاریخ میں اس امتزاج کی مثالیں تلاش کرنے کے لئے ھمیں شہنشاہ بابر اور اس کے پوتے اکبر سے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ بیشتر حالات میں اس قسم کا نتیجہ نکالنا صحت سے زیادہ قریب ھوتا ھے بہ نسبت اس کے کہ کسی گروہ یا قوم کو واضح طور پر کسی ایک نسل سے وابستہ سمجھ لیا جائے ۔ افغانوں اور پٹھانوں کے معاملہ میں بھی ھم اسی قسم کے نتائج اخذ کرنے پر مجبور ھیں ۔

ھمیں سب سے پہلے افتھالیوں کا تذکرہ اس حیثیت سے ملتا ھے کہ وہ آوروں (AVARS) کے محکوم اور رعیت تھے جنھوں نے چوتھی صدی عیسوی میں اپنی سلطنت قائم کی تھی ۔ اس سلطنت کا مرکز منگولیا تھا ۔ اور غالباً

منگولی زبان بولتے تھے اور ان کا حکمران خاقان یا خان کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا ۔ افتھالی یہ خطاب وسط ایشیا سے کوچ کے دوران اپنے ساتھ لائے ۔ افتھالیوں نے قبائلی نظم و نسق کے خاص خاص اصول اپنے حاکم آوروں سے اخذ کئے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ خود ایک جدا گانہ قوم تھے جن کا لسانی اور ثقافتی پس منظر بالکل جدا تھا ۔ اور اپنے وطن سے ان کے کوچ کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے سخت گیر آور حکمرانوں سے بچنا چاہتے تھے ۔ انہوں نے کاشغر یعنی موجودہ سنکیانگ اور سوغذ (SOGDIA) یعنی موجودہ سمرقند کو تاخت تاراج کر دیا اور تقریباً ۴۱۰ء میں باختر کے کشانوں پر حملہ کرنے کے لئے جنوب کا رخ کیا ۔ کشان حکمرانوں نے شدید مزاحمت کی لیکن جب ایران کی ساسانی حکومت ان کی فریاد پر امداد کو نہ پہنچی تو کدارا نامی لیڈر کی قیادت میں جنوب مشرق کی طرف گندھارا میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ۔ اس علاقہ میں ان کے رشتہ دار بڑے عرصہ تک حکومت کرتے رہے تھے لیکن اب ساسانی سلطنت کے باج گزار بن گئے تھے ۔ ان کداریوں کو جنھیں کبھی کبھی چھوٹے کشان کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے عام طور پر شمال کی طرف سے سفید ھنوں کے حملے کی پہلی لہر سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ قیاس قریب قریب یقین کی حد تک درست ہے کہ کدارا اور اس کے جانشین صحیح النسل تورانی تھے جنھیں افتھالیوں نے باختر سے اجاڑ دیا تھا ۔ کدارا آخری کشان شاہ سے جو تقریباً ۳۲۵ء میں فوت ہوا گندھارا اور آس پاس کے علاقوں پر اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ اس نے کشان شاہ کا لقب اختیار کر لیا اور عین ممکن ہے کہ ساسانی شہنشاہ نے بھی اس کی یہ حیثیت تسلیم کر لی ہو ۔ گندھارا پر کداریوں کی حکومت کی مدت غیر یقینی ہے لیکن سکوں کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نام کے ایک سے زیادہ حکمراں گزرے ہیں ۔ اس طرح یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس خاندان کا دور حکومت ایکسو سال تک رہا ہو ۔ آخرکار اس پورے علاقہ پر افتھالی یا سفید ھن بادلوں کی طرح چھا گئے ۔ یہ حملہ آور مشرق میں شمالی ھندوستان میں پھیل گئے اور مغرب میں انھوں نے ایران کی ساسانی سلطنت قریب قریب ختم کر دی ۔

افتھالیوں نے ۴۲۵ء میں باختر پر مکمل قبضہ کر لیا اور اس مرکز سے ایک طرف جنوب مغرب میں ایران پر اور دوسری طرف جنوب مشرق

میں وادی کابل اور گندھارا پر زبردست حملے کے لئے بڑھے۔ ایران پر ان کی چڑھائی کو سب سے پہلے ۴۲۷ء میں مشہور ساسانی بادشاہ بہرام پنجم نے روکا جو 'بہرام گور' کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ شکار عشق بازی اور گانے بجانے کا بڑا شوقین تھا۔ بہرام گور حملہ آوروں کو سونے چاندی سے خریدنے میں ناکام رہا تو اس نے گھات لگا کر افتھالی فوج کے ایک ایک سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ یہ تدبیر ایک پشت تک کارگر رہی۔ لیکن پانچویں صدی کے وسط کے بعد جب بہرام کا پوتا فیروز تخت نشین ہوا تو پانسہ پلٹ گیا۔ فیروز نے اپنے چھوٹے بھائی کو تخت سے اتارنے کے لئے افتھالیوں کو بادشاہ گر کی حیثیت سے ایران میں داخل ہونے کی دعوت دی اور پھر آپس کی رنجشوں نے جنگ کی صورت اختیار کرلی۔ دونوں فریقوں میں کئی زبردست لڑائیاں ہوئیں جن میں فیروز پہلے تو قید ہوا اور پھر ۴۸۴ء کے آخر میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ساسانی ایران کا غرور خاک میں مل گیا اور اس کی حیثیت افتھالیوں کے باج گزار کی رہ گئی۔ یہ حیثیت چھٹی صدی میں بھی کافی عرصہ تک قائم رہی۔ لیکن افتھالیوں کی توجہ کا مرکز کوئی اور علاقہ تھا اس لئے وہ ایرانی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا سکے۔

ساسانیوں پر افتھالیوں کا دباؤ کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہندوستان پر حملے کے خواب دیکھ رہے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ حملہ زیادہ کارآمد اقدام تھا۔ انہوں نے اس کی ابتدا گندھارا پر چڑھائی سے کی اور قریباً ۴۵۵ء میں کدارا کے جانشین کو مغلوب کرلیا۔ اس حملہ میں ان کے ساتھ قبائلیوں کا ایک گروہ بھی تھا جس کی حیثیت غلاموں یا رعیت جیسی تھی۔ یہ لوگ گرجارا (GURJARAS) کہلاتے تھے۔ گندھارا میں انہوں نے ایک تاجین (TAGIN) یا نائب الحکومت مقرر کیا جو باختر کے افتھالی حاکم اعلیٰ کا برائے نام ماتحت تھا۔ اس نائب الحکومت یا اس کے جانشین کو ہندوستانی گپت خاندان کے کتبوں میں تورامانا (TORAMANA) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد تورامانا اور اس کے بیٹے مہراگلا (MIHIRAGULA) نے جو دونوں بڑے ظالم مشہور ہیں پنجاب کو تاراج کر دیا، ہندوؤں کی گپت سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شمالی اور وسطی ہندوستان کے مطلق العنان فرماں روا بن بیٹھے۔ انہوں نے اپنا پایۂ تخت سکالہ (SAKALA)

یعنی موجودہ سیالکوٹ کے مقام پر قائم کیا۔ (۱)

مہراگلا کے مظالم کا تذکرہ صرف ہندووں ھی کے بیانات میں نہیں ملتا بلکہ چینی بودھ سیاح سون یون اور ایک بازنطینی راھب نے بھی جو اس دور میں شمالی علاقہ کے دورہ پر گیا تھا یۂ مظالم بیان کئے ھیں۔ آخر کار ان مظالم کی وجہ سے بغاوت پھیل گئی اور افتھالی شکست کھاگئے۔ ان کے پاس پاؤں ٹکانے کے لئے شمال میں تھوڑا سا علاقہ رہ گیا۔ مہراگلا نے کشمیر میں پناہ لی جہاں اس نے دھشت گردی کا نیا دور شروع کردیا جو ۵۴۲ء میں اس کی موت تک جاری رھا۔ کشمیریوں میں یہ قصہ مشہور ھے کہ وہ ھاتھیوں کو بلند چٹان سے گرا کر اور انھیں مرتے ہوئے تڑپتا دیکھ کر خوش ھوتا تھا۔ جس چٹان سے ھاتھی گرائے جاتے تھے اس کی نشاندھی درۂ پیرپنجال کے جنوب میں پہاڑی چوٹی کے قریب کی جاتی ھے۔ یہ جگہ اس راستہ پر واقع ھے جو ایک ہزار سال بعد مغل حکمرانوں نے ہر سال کشمیر جانے کے لئے اختیار کیا تھا۔

وادی سندھ میں افتھالیوں کی طاقت ختم ھونے کے بعد ان کا بڑا حصہ بھی جو باختر میں رہ گیا تھا زیادہ عرصہ تک اپنا وجود قائم نہ رکھ سکا۔ چھٹی صدی کے تقریباً وسط میں ترکوں نے جو افتھالیوں کی جگہ آوروں کی رعیت بن گئے تھے اپنے مالکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور شمالی ترکستان کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے بعد فاتح ترکوں اور باختر میں رھنے والے افتھالیوں کے تعلقات کشیدہ ھو گئے اور وہ ایک دوسرے کے دشمن ھو گئے۔ اس مرحلہ پر ساسانی ایران میں خسرو اول نوشیروان عادل کا طویل دور حکومت (۵۳۱-۷۹) شروع ھوا تھا۔ اگرچہ اس بادشاہ کی پیش قدمی کو بیلی ساریس نے دریائے فرات پر روک دیا پھر بھی وہ جسٹینین کے تحت رومی بازنطینہ سے لڑائی لڑ کر ایرانی فوج کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے میں کسی حد تک کامیاب ھوگیا۔ باختری افتھالیوں کے دوسری طرف ترکوں کے عروج کے ساتھ خسرو کو ان لوگوں سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا جنھوں نے تین پشتوں تک ایران کا وقار خاک میں ملائے رکھا تھا۔ ساسانیوں اور ترکوں نے متحدہ محاذ بنا کر افتھالی

---

(۱) مسلمانوں کے عہد سے پہلے شمال میں صدر مقامات پورو شاپورا (پسکا پوروس) ٹیکسلا اور سکالا جہاں واقع تھے قریب قریب وھیں آج پشاور راولپنڈی اور لاھور آباد ھیں۔

سلطنت پر حملہ کر دیا اور سغد کے مقام پر ایک فیصلہ کن لڑائی کے ذریعہ اسے تباہ کردیا۔ بازنطینی مورخ مناندر پروٹیکٹر نے اس لڑائی کا سن ۵۶۸ عیسوی لکھا ہے۔ لڑائی کی تفصیلات شاہنامہ فردوسی کے اس حصہ میں ملتی ہیں جس میں خسرونوشیروان کا حال بیان کیا گیا ہے۔ فردوسی نے افتھالیوں کو ہیتال کے نام سے یاد کیا ہے۔

اس طرح ایک بار پھر ساسانی سلطنت برائے نام ہی سہی لیکن دریائے سندھ تک پھیل گئی۔ اور تمام مشرقی ایران، جو آج کل افغانستان کہلاتا ہے، پھر ساسانی فرماں رواؤں کے قبضہ میں آ گیا۔

لیکن افتھالی سلطنت کے ساتھ خود افتھالی ختم نہیں ہوئے۔ عین ممکن ہے کہ دوسری میراثوں کے ساتھ خان کا لقب بھی ان ہی کا ترکہ ہو جو آج کل نہ صرف پٹھانوں میں بلکہ پنجاب اور اس سے بھی آگے جہاں کہیں یہ احساس موجود ہے کہ ہم وسطی ایشیا سے آئے ہوئے لوگ ہیں یہ لقب طرۂ امتیاز ہے یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ بعض اصطلاحیں جن کی ابتدا منگولیا میں ہوئی اور جو ترکوں کے ساتھ جنوب میں پہنچ کر پٹھانوں کے استعمال میں آئیں ان کا تعلق اسی دور سے ہے۔ مثال کے طور پر قبیلہ کے لئے ''اولس،،۔ اپنا نقصان پورا کرنے کے لئے دشمن کی ذات یا بھیڑوں کے گلے پر حملہ کے لئے ''بر متہ،، اور فصل کاٹتے وقت مدد کے لئے جو دوست بلائے جاتے ہیں ان کے لئے ''اشر،، کا لفظ۔ یہ تمام الفاظ پختو میں عام مستعمل ہیں لیکن ان کی اصل فارسی نہیں ہے۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ افتھالیوں کے ساتھ گرجارا بھی آئے اور جب افتھالی سلطنت ختم ہوگئی تو گوجر یہیں رہ گئے۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ پنجاب کے جاٹ یعنی وہ نسل جس سے دیہاتی سکھ تعلق رکھتے ہیں اور بہت سے راجپوت خاندان بھی ان ہی حملہ آور سفید ہنوں کی اولاد ہیں اگر یہ صحیح ہے تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوگی کہ افتھالیوں نے پشاور کے میدان میں رہنے والی آبادی پر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑا۔

راجپوتوں کی اصل کا بھی موضوع زیر بحث سے تعلق نکل سکتا ہے اور ونسنٹ سمتھ نے بہت سے دلچسپ نکات بیان کئے ہیں (۱)۔ اس بیان

---

(۲) ونسنٹ سمتھ نے پنجاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ یعنی گندھارا اور ڈیرہ جات کو بھی شامل کرلیا تھا۔

کے بعد مسلمان حملہ آوروں سے پہلے شمال مغربی دروں کے راستے تین بڑے حملے ساکاؤں کشانوں اور سفید ھنوں نے کئے تھے(۱) وہ اس بات کی طرف توجہ دلاتے ھیں کہ تاریخ ھند کے دور قدیم اور زمانۂ وسطیٰ کا بڑا فرق یہ ھے کہ کسی موقع پر زندہ روایات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ درحقیقت دور قدیم کی کوئی روایت ھی نہیں ھے۔ موریہ ساکا اور کشان ایک مردہ اور مدفون ماضی سے تعلق رکھتے ھیں ان کا پتہ صرف سکوں اور کتبوں سے چلتا ھے۔ اس کے برخلاف راجپوت خاندان کی روایت بڑی حد تک زندہ ھے اور وہ آج بھی قوم کا بااثر حصہ ھیں۔

ونسنٹ کا خیال ھے کہ تاریخ کا سلسلہ تیسری یلغار یعنی پانچویں صدی میں سفید ھنوں کے حملہ کے زمانہ میں ٹوٹ گیا۔ یہ یلغار اتنی زبردست تھی کہ اس نے پہلے اور دوسرے حملہ آوروں یعنی ساکاؤں اور کشانوں کے ساتھ نسلی تعلق کی تمام یادیں بھلادیں۔ یہ حملہ برطانیہ پر اینگلو سیکسن حملہ کی طرح تھا جس کے ساتھ دور جاھلیت شروع ھو گیا۔ ونسنٹ آگے چل لکھتے ھیں :—

یہ راجپوت کون ھیں اور اسلامی فتوحات سے پہلے چند صدیوں تک یہ لوگ اور انکے واقعات اس قدر دلچسپ کیوں ھیں۔ ان کا تسلط ھی شمالی ھند کی زمانۂ قدیم اور زمانہ وسطیٰ کی تاریخ کے درمیان مابہ‌الامتیاز ھے۔ اور ذھن اس کی توجیہ کا طالب ھے۔

یہ حقیقت واضح ھے کہ ھن قبائل نے اپنی بڑی بڑی بستیاں راجپوتانہ اور پنجاب میں آباد کیں۔ اس گروہ میں ھنوں کے بعد سب سے زیادہ اھمیت گرجاروں (GURJARAS) کو حاصل تھی ان کا نام گوجر (GUJAR) کی شکل میں موجود ھے یہ شمال مغربی ھندوستان میں دور تک بکھری ھوئی ایک قوم کا نام ھے۔ جاٹ جو عام طور پر زراعت پیشہ ھیں گوجروں کے قرابت‌دار سمجھے جاتے ھیں اور گوجر پیشہ کے اعتبار سے مویشی پالنے والے ھیں۔

(۱) مصنف نے ایرانیوں کو غیر ملکی قرار نہیں دیا ۔ ان کا یہ خیال درست ھے۔

یہ دریافت کہ ۸۰۰ سے ۱۰۱۸ء تک قنّوج پر حکومت کرنے والے راجے (پاریہار) (PARIHARS) جن میں سے کئی شمالی ہند کے مطلق العنان حکمران کی حیثیت کے مالک تھے در حقیقت پانچویں اور چھٹی صدی میں باہر سے آئی ہوئی قوموں کی نسل سے تھے اور گوجروں کے قرابت دار تھے (اگر چہ انہیں اعلیٰ نسل کا راجپوت سمجھا جاتا ہے) ہندوستان کی تاریخی معلومات میں ایک اہم افسانہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بہت سے راجپوت خاندان بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بظاہر حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی غیر ملکی قبیلہ ہندو دھرم اختیار کر لیتا تھا تو حکمران خاندانوں کو کسی اعتراض کے بغیر کھتری یا راجپوت تسلیم کر لیا جاتا تھا جبکہ اس قبیلہ کے عام لوگ گوجر اور اس سے چھوٹی ذات سے منسوب کر دئے جاتے تھے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ دعویٰ پٹھانوں کی اصل پر کس طرح منطبق ہوتا ہے۔ گندھارا یا وادی پشاور شمالی ہند پر حملے کے لئے افتھالیوں یا سفید ہنوں کا نقطۂ آغاز تھا۔ آج سوات، دیر اور مردان کے دیہات میں ہزاروں گوجر پائے جاتے ہیں، یوسف زئی 'سمہ' میں ایک بہت بڑے گاؤں کا نام ہی گوجر گڑھی ہے۔ سدم کی جو شمالی پہاڑیاں سمہ کو بنیر سے الگ کرتی ہیں ان کی ترائی میں بہت سے دیہات صرف گوجروں سے آباد ہیں۔ البتہ ان دیہات کے خان اور ان کا خاندان پٹھان ہے اور گوجر اس کی رعیت ہیں جس طرح گرجارے افتھالیوں کی رعیت تھے۔ ہر پٹھان، خان کا لقب اپنے حق کے طور پر استعمال کرتا ہے یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں کہ افتھالیوں جیسی فاتح قوم نے جس نے ہندوستان میں اپنی نسل کے مانے ہوئے لوگ راجپوتوں میں چھوڑے ہیں گندھارا میں جو اس قوم کا ایک مرکز تھا لوگوں کے خون میں اپنا اثر نہ چھوڑا ہو۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا کہ افتھالیوں کے زوال اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد اسلام کے ہاتھوں ساسانی سلطنت کے خاتمہ کے بعد گندھارا اور آس پاس کے علاقہ پر ہندو راج قائم ہوگیا جو چار صدی تک قائم رہا۔ اس طویل عرصہ میں شمال مغرب کی طرف سے کوئی کامیاب حملہ نہیں ہوا او لوگوں کو چین سے آباد ہونے

کا موقع مل گیا۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جیسا کہ پرو کوپیس نے کہا ہے کہ سفید ھنوں کا رنگ سفید اور ناک نقشے ھموار تھے۔

افتھالیوں اور گرجاروں کا باھمی رابطہ ظاھر ھونے سے بہت پہلے بیلیو نے افغانوں اور راجپوتوں کے قومی کردار اور رسم و رواج کی مشابہت کی طرف اشارہ کیا تھا اور اس مشابہت کو بہت واضح قرار دیا تھا۔ وہ اس سلسلہ میں مہمان نوازی کے سخت قاعدہ، پناہ مانگنے والے کو پناہ دینے، عورتوں کی حرمت، جنگجوئی کے جذبہ، کسی قسم کے دباؤ کی مخالفت، نسلی غرور، قوم کی عزت پر مرمٹنے کے جذبہ اور ذاتی وقار کا تذکرہ کر۔ ھیں۔ یعنی ایک ایسی شخصیت جو غالب رھنا چاھتی ھے۔ وہ دونوں قوموں کی شکلی مشابہت کا بھی تذکرہ کرتے ھیں۔ اور بہت سے لوگ جو ان دونوں قوموں سے واقف ھیں اس دعوے سے اتفاق کرینگے۔ آخر میں وہ کہتے ھیں کہ آج ان دونوں قوموں کے درمیان علاقائی دوری اور شخصیت سے زیادہ اسلام اور برھمنیت حد فاصل ھے۔ اس کی وضاحت کے لئے ان کی عبارت درج ذیل ھے۔

”بہت سے معاملوں میں راجپوت اسکاٹلینڈ کے پہاڑی باشندوں سے اتنی گہری مشابہت رکھتے ھیں کہ ان کا تذکرہ پڑھتے ھوئے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ناموں اور لباس کے فرق سے قطع نظر سر والٹر اسکاٹ کی کہانیاں پڑھی جا رھی ھیں۔ ان میں بھی وھی بے جگری سردار کے ساتھ وفاداری کھیلوں کا شوق، بات بات پر بگڑنے کے لئے تیار رھنے اور کسی دشمن کی غیر موجودگی میں آپس میں لڑنے کی عادتیں پائی جاتی ھیں۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی راجپوت کا بانکپن وھی ھے جو اس کے عروج کے زمانہ میں تھا۔ یہ بانکپن اسے دوسری قوموں سے ممتاز بنائے ھوئے ھے۔ غریب سے غریب راجپوت بھی نسل کے اعتبار سے شریف ھے اس لئے بڑے سے بڑے آدمی کے برابر ھے۔ ایک شہسوار راجپوت کو ان راستوں سے گزرتا دیکھ کر جو اس کے اجداد نے بزور شمشیر ھموار کئے تھے وہ واقعات نظر میں پھر جاتے ھیں جب پرتھوی راج لڑائی کے لئے نکلا تھا۔ اس پورے بیان میں راجپوت کی جگہ افغان اور پرتھوی راج کی جگہ احمد شاہ استعمال کیا جائے تب بھی پورا بیان ٹھیک بیٹھتا ھے“۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ پٹھان خاندانوں کے نام افتھالیوں کے حملے سے سینکڑوں سال پہلے اپنی ابتدائی شکل میں جنم لے چکے تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ بہترین ماہرین لسانیات کے نزدیک پختو زبان ساکاؤں کے بعد نہیں (بلکہ پہلے) وجود میں آئی ہے۔ ساکا افتھالیوں سے چار صدی پہلے آئے تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ نچلی تہہ خواہ کچھ بھی ہو سفید ہن اس علاقہ میں بسنے والے لوگوں کی تہہ بہ تہہ قوم میں ایک اور تہہ ثابت ہوئے تھے۔ جس طرح سفید ہنوں کی رعیت گرجارے اس علاقہ میں گوجروں کے نام سے ہزاروں کی تعداد میں ملتے ہیں اسی طرح ان کے حاکم افتھالی آج کل کے خان حضرات میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یوسف زئی جیسے قبیلے کے خان خیل اس دعوے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ افتھالیوں کے نسل سے ہیں۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ افتھالی خون پہاڑی پٹھانوں کی بجائے میدانوں میں رہنے والے افغانوں مثلاً یوسف زئیوں میں پایا جاتا ہو۔ بہ الفاظ دیگر شجرے کی اصطلاح میں یہ بیرونی اثرات کو کرلانیوں میں نہیں بلکہ سڑبنیوں میں تلاش کرنے چاہیں۔ یہاں بیلیو کی یہ قیاس آرائی یاد رکھنی چاہئے کہ سڑبنی شجرے سے راجپوتوں کا رنگ جھلکتا ہے مثلاً سڑبن سوریہ بن سے شرجیون سورجن سے اور کرشیون کرشن سے نکلا ہے۔

یہ دریافت تعجب خیز نہیں ہے کہ چند مستثنی الفاظ کو چھوڑ کر جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں پٹھانوں کی زبان کا ترکوں کی زبان سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ پٹھانوں کی زبان مشرقی ایرانی زبان ہے جس نے ہندوستانی گروپ کی زبانوں سے الفاظ وغیرہ اخذ کئے ہیں۔ ثقافتی معاملات میں جن میں زبان بھی شامل ہے ہن فاتحوں نے بظاہر مفتوحین کے طور طریقے اپنا لئے یہ طور طریقے سینکڑوں سال پرانی ایرانی تہذیب کی میراث تھے۔

اس قیاس کی اور بھی وجوہات موجود ہیں کہ افتھالی اس مرکب کا ایک اہم جز بن گئے جو دنیائے افغان کہلاتی ہے۔ جیسا کہ ہمیں نسب ناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے غلجی بیٹن کی اولاد قرار دئے جاتے ہیں اور قیس کے خاندان سے ان کا تعلق اس کی بیٹی بی بی متو کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جسے ایک غیر ملکی شہزادہ حسین نے ورغلایا تھا۔

یہ کہانی صاف طور پر صنمیات کے انداز میں غیر ملکی حملہ آوروں کی روایت ظاہر کرتی ہے جنہوں نے زبردستی یا چالاکی سے اس علاقہ کی عورتوں کو اپنی بیویوں کی طرح رکھا ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ بعض وقائع نگاروں کے نزدیک یہ افسانوی شاہزادہ غالباً ترکی‌النسل تھا۔ یہ بات تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ افغان نہیں تھا۔

غلجیوں میں ترک آمیزش کے امکان پر بڑی بحث ہوتی آئی ہے۔ محمود کاشغری کی رائے پر جس نے اپنی کتاب گیارھویں صدی میں بغداد میں لکھی خاص طور پر بھروسہ کرتے ہوئے روسی مستشرق بارتھولڈ (BARTHOLD) لکھتے ہیں کہ غلجی ترک خلج ہیں جو اوغز (OGHUZ) (غز (GHUZZ)) ترکوں کے چوبیس خاندانوں پر مشتمل قبیلہ میں سے دو خاندانوں کے نام ہیں۔ ان میں سے پہلا قبیلہ دسویں صدی میں آمو دریا کے جنوب میں چلا گیا اور انھیں محمود غزنوی کی فوج میں اہم حیثیت حاصل تھی۔ خیال ہے کہ انھوں نے رفتہ رفتہ افغانوں کی زبان اور طرز طریقے اپنا لئے۔ ایک اور روسی مستشرق ریزنر (Reisner) بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں کیمرج ہسٹری آف انڈیا میں اور میری اس سے پہلے کی ایک اور تصنیف میں بھی قریب قریب یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے۔

میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ فی‌الحال یہ بحث ملتوی کردی جائے کہ غلجی در اصل خلج ہیں اور یہ بحث ہندوستان پر پیشہ‌ور خلج سپاہیوں کے حملہ کے تذکرہ کے ساتھ چھیڑی جائے۔ ابھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خلج کے پیش رو کون تھے۔ اگر خلج واقعی ترکی‌النسل تھے اور حال ہی میں یعنی دسویں اور گیارھویں صدی میں غزنوی دور میں افغانوں میں ضم ہوئے ہیں تو میرا خیال ہے غزنوی دور اور بعد کی کتابوں میں اس امتزاج کا تذکرہ ضرور ہوگا کیونکہ اس دور کے مقامی اور عرب ہم عصروں کی بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ غزنوی دور اور بعد کے وقائع نگاروں کی تصنیفات میں اس قسم کے تذکرے ضرور ہوتے۔ ہمیں فاتحوں کی ابتدائی ٹولیوں میں خلج کی اصل تلاش کرنے کے لئے تاریخ میں اور پیچھے جانا ہوگا۔ کیا وہ افتھالیوں کے اخلاف ہوسکتے ہیں؟ اس نسل کا دور غز کے ترکوں سے بھی پہلے گزرا ہے یہ بات امکان سے بعید معلوم ہوتی ہے کہ یہ نظریہ تحریروں اور

کتبوں کی شہادت سے ثابت کیا جا سکے گا کیونکہ جہاں تک ہمارے علم میں ہے افتھالیوں کا اپنا کوئی ادب نہیں تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی کتبہ یا یادگار عمارت بھی نہیں چھوڑی۔ لیکن یہ قیاس بھی اتنا ہی دلچسپ اور اتنا ہی معقول ہے جیسا ونسنٹ سمتھ کا یہ کہنا کہ راجپوتوں کی شاندار قوم افتھالیوں کی اولاد ہے۔

اس مرحلہ پر روشنی کی کرن نمودار ہوتی ہے۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ افتھالیوں کو فارسی عربی میں ہیتال یا ہیاتلہ کہا جاتاہے اور فردوسی نے شاہنامہ میں ان کا تذکرہ اس نام سے کیا ہے۔ پروفیسر منورسکی (MINORSKY) حدودالعالم (۱) کی تفسیر میں عرب وقائع نگاروں کی دو عبارتیں نقل کرتے ہیں جو بظاہر تمام اشتباہات دور کر دیتی ہیں وہ عبارتیں یہ ہیں:-

(الف) الخوارزمی کی تصنیف مفتاح العلوم میں جو غالباً ۹۷۵ء (۳۶۵ ہجری) میں لکھی گئی یہ عبارت درج ہے ''ہیاتلہ وہ قبیلہ ہے جسے عظمت حاصل رہی ہے اور جو طخرستان (TUKHARISTAN) پر قابض رہا ہے جو ترک خالخ (KHALUKH) یا خلج (KHALAJ) کہلاتے ہیں وہ ہیاتلہ ہی کی نسل سے ہیں''۔

(ب) اصطخری کی کتاب المسالک میں جو ۹۳۳ء (۳۲۱ ہجری) میں لکھی گئی یہ عبارت درج ہے ''خلج ترکو کی وہ شاخ ہیں جو قدیم زمانہ مین غور کے عقب میں واقع سجستان (SIJISTAN) (سیستان) کے ضلعوں اور ہندوستان کے درمیانی علاقہ میں آئے تھے۔ وہ مویشی پالتے ہیں اور حلیہ لباس اور زبان کے لحاظ سے ترک معلوم ہوتے ہیں''۔

جہاں تک پہلی عبارت کا تعلق ہے مختلف کتابوں میں کہیں خلج اور کہیں خلخ لکھا ہے۔ کیونکہ عربی میں ان دونوں لفظوں میں صرف

---

(۱) حدودالعالم فارسی زبان میں لکھا ہوا جغرافیہ ہے جو کسی نا معلوم مصنف نے ۹۸۲ء میں تحریر کیا تھا ۔ V. MINORSKY نے حواشی کے ساتھ اس کا ترجمہ کیا جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ۔

خ اور ج کا فرق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں مصنف کی مراد خلج ہی ہے۔ طخرستان وہ علاقہ ہے جو اب بغلان کے ارد گرد شمال مشرقی افغانستان ہے۔ دونوں عبارتوں کو ملا کر پڑھا جائے تو وہ افتھالیوں کی جغرافیائی فتوحات پر صادق آتی ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ افتھالی خلج ہی تھے۔ یہ عبارتیں خلج کو غز کے ترک وطن سے مزید پانچ صدی تک ماضی میں لے جاتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ ان کے اسلاف بھی سفید ھن ہی تھے جو اس وقت کے ھندوستان کے شمال میں دوسری سر بر آوردہ قوموں کے بھی اسلاف ہیں۔

اگر میں اس موقع پر یہ کہوں کہ بعد میں ملنے والے ثبوتوں سے یہ طے ہوگیا ہے کہ خلج اور غلجی ایک ہی گروہ کے دو نام ہیں تو یہ نتیجہ پر قبل از وقت پہنچنے کے مترادف ہوگا۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث نسب ناموں کے سلسلہ میں کی جائے گی۔

افتھالیوں کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے ایک اور ممکنہ تعلق کا اظہار ضروری ہے۔ مشہور سیاح میسن نے جس کی تصنیف تقریباً ایک سو سال پہلے سپرد قلم کی گئی ہے درانیوں کو بھی افتھالی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ھندوستان اور ایران میں درانی ابدالی یا اودالی کے نام سے مشہور ہیں اور جب ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ قدیم تاریخ کے سفید ھن جنھیں کلاسیکی مصنفوں نے یوتھالی لکھا ہے اور جنھیں آرمنی مصنفوں نے ھفتال کے نام سے یاد کیا ہے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ابدالی یعنی موجودہ درانی بھی اسی طاقتور قوم کی نسل سے ہیں۔ سیاہ پوش کافروں میں یہ بات مشہور ہے کہ انہیں اودالوں نے میدان سے بھگا کر پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ یہ لوگ اب بھی میدانوں میں رہنے والوں کو اودال کے نام سے پکارتے ہیں۔

صوتی اعتبار سے افتھالی کا بدل کر اودال ہوجانا قرین قیاس ہے لیکن اس رشتہ کو ثابت کرنے کے لئے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ بہرحال ابدالیوں کی ابتدا ابھی تک مخفی ہے اور وہ سترھویں صدی میں شاہ عباس کے زمانہ سے پہلے منظر عام پر نہیں آئے۔

حقیقت حال خواہ کچھ بھی ہو اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے چھٹی

صدی کے آخر میں ایسے قبیلوں کا گروہ منظر عام پر آتا ہے جو پس منظر اور زبان کے اعتبار سے ایرانی تھے لیکن جس میں بعد میں آنے والے گروہ بھی شامل ہو گئے تھے اور ان کی بالائی تہہ ہنوں کی فتوحات سے قائم ہوئی تھی اور جس کا تاریخی مرکز گندھارا یا وادی پشاور تھا بعد میں آنے والے سفید ہن میدانوں پر قبضہ کرتے ہوئے دور تک ہندوستان میں اتر گئے اور مقامی باشندوں کو دشوار گزار پہاڑیوں میں دھکیل گئے قبیلوں کے اس ڈھانچہ کی جھلک نسب‌ناموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اب اس گتھی کے سلجھانے کا وقت آگیا ہے کیونکہ اب ہم ہجری عہد میں داخل ہو رہے ہیں جو افغان وقائع نگاروں کے قول کے مطابق آفتاب رسالت کے طلوع کا زمانہ ہے۔

فصل ہفتم

عربوں کی فتوحات

ساسانی عہد میں ایران نے ۵۶۸ عیسوی میں ترکوں کی مدد سے افتھالیوں یا ھیتال کو شکست دے دی اس کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبہ دریائے سندھ تک اور گندھارا سمیت ایک بار پھر ساسانیوں کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ دارائے اعظم کے زمانہ سے آئندہ گیارہ صدی تک یکے بعد دیگرے اخامنشی پارتھی اور ساسانی حکمرانوں کے عہد میں اور پھر باختری ساکا اور کشانوں کے زمانہ میں بھی جنھیں ایرانی النسل سمجھا جاتا ہے یہ علاقہ ھندوستان کی طرف ایران کی بیرونی چوکی تھا۔ ماضی قریب میں اور اوپر شمال کی طرف سے وحشی افتھالیوں نے اس علاقہ کو تاراج کیا اپنے پیش رو حملہ آوروں کی طرح افتھالیوں نے بھی وہ عہد جو ان کے لئے مقدر ہو چکا تھا پورا کیا اور دوسرے بادشاھوں کی طرح گزر گئے لیکن انھوں نے یہاں کی آبادی پر گہرا اثر چھوڑا۔ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ خود ان افتھالیوں نے ایرانی اثر قبول کر لیا تھا اور وہ لوگوں پر اپنی زبان نہیں تھوپ سکے۔

ظہور اسلام سے پہلے اس علاقہ کی ایک ہزار سال تک دنیائے ایران میں شمولیت بڑا اھم تاریخی واقعہ ہے۔ ایرانی تہذیب اسلامی اور مسیحی اثرات سے کہیں پرانی ہے اور اس کے علاوہ بڑی پائدار تہذیب ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب اسلام اناطولیہ سے آمودریا اور وادی سندھ تک پھیلے ہوئے غیر عرب ملکوں میں پہنچا تو اسے ایرانی اثرات کے سانچہ سے گزرنا پڑا۔ اسلام نے ان شمالی علاقوں پر تسلط جمالیا لیکن انھیں ضم نہیں کر سکا بلکہ یہ کہنا حقیقت سے زیادہ قریب ھوگا

کہ خراسان سے جس قدیم ثقافت کی کرن پھوٹی تھی اور جو بادیہ نشینوں کی تہذیب نہیں تھی اس نے نئی فکر کو آزمانے ہوئے سانچوں میں ڈھال دیا پشاور کے ارد گرد جو ایرانی روح اور ماحول طاری ہے وہ اسلام سے کہیں پہلے کے اثرات کا عطیہ ہے یہ وہ اثرات ہیں جو ایک ہزار سال سے زائد عرصہ میں بہت سے بادشاہوں او بہت سے درباروں نے پیدا کئے تھے۔

لیکن یہ علاقہ مشرق کی طرف ایرانی سرحد رہا تھا اور اس حیثیت سے اس پر ہندوستانی اثرات بھی برابر پڑتے رہے تھے۔ اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں ایک صدی تک یعنی اسکندر کے ورود کے بعد کی صدی میں یہ علاقہ ہندوستان کی موریہ سلطنت (۱۹۰-۳۰۳ قبل مسیح) کا حصہ رہا تھا اور بودھ مت کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ اس کے بعد دوسری صدی عیسوی میں کشان حکمران کنشک نے بودھ مت میں نئی روح پھونک دی اور بودھ احیاء کا باعث بنا جس کی بدولت نہ صرف گندھارا آرٹ وجود میں آیا بلکہ مہایانا یعنی بودھ کو خدا کا اوتار ماننے کا عقیدہ بھی اسی کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اور جیسا کہ واسو دیوا نام سے ظاہر ہوتا ہے کشان خاندان کے آخری حکمران نے برھمنیت کے آگے سر جھکادیا تھا۔ شاید ہندوستانی اثرات کی طرف اسی مراجعت نے پہلے ساسانی بادشاہوں اردشیر اور شاپور کو اس بات پر اکسایا ہوگا کہ وہ اس علاقہ پر ایران کی بالادستی ثابت کریں اور فارسی نظریات رائج کریں۔ اور اس طرح بعد میں آنے والے ابتدائی مسلمانوں کے جذبۂ تبلیغ کے لئے راستہ ہموار کریں۔

چھٹی صدی کے آخر میں ایسا معلوم ہوتاتھا کہ فارسی اثرات بڑی کامیابی کے ساتھ پھر مسلط ہوگئے ہیں ۵۶۸ میں خسرو انوشیرواں کے ہاتھوں افتھالی طاقت کے خاتمہ کے بعد خسرو دوئم (۵۹۰-۶۲۸) کے عہد میں ایک اور کامیابی ہوئی جو بظاہر پہلی کامیابی سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ خسرو دوئم نے الظاکیہ دمشق اور بیت المقدس پر قبضہ کرلیا مصر پر پے در پے چڑھائی کی اور شمال میں انقرہ (انکیرہ) فتح کرلیا یہاں تک کہ وہ بازنطینہ کے سامنے باس فورس تک پہنچ گیا اس حکمراں کے دور میں ایرانی سلطنت کے لئے اخامنشی عظمت کا دور پلٹ آیا اور بازنطینی روم کی نظر میں یہ سلطنت ایسی ھٹوا بن گئی ہوگی جیسے دارا یا کیخسرو یونانیوں کے لئے بن گیا تھا۔

لیکن بجھنے سے پہلے یہ شمع کا آخری سنبھالا تھا۔ ہرقل کی قیادت میں بازنطینی ایک زبردست جوابی حملہ میں کامیاب ہوگئے۔ ایشیائے کوچک اور آرمینا نے اپنی گردن سے ایران کی غلامی کا جوا اتار پھینکا اور وقت آنے پر ہرقل ایران کے سرمائی صدر مقام سائفان کے سامنے پہنچ گیا۔ خسرو دوئم کو شکست ہوئی اور اسے اسی کے بیٹے نے قتل کر دیا جو ایک باز نطینی شہزادی کے بطن سے تھا۔ اس واقعہ کا سن ۶۲۸ عیسوی یا ۶ ہجری یعنی پیغمبر اسلام (ص) کی وفات سے چار سال پہلے ہے۔

اس لڑائی نے ساسانی ایران کی بنیادیں ہلادیں۔ خسرو دویم کی وفات سے لے کر آخری ساسانی بادشاہ یزد گرد سویم کے تخت نشین ہونے تک کے درمیانی چودہ سال کے عرصہ میں یکے بعد دیگرے بارہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ فوج قابو سے باہر ہوگئی اور شہزادے شطرنج کے مہرے بن گئے انہیں تخت پر بٹھایا جاتا تھا اور قتل کردیا جاتا تھا۔ فوجی لیڈروں نے تخت حاصل کرنے کی کوشش کی اور قریب قریب تمام ساسانیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ جب کبھی نئے بادشاہ کی ضرورت پڑتی تھی تو شاہی خاندان کے کسی شہزادے کو پردۂ اخفا سے ڈھونڈ نکال کر اصطخر لایا جاتا تھا۔ لیکن یہ اقدام بعد از وقت تھا۔ سپہ سالاروں نے اخامنشیوں کے آخری عہد کے مطلق العنان گورنروں کا سا رویہ اختیار کرلیا۔ سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ جب چند سال بعد عربوں نے حملہ کیا تو ایران میں کوئی ایسی موثر تنظیم نہیں تھی جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ عرب طوفان بڑھتا ہی چلا گیا۔ شام میں شکستوں کے بعد سائفان بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اور ۶۴۲ء مطابق ۲۱ ہجری میں تہران کے جنوب میں نہاوند کے میدان میں عربوں کو قطعی فتح نصیب ہوئی یزد گرد اپنے پیش رو داراکی طرح مشرق کی طرف بھاگا اور ۶۵۱ء میں مرو کے قریب اسے موت نے آگھیرا۔

مغربی اور مشرقی ایران کی سر زمین پر عرب ترک اور منگول فاتحوں کی حیثیت سے قابض رہے اور کئی صدیوں کے بعد یہ ملک ایک بار پھر ایسے حکمرانوں کے زیر نگین آیا جو غیر ملکی نہیں تھے لیکن جو قدیم ایرانی ثقافت گزشتہ ایک ہزار سال میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ چکی تھی اپنی جگہ قائم رہی اور اس نے اپنے فاتحوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ سندھ

اور آمو دریا کی وادیوں میں اسلام کے ظہور کا اسی پس منظر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہئے۔ ایران اپنے فاتحوں کو مسخر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

سر زمین ایران پر ایرانی سلطنت کا جو حشر ہوا اس کے مقابلہ میں ایک حیثیت سے سرحدی علاقوں پر ساسانیوں کے زوال کا اثر اس سے بھی زیاد گہرا اور یقینی طور پر زیادہ پیچیدہ تھا۔ اس صورت حال کی تفصیل واضح نہیں ہے اس لئے کہ عرب مصنف شکستوں کا حال تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرتے یا جن علاقوں میں عربوں کی پیش قدمی کی مزاحمت کی گئی یا جہاں عرب دشوار گزار علاقوں سے بچ کر نکل گئے ان علاقوں کی تفصیل نایاب ہے۔ ظہور اسلام کے بعد ہماری توقع یہ ہوگی کہ تاریخی وسائل بہت بڑھ گئے ہوں گے اور واقعات کی تصویر واضح ہوگئی ہوگی۔ لیکن یہ توقع خیال خام ثابت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سفید ہنوں کے خاتمہ اور سبکتگین کے زیر قیادت غزنویوں کے عروج کے درمیان کی چار صدیاں صوبہ سرحد کے تاریک ترین زمانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس عہد کے متعلق جو مواد ملتا ہے وہ یا تو سکوں کی شکل میں ہے یا اصل تصانیف کے حواشی کی شکل میں ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی واضح بیانات شاذ و نادر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام خیال کے برعکس اور پٹھانوں کی روایات کے قطعاً خلاف اس علاقہ میں اسلام کے پھیلنے مین چار سو سال کی تاخیر ہوئی اور اس پہاڑی علاقہ میں بھی جو اب افغانستان کہلاتا ہے اسلام بڑی سست رفتاری کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر پھیلا۔ جب ابتدائی صدیوں میں عرب وادی کابل میں داخل ہوئے اور وادی سندھ کی طرف بڑھے تو ان کی حیثیت محض وقتی حملہ آوروں کی تھی جو مقامی امیروں سے لڑنے آئے تھے۔ ان امیروں کو یا تو کافر بنایا جاتا ہے یا واضح طور پر ہندو قرار دے دیا جاتا ہے۔ نویں صدی کے آخر تک مسلمانوں نے کابل بھی فتح نہیں کیا تھا۔ جہاں تک گندھارا اور دریائے سندھ کے کنارے کے میدانی اضلاع کا تعلق ہے وہ گیارھویں صدی کے آغاز میں محمود غزنوی کے عہد تک ہندو شاہی خاندان کے زیر نگین تھے۔ ونسنٹ سمتھ اس عہد کے واقعات کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سفید ہنوں کے بعد پانچسو سال تک ہندوستان پر کوئی موثر حملہ نہیں ہوا۔ اس حقیقت میں بھی ایک استثنا ہے اور وہ یہ ہے آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں عربوں کے ہاتھوں سندھ کی فتح۔ لیکن یہ بات موجودہ قصہ سے الگ ہے۔

اسلامی فتوحات کے متعلق جو تحریریں ملتی ھیں ان میں واقعات کا خلاصہ ایسے سطحی انداز میں بیان کیا گیا ھے۔ جو قطعی گمراہ کن ھے مثال کے طور پر اس وقت میرے سامنے جو کتاب ھے اس میں موجودہ افغانستان کے متعلق لکھا ھے کہ وہ ۶۶۱ء اور ۷۴۹ء کے درمیان بنوامیّہ اور مقامی سرداروں کے درمیان تقسیم ھوگیا تھا اس کے بعد ۸۶۹ء تک یہ علاقہ کسی نہ کسی طرح عباسیوں کے زیر نگیں رھا پھر اس پر صفاریوں کا قبضہ ھوگیا۔ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ھے کہ افغانستان میں بہت پہلے اسلام پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ ھمیں آگے چل کر معلوم ھوگا۔ گندھارا تو درکنار افغانستان کے بارے میں بھی یہ دعویٰ صحیح نہیں ھے۔ در حقیقت وہ مختلف مسلم حکمراں خاندان جو محمود غزنوی کے دور کے آغاز تک اس بات کے دعویدار تھے کہ مشرقی ایرانی صوبے ان کے مطیع ھیں ان کے مقابلہ میں مشرق اور شمال مشرق کے مقامی امیروں کا تسلط زیادہ مضبوط اور زیادہ طویل تھا۔ یہ امیر مسلمان نہیں تھے۔ اس وقت بھی جبکہ ھم محمود غزنوی کے عہد میں داخل ھوتے ھیں یعنی گیارھویں صدی میں جبکہ ظہور اسلام کو چار سو سال گزر چکے تھے افغان جن کا تذکرہ واضح طور پر تحریروں میں آنے لگا تھا سب کے سب مسلمان نہیں تھے۔ مختصر یہ کہ اصل تصویر نسب نامے بیان کرنے والوں کی اس تصویر سے بالکل مختلف ھے جس میں یہ ظاھر کیا گیا ھے کہ پوری افغان قوم رسول اکرم (ص) کی حیات میں مشرف بہ اسلام ھوگئی تھی۔ تسلی کے لئے یہ بات سمجھ لینی چاھئے کہ ایسا بہت کم ھوتا ھے کہ جو سب سے پہلے ایمان لے آئیں ان ھی کا ایمان پختہ ھو۔

ظہور اسلام کے بعد گندھارا کی سیاحت کرنے والا سب سے پہلا معتبر اور مستند شخص جس کی تحریر دستیاب ھے چینی سیاح ھیان سانگ ھے جس نے ۶۴۴ء میں پشاور اور سوات کا دورہ کیا اور بودھ مت کو زوال پذیر اور برھمنیت کو عروج پر دیکھا۔ ھیان سانگ نے یہ دورہ نہاوند کے مقام پر ساسانی ایران پر عرب فوجوں کی فیصلہ کن فتح سے دو سال بعد کیا تھا لیکن اس کے سفر نامے میں اس نئے مذھب کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ ساسانی سلطنت کے مشرقی علاقوں میں صرف اتنا ھوا تھا کہ مرکزی ایرانی اقتدار ختم ھونے پر ھندوستان کی طرف سے برھمنیت نے اپنا حق جتانا شروع کردیا تھا۔ اور یہی وجہ ھے کہ

ھمیں آئندہ چار صدیوں کے واقعات سے اتنی کم واقفیت حاصل ھے۔ ھندو نہ تو تاریخ لکھتے تھے نہ اھم واقعات قلم بند کرتے تھے۔ لاچار ھمیں سکوں کا سہارا لینا پڑتا ھے اور کمی پوری کرنے کے لئے اس علاقہ پر اکا دکا حملوں کے متعلق ابتدائی عرب وقائع نگاروں کی تحریریں چھاننی پڑتی ھیں۔

ایران میں ساسانیوں کا مرکزی نظم و نسق تباہ کرنے کے بعد عرب مشرقی اور شمال مشرقی ایرانی صوبوں پر فتح پانے کے لئے کرمان کے راستے دو محوروں پر فارس سے آگے بڑھے۔ پہلا محور نیشاپور کے راستے ھرات، مرو اور بلخ (باختر) اور دوسرا سیستان کے راستے جو اس وقت سجستان کہلاتا تھا ھلمند اور بست تک تھا۔ بست، ھلمند اور ارگنداب کے سنگھم پر واقع تھا اور آج کل کھنڈر ھے۔ قندھار شہر کا کسی قدیم مصنف کی تحریر میں تذکرہ نہیں آتا۔ اس کے متعلق یہ تحقیق ھے کہ اس شہر کی بنیاد بعد میں رکھی گئی۔ میں عربوں کی پیش قدمی کے دونوں راستے الگ الگ بیان کروں گا۔

پہلا محور کبھی ھندوکش کی بڑی فصیل کے جنوب میں نہیں پہنچا۔ کابل اور مرکزی افغانستان کا پہاڑی سلسلہ جو اب ھزارہ‌جات کہلاتا ھے اور ان دنوں غور کہلاتا تھا وہ اس حملہ سے صاف بچ گیا چونکہ عربوں کی اس پیش قدمی کے دوران ایرانی علاقے خراسان اور ماوراءالنہر فتح ھو گئے تھے اس لئے بعض مرتبہ غلطی سے یہ سمجھ لیا جاتا ھے کہ عرب اسی راستے سے وادی سندھ کے بالائی سرے پر پہنچے تھے۔ لیکن درحقیقت واقعات اس سے بالکل مختلف تھے۔

عبداللہ بن عمرو ایران میں کرمان کے مقام سے پیش قدمی کر کے دشت لوط کا صحرا عبور کرتا ھوا ایرانی خراسان میں داخل ھوا اور نیشاپور میں صدر مقام بنا کر ۶۵۰ء (۳۰ ھجری) میں یا اس کے فوراً بعد ھرات مرو اور بلخ پر قابض ھوگیا۔ پانچ سال کے بعد خلیفہ عثمان غنی(رض) شہید کر دئے گئے اور حضرت علی (رض) کی خلافت کے سوال پر عربوں میں خانہ جنگی شروع ھو گئی۔ حضرت علی (رض) نے خراسان میں اپنی نمائندگی کے لئے کئی گورنر بھیجے لیکن افراتفری جاری رھی یہاں تک

کہ معاویہ ۶۶۱ء (۴۱ ھجری) میں دمشق میں سلطنت بنی امیّہ قائم کرنے میں کامیاب ھوگئے۔ اس کے بعد بنی امیّہ کے بہت سے غیر ممتاز گورنر آئے۔ ان میں سے صرف چند ھی ایسے تھے جو ایک دو سال سے زیادہ عرصہ تک اس عہدہ پر فائز رھے ان سب کی نظریں آمو دریا کے پار کا علاقہ فتح کرنے پر لگی ھوئی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ھرات سے مشرق کی طرف یا بلخ سے جنوب کی طرف نہیں بڑھا۔ ۶۸۰ء (۶۱ ھجری) میں بنی امیّہ کے نمائندہ سلم اور عبداللہ ابن خازم میں چپقلش شروع ھوگئی جو دس سال جاری رھی۔ ابن خازم خلیفہ کے مخالف عبداللہ بن زبیر کا حامی تھا۔ خلافت کے لئے باھمی چشمک کا جو اثر خراسان پر پڑ رھا تھا ۶۸۵ء میں خلیفہ عبدالملک کے بر سر اقتدار آنے تک دور نہیں ھوا۔ اس خلیفہ کے عہد میں ابن خازم ۶۹۱ء میں مرو کے قریب ایک لڑائی میں کام آئے۔ ۷۰۵ء (۸۶ ھجری) میں ناقابل فراموش گورنر قتیبہ ابن مسلم کا تقرر عمل میں آیا انھوں نے خوارزم اور سمرقند تک ماوراءالنہر کا علاقہ فتح کرلیا۔ لیکن ۷۱۴ء (۹۶ ھجری) میں خلیفہ سلیمان کے بر سر اقتدار آنے پر انھیں بھی برے دن دیکھنے پڑے۔ وہ سلیمان کے خلیفہ بننے سے پہلے ان کے ذاتی دشمن تھے اور انھوں نے بغاوت کی سازش کی تھی لیکن ان کی عرب فوج ان کے خلاف اٹھ کھڑی ھوئی اور وہ ۷۱۵ء (۹۷ ھجری) میں قتل کر دئے گئے۔ ان کے تمام جانشین سریع‌الزوال ثابت ھوئے یہاں تک کہ ۷۵۰ء (۱۳۳ ھجری) میں خلافت امیّہ کی جگہ خلافت عباسیہ قائم ھوگئی۔

شمالی محور پر عربوں نے خراسان بلخ اور ماوراءالنہر فتح کر لئے لیکن ان فتوحات کا ھمارے علاقہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ھے۔ البتہ کوہ سلیمان اور وادی سندھ کے علاقوں پر اتنا اثر ضرور ھوا کہ عربوں نے شمال میں ایک مسلم مرکز قائم کر کے ترک سرداروں، غلاموں اور سپاھیوں کے لئے، جنھوں نے مغلوں کے دور تک تاریخ ھند میں بہت بڑا کردار ادا کیا ھے، راستہ ھموار کردیا۔ ساسانیوں کے عہد میں، جو بلخ کا ایک ایرانی خاندان تھا اور مشرف بہ اسلام ھوگیا تھا، آمو دریا کے علاقہ پر عباسی سلطنت کا جانشین ھوا اور تیسری اور چوتھی صدی ھجری میں (۸۷۴-۹۹۹ء) حکمراں رھا اسی عہد میں ترک غلاموں نے غزنوی خاندان کی بنیاد ڈالی جو سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود کے زمانہ میں پنجاب پر مسلمانوں کے حملہ اور قبضہ کا سبب بنا۔ لیکن یہ واقعات صدیوں بعد رونما ھوئے۔

کوہ سلیمان کے کسی علاقہ کا تو ذکر ہی کیا عرب پوری طرح کابل یا غزنی کو بھی زیر نگیں نہیں لا سکتے تھے۔

عربوں کی کمان میں سندھ میں جو پیش قدمی ہوئی وہ سیستان کے راستے دوسرے محور کے ذریعہ ہوئی۔ لیکن ان پیش قدمیوں کو صرف حملے ہی کہا جا سکتا ہے اگر چہ بعض حملے خاصے شدید اور بڑے پیمانے پر کئے گئے۔

جب عبداللہ بن عمر فارس سے خراسان جاتے ہوئے کرمان پہنچے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے انہوں نے الربی بن زیاد کی قیادت میں ایک فوجی دستہ سجستان سے لڑائی کے لئے بھیجا۔ ۶۵۱ عیسوی (۳۱ ھجری) میں بن زیاد زرنج میں داخل ہوئے جو ہلمند کے کنارے اس مقام پر واقع ہے جہاں یہ دریا تنگ گھاٹی کے نکل کر میدان میں آتا ہے اس وقت زرنج اس علاقہ کا بڑا شہر تھا۔ یہاں انہوں نے اپنا صدر مقام اس جگہ قائم کیا جس کا نام اخامنشی کتبوں میں زرنکا درج ہے اور جو بعد میں غزنوی سلطنت کے مغربی حصہ کا بالا حصار بنا۔ یہ جگہ افغان سر زمین پر بالکل سرحد کے قریب اس مقام پر ہے جو اب نادعلی کہلاتا ہے اور ہلمند کے دھانے پر واقع ہے۔

دو سال کے بعد ابن زیاد کو برطرف کردیا گیا اور عرب فتوحات متزلزل ہوگئیں۔ عراق میں حضرت علی (رض) کی خلافت کے سوال پر جھگڑا پیدا ہو جانے کی وجہ سے خراسان جیسے نئے صوبوں میں غیر یقینی حالات پیدا ہوگئے۔ ۶۶۱ عیسوی (۱۴ ھجری) میں معاویہ کے زیر قیادت خلافت امیّہ کے قیام کے ساتھ ایک قابل ذکر کامیابی ہوئی۔ نئے گورنر عبدالرحمان بن سمورہ نے بست اور زمین‌داور فتح کر لئے۔ بست اس زمانہ میں ہلمند اور ارگنداب کے سنگھم پر ایک بڑا شہر تھا اور زمین‌داور غور کے پہاڑی سلسلہ کے جنوبی حصہ میں بست(۱) سے شمال میں ایک زرخیز اور وسیع وادی تھی۔ زرنج کی طرح بست بھی آج کل کھنڈر ہے اور اس کی جگہ پچیس میل کے فاصلہ پر گرشک آباد کیا گیا ہے لیکن زمین‌داور آج بھی اسی طرح ابدالیوں (درانیوں) کی سر زمین ہے جس طرح وادی پشاور کا شمالی

---

(۱) جس جگہ بست آباد تھا وہاں حال ہی میں کھدائی سے بڑی دلچسپ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

علاقه یوسف زئیوں کی سر زمین ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اس مرحلہ پر اور اس کے بعد ایک ہزار سال تک عظیم قبیلہ ابدالی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

بست فتح کرنے کے بعد ابن سمورہ اور ان کے جانشین ابن زیاد (جو ان کے پیش رو بھی تھے) زابل، کابل اور الرخج پر چڑھائی کے لئے مہمات بھیجتے رہے۔ کابل کا تو ہمیں علم ہے۔ الرخج قریب قریب کلاسیکی اراکوسیا پر حاوی ہوتا ہے اور قندھار صوبہ پر مشتمل ہے۔ زابل سے مختلف علاقے مراد لئے گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نام سے ابتدائی عرب وقائع نگاروں کی مراد وہ علاقہ تھا جو اب ہلمند اور ارگنداب اور ترناک دریاؤں کے درمیان ہزارہ جات کہلاتا ہے۔ لیکن بابر زابل کو غزنی کے جنوب میں مکڑ کا علاقہ قرار دیتا ہے۔ اس زمانہ میں دو حکمران تھے جن سے سجستان کے عرب جنگ آزمائی کر رہے تھے۔ ایک تو رتبیل یا زنبیل (۱) کے خاندانی نام سے مشہور تھا اور دوسرا کابل شاہ کہلاتا تھا۔ واضح طور پر یہ دونوں حکمران کافر تھے اور انہوں نے اطاعت قبول نہیں کی البتہ عرب وقائع نگاروں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مقابلہ پر کچھ عارضی کامیابی ضرور ہوئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ابن سمورہ لڑتے بھڑتے ۶۶۳ء مطابق ۴۳ ہجری میں کابل میں داخل ہوگئے لیکن تین سال بعد ابن زیاد نے زرنج پہنچ کر یہ دیکھا کہ کابل شاہ اور رتبیل نے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کر دیا تھا اور بست تک ملک کے جنوبی علاقہ پر قابض تھے۔ اس کے بعد رتبیل سے متعدد لڑائیاں ہوئیں جن کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر ایک عارضی صلح نامہ ہوا۔ ۶۶۴ء (۴۴ ہجری) میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو اس پورے خشک بیان میں ہمارے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہے۔ اس سال المہلب بن ابی صفرہ نے جو ابن سمورہ کا نائب تھا الملتان اور کابل کے درمیان بناہ اور الاہوار پر حملہ کیا۔ ان مقامات پر اٹھارہ ترک شہسواروں نے اس پر حملہ کیا تھا۔

(۱) اس لفظ کی اصل شکل متعین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ عربی عبارت میں نقطے عام طور پر صحیح جگہ نہیں لگائے جاتے۔ ریورٹی کا خیال ہے کہ یہ ہندی کے رتن پال یا رتھپل کی عربی شکل ہے۔ وارتھر سٹر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ رتبیل یقیناً مسلمان نہیں تھا۔

مسلمان مصنفوں کی کسی تحریر میں صوبہ سرحد کے ان مقامات کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو آج بھی شناخت کئے جا سکتے ہیں۔ ہم جلد بازی سے کام لے کر بنّاہ کو بنوں قرار نہیں دیں گے جو براہ راست ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہے اور پشاور کے بعد سلسلہ کوہ سلیمان کے نیچے سب سے زرخیز علاقہ ہے اور لوٹ مار کے لئے موزوں ترین ہے الاہوار اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔

البلاذری کے ایک قلمی نسخے میں الاہوار کی جگہ لاہور لکھا ہے۔ عربی رسم الخط میں یہ فرق معمولی سا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اشارہ اس جگہ کی طرف ہے جو پشاور کے یوسف زئی سمہ میں ہنڈ کے آس پاس موجودہ گاؤں لاہور (۱) کے نزدیک واقع ہے۔ یہ گاؤں جس سے میں اچھی طرح واقف ہوں ہنڈ کے مقام پر دریائے سندھ کے گھاٹ سے چار میل اندر کی طرف واقع ہے اور اس کے چاروں طرف پانچ بڑے بڑے ٹیلے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹیلہ پچاس فٹ اونچا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور سے آگے دوسرے گاؤں جاسئی سے دو میل جنوب میں چار پانچ ٹیلے اور ہیں جو قریب قریب اتنے ہی بڑے ہیں۔ یقینی طور پر یہی وہ جگہ ہے جس پر عربوں نے حملہ کیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ جگہ وادی پشاور کے راستے کابل سے ملتان جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتہ نے اپنی تاریخ کے دیباچہ میں جس لاہور کو ہندو شاہیہ جے پال کا دارالحکومت بتایا ہے وہ پنجاب کا شہر نہیں ہے بلکہ یہی لاہور ہے۔ (جے پال کو محمود غزنوی نے شکست دی تھی) اور یہ کہ او ہند یا وے ہند جہاں ایک زمانہ میں ہندو شاہی منتقل ہوگئے تھے موجودہ ہنڈ کا نام نہیں تھا۔ ہنڈ دریا کے بالکل کنارے ایک چھوٹے سے قلعہ میں تعمیر کیا گیا ہے۔

---

(۱) ریورٹی نے اپنی کتاب (NOTES ON AFGHANISTAN) میں ایک طویل عبارت میں اس نظریہ کا مذاق اڑایا ہے کہ یہ مقام لاہور ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ مقام اھواز ہونا چاہئے جو خوزستان میں بصرہ کے قریب واقع ہے۔ انھوں نے یہ بھی دلیل پیش کی ہے کہ مہلب مغربی پاکستان کے موجودہ صدر مقام لاہور تک پیش قدمی نہیں کر سکتا تھا۔ بظاہر انھیں یہ معلوم ھی نہیں تھا کہ گندھارا میں دریائے سندھ کے قریب لاہور نام کا ایک گاؤں واقع ہے۔

یہ جگہ ایسی غیر محفوظ ہے کہ یہ کبھی دارالحکومت نہیں رہی ہوگی البتہ گھاٹ کی حفاظت کے لئے یہ مضبوط مورچہ کا کام ضرور دیتی ہوگی یہاں ایسے ٹیلے نہیں ہیں جنہیں کسی پرانے شہر کے کھنڈر سمجھا جاسکے۔ دارالحکومت کسی ایسی جگہ پر واقع ہوگا جو سیلاب سے محفوظ ہو اور یہ جگہ چار میل اندر کی طرف وہیں ہو سکتی ہے جہاں لاہور گاؤں کے آس پاس اونچے اونچے ٹیلے ہیں۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ دریائے راوی کے کنارے بسائے جانے والے بڑے شہر کا نام اسی گاؤں پر رکھا گیا جو سندھ کے کنارے واقع تھا اور اب غیر معروف ہے۔

لاہور کے اٹھارہ ترک شہسوار ھنڈ اور زیدہ کے موجودہ خوانین کے افتہالی اسلاف یعنی ھیتال ہونگے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس مقام پر قاعدہ کے ساتھ کھدائی کی جائے تو اس عہد کے متعلق ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

چند سال بعد سجستان کے ایک اور عرب گورنر عباد بن زیاد نے الہند کی سرحد پر حملہ کیا اور صحرا عبور کر کے القندھار پہنچ گیا جہاں کے مقامی باشندے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے لیکن حملہ آوروں میں سے بھی بہت سے ہلاک اور زخمی ہوئے۔ یہ واقعہ ۶۷۲ء (۵۳ ہجری) کا ہے۔ یہ قندھار اس نام کا آج کل کا شہر قندھار نہیں ہے کیونکہ اس وقت اس شہر کا نام نہیں تھا۔ بلکہ قندھار سے مراد گندھارا ہے۔ یہ حقیقت گیارھویں صدی میں محمود غزنوی کے عہد کے مورخ البیرونی کی بعد کی تحریروں سے واضح ہوتی ہے۔ البیرونی ہندو بادشاہوں کا تذکرہ کرتا ہے جو کابل اور قندھار پر حکومت کرتے تھے اور جن کا دارالحکومت وائے ہند تھا (موجودہ ھنڈ یا جیسے کہ میں نے خیال ظاہر کیا ہے ھنڈ کے قریب کا مقام لاہور)۔ عرب مصنفوں کی تحریر میں جس قدیم قندھار کا ذکر آتا ہے اس کی شناخت البیرونی کی ایک اور عبارت سے بھی ہوتی ہے پنجاب سے کابل تک ایک سیاحت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ''اور دریائے بیاتا (دریائے جہلم) کے مغرب میں جہلم تک کا فاصلہ آٹھ فرسخ اور دریائے سندھ کے مغرب میں وائے ہند تک جو قندھار کا دارالحکومت ہے بیس فرسخ کا فاصلہ اور پورشاور (پشاور) تک چودہ فرسخ کا فاصلہ ہے''۔ قندھار یعنی وادی پشاور میں یہ ابتدائی داخلہ محض وقتی حملہ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی کوئی مستقل اہمیت نہ تھی۔

تھوڑے عرصہ بعد سہ طرفہ خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں دمشق کے امیہ خلیفہ، عرب اور عراق کے زبیری اور خارجی جو ایک عرصہ تک خلیج فارس کے دونوں ساحلوں پر قابض رہے، فریق تھے۔ اس خانہ جنگی میں سب ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خارجیوں اور زبیریوں نے مل کر خلیفہ کے خلاف محاذ بنا لیا تھا۔ اس جنگ میں ایک طرف کے آدمی دوسری طرف جا ملتے تھے یہاں تک کہ ایک جماعت کے معتبر اپنے سردار کے خلاف بغاوت کر دیتے تھے۔ اس عرصہ میں جو غالباً ۶۸۵ء (۶۶ ھجری) سے ۷۵۰ء (۱۳۳ ھجری) میں خلافت امیّہ کے خاتمہ تک قائم رہا سب خلفاء کی توجہ جن میں خلیفہ اعظم عبدالملک (۶۸۵-۷۰۵ء) بھی شامل تھے حریف دعویداروں کے ھاتھوں خاندانی اقتدار بچانے کی طرف لگی رہی اس عرصہ میں سجستان کے مشرق میں کسی منصوبہ کے تحت اسلامی اقتدار پھیلانے کا سوال ھی پیدا نہیں ہوا۔ ۶۸۵ء میں رتبیل یا رنتھیل اتنا طاقتور ھے کہ وہ عرب گورنر کا اقتدار صرف زرنج کے قلعہ تک محدود کر دیتا ھے۔ یہ رتبیل مارا جاتا ھے لیکن اس کی جگہ اسی لقب کا ایک اور شخص بر سر اقتدار آجاتا ھے جو اپنے پیش رو کی طرح طاقتور ھے۔ اس کے ھاتھوں سجستان کے ایک گورنر کو شکست ھوئی جسے بعد میں عبدالملک نے برطرف کر دیا۔ ایک اور شخص عبیداللہ نے ۶۹۸ء (۷۹ ھجری) میں کابل پر حملہ کیا لیکن یہ حملہ ناکام ھوگیا اور وہ خود بھی مارا گیا۔ اگلے سال عبدالرحمان بن محمد نے اس کی جگہ سنبھالی۔ عبدالرحمان کو ابتدا میں رتبیل کے مقابلہ پر کچھ کامیابی ھوئی لیکن وہ اپنے حاکم اعلیٰ الحجاج سے لڑ بیٹھا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ عام طور یہ کہا جاتا ھے کہ عبدالرحمان نے ۶۹۹ء میں کابل فتح کرلیا۔ واقعہ یہ ھوا کہ الحجاج کے خلاف بغاوت کرنے اور اس کے ھاتھوں شکست کھانے کے بعد عبدالرحمان کابل میں رتبیل کی پناہ لینے پر مجبور ھوگیا لیکن رتبیل نے الحجاج کے مطالبہ پر ۷۰۴ء (۸۵ ھجری) میں اسے قتل کردیا۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ الحجاج کچھ عرصہ تک رتبیل سے غیر معینہ خراج لیتا رہا لیکن حجاج اس کے خلاف کوئی فیصلہ کن مہم نہیں چلا سکا۔ خلیفہ عبدالملک کی وفات کے بعد بنوامیہ کی طاقت بتدریج کم ھوتی گئی اور خلافت کی طرف سے بعد میں جو گورنر مقرر کئے گئے انہیں خود زرنج پر قابض رہنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔

بغداد کے عباسی خلفاء بھی اس سلسلے میں اگر اپنے پیش رو امیہ خلفا کے مقابلہ میں کم نہیں تو زیادہ کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکے۔ المامون کے عہد میں جو ۸۱۳ء (۱۹۸ ھجری) میں خلیفہ بنا تھا ھمیں پتہ چلتا ھے کہ سجستان پر اس وقت تک مسلمانوں کا قبضہ نہیں ھوا تھا حال آنکہ اس سے پہلے کی تحریروں میں بتایا گیا ھے کہ المامون نے خلیفہ بننے سے پہلے خراسان کے گورنر کی حیثیت سے شمال سے ھندو کش کے پار کابل تک ڈاک کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ لیکن کابل شاہ اپنی جگہ جمے رھے اور نویں صدی میں صفاریوں کے عروج تک اس علاقہ میں مسلمانوں کو موثر اور براہ راست حکومت نصیب نہیں ھوئی۔

میں نے مسلمانوں کی تصانیف سے یہ خشک بیان یہ ثابت کرنے کے لئے نقل کیا ھے کہ یہ سمجھ لینا کس قدر غلط ھے کہ گندھارا اور آس پاس کے پہاڑی علاقوں کے باشندے اسلامی عہد کے آغاز ھی میں اسلام کے حلقہ بگوش ھو گئے تھے۔ اس کے بر عکس عام صورت حال یہ ھے کہ ابتدائی دو اسلامی صدیوں میں سندھ کو چھوڑ کر ساسانی سلطنت کے سابقہ مشرقی صوبوں میں کہیں بھی عربوں کو موثر اقتدار حاصل نہیں ھوا تھا ھندو کش کے صوبے میں عرب سرحد کبھی ھرات اور بست سے آگے نہیں بڑھی اور اس علاقہ میں بھی بڑی بڑی شاھراھوں تک محدود رھی۔ یہ سرحدیں بھی غیر واضح تھیں اور جا بجا مداخلت کا شکار تھیں۔ زابستان اور کابل میں جہاں عربوں کا داخلہ وقتی حملے یا خراج کی وصولی تک محدود تھا غیر مسلم حکمرانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں عملی طور پر اپنی آزادی برقرار رکھے ھوئے تھیں۔ ایسے سکے موجود ھیں جو یقینی طور پر ان ھی سلطنتوں سے تعلق رکھتے ھیں البتہ ان سکوں کی تحریروں کا مطلب تسلی بخش طریقہ سے نہیں نکالا گیا۔ عرب کابل کے علاقہ میں داخل ھوئے اور اس سے پہلے گندھارا میں لاھور کے قریب دریائے سندھ کے ساحل تک بھی پہنچے۔ انہوں نے ایک بار بنوں پر حملہ کیا۔ لیکن ھلمند کے مشرق میں وہ کسی علاقہ پر قبضہ نہ کر سکے۔ عرب جو دو سمتوں سے پیش قدمی کر رھے تھے یعنی شمال میں سمرقند کی طرف سے اور جنوب میں سجستان سے ھوتے ھوئے انہوں نے وسطی افغانستان اور ایک بڑی حد تک کابل غزنی کے علاقہ کو ھاتھ تک نہیں لگایا۔ ان علاقوں کے باشندے جنھیں کبھی ترک اور کبھی ھیتال قرار دیا جاتا ھے زیادہ سے زیادہ ذمی

تھے لیکن یقینی طور پر مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

کابل اور زابستان میں ایسے غیر مسلم بادشاہ موجود تھے جن کی فوجوں نے متعدد بار عربوں کے حملوں کو ناکام بنایا اور عرب گورنروں کو قید کر لیا۔ رتبیل زنبیل یا رنتھیل جس کا بار بار تذکرہ آتا ہے ایک معما بنا ہوا ہے مختلف مواقع پر اسے الرخج (موجودہ قندھار) زابستان (غزنی کے جنوب اور مغرب کا علاقہ) اور کابل کا بادشاہ قرار دیا جاتا ہے مسلم وقائع نگار اس علاقہ میں اپنے حریفوں کو ہمیشہ ترک یا ھیتال کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جیسا کہ ہمیں پہلے معلوم ہو چکا ہے ھیتال کا خلج کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ لامحالہ منطقی طور پر رتبیل کو اٹھارویں صدی کے خلجی وفاق کے لیڈر میرویس کا پیش رو قرار دینے کو جی چاہتا ہے۔

خود وادی کابل کے بالائی حصہ میں کوئی ایسی دستاویز یا قابل شناخت سکہ نہیں ملتا جس سے ثابت ہوسکے کہ در حقیقت وہ بادشاہ کون تھے جو ابتدائی دو اسلامی صدیوں میں اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے ونسنٹ سمتھ کا بیان ہے کہ ترکی شاہیہ حکمران جو کشانوں کی فوج کا حصہ تھے نویں صدی میں صفاریوں کے عروج تک کابل اور گندھارا دونوں پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا دارالحکومت کابل سے منتقل کرلیا جس پر ابتدائی صفاریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور دریائے سندھ کے کنارے وے ہند پہنچ گئے۔ یہ وہی جگہ ہے جسے میں نے گندھارا کا مقام لاھور قرار دیا ہے۔ یہاں وہ ہندو شاہیہ خاندان کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں جس کے متعلق ابھی کچھ اور کہنا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ان غیر مسلم حکمرانوں کا مذہب بودھ مت تھا لیکن انہوں نے تیزی کے ساتھ ہندو دھرم اختیار کرلیا۔ بامیان سے جو بت دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ تو ثابت ہوگیا ہے کہ کنشک کے عہد کے بعد بھی بڑے عرصہ تک ہندوکش کی وادیوں میں بودھ مت کا چرچا تھا لیکن عین ممکن ہے کہ موجودہ نیپال کی طرح اس علاقہ میں بھی برھمنیت کے مقابلہ پر بودھ مت جنگ مغلوبہ لڑ رہا ہو اور اس کے ماننے والوں کو بتدریج پہاڑوں کی طرف دھکیلا جا رہا ہو۔ ہمیں ھیان سانگ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے قریبی علاقوں

میں گندھارا کی طرح حاکم اور رعایا ۹۶۳ء ھی میں بڑی تیزی کے ساتھ ہندو دھرم اختیار کرتے جا رہے تھے غزنوی عہد (جس کی ابتدا ۹۶۰ء میں ہوئی) سے بہت پہلے کم از کم پشاور کے اطراف میں کٹر برھمنی ہندو دھرم کا بول بالا ہوگیا تھا۔

اس وقت سے پہلے جب مسلم حکمران مقامی ایرانی یا کشان خاندانوں کو جنھوں نے بودھ مت یا ہندو دھرم اختیار کرلیا تھا مغلوب کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے، مشرق کی طرف عربوں کے اثرات کے نفوذ کے ایک اہم پہلو پر توجہ دینا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ جب عرب طاقت اور اثرات سجستان اور بلخ سے بڑھ کر آگے پھیلے تو عربوں اور عراق شام اور ایران کے مسلمانوں کی بہت سی نو آبادیات یا تو مقامی آبادی کے ساتھ خود بس گئیں یا انہیں گورنروں نے بسادیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس علاقہ کے نو مسلم حجاز کے عربوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

بنی اسرائیل کے قصہ پر بحث کرتے ہوئے ہم نے سیّدوں اور دیگر خاندانوں کی موجودگی پر توجہ دی تھی جن کے ساتھ حال یا ماضی کا تقدس اور بزرگی وابستہ ہے۔ پورے سرحدی علاقہ میں یہ لوگ کافی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کم از کم پانچ سیّد خاندان پشاور میں آباد ہیں ایک اور مشہور سید خاندان یوسف زئی سمہ میں اسماعیلہ کے مقام پر ایک اور دوآبہ میں بٹگرام کے مقام پر ایک اور خاندان جو بنیر میں پیر بابا کے مزار سے وابستہ ہے ایک اور خاندان کوھاٹ کے قریب جرمان گاؤں میں اور ایک اور خاندان ڈیرہ جات کے شمال میں شیخ بدین کی پہاڑیوں سے نیچے پنیالہ کے مقام پر آباد ہے۔ سادات کی آبادی ان ھی خاندانوں تک محدود نہیں ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ تمام سادات حضرت فاطمہ زھرہ (رض) اور حضرت علی (رض) کے عقد کی وساطت سے پیغمبر اسلام حضرت محمد (ص) کی اولاد ھیں۔ یہ بات غیر یقینی ہے کہ کسی سید یا تمام سادات کا سلسلۂ نسب رسول اکرم صلعم سے جا ملتا ھو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ پیغمبر اسلام کی اولاد ھوں یا نہ ھوں لیکن ان عرب آبادکاروں اور مبلغوں کی اولاد ضرور ھیں جو ابتدائی اسلامی صدیوں میں اس علاقہ میں نئے دین کی تبلیغ کرنے اور مسلم فاتحوں کو پیش قدمی میں مدد دینے کے لئے آئے تھے۔

سادات کے علاوہ اور بھی خاندان ہیں مثلاً میاں، اخوندزادے، صاحبزادگان، قریش وغیرہ۔ جو مشہور و معروف مقدس ہستیوں کی نسل سے ہیں۔ قریش کے سوا جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ حضرت محمد صلعم کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ باقی ان سب کے اسلاف عرب تھے۔ اگر سب نہیں تو ان میں سے بہت سے لوگ ترک، ایرانی یا پٹھان نسل سے ہوں گے۔ ان میں سے جو لوگ عرب تھے وہ بھی جلد ہی عربی زبان بھول گئے البتہ انھیں اتنی عربی ضرور یاد رہ گئی کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کر سکیں۔ انھوں نے مقامی خاندانوں میں شادیاں کرلیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور یہ لوگ صحیح معنوں میں عوام کے ترجمان اور قائد بن گئے۔ اس علاقہ کی آبادی کی نسلوں میں ان لوگوں کا بھی اہم حصہ ہے۔ آج بھی ان لوگوں کا وقار اور احترام زندہ شکل میں موجود ہے۔ لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ سید کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہیں۔

لیکن عربی النسل ہونے کا دعویٰ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اسلام ان ملکوں میں پہنچا جو اس سے پہلے ایران کے زیر اثر تھے تو اسے بھی ایرانی سانچہ سے گزرنا پڑا۔ صوبہ سرحد کے لوگوں کو اسلامی فکر کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش میں ان سادات کو خود بھی پرانی ایرانی تہذیب اپنانا پڑی جس سے نو مسلم ایک ہزار سال اور ظہور اسلام سے بہت پہلے سے واقف تھے۔

فصل هشتم

صفاری اور ہندو شاہی

دوسری ہجری صدی کے آخر تک مشرق کی طرف عربوں کی پیش قدمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اسلام کا روحانی پیغام اس کے بعد بھی پھیلتا رہا اور ایران اور ترک علاقوں کے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے لیکن ایک فاتح کی حیثیت سے مشرق میں عربوں کی ساری قوت ختم ہوگئی۔ اس کے بعد قرآن و شمشیر دوسری قوموں کے سپرد ہوگئے۔ یہ نیا جذبہ سجستان (۱) سے ابھرا۔ سب سے پہلے اس کا ظہور خارجیوں کے تحت ایک فرقہ دارانہ تحریک کی شکل میں ہوا لیکن در حقیقت اس پردے میں ایرانی شعور نے جسے صحرائے عرب سے نیا پیغام ملا تھا اور جو عربوں کا تسلط برداشت نہیں کر سکتا تھا اس پیغام کی بدولت نئی زندگی پالی تھی اور وہ فکر و عمل کی نئی راہیں تلاش کرنے لگا تھا۔

سجستان گندھارا اور کوہ سلیمان سے بہت دور ہے اور اس کے باشندے مشرقی ایرانی ضرور ہیں لیکن افغان نہیں ہیں۔ لیکن یہاں علاقہ ہلمند کے واقعات کا تذکرہ دو وجوہ کی بنا پر ضروری ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اسلام کو زرنج کے مرکز سے جو نئی قوت نصیب ہوئی اسی کی بدولت اسلام کے جھنڈے قدیم ساسانی سلطنت کی مشرقی سرحدوں تک اور وادی سندھ میں پہنچ گئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صفاریوں ہی کے عہد میں جو سجستان کا حکمران خاندان ہے سب سے پہلے پیشہ ور خلج سپاہیوں کا تذکرہ ملتا ہے

---

(۱) قدیم سکستان اور موجودہ سیستان۔

اس عہد کے متعلق ایک بڑی اہم کتاب تاریخ سیستان موجود ہے جو تہران میں تقریباً ۱۹۳۰ء میں دریافت ہوئی اور پھر طبع کی گئی۔ یہ مبسوط وقائع ہیں جو تین مختلف طرزوں پر لکھے گئے ہیں۔ پہلا حصہ داخلی شہادتوں کی بنیاد پر صفاری عہد میں نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں لکھا گیا ہے۔ یہ حصہ بظاہر مستند معلوم ہوتا ہے اور چونکہ فارسی میں لکھا گیا ہے اس لئے ان تمام عرب وقائع کے مقابلہ میں جو عباسی سلطنت کی مشرقی سرحدوں کے واقعات پر مبنی ہیں کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

مشرق میں عربوں کی طاقت کو خارجیوں کی بغاوت سے شکست اٹھانا پڑی۔ یہ بغاوت سجستان کے علاقہ سے اٹھی تھی۔ خارجی صرف قرآنی احکام کو مانتے تھے اور دنیائے اسلام کے دوسرے عقیدوں یعنی شیعوں اور سنیوں دونوں کے مخالف تھے۔ بعد میں انھوں نے اور بھی غیر متعلق اصول اپنا لئے۔ مثلاً امامت یا خلافت کے لئے اہلیت ضروری ہے۔ ان کے قائد نے امیرالمؤمنین کا لقب اختیار کرلیا اور کلمہ میں ولا حکم الا للہ کا اضافہ کرلیا۔ یہ لوگ پہاڑوں اور جنگلوں میں ڈاکوؤں کی طرح رہتے تھے۔ اور خلفا کے دشمن تھے۔ انہوں نے بعض گھمسان کی لڑائیوں میں عباسی فوجوں کو بھی شکست دی۔ ان کی اس جرأت کی وجہ سے سجستان کے عرب گورنر فوجی کارروائی کے بغیر زرنج اور بست سے باہر کسی علاقہ پر تسلط نہیں جما سکتے تھے۔

سجستان میں انھوں نے قومی اور عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلی جو عربوں کے تسلط اور انہیں محصول ادا کرنے کے خلاف تھی۔ اس علاقہ کے لوگ ان کے ہمدرد تھے تا وقتیکہ ان کے مظالم کا رخ عربوں اور غیر مسلموں کی طرف تھا۔ ۷۹۷ء (۱۸۱ ہجری) میں حالات انتہا کو پہنچ گئے جبکہ خارجی لیڈر حمزہ نے نہ صرف خلیفہ کی فوجوں کو چھاؤنیوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا بلکہ مال گذاری اور خراج بند کرنے کا اعلان کردیا اور عباسی حکومت کے مقرر کردہ اہل کاروں کو ہلاک کردیا۔ اس طرح بغداد کو باقاعدہ محصول ادا کرنے کا سلسلہ ختم ہوگیا تاریخ سیستان میں خلیفہ ہارون الرشید اور حمزہ کی خط و کتابت جو بظاہر مستند معلوم ہوتی ہے لفظ بہ لفظ نقل کی گئی ہے۔ خلیفہ اپنے خط میں

حمزہ کو اس کے غیر اسلامی رویہ پر لعنت ملامت کرتا ہے جس کے جواب میں حمزہ نرم لیکن با وقار خط لکھتا ہے اور آخر میں وہ کلمہ لکھتا ہے جو اوپر درج کیا گیا۔

تاریخ سیستان میں یہ بھی لکھا ہے کہ حمزہ نے گردیز شہر کی بنیاد رکھی۔ اس بات کی تصدیق دسویں صدی میں لکھی ہوئی کتاب حدودالعالم سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے ''گردیز کے باشندے خارجی ہیں''۔ گردیز وادی زرمت کا مرکز ہے اور کرم اور خوست سے صرف چند میل مغرب میں ہے اور افغانستان کی طرف ڈیورینڈ لائن سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پٹھان علاقہ کے اس حصہ سے خارجیوں کا تعلق نہ صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ حمزہ کی حکومت سجستان کے مشرق میں کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی بلکہ بعض فرقہ دارانہ اختلاف کی بھی تشریح ہو جائے گی جن کا ہم بعد میں توریوں اور دوسرے کرلانی پٹھانوں کے سلسلہ میں تذکرہ کریں گے۔

تیسری صدی ھجری کے آغاز میں یعنی تقریباً ۸۰۰ عیسوی میں خارجیوں کی بغاوت کی وجہ سے سجستان کی گورنری کمزور ہو گئی اور خلافت بغداد کی بیرونی چوکی بن کر رہ گئی جس میں مرکزی حکومت کا دخل برائے نام تھا۔ بست کے مشرق میں رتبیل کی حکومت بدستور قائم تھی - وہ اور کابل شاہ کبھی کبھی زرنج کو برائے نام خراج ادا کر دیا کرتے تھے لیکن عملی طور پر آزاد تھے اور مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جہاں تک کوہ سلیمان کے علاقہ کا تعلق ہے مسلم عہد کے ایک بڑے قدیم کتبے سے بڑے دلچسپ انداز میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں مسلمان کہاں تک پہنچے تھے۔ یہ کتبہ ۱۹۰۷ء میں وادی ٹوچی سے دستیاب ہوا ہے اور آج کل پشاور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔(۱) اس کتبہ کا سب سے دلچسپ پہلو اس پر درج شدہ سن ہے جو واضح طور پر لکھا ہوا ہے - (۲۴۳ ھجری ۸۵۷ عیسوی)۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ عبارت دو زبانوں یعنی سنسکرت اور عربی میں لکھی ہوئی ہے۔ سنسکرت کی عبارت ناگری کی ابتدائی شکل ساردا رسم الخط میں اور عربی عبارت خط

---

(۱) یہ دریافت (STEURT PEARS) نے کی تھی جو ان دنوں ٹوچی کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے اور بعد میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے چیف کمشنر بنا دئے گئے۔

کوفی میں لکھی ہوئی ہے۔ کتبہ میں ایک عمارت کی تعمیر کا تذکرہ درج ہے جو کسی ایسے شخص نے بنوائی ہے جس کا نام عربی میں لکھا ہوا ہے لیکن وہ خود عرب نہیں ہے کیونکہ یہ نام انوکھا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کتبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ سجستان میں عباسی خلافت کے آخری سال میں اور پہلے صفاری یعقوب لیس کے عروج سے ذرا پہلے وادی ٹوچی میں سنسکرت اور عربی دونوں رائج تھیں۔

یعقوب لیس (۱) صفار (ٹھٹیھرا یا مس گر) سجستان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور کچھ دنوں ظروف سازی کا کام سیکھنے کی وجہ سے صفار کے نام سے مشہور ہو گیا تھا وہ کچھ دنوں تک رہزنی کرتا رہا اور پھر صالح ابن النذر کی ملازمت اختیار کر لی جسے خارجیوں کے خلاف داد شجاعت دینے کی بنا پر ۸۵۲ء (۲۳۸ ھجری) میں بغداد کی حکومت نے اس علاقہ کا حاکم تسلیم کر لیا تھا۔ چھ سال بعد النصر کا بھائی جو اس کا جانشین تھا یعقوب کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ یعقوب اس وقت تک فوج کا سالار بن چکا تھا اور ۸۶۱ء (۲۴۷ ھجری) میں امیر سجستان قرار دے دیا گیا۔ آئندہ چند سال کے دوران اس نے کرمان کے خارجیوں، ھرات کے حاکم الرخج کے رتبیل اور کابل کے شاہ کے خلاف کامیاب مہمات سر کیں۔ ھمارے نقطۂ نظر سے رتبیل اور کابل شاہ کے خلاف اس کی مہمات زیادہ اہم ھیں۔ اس تاریخ میں لکھا ہے کہ اس مہم کے دوران یعقوب نے غزنی کی بنیاد رکھی جس طرح اس سے پہلے حمزہ نے گردیز کی بنیاد رکھی تھی۔ ۸۷۰ء (۲۵۷ ھجری) میں اس نے کابل شہر پر قبضہ کر لیا اور وھاں کے بڑے مندر سے جو بُت ملا اسے بامیان سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کے ساتھ تحفہ کے طور پر خلیفہ بغداد کو بھیج دیا۔ ۸۷۲ء میں اس نے جنوب کی طرف سے ھندوکش پار کر کے بلخ پر قبضہ کر لیا اور نیشاپور میں طاھری خاندان کا خاتمہ کر کے خراسان کے راستے واپس ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب شمال اور جنوب کی طرف سے پیش قدمی کرنے والے محور آپس میں آ ملے تھے۔ لیکن یہ کام کسی عرب نے سر انجام نہیں دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کابل کی طاقت ختم ہو گئی اور وہ مسلمان فوج کے ہاتوں فتح ہو گیا اور غزنی کے

(۱) میں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یعقوب ایرانی تھا یعقوب بن لیس کی بجائے فارسی اضافت کے ساتھ یعقوب لیس لکھا ہے۔

علاقه میں نظم و نسق قائم هوگیا اور وهاں ایک شہر کی بنیاد پڑ گئی۔ یه بھی پہلا موقع تھا که خلج جنھیں فارسی میں خلجی کہا جاتا ہے محکوم بنائے گئے اور انھیں یعقوب کی فوج میں پیشه ور سپاهیوں کی حیثیت سے بھرتی کرلیا گیا۔ ان میں سے ایک سپاهی جس کا نام سبکاری تھا ایران میں فوج کا سپه سالار تھا اور وه یعقوب کے جانشینوں کا ساتھ چھوڑ کر خلیفه کے ساتھ هوگیا۔ اس طرح وه یعقوب کے جانشینوں کے زوال کا سبب بنا۔

۸۷۰ ء میں یعقوب کے هاتھوں کابل کی تسخیر هی یقیناً وه واقعه تھا جس کی بنا پر شاهیا بادشاهوں نے کابل سے اپنا دارالحکومت وائے هند یا جیسا که میرا خیال ہے دریائے سندھ کے کنارے لاهور کے مقام پر منتقل کر لیا۔ لیکن یه بڑی بد قسمتی ہے که مشرقی علاقوں میں یعقوب کی مہمات سے متعلق کتابوں میں کوئی مواد نہیں ملتا۔ جب وه موجوده افغانستان کا پورا علاقه مسخر کر چکا تو اسے خلیفه بننے کا شوق پیدا هوا۔ وه خلیفه کا دشمن هوگیا اور اس نے ۸۷۵ ء (۲۶۲ هجری) میں بہت بڑی فوج کے ساتھ بغداد کی طرف کوچ کیا۔ اس کی یه ڈرامائی پیش‌قدمی مسلمانوں کی توجه کا مرکز بن گئی اور اس کے مقابله میں اس کی دوسری مہمات فراموش کردی گئیں۔ وه بغداد سے چند هی میل کے فاصله پر ره گیا تھا جہاں وه شکست کھا کر پیچھے هٹنے پر مجبور هوگیا اور ۸۷۹ ء (۲۶۶ هجری) میں خوزستان کے شہر اهواز میں فوت هوگیا۔

تاریخ کی ایک دلچسپ عبارت سے یه بات واضح هوتی ہے که یعقوب عرب نہیں تھا بلکه ایرانی تھا۔ اس کی فتح کی خوشی میں ایک ضیافت کے موقع پر اس کے سامنے ایک عربی نظم پڑھی گئی۔ امیر نے احتجاج کیا اور کہا ایسی نظم پڑھنے سے کیا فائده جسے میں سمجھ نہیں سکتا۔ اس پر اس کے منشی نے فارسی اشعار پڑھنے شروع کر دئے۔ آگے چل کر تاریخ میں لکھا ہے ''عرب فتوحات کے بعد یه پہلا موقع تھا که جب سے ایرانی باشندوں نے ساسانیوں کی نظم خوانی کا طرز اختیار کیا تھا اس کے بعد ایرانیوں کے مجمع میں فارسی اشعار پڑھے جانے لگے ایرانیوں پر عربوں کے غلبه کے بعد یه رسم هوگئی تھی که صرف عربی اشعار پڑھے جائیں''۔ اس کے بعد مصنف اس موقع پر پڑھے جانے والے اشعار کا

نمونہ پیش کرتا ہے۔ پہلے شعر کا ترجمہ یہ ہے :

خدا نے مکہ کو عربوں کے لئے حرم بنایا ہے
لیکن تیرے مریدوں نے ایران میں ایک حرم بنایا ہے

کہا جاتا ہے یہ اشعار ایک خارجی نے لکھے تھے جسے یعقوب نے معافی کی پیش کش کی تھی اور جو یہ پیش کش قبول کر کے یعقوب کی فوج میں شامل ہوگیا تھا۔ ایک اور کتاب میں اس سے بھی دلچسپ واقعہ درج کیا گیا ہے اور یعقوب کی فوج کے ایک سپاھی کو اپنے گھوڑے سے فارسی میں باتیں کرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ واقعہ عربی زبان میں لکھا ہے۔

جب یعقوب کے عروج کی ابتدا ہوئی تو اس کے دشمنوں نے اسے خارجی قرار دے کر بدنام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یعقوب کو خلیفہ نے امیر مقرر نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے زور بازو سے بر سر اقتدار آیا تھا۔ اور وہ عرب نہیں تھا۔ وہ اس الزام کو جھٹلانے کی بڑی کوشش کرتا رھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی بدنامی کا بڑا صدمہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے خارجیوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس نے خارجیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور اس کا عقیدہ مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ غالباً حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے تمام وسیع العقیدہ اور مقامی عناصر کو مجمع کرنا چاھتا تھا جو بغداد کی کٹر عربیت کے خلاف اس کی خود مختاری کی حمایت کرنے کو تیار تھے۔

۸۷۹ء (۲۶۶ هجری) میں یعقوب کا بھائی عمرو بر سر اقتدار آیا جو چند عارضی کامیابیوں کے باوجود مشرق میں صفاریوں کے مفتوحہ علاقوں پر قابض نہ رہ سکا کیونکہ ہندو شاہوں نے ننگرھار اور لوگر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور غالباً کابل بھی دوبارہ ان ھی کے قبضہ میں چلا گیا۔ البتہ عمرو نے سجستان اور فارس میں اپنے خاندان کا اقتدار بیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا۔ ۹۰۰ء (۲۸۷ هجری) میں عمرو نے ایک اور ایرانی خاندان سامانیوں کے خلاف مہم چلائی اس خاندان نے ۸۷۴ء میں ہندوکش کے شمال میں عباسی حکومت کی جگہ سنبھال لی تھی اسے شکست ہوئی وہ بلخ کے قریب گرفتار کر لیا گیا اور قیدی بنا کر بغداد بھیج دیا گیا جہاں خلیفہ نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے بعد سامانیوں نے صفاریوں کے

علاقه پر قبضه کرنا چاها لیکن یعقوب کے خاندان کے ایک اور شخص طاهر نے قدرے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابله کیا۔ طاهر فارس کے کچھ حصوں اور سجستان پر قابض رها اور اس نے خلیج فارس کے پار عمان میں اپنے نام کے سکے بھی ڈھلوائے لیکن ۹۰۸ء (۲۹۶ هجری) میں اسے اس کے دشمنوں نے قید کر لیا اور عمرو کی طرح اسے بھی بغداد بھیج دیا۔ خاندان کے دیگر افراد کئی سال تک سجستان کے کچھ علاقوں میں برسراقتدار رهے اور ایسا معلوم هوتا تھا که انهیں عوام کی حمایت حاصل تھی۔ غزنی کے علاقه پر سامانیوں کا قبضه هو گیا البته یه قبضه غیر مستحکم اور غیر یقینی تھا۔

یعقوب لیس کی زندگی اس لحاظ سے اهم هے که وه پهلا مسلمان حکمراں هے جس نے سابق ساسانی سلطنت کی مشرقی حدود میں اسلام کی طاقت موثر طریقه سے محسوس کرائی ۔ غالباً یعقوب لیس هی پهلا آدمی هے جس نے افغان قبائل کو بڑی تعداد میں اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ یه قبائل خلجی اور غزنی کے آس پاس رهنے والے دوسرے باشندے تھے۔ یعقوب لیس کے متعلق بہت سے قصے مشهور هیں جن سے ظاهر هوتا هے که وه نظم و ضبط کا شدت سے پابند تھا۔ معاملات کا فوری لیکن منصفانه فیصله کرتا تھا جس کی وجه سے تمام قلم رو میں وه اپنی رعایا میں هردلعزیز تھا اور وه میدان جنگ میں بڑی چستی کا ثبوت دیتا تھا۔ یعقوب لیس بجا طور پر یه بھی فخر کر سکتا هے که اس نے مشرقی علاقه کے لوگوں کو مشرف به اسلام کیا۔ اس سے پهلے ان لوگوں کے عقائد میں بت پرستی بھی شامل تھی۔ اگرچه تفصیلات ناپید هیں لیکن یعقوب کے کردار اور اس کی فتوحات کے رخ سے ظاهر هوتا هے که اس کے زمانه میں کابل اور غزنی کے بہت سے لوگ مشرف به اسلام هو گئے تھے۔ درحقیقت هر لحاظ سے یعقوب صفار محمودغزنوی کا پیش رو ثابت هوا۔ بعد میں محمودغزنوی کی سرگرمیاں یعقوب کے نمونه پر هوئیں۔ فرق یه هے که یعقوب مشرق میں کابل سے آگے نہیں بڑھ سکا اور اس کی فتوحات نےاس علاقه کے هندو راجاؤں کو پریشان ضرور کیا لیکن وه ان کی ریاستوں کو ختم نہیں کر سکا۔ پھر بھی صفاری خاندان نے افغانوں اور پٹھانوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنے میں فیصله کن کردار ادا کیا اور اس لحاظ سے محمودغزنوی کے مقابله میں جس نے پهلے سے قائم کی هوئی بنیادوں پر عمارت بنا دی

یاد رکھنے کا زیادہ مستحق ہے۔

یہ قیاس بڑا دلچسپ ہے کہ اگر یعقوب بغداد فتح کر لیتا جیسا کہ اس نے قریب قریب فتح کر لیا تھا اور خلافت پر قابض ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ عباسی مشرقی ایران کے حاکموں کے محکوم بن جاتے سپاہیوں کی حیثیت سے غلجی اور افغان ترکوں کی جگہ لے لیتے اور بغداد کی ثقافت پشتو زبان کے اثر کے تحت ترقی کرتی۔

شاھیا خاندان جس سے یعقوب لیس نے ۸۷۰ء میں کابل چھینا تھا مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے کبھی اسے کابل شاہ، کبھی ترکی شاھیہ خاندان اور کبھی وائے ہند کا ہندو شاھیہ خاندان کہا جاتا ہے۔ البیرونی نے اس خاندان کو تبتّی بتایا ہے (اس سے البیرونی کی مراد ترک یا کشان تھی جس کی اس نے وضاحت نہیں کی) محض اس حیثیت سے کہ یہ گندھارا میں آخری غیر مسلم حکمران خاندان تھا ہمارے بیان کردہ واقعات میں اس کی بڑی اھمیت ہے۔ یہ حقیقت کہ یہ بادشاہ گیارھویں صدی کے آغاز تک یعنی ھجرت نبوی سے چار سو سال بعد وادی پشاور میں شان و شوکت کے مالک تھے اس روایت کو بالکل جھٹلا دیتی ہے کہ اس علاقہ میں اسلام ابتدا ھی میں پھیل گیا تھا۔

جب تک یعقوب نے کابل فتح نہیں کرلیا اور ان بادشاھوں نے بظاھر اپنا دارالحکومت گندھارا میں دریائے سندھ کے کنارے وائے ھند کے مقام پر منتقل نہیں کرلیا ان بادشاھوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ان وجوہ کی بنا پر جو پہلے بیان ھو چکی ھیں میرے نزدیک یہ دارالحکومت لاھور گاؤں کے قریب واقع تھا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ جس کابل شاہ کو یعقوب نے شکست دی وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس نے وائے ھند کے ہندو شاھوں کی بنیاد ڈالی اور کیا دارالحکومت بدلنے کے ساتھ حکمران بھی بدل گئے تھے۔ اس کے متعلق اھم تحریری شہادت البیرونی (۱) کی ایک مبہم عبارت ہے جو درج ذیل ہے۔

"اس نسل کا آخری بادشاہ لگاتورمان تھا اور اس کا وزیر کلّر تھا

(۱) البیرونی ایک مشہور مورخ تھا جس نے عربی میں تاریخ الہند لکھی۔ وہ ۹۷۳ء میں خوارزم میں پیدا ہوا تھا۔

جو ایک برھمن تھا۔ وزیر کو خوش قسمتی سے ایک مدفون خزانہ مل گیا جس کی وجہ سے اسے بڑا رسوخ اور طاقت حاصل ہو گئی۔ آخر کار اس تبتی خاندان کے آخری بادشاہ نے اتنے طویل عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد رفتہ رفتہ اقتدار گنوا دیا۔ اس کے علاوہ لگاتورمان کے خصائل اور عادات بڑی خراب تھیں اور لوگ وزیر سے اس کی شکایتیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وزیر نے اسے پا بہ زنجیر کر دیا اور اس کی اصلاح کے ارادہ سے اسے قید میں ڈال دیا۔ لیکن پھر وزیر کو حکومت کا چسکا پڑ گیا وہ اپنی دولت کے سہارے اپنے منصوبے پورے کرنے میں کامیاب ہو گیا اور تخت پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے برھمن بادشاہ سمند، کمالو، بھیم، جے پالا، انندپال، تروجنا پالا تخت نشین ہوئے۔ آخری بادشاہ تروجنا ۱۰۲۱ء (۴۱۲ ھجری) میں اور اس کا بیٹا بھیم پالا پانچ سال بعد قتل ہو گیا۔

اب یہ ھندو شاھیہ خاندان فنا ہو چکا ہے اور پورے خاندان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ ھم یہ کہنے پر مجبور ھیں کہ یہ بادشاہ اپنی شان و شوکت کے زمانہ میں بھی نیکی کے کاموں سے کبھی غافل نہیں ہوئے اور یہ بادشاہ شریف النفس اور شریف النیت تھے،،۔

اس عبارت کے متعلق کئی باتیں قابل غور ھیں۔ اول تو یہ کہ البیرونی اس خاندان کا ھم عصر تھا۔ وہ ۹۷۳ء میں پیدا ھوا اور ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۶ء تک محمود غزنوی کی فتوحات کے ذریعہ ھندوستان کے راستے کھل جانے کے بعد ھندوستان آیا۔ ھو سکتا ہے کہ وہ محمود غزنوی کے ھاتھوں جے پال اور انند پال کی شکست کے بعد ان ھندو راجوں سے بھی ملا ھو۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حکمران خاندان کی تبدیلی جسے مخصوص مشرقی افسانوی انداز میں ایک بادشاہ کی جگہ اس کے وزیر کے تخت نشین ہونے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک نئے دور کی ابتدا ھو جو دارالحکومت کابل سے وائے ھند (لاھور) منتقل ھونے کے ساتھ شروع ھوا ھو۔ اس عبارت سے کم از کم اتنا ثابت ھوتا ہے کہ حکمران خاندان کی تاریخ میں تسلسل تھا اور پہلے ھندو شاہ کلّر کے پیش رو حلقۂ اسلام میں شامل نہیں تھے۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ البیرونی کا بیان شروع میں ایک داستان معلوم ھوتا ہے لیکن جوں جوں وہ خود اپنے عہد کے قریب آتا جاتا ہے اس کا

بیان قابل اعتبار ہوتا جاتا ہے اور اس نے ان بادشاہوں کی تعریف کر کے جو اس کے ہم مذہب فاتح کے خلاف اتنی بے جگری سے لڑتے تھے عالی ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی سلسلہ کی کچھ اور بھی باتیں ہیں جو ہم بعد میں محمود کے تذکرہ کے ساتھ بیان کریں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور بھی ماخذ (۱) ہے جس کی مدد سے ہم زیادہ صحت کے ساتھ ان شاہوں کے عہد کا تعین کر سکتے ہیں جس زمانہ میں یعقوب کا بھائی عمرو لیس مشرقی سرحدوں پر صفاری خاندان کے مفتوحہ علاقوں پر قابض رہنے کی کوشش کر رہا تھا اسی زمانہ میں غزنی یا گردیز میں اس کے نائب نے جس کا نام فردغان تھا درۂ ایتمور کے قریب لوگر اور زرمت کی وادیوں کے درمیان سقاوند کے مقام پر ہندؤں کے ایک مندر کو جس میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی آگ لگا دی۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ سقاوند کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبر سن کر ہندوستان کے رائے کملٔو نے بڑی فوج جمع کی اور زابلستان کی طرف بڑھا۔ بظاہر یہ وہی کمالو ہے جو البیرونی کی بیان کردہ ہندو شاہیہ فرماں رواؤں کی فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے اور جس کے متعلق یہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ عمرو صفار کا ہم عصر تھا (۹۰۰-۸۷۹ء) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں سے پہلا بادشاہ جسے البیرونی نے کلر کے نام سے یاد کیا ہے ۸۷۰ء میں یعقوب لیس کے ہاتھوں کابل کی فتح سے پہلے اس شہر پر حکومت کرتا رہا ہوگا۔

سکوں سے جو شہادت ملتی ہے اس سے ایک حد تک البیرونی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور کچھ شہادت اس کے بیان سے مختلف ہے۔ اس عہد کے متعدد سکے دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے بیشتر وادی پشاور، خاص طور پر وائے ہند کے پاس سے ملے ہیں جو دریائے سندھ کے قریب ہنڈ اور لاہور کے قریب واقع ہے۔ ان میں سے بیشتر سکے چاندی کے بنے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ان کے ایک طرف مسلح شہسوار اور دوسری طرف بیٹھا ہوا بیل بنایا گیا ہے۔ کچھ تانبے کے سکے بھی ملے ہیں جن کے ایک طرف شیر اور دوسری طرف ہاتھی بنا ہوا ہے۔ ایک طلائی سکہ بھی ملا ہے جس پر دو بادشاہوں کی تصویریں ہیں ایک طرف بھیما دیوا

(۱) محمد عفی کی تصنیف جامع الحکایات۔

اور دوسری طرف سمنتا دیوا کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ مسٹر اجیت گھوش کی رائے میں یہ سکہ بھیم کے زمانہ میں ڈھالا گیا تھا لیکن اس کے پیش رو کی یاد میں رائج کیا گیا تھا جو غالباً بھیم کے حق میں تخت سے دست بردار ہوگیا تھا۔ لیکن مسٹر اجیت گھوش نے اس حقیقت کو نظر انداز کردیا ہے کہ سمنتا کے بعد اور بھیم سے پہلے کمالو حکمران رہا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ سمنتا کی حیثیت پورے حکمران خاندان کے سرپرست کی تھی۔

ان تمام سکوں پر ناگری رسم الخط میں نام کندہ ہیں اور ان کی علی الترتیب فہرست یہ ہے۔

١۔ اسپالا پتی دیوا (سکے عام ہیں)
٢۔ سمنتا دیوا (سکے بہت ہی عام ہیں)
٣۔ بھیم دیوا (سکے کمیاب ہیں)
٤۔ وکا دیوا (تانبے کے سکے عام ہیں)
٥۔ کھامارا یاکا (سکے بہت ہی کمیاب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران مسلمان ہوگیا تھا)

اسپالا پتی (اسپادہ قدیم فارسی میں فوج کو کہتے ہیں) کے معنی سپہ سالار ہیں اور د کی جگہ ل کا استعمال اسی لسانی تبدیلی کے مطابق ہے جس پر ہم نے پختو اور فارسی کا موازنہ کرتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔

موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے صرف دوسرا اور تیسرا حکمران یعنی سمندا اور بھیم (یہی وہ حکمراں ہیں جن کی تصویریں طلائی سکے پر بنی ہوئی ہیں) البیرونی کی ہندو شاہی بادشاہوں کی فہرست کے مطابق ہیں۔ خاص طور پر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ابھی تک جے پال اور انند پال کے ناموں کا کوئی سکہ دستیاب نہیں ہوا حالانکہ یہ دونوں مستند اور تاریخی شخصیتیں ہیں۔ انھوں نے سبکتگین اور محمود غزنوی کے خلاف ایسی لڑائیاں لڑیں جن کی تاریخیں معلوم ہیں۔ دوسری طرف حکمراں خاندان کے بدلنے کے بعد نئے خاندان کے پہلے حکمراں یعنی اسپالا پتی کے متعلق کتابوں میں کسی بیان کا نہ ملنا بڑا حیران کن ہے۔ ان حالات میں یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ برھمن کاٹر نے جس کا البیرونی نے تذکرہ کیا ہے تخت نشین ہوکر اسپالا پتی کا لقب اختیار کر لیا۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ جن سکوں پر ناگری میں اسپالا پتی کا نام درج ہے ان میں سے اکثر پر کشانی رسم الخط میں بھی کچھ لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا ہندو شاہی، ایک طرح سے کشان افتہالی خاندان کی نیابت کا بھی وارث تھا اور حکمراں خاندان اور شاید دارالحکومت کی تبدیلی کے ساتھ زیادہ ہندو اثرات لے آیا تھا۔ (دارالحکومت کی تبدیلی غیر یقینی ہے) ہم عصر مؤرخ اور سکوں کی شہادتوں کا یہ تضاد نام نہاد ہندو شاہیہ مسئلہ ہے جو ابھی تک متنازعہ فیہ ہے اور جو ابھی تک تسلی بخش طریقہ سے طے نہیں ہوسکا (۱)۔ سمند کے نام کے سکے بکثرت ملتے ہیں۔ یہ ہندو شاہیہ خاندان کا دوسرا حکمراں ہے جس کا تذکرہ تاریخ میں بھی اور سکوں پر بھی ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کے جانشین اپنے نام کے سکے چلانے کی بجائے اسی کے نام کے سکے چلاتے رہے۔ اوپر جس طلائی سکہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے اس مفروضہ کو تقویت پہنچتی ہے

ایک اور حقیقت جس کی ابھی تک وضاحت نہیں ہوئی اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔ وہ یہ کہ عباسی خلیفہ المقتدر نے ۹۰۸ء (۲۹۵ھ) میں بغداد میں اسی نمونے کے سکے ڈھلوائے اور ان پر عربی میں صرف اپنا نام لکھوادیا۔ اس غیر معمولی اقدام سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نظر میں ہندو شاہیوں اور انکے سکوں کی کتنی وقعت تھی۔ تاریخوں کے موازنہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا ہندو شاہی حکمراں ۸۷۰ء (۲۵۷ ھجری) میں جبکہ یعقوب نے کابل فتح کیا یا قریب قریب اسی زمانہ میں تخت نشین تھا۔

ہندؤں کی کوئی کتاب یا کوئی سکہ ایسا نہیں جس سے ان قبیلوں کے کچھ حالت معلوم ہوسکیں جن پر یہ خاندان حکومت کرتا تھا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ کابل پر صفاریوں کے قبضہ کے بعد بھی یہ خاندان خیبر کے مغرب میں ننگر ھار پر اور لوگر پر قابض رہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگر کے مقام پر ان کی تاج پوشی ہوا کرتی تھی۔ خود یہ حکمراں اور ان کے اہل کار کابل اور پشاور کے درمیان تمام قبیلوں اور تمام راستوں

(۱) صوابی تحصیل میں لاھور اور ھنڈ کے مقامات پر باقاعدہ کھدائی سے یہ معاملہ حل ہو سکتا ہے۔

سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ان میں براہ راست خیبر کا راستہ، جنوبی کرم کا راستہ، اور کونڑ باجوڑ تلاش اور سوات ہوتے ہوئے شمال کا راستہ بھی شامل ہے۔ یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ یہ خاندان سوات پر حکمراں رہا ہے ساتھ ہی ساتھ خود جے پال کا وجود بھی ثابت ہوگیا ہے (بشرطیکہ اس کا وجود مشتبہ رہا ہو) سوات میں بری کوٹ کے مقام پر ایک کتبہ (۱) شاردا رسم الخط میں لکھی ہوئی سنسکرت زبان میں ملا ہے۔ یہ کتبہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے "حاکم اعلیٰ عظیم بادشاہوں کے عظیم بادشاہ اور فرماں روائے اعلیٰ سری جے پال دیو کے عہد میں....،، ان سب باتوں کے باوجود ان حکمرانوں کی رعایا کے حالات یا نام و نشان کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ عام طور پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسکندر اعظم سے بابر کے عہد تک اس قوم کی سماجی تاریخ یا ترقی کی واضح تصویر نہیں ابھرتی جس کے علاقہ سے اٹھارہ صدیوں کے دوران اتنے زیادہ حملہ آور گزرے ہیں۔ تاریخ کے آغاز سے اب تک کوئی اور ایسا آباد علاقہ نہیں ہے جو دو قدیم تہذیبوں کی سرحد رہا ہو اور جس کے متعلق ہماری معلومات میں اتنا بڑا حیران کن خلا پایا جاتا ہو۔

البتہ روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ افغانوں کے وجود کا سب سے پہلا سراغ تیسری صدی کے ساسانی کتبے میں ابگان کی شکل میں ملتا ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے افغانوں کا تذکرہ ہندوستانی ماہر فلکیات وراہا مہیرا نے اپنی تصنیف برھت سمہتا میں کیا ہے جو چھٹی صدی میں لکھی گئی۔ چینی سیاح ہیان سانگ بھی سلسلہ کوہ سلیمان کے شمالی حصوں میں اپوکین کے نام سے ایک قوم کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ قوم افغان ہی ہوسکتی ہے ہیان سانگ نے جنوبی ایشیا کا سفر ۶۲۹ء سے ۶۴۵ء تک کیا اور وہ ۶۴۴ء میں یعنی پہلے عرب حملہ آوروں کے الاھوار (لاھور) پہنچنے سے بیس سال پہلے گندھارا پہنچا تھا مسلمانوں کی کتابوں میں افغانوں کا سب سے پہلا تذکرہ حدودالعالم میں ملتا ہے جو ۹۸۲ء (۳۷۳ ھجری) میں لکھی گئی۔ اس میں گردیز کے قریب ایک گاؤں ساول کا بیان درج ہے جس میں افغان آباد تھے اور ننہار کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو بظاہر ننگرھار یعنی موجودہ جلال آباد ضلع ہے اس

---

(۱) یہ تحریر (HERALD DEANE) نے قریباً ۱۸۹۷ء میں پیش کی تھی اور اب لاھور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

کے متعلق لکھا ہے کہ یہاں کا بادشاہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے اسلام قبول کرلیا ہے لیکن اس کی تیس سے زیادہ مسلمان افغان اور ہندو بیویاں ہیں۔ اس عبارت میں مسلمان اور افغان کا امتیاز اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ غزنوی عہد کا مؤرخ العتبی جس نے گیارھویں صدی کے آغاز میں تاریخ لکھی ہے، لکھتا ہے کہ افغان محمود کی فوج میں شامل تھے اور محمود کے جانشین مسعود نے افغانوں کو مغلوب کرنے کے لئے اپنے بیٹے کو پہاڑی علاقہ کی طرف روانہ کیا۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ واضح تذکرے البیرونی کی تاریخ الہند میں ملتے ہیں جیسا کہ ہم ہندو شاہیوں کے متعلق اس کے بیان سے اندازہ لگا چکے ہیں البیرونی کا دماغ وسیع اور قلم زور دار تھا۔ وہ تقریباً ۱۰۰۰ء کے زمانہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ہند کے مغرب میں جو پہاڑ واقع ہیں ان میں افغانوں کے مختلف قبیلے آباد ہیں۔ یہ قبیلے وادی سندھ کے پاس تک پھیلے ہوئے ہیں"۔ اس سے پہلے وہ ایک مقام پر ان قبائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ باغی اور وحشی لوگ ہیں جو مغرب کی طرف ہند کی سرحد پر قابض ہیں اور ہند کی دور دراز سرحد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ایک اور مقام پر یہ واضح کر چکا ہے کہ ہند کی آخری سرحد کابل تک ہے۔ اس کے علاوہ البیرونی ان قبائل کو ہندو قرار دیتا ہے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندیوں کا بادشاہ پہلے کابل میں رہا کرتا تھا لیکن میرے زمانہ میں پایۂ تخت وائے ہند تھا۔ وہ گندھارا یعنی وادی پشاور کا جسے وہ قندھار کے نام سے یاد کرتا ہے بار بار تذکرہ کرتا ہے وہ پشاور کا بھی تذکرہ کرتا ہے جسے وہ پروشاور لکھتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی افغان قبائل کی سرزمین وہی تھی جو آج ہے یعنی کابل کے مشرق میں اور دریائے سندھ تک پہاڑوں میں۔ وہ اس زمانہ تک اسلام نہیں لائے اور انہوں نے بیرونی تسلط برداشت نہیں کیا۔ اس وقت تک پختون یا پشتون کا نام سنائی نہیں دیتا اس کے لئے ہمیں کئی صدیوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ البیرونی دوسرا ہیروڈوٹس ہے۔ پندرہ سو سال کے عرصہ میں پہلی مرتبہ ہمیں ان لوگوں کی جھلک نظر آتی ہے جو ابھی تک خاندانی کارناموں کے تذکروں کے پردے میں چھپے ہوئے تھے۔ بدقسمتی

سے البیرونی ان باغی وحشی افغان قبائل کے نام درج نہیں کرتا - اس کیلئے ہمیں مزید پانچ صدیوں تک بابر کا انتظار کرنا ہوگا - لیکن ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ بابر کے زمانہ میں جو کچھ تھے ماضی بعید میں اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے اور جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا بابر کے زمانہ میں بیشتر قبائل ان ہی علاقوں میں آباد تھے جہاں وہ آج آباد ہیں - کم از کم البیرونی کی تاریخ سے ہمیں اتنا معلوم ہوگیا کہ ابتدائی غزنوی حکمرانوں کے عہد میں افغان منظر عام پر آگئے تھے - اسی علاقہ میں جہاں وہ آج کل آباد ہیں مسلمانوں کو غزنی کے آس پاس منظم طور پر قدم جمانے میں کئی صدیاں لگیں اور دسویں صدی کے آخر تک ایک ہندو بادشاہ درۂ خیبر کے دونوں طرف حکومت کر رہا تھا -

حصہ دویم

مسلمانوں کا درمیانی دور

۱۰۰۰ء تا ۱۷۰۷ء

(۳۹۱ھ تا ۱۱۱۹ھ)

فصل نہم

محمود اور خلجی

دریائے سندھ کی سرحد پر پانچسو سال تک پہلے کے مقابلہ میں سکون رہا - اس کے بعد محمود کے زمانہ میں شمال کی طرف سے از سرِ نو حملوں کے ساتھ پیچیدگیوں اور افراتفری کے دور کی ابتداء ہوئی - یہ دور غزنی میں اندازاً ۹۶۰ء میں ترک خاندان کے عروج سے شروع ہو کر ۱۵۲۶ء میں مغل بادشاہ بابر کے ہاتھوں دہلی کے افغان لودی خاندان کی شکست کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور چونکہ شیر شاہ اور اس کے جانشینوں کا سُور خاندان (۱۵۳۹-۵۵ء) بھی درحقیقت لودیوں کے اقتدار کا احیا تھا اس لئے بیان کی تکمیل کے لئے اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے -

اس دور کے اہم واقعات یہ ہیں کہ افغان بساط عالم پر ایک طاقت کی حیثیت سے نمودار ہوئے وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور انہوں نے اپنے وطن میں نہیں بلکہ ہندوستان میں افغان سلطنت قائم کی - اس دور کو سرسری طور پر دو اہم حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پہلا حصہ ۹۷۷ء میں غزنی میں سبکتگین کے بر سرِ اقتدار آنے کے ساتھ شروع ہو کر دہلی میں مسلم سلطنت قائم کرنے کے بعد ۱۲۰۶ء میں غوری سلطان معزالدین محمد کی وفات پر ختم ہوتا ہے - دوسرا دور وسط ایشیا کی طاقتوں کے دباؤ سے (اندازاً ۱۲۱۵-۲۰ء) غوریوں کے زوال سے شروع ہو کر ۱۵۰۴ء میں کابل میں بابر کی آمد پر ختم ہوتا ہے - پہلی دو صدیوں میں تمام سرگرمیوں کا مرکز غزنی تھا جسے پہلے غزنویوں اور پھر غوریوں نے اپنا دارالحکومت بنا رکھا تھا اور جو افغان علاقہ کے وسط میں واقع

ھے۔ اس دور کے ابتدائی زمانہ کے متعلق ھم عصر مورخ البیرونی جس کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ھے اور محمود غزنوی کے درباری مورخ العتبی کی تحریریں موجود ھیں۔ بابر کی آمد سے قبل اس دور کی آخری تین صدیوں میں سرگرمیوں کا مرکز افغان علاقہ سے دھلی اور ان دوسرے ھندوستانی علاقوں میں منتقل ھو جاتا ھے جہاں مسلمانوں نے پاؤں جما لئے تھے۔ اسی دور کے دوسرے حصہ کے اھم واقعات یہ ھیں کہ ۱۲۱۸ء سے ۱۲۲۷ء تک چنگیز خان کے زیر قیادت منگولوں کی یورش سے زبردست تباھی مچی۔ اس کے بعد (۱۴۰۰-۱۳۸۰) تیمور لنگ نے وسیع علاقے فتح کرلئے۔ منگولوں کے حملے کا ھندوستان پر گہرا اثر نہیں پڑا لیکن اس علاقہ میں جو اب افغانستان کہلاتا ھے جمی جمائی حکومت کی بنیادیں ھل گئیں۔ پھر پندرھویں صدی میں تیمور کے جانشینوں نے اس علاقہ میں مستحکم حکومت قائم کی۔

ان دونوں زمانوں میں ھندوستان میں مسلمانوں کے داخلہ اور فتوحات کے دوران افغان اور پٹھان قبائل سب سے آگے تھے۔ وہ پہلے محض قسمت آزمائی کرنے والے سپاھی تھے اور پھر طاقتور بادشاہ یہاں تک کہ شہنشاہ بھی بن بیٹھے لیکن یہ عجیب بات ھے کہ ان تمام صدیوں میں ان کی اپنی سر زمین پر آس پاس کی کسی اور طاقت نے یا خود انہوں نے کوئی منظم حکومت قائم نہیں کی۔ ان کی سر زمین جو اس زمانہ میں ھندوستان میں روہ کی سر زمین کہلانے لگی تھی جنگجو قبائل کا مسکن بنی رھی۔ اس کی صرف اتنی اھمیت تھی کہ مال کے لالچ میں لڑنے والے سپاھی بھرتی کرنے کے لئے وہ ایک ایسا چشمہ تھا جو کبھی خشک نہیں ھوتا تھا۔

میں اس سے پہلے البیرونی کی وہ عبارت نقل کر چکا ھوں جس میں اس نے لکھا ھے کہ افغان جنگجو قبیلوں کا نام ھے عبارت سے یہ بھی ظاھر ھوتا ھے کہ ان دنوں ان قبائل کے مشرف بہ اسلام ھونے کی ابتدا تھی اور وہ دریائے سندھ اور دریائے کابل کے درمیان ھندوستان کی سرحدوں پر آباد تھے۔ یہ طے ھوجانے کے بعد کہ افغانوں کی سرزمین اس دور کی ابتدا میں بھی قریب قریب وھی تھی جو آج ھے اور محمود غزنوی کے زمانہ میں وہ بڑی تعداد میں اسلام لے آئے تھے اور ساتھ ھی سمجھ بوجھ رکھنے والے عربوں نے وقائع نگاری کا سلسلہ شروع کردیا تھا ھمیں توقع تھی

کہ اس مرحلہ سے ان قبائل کی مفصل تاریخ کا آغاز ہوگا جن میں سے اس فوج کے بہت سے سپاہی بھرتی کئے گئے تھے، حقیقت بالکل برعکس ہے۔ البیرونی نے جو کچھ کہا ہے اور چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں اتفاقیہ جو مختصر عبارت نظر آتی ہے اس سے قطع نظرعام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان پانچ صدیوں کی تاریخیں ان وحشی اور سرکش نسلوں کی سرزمین میں ان کے متعلق کسی مفصل تذکرہ سے یکسر خالی ہیں۔ لے دے کر خلجی اور لودی ہی دو ایسے قبائلی نام ہیں جنھیں افغانوں کے تذکرہ میں لایا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی ان خاندانوں کے نام ہیں جو حقیقتاً دہلی پر حکومت کرتے تھے۔ یہ تاریکی قرون وسطیٰ میں شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ البیرونی اور العتبی نے تقریباً ۱۰۱۵ء میں اپنی تحریروں میں پشاور کا جو واضح تذکرہ کیا تھا اس کے بعد پانچسو سال تک بابر کی تحریر سے پہلے پشاور کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ پھر بھی ان تینوں مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں پشاور کو برابر اہمیت حاصل رہی۔

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ البیرونی کو چھوڑ کر قرون وسطیٰ کے تمام مصنفوں نے گھر بیٹھے حکمرانوں کے کارنامے قلم‌بند کرنے کے سوا اور کوئی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس طویل دور میں ہندوستان میں تنخواہ دار افغان سپاہیوں کے متعلق جتنی معلومات موجود ہیں وہ ان کے وطن کے حالات کی معلومات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ جو شخص پشاور اور اس کے ارد گرد کی پہاڑیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہے اس کے لئے ہم صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ حکمراں خاندانوں کے کارناموں کے آئینہ میں قبائل کے اطوار اور امنگوں کی جو جھلکیاں ملتی ہیں وہی پیش کردیں۔

غزنی بخارا کی سامانی سلطنت کی جاگیر تھا۔ سامانی خاندان ۹۰۰ء میں بلخ کے قریب عمرو لیس کی شکست کے بعد خراسان میں صفاریوں کے مفتوحہ علاقوں کا وارث بن بیٹھا تھا۔ صفاریوں کی طرح سامانی بھی ایرانی نسل سے تھے لیکن وہ ترک مملوک کی مدد سے حکومت کرتے تھے۔ یہ

مملوک جنگی قیدی تھے جن کی فوجی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں علاقوں کی منڈیوں سے خریدا گیا تھا۔ جو مملوک بہترین صفات کے مالک تھے انہیں ان کے مالکوں نے آزاد کرکے اپنے علاقوں میں گورنروں اور سپہ سالاروں کے اہم عہدوں پر فائز کردیا۔ ۹۵۰ء سے غزنی صوبہ یکے بعد دیگرے الپتگین بلکتگین اور پیرائے نامی مملوکوں کی تحویل میں چلا آرہا تھا جو اب صوبے کے والی یعنی گورنر تھے۔ غزنی جنوب مشرق میں سامانیوں کا سرحدی صوبہ تھا جسے وادی کابل میں طاقتور ہندو شاھیہ سلطنت اور اس کے ارد گرد پہاڑوں میں سرکش اور نڈر قبائل کا سامنا تھا جو اسلام کی طرف نئے نئے مائل ہوئے تھے۔ ۹۷۷ء میں جبکہ پیرائے کی نا اہلی عیاں ہوچکی تھی سبکتگین نے جو الپتگین کا غلام رہ چکا تھا اور جس نے الپتگین کی بیٹی سے شادی کی تھی گورنری پر قبضہ کرلیا اور بخارا میں سامانی حاکم اعلیٰ سے اپنی گورنری کی توثیق کرانے کے بعد غزنوی خاندان کا بانی بن گیا۔ اس کے عروج کے وقت سامانی سلطنت رو بہ زوال تھی اور آخر ۹۹۹ء میں ختم ہوگئی۔ اس طرح اس توثیق سے محض ایک قانونی سہارا مل گیا۔ اور اس کے بیٹے محمود کے لئے غزنی کو ایک ایسی سلطنت کا دارالحکومت بنانے کے لئے راستہ ہموار ہوگیا جو طاقت اور شہرت میں اس سلطنت سے کہیں زیادہ تھی جس نے اس کے باپ کو گورنری عطا کی تھی۔

یہ فیصلہ سبکتگین کے بیٹے محمود نے نہیں بلکہ خود سبکتگین نے کیا تھا کہ وادی کابل اور پشاور سے جو اس وقت تک گندھارا اور عربی میں قندھار کہلاتا تھا ہندوؤں کے اخراج کو نصب العین بنایا جائے۔ غزنوی مورخ العتبی کا کہنا ھے کہ ''اس نے اپنی فوج میں بھرتی بڑھا دی اور افغان اور خلج نے اپنی خدمات پیش کیں اور جب بادشاہ کی مرضی ہوئی تو اس نے ان میں سے ہزاروں کو اپنی فوج میں داخل کرلیا۔ اس طرح وہ دل و جان سے بادشاہ کی خدمت پر کمر بستہ ہوگئے۔ ان فوجوں کی مدد سے محمود نے لغمان اور ننگرھار کے مقام پر دو مرتبہ ہندو شاھی بادشاہ جے پال کو شکست دی اور اسے وادی کابل کے بالائی حصے سے نکال دیا۔ محمود کے ھاتھ بہت سا مال غنیمت آیا جس میں دو سو ھاتھی بھی شامل تھے۔

۹۹۷ ء میں سبکتگین کی جگہ اس کا بڑا بیٹا اسماعیل تخت‌نشین ہوا جو نا اہل ثابت ہوا۔ اس نے دو سال کے بعد سبکتگین کے دوسرے لڑکے محمود کے لئے تخت خالی کردیا۔ محمود نے نہ صرف ہندووں کو گندھارا سے نکالنے کا بیڑا اٹھایا جہاں وہ اس زمانہ میں جمع تھے بلکہ دریائے سندھ کے پار ہندوستان تک جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اس نے مغرب میں ایران تک شمال میں بلخ تک مشرق میں گندھارا کے مقام پشاور تک اور اس سے بھی آگے پنجاب اور بالائی سندھ میں لڑائیاں لڑیں۔ اس نے ۹۹۹ ء اور ۱۰۲۶ ء کے درمیانی عرصہ میں آخرلذکر علاقوں پر کم از کم بارہ حملے کئے وہ ہر جگہ فاتح رہا اپنی زندگی کے آخری دور میں محمود جس علاقہ پر حکومت کر رہا تھا اس میں جدید ایران کا بہت بڑا حصہ، اور مشرق میں پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی وادیاں شامل ہیں شمال میں اس کا اثر آمو دریا کے پار تک جا پہنچا تھا جہاں اس نے قراخانی ترکوں کو شکست دی تھی یہ قراخانی بخارا میں سامانیوں کے جانشین تھے۔ محمود کی سلطنت کی اصل سر زمین کابل اور قندھار (جو اس وقت تک آباد نہیں ہوا تھا) یعنی غلجیوں کا موجودہ علاقہ تھا۔ محمود کا دارالحکومت غزنی اس عہد کی انتہائی شاندار عمارتوں سے آراستہ تھا اور اس نے اپنے دربار میں بہت سے مشہور علما اور شعرا جمع کر رکھے تھے جن میں فارسی زبان کا ہومر فردوسی بھی شامل تھا۔ محمود عام طور پر بت شکن اور ہندوستان کے لئے قہرالہٰی کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن ہمارے نکتہ نظر سے محمود غزنوی اس لئے اہم نہیں ہے کہ اس نے دریائے سندھ کے مغرب میں ہندؤں کی طاقت اور اثر ہمیشہ کے لئے ختم کردیا بلکہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے جھنڈے تلے تمام افغان قبائل جمع ہوئے پھر مشرف بہ اسلام ہوئے اور انہوں نے پیشہ ور سپاہیوں کی حیثیت سے دور دراز علاقوں میں فتوحات حاصل کیں۔ اس کا بیٹا مسعود اس کی پالیسیوں پر کاربند رہا۔

محمود ایک ترک تھا۔ لیکن اس نے روہ کے سرحدی باشندوں پر جو گہرا اثر چھوڑا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوک کہانیوں میں اسے پہلا قومی ہیرو مانا جاتا ہے۔ محمود کی یہ تعظیم اس حقیقت کے باوجود برقرار ہے کہ ہم‌عصر اور بعد کے مورخوں کی زبانی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے کس طرح کوہ سلیمان کے قبائل پر حملے

گئے- اور اس نے اپنے بیٹے کے نام یہ وصیت چھوڑی کہ وہ ان سرکش قبائل سے جو دارالحکومت سے اس قدر قریب ہیں خبردار رہے اور محمود کے بیٹے نے کوہ پیما کی طرف جہاں یہ سرکش افغان رہتے تھے اپنی فوج روانہ کی- اس فوج کو یہ حکم تھا کہ وہ اس علاقہ کا خیال رکھے تاکہ وہاں بدامنی نہ پھیلے- قریب قریب ان ہی الفاظ میں آج حکومت پاکستان کسی ایسے افسر کو جو سرکش افریدیوں یا محسود سے نپٹنے پر مامور کیا گیا ہو ہدایات دے سکتی ہے-

محمود کو اس کی وفات کے بعد پٹھان کا جو اعزازی لقب دیا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ محمود نے ان فوجوں کی مدد سے جن کی بیشتر تعداد سرحدی قبائل سے بھرتی کی گئی تھی اور جن کا علاقہ غزنی سے قریب تھا شاندار فتوحات کیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ محمود کے زمانہ میں یہ قبائل بہت بڑی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہوئے- ان میں سے بہت سوں نے غالباً صفاریوں کی فوج میں رہتے ہوئے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اسلام جو اس دنیا میں عظمت اور آخرت میں عافیت کا وعدہ کرتا ہے ان کی دلی ترغیب کے عین مطابق ہے- لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بڑی تعداد میں اس علاقہ میں اسلام لانے کا سلسلہ محمود کے زمانہ میں شروع ہوا - ہمعصر مصنف البیرونی کی جو عبارت اس سے پہلے نقل کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود سے پہلے اس علاقہ کے لوگ بڑی تعداد میں مسلمان نہیں ہوۓ تھے- محمود کے زمانہ میں اسلام کے اتنی تیزی سے پھیلنے کی محض یہ وجہ نہیں ہے کہ محمود ہر جنگ میں کامیاب ہوتا تھا بلکہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا دارالحکومت پٹھانوں کی سرزمین سے بہت قریب تھا- العتبی کا کہنا ہے کہ اپنے والد سبکتگین کی طرح جب محمود نے بلخ پر چڑھائی کی تو پہلے کی طرح اس موقع پر بھی خلج اور افغان اس کی فوج میں شامل تھے اور بلا خوف تردید یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خلج اور افغان محمود کے ساتھ ہندوستان بھی گئے ہوں گے محمود کے عہد میں پٹھان جزیرہ نمائے ہند کے ہر اس گوشے میں پہنچنا شروع ہوگئے جہاں تاریخ کے کسی دور میں مسلمانوں کی کوئی فوج پہنچی ہے-

جس فیصلہ کن جنگ میں محمود نے ہندو شاہی جے پال کو شکست دی

وہ اس میدان میں لڑی گئی جس کا تعین نہیں کیا جا سکا لیکن جو پشاور کے قرب وجوار میں تھا۔ یہ واقعہ ۱۰۰۰ء (۳۹۱ ھجری) کا ھے چند سال بعد ۱۰۰۸ء (۳۹۹ ھجری) میں جے پال کے جانشین انند پال کے زمانہ میں پھر لڑائی ھوئی۔ انند پال نے اپنی مدد کے لئے پورے شمالی ھند سے جنگجو فوجیں بلا لیں۔ پختو وقائع نگار کے الفاظ کے مطابق مسلمانوں کے خلاف لڑائی ھندووں کی نظر میں نیکی کا کام ھے اس لئے تمام راجے جمع ھو گئے۔ وہ اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دھلی، اور اجمیر جیسے دور دراز مقامات سے آئے تھے۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ انندپال کی حمایت میں پشاور کے میدان میں جمع ھوئے،،۔

لیکن یہ سب تیاریاں رائگاں گئیں۔ راجپوتوں کا غرور ایک بار پھر خاک میں مل گیا۔ تاریخ کی کتاب میں یہ تذکرہ نہیں ھے پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفتوحین میں سے بہت سے لوگ وادی پشاور کے باشندے تھے یعنی گندھارا کے لوگ تھے۔ ان میں وہ افغان ضرور شامل ھوں گے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ھوئے تھے۔ البیرونی کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ھے اس سے کافی نتائج نکالے جا سکتے ھیں۔ ھمیں یہ بھی معلوم ھے کہ اس زمانہ میں ھزاروں ھندو مشرف بہ اسلام ھوئے۔ یہ بات عین قرین قیاس ھے کہ بہت سے مفتوحین محمود کی فوج میں شامل ھوگئے اور پھر ھندوستان پر حملے میں شریک ھوئے۔

البیرونی نے بڑی عمدہ عبارت لکھی ھے۔ جو اس آخری بہادر ھندو بادشاہ کو خراج عقیدت بھی ھے اور صاحب تحریر کی وسیع النظری کا ثبوت بھی وہ لکھتا ھے۔ ''مجھے انند پال کے خط کی مندرجہ ذیل عبارت بہت پسند ھے۔ انند پال نے شاہ محمود کو یہ خط ایسے وقت میں لکھا ھے جبکہ دونوں کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ ''مجھے معلوم ھوا ھے کہ ترکوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ھے اور خراسان میں پھیل گئے ھیں اگر آپ کی اجازت ھو تو میں پانچ ھزار شہسوار اور دس ھزار پیادے اور ایکسو ھاتھی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ھو جاؤں یا آپ کی اجازت ھو تو اپنے فرزند کو اس سے دوگنی فوج دے کر بھیج دوں۔ اس پیشکش سے میری نیت یہ نہیں ھے کہ آپ کو مرعوب کروں۔ مجھ پر آپ نے فتح پائی ھے اس لئے میں یہ نہیں چاھتا کہ کوئی اور آپ پر فتح پائے،،۔

محمود غزنوی کا ۱۰۳۰ء میں انتقال ہوگیا اس کے بیٹے مسعود نے ہندوستان میں غزنوی عروج کو برقرار رکھا لیکن اسے کسی نے قتل کردیا۔ اس کی موت کے بعد شمال اور مغرب کی سمتوں سے دباؤ پڑنے کی وجہ سے غزنوی طاقت کا زوال شروع ہوگیا اور اب ہم ایسے دور میں داخل ہوتے ہیں جس میں ہر طرف افرا تفری نظر آتی ہے۔ سلجوق جو غز کے ترکوں کی ایک شاخ تھے آمو دریا کے اس پار سے پیش قدمی کرکے ۱۰۵۰ء میں بزور شمشیر ایران کے مالک بن بیٹھے۔ پھر وہ مرو اس کے بعد اصفہان (۱۰۶۳ء) اور آخر کار (۱۰۹۱ء) بغداد پر بھی قابض ہوگئے عظیم المرتبت سلجوق سلطان الپ ارسلان (۱۰۶۳-۷۲) نے ہرات سے غزنی پر چڑائی کی اور اس کے حاکم کو سلجوق سلطنت کا باج گزار بنا لیا۔ غزنوی خاندان کا آخری حکمران جسے کچھ شہرت حاصل ہوئی ہے بہرام شاہ (۱۱۱۸-۴۹ء) تھا۔ اس نے ایک سلجوق شہزادی سے شادی کی تھی اس لئے وہ باج گزار حاکم کی حیثیت سے اپنے بھائی کی جگہ لینے کے لئے آخری مشہور سلجوق سلطان سنجر کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن بہرام کے ساتھ محمود کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور اس کے زمانہ میں پہلی مرتبہ غزنی کو اس بری طرح لوٹا گیا جس طرح بعد میں چنگیز خان نے تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا۔

سلجوقیوں کے دباؤ سے غزنویوں کا زور ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ غور کے شنسبانی شہزادوں کا عروج شروع ہوگیا جو محمود کے زمانہ میں غزنی کے باج گزار تھے۔ غور کے سردار افغان نہیں تھے۔ کچھ قدیم مورخ جو پشتو نہیں جانتے تھے غور کو جو مشرقی ایران کے وسطی پہاڑی سلسلہ کا نام ہے غر سمجھ بیٹھے جو پہاڑ کے لئے پشتو کا لفظ ہے۔ اور اس طرح وہ غوریوں کو افغان قرار دیتے ہیں غور اس علاقہ کا پرانا نام ہے جو اب ہزارہ جات کہلاتا ہے۔ اس علاقہ میں منگولوں کے زمانہ سے جو لوگ بستے چلے آتے تھے وہ ہزارہ کہلاتے تھے۔ در اصل یہ وہ آبادکار تھے جنہیں اس علاقہ میں چنگیز خان کے جانشین چھوڑ گئے تھے۔ بارھویں صدی میں یعنی اس زمانہ میں جس کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اس علاقہ میں غالباً مشرقی ایران کی ایک نسل بستی تھی جسے افغان اور ترک دونوں تاجیک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن ہم اس امکان کو قطعی طور پر مسترد نہیں کر سکتے کہ خود شہزادوں میں ترک خون کی آمیزش ہوگی خواہ وہ خالص ترک

نہ ہوں۔ دوسرے تمام خاندان جو سابق سامانی سلطنت کا حصہ تھے اور غور کے ارد گرد آباد تھے مثلاً سلجوق غزنوی یا قراخانی یہ سب کے سب ترک تھے۔ ایسے خلط ملط میں غور کے شہزادوں کے لئے اپنے ایرانی خون کو آمیزش سے پاک رکھنا بڑا مشکل ہوگیا ہوگا۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ یہ شنسبانی سردار اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس سے نسب ناموں کے ماہر بی بی متو کے خوش نصیب عاشق اور غلجیوں اور لودھیوں کے جد امجد حسین کا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کہانی میں یہ اضافہ ان مصنفوں نے کیا ہے جو ہندوستان میں بیٹھے تھے اور جو بہت بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جب غور کے شہزادے ہندوستان کے شہنشاہ بن چکے تھے۔

غوری غزنی کے راستے سے ہندوستان میں برسراقتدار آئے بہرام شاہ کی حکومت کے ابتدائی دور میں غور کے ملک سیف الدین سوری نے بغاوت کردی اور تھوڑے عرصہ کے لئے غزنوی حکمران کو ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ لیکن بہرام شاہ کھویا ہوا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے رات کی تاریکی میں غزنی پر حملہ کردیا اور چونکہ دشمن مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے بہرام شاہ سیف الدین کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سیف الدین کو اس کے وزیر کے ساتھ جو ایک سید تھا ایک مریل اونٹ پر بٹھاکر شہر کی سڑکوں پر پھرایا گیا پھر اس کا سر اڑا دیا گیا اور دھڑ دریائے غزنی کے پل سے باندھ کر نیچے لٹکا دیا گیا۔ ان حرکتوں کا عبرتناک انتقام مقدر ہو چکا تھا۔

۱۱۵۰ء میں سیف الدین کے بھائی علاوالدین نے جو تاریخ میں جہاں سوز کے نام سے مشہور ہے علاقہ غور سے بہت بڑی فوج بھرتی کی، بہرام کی فوج کو غزنی کی شہر پناہ کے قریب شکست دی اور زبردست حملہ کر کے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد اسے لٹوادیا شہریوں کا قتل عام کیا اور بعد میں شہر میں آگ لگادی۔ وقائع نگار اس غارت گری کا گہرا اثر قائم رکھنے کے لئے مرنے والوں کی صحیح تعداد نہیں بتاتے۔ آگ کے شعلے سات دن اور سات راتوں تک بھڑکتے رہے اور اندازاً ستر ہزار افراد یا تو قتل کردئے گئے یا شعلوں کی نذر ہوگئے۔ محمود غزنوی کے سوا تمام بادشاہوں کی قبریں کھود کر پھینک دی گئیں اور ان کی ہڈیاں جلادی

گئیں۔ علاوالدین کا جی ان وحشیانہ حرکتوں سے بھی ٹھنڈا نہیں ہوا وہ بست پہنچا جو الرخج کا دارالحکومت رہ چکا تھا اور غزنوی سلطنت کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ وہاں اس نے شہر پناہ محلات اور ان سرکاری عمارتوں کو تباہ کر دیا جن کا ثانی وقائع نگار کے الفاظ کے مطابق کم از کم اس دنیا میں ملنا مشکل ہے کسے معلوم کہ جب غور کے شنسبانی شہزادے علاوالدین نے غزنی اور بست کو نذر آتش کر دیا تو کیسی کیسی کتابیں صفحۂ ہستی سے محو ہو گئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر البیرونی کے سفرنامہ کے ساتھ اس عظیم الشان سلطنت کی مثالیں بھی موجود ہوتیں جس کا دارالحکومت افغان علاقہ کے عین وسط میں واقع تھا تو عین ممکن ہے کہ قبائل روہ کی تاریخ بابر کے عہد سے چار سو سال پہلے شروع ہوئی ہوتی۔

ایک سال بعد علاوالدین کو اپنی خود سری کی سزا بھگتنا پڑی۔ اس نے غرور کی وجہ سے سلجوق سلطان سنجر کو خراج ادا کرنے سے انکار کردیا چنانچہ اس سے حکومت چھین لی گئی اور اسے ہرات کے قریب ایک لڑائی میں قیدی بنا لیا گیا۔ اس کے بعد وہی الٹ پھیر ہوئی جس کی مثالیں مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں بکثرت ملتی ہیں۔ دو سال بعد ۱۱۵۳ء میں خود سلطان سنجر شمال کی طرف سے حملہ کرنے والے غز ترکوں کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ حملہ آور ترکمان تھے۔ اس طرح قریب قریب ایک ہی وقت میں دو بڑی بڑی سلطنتیں یعنی سلجوق اور غزنوی سلطنتیں ختم ہوگئیں۔ اب غور کے شہزادوں کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔

لیکن غوری خاندان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ان ترکمانوں نے غزنی کے آس پاس وادی کرم اور گردیز میں پاؤں جمالئے اور قریباً دس سال کے درمیانی عرصہ میں جبکہ کوئی بڑا سلطان موجود نہیں تھا اجڑے ہوئے دارالحکومت غزنی میں بھی ترکمانوں ہی کا حکم چلتا تھا۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے اور ریورٹی نے اس کی تائید کی۔ ہے کہ کرلانی پٹھان قبائل جو بالائی بنگش میں آباد ہیں یعنی توری منگل مقبل اور زازی حتیٰ کہ ننگرہار کے خوگیانی بھی ان ہی ترکمانوں کی نسل سے ہیں۔ اس نظریہ کی حمایت میں عام طور پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قبائلی نام توری اور لفظ تورانی میں بڑی مماثلت ہے۔ تورانی ایک عام لقب ہے جو فردوسی

اور دوسرے مصنفوں نے ایک وسیع معنی میں استعمال کیا ہے اور اس کے استعمال سے ترکی علاقہ اور ترکوں کو فارسی ایران سے ممیز کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ جاندار دلیل یہ ہے کہ یہ وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ ترکمان ایک عرصہ تک بالائی کرم پر قابض رہے چنانچہ اس علاقہ میں اور اس کے آس پاس ابھی تک بعض مقامات ترکی ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ ننگرہار میں پیش بلک (پانچ چشمے) اس کی واضح مثال ہے۔

میری رائے میں یہ نظریہ مشتبہ ہے۔ توری اور ان کے ہمسائے دوسرے کرلانی پٹھانوں کے درمیان آباد ہیں۔ ان کے شمال مشرق میں افریدی اور اورکزئی اور جنوب مغرب میں خٹک بنگش اور وزیر بسے ہوئے ہیں۔ وہ تمام کرلانیوں کے وسط میں ہیں۔ توری وسیع اور زرخیز میدان میں بسے ہوئے ہیں اور دوسرے قبیلے پہاڑی ہیں۔ خاص طور پر اورکزئیوں اور وزیریوں کے اطوار اور حلیہ سے یہ فرق اور بھی واضح ہوتا ہے۔ یہ مفروضہ بھی اتنا ہی معقول ہے کہ تمام کرلانی پٹھان ترکمانوں کی نسل سے ہیں۔ یہ بات صحت سے زیادہ قریب ہے کہ توری اور منگل قبیلوں کو کرلانی کے شجرے میں اس محکم عقیدہ کی بنا پر شامل کیا گیا ہے کہ دوسرے کرلانیوں کی طرح یہ قبیلے بھی پہاڑی پٹھانوں کے اس اصل گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو آس پاس کے علاقوں میں آباد ہے روہ کے دوسرے باشندوں کے مقابلہ میں یہ پہاڑی پٹھان ترک وطن اور نقل مکانی سے بہت کم متاثر ہوئے ہیں۔ توریوں کے متعلق اس دعوے سے کہ وہ ترکی‌النسل ہیں اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ غلجیوں کے برعکس ان کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ترک رہے ہوں گے۔

علاوالدین جہاں سوز کے غائب ہوجانے اور غزنوی اور سلجوقی سلطنتوں کے ختم ہو جانے کے بعد غور کا اقتدار علاوالدین کے دو بھتیجوں غیاث‌الدین اور معزالدین کے ہاتھ آگیا۔ دونوں محمد بن سام کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان دونوں کے طویل نام یوں بھی غیر مانوس ہیں پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ معزالدین کو بار بار شہاب‌الدین کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں معزالدین محمد غوری کے نام سے مشہور ہے جو سیدھا سادہ نام ہے۔ میں بھی اس کا تذکرہ اسی نام کے ساتھ کروں گا۔

دونوں بھائی ۱۱۷۳ء میں غزنی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بڑے بھائی نے غزنی جاگیر کے طور پر چھوٹے بھائی کو بخش دی اور خود فیروز کوہ کو اپنا دارالحکومت بنا کر غور پر حکومت کرتا رہا۔ اسی غزنی سے ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوا تھا اور محمد غوری نے ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس نے یہ کام ان فوجوں کی مدد سے کیا تھا جن میں سب نہیں تو بیشتر سپاہی خلج اور افغان تھے۔ ۱۱۷۸ء میں اس نے دریائے سندھ پار کیا اور ملتان کے قریب آچ پر قبضہ کرلیا۔ ۱۱۸۲ء میں اس نے زیریں سندھ پر فوج کشی کی اور ساحل سمندر کے ساتھ کے علاقہ کو فتح کرنے کے بعد اصل جد و جہد کی تیاری کے لئے غزنی واپس آگیا۔ یہ تیاری دھلی پر چڑائی کے لئے تھی جو شمالی ہند میں ہندو حکومت کا مرکز تھا۔

محمد غوری نے دھلی پر پیش قدمی سے پہلے ۱۱۸۶ء میں اہم شہر لاھور پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں بابر نے بھی ایسا ھی کیا تھا۔ لاھور میں غزنوی خاندان کا آخری چراغ اور بہرام شاہ کا بیٹا خسرو موجود تھا جسے محمد غوری نے قید کر لیا اور اپنے راستہ سے ھٹا دیا۔ جب اس کے مسلم حریف میدان میں نہیں رھے تو ھندوستان پر حملہ کے لئے راستہ صاف ھو گیا۔

۱۱۹۰ء میں دھلی پر اس کا پہلا حملہ ناکام رھا۔ دھلی سے ستر میل شمال میں کرنال کے قریب نارائن کے میدان میں رائے پتھورا نے جو پرتھوی راج کے نام سے زیادہ مشہور ھے خلجیوں اور افغانوں کو پہلی مرتبہ یہ تجربہ کرایا کہ کھلے اور ھموار میدان میں راجپوتوں کا حملہ کتنا شدید ھوتا ھے۔ محمد غوری خود بھی زخمی ھو گیا اور ایک نوجوان خلجی سپاھی کی بروقت مداخلت کی بدولت اس کی جان بچ گئی۔ اس شکست کا بدلہ لینے کی دیوانگی میں اس نے اگلے سال پھر چڑھائی کی اور ایک بار پھر کرنال کے قریب اسی میدان میں چوھان راجہ پرتھوی راج سے اس کا مقابلہ ھوا۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں طرف کی فوجوں نے خوب داد شجاعت دی جس کا تذکرہ آج تک کیا جاتا ھے۔ پرتھوی راج مارا گیا اور اس کے ساتھ ھندوستان میں ھندوؤں کا اپنی بہادری پر غرور بھی خاک میں مل گیا۔ راجپوتانہ کی پہاڑیوں اور ریگستان کو چھوڑ کر پورے شمال ھند میں

انیسویں صدی کے آغاز میں رنجیت سنگھ کے زمانہ تک کوئی ہندو برسراقتدار نہیں آیا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان کو خاص طور پر خلجی اور افغان سپاہیوں کی مدد سے فتح کیا گیا۔ تاریخی کتابوں کے ارشادات کے علاوہ دھلی کے مسلمان حکمرانوں کے تمام واقعات کے ساتھ خلجیوں اور افغانوں کا تذکرہ ضرور پایا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی فتح میں ان کا کتنا بڑا ھاتھ تھا۔

محمد غوری ۱۲۰۶ء تک تخت پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ اسے دریائے سندھ کے کنارے اس کے خیمہ میں قتل کر دیا گیا۔ دھلی فتح کرنے کے بعد محمد غوری نے خوارزمی سلطنت کے خلاف صف آرائی کر کے اپنی پوزیشن کو خطرہ میں ڈال دیا یہ سلطنت سلجوقیوں کے عہد میں آمو دریا کے زیریں علاقہ میں قائم ہوئی تھی جہاں آج کل خیوا واقع ہے۔ بعد کی صدیوں میں روسیوں پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خیوا (جو کبھی خوارزم تھا) کا سر سبز و شاداب علاقہ ہر طرف سے ریگستان اور بحیرہ ارل سے گھرا ہوا ہے اور برفانی طوفانوں اور ناقابل برداشت گرمی کی وجہ سے اس تک پہنچنا مشکل ہے۔ خوارزم کے اس لق و دق علاقہ کے عقب میں جو علاقہ متعدد نہروں کی وجہ سے سر سبز و شاداب ہے اس میں خوارزم شاہوں کے مقرر کردہ گونر جنھیں ان کا عہدہ نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا رہتا تھا بر سر اقتدار آ گئے تھے۔ یہ حاکم سلجوقی سلطنت ہی کا ایک حصہ تھے اور اعلیٰ تہذیب اور ثقافت کے مالک تھے۔ محمد غوری کے زمانہ میں اس حکمراں خاندان کا نمائندہ آخری با اثر سلطان محمد شاہ تھا۔ اور اس کے بیٹے جلال الدین کے لئے چنگیز خان منگول کی سفاک فوجوں کے مقابلہ پر شکست مقدر ہو چکی تھی لیکن غوریوں کے لئے محمد شاہ کافی طاقتور حریف تھا۔ چنانچہ محمد غوری کو پسپا ہونا پڑا اس کی فوج تتر بتر ہو گئی اسے پنجاب میں بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور آخر ایک قاتل کے خنجر نے اس کا کام تمام کر دیا۔ محمد غوری کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ دھلی میں اس کا وارث اس کا ترک مملوک قطب الدین ایبک اور غزنی میں ایک اور مملوک ایلدیز بنا۔ دھلی میں قطب الدین کے جانشین مملوک ۱۲۹۰ء تک بر سراقتدار رہے پھر سلطنت خلجیوں کے ھاتھ میں چلی گئی۔ غزنی میں ۱۲۱۵ء میں خوارزم کے محمد شاہ نے دارالحکومت اور سندھ کے پار کا تمام علاقہ ایلدیز سے چھین لیا۔ یہ وہی محمد شاہ ہے جس نے دس سال پہلے محمد غوری کے

حملے کو پسپا کیا تھا۔

یہ دونوں ترک مملوک قطب‌الدین اور ایلدیز اپنی مختصر معیاد حکومت اور غلام‌النسب ہونے کے علاوہ کچھ اور وجوہ کی بنا پر بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ قطب مینار جو دھلی سے دس میل جنوب میں ہے (سرخ پتھر سے بنا ہوا) اس کا نقشہ ان دونوں میں سے ایک نے بنایا تھا اور اسی نے تعمیر کی ابتدا کی تھی۔ دوسرے کا نام جس کے معنی ترکی میں چاند تارا ہیں عثمانی سلطنت کے پرچم کی ابتدائی شکل ہے۔ بعد میں قریب قریب ہر اسلامی مملکت نے کسی نہ کسی شکل میں ہلال اور ستارہ کو اپنا لیا۔

اس دور میں روہ کا علاقہ منگولوں کے حملہ کی پیدا کردہ افراتفری کا شکار ہونے والا تھا۔ لہٰذا ہمیں خلج یا خلجیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے اور ان کی اصل معلوم کرنے کے لئے کسی اور طرف رخ کرنا ہوگا، کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات میں اضافہ کے ساتھ خلجی بھی زیادہ سے زیادہ منظر عام پر آنے لگے ہیں۔ غوری شہزادوں کا اپنا خاندان خواہ کوئی بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے امور سلطنت ترک غلاموں کے سپرد کر رکھے تھے اور فوج میں خلج سپاہی بھرتی کر رکھے تھے۔ تواریخ کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خلج یا خلجیوں کو بیشتر مواقع پر افغانوں کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے۔ اور جب تاریخ نویسی کے لئے عربی کی جگہ فارسی نے لے لی تو خلج کی جگہ عام طور پر خلجی استعمال ہونے لگا۔

ابتدا ہی سے یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ ایک طرف ترک مملوک اور دوسری طرف خلجی اور افغان دو مختلف کردار ادا کر رہے تھے۔ سلطنت عثمانی کے جاں‌نثاروں کی طرح ترک بھی سلطان وقت کے زرخرید غلام ہوتے تھے۔ انہیں خود بادشاہ یا بادشاہ کا مقرب پسند کرتا تھا اور ان سے شاہی محافظوں کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ صرف بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھے انہیں تنخواہ دینا ضروری نہیں تھا پھر بھی دانشمند بادشاہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ اس کے ذاتی محافظ مطمئن اور آسودہ رہیں۔ اپنے رتبہ کی بدولت انہیں بہت سے مستقبل فائدے حاصل تھے اور اعلیٰ عہدہ تک پہنچنے

کا بھی موقع تھا۔ اس طرح محمد غوری کی وفات کے بعد دھلی میں اس کے تخت پر اس کا منظور نظر ترک غلام قطب الدین ایبک بیٹھا اور قطب الدین کے بعد مملوک بادشاھوں کا دور تقریباً ایک صدی تک قائم رھا۔ ان مملوکوں کی سب سے بڑی صفت ان کی وفاداری اور کارکردگی تھی جس کی وجہ سے ترک ھمیشہ مشھور رھے ھیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری تمام مملوک خاندانوں کی طرح اس سلطان کی وفات کے بعد منظر عام پر آئی تھی جو ان کا مالک ھوتا تھا۔ روایات کے مطابق سلطان کے زمانۂ حیات میں ان سب کا مرتبہ مساوی ھوتا تھا لیکن سلطان کی آنکھ بند ھوتے ھی اس کے ساتھ ان کی ذاتی وفاداری بھی ختم ھوجاتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر لیڈر نہیں بن سکتا تھا تو آپس میں خوب لڑائی ھوتی تھی نئے سلطان کے منظور نظر دوسرے لوگ ھوتے تھے جو مرحوم سلطان کے مملکوں سے کدورت رکھتے تھے۔ اکثر یہ مملوک اپنی جان پر کھیل کر ایسی حرکت کر بیٹھتے تھے جس سے نہ صرف ان کی بلکہ پوری سلطنت کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔

اس کے برخلاف خلجی جن کا تذکرہ بیشتر تاریخی کتابوں میں افغانوں کے ساتھ آتا ھے بظاھر پیشہ‌ور سپاھی ھی بنے رھے۔ وہ کسی ایک سلطان کے ذاتی وفادار نہیں تھے بلکہ ھر اس حکمران کی ملازمت اختیار کر لیتے تھے جو انہیں تنخواہ دے سکتا تھا یا لوٹ مار کا موقع دے کر انہیں مالی فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ اس طرح اپنے قبیلہ سے وفاداری کی بنا پر انہیں مملوک بنانا خطرناک تھا لیکن تنخواہ دار سپاھی کی حیثیت میں ان پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ کتابوں سے ظاھر ھے وہ اپنے اپنے قبیلہ سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے اور اپنے اپنے سردار یا ملک کے وفادار رھتے تھے۔ چنانچہ حکمران کے مرنے سے ترک مملوکوں کے برخلاف ان کا شیرازہ منتشر نہیں ھوتا تھا ان کے اقتدار کی جڑیں مضبوط تھیں اور وہ اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ ثابت قدم تھے۔ یہ بھی ظاھر ھوتا ھے کہ ترک تعداد میں تھوڑے تھے لیکن چیدہ افراد کی مختصر سی ٹولی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے برخلاف خلجی اور افغان تعداد میں بہت زیادہ تھے البتہ مملکت کے مفاد کے نکتہ نظر سے ان کی تنظیم مضبوط نہیں تھی۔

محمد غوری کے زمانہ سے ہندوستان کی تاریخ میں خلجی (۱) زیادہ سے زیادہ ممتاز ہوتے چلے گئے۔ اس امتیاز کی ایک مثال محمد بختیار ہے جو محمد غوری کے زمانہ میں غزنی میں جبری فوجی بھرتی کے محکمہ کا سربراہ تھا۔ اس کے عہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غوری سلطان کی فوجوں میں خلجیوں کی بھرتی کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ پھر اس محکمہ کے سربراہ کو غزنی میں جو موجودہ خلجی قبائل کا مرکز ہے مقرر کرنا بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بختیار اپنے عہدہ میں ترقی کے امکانات نہ دیکھ کر دھلی چلا گیا۔ اسے اودھ میں جاگیر مل گئی اور اس نے بہار کی بچی کھچی ہندو ریاستوں پر یلغار شروع کردی۔ اس کی بہادری اور لوٹ مار کی شہرت سن کر بہت سے خلجی جو اس کے ہم قبیلہ تھے اس کے پاس آگئے اور وہ پورا بہار اور شمالی بنگال فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے بھیس بدل کر تن تنہا ایک ہندو راجہ کی راجدھانی میں داخل ہو کر شہر پر قبضہ کر لیا اور اس طرح شیر شاہ کے لئے ایک نظیر قائم کردی جو تین صدیوں کے بعد اسی ترکیب سے کام لینے والا تھا۔ وہ برائے نام سلطنت دھلی کا باج گزار تھا۔ اس کی حیثیت کاؤنٹ پلاٹین (COUNT PLATINÉ) جیسی تھی۔ اس نے اپنی قلمرو میں تمام اہم عہدے چھانٹ کر خلجیوں کو تفویض کئے۔ وہ صرف تین سال (۵-۱۲۰۲ء) حکمران رہا اور یکے بعد دیگرے دو خلجی سردار اس کے جانشین ہوئے۔ اس میں سے دوسرے سردار کو ۱۲۲۲ء میں التمش نے کچل دیا جو قطب الدین کی جگہ دھلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس طرح پہلی نیم خود مختار خلجی مملکت پچیس سال قائم رہی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہار میں خلجیوں کے ایک طاقتور گروہ کی موجودگی خلجی قبائل کے لئے مقناطیس ثابت ہوئی جو قرون وسطیٰ میں ھجرت کر کے برابر بہار پہنچتے رہے۔ اور یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کہ وقت آنے پر شیر شاہ نے مغلوں کے مقابلہ میں اسی علاقہ کو اپنا مرکز بنایا۔ درحقیقت بہار اور روھیلکھنڈ دونوں علاقوں میں مغلوں کے زمانہ سے کہیں پہلے خلجی اور افغان پہنچ چکے تھے۔

خلجیوں کا قصہ مکمل کرنے کے لئے بعد میں پیش آنے والے کچھ واقعات کا اسی موقع پر تذکرہ کردینا ضروری ہے۔ ہندوستان میں باقی دو

(۱) طبقات ناصری اور منہاج السراج میں خلجیوں کی ریاستوں اور جاگیروں کی تفصیل درج ہے۔

خلجی سلطنتوں میں سے ایک تو دھلی کا حکمراں خاندان تھا۔ اس خاندان میں علاوالدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶) سب سے زیادہ مشہور ہے اور دوسرا خاندان مالوہ کے خلجی تھے (۱۵۱۰-۱۴۳۵ء) جن کا شاندار دارالحکومت مانڈو تھا۔ اس کے کھنڈر آج بھی وادی نربدا کے کنارے ایک بلندی پر عظمت دیرینہ کا پتہ دیتے ھیں۔

دھلی میں حکمران خلجی خاندان مملوکوں پر پیشہور سپاھیوں کے غلبہ کا مظہر تھا۔ دھلی کے مملوک بادشاھوں میں سے آخری بااثر بادشاہ بلبن تھا۔ وہ خلجیوں اور افغانوں پر بھروسہ کرتا تھا چنانچہ اس نے جلال الدین نامی ایک خلجی کو فوجوں کا داروغہ مقرر کیا۔ بلبن ۱۲۸۷ء میں فوت ھوگیا اور اس کی جگہ اس کا پوتا کیقباد تخت نشین ھوا جو دائم المرض اور نکما تھا۔ تاریخ میں لکھا ھے کہ سلطان کیقباد دھلی کے قریب کلو گڑھی میں اپنے دیہی محل میں بیمار اور بے بس پڑا تھا اور معالج اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسی اثنا میں جلال الدین جو فوجوں کا میر منشی تھا بہارپور گیا ہوا تھا جہاں اس نے فوجوں کا معائنہ کیا۔ وہ اپنی نسل کے اعتبار سے ترکوں سے جدا تھا اس لئے وہ ترکوں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا دوسری طرف ترک بھی اسے اپنا دوست نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ۱۲۹۰ء کا واقعہ ھے۔

یہاں خلجی اور ترک کا جو فرق واضح کیا گیا ھے وہ قابل غور ھے۔ یہ حقیقت بھی قابل غور ھے کہ بختیار خلجی کی طرح جو اس سے پہلے ھو گزرا تھا جلال الدین خلجی بھی ایسے عہدہ پر فائز تھا جو فوج کی بھرتی اور اسے تنخواہ بانٹنے سے متعلق تھا۔ اس طرح اس معاملہ میں خلجیوں کی اھمیت واضح طور پر ثابت ھو گئی۔ اس بیان سے اس دعوے کو بھی تقویت ملتی ھے کہ ھندوستان پر چڑھائی کرنے والی مسلمانوں کی فوج میں خلجیوں کو ھراول کی حیثیت حاصل تھی۔ تاریخ میں آگے چل کر لکھا ھے کہ دوستوں اور دشمنوں نے جلال الدین کے ساتھ اپنے معاملات طے کر لئے۔ وہ بہار پور سے بہت بڑی شہسوار فوج کے جلو میں کلوگڑھی پہنچا جہاں اسے تخت پر بٹھایا گیا۔ دھلی کی بیشتر آبادی جلال الدین کی مخالف تھی چنانچہ وہ کچھ دنوں تک اپنے مخالفوں کے ڈر سے دھلی میں داخل نہیں ھوا اور نہ کسی نے اسے مبارکباد پیش کرنے

کے لئے کلوگڑھی پہنچنے کی کوشش کی۔ دھلی کے لوگ خلجی ملکوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سلطان کیقباد کی موت سے سلطنت ترکوں کے هاتھ سے نکل گئی۔

جلال‌الدین خلجی نے فیروز شاہ کا لقب اختیار کیا اس نے صرف چھ سال حکومت کی اسے اس کے بھتیجے علاوالدین خلجی کے ایما پر قتل کر دیا گیا۔ علاوالدین (۱) ہندوستان کا ایک بے رحم اور مطلق‌العنان لیکن سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ ہو گزرا ہے۔ اس سے پہلے یا بعد میں کسی هندو، بودھ، مسلمان، موریہ یا مغل حکمران ۔ جزیرہ نمائے هند کے اتنے وسیع خطہ پر حکومت نہیں کی۔ (جب تک کہ پورا برصغیر برطانوی دور حکومت میں متحد نہ هوا) اس نے نظم و نسق اور مالیہ کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جسے بعد میں شیر شاہ اور اکبر نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اکبر کی طرح اس کے مغرور ذهن میں بھی یہ بات آئی تھی کہ پوری سلطنت میں تمام مذاهب کے خلاصہ پر مشتمل ایک نیا مذهب رائج کیا جائے جس پر اس کا کنٹرول هو۔ لیکن اکبر کے برعکس علاوالدین اس معاملہ میں خوش قسمت تھا کہ اس کے درباریوں میں قریب قریب اس کا هم نام علاء الملک بھی شامل تھا جو اتنا عقلمند اور جرأت مند تھا کہ اس نے ایسی کافرانہ تجویز کی مدلل مخالفت کی۔ علاء الملک نے علاوالدین خلجی کو سمجھایا کہ بادشاهوں کے لئے پیغمبروں کی حیثیت اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ علاوالدین نے سمجھ بوجھ سے کام لے کر یہ نصیحت مان لی۔

۱۳۲۱ء میں علاوالدین کے بیٹے اور جانشین مبارک شاہ کو خسرو خان نامی ایک نو مسلم نے جو اس کا منظور نظر تھا قتل کر دیا اور اس طرح دھلی کے حکمران خلجی خاندان کا خاتمہ هوگیا۔

مالوہ میں خلجی خاندان دھلی کے خلجیوں کے زوال سے ایک سو سال سے زائد عرصہ کے بعد ۱۴۳۵ء میں بر سر اقتدار آیا۔ اس خاندان نے مانڈو

---

(۱) یہ جلال‌الدین اور علاوالدین خوارزم کے جلال‌الدین اور علاوالدین جہانسوز سے مختلف هیں۔ اس فصل میں ان چاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی لکھی هوئی تواریخ کا ایک سقم یہ بھی هے کہ مختلف افراد کے لئے ایک هی نام بار بار استعمال کیا گیا ہے۔

کے محلات کے سوا اور کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ اس خاندان کا سب سے مشہور شہزادہ محمود ہے جو وزیر تھا اور جس نے اپنے آقا کو زہر دے کر سلطنت پر قبضہ کرنے کی سازش کی تھی۔ اس کے متعلق تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ اپنی نسل کے اعتبار سے ترکستان کا خلجی ترک تھا۔ اس طرح ہم گھوم پھر کر پھر اسی سوال پر لوٹ آئے کہ خلجیوں میں ترک نسل کے اثرات کس طرح شامل ہوئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خلجی کون تھے؟

اس سے پہلے باب میں وہ وجوہ بیان کی گئی ہیں اور میرے نزدیک وہ وجوہ حرف آخر ہیں جن کی بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خلجی سفید ھنوں یا افتھالیوں کی نسل سے تھے جنہیں مسلم مورخ ھیاتلہ یا ھیتال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ھیاتلہ قرون وسطیٰ میں غز کے حملوں سے کئی صدی پیشتر کوہ سلیمان کے علاقہ میں داخل ہوئے تھے اور وہ شمال میں بسنے والی بڑی قدیم ترک ایرانی نسل کی نمائندگی کرتے تھے۔ میرا یہ یقین ہے کہ خلج غز کے ترک سلجوق یا ترکمان نہیں تھے۔ کیونکہ یہ ترک غزنوی دور میں اور اس کے بعد غزنی آئے جبکہ خلج، جنہوں نے محمود کے ساتھ جنگوں میں حصہ لیا تھا وہاں اپنے پاؤں جما چکے تھے۔ تواریخ کی بنیاد پر خلج اور ھیاتلہ کا تعلق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر انہیں نسل کے اعتبار سے ترک سمجھا گیا اور اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خلج اسلامی فتوحات سے پہلے غزنی میں کس طرح بس گئے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خلج اور ہندوستان کے حکمران خلجی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ الخوارزمی اور دوسرے مورخوں نے جن لوگوں کے لئے خلج کا نام استعمال کیا تھا بعد کے مورخوں نے ان کے لئے اسی لفظ کی فارسی شکل یعنی خلجی کا استعمال شروع کردیا ریورٹی بھی جو خلج اور خلجی میں مطابقت ظاہر کرنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے یہ اعتراف کرنے کو تیار ہیں کہ خلجی خلج کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا خلجی افغان تھے اور کیا انہیں صحیح معنی میں افغانستان کا غلجی قبیلہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ ریورٹی یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غلزی (وہ ان

کے لئے یہی لفظ استعمال کرتے ہیں) اس دور میں تخت سلیمان کے قریب ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا۔ وہ اس اعتراف کے باوجود کہ اس قبیلہ کے نام کا تلفظ عام طور پر غلجی کیا جاتا ہے اسے زبان کی غلطی قرار دیتے ہیں اور اس کا ذمہ دار ان لوگوں کو ٹھہراتے ہیں جو خلج ترکوں اور ان کی اصل سے ناواقف ہیں۔ اور آخر میں اس کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے جو عربی اور فارسی کی کتابوں کے عالم متبحر کا خاصہ ہے نسب ناموں میں بیان کئے ہوئے قصوں کا سہارا لیتے ہیں اور اصل کو فروعات سے الگ کئے بغیر اس حکایت کو تاریخی حقیقت قرار دیتے ہیں کہ غلزی بی بی متو اور غور کے شاہ حسین کی اولاد ہیں۔

کیمرج ہسٹری آف انڈیا میں اس دعویٰ کو جھٹلایا جا چکا ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں دھلی کے لوگ واضح طور پر خلجیوں کو ترکوں کا نہیں بلکہ افغانوں کا قرابت‌دار سمجھتے تھے اس کے علاوہ اگر ہم غلجیوں کو خلجیوں کا موجودہ نمائندہ نہ سمجھیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلجی کہاں گئے۔ میرا خیال ہے خلجیوں کی اصل کا فیصلہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔

آج کا غلجی قبیلہ سب سے بڑا افغان قبیلہ ہے۔ یہ کسی بھی دور میں کوہ سلیمان میں چھپا ہوا ایک چھوٹا سا قبیلہ نہیں رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ تمام غلجی اپنے قبیلہ کے نام کا وہی تلفظ ادا کرتے ہیں جو دوسرے پٹھانوں میں مستعمل ہے۔ غلجی اور خلجی قریب قریب ایک ہی نام ہے۔ البتہ غلزئی ادبی فارسی کی پیداوار ہے یہ لفظ غلزوئی (چور کا بیٹا) کی حکایت سامنے رکھ کر گڑھا گیا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب خلجی ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ ترک نہیں رہے تھے اور وہ کسی بھی نسل سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں عام طور پر ان کا تذکرہ افغانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس دعوے کے حق میں آخری اور فیصلہ کن دلیل کے طور پر پٹھانوں کے قومی شاعر خوشحال خان خٹک کی ایک بیت پیش کی جا سکتی ہے جس میں اسی جلال‌الدین خلجی کے تخت دھلی پر بیٹھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی ترتیب اور ان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے

خوشحال لکھتا ھے کہ:-

بیا سلطان جلال‌الدین پہ سریر کښیناست
چہ پہ اصل کښے غلجے د ولایت وو

''اس کے بعد سلطان جلال‌الدین تخت پر بیٹھا
جو اصل میں غلجی ولایت سے تعلق رکھتا تھا،،

خوشحال جس نے یہ نظم ۱۶۵۰ء میں اس وقت لکھی ھے جب خلجی اور غلجی کی بحث شروع نہیں ھوئی تھی، جانتا تھا کہ خلجی در اصل غلجی ھی تھے۔ یہ اس بات کا پختہ ثبوت ھے کہ خلجی لفظ غلجی کی ابتدائی شکل تھی۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ھوں کہ خلجیوں کا غلجی ھونا ثابت ھوگیا ھے اور یہ بھی ثابت ھوگیا ھے کہ یہ قبیلے جن کے حلیے اور جن کی روایات میں ترک نسل کے اثرات شامل ھیں سفید ھنوں یا ھفتالیوں کی ایک شاخ ھیں جو پانچویں صدی عیسوی میں افغان علاقہ میں داخل ھوئے تھے۔ کئی صدی تک پشتانہ کی قربت میں رہ کر انھوں نے پٹھانوں کی عادتیں اور زبان اختیار کرلی لیکن ایسے فرق کے ساتھ جو آج بھی محسوس کیا جا سکتا ھے۔

دھلی میں بیٹھ کر تاریخ لکھنے والے سرحدی علاقوں سے ناواقف تھے اور انھوں نے ان پیشہ‌ور سپاھیوں کے قبائلی پس منظر سے کوئی دلچسپی نہیں لی جو ترقی کر کے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔ ان کا محض اتنا کام تھا کہ وہ بادشاہ وقت کی چاپلوسی کریں اور اس کے حریف یا پیش‌رو کا مضحکہ اڑائیں۔ مثال کے طور پر اس بات کا ذرا سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ جلال‌الدین خلجی کون سی زبان بولتا تھا۔ یہ زبان خلجی ترکی تھی یہ فارسی تھی یا پشتو تھی؟ ان حکمرانوں کے اسلاف، قرابت‌داری وغیرہ کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ملتا سوائے اس کے کہ خلجی ترک نہیں تھے اور ان کا تذکرہ افغانوں کے ساتھ کیا جاتا ھے۔ افغانوں کے ساتھ خلجیوں کے تذکرہ سے ایک اور امکان کو تقویت پہنچتی ھے۔ عین ممکن ھے کہ قرون وسطیٰ کے مورخوں کی تصنیفات میں لفظ خلجی ھر قسم کے افغانوں مثلاً یوسف زئیوں، اورکزئیوں یا بنگش کے لئے استعمال ھوتا ھو۔ ان تمام قبیلوں کے متعلق یہ معلوم ھے کہ انھوں نے ھندوستان میں اپنی بستیاں بنائی تھیں اور وہ اپنے قبیلوں کی یاد برقرار رکھے ھوئے تھے۔ یہ قبائلی

نام مورخوں کو معلوم نہیں تھے چنانچہ انہوں نے سب قبیلوں کو خلجی اور افغان قرار دے دیا۔

ہندوستان کی مروجہ تاریخ سے اس انحراف کا ایک اور بھی سبب ہے۔ خلجی اور پٹھان جو مسلمانوں کی فاتح فوج کے هراول کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور اپنے وطن میں اپنی متحدہ مملکت نہیں بنا سکے تھے اپنے مفتوحہ علاقہ میں دہلی کے تخت پر قابض ہوگئے اور بڑی بڑی ریاستوں کے مالک بن بیٹھے۔ بعد کی صدیوں میں مزید افغانوں کے آنے سے شمال مغربی علاقہ کے ان آباد کاروں کی پوزیشن اور مضبوط ہوگئی۔ لودی (۱۴۵۱-۱۵۲۶) اور سور (۱۵۳۹-۵۵) خود بھی خلجی تھے۔ انہوں نے بہت سے پٹھانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ مغل بھی اور خاص طور پر بابر پیشہ‌ور افغان سپاہیوں پر تکیہ کرتے تھے۔ یہ سلسلہ محمود غزنوی اور محمد غوری کی فتوحات سے شروع ہوا۔ ترک خواص کا ایک چھوٹا سا گروہ تھے۔ عام سپاہی جن میں سے کچھ بعد میں حکمران بن گئے خلجی یا پٹھان تھے۔ حقیقتاً یہ افغانوں کا عروج تھا۔

بعد کے پٹھان ان کارناموں پر جس طرح فخر کرتے تھے اس کا اظہار خوشحال خان کے اشعار سے ہوتا ہے۔

میں نے بہلول شاہ اور شیر شاہ کا قصہ سنا ہے
کہ کسی زمانہ میں پٹھان ہندوستان کے بادشاہ تھے۔
وہ چھ سات نسلوں تک بادشاہ بنے رہے
اور پوری دنیا ان پر حیرت کرتی تھی۔

فصل دهم

شیر شاہ سور

ہندوستان میں پیشہ ور افغان سپاہیوں کی کامیابی کے حالات بیان کرتے ہوئے ہم خلجیوں کے عہد (۱۲۹۰-۱۳۲۱ء) تک پہنچ گئے اور غزنی کو قریب قریب فراموش کر بیٹھے۔ اس شہر پر ۱۲۱۵ء میں خوارزم شاہ نے قبضہ کر لیا جس نے ترک مملوک ایالدیز سے اقتدار چھین لیا تھا۔ ایالدیز محمد غوری کی وفات کے بعد غزنی کا حاکم بن بیٹھا تھا۔ خوارزم شاہ نے جنوب میں اپنے نئے صوبہ کا انتظام سنبھالنے کے لئے اپنے بیٹے جلال الدین کو بھیجا۔ لیکن جس طرح ساجوقی اپنی فتوحات سے دو سال بعد ناپید ہو گئے اسی طرح خوارزم شاہ بھی جو ان ہی کے باقیات تھے صرف چند سال برسر اقتدار رہے پھر وہ بھی چنگیز خان کے ان حملوں کی رو میں بہ گئے جن سے پوری دنیا میں تلاطم برپا ہو گیا۔ جلال الدین (۱) غزنی پر پانچ سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا لیکن پٹھانوں کے بیان میں اس کا تذکرہ ضروری ہے نہ صرف اس لئے کہ وہ بھی شمالی سرحد کے اسٹیج پر نمودار ہوا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے ساتھ خلجیوں یا غلجیوں کا ایک اور گروہ منظر عام پر آیا۔ یہ جلال الدین ہی تھا جس کی بدولت چنگیزی حملوں کی آفت موثر طور پر دریائے سندھ کے پار نہیں پہنچ سکی۔

محمد شاہ خوارزم نے نہ صرف غوریوں کو شکست دے کر غزنی پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ ایک چینی خاندان سے جو قراقطائی کے نام سے مشہور ہے بخارا بھی چھین لیا تھا۔ ان کامیابیوں اور کچھ دوسری فتوحات

---

(۱) یہ جلال الدین خلجی نہیں ہے جس کا تذکرہ گزشتہ فصل میں کیا گیا ہے۔

کی بنا پر وہ خود پسندی میں مبتلا ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو خلیفہ ظاہر کرنے لگا اور اس نے سلجوق آخر اور سکندر اعظم کے خطابات اپنا لئے۔ اسی زمانہ میں منگول اعظم چنگیز خان نے جو ۱۲۰۵ء میں منگولیا میں بر سر اقتدار آیا تھا چین کو تاخت تاراج کیا اور پیکن پر قبضہ کر لیا۔ اس مہم کے دوران چنگیز نے اپنے بڑے بیٹے جوچی کو مغربی سرحدوں کی حفاظت پر مامور کیا جہاں جوچی کی فوج اور خوارزم کے سرحدی محافظ دستوں میں جھڑپیں ہونے لگیں۔ محمد شاہ اپنے آپ کو دین اسلام کا محافظ سمجھتا تھا اور چین فتح کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا وہ منگولوں سے، جو اس کے ارادوں کی تکمیل میں حائل تھے نفرت کرتا تھا۔ چنگیز اور محمد شاہ کے پاس ایک دوسرے کے ایلچی آتے جاتے رہے۔ آخرکار باہمی اعتماد اور عواقب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے محمد شاہ نے سرحدی قصبہ اوترار کے قریب چنگیز کے بھیجے ہوئے قافلہ والوں کو بے دردی سے قتل کرا دیا۔

اس واقعہ کی بنا پر منگول ۱۲۱۹ء میں خوارزم پر ٹوٹ پڑے۔ چنگیز نے اوترار کو تباہ کرنے کے لئے جوچی کو بھیجا اور خود بخارا سمرقند پر قبضہ کرکے ان دونوں شہروں کو لوٹا اور پھر آگ لگا دی اور آبادی کا قتل عام کیا۔ شاہ نے فرار ہو کر بحیرہ کیسپین کے ایک جزیرہ میں پناہ لی جہاں وہ فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے جلال الدین نے میدان جنگ میں داد شجاعت دینے کے بعد اپنی غزنی کی جاگیر میں پناہ لے لی لیکن خود چنگیز خان نے اس کا تعاقب کیا۔ اسے پہاڑیوں میں غالباً ٹوچی کے راستے پسپا ہونا پڑا اور آخر وہ کالاباغ کے قریب دریائے سندھ کے کنارے آنکلا۔ یہاں ایک اور گھمسان کی لڑائی کے بعد جس میں اس نے بہادری کے جوہر دکھائے وہ چنگیز کی نظروں کے سامنے دریائے سندھ پیر کر محفوظ علاقہ میں چلا گیا۔ چنگیز اس کی اس بہادری سے بڑا متاثر ہوا۔ عین ممکن ہے کہ جلال الدین نے جس پامردی سے مقابلہ کیا تھا اس کے پیش نظر چنگیز کو وادی سندھ سے آگے ہندوستان میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں ہوا ہو لیکن اس کے باوجود چنگیز غزنی کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجانے سے باز نہیں آیا۔ جلال الدین التمش سے کچھ لڑائیاں لڑ کر جن کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا سندھ کے راستے ہندوستان سے باہر نکل گیا۔ یہ التمش وہی مملوک بادشاہ ہے جو قطب الدین کے بعد دھلی

کے تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ واقعات ۲۲-۱۲۲۱ء میں رونما ہوئے۔

جب جلال‌الدین ہندوستان سے رخصت ہوا تو خلجیوں کا ایک مضبوط گروہ ہندوستان ہی میں رہ گیا اس گروہ کے سردار ملک خان کو بست کے قریب جاگیر ملی ہوئی تھی اور ۱۲۱۵ء میں جب خوارزم کی فوج نے غزنی پر قبضہ کیا تھا تو ملک خان اپنے قبیلہ کے ساتھ اس فوج میں شامل تھا۔ ان لوگوں کو وسطی ایشیا میں مارے مارے پھرنے اور چنگیز کے حملوں کا خطرہ مول لینے کی بجائے اپنے ان بھائیوں سے جا ملنے میں زیادہ فائدہ نظر آیا جنھوں نے دھلی کے بادشاھوں کی ملازمت اختیار کر رکھی تھی۔ جلال‌الدین کے رخصت ہونے کے بعد وہ بالائی سندھ میں ٹھیر گئے تھے جہاں سے وہ التمش کی ملازمت اختیار کرنے کے لئے دھلی روانہ ہوگئے۔ بعد میں ان ھی کی مدد سے التمش نے آچ اور ملتان فتح کیا۔ ان کا لیڈر ملک خان ان ھی علاقوں میں کسی لڑائی میں مارا گیا لیکن بہ وجوہ یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ دھلی کا حکمران خلجی خاندان ان ھی جانبازوں کے گروہ کی نسل سے تھا۔

کابل اور غزنی کے علاقوں سے چنگیز کے گزر کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان علاقوں میں ہر طرف افرا تفری پھیل گئی۔ غزنی کو ستر سال کے عرصہ میں دو مرتبہ تہ‌وبالا کیا جا چکا تھا اور وھاں ایک بھی عمارت صحیح سالم باقی نہ رھی تھی۔ محمود غزنوی کے دور سے لے کر اب تک یہ شہر ایک طرح سے ثقافتی مرکز تھا جسے سرحدی علاقوں کے لوگ نمونہ بنا سکتے تھے۔ لیکن اب وہ بات جاتی رھی تھی بادشاہ، دربار، کارواں اور تجارت سب ختم ہو چکے تھے۔ ۱۲۲۲ء میں چنگیز اپنی وسیع سلطنت کے کسی اور علاقہ کے معاملات سلجھانے چلا گیا۔ اور ۱۲۲۷ء میں فوت ھوگیا اس نے بستر مرگ پر وصیت کے ذریعہ یہ صوبے اپنے دوسرے بیٹے چغتائی کو میراث میں دے دئے لیکن ایسا معلوم ھوتا ھے کہ چغتائی اور اس کے جانشینوں نے اس علاقے کو مال و دولت سے خالی اور دشوار گزار سمجھا اور اس پر قبضہ کرنے یا نظام حکومت قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ وہ اس علاقہ پر گاھے گاھے حملے ضرور کرتے رھے اس میں سے ایک حملہ کے دوران وہ ۱۲۴۰ء میں لاھور تک پہنچ گئے اور انھوں نے اس شہر کو تباہ کردیا۔ چغتائی ۱۲۴۱ء میں فوت ھوگیا۔ سلطنت کے

اس حصہ میں منگولوں کا اثر قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی البتہ وسطی غور کے پہاڑی علاقہ میں منگولوں کو فوجی آبادکاروں کی حیثیت سے بڑی تعداد میں بسایا گیا یہ ایک استثنا ہے۔ یہ منگول آبادکار وہی لوگ ہیں جو آج کل هزارہ کہلاتے ہیں یہ نام فارسی لفظ ہزار سے لیا گیا ہے جو منگولی کے منگ (MING) یا ترکی کے بن (BIN) کا ترجمہ ہے۔ بعد میں یہ لوگ وہاں پہلے سے بسنے والی ایرانی نسل کے ساتھ گھل مل گئے اگر چہ اب بھی کچھ خاندان ایسے ہیں جو قدیم منگولی بولتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا ذریعہ بیان غیر شائستہ فارسی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روہ کا علاقہ جو پٹھانوں کا وطن ہے منگول فتوحات کی دستبرد سے محفوظ رہا اور یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے لئے اس علاقہ سے بھرتی میں کمی ہوگئی۔

ہمارے علاقہ میں جو باقاعدہ واحد نظام حکومت قائم ہوا۔ اور وہ بھی روہ کے مغرب میں وہ ہرات کے کرتوں (۱) نے ۱۲۴۵ء میں قائم کیا تھا۔ یہ لوگ غور کے تاجیک تھے جنھیں منگولوں کی رعایا کے طور پر آباد کیا گیا تھا۔ افغان علاقہ سے کرتوں کا قریب ترین تعلق اس وقت پیدا ہوا جب انہوں نے قندھار فتح کیا۔ یہ واقعہ ۱۲۸۱ء کا ہے۔ اس موقع پر پہلی مرتبہ قندھار شہر کا نام سننے میں آیا۔ یہ وثوق کے ساتھ معلوم نہیں کہ قندھار شہر کی بنیاد کب ڈالی گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے علاوالدین جہاں سوز کے ہاتھوں بست کی تباہی کے بعد یہ شہر آباد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ شہر گندھارا سے ترک وطن کرنے والے قبائل نے آباد کیا تھا۔ اس سوال پر ہم یوسف زئیوں کے بیان کے ضمن میں روشنی ڈالیں گے۔ اس مرحلہ پر ہمیں ابدالیوں یا ان دوسرے قبائل کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا جو بعد میں قندھار کے علاقہ میں ممتاز حیثیت کے مالک بنے۔ کابل کا بھی تذکرہ خال خال ہے اور پشاور کا تو نام ہی سننے میں نہیں آتا۔ حکمران کرت خاندان ۱۳۷۹ء تک قائم رہا پھر ہرات نے وسط ایشیا سے آنی ہوئی نئی آفت تیمور لنگ کی اطاعت قبول کر لی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۲۲۰ء میں چنگیز کے زمانہ سے ۱۳۶۹ء میں تیمور کے

(۱) کرت خاندان کی بنیاد شمس الدین کرت نے رکھی تھی اور امیر تیمور نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

عروج تک بلکہ اس کے بعد تک افغانوں کی تاریخ ان کے اپنے وطن میں نہیں بلکہ ہندوستان میں ملتی ہے۔ اس تمام عرصہ میں اپنے وطن میں بسنے والے پٹھانوں کا صرف ایک تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تذکرہ مراکش کے سیاح ابن بطوطہ نے کیا ہے جو ۱۳۳۳ء میں غزنی سے گزرا تھا پھر وہ بنگش کے راستے دریائے سندھ عبور کر کے دھلی پہنچ گیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ غزنی اور کرم کے درمیان غالباً هریوب کے مقام پر ایک تنگ گھاٹی سے گزرتے ہوئے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ڈاکوؤں سے واسطہ پڑا۔ وہ ان ڈاکوؤں کو افغان قرار دیتا ہے۔ وہ غزنی کے بارے میں لکھتا ہے کہ جنگجو محمود بن سبکتگین کا یہ شہر جو کبھی بہت عظیم‌الشان شہر تھا اب اس کی اکثر عمارتیں کھنڈر بن چکی ہیں۔

تیمور نے، جو ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوا تھا ۱۳۶۹ء میں ماوراءالنہر میں چغتائیوں سے اقتدار چھین لیا۔ وہ ترکستانی منگولوں کے برلاس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا جو سمرقند کے جنوب میں کیش کے مقام پر آباد تھا۔ اس نے سمرقند کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس شہر کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے خوبصورت عمارتیں بنوائیں جس سے اس کا نام روشن ہوا وہ بابر اور ہندوستان کے دوسرے مغل حکمرانوں کا مورث‌اعلیٰ ہے۔ اگرچہ تیمور اور دوسرے مغل بادشاہ اصلاً ترک تھے لیکن چغتائی اور مغل (منگول) کہلاتے تھے کیونکہ وہ اس علاقہ میں چنگیز کی سلطنت کے وارث بنے تھے۔ چنگیز کے جانشین کی حیثیت سے تیمور نے ۱۳۷۹ء اور ۱۳۸۳ء کے درمیان ہرات اور سیستان اور قندھار پر قبضہ کیا۔ اور اس کے بعد وہ کارنامہ انجام دیا جو چنگیز بھی انجام نہیں دے سکا تھا اس نے افغان قبیلوں پر خود ان کے پہاڑی وطن میں حملہ کردیا اور ۱۳۹۸ء میں جب اس نے ہندوستان پر حملہ کا قصد کیا تو اس نے لودیوں اور شیرانیوں سے فوجی امداد مانگی۔ ان دونوں قبیلوں کا نام اس موقع پر سب سے پہلے سنا گیا۔ تیمور ہندوستان میں گنگا کے کنارے ہردوار تک جا پہنچا۔ اس نے ترک حکمران تغلق خاندان کا جو دھلی میں خلجیوں کا جانشین تھا تختہ الٹ دیا اور ان کی جگہ خضر نامی ایک سید کو اپنا وائسرائے مقرر کردیا خضر اور اس کے جانشین تیموری خاندان کے کمزور نائبوں کی حیثیت سے ۱۴۵۱ء تک حکومت کرتے رہے اس کے بعد دھلی کا تخت ایک بار پھر ایک افغان گھرانے یعنی لودی خاندان کے ہاتھ آگیا۔ لودی بھی خلجی ہی ہیں۔

دھلی کی لودی سلطنت کا نظام حکومت، سرحدی علاقہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس خاندان کے تین بادشاہ بہلول، سکندر اور ابراھیم گزرے ھیں ان میں سے کوئی بھی شیر شاہ سوری کی طرح جس نے لودیوں کا کھویا ھوا اقتدار پھر حاصل کیا ممتاز شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ ان بادشاھوں نے اپنی جو بہترین یادگار چھوڑی ھے وہ دھلی سے تین میل جنوب میں بڑی بڑی چوکور قبریں ھیں یہ خاندان پچھتر سال (۱۴۵۱-۱۵۲۶ء) تک حکومت کرتا رھا۔ پھر پانی پت کے میدان میں بابر کے ھاتھوں ابراھیم لودی اپنی حکومت اور جان دونوں گنوا بیٹھا۔ لودی بادشاھوں کا اختیار سندھ کے پار کبھی نہیں پہنچا اور دوآبہ یعنی سندھ اور جہلم کے درمیان بھی یہ اختیار غیر یقینی تھا۔ دریائے سندھ کے مغرب میں تیموری شہزادوں کا راج تھا۔ خیال گزرتا ھے کہ پندرھویں صدی اور سولھویں صدی کے اوائل میں دھلی میں ایک اور خلجی خاندان کے بر سر اقتدار آنے کی وجہ سے پٹھانوں کی اصل سرزمین کے حالات پر ضرور کچھ روشنی پڑی ھوگی۔ لیکن اس سلسلہ میں کوئی تحریر دستیاب نہیں ھے اور ایک استثنا سے قطع نظر ھماری تلاش رائگاں ثابت ھوتی ھے۔

وہ استثنا یہ ھے کہ سرحدی قبائل کو دھلی کی سرکاری ملازمت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی۔ پہلے لودی بادشاہ بہلول نے ایک فرمان جاری کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ھندوستان پر اسی کا قبضہ رہ سکتا ھے جو قبائل کی مدد سے حکومت کرے۔ ھر افغان قبائلی کو چاھئے کہ وہ اپنے ان تمام رشتہ داروں کو جو عسرت کی زندگی بسر کر رھے ھیں اپنے پاس بلا لے۔ یہ لوگ ھند میں جائداد حاصل کریں اس طرح اپنی ناداری ختم کریں اور طاقتور دشمنوں کے خلاف مملکت کی مدد کریں۔ اس فرمان پر قبائل بہت بڑی تعداد میں ھندوستان پہنچ گئے۔

یہ فرمان شیر شاہ کی اس تاریخ میں درج ھے جو عباس سروانی (۱) نے اکبر کے عہد میں لکھی۔ ان قبائل کی فہرست بھی درج کی گئی ھے جنھوں نے اس فرمان پر لبیک کہا۔ جیسا کہ توقع کی جاسکتی ھے چونکہ لودی خود خلجی تھے اس لئے جو قبیلے آئے ان میں سے بیشتر خلجی تھے۔

---

(۱) یہ سڑبنی کی دھلی میں بگڑی ھوئی شکل ھے۔

ان میں لودی، لوھانی، نیازی، مروت اور بٹھانی شامل تھے۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا ھے کہ کچھ سڑبنی اور کچھ کرلانی قبیلے بھی جن کے نام واضح نہیں ھیں ھندوستان چلے گئے۔ ھندوستان میں مختلف پٹھان بستیوں کے متعلق بعد میں جو معلومات حاصل ھوئیں ان سے ظاھر ھوتا ھے کہ سڑبنیوں میں سے مندڑ یوسف زئی اور کرلانیوں میں سے بنگش اور اورک زئی ھندوستان گئے ھوں گے۔ جن قبائلیوں نے اس فرمان پر لبیک کہا تھا ان میں شیر شاہ کا دادا ابراھیم بھی شامل تھا جو لودی قبیلہ کی سوری شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔

اس زمانہ میں سندھ کے پار کا علاقہ بیشتر اوقات تیموری خاندان کے دو گھرانوں میں بٹا رھا۔ ان میں سے ایک گھرانے کا سب سے طاقتور حکمران بابر کا دادا مرزا ابو سعید تھا جو سمرقند اور اس کے باج گزار علاقوں کابل اور غزنی پر حکومت کرتا تھا اور دوسرا گھرانا مرزا حسین بیقرا کا تھا جو پہلے ھرات اور پھر قندھار کا حاکم تھا۔ ابو سعید نے کابل اور غزنی کی گورنری اپنے ایک بیٹے اور بابر کے چچا مرزا الغ بیگ کے حوالے کردی۔ الغ بیگ ۱۵۰۱ء میں اپنی وفات تک اس عہدہ پر فائز رھا۔ جب بابر کو سمرقند سے نکالا گیا تو اس نے اپنے چچا کی وفات کے بعد موقع غنیمت جان کر کابل کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ دھلی کے تخت پر بھی وہ تیمور کے وارث کی حیثیت سے دعویدار تھا اور وہ لودھیوں کو غاصب سمجھتا تھا۔

۱۵۲۶ء میں لودیوں کے زوال اور ۱۵۳۹ء میں شیر شاہ کے برسراقتدار آنے کے درمیانی عرصہ میں بابر کو دھلی کی فتح کے بعد چین سے حکومت کرنے کے لئے صرف چار سال ملے اور باقی نو سال تک اس کا بیٹا ھمایوں لودیوں کے عہد کے بچے ھوئے افغان سرداروں اور سپاھیوں کی طاقت کے مقابلہ پر مغلوں کا اقتدار جمانے کی ناکام کوشش کرتا رھا۔ یہ بات قابل غور ھے کہ ھندوستان میں بسنے والے افغان قدرتی طور پر بابر اور ھمایوں کو غاصب سمجھتے تھے۔ ھندوستان میں افغانوں کو تین سو سال سے امتیازی حیثیت حاصل تھی اور وہ اس عرصہ میں ایک سو سال تک سلطنت کے مالک بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نزدیک تخت پر شیر شاہ کا قبضہ ایک جائز حق حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ حال آنکہ اتنا عرصہ

گزرنے کے بعد ہمیں یہ اقدام مداخلت معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ زیادہ صحیح ہے کہ بابر اور ہمایوں کو غاصب سمجھا جائے اور مغل عہد کا آغاز اکبر کے زمانہ سے کیا جائے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ بعد میں پیش آنے والے واقعات اسی موقع پر بیان کر دئے جائیں اور بابر سے قطع نظر کرتے ہوئے شیر شاہ اور اس کے جانشینوں کے عہد کو ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے پہلے حصہ کا آخری باب قرار دے دیا جائے۔

لیکن یہاں بھی ایک متضاد شکل پیش آتی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا بابر کی آمد کے ساتھ پٹھانوں کے وطن کے حالات پر روشنی پڑنے لگتی ہے۔ اس کے برخلاف اس زمانہ میں جبکہ لودی اور سور دھلی کے بادشاہ بنے بیٹھے ہیں شمالی پہاڑوں پر تاریکی کے بادل چھائے رہتے ہیں البتہ دھلی کے واقعات کے ساتھ کبھی کبھی اس علاقہ کا بھی کوئی تذکرہ آ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بابر کو وسطی ایشیا سے دھلی تک پہنچنے کے لئے پٹھان قبائل کے وطن میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانی تھی۔ شیر شاہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی شمال کی طرف راولپنڈی سے چند میل کے فاصلہ پر مارگلہ سے آگے کبھی اپنا اثر نہیں ڈال سکا۔ جنوب میں اس کی سلطنت برائے نام کالا باغ کے قریب نیازی قبیلہ کی سر زمین پر دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ باقی اطراف میں دریائے جہلم ہی اس کی سلطنت کی سرحد تھا اور اس دریا سے دس میل دور روھتاس کا عالی شان قلعہ سرحدی چوکی تھا۔ اس کے باوجود شیر شاہ جو بہ مشکل چھ سال تخت نشین رہا تاریخ میں سب سے زیادہ نامور افغان گزرا ہے۔ اس کا مرتبہ احمد شاہ سے بھی بلند ہے جس نے دو سو سال بعد درانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ شیر شاہ نے اپنے اجداد کی سر زمین لینا سے باھر اقتدار حاصل کیا اس لئے اس کے کارناموں کا جائزہ ضروری ہے۔

شیر شاہ کا اصل نام فرید تھا۔ اس کا دادا ابراھیم اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جو ہندوستان آیا تھا۔ اور کپلنگ (KIPLING) کے محبوب علی اور دوسرے بہت سے خلجیوں کی طرح جو اس سے پہلے اور بعد میں گزرے ہیں اس نے بھی غزنی اور ہندوستان کے درمیان گھوڑوں کی تجارت میں خاندان کا سرمایہ لگایا۔ اس کے باپ حسن نے دوسرے لودی

بادشاہ سکندر کی ملازمت اختیار کرلی اور اسے بہار کے علاقہ سہسرام میں جاگیر مل گئی۔ یہ علاقہ تین سو سال پہلے محمد غوری کے زمانہ میں بختیار خلجی کے وقت سے پٹھانوں کا جانا پہچانا تھا۔ فرید اسی علاقہ میں پل بڑھ کر جوان ہوا۔ حکایتوں میں اس کی جوانی کے بہت سے قصے بیان کئے جاتے ھیں۔ حضرت داؤد (ع) کی طرح اس نے بھی تن تنہا ایک شیر یا چیتے سے مقابلہ کیا اور اسی بنا پر شیر خاں مشہور ھوگیا۔ اور وقت آنے پر جب حسن سلطان کی رکاب میں کسی مہم پر جانے لگا تو باوجودیکہ شیر خان کو اپنے باپ سے شکایت تھی کہ وہ اس کے سوتیلے بھائیوں پر زیادہ مہربان ھے۔ باپ نے خاندانی جاگیر کا انتظام شیرخان کے حوالہ کیا۔

شیر خان نے اپنے باپ کی جاگیر کے منصرم کے فرائض جس تندھی اور کامیابی کے ساتھ انجام دئے موخوں نے اسے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ھے۔ کہا جاتا ھے کہ پورے شمالی ھند میں لگان کے نظام کی بنیاد شیر خان کے طریق کار پر رکھی گئی ھے۔ شیر شاہ کے پرستار یہاں تک دعویٰ کرتے ھیں کہ در حقیقت زمینوں کے نظم و نسق اور متعلقہ امور شیر شاہ نے مرتب کئے تھے جنہیں بعد میں اکبر کے لائق ھندو وزیر ٹوڈرمل نے بہتر شکل دے دی۔ میرے خیال میں یہ دعویٰ محض مبالغہ ھے۔ شیر شاہ کا دور حکومت بہت مختصر تھا اور یہ عرصہ بھی نئی سلطنت پر گرفت مضبوط کرنے میں صرف ھوگیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر عرصہ میں وہ تفصیلات مرتب نہیں کی جا سکتی تھیں جو شرح و بسط کے ساتھ ابوالفضل (۱) کے آئین اکبری میں درج ھیں۔ جہاں تک ان اصولوں کی بنیاد کا تعلق ھے تو بنیاد تو علاوالدین خلجی کے دور حکومت میں پڑ چکی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیر شاہ نے انتھک محنت اور ذھانت سے کام لے کر اپنے زمانہ کے طور طریقوں کو صیقل کیا اور ایسا نظام قائم کیا جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور جس کی یاد بہت دنوں تک باقی رھی۔ اس نے جاگیر کا نظام سنبھالتے وقت سہسرام میں اپنے مزارعوں کے سامنے جو تقریر کی تھی اس سے واضح طور پر معلوم ھوتا ھے کہ اس نے کیا طریقے اختیار کئے تھے۔

---

(۱) ابوالفضل اکبر کا وزیر تھا۔ اس نے اپنی کتاب آئین اکبری میں اکبر کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی ھے۔

"میرے والد نے آپ کے معاملات کا بندوبست میرے حوالہ کر دیا ہے اس لئے میرا یہ فرض ہے کہ میں رعیت، زراعت کے اصولوں، اصل کاشت اور مزارعوں کی بہبود پر حتی المقدور توجہ دوں تا کہ سب کو چین اور اطمینان نصیب ہو اور لوگ میرے زمانہ کو اس طرح یاد رکھیں کہ اس زمانہ میں کمزور کی گردن ظلم کے پنجہ سے آزاد کردی گئی تھی- میں ماضی کے واقعات سے چشم پوشی کروں گا لیکن آئندہ کی کوتاہی سے درگزر نہیں کیا جائے گا"۔

پھر اس نے مالیہ وصول کرنے والوں اور مزارعوں سے الگ خطاب کیا- اس نے زمین کا سروے کرنے والوں اور مالیہ وصول کرنے والوں کو بتایا کہ جاگیر کی بہتری مزارعوں کی بہبود سے وابستہ ہے- ان پر زیادہ بوجھ ڈالا گیا تو جاگیر تباہ ہوجائے گی اس نے یہ بھی کہا کہ وہ خود گاؤں گاؤں پھرے گا اور اہل کار اور مزارعوں کو طلب کرے گا تا کہ تفصیل کے ساتھ معلوم کیا جا سکے کہ اس کی ہدایات پر کس حد تک عمل ہوا ہے- بہترین کلکٹر وہ ہے جو مالیہ کی پائی پائی وصول کرے لیکن وصولی کا خرچ مالیہ سے زیادہ نہ ہونے دے- اگر کسی مزارع سے واجب الادا رقم سے ایک پائی بھی زیادہ وصول کی گئی تو گاؤں کے نمبردار کو سزا دی جائے گی- تقریر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ فصل میں مزارع کا کیا حصہ ہوگا- تقریر کا مطالعہ کرنے والا یہی رائے قائم کرتا ہے کہ شیر شاہ کے طریقے کتنے ہی منصفانہ اور موثر کیوں نہ ہوں لیکن وہ فوری تقاضے کا نتیجہ تھے اور ان میں وہ بات نہیں تھی جو ایک تجربہ کار حاکم کے ان طریقوں میں ہوتی ہے جو بڑی سوچ بچار کے بعد طے کئے جاتے ہیں-

لیکن وہ سرکشوں سے نپٹنا جانتا تھا- اس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی خوف یا جنبہ کے بغیر سرکشوں کے سرغنہ کو سزا دی جائے- وہ اپنے مصاحبوں کے مشورہ کے برخلاف اور اپنے باپ کے پاس کمک پہنچنے کا انتظار کئے بغیر سرکشوں میں سے سر بر آوردہ شخصیتوں کے قلعوں پر حملہ کر دیتا تھا- آگے چل کر یہ بیان کیا جاتا ہے:-

"شیر شاہ کی ہمت اور فراست دیکھ کر باغی سراسیمہ ہو جاتے تھے اور اپنی غلطی پر نادم ہو کر معافی مانگنے لگتے تھے- لیکن فرید کی

رائے تھی کہ ہندوؤں (۱) کی یہ عادت ہے کہ پہلے تو اپنے حاکم کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور کامیاب ہو جائیں تو لگان دینے اور اطاعت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن اگر حاکم غالب رہے اور اس میں اپنی بات منوانے کی طاقت ہو تو بزدلوں کی طرح خوشامد پر اتر آتے ہیں اور لگان ادا کرنے لگتے ہیں۔ لیکن موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس عادت کے مطابق آج کل ہندو اس کے پاؤں پڑ رہے ہیں لیکن چونکہ پہلے بھی ان پر اس کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اس لئے اب بھی ان کی اطاعت سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا،،۔

اس کے بعد شدید سزائیں دی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کو اچھی نصیحت ہوگئی۔ جب مزارعوں کو یہ اطمینان ہوگیا کہ انہیں خواہ مخواہ بے دخل نہیں کیا جائے گا اور کارندے ان کی کھال نہیں اتاریں گے تو انہوں نے محنت سے کام شروع کر دیا۔ اور جب حسن اپنی جاگیر کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے دیکھا کہ ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ ہے اور پہلے جو زمینیں بنجر پڑی تھیں وہاں خوب فصل اگی ہوئی ہے۔

پٹھان حاکم اب بھی شیر شاہ کے اصولوں اور قواعد کا بڑے فخر کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔ انہیں شیر شاہ کی جو باتیں خاص طور پر پسند ہیں وہ یہ ہیں کہ شیر شاہ خود موقع پر پہنچتا تھا حالات کا معائنہ کرتا تھا زوردار حکم جاری کرتا تھا اور یہ اطمینان کر لیتا تھا کہ اس حکم کی تعمیل کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ عمدہ نظم و نسق کے لئے باریکیوں اور جزرسی کی ضرورت ہوتی ہے اور نظم و نسق اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ ہر اہل کار کے اختیارات واضح ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ذاتی نگرانی اور دلچسپی سے جو شیر شاہ کی فطرت ثانیہ تھی ایشیا میں اب بھی بڑے بڑے کام انجام دئے جا سکتے ہیں۔ شیر شاہ ہر معاملہ کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا وہ ہر موقع پر پہنچ سکتا تھا اور اس کا ہر اقدام بے باکانہ ہوتا تھا۔

---

(۱) ہندوستان میں پٹھان جاگیرداروں کا نشانہ ہندو ہی تھے لیکن یہ بات مالیہ ادا نہ کرنے والے دوسرے لوگوں پر بھی صادق آتی ہے۔

میں نے ایک بار اپنے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب سے دریافت کیا کہ بر صغیر کی تاریخ میں ان کا ہیرو کون ہے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب اکبر کا نام لیں گے کیونکہ اکبر کی طرح وہ بھی فرقہ پرستی سے بلند تھے۔ لیکن انہوں نے شیر شاہ کا نام لیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ پٹھان تھا وہ کسی جھجھک کے بغیر معاملہ کی تہ تک پہنچتا تھا اور جب کارروائی کی ضرورت ہوتی تھی تو خود موقع پر جاتا تھا۔ میرے دوست ڈاکٹر خان صاحب بھی شیر شاہ کی تقلید کرتے تھے۔

جب بابر نے دھلی فتح کر لیا تو شیر شاہ جو اس وقت تک شیر خان کہلاتا تھا کبھی کبھی دارالحکومت پہنچ کر دربار میں تعظیم بجا لاتا تھا۔ ایک بار اسے شاہی ضیافت میں مدعو کیا گیا جہاں اس کے سامنے از بک طریقہ کے مطابق پکائے ہوئے کھانے کی ایک قاب رکھی گئی۔ شیر شاہ کو اپنے وطن میں ایسے کھانے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ شیر شاہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ گوشت کا اتنا بڑا پارچہ کس طرح کھایا جائے۔ چنانچہ اس نے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر اپنا خنجر نکالا گوشت کے ٹکڑے کئے اور ایک بڑے چمچ سے اپنے حلق میں اتارنے شروع کر دئے۔ بابر جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اپنے مہمان کی بدتمیزی سے بڑا متعجب ہوا اور اپنے وزیر سے کہا کہ اس کے دربار میں بہت سے افغان سردار اور سفید ریش موجود ھیں لیکن اس نے ایسی بد اخلاقی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ بابر کی طبیعت مکدر ہو گئی اور اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ایسے لوگ خطرناک ہوتے ھیں اور شیر خان کو قبضہ میں رکھنا ضروری ھے۔ وزیر نے جواب دیا شیر خان کے پاس اتنی فوجی طاقت نہیں ھے جو سلطنت کے لئے خطرہ بن سکے۔ اس کی بدتمیزی کا سبب یہ ھے کہ وہ دربار کے آداب سے ناواقف ھے۔ اس کے بعد بابر دوسری باتوں میں مشغول ہو گیا۔ لیکن شیر خان نے اس کی متجسس نگاہ اور مصاحبوں کے ساتھ سرگوشی کو بھانپ لیا چنانچہ وہ باقاعدہ رخصت لئے بغیر سہسرام واپس چلا آیا۔ بعد میں شیر خان نے بتایا کہ دربار میں آمدورفت کے دوران اسے مغل غاصبوں کے عادات و خصائل سے خوب واقفیت حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انھیں ھندوستان سے نکالنا معمولی بات ھے۔

چنانچہ اس نے قریباً دس سال بعد مغلوں کو ھندوستان سے نکال دیا۔ اس نے بڑی ھوشیاری کے ساتھ جس میں مکر بھی شامل تھی اور ایسے عزم سے کام لیا جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی بہت سی چالیں رنجیت سنگھ سے ملتی جلتی تھیں جو بعد میں اس کی قوم کا حریف بنا۔ وہ ھر جگہ ان افغانوں اور پٹھانوں کو جو حکومت سے ذرا بھی عناد یا رنجش رکھتے تھے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ متحد کرنے اور اپنا ھمنوا بنانے کی جدوجہد کرتا رھا۔ لودی عہد کے جو سردار بچ رہے تھے ان کے ساتھ وہ ایک لودی کی حیثیت سے بات چیت کرتا تھا اور انہیں افغانوں کی اس ننگ کا واسطہ دیتا تھا جس کی بدولت وہ پانی پت میں لودی کی شکست کے بعد بے عملی اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ھوگئے تھے۔ وہ نوجوانوں کو ایسی زندگی کے سبز باغ دکھاتا تھا جس میں خطرات بھی ھیں اور مال و زر بھی ملتا ھے۔ اور وہ دولت مندوں سے بڑی بے رحمی کے ساتھ دولت سمیٹتا تھا۔

فوجی طاقت حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ حکمت عملی اختیار کی تھی کہ افغانوں کو اپنے ساتھ ملا کر رکھا جائے اور جہاں تک جنگی وسائل کا تعلق تھا اس نے سوچ سمجھ کر بہار کے زرخیز صوبے کو جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا اپنی کارروائیوں کا مرکز بنایا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ھندو گورنر سے بہار کا قلعہ روھتاس بڑی چالاکی سے حاصل کیا۔ بہار کا روھتاس وہ روھتاس نہیں ھے جو شیر شاہ نے بعد میں اپنی سلطنت کے شمالی حصہ میں بنوایا اور پھر اس کا نام بھی روھتاس رکھ دیا۔ شیرشاہ نے جسے بختیار خلجی کے کارنامے یاد تھے بہار کے اس قلعہ پر قبضہ کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ اپنے مضبوط ترین بہادروں کو عورتوں کا لباس پہنا کر پالکی میں بٹھا دیا۔ اس طرح یہ لوگ قلعہ میں داخل ھونے میں کامیاب ھوگئے جہاں وہ اچانک قلعہ کے محافظوں پر ٹوٹ پڑے اور راجہ کو بھی قتل کر دیا اور ایک ایسا مرکز حاصل کرنے میں کامیاب ھوگئے جہاں سے جنگی کارروائی کی جا سکتی تھی۔ ۱۵۳۹ء میں شیر خان نے بہت سی جنگی چالوں کے بعد ھمایوں کو گھمسان کی دو لڑائیوں میں شکست فاش دی۔ پہلی لڑائی چوسہ کے مقام پر ھوئی جو بنارس سے نیچے کی طرف دریائے گنگا کے کنارے واقع ھے اور دوسری لڑائی قنوج کے مقام پر ھوئی جو گنگا کے کنارے کافی اوپر کی طرف واقع ھے۔ ھمایوں پسپا ھو کر لاھور

پہنچا اور جب اس کے بھائی کامران نے جو کابل اور غزنی پر قابض تھا اسے پناہ نہ دی تو وہ سندھ اور قندھار کے راستے ہندوستان سے نکل کر ایران میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ وہ سولہ سال تک ہندوستان واپس نہ آسکا۔

ہمیں ہندوستان کی ان لڑائیوں کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہئے۔ لیکن چوسہ کی لڑائی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے ایک افغان سپاہی کی شان ظاہر ہوتی ہے۔ ہمایوں جو بڑا بہادر لیکن بے پرواہ تھا غسل کر رہا تھا کہ اچانک خطرہ کا اعلان ہوا۔ ابھی وہ غسل سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ شیر خان نے حملہ کردیا اور مغلیہ فوج میں افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ غسل کرنے کے بعد اس نے اپنے محافظوں کو جمع کیا اور لڑائی میں کود پڑا۔ لیکن وہ جھنڈے تک نہیں پہنچ سکا اور خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ اس وقت بھی اس بات پر کف افسوس مل رہا تھا کہ وہ اپنی منظور نظر اور حرم کی دوسری بیبیوں کو نہیں بچا سکتا چنانچہ اس نے اپنے ایک مصاحب کو ملکہ اور دوسری بیبیوں کی حفاظت پر مامور کیا اور خود اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا کیونکہ بھگدڑ کی وجہ سے گنگا کا پل ٹوٹ چکا تھا۔ اس موقع پر ایک وفادار ملازم نے ہمایوں کو ڈوبنے سے بچایا۔ اس اثنا میں پٹھان شاہی خیموں پر قبضہ کر چکے تھے اور تمام بیبیوں کو حراست میں لے چکے تھے۔ وہ ان بیبیوں کو لے کر شیر خان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیر خان گھوڑے سے اتر کر بڑی انکساری کے ساتھ آداب بجا لایا۔ وہ ملکہ اور اس کی بدحواس کنیزوں کے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ پیش آیا اور اس نے حکم دیا کہ انہیں ان کے خیمہ میں واپس بھیج دیا جائے۔ خیمہ کے گرد پہرہ بٹھا دیا گیا اور محافظوں کو ہدایت کر دی گئی کہ فاتح فوج کا کوئی سپاہی ان میں سے کسی کو ہاتھ نہ لگائے۔ اگلے دن انہیں ایک شخص حسین خان کی نگرانی میں جو پرہیزگار اور کافی معمر تھا (یہ احتیاط بھی خوب تھی) بہار کے شہر روہتاس بھیج دیا گیا جہاں ان کے ساتھ شایان شان سلوک کیا گیا اور بعد میں رہا کر دیا گیا۔

افغانوں کی قبائلی لڑائیوں میں یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ دشمن کی عورتوں یا بچوں کو نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔

ان فتوحات کے بعد شیر خان دهلی پر قابض هوگیا اور اس نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ کمزور کامران جس کی طاقت اپنے بھائی کی مخالفت تک محدود تھی اس پنجاب سے نکال دیا گیا جس کے بچاؤ کے لئے اس نے مغلوں کے نام کی پروا نہ کرتے ہوئے بھائی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دریائے سندھ کے مغرب میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا شیر شاہ پیش قدمی کرتا ہوا جہلم تک پہنچ گیا۔ جہاں اس نے روھتاس کا نیا قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ یہاں اسے اپنے برادری کے ان لوگوں سے بھی ملنے کا موقع ملا جو شمال میں رھتے تھے۔ تاریخ میں لکھا ھے کہ روہ کے هزاروں قبائل شیر شاہ سے ملنے کے لئے جہلم کے کنارے خوشاب کے مقام پر کیمپ میں پہنچے۔ اس کی خدمت میں کابل اور قندھار حتیٰ کہ هلمند کے کنارے تک سے مختلف جرگے آئے۔ ان میں شیخ قتال کے فرزند شیخ بایزید سروانی بھی تھے جو روہ کے انتہائی با عزت ولی تھے اور تاریخ شیر شاہ کے مصنف کے دادا تھے۔ افغان حکمرانوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ کسی ولی یا سید کے خیر مقدم کے لئے چند قدم آگے بڑھتے تھے اور پھر اس کا ھاتھ تھامتے تھے۔ پھر واپسی پر تھوڑی دور تک اس کے ساتھ جاتے تھے۔ لیکن بایزید کی آمد پر شیرشاہ نے بڑے جوش کے ساتھ پشتو میں کہا۔ 'آؤ شیخ گلے مل لو'۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی اپنی زبان بے تکلفی اور وفاداری کا سب سے مضبوط رشتہ ھے۔

جس زمانہ میں شیر شاہ خوشاب میں تھا۔ ھٹ قبیلہ کے تین بلوچ سردار اسماعیل خان فتح خان اور غازی خان اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ سردار دریائے سندھ کے کنارے تین ڈیروں یا آبادیوں کے بانی تھے۔ اس وقت یہ تمام علاقہ بلوچوں کے قبضہ میں تھا اور مجموعی طور پر ڈیرہ جات کہلاتا تھا۔ شیر شاہ نے ان کے مقبوضات کی توثیق کردی۔ اس سے آگے شمال میں جہاں کامران کی منظم حکومت قائم تھی اس کی پیش قدمی رک گئی۔ ادھر راولپنڈی کے شمال میں پہاڑی علاقہ میں پنجابی قبائل کی لوٹ مار نے بھی اسے اور آگے بڑھنے نہیں دیا اور وہ دریائے سندھ تک کا علاقہ زیر نگیں نہیں لا سکا۔ لیکن جنوب میں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ کا علاقہ بلوچ سرداروں کے سپرد کرنے سے ظاهر هوتا ھے کہ اگر وہ زندہ رهتا تو اس نے مغرب کی طرف اپنا علاقہ بڑھانے کے لئے کیا منصوبہ بنایا تھا۔ شروع میں اس نے نیازیوں کو قابو میں لانے کی کوشش کی تھی۔

یہ غلجیوں کا آباد قبیلہ تھا جو کالا باغ کے آس پاس اس علاقہ میں جو عیسیٰ خیل کہلاتا ہے اور جس کا نام نیازی قبیلہ کے ایک خیل کے نام پر رکھا گیا ہے دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر بسا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیازیوں نے بڑی آسانی سے اس کی اطاعت قبول کرلی کیونکہ شیر شاہ کی فوج میں اس قبیلہ کے بہت سے افراد شامل تھے اور اس کا سب سے زیادہ معتمد سپہ سالار ہیبت خان بھی نیازی ہی تھا۔

ہیبت خان پنجاب میں جس میں ملتان بھی شامل تھا شیر شاہ کا گورنر تھا۔ اس کے تحت شیر شاہ نے اپنے بھتیجے مبارک خان کو جو ایک باندی کے پیٹ سے تھا نیازی علاقہ کا حاکم مقرر کیا۔ مبارک خان کے ساتھ ایک ایسا واقعۂ منسوب ہے جس سے پٹھانوں کے اطوار پر روشنی پڑتی ہے۔

نیازیوں کے دو بڑے خیل عیسیٰ خیل اور سنبل ہیں۔ سنبل خیل کے ایک جاگیردار اللہ داد کی ایک لڑکی تھی جس کے حسن کے چرچے زبان زد خاص و عام تھے۔ کتاب میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے ابروؤں کی کمانوں میں پلکوں کے تیر چڑھا رکھے تھے اس کے گال دھکتے ہوئے شعلے تھے اور اس کی زلفیں آگ سے اٹھتا ہوا دھواں تھیں اس علاقہ کے حاکم مبارک نے اسے صرف ایک مرتبہ دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ یہ بھول گیا کہ روہ کے لوگوں میں نسلی افتخار کی کیا اہمیت ہے اور اس نے ایک خاص قاصد بھیج کر اللہ داد سے بیٹی کا رشتہ طلب کیا۔ اللہ داد حاکم کی تعظیم بجا لایا لیکن اس نے بڑے ادب سے جواب دیا کہ خان تو اس علاقہ کا حاکم ہے اس کے حرم میں تو بہت سی اونچے گھرانوں کی بیبیاں اور خوبصورت باندیاں ہوں گی۔ اس کے علاوہ خان کی پرورش ہندوستان میں ہوئی ہے وہ ذوق سلیم کا مالک ہے۔ میری بچی گاؤں میں پلی ہے اور وہ ایسی ہی ہے جیسی روہ کی عورتیں ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ دونوں میں عدم مساوات اتنی نمایاں ہے کہ شادی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

مبارک جھلا اٹھا اور اس نے سنبل خیل کو تنگ کرنے کی ٹھان لی تاکہ اللہ داد اپنی بیٹی کا رشتہ دینے پر مجبور ہو جائے۔ اس کے بعد

سرداروں کا جرگہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سرداروں نے یہ اعتراف کیا کہ اس سے پہلے نیازی اور سُور قبائل کے آپس میں رشتے ضرور ہوئے ہیں لیکن ان رشتوں میں مساوات کا خیال رکھا گیا ہے۔ آزاد کا رشتہ آزاد سے اور غلام کا رشتہ غلام سے ہوا ہے۔

کند ہمجنس با ہمجنس پرواز - کبوتر با کبوتر باز با باز۔

قبیلہ میں ایک لڑکی باندی کے پیٹ سے ہے۔ اگر خان چاہے تو اس سے شادی کر سکتا ہے۔ لیکن وہ پورے خیل کو تنگ نہ کرے۔ اللہ داد آزاد ہے وہ جان پر کھیل جائے گا لیکن یہ رشتہ منظور نہیں کرے گا۔

لیکن مبارک نے جو اقتدار کے نشہ میں چور تھا ان کی بات سنی ان سنی کردی اور خیل کو سبق سکھانے کے ارادے سے سنبلوں کا ایک گاؤں لوٹ لیا اور ایک باندی کو اغوا کرکے لے گیا۔ اس پر پورے خیل کا جرگہ اس کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اسے جس قدر اپنی عزت پیاری ہے انہیں بھی اپنی عزت اتنی ہی پیاری ہے۔ جرگہ نے اس وقت تک ادب کا دامن نہیں چھوڑا اور حاکم سے درخواست کی کہ لڑکی واپس کی جائے۔ لیکن جب انہیں کورا جواب ملا تو وہ بھی دل کی بات زبان پر لے آئے اور کہا ”تُو ہندوستان میں پیدا ہوا ہے اور افغانوں کے طور طریقوں سے ناواقف ہے۔ اب تک کبھی بگلے کی اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ شہباز کو ستائے۔ ہم تیرے چچا شیر شاہ کے خیال سے اب تک تجھ کنیز زادے کا احترام کرتے رہے ہیں۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دے اور ظلم سے باز آ اور اس عورت کو واپس کردے۔ مبارک نے غصہ میں جواب دیا کہ تم اپنی عزت کی ڈینگ مارتے ہو میں اپنی عزت اس میں سمجھتا ہوں کہ میرا گھر عورتوں سے بھرا رہے۔ میں اس لڑکی کو واپس نہیں کروں گا بلکہ اللہ داد سے بھی اس کی لڑکی زبردستی چھین لوں گا۔ ملکوں نے غصہ میں آکر کہا اگر تجھے اپنی جان پیاری ہے تو تُو ہماری عورتوں کی طرف آنکھ یا ہاتھ نہ اٹھانا۔ اس پر مبارک طیش میں آگیا اور اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سنبلوں کو مار کر نکال دو۔ قبائلی قاعدہ کے مطابق اپنے ہتیار جلسہ گاہ سے باہر چھوڑ آئے تھے لیکن وہ بھی طیش میں آگئے اور نہتے ہونے کے باوجود حاکم پر ٹوٹ پڑے اور اسے اور اس کے تمام نوکروں چاکروں کو ہلاک کر دیا۔

جب شیر شاہ تک یہ خبر پہنچی تو اس نے ہیبت خان کو لکھا کہ سور قبیلہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اگر افغانوں نے اسی طرح سور قبیلہ کے افراد کو مارنا شروع کیا تو اس قبیلہ کا ایک فرد بھی باقی نہیں رہے گا سنبل خیل ہیبت خان کے اپنے قبیلہ کے آدمی ہیں لہذا وہی ان کے ساتھ نپٹے اور انہیں ایسی سزا دے کہ اس کے بعد دوسرے لوگ اپنے حاکموں کو ہلاک کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

سنبل خیل پہاڑیوں میں جا چھپے جہاں ہیبت خان ان کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ علاقہ شیر شاہ کی قلمرو نہیں تھا۔ ہیبت خان خود بھی نیازی تھا لہذا اس نے بڑے فریب سے کام لیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ سنبل خیل اپنے کئے پر معافی مانگ لیں تو وہ شیر شاہ سے ان کی صلح صفائی کرا دے گا اور چونکہ وہ خود بھی ان ہی کے قبیلہ کا ہے اس لئے انہیں اس پر اعتماد کرنا چاہئے۔ چنانچہ سنبل خیل اس کے فریب میں آگئے اور نو سو افراد بال بچوں سمیت اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے۔ ہیبت خان نے تمام مردوں کو قتل کردیا اور عورتوں کو شیر شاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ شیر شاہ نے اس حرکت پر سخت ناراضگی ظاہر کی اور کہا کہ قبائل میں آج تک کسی نے ایسی ذلیل حرکت نہیں کی تھی اس نے یہ بھی کہا کہ ہیبت خان بادشاہ بننے کا خواب نہیں دیکھ رہا تھا ورنہ وہ اتنے آدمیوں کو ہلاک نہ کرتا۔ اگر وہ بادشاہ بھی بننا چاہتا تھا تب بھی اسے اپنے پشتو اس قدر نہیں بھولنی چاہئے تھی کہ وہ اپنے ہی لوگوں کا خون ناحق بہادے۔ شیر شاہ کا خیال تھا کہ ہیبت خاں کو پنجاب سے ہٹا دیا جائے لیکن اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد وہ ۱۵۴۵ء میں فوت ہوگیا۔ وہ پریاگ (۱) سے جنوب مغرب میں بندیلکھنڈ کی پہاڑیوں میں قلعہ کالنجر کا محاصرہ کئے پڑا تھا کہ اچانک بارود کے دھماکے سے اس کے ٹکڑے اڑ گئے۔

شیر شاہ عظیم المرتبت انسان تھا۔ مغل طاقتور حریف تھے۔ ان کی رگوں میں وسطی ایشیا کا تازہ خون گرم آب و ہوا میں دھنے سے سرد نہیں ہوا تھا لیکن شیر شاہ جو ہمت اور بہادری میں ان کا ہم پلہ تھا اپنی

---

(۱) گنگا اور جمنا کے سنگھم پر واقع ہندؤں کا مقدس شہر پریاگ جو پنڈت نہرو کا وطن ہے۔ ان دنوں الہ آباد میں اکبر کا قلعہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔

ذہانت اور دوسری صلاحیتوں سے پورا کام لینے میں مغلوں سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ چنانچہ اس نے مغلوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔ نیازیوں کے ساتھ ناگوار تعلقات سے قطع نظر اس نے کبھی سرحدی علاقہ پر حکومت نہیں کی لیکن اس نے ہمیشہ کے لئے یہ مثال قائم کردی کہ ایک پٹھان وطن سے دور اپنے ہم وطنوں کو پیشہ‌ور سپاہیوں کی حیثیت سے کس طرح جمع کر سکتا ہے اور پانچ سال کے مختصر عرصہ میں ایک براعظم میں کس طرح امن و امان قائم کر سکتا ہے۔ وہ خائنوں، سرکشوں اور باغیوں کے ساتھ بڑی بے رحمی سے پیش آتا تھا لیکن محتاجوں اور غریبوں پر رحم کرتا تھا اور مزارعوں کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے سارے ملک میں سڑکیں اور کاروان سرائیں تعمیر کرائیں۔ لیکن اس کی عظمت کی سب سے نمایاں جھلک اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں ملتی ہے۔ دہلی میں شیر شاہ کے قلعہ کے عظیم‌الشان دروازوں اور فصیل سے اس شخص کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے قلعہ کے برجوں کے مقابلہ پر شاہجہان کا بنوایا ہوا لال قلعہ جو تین میل شمال میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بچہ نے چھوٹی چھوٹی اینٹیں جوڑ کر گھروندا بنایا ہو۔ شیر شاہ نے اپنے قلعہ میں جو مسجد بنوائی ہے وہ بھی سادگی اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے اور اس مسجد سے اسلام کی روح جھلکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مغلوں کی بنوائی ہوئی تمام مسجدیں جڑاؤ صندوقچے معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن شیر شاہ کی اصل عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کا سرحدی قلعہ روہتاس دیکھنا ہوگا۔ یہ قلعہ جہلم سے چند میل شمال میں نیچی‌نیچی پہاڑیوں کے سلسلہ کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ اس کے بڑے بڑے برج جو چٹانوں سے اوپر ابھرے ہوئے ہیں دیوار چین معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے شمال میں خشک چشمہ کی ریتلی گزرگاہ کے پار کوہستان نمک ہے اور اس کے پار پیر پنجال کی برف پوش چوٹی نظر آتی ہے ایک فوجی قلعہ کی مناسبت سے اس کے عظیم‌الشان دروازوں اور برجوں پر کوئی آرائشی کام نہیں ہے جیسا کہ دہلی کے قلعہ پر ہے لیکن چوکور پتھر بڑی خوبصورتی سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے گئے ہیں اور پوری عمارت کا تناسب آنکھوں میں کھب جاتا ہے۔ اس قلعہ کا احاطہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں دو ڈویژن فوج سما سکتی ہے۔ یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اتنا عظیم‌الشان قلعہ جو مجسم طاقت ہے شیر شاہ کے مختصر دور حکومت میں تیار ہوگیا

ہوگا۔ شہامت علی جس نے ۱۸۳۹ء میں مسٹر ویڈ کے ساتھ کابل جاتے ہوئے قلعہ روہتاس دیکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ قلعہ کی تعمیر دس سال میں مکمل ہوئی۔ اگر ایسا ہے تو یہ قلعہ شیر شاہ کے جانشین کے نصف دور حکومت تک مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔

لیکن قلعہ کا نقشہ شیر شاہ ہی نے بنایا تھا اور اس عمارت کی شکل میں شیر شاہ کو دوسری زندگی مل گئی۔ اس عمارت میں جو مصالحہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی قلعہ کے بانی کی دل جوڑنے کی صفت کا مظہر ہے۔ چنانچہ عمارت کے جو حصے امتداد زمانہ کے ہاتھوں سے گر گئے ہیں ان کے پتھر ابھی تک ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح پٹھان سوسائٹی کے جو منتشر حصے باقی ہیں وہ شیر شاہ کو یاد کرتے ہوئے اسی جیسے ایک لیڈر کے انتظار میں ہیں جو انہیں متحد کر سکے۔ ایسے لیڈر کے بغیر وہ دنیا کی قوموں میں اپنی جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔

شیر شاہ کا ایک مزیدار واقعہ سنئے۔ ایک روز وہ ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا اور بار بار سسکیاں لے رہا تھا۔ اس پر ایک مصاحب نے کہا آپ نے اتنے مختصر عرصہ میں امور سلطنت، خزانہ، فوج، رعایا اور امن و امان سے متعلق تمام معاملات کو سلجھا دیا ہے اس سے پہلے کبھی کوئی حکمران ایسا نہیں کر سکا تھا پھر آپ کیوں رنجیدہ ہیں۔ شیر شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب مصاحبوں کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا تم ٹھیک کہتے ہو لیکن چار خواہشیں میرے دل میں رہ گئیں جنہیں میں پورا نہیں کر سکتا اور اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گا۔ مصاحبوں کے دریافت کرنے پر شیر شاہ نے کہا پہلی خواہش تو یہ تھی کہ میں روہ کے علاقہ کو اجاڑ دیتا اور اس کے باشندوں کو نیلاب(۱) سے لاہور تک پھیلے ہوئے میدان میں بسا دیتا تاکہ مغلوں کی طرف سے حملہ ہوتا تو انہیں فوراً خبر ہو جاتی اور پھر کوئی کابل کی طرف سے ہندوستان میں داخل نہ ہو سکتا۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ پہاڑی باشندے مہذب زندگی کے آداب سے واقف ہو جاتے۔ میری دوسری خواہش یہ تھی کہ میں لاہور کو اجاڑ دیتا تاکہ شمال کی طرف سے کوئی حملہ آور اتنے بڑے شہر میں داخل ہوکر اپنی ضرورت کی تمام چیزیں حاصل نہ

(۱) نیلاب سے دریائے سندھ مراد ہے۔

کر سکے۔ تیسرے بڑے عرصہ سے میری یہ تمنا رہی ہے کہ میں مکہ معظمہ کے راستہ پر پچاس مضبوط چوکیاں بنواؤں تاکہ حاجی اطمینان کے ساتھ سفر کر سکیں۔ میری آخری خواہش یہ تھی کہ میں پانی پت میں سلطان ابراهیم (۱) کا مقبرہ بنواتا اور اس کے مقابل چغتائی سلطان بابر کا مقبرہ بنواتا جس کی بدولت سلطان ابراهیم کو شہادت کا مرتبہ ملا۔ میرے اس کام کی دوست اور دشمن یکساں تعریف کرتے اور میرا نام تا قیامت زندہ رهتا۔ یہ تمنائیں جو مجھے بڑی عزیز هیں میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گا۔

اس حسرت خیز عبارت میں شیر شاہ نے اپنی اس حکمت عملی کا سر چشمہ بتا دیا ہے جس کی بدولت اسے اتنے مختصر عرصہ میں کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے اپنا مدعا اس زمانہ کی سیدھی اور سادہ زبان میں ظاہر کیا ہے۔ اسے لاهور کو اجاڑنے کا خیال اس لئے آیا کہ اسے یاد تھا کہ پہلے محمد غوری اور پھر بابر نے جن کا تذکرہ آگے آنے والا ہے هندوستان فتح کرنے کے لئے اس شہر کو اپنا نقطۂ آغاز بنایا۔ شیر شاہ کا مدعا یہ ہے کہ جس نے پنجاب پر قبضہ کرلیا اس کے لئے هندوستان پر اقتدار جمانے کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اس کی تیسری اور چوتھی خواهش سے ایک انجنیر اور ماهر تعمیرات کی حیثیت سے اس کی عظمت ظاهر ہوتی ہے اور اس کے دلی جذبات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس نے جو عمارتیں بنوائیں وہ وقتی ضرورت پوری کرنے کے لئے نہیں تھیں بلکہ ان عمارتوں کو یادگاری حیثیت حاصل ہے۔ سرحدی قبائل کے متعلق اس نے اپنی جس پہلی خواهش کا اظہار کیا ہے وہ خیالات کے اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں اسے لاهور کا خیال آیا۔ اسے روہ کے پہاڑی باشندوں کی طاقت اور کمزوری دونوں کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ اس نے ان ہی قبیلوں میں سے وہ سپاهی بھرتی کئے تھے جن کے ساتھ وہ دهلی کے تخت تک پہنچ گیا لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ قبائلی طبقے جو اپنے وطن میں زبردست نفاق اور قبائلی تفریق کا شکار هیں سلطنت کو کسی بیرونی حملے سے نہیں بچا سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک کمانڈر کے سپاهی دوسرے کمانڈر کے ساتھ جا ملیں کیونکہ وہ کسی خاص طبقہ یا نظام حکومت کے نہیں بلکہ ایک فرد کے وفادار رهتے هیں۔ ایک لحاظ سے یہ بات شیر شاہ کی

(۱) آخری لودی بادشاہ جو ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں مارا گیا۔

عظمت کی دلیل ہے کہ اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ قبائل کی سخت کوشی سے وہ سلطنت فائدہ اٹھا سکتی ہے جسکی سرحد پر وہ آباد ہیں اس نے یہ بھی پیش گوئی کردی، کہ پٹھانوں کا مستقبل وسط ایشیا کی چھوٹی چھوٹی اور غیر واضح ریاستوں کے ساتھ نہیں بلکہ وادی سندھ کے ساتھ وابستہ ہے۔

جیسا کہ شیر شاہ کے شایان شان تھا وہ بہار میں سہسرام کے مقام پر مدفون ہے جہاں وہ پلا بڑھا اور اس نے پہلے پہل شہرت حاصل کی۔ اس کا مقبرہ ایک بہت بڑے تالاب کے بیچوں بیچ پتھر کے ایک چبوترہ پر واقع ہے جو اس کی عظمت کی مناسب یادگار ہے لیکن اس کی اصل یادگاریں دھلی کا پرانا قلعہ اور روھتاس کا قلعہ ہے جو جہلم سے آگے شمال کی طرف واقع ہے۔

شیر شاہ کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کے لئے رسہ کشی لازم تھی اس رسہ کشی میں شیر شاہ کا چھوٹا بیٹا جلال خان کامیاب ہوا جس نے سلیم یا اسلام شاہ کا لقب اختیار کیا۔ جس وقت شیر شاہ کا انتقال ہوا اس وقت بڑا بیٹا عادل خان دارالحکومت سے دور تھا اس لئے وہ ھیبت خان اور دوسرے سرداروں کی، جن میں سے اکثر نیازی تھے حمایت حاصل نہیں کر سکا۔ البتہ جب ان سرداروں نے دیکھا کہ اسلام شاہ بڑا سخت گیر آقا ہے تو وہ عادل خان کے ھم نوا ھوگئے۔ سرحد کے ساتھ ان واقعات کا تعلق برائے نام ہے اس لئے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بھائیوں کے جھگڑے کے ساتھ سرداروں میں بھی جھگڑا شروع ھوگیا اور آخر کار ۱۵۵۴ء میں گوالیار کے مقام پر اسلام شاہ کی وفات کے ساتھ سُور خاندان کا خاتمہ ھوگیا۔ سُور گھرانے کے تین افراد تخت کے دعوے دار بن بیٹھے اور ھمایوں کو مغلیہ سلطنت بحال کرنے کا موقع مل گیا۔

شیر شاہ کے واقعات سے پٹھانوں کی طاقت اور کمزوری دونوں نمایاں طور پر ظاہر ھوجاتی ھیں۔ ایک لیڈر اٹھتا ہے جو اپنی بڑائی کی بدولت لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا ہے اور شان و شوکت کے مختصر زمانہ تک سب آپس کے جھگڑے بھول جاتے ھیں وہ لیڈر مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا جذبہ بھی دفن ھو جاتا ہے۔ اس لیڈر کی غیر موجودگی میں

جس پھر سب کو بھروسہ تھا قبائلی جھگڑے پر سر اٹھاتے ہیں اور جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ سب خاک میں مل جاتا ہے۔

کبھی کبھی حالات اس طرح رخ بدلتے ہیں
کہ جو کام ایک مہم کی حیثیت سے شروع کیا گیا تھا
اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

فصل یازدهم

بابر

همیں افغانوں اور پٹھانوں کی اپنے وطن میں پہلی حقیقی اور تاریخی جھلک پہلے مغل شہنشاہ (۱۴۸۲-۱۵۳۰ء) بابر کے خود نوشت سوانح بابرنامہ میں ملتی ہے۔ اب ہمیں عرب اور ایرانی جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی تصنیفات میں پٹھانوں کے خال خال تذکرے یا کسی ایک قبیلہ مثلاً یوسف زئیوں کی روایات پر بھروسہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ بابر کے ہندوستان آنے سے پہلے کئی افغان خاندان دھلی کے تخت پر حکومت کر چکے تھے۔ خلجیوں اور لودھیوں نے افغانوں کی فوجی طاقت کی دھاک بٹھا دی تھی اور اپنی عظمت کی بہت سی یادگاریں چھوڑی تھیں جو آج بھی ہندوستان کے دارالحکومت کے اطراف میں مقبروں اور قلعوں کی شکل میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے وقائع نگاروں نے ان بادشاھوں کی شان و شوکت ان کی لڑائیوں اور قتل عام کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ان تمام وقائع میں محلاتی سازشوں اور قتل و غارت گری کے تذکروں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ بادشاہ اور ان کے حاکم ہمیشہ شمالی پہاڑی علاقوں کے لوگوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرتے رہے لیکن جن وقائع نگاروں نے اس دور کے واقعات قلم بند کئے وہ افغانوں اور پٹھانوں کی سر زمین کے حالات سے بہت کم واقف تھے۔ اور اگر کچھ واقف تھے بھی تو انھوں نے ان واقعات کو قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان تمام وقائع میں کسی خاص قبیلہ کا شاذونادر ہی کوئی تذکرہ ملتا ہے۔ صرف خلجی اور غوری ہی دو ایسے نام ہیں جو اس دور کی تصانیف کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔

لیکن جب بابر کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ بابر ایشیا کے حکمرانوں میں سب سے زیادہ عالی دماغ ہو گزرا ہے۔ ایک مضبوط سلطنت کے بانی کی حیثیت سے اس کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک مدبر اور ایک جرنیل کی صفات یکجا نظر آتی ہیں۔ وہ ان کے علاوہ کچھ اور صفات کا بھی مالک تھا۔ اس نے اچھی سجھ بوجھ اور متجسس ذہن پایا تھا۔ وہ اپنے گردو پیش سے بڑی گہری دلچسپی لیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے عملی انسانوں کی دسترس فطرت اور فنون لطیفہ کے جن شعبوں تک تھی ان میں سے کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں بابر نے تحقیق نہ کی ہو۔ اس کی بلا نوشی اس کی فطری سر مستی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جسے بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے گناہوں کا برملا اعتراف کیا اور ان پر پشیمانی بھی ظاہر کی جس کی وجہ سے اس کی انسانیت اور نمایاں ہوگئی ہے اور اس کا کردار اور دلکش ہوگیا ہے۔ وہ بچپن ہی سے اپنی مادری زبان ترکی اور فارسی میں شعر کہنے لگا تھا اور اپنے ملک کے شعراء میں اسے بڑی شہرت حاصل تھی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی شہرت کا انحصار اس کے خود نوشت سوانح پر ہے جو اس نے چغتائی ترکی میں لکھے ہیں اور جن سے لکھنے والے کی زیرکی اور تیز فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بابرنامہ کا دو مرتبہ انگریزی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ارسکین (ERSKINE) اور لیڈن (LEYDEN) نے ۱۸۲۹ء میں اور لارڈ بیوریج کی والدہ مسز بیوریج (MRS. BEVERIDGE) نے ۱۹۲۲ء میں اس کا ترجمہ کیا۔ دونوں ترجمے قابل تعریف ہیں لیکن مسز بیوریج کا ترجمہ زیادہ عالمانہ ہے کیونکہ وہ چغتائی ترکی سے خوب واقف تھیں۔ دراں حالیکہ مقدم الذکر مترجموں نے انگریزی ترجمہ فارسی کے اس نسخہ سے کیا ہے جو اکبر کے زمانہ میں تیار کیا گیا تھا۔ البتہ لیڈن اور ارسکین کا ترجمہ زیادہ جاندار ہے اور تازہ ترین ایڈیشن کی شکل میں جسے کنگ (KING) نے ۱۹۲۱ء میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے موزون سائز کا ہے۔ ترجمہ کا بیشتر کام ارسکین نے کیا ہے جنہیں ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن (STUART ELPHINSTONE) نے اس کا کام شوق دلایا۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن ہی نے سب سے پہلے یورپ کو اس تصنیف سے روشناس کرادیا۔ وہ اصل چغتائی زبان میں لکھا ہوا بابر نامہ جو انہیں ۱۸۰۹ء میں اس وقت دیا گیا تھا جب وہ پشاور میں شاہ شجاع

کے دربار میں آئے تھے اپنے ساتھ یورپ لائے تھے۔

بابر نے جغرافیائی تفصیلات اتنی وضاحت اور صحت کے ساتھ قلم بند کی ہیں کہ آج بھی آمو دریا اور سندھ کے درمیان پھیلے ہوئے پیچ در پیچ علاقوں کا عام تذکرہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ وہ واقعات کے تذکرہ میں بھی اس صحت اور وضاحت کو برقرار رکھتا ہے اور اپنی اس واضح نگاری کی بدولت اسے ایک مورخ کی حیثیت سے بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ اور ایک لیڈر کی حیثیت سے جس نے متعدد بار فتح کی شیرینی اور شکست کی تلخی چکھی تھی وہ بدیہی طور پر ایک ایسا انسان تھا جو دوسرے انسانوں کے حسن سلوک اور ہمدردی پر بھروسہ کرتا تھا۔ وہ ہنس بھی سکتا ہے رو بھی سکتا ہے وہ گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے اور پھر اس پر پشیمان بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے دل سے شگفتگی اور فیاضی کے چشمے ابلتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ وہ پھول، درخت، پرندے، سخت چٹانیں، اور شگفتہ وادیاں، صاف آسمان، بارش، برف، طوفان، افراد اور قبیلوں کے نام اپنے دوست اور دشمن اور ان سب کے حرکات و سکنات اس خدائے واحد کے سایہ میں دیکھتا ہے جس پر اسے پورا بھروسہ ہے۔ اچانک پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ افغان سرزمین جس پر ابھی تک تاریکی کا پردہ پڑا ہوا تھا اچانک بقعۂ نور بن جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ بابر پٹھان نہیں تھا بلکہ ترک تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرف سے پانچویں پشت میں تیمور لنگ کی اولاد میں سے تھا اور اس کی ماں تیرھویں پشت میں چنگیز خان کے دوسرے بیٹے چغتائی کی نسل سے تھی۔ اس طرح وہ برلاس اور چغتائی دونوں نسلوں کا امتزاج تھا۔ یہ دونوں نسلیں اپنی اصل کے اعتبار سے ماضی بعید میں منگول ہونے کی دعویدار تھیں لیکن بابر کی پیدائش کے زمانہ تک مکمل طور پر ترک بن چکی تھیں۔ اس کے علاوہ جنوبی ترکستان میں جہاں بابر کی عمر کا ابتدائی حصہ گزرا تھا ترک اثرات قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس خاندان میں ایرانی فکر ایرانی آداب اور غالباً ایرانی خون بھی شامل ہوگیا تھا۔ چنانچہ بابر کے مزاج میں منگولوں، ترکوں اور ایرانیوں کے خواص شامل تھے۔ اس معاملہ میں بابر اور اس کے کچھ ساتھی ان ہیتھالوں سے مختلف نہیں ہوں گے جو ایک ہزار سال پہلے اسی طرح کی ایک مہم پر اس علاقہ میں

آئے تھے۔ لیکن جہاں بابر میدان جنگ میں اپنے پیش رووں کی طرح داد شجاعت دے سکتا تھا وہاں ان کے برخلاف اس میں ایک بانکپن بھی تھا۔ یہ بانکپن اس قتل و غارت گری کی بڑی حد تک تلافی کر دیتا ہے جو فتح کا خاصہ ہوتی ہے۔

جب بابر نے سندھ اور گنگا کی وادیاں فتح کرنے کا قصد کیا تو اس نے کابل کو اپنی پہلی منزل بنایا۔ وہ اپنے خاندان کا پہلا آدمی نہیں تھا جس نے یہ شہر فتح کیا۔ کابل اس وسیع سلطنت کا ایک حصہ تھا جو اس کے مورث تیمور نے ۱۴۰۴ء میں اپنی وفات کے وقت چھوڑی تھی اور جو ترکہ میں بابر کے چچا الغ بیگ کو ملی۔ یہ الغ بیگ وہی حکمران ہے جس کے متعلق ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اس پر یوسف زئی یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے ایک دعوت کے موقع پر ان کے ملکوں کو قتل کرادیا تھا۔ اس الغ بیگ پر اسی نام کے اس سے زیادہ مشہور شہزادہ کا دھوکا نہیں ہونا چاہئے جو تیمور کا پوتا سمرقند کا حاکم اور مشہور ماہر فلکیات تھا۔ وہ الغ بیگ اس الغ بیگ کے دادا کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ الغ بیگ بابر کا چچا تھا۔ بابر کا چچا ۱۵۰۱ء میں فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے کے خلاف ایک وزیر اٹھ کھڑا ہوا اس طرح بابر کے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ وہ کوہ ہندوکش پار کرکے کابل پہنچ گیا اور صرف تین سال بعد لڑائی کے بغیر ۱۵۰۴ء میں شہر پر قابض ہوگیا۔ بابر کو ہمیشہ کابل سے محبت رہی ہے وہ بڑے چاؤ سے اس شہر اور اس اطمینان قلب کا تذکرہ کرتا ہے جو اسے کابل میں حاصل ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک آب و ہوا کے اعتبار سے کوئی شہر کابل کا ہمسر نہیں وہ بڑے مزے لے لے کر کابل کے متعدد باغات کا تذکرہ کرتا ہے جن میں نہریں بہ رہی ہیں اور ان کے کنارے سایہ دار چناروں کے درخت کھڑے ہیں۔ اس نے ایسی ہی ایک جگہ اپنی آخری آرام گاہ کے لئے منتخب کی۔ اس کا مقبرہ کابل (۱) سے تھوڑے سے فاصلہ پر ایک اونچی سی جگہ واقع ہے جس کی ڈھلوان غیر محسوس طریقہ پر آس پاس کے سبزہ زار سے جا ملتی ہے۔ مقبرہ تک جو سڑک جاتی ہے اس کے دونوں طرف سفیدہ کے درخت کھڑے ہیں اور یہاں سے دور دراز پغمان کی برف پوش چوٹی نظر آتی ہے۔ یہ مقبرہ پرشکوہ نہیں ہے

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں سہواً ایک غلط بات شامل ہوگئی ہے۔ محمود کے دھوکہ میں بابر کے متعلق یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ غزنی میں دفن ہے۔

بلکہ سنگ مرمر کی معمولی سی عمارت ہے جو پر فضا علاقہ میں بنی ہوئی ہے اس پر چنار اور ارغوان کے درختوں کا سایہ ہے جن کا تذکرہ بابر نے بڑے مزے لے لے کر کیا ہے وہ لکھتا ہے ''جب ارغوان کے پھول کھلنے لگتے ہیں تو یہ علاقہ اتنا خوبصورت نظر آتا ہے کہ دنیا میں اس کا جواب نہیں مل سکتا''۔

کابل سے ہندوستان جاتے ہوئے بابر کو افغانوں سے دو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان میں سے ہر لڑائی ایک دوسرے سے مختلف نظام حکومت کے خلاف لڑی گئی۔ اس کی دوسری اور آخری لڑائی کا نتیجہ لودی خاندان کی شکست کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ دہلی پر قابض ہوگیا جو ۱۴۵۱ء سے جبکہ سلطان بہلول لودی نے اپنے پیش رو سید خاندان کی سلطنت کے کھنڈروں پر اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی افغان سلطنت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ یہ سلطنت جیسا کہ بابر نے لکھا ہے دریائے جہلم سے بہار تک پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کا حکم دریائے سندھ کے پار نہیں چلتا تھا اور افغان سرزمین پر جہاں سے دہلی کے افغان حکمراں آئے تھے حکومت کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ ایک شاندار اور طاقتور حریف تھا۔ جس وقت بابر کابل پہنچا اس وقت سلطان سکندر کی حکومت تھی جو حکمراں لودی خاندان کے بانی کا بیٹا اور اس خاندان کا دوسرا فرمان روا تھا۔ بابر کا کہنا ہے کہ لودی بادشاہ پانچ لاکھ فوج میدان میں لا سکتا تھا۔

بابر کے پہلے افغان حریف جو نسبتاً زیادہ اہم نہیں تھے قبائل تھے جو اپنے علاقہ میں جمے ہوئے تھے۔ یہ قبائل اس راستہ میں حائل تھے جس پر ایسے ہر فاتح کے لئے جو ہندوستان فتح کرنے کے ارادہ سے وسط ایشیا سے چلا ہو قبضہ کرنا اور اسے کابل اور جہلم دریاؤں کے درمیان پہاڑی علاقہ میں کھلا رکھنا ضروری ہے۔ بابر کو یہ مہم سر کرنے میں کئی سال لگے اور بابر کی عبارت پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اس علاقہ میں جو مشکلات پیش آئیں اور جو پوری طرح کبھی دور نہیں ہوئیں ان کی وجہ سے بابر متواتر پریشان رہتا تھا۔ اس کے بعد اس کی نسل کے دوسرے بادشاہ بھی اس مشکل کا حل تلاش کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

بابر کا آخری اور فیصلہ کن حملہ جس میں اس نے ہندوستان فتح کیا ۲۶-۱۵۲۵ء میں ہوا۔ اس سے پہلے ہندوستان کی طرف بابر نے پانچ حملے کئے جن کا مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ان قبائل کو جو راہ میں حائل ہیں زیر کر لیا جائے۔ ان پانچ حملوں کے علاوہ غزنی کے آس پاس غلجیوں پر فوج کشی کی گئی اور قندھار پر قبضہ کرنے کے لئے بابر قریب قریب ہر سال اس شہر پر چڑھائی کرتا رہا۔ بابر ۱۵۲۲ء میں قندھار پر مکمل قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ بابر نے ان مہمات کا تذکرہ اتنی وضاحت کے ساتھ کیا ہے کہ سکندر اعظم اور دوسرے حملہ آوروں کے مقابلہ میں ہم بابر کی پیش قدمی کا کہیں زیادہ صحت کے ساتھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور جب ایک پٹھان سرحدی علاقہ میں بابر کی مہمات کا بیان پڑھتا ہے تو وہ پہلی مرتبہ یہ محسوس کرتا ہے کہ تاریکی ختم ہوگئی اور روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ بابر کے بیان میں قبائل کے وہ نام ملتے ہیں جن سے آج ہم اچھی طرح واقف ہیں۔

ان قبائل میں سب سے پہلے اور سب سے نمایاں یوسف زئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بابر نے ان کے علاقہ میں زیادہ وقت گزارا اور میرے خیال میں ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ بابر نے ایک یوسف زئی لڑکی سے شادی کی تھی۔ یوسف زئیوں کے بعد دوسرے زبان زد عام نام سنائی دیتے ہیں مثلاً افریدی، اورک زئی، بنگش، توری، دلہ زاک، مہمند گیگیانی، محمد زئی، لوھانی، نیازی، عیسیٰ خیل، حتیٰ کہ غلجی بھی (بابر نے یہی نام لکھا ہے) اور وزیر۔ بابر نامہ میں ہر قبیلہ کا مناسب تذکرہ موجود ہے۔ پرشاور، باجوڑ، سواد، کوھاٹ، انگو، گور کھٹری، خیبر اور خیبر کی علی مسجد اور جم، صوابی کے قریب کا جنگل جہاں گینڈے پائے جاتے تھے اور جہاں اب تمباکو کی کاشت ہوتی ہے، پجا کی آبشار سے نیچے کاٹلنگ اور سدم سے نکلتا ہوا مقام کا چھوٹا چشمہ، غرض ان تمام مقامات میں اچانک جان سی پڑ جاتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان میں سے کچھ قبیلے جہاں آباد تھے اب وہاں آباد نہیں ہیں لیکن بابر نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیشتر قبائل آج بھی وھیں آباد ھیں جہاں بابر کے زمانہ میں تھے۔ افریدی اس زمانہ میں بھی خیبر میں آباد تھے یوسف زئی، سمہ اور سوات میں محمد زئی ھشت نگر میں بنگش ھنگو کے آس پاس لوھانی دامان میں



بابر کا مقبرہ

اور غلجی غزنی کے آس پاس آباد تھے۔ جہاں وہ آج بھی آباد ہیں۔ خٹک اور خلیل ہی دو ایسے بڑے قبیلے ہیں جنھوں نے بعد میں شہرت حاصل کی لیکن جن کا بابر نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بابر کے اس بیان کے پیش نظر جو اتنا جدید اور قرائن کے اعتبار سے مستند ہے ہمیں وادی پشاور اور سوات میں افغان آبادیوں کے ان قصوں کے متعلق شبہ ہونے لگتا ہے جو یوسف زئیوں کی روایات میں شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں میں پٹھان بابر کی آمد ہی کے زمانہ میں آباد ہوئے تھے۔

بابر کے قلم سے کچھ قبیلوں کا تذکرہ چھوٹ جانا بھی اتنا ہی دلچسپ ہے جتنا دوسرے قبیلوں کے متعلق اس کی بہم پہنچائی ہوئی تفصیلات۔ مثال کے طور پر وہ پٹھان قبیلوں کے بہت سے نام گنواتا ہے لیکن وہ ان کے لئے کہیں بھی پٹھان پختون یا پشتون کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ اس نے بنوں کے قریب کاشت کرنے والے کرلانی قبائل کا تذکرہ کیا ہے۔ بابر جب کبھی کسی قبیلہ کا نام نہیں بتاتا یا بعض حالات میں قبیلہ کے نام کے ساتھ بھی وہ افغان کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ پٹھانوں کی زبان کو بھی جو وہ کابل میں بولی جانے والی گیارہ زبانوں کے ساتھ گنواتا ہے افغانی ہی بتاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کی سب سے زیادہ شناسائی یوسف زئی قبیلہ سے تھی۔ یہ قبیلہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اپنے لئے افغان کا لقب استعمال کرتا ہے۔ اور اپنے لئے پٹھان کا لفظ کبھی استعمال نہیں کرتا۔ بابر نامہ میں بیان کئے ہوئے مختلف قبائل کی تعداد کے پیش نظر جس قبیلہ کا بیان نظر انداز کردیا گیا ہے وہ ابدالی (۱) ہیں۔ یہ فروگزاشت بڑی اہم ہے۔ بابر قندھار اور ہرات کے درمیان (ابدالی، تاریخ میں پہلی مرتبہ اسی علاقہ میں ظاہر ہوئے تھے) بسنے والے جس قبیلہ کا تذکرہ کرتا ہے وہ نکدری ہیں۔ یہ قبیلہ جس کا تذکرہ ہزاروں کے ساتھ کیا گیا ہے افغان نہیں تھا۔ بابر زمینداور پر جو ابدالیوں کا مرکزی علاقہ ہے اپنی فتح کا تذکرہ کرتا ہے لیکن اس علاقہ کے رہنے والوں کا تذکرہ نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ فردگزاشت بڑی عجیب ہے۔

(۱) ابدالی جو بعد میں احمد شاہ کے زمانہ سے اپنے آپ کو درانی کہلانے لگے ۱۷۴۷ء سے اب تک افغانستان کے تمام حکمراں خاندان اسی قبیلہ کی کسی نہ کسی شاخ سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ احمد شاہ کے زمانہ سے درانیوں کو اعلیٰ ترین افغان قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔

بابر کی آنکھوں کے سامنے سے جو قبائلی کردار گزرے ہیں ان کا جائزہ لینا غیر مناسب نہ ہو گا۔ عام طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کابل اور سندھ کے درمیانی علاقہ میں اثرو نفوذ کی ضرورت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں قبائل اتنے آزاد تھے کہ جو شخص شمال مغرب سے ہندوستان کا قصد رکھتا ہو وہ ان کے ہاتھوں تنگ آسکتا تھا۔ حقیقتاً بابر نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ پورا قبائلی علاقہ جس پر اس نے باجوڑ سواد پرشاور اور ہشت نگر کو شامل کیا ہے کسی زمانہ میں سلطنت کابل کا حصہ تھا لیکن ''اب اس پورے علاقہ پر افغان قبائل قابض ہیں اور یہاں کسی کی حکومت نہیں ہے''۔ بابر نے قبائلی علاقہ میں جو راستہ اختیار کیا قبائل کو رام کرنے میں جو وقت صرف کیا اور اپنے حریفوں کے طور طریقوں پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

بابر نے پہلی مہم کابل فتح کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۵۰۵ء کے آغاز میں اختیار کی۔ اس مہم کا مقصد واضح طور پر یہ تھا کہ ہندوستان تک پہنچنے کے لئے راہ نکالی جائے۔ بابر خیبر میں گھستا ہوا پشاور پہنچا (اس بیان میں بابر نے اس کا نام بگرام لکھا ہے) پشاور میں وہ برگد کے اس بڑے درخت تک پہنچا جو اس وقت تک کھڑا تھا (یہ بابر کی تحریر کا خاص انداز ہے) پھر اس نے اپنے افسروں کے مشورہ پر دریائے سندھ عبور کرنے کا ارادہ بدل دیا اور کوہاٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے سنا تھا کہ کوہاٹ دولتمند علاقہ ہے اور وہاں سے کافی مال غنیمت مل سکتا ہے۔ غالباً اسے یہ اطلاع گگیانیوں نے دی تھی جو آج کی طرح اس زمانہ میں بھی پشاور کے آس پاس آباد تھے۔ ظہر کے وقت کوہاٹ پر حملہ کرنے اور لوٹ مار مچانے اور چند روز آرام کرنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ دوبارہ مغرب کی طرف کوچ کیا جائے اور بنگش اور بنوں میں افغان علاقوں میں لوٹ مار مچائی جائے۔ اور پھر بیرمل کے راستے جسے بابر نے فرمل لکھا ہے واپسی ہو۔ اس کے بعد ہنگو کے قریب بنگش قبیلہ کے خلاف لڑائی کا بڑا موثر بیان کہتا ہے یہ لڑائی ایک تنگ گھاٹی میں ہوئی اور اس کا تذکرہ اتنی وضاحت سے کیا گیا ہے کہ آج بھی استرزئی اور رئیسان نامی دیہات کے درمیان یہ گھاٹی شناخت کی جا سکتی ہے۔ بابر نے اس موقع پر پٹھانوں کی ایک رسم بھی بیان کی ہے جو اس نے پہلی مرتبہ

دیکھی تھی۔ جو پٹھان لڑائی میں گرفتار کر لئے گئے تھے اور رحم کے طلبگار تھے وہ اپنے دانتوں میں گھاس دبائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے ''میں تمہارا بیل ہوں،،۔ اس لڑائی کے بعد بابر کی فوج ٹل ہوتی ہوئی بنوں پہنچی۔ بابر نے بنوں کے متعلق ٹھیک لکھا ہے کہ یہ ایک زرخیز اور ہموار علاقہ ہے۔ اس کے شمال میں پہاڑیاں ہیں اور بنگش (کرم دریا) اس کے درمیان سے بہتا ہے۔ وہ بنوں اور دریائے سندھ کے درمیان کھیتی باڑی کرنے والے جن قبائل کا تذکرہ کرتا ہے ان میں کرلانی جن کا نام بگاڑ کر کرانی لکھا گیا ہے اور لودی قبائل نیازی اور عیسیٰ خیل شامل ہیں آج کل بنوں کے آس پاس جو کرلانی قبیلے آباد ہیں وہ خٹک اور ان کے قرابت‌دار شیتک ہیں جو عام طور پر بنوچی "کہلا" ہیں۔ نیازی اور عیسیٰ خیل آج بھی وہیں آباد ہیں جہاں اس زمانہ میں تھے۔ اور بابر نے جن قبیلوں کو کرانی بتایا ہے وہ خٹک یا شیتک یا دونوں ہوں گے۔

اس مرحلہ پر فوج نے ایک بار پھر اپنی منزل بدل دی اور وادی لارگی کے راستہ دشت (جس سے بابر کی مراد دامان یا ڈیرہ جات ہے) تک اور وہاں سے تخت سلیمان کے دامن کے ساتھ ساتھ ڈکی جو اب بلوچستان کے ضلع لورالائی کی تحصیل ہے اور آب ایستادہ جھیل کے پاس سے ہوتی ہوئی غزنی واپس پہنچ گئی۔ فوج کا ایک حصہ سندھ کے دائیں کنارے پر سفر کرتا ہوا سخی سرور پہنچا۔ بابر لکھتا ہے کہ یہاں ایک مزار ہے اور یہ حقیقت ہے کہ یہ مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ لیکن فوج نے دریا عبور نہیں کیا۔ صرف ایک بہادر آدمی نے جو بابر کا آبدار تھا دشمنوں کی موجودگی میں جو دوسرے کنارے پر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے للکار للکار کر تلواریں ہوا میں ہلا رہے تھے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب گھوڑا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تو اس کا سوار بایزید اتنی دیر توقف کئے رہا جتنی دیر میں دودھ ابلتا ہے پھر اس نے حملہ کا ارادہ باندھ لیا اور یہ دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے نہ کسی کے آنے کی امید ہے دریا کے کنارے کھڑے ہوئے دشمن پر تیزی سے جھپٹا۔ دشمنوں نے اس پر تیر برسائے لیکن وہ پاؤں نہیں جما سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بابر لکھتا ہے ''ننگے گھوڑے پر نہتا سوار ہونا کسی کی مدد کے بغیر آگے بڑھنا سندھ جیسا دریا عبور کرنا دشمن کو بھگا دینا اور اس کی جگہ پر قبضہ کر لینا بہادری اور مردانگی کا بہت بڑا

کارنامہ ہے،،۔ اس موقع پر پوری فوج میں سے صرف بایزید نے دریا عبور کیا۔

بابر نے بنگش علاقہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں توریوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس علاقہ میں بسنے والے قبائل میں آج بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بنگش میں اس پورے علاقہ کو شامل کرتا ہے جس کی شمالی سرحد سفید کوہ ہے (بابر اس پہاڑ کا یہی نام لکھتا ہے) اور دوسری طرف بنوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں وہ پورا علاقہ آجاتا ہے جہاں آج کل ٹیری کے خٹک آباد ہیں۔ وہ ان علاقوں کو بھی محکوم نہیں بنا سکا اس کا ثبوت اس کی اس عبارت سے ملتا ہے ''بنگش کے قبائل دور دراز علاقوں میں آباد ہیں اور اپنی مرضی سے محصولات ادا نہیں کرتے۔ دوسرے اہم معاملات مثلاً قندھار، بلخ، بدخشان اور ہندوستان کی فتوحات میں مصروف رہنے کی وجہ سے مجھے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ میں بنگش میں نظم و نسق قائم کرنے پر توجہ دیتا۔ لیکن اگر خداوند تعالیٰ نے میری مرادیں پوری کیں تو میں اپنی پہلی فرصت میں اس علاقہ اور اس کے رہزن ہمسایوں سے نپٹوں گا،،۔ ایک اور قبیلہ کے متعلق جس کا مزاج چار صدیاں گزرنے کے بعد بھی نہیں بدلا بابر لکھتا ہے ''وزیر افغان محصولات ادا کرنے میں بڑے بد معاملہ ہیں... وہ اب خراج کے طور پر تین سو بھیڑیں لائے ہیں،،۔

بابر کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ بنگش اور توریوں کو رام کرنے کا کام دوسروں کے سپرد ہوا اور جہاں تک وزیر قبائل کا تعلق ہے وہ آج ۱۹۵۷ء میں بھی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔

بابر ۱۵۱۹ء سے پہلے ہندوستان کا قصد نہ کر سکا۔ ۱۵۰۷ء میں غلجیوں کے ساتھ ایک لڑائی میں الجھا ہوا تھا۔ غلجی آج کی طرح اس زمانہ میں بھی کٹاواز کے محدب میدانوں پر قابض تھے۔ بابر غلجیوں کے قافلہ کا بڑا صحیح نقشہ کھینچتا ہے۔ ''اندھیرا سا نظر آتا ہے یا تو غلجیوں کا قافلہ گزر رہا ہے یا دھواں چھایا ہوا ہے،، اس بیان سے ہمیں غلجی دوشیزہ کا پیار بھرا گیت یاد آجاتا ہے:-

''اے میرے محبوب آج میرا چہرہ جی بھر کر دیکھ لے
کل یہ چہرہ کارواں کی گرد میں چھپ جائے گا،،

بابر کا بیان کتنا جان دار اور کتنا سچا ہے۔ لیکن وہ ہمیں غلجیوں کی مختلف اور متعدد ٹکڑیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہیں تھا کہ لودی شہنشاہ جسے اس نے تخت سے اتار دیا غلجی نسل سے تھا۔ وہ ایک لوھانی کا بھی تذکرہ کرتا ہے ''جو افغان تاجروں میں سب سے زیادہ معروف تھا،، جس کا سر کاٹ کر ٹانک کے قریب کسی مقام پر اس کے سامنے پیش کیا گیا (لوھانی آج بھی اسی علاقہ میں آباد ھیں) لیکن بابر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ لوھانی بھی غلجی نسل سے تعلق رکھتے ھیں۔

۱۵۰۸ء اور ۱۵۱۹ء کے درمیان بابر نامہ میں ایک خلا پایا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں بابر کی مصروفیات کیا تھیں ان کے متعلق ھمیں بہت کم معلومات حاصل ھوتی ھیں البتہ ایران کے پہلے صفوی بادشاہ شاہ اسماعیل کے ساتھ اس کی منحوس قرابت اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ ہر سال قندھار پر بھی حملہ کیا کرتا تھا۔ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ وہ ھندوستان کی طرف مزید پیش قدمی سے پہلے کابل اور قندھار کے راستے پر اس اڈے کو قبضہ میں لانا ضروری سمجھتا تھا۔ جب جنوری ۱۵۱۹ء میں سوانح کا سلسلہ پھر جاری ھوتا ہے تو ہم دیکھتے ھیں کہ بابر باجوڑ پہنچ چکا ہے وھاں ایک قلعہ کے محاصرہ میں مصروف ہے۔ بابر نامہ میں اس خلا کی وجہ سے ھمیں بابر کی زبانی یہ معلوم نہیں ھوسکا کہ وہ کن وجوہ کی بنا پر باجوڑ میں داخل ھوا۔ یوسف زئیوں کی روایت کے مطابق بابر یوسف زئی قبیلہ کے سردار ملک احمد سے گفت و شنید کر رھا تھا اور جب اس ملک نے کابل میں بابر کے دربار میں حاضر ھونے سے دوبارہ انکار کر دیا تو بابر کو غصہ آگیا۔ آج کی طرح اس وقت بھی یوسف زئی قبیلہ سوات کے علاوہ ملاکنڈ کے جنوبی میدانی علاقہ کے بیشتر حصہ پر قابض تھا۔ احمد نے اپنی جگہ اپنے چچا زاد بھائی اور ملک سلیمان کے بیٹے ملک شاہ منصور کو بھیج دیا۔ ملک سلیمان وھی ہے جس کے متعلق یوسف زئیوں میں یہ مشہور ہے کہ اسے بابر کے چچا الغ بیگ نے قتل کر دیا تھا۔ اس پر بابر نے فیصلہ کیا کہ سوات پر چڑھائی کی جائے اور یوسف زئیوں کے مزاج درست کر دئے جائیں۔ وہ باجوڑ کے راستے آگے بڑھا تاکہ اس علاقہ کے غیر افغان حکمران جبری کو بھی جس نے الغ بیگ سے گستاخی کی تھی سزا دی جا سکے۔

اس کہانی میں جس پر روایات کے پردے پڑے ہوئے ہیں بابر کا اصل مدعا ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ بابر اپنے حقیقی اور آخری مقصد یعنی ہندوستان پر حملہ کی طرف اطمینان کے ساتھ توجہ دینے سے پہلے یہ چاہتا تھا کہ سوات اور پشاور کے شمال میں رہنے والے یوسف زئیوں کو زیر کر لیا جائے۔ بابر کے پروگرام اور بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مدعا یہی تھا۔ کیونکہ باجوڑ کو زیر نگین کرنے اور یوسف زئیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ دریائے سندھ عبور کیا اور جہلم کے کنارے بھیرہ کے مقام تک پھیلا ہوا کوہستان نمک کا علاقہ فتح کر لیا۔ وہ لکھتا ہے ''جب ہم باجوڑ سے روانہ ہوئے تو ہمارا ارادہ تھا کہ کابل واپس ہونے سے پہلے بھیرہ پر حملہ کیا جائے۔ ہمارے دل میں ہندوستان پر حملہ کا خیال ہمیشہ جاگزیں رہا''۔

وقت آنے پر بابر نے باجوڑ کے جبری حکمران ملک حیدر علی کا قلعہ بھی فتح کر لیا اور پنج کوڑہ کو اس مقام کے قریب عبور کرنے کے لئے جہاں یہ دریائے باجوڑ سے ملتا ہے جندل کے راستے آگے بڑھا۔ (غالباً اس نے دریا اس مقام کے قریب عبور کیا جہاں آج کل پل بنا ہوا ہے) اس کے بعد وہ تلاش (جو اب دیر میں ہے) میں داخل ہوا ہوگا تاکہ اسی راستہ پر جہاں سے سکندر گزرا تھا آچ کے قریب درہ کٹ گلہ عبور کرے اور پھر سوات پہنچ جائے۔ لیکن اس کے اپنے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے یہ ارادہ پورا نہیں کیا اس کی بجائے اس کی فوج جنوب کی طرف مڑ گئی اور امبار ہوتی ہوئی دوبارہ ضلع پشاور میں داخل ہوگئی اور تخت‌بھائی کے قریب سے ہوتی ہوئی پہلے کاٹلنگ اور وہاں سے شہباز گڑھ کے قریب مقام کے چشمہ پر پہنچ گئی۔ اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اپنا منصوبہ ملک شاہ منصور یوسف زئی کے ساتھ اپنی بات چیت کی وجہ سے بدلا تھا اس بات چیت کے نتیجہ میں بابر نے ملک کی لڑکی سے شادی کرلی۔ لڑکی کا نام بی بی مبارکہ تھا۔

بابر کے اپنے بیان کے مطابق اس یوسف زئی لڑکی کے ساتھ اس کی شادی سیاسی نوعیت کی تھی۔ وہ لکھتا ہے ''ملک سلیمان شاہ کا بیٹا شاہ منصور میری اطاعت قبول کرنے اور میرا وفادار رہنے کے ارادے سے یوسف زئی

افغانوں کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے یوسف زئیوں کو مٹھی میں لینے کے ارادے سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا،، اس کہانی میں اس حقیقت کی وجہ سے اور رنگ آمیزی ہوگئی ہے کہ مبارکہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی (بابر کا بیٹا ہمایوں دوسری بیوی کے بطن سے تھا) اور وہ اکبر کے عہد حکومت تک زندہ رہی لیکن اس کی کوئی خاص عزت نہیں تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ پورے بابر نامہ میں بابر نے اس عورت کے متعلق جو اس کی شریک حیات تھی جذبۂ احترام کے سوا اور کسی جذبہ کا اظہار نہیں کیا اپنی پہلی بیوی عائشہ سلطانہ کے متعلق جس سے اس نے سترہ سال کی عمر میں شادی کی تھی وہ لکھتا ہے کہ وہ شرم کی وجہ سے اپنی بیوی کے پاس نہیں جاتا تھا۔ پھر وہ بڑے پر لطف انداز میں بتاتا ہے کہ جب وہ زنانہ میں اتنی بار نہیں جاتا تھا کہ جتنی بار اس کی والدہ مناسب سمجھتی تھی تو اس کی والدہ آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ اپنی ایک اور بیوی معصومہ کے متعلق بابر لکھتا ہے کہ اسے مجھ سے بڑی محبت تھی لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ اسے بھی اپنی اس بیوی سے محبت تھی یا نہیں۔

لیکن بابر ایسا آدمی نہیں تھا جو ذاتی فائدہ کا غلام ہو۔ اس نے مبارکہ کے والد کا بار بار تذکرہ کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لڑکی اس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ اس سے واقعات کچھ اور ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ عام طور پر تمام افغان اور خاص طور پر یوسف زئی اپنی بیٹیوں کی شادی قبیلہ سے باہر نہیں کرتے۔ ایک شخص اس قبیلہ کے سینکڑوں افراد سے دوستی بڑھا سکتا ہے لیکن سالہا سال تک وہ اپنے کسی دوست کی بہن یا بیٹی سے بات کرنا تو درکنار اس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ بابر اور مبارکہ کی شادی کی وقعت بڑھانے کے لئے یوسف زئیوں کے حجروں میں ایک رومانی قصہ مشہور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح بابر جو قلندر کا لباس پہنے ہوئے تھا مورہ درہ کی چوٹی کے قریب ایک چشمہ کے کنارے مبارکہ سے ملا۔ یہ قصہ وہی پہلی نظر میں محبت کا شکار ہونے کی کہانی ہے جس کے لئے پہاڑیوں پھولوں درختوں اور آب رواں کا پس منظر مہیا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ دوشیزہ کی منت سماجت کی وجہ سے شہزادہ اور قبائلی سرداروں میں ملاپ ہو گیا۔ واقعات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بابر کو افغانوں کے متعلق اتنی زیادہ معلومات مبارکہ کے ذریعہ حاصل ہوئیں اور

یہ شاید مبارکہ کے یوسف زئی قبیلہ کا اثر تھا کہ بابر نے ان تمام قبائل کو افغان اور ان کی زبان کو افغانی قرار دے دیا۔ سرحدی قبائل اور ان کے علاقوں کے متعلق بابر کی اتنی وسیع معلومات میں کچھ نہ کچھ اس کی بیوی کا بھی دخل ہو گا۔

یہاں یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ بابر اپنے عنفوان شباب میں ایک لڑکے پر مائل تھا۔ اس کا منظور نظر بابری نام کا ایک نوجوان تھا۔ بابر بڑے جذباتی انداز میں دونوں ناموں کی مماثلت بیان کرتا ہے۔ اس معاملہ میں وہ وسطی ایشیا کے ان دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح تھا جنھوں نے قرآن مجید میں قوم لوط کے متعلق متعدد تنبیہات کے باوجود ایسے جذبات کی پرورش کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے جذبات محض شہوانی نہیں تھے بلکہ یہ رفاقت کا ایک نازک رشتہ ہوتا تھا اور ایسے سماج میں پرورش پاتا تھا جہاں عورت کو چار دیواری میں قید رکھا جاتا ہے۔ بابر نے اس سلسلہ میں جو انکشافات کئے ہیں ان میں کوئی گھناؤنی یا ذلت آمیز بات شامل نہیں ہے۔ دوسرے گناہوں کی طرح یہ جذبہ بھی اس کے جسم اور روح کو بے چین رکھتا ہے۔ اس نے اپنی کیفیت اپنے الفاظ میں خوب بیان کی ہے ''میں ننگے سر اور ننگے پاؤں گلیوں سڑکوں باغوں اور خیابانوں میں گھومتا پھرا کرتا تھا (۱)۔ اور دوستوں اور اجنبیوں کو سلام تک کرنا بھول جاتا تھا۔ کبھی کبھی میں دیوانوں کی طرح تنہا پہاڑوں پر اور صحرا میں گھومنے نکل جاتا تھا۔ کبھی میں شہر میں گلی گلی ایک ایسے مکان یا باغ کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا جہاں مجھے سکون مل سکے۔ نہ میں بیٹھ سکتا تھا نہ چل سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا نہ پھر سکتا تھا،،

یہ ماجرا پٹھانوں اور افغانوں پر بھی عام طور پر عنفوان شباب میں گزرتا ہے۔ داؤد اور یوناثان کی محبت کی طرح یہ ضروری نہیں کہ یہ محبت ہمیشہ گھناؤنی شکل اختیار کرے۔ شیوخ اور محتسب جن میں سے اکثر خود بھی اس معصیت میں مبتلا رہے ہیں اس کے خلاف ہمیشہ لعنت ملامت کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض حالات میں

---

(۱) پٹھانوں اور اس علاقہ کے دوسرے باشندوں میں عشاق کی حرماں نصیبی کی یہی علامتیں سمجھی جاتی ہیں۔

امرد پرستی نے لطیف اور پاک جذبات کی اعلیٰ ترین شکل اختار کرلی ہے۔

بی بی مبارکہ جس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ بابر اس سے محبت کرتا تھا یا نہیں باجوڑ کے قلعہ میں رہ گئی اور بابر سمہ کو لوٹنے کے ارادہ سے غالباً امبار کے راستے درے عبور کرتا ہوا وادی پشاور میں داخل ہوا۔ وہ اس موقع پر میدان میں رہنے والے یوسف زئیوں مندڑ اور اشت نگر کے محمد زئیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ پھر وہ کاٹلنگ کے راستے وادی مقام پہنچا۔ مقام ایک چھوٹا سا چشمہ ہے جو سدم سے نکلتا ہے اور شہباز گڑھ کے قریب سے ہوتا ہوا، جہاں اشوک کی لاٹ کھڑی ہے مردان سے آگے کلپانی سے جا ملتا ہے اور نوشہرہ کے قریب لنڈے میں آ گرتا ہے۔ بابر آگے چل کر لکھتا ہے ''مقام کی پہاڑی اچانک ختم ہوتے ہی ایک چھوٹا سا ٹیلہ آتا ہے جہاں سے پورا سمہ نظر آتا ہے۔ یہ جگہ بڑی خوبصورت ہے اور جہاں تک نظر کام کرتی ہے بڑا حسین منظر نظر آتا ہے۔ ٹیلہ پر شہباز قلندر کی قبر تھی۔ میں یہ قبر دیکھنے گیا اور مجھے یہ بات غیر موزون معلوم ہوئی کہ ایسے دلکش اور پر فضا مقام پر ایک کافر کی قبر ہو۔ میں نے حکم دیا کہ قبر مسمار کردی جائے۔ یہ فروری کا واقعہ ہے۔ آب و ہوا اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ جگہ بہت اچھی تھی لہذا میں نے معجون (۱) استعمال کی اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا،،۔

مقام کی پہاڑی، شہباز گڑھ سے اوپر دو ٹیلوں میں سے ایک ٹیلہ ہوگا غالباً یہ وہ ٹیلہ ہوگا جو چشمہ سے ذرا اوپر شمال میں واقع ہے۔ دوسرے ٹیلہ پر اشوک کی لاٹ کھڑی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ شہباز (۲) کون تھا۔ لیکن بابر نے اسے کافر قرار دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہباز کا تعلق اشوک اور بودھوں کے زمانہ سے ہوگا۔ اس کے علاوہ ان دونوں ٹیلوں کے درمیان کا درہ جس پر سے آج کل صوابی جانے والی سڑک گزرتی ہے اب بھی کافر درہ کہلاتا ہے اور پاس ہی ایک گاؤں کا نام بودھ سرائے یا بودھ کی قیام گاہ ہے۔

(۱) ایک دارو جس میں بھنگ بھی شامل ہوتی ہے۔

(۲) ریورٹی کا کہنا ہے کہ وہ مشہور بدعتی تھا جو خراسان سے آیا تھا لیکن اس سے مطلب حل نہیں ہوتا۔

بابر اس سیر و سیاحت کے بعد گینڈوں کے شکار کے لئے صوابی کے قریب پہنچا۔ کتاب میں یہ نام غلطی سے صواتی لکھا ہے۔ یہ مقام رزڑ میں سرکنڈوں کا جنگل ہوگا جس کا بیشتر حصہ صاف کردیا گیا ہے اور جو یار حسین کے جنوب میں واقع ہے. یا دریائے سندھ کی طرف ٹوپی کی پہاڑیوں کے نیچے جھاڑی دار جنگل ہوگا۔ وہاں سے وہ ھنڈ کے قریب پرانے گھاٹ پر دریائے سندھ عبور کرنے گیا۔ یہ واحد جگہ ہے جہاں سے دریا پار کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی سردیوں میں جب دریا پایاب ہوتا ہے۔ گھوڑے اور اونٹ دریا میں گھس کر پار ہوگئے اور پیدل فوج اور بھاری سامان کے لئے بیڑے استعمال کئے گئے۔

بابر تقریباً ایک مہینہ سندھ کے پار رہا اور اس موقع پر وہ جہلم سے آگے نہیں گیا۔ چند میل اٹک سے آگے سندھ اور کابل کے سنگھم سے نیچے کی طرف کشتیوں کے ذریعہ دریا پھر عبور کر لیا۔ اس زمانہ میں اٹک کا قلعہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔ یہ مارچ کا آخر تھا پشاور کے راستے میں باغوں اور گلزاروں کی خوبصورتی دیکھ کر بابر پر کیف طاری ہوگیا ”میں پھولوں کی کیاریوں کو جی بھر کر دیکھنے کے ارادے سے کیمپ کے قریب ایک ٹیلہ پر بیٹھ گیا ایک طرف پیلے اور دوسری طرف گلابی پھول شش پہلو کیاریوں میں کھلے ہوئے تھے جہاں تک نظر کام کرتی تھی اسی طرح کی پھولوں کی کیاریاں نظر آتی تھیں موسم بہار میں پشاور کے قرب و جوار میں پھول بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں“۔

یہ خوبصورتی آج بھی قائم ہے اور پوست کی کاشت کا لائسنس مل جانے کی وجہ سے اس خوبصورتی میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف رنگا رنگ لالے کے بڑے بڑے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔

چند روز بعد بابر کابل واپس پہنچ گیا اور دوسری مہم ختم ہوگئی۔ اس نے اس موقع پر شاہ منصور اور دوسرے یوسف زئی سرداروں کو جو اس کے ساتھ گئے تھے اعزازی خلعت دئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے یوسف زئیوں کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اور یقیناً مبارکہ کا باپ تو خلعت کا حقدار ہی تھا۔

بعد میں اسی سال یعنی ۱۵۰۹ء کے موسم خزاں میں بابر تیسری مہم پر درۂ خیبر کے راستے وادی پشاور میں داخل ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بی بی مبارکہ کے باوجود سوات کے یوسف زئی اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے اور بابر نے اپنی اس مہم کا خاص مقصد ان قبائل کو قابو میں لانا بتایا ہے۔ لیکن وہ اس مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔

جیسا کہ الفنسٹن نے کہا ہے بابر اس قبیلہ کو رام نہیں کر سکا کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ اپنے علاقہ کی پہاڑیوں میں جا چھپتے تھے۔ دلہ زاک قبائل نے بابر کو مشورہ دیا کہ وہ ہشت نگر میں بسنے والے قبائل پر حملہ کرے کیونکہ اس علاقہ پر حملہ نسبتاً آسان ہے۔ اس حملہ میں جو مال غنیمت ملے اسے شاہراہ کی حفاظت کے لئے پشاور اور ہشت نگر میں قلعہ بندی پر صرف کیا جائے۔ ہشت نگر پر حملہ کا نتیجہ مایوس کن ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں سوات میں نہریں نہیں تھیں۔ راستہ میں بابر نے ایک بار پھر افریدیوں کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ غالباً پہلا اور آخری موقع تھا کہ ان مشہور لٹیروں کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لئے علی مسجد تک پیش قدمی کی گئی لیکن یہ منصوبہ بھی ناکام ہوگیا کیونکہ بنگش کی طرح بدخشان سے بھی بری خبر آئی اور بابر کو واپس کابل جانا پڑا۔ اس نے راستہ میں خضر خیل پر چڑھائی کی یہ قبیلہ غالباً شنواریوں کی شاخ تھا اور بہت سرکش تھا۔ بابر نے وزیر قبائل سے بھی بطور خراج بھیڑیں وصول کیں۔ اس مہم کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ درۂ خیبر سے ہندوستان جانے والے راستہ پر افریدیوں، شنواریوں اور پشاور کے قبائل کے دلوں میں بابر کی دھاک بیٹھ گئی۔

چوتھی مہم ایک سال بعد ۱۵۲۰ء میں پیش آئی لیکن اس مدت کے متعلق بھی بابر نامہ میں کوئی تفصیل درج نہیں ہے اس لئے ہمیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔ بابر پیش قدمی کرتا ہوا سیالکوٹ تک پہنچ گیا۔ اس عرصہ میں اس نے ان لوگوں کو سزائیں دیں جو پہلے اس کے وفادار بن گئے تھے لیکن جنہوں نے بعد میں اس کے مقرر کردہ حاکموں کو اپنے علاقے سے نکال دیا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مہم میں اس نے کون سا راستہ اختیار کیا اور سرحدی قبائل کے ساتھ کس طرح پیش آیا وہ قندھار کے متعلق بری خبر سن کر ایک بار پھر واپسی پر مجبور ہوگیا۔

آخرکار اس نے قندھار بھی ۱۵۲۲ء میں فتح کرلیا۔

ہندوستان پر حملہ کی تیاری کے لئے وہ ۱۵۲۴ء میں پانچویں اور آخری مہم میں لاہور فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا اور سر ہند تک پہنچ گیا۔ وہ راستہ میں حسن ابدال کے قریب جنوبی هزاره (۱) کے پہاڑی علاقہ میں پنجابی قبائل سے نپٹتا رہا اور افغان قبائل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ کارروائیاں دھلی کی لودی سلطنت کے ھمدردوں کے خلاف تھیں اس لئے یہ ھمارے قصه کے دائرہ میں نہیں آتیں۔ اسے لاهور پر قبضہ کرنے کے لئے ایک بہت بڑی فوج سے مقابلہ کرنا پڑا جس کی قیادت لودی سلطنت کے افغان امیروں کے ھاتھ میں تھی۔ دوسری طرف اسے پنجاب میں لودی سلطنت کے مقرر کردہ حاکم دولت خان کی مدد حاصل تھی جو بعد میں بےکار ثابت ہوئی۔ دولت خان اور اس کے بیٹوں غازی اور دلاور نے سوچا تھا کہ ابراھیم کی غلامی میں رھنے کی بجائے جو اپنے باپ سکندر کی وفات کے بعد ۱۵۰۷ء میں دھلی کی لودی سلطنت کا وارث بنا تھا حملہ آور کا ساتھ دینے میں بچت کی صورت زیادہ ہے۔ ابراھیم بڑا بدمزاج تھا اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنے ان افغان سرداروں کے ساتھ جنھوں نے اس کے خاندان کو تخت دلایا تھا تکبر کے ساتھ پیش آتا تھا۔ چنانچہ ایک ایک کر کے وہ تمام سردار جن پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا اس سے بچھڑ گئے۔ لیکن دولت خان جو بظاہر اپنے بادشاہ کے خلاف بابر کی مدد کر رہا تھا درحقیقت پنجاب میں اپنی خودمختار سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ آخر بڑے انقلابات کے بعد جن کے دوران میں وہ بابر کے ھاتھوں ذلت کے ساتھ گرفتار اور قید ھوا مشرقی پنجاب کی پہاڑیوں میں پناہ لینے میں کامیاب ھو گیا۔ بابر نے ابراھیم لودی کے بھائی علاوالدین کو اپنے ساتھ ملانے کے کوشش کی لیکن پنجاب میں علاوالدین کی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ دھلی پر چڑھائی کر سکتا۔ آخر بابر لاھور واپس آ گیا اور وھاں سے لوٹ کر کابل چلا گیا۔

آخرکار اگلے سال ۱۵۲۵ء میں اس نے وہ آخری مہم شروع کی جس کے نتیجہ میں اپریل ۱۵۲۶ء میں ابراھیم لودی پانی پت کے میدان میں شکست کھا کر مارا گیا اور مغلیہ سلطنت کا آغاز ھوا۔ اس تاریخی مہم

---

(۱) هزاره جات نہیں بلکہ ضلع هزاره مراد ہے۔

میں صرف دو واقعات ایسے پیش آئے جن کا صوبہ سرحد سے تعلق ہے۔ ایک تو بابر نے علی مسجد کے قریب کچھ وقت تفریح میں گزارا اور دوسرے پشاور کے قریب غالباً زخی میں نرکل کے جنگل میں گینڈے کا شکار کھیلا یہ جنگل میرے زمانہ میں ڈاکوؤں کا مسکن تھا۔ بابر کا یہ شکار صوابی میں شکار سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ بابر لکھتا ہے ''علی مسجد میں خیمہ گاہ مختصر سی تھی میں نے اپنا خیمہ ایک اونچی جگہ نصب کرایا جہاں سے مجھے نیچے کی طرف کیمپ میں جلتی ہوئی آگ نظر آتی تھی جو بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب کبھی یہاں پڑاؤ ڈالتا تھا تو شراب ضرور پیتا تھا،، اس نے شکار کے دوران یہ دیکھنے کے لئے کہ ہاتھی اور گینڈا ایک دوسرے کے مقابلہ پر کیا کرتے ہیں۔ ایک ہاتھی کو گینڈے سے بھڑا دیا۔ گینڈا مقابلہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور بابر نے اسے نیک فال سمجھا۔ افغان تماشائیوں کو بھی اس لڑائی میں لطف آیا ہوگا۔

ان تمام مہمات میں بابر کی فوج کو یوسف زئیوں اور ان دوسرے قبائل سے مہیا کئے ہوئے سپاہیوں سے بڑی تقویت ملی جن سے اسے پشاور کے آس پاس واسطہ پڑا۔ ایک مثال واضح طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ قصوریہ پٹھان جو لاہور کے جنوب میں دریائے ستلج کے دونوں کناروں پر آباد ہیں محمد زئیوں کی خویشگی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ پشاور سے بابر کی فوج کے ساتھ آئے تھے اور بابر کی خدمت کے صلہ میں انھیں وسطی پنجاب میں جاگیریں عطا کی گئیں۔ خویشگی جیسا کہ باب اول میں دوسرے گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے ہشت نگر کے محمد زئیوں کے قرابت دار ہیں اور چارسدہ اور نوشہرہ کے درمیان دریائے کابل کے شمال میں ان کے نام پر ایک مشہور گاؤں آباد ہے۔

پٹھان بابر پر اپنا جو احسان جتاتے ہیں وہ خوشحال خان کے ایک شعر سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ وہ دھلی پر حکومت کرنے والے بادشاہوں کے نام گنواتے ہوئے لکھتا ہے :-

بیا له پاسه د ډیلی بادشاه بابر شو ـ چه ئے کار د پښتنو په برکت وو

اس کے بعد بابر دھلی کا بادشاہ بنا ـ جو پٹھانوں کی مدد سے اس مرتبہ پر پہنچا

بابر نے یقیناً اس علاقہ کی تاریکی دور کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پوری افغان سرحد کو ایک واضح شکل بخشی ہے۔ اس کے بعد تین سو سال تک جبکہ برطانوی دور کا آغاز ہوا ہمیں کسی تحریر میں سوات سے داماں تک بسنے والے قبائل کی اتنی مفصل اور ہمہ گیر فہرست نہیں ملتی۔ بابر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کابل اور سندھ کے درمیانی علاقہ کو قابو میں رکھنے کے لئے یوسف زئی اور بنگش قبائل کو (بنگش قبیلہ کا نہیں بلکہ علاقہ کا نام ہے لیکن اس علاقہ میں رہنے والے قبائل آج بھی بنگش ہی کہلاتے ہیں) بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ اس عرصہ میں قندھار فتح کرنے کی بھی برابر کوشش کرتا رہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اسے قبائل کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کی تحریر کا ابدالیوں کے تذکرہ سے خالی ہونا بڑا تعجب انگیز ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ بابر کے زمانہ میں خانہ بدوش اور آباد غلجی قبائل قریب قریب اس علاقہ میں زندگی بسر کر رہے تھے جہاں وہ آج کل رہتے ہیں۔ یعنی داماں میں۔ اور غزنی کٹاواز کے علاقہ میں، لیکن اس زمانہ میں ابدالی کہاں تھے؟ کم از کم وہ اتنے طاقتور نہیں تھے کہ بابر کے ھندوستان فتح کرنے کے منصوبہ میں رکاوٹ بن سکیں۔

تین قبیلے ایسے ہیں جن کا بابر نے تذکرہ کیا ہے لیکن جو آج کل ان علاقوں میں نہیں ہیں جہاں اس زمانہ میں تھے۔ یہ قبیلے دلہ زاک گگیانی اور مہمند ہیں۔ بظاہر اس زمانہ میں دلہ زاک ہشت نگر کے علاقہ میں اور غالباً دوآبہ میں جہاں اب محمدزئی اور گگیانی آباد ہیں پاؤں جمائے ہوئے تھے۔ اب وہ قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں اور پشاور کے آس پاس نووارد قبائل کی تہہ میں دب گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گگیانی پشاور کے آس پاس آباد تھے جہاں اب پشاوری مہمند اور خلیل آباد ہیں۔ اب گگیانی دوآبہ میں آباد ہیں۔ بابر کو مہمند قبائل سے اس علاقہ میں واسطہ پڑا تھا جو غزنی کے جنوب مغرب میں مکڑ کے قریب اب غلجیوں کا علاقہ ہے۔ اس زمانہ میں مہمند پشاور نہیں آئے تھے۔ یہ ساری باتیں قبائلی روایات کے مطابق ہیں۔ بابر نے مہمندوں کے سوا دوسرے غوریہ خیل قبائل یعنی خلیل اور داؤد زئیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس بات سے بھی قبائل کی اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ غوریہ خیل بابر کے زمانہ تک وادی پشاور میں نہیں آئے تھے۔ لیکن بابر کی تحریر سے

جس سب سے بڑی بات کا ثبوت ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اتنے بہت سے قبیلے اس زمانہ میں بھی اسی علاقہ میں رہ رہے تھے جہاں وہ آج کل رہ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ قبائلی روایات میں قبائل کے نقل مکانی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ ان روایات کے مطابق بعض قبائل نے پانچ پانچ سو میل کا سفر طے کیا۔ پھر پرانے قبائل اور نو واردوں میں تنازع للبقا شروع ہوگیا اور جو قبیلہ ہار گیا اس کا یا تو صفایا کر دیا گیا یا علاقہ سے نکال دیا گیا یا رعیت بنا لیا گیا۔ میں نے اپنے زمانہ میں سمہ کے شمال میں اس علاقہ میں جو ''میرا'' کہلاتا ہے اور جو یوسف‌زئی محمد زئی علاقہ ہے ایک پشت کے دوران ایک قبیلہ کو پر امن طریقہ سے دوسرے قبیلہ کی جگہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس علاقہ کو ۱۹۱۰ء میں سیراب کیا گیا جس کے بعد پہاڑیوں میں بسنے والے مہمندوں اور اتمان خیلیوں نے ہزاروں کی تعداد میں اس علاقہ پر یورش کردی۔ وہ پہلے تو کھیت مزدوروں کی حیثیت سے آئے پھر انہوں نے یوسف زئی اور محمد زئی زمینداروں سے زمینیں پٹہ پر لے لیں۔ رفتہ رفتہ جب وہ دولت مند ہوگئے اور ان کا کام اچھا چلنے لگا تو انہوں نے زمین رھن پر لی اور پھر اس کے مالکانہ حقوق خرید لئے۔ یہ لوگ زمین کے اصل مالکوں کے مقابلہ میں کھیتی باڑی اچھی جانتے تھے اور ان کی رگوں میں تازہ خون تھا لہذا وہ پرانے آبادکاروں کی جگہ لے رہے ہیں اور بہت سے مقامات پر انہوں نے یہ جگہ لے بھی لی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیشتر ''میرا'' علاقہ اب مہمند قبیلہ کا حصہ بن چکا ہے۔ میرا خیال ہے ایک قبیلہ کے ہاتھوں دوسرے قبیلہ کے قتل عام یا اسے علاقہ بدر کرنے کی بجائے ماضی میں دوسرے علاقوں میں بھی اس طرح ایک قبیلہ نے دوسرے کی جگہ لی ہو گی۔ اس میل ملاپ کے زمانہ میں مختلف خاندانوں میں خونی رشتے قائم ہو گئے ہوں گے اور قبائلی امتیاز بھی واضح نہ رہا ہو گا۔

یہ صورت حال زرخیز میدانی علاقہ میں پیش آئی ہو گی۔ جہاں تک پہاڑی علاقوں کا تعلق ہے میرے خیال میں بیشتر قبائل جو آج کل ان علاقوں میں آباد ہیں تاریخ کے آغاز سے پہلے سے رہتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے کئی قبیلوں کے نام اسلام سے کئی صدی پہلے سے مشہور چلے آرہے ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ وہ تمام قبیلے جن کے متعلق

ترک وطن کی روایت مشہور ہے مشرقی افغان قبیلے یعنی کرشبون خاندان کے سڑبنی قبیلے غوریہ خیل اور خخے خیل ہیں۔ یہ روایات کرلانی قبیلوں مثلاً افریدیوں اورک زئیوں بنگش خٹک اور وزیریوں میں نہیں پائی جاتیں۔ ان قبیلوں کی نقل مکانی بہت بعد میں اس دور میں پیش آئی جس کی تاریخ دستیاب ہے۔

بابر کے بیان سے بھی اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ دلہ زاک اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اس قبیلہ کے متعلق مشہور ہے کہ یہ کرلانی قبیلہ تھا جو ناپید ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ دلہ زاک افغان ہی نہیں تھے لیکن بابر اس خیال کی تائید نہیں کرتا۔ جن مقامات کا تذکرہ ملتا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ غوریہ خیل قبیلوں یعنی خلیل مہمند اور داؤد زئیوں میں جو آج کل پشاور کے آس پاس آباد ہیں ضم ہو گیا ہو گا۔

بہ الفاظ دیگر بابر کی فراہم کی ہوئی شہادت پر وسیع معنی میں غور کیا جائے تو یہ شہادت پٹھانوں اور افغانوں کی اصل کے متعلق ان خیالات سے مختلف نہیں ہے جو اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں ظاہر کئے گئے ہیں۔

فصل دوازدهم

پشاوری قبائل

محمود غزنوی کے دور حکومت اور سرحدی علاقہ میں بابر کی آمد کے درمیانی زمانہ میں کسی وقت وہی افغان جنہیں البیرونی نے سرکش اور وحشی نسلوں کے لقب سے یاد کیا ہے اور جو البیرونی کے زمانہ میں بھی کابل کی طرف ہندوستان کے انتہائی سرحدی علاقہ پر قابض تھے یوسف زئی اور ان دوسرے قبائلی ناموں سے پہچانے جانے لگے جو آج بھی معروف ہیں۔ پانچ سو سال کے اسی عرصہ میں البیرونی کے بتائے ہوئے قندھار کے مقابلہ پر جس سے اس کی مراد گندھارا یا وادی پشاور تھی پانچ سو میل کے فاصلہ پر ایک اور قندھار آباد ہوگیا جو جدید افغانستان کا جنوبی شہر ہے۔ گندھارا اور پنجاب میں ہندو اقتدار کو زیر و زبر کرنے کے لئے محمود غزنوی کی آمد اور ہندوستان تک پہنچنے کے لئے راستہ ہموار کرنے کی غرض سے بابر کی آمد کے درمیانی زمانہ ۱۰۰۱ء تا ۱۵۰۵ء کی یہ پانچ صدیاں دورِ اسلامی کی صدیاں ہیں اور ہجری سن کے اعتبار سے پانچویں چھٹی ساتویں آٹھویں اور نویں صدیاں ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں کسی ذریعہ سے حتیٰ کہ مسلمانوں کی تصانیف سے بھی ہمیں سرحدی قبائل پر اثر انداز ہونے والے واقعات کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ غزنوی اور غوری حکمران ہندوستان جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے متعدد بار سرحدی دروں سے گزرے۔ ان کے جلومیں غیر معروف افغان اور غلجی قبائل کی فوجیں تھیں۔ جنوبی علاقہ یعنی کوہ سلیمان کے غلجیوں اور لودیوں نے دھلی میں افغان حکمران خاندانوں کی بنیاد ڈالی۔ خوارزم شاہ چنگیز خان اور تیمور لنگ یکے بعد دیگرے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے ان پہاڑوں سے گزرنے والی شاہراہوں پر قابض رہے لیکن سرحدی قبائل

کے متعلق ہمیں کہیں ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ تا وقتیکہ بابر اس علاقہ میں نہیں پہنچا۔ اس کے بعد اچانک خد و خال نمایاں ہونے لگے۔ گویا یونانی دیوتا زئیس (ZEUS) کے سر سے علم و دانش کی دیوی پیدا ہو گئی۔

مسلمانوں کے لکھے ہوئے وقائع جن کی بنیاد بدیہی طور پر ہم عصر پشتو تحریریں ہیں تاریخ کے اسی دور کے متعلق ہیں۔ بد قسمتی سے ان وقائع میں اس سے پہلے کی تاریخ مفقود ہے۔ ایسی کئی کتابیں موجود ہیں جنہیں یوسف زئیوں اور ان کے قرابت داروں کی تاریخ قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور کتاب تاریخ حافظ رحمت خانی ہے جس کا حوالہ ماؤنٹ اسٹوارٹ الفنسٹن اور ان کے ہم عصر روسی پروفیسر برنہارڈ ڈارن نے بھی دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۸۴ ہجری (۱۷۷۰ء) میں فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور ریورٹی کے دعوے کے مطابق اس کی بنیاد یوسف زئی سرداروں شیخ ملی اور خان کجو کی وہ پرانی پشتو نثر کی تحریریں ہیں جو اب نایاب ہیں۔ شیخ ملی اور خان کجو سولھویں صدی کے نصف اول میں گزرے ہیں اور آگے چل کر مناسب مقام پر ان کا تذکرہ کیا جائے گا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ شیخ ملی اور خان کجو نے جو بابر اور ہمایوں کے ہم عصر تھے یہ کتابیں لکھی بھی تھیں یا نہیں۔ بالفرض اگر ان بزرگوں نے کچھ لکھا بھی تھا تب بھی یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب تک بابر منظر عام پر نہیں آیا اور اس نے قبائل کی تاریخ نویسی کی ابتدا نہیں کی پشاوری قبائل کے متعلق خود ان قبائل میں سے کسی کی لکھی ہوئی کوئی تحریر دستیاب نہیں تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل اعظم کی آمد سے قبائلی وقائع نگاروں میں خودی کا احساس بیدار ہوا۔

ان تمام وقائع کا نقطۂ آغاز قریب قریب ایک ہی زمانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یوسف زئی جو خخی قبائل کی اہم شاخ تھے قندھار کے پاس سے چل کر کابل کے راستے وادی پشاور میں وارد ہوئے۔ روایات کے مطابق ان کے حریف خلیل اور مہمند جو غوریہ خیل قبائل میں سے ہیں قریب قریب اسی علاقہ یعنی قندھار کے شمال سے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قندھار کے قریب نوشکی، مکڑ اور گڑھا کے رہنے والے تھے۔ ریورٹی کا کہنا ہے کہ یہ وہ نوشکی نہیں ہے جو بلوچستان میں قلات کے قریب ایک قصبہ ہے بلکہ یہ وہ جگہ ہے جو اب مشکی کہلاتی

ہے اور غزنی سے کوئی تیس میل جنوب میں واقع ہے۔ حقیقت خواہ کچھ هو لیکن یوسف زئیوں کی روایت کے مطابق وہ چودھویں صدی (آٹھویں صدی ہجری) کے آغاز تک قندھار کے علاقہ میں آباد تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ خخے اور غوریہ خیل قبائل جو اب پرانے گندھارا (قندھار) میں آباد ہیں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے قندھار سے آئے ہیں جو بعد میں آباد ہوا تھا۔ موجودہ افغانستان کا جنوبی صوبہ اور شہر قندھار کے نام سے کس طرح مشہور ہوا؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گیارھویں صدی میں محمود غزنوی کے دور کے مصنف البیرونی نے جس علاقہ کو قندھار کے نام سے پکارا ہے وہ گندھارا یعنی وادی پشاور ہے۔ قندھار شہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مسلمانوں کی تحریروں یا کہیں اور سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ قندھار نام کا کوئی شہر اس زمانہ میں آباد تھا اور اگر تھا تو اس شہر کو کافی اهمیت حاصل تھی۔ بیلیو کا خیال ہے کہ قندھار شہر کی بنیاد گندھارا کے تارکان وطن نے رکھی تھی جو کسی بیرونی حملے سے پناہ لینے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان پناہ گزینوں نے جنھیں ھیروڈوٹس نے گندھاریوئے کے نام سے پکارا ہے اس شہر کو اپنا نام دے دیا۔ یہ لوگ جن حملہ آوروں کے ڈر سے بھاگے تھے بیلیو انہیں ستّھی (SCYTHIC) قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یہ ترک وطن پانچویں یا ابتدائی چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حملہ سفید ہُنوں کا تھا۔ وہ ان ستھیوں کو جاٹوں اور گوجروں کے اجداد بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان نوواردوں نے نہ صرف اپنی نئی بستی کا نام گندھارا رکھا بلکہ انہوں نے دس صدیوں کے بعد ایک طاقتور جماعت کو اپنے وطن واپس بھیجا۔ جو لوگ وطن واپس آئے وہ جلاوطنی کے زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور اپنا اصل وطن بھول چکے تھے۔ بیلیو کا خیال ہے کہ نئے قندھار سے واپس آنے والے خخے اور غوریہ خیل قبائل ان لوگوں کے ساتھ جو اس وقت وادی پشاور اور آس پاس کے علاقہ میں آباد تھے جس آسانی کے ساتھ گھل مل گئے اس سے ان کے اپنے نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

بیلیو نے جن قیاس آرائیوں کو حقیقی واقعات بنا کر پیش کیا ہے

انہیں مسلمہ تاریخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی دستاویز سکہ یا کتبہ سے اس قیاس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ پہلے زمانہ میں قبائل گندھارا سے نقل وطن کر کے موجودہ قندھار کے علاقہ میں آئے تھے۔ اس قیاس کی واحد بنیاد یہ ہے کہ گندھارا کو عرب مورخوں نے قندھار لکھا ہے۔ البتہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ بیلیو نے ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس پر مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔ انسائیکلو پیڈیا میں قندھار پر جو مضمون درج ہے اس پرانے مفروضہ کو بالکل رد کر دیا گیا ہے کہ اس شہر کی بنیاد سکندر اعظم نے رکھی تھی اور یہ شہر اسکندریہ اراکوسیا کہلاتا تھا۔ اس مفروضہ کی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے اور صوتی اعتبار سے بھی یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ اسکندریہ بگڑ کر قندھار بن گیا ہو۔ مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے:-

”دوسری طرف یہ بات قریب قریب ثابت ہوچکی ہے کہ قندھار سے مراد گندھارا یعنی قدیم ہندوستان کا وہ علاقہ مراد ہے جو زیریں دریائے کابل کی وادی پر محیط تھا۔ عرب مورخ گندھارا کو قندھار لکھتے تھے۔ مسعودی اور بیرونی نے جہاں جہاں قندھار کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا موجودہ قندھار شہر سے کوئی تعلق نہیں۔ بیلیو کا یہ نظریہ تسلیم کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ یہ نام گندھارا سے اراکوسیا آنے والے تارکان وطن اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ ترک وطن غالباً پانچویں صدی میں ہوا تھا۔ جب ہفتالیوں نے گندھارا فتح کر لیا تھا۔ جیسا کہ چینی سیاح سنگ یون نے بیان کیا ہے جو ۵۲۰ء میں گندھارا آیا تھا۔ مہاتما بودھ کا بھیک کا پیالہ جو قندھار شہر سے باہر سلطان ویس کی خانقاہ میں رکھا ہوا ہے غالباً ترک وطن کرنے والے بودھ بھکشو اپنے ساتھ لائے تھے“۔

بیلیو نے اس پیالہ کے متعلق جو اس نے ۱۸۷۲ء میں خود دیکھا تھا اور بھی تفصیل لکھی ہے اب یہ پیالہ کابل کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ یہ پیالہ سیاہ رنگ کی ایک لکڑی کا بنا ہوا ہے اور اس کا قطر قریباً سات فٹ ہے۔ بیلیو نے یہ پیالہ موجودہ شہر قندھار سے باہر سلطان ویس کی خانقاہ میں رکھا ہوا دیکھا تھا جو پرانے شہر سے چند سو قدم کے فاصلہ

پر ہے بعد میں نادر شاہ نے اسے تباہ کر دیا۔ اس زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ یہ پیالہ وہ بودھ بھکشو لائے تھے جو عہد اسلام سے پہلے پشاور کے قریب نقل وطن کر کے آئے تھے۔ اب اس پیالہ پر بابر کی طرف سے اس خط نسخ میں جو قریباً ۱۶۰۰ء میں رائج تھا ایک طویل عبارت کندہ کردی گئی ہے۔ ۱۸۷۲ء میں یہ پیالہ ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا۔ اس عہد میں جب قدیم عہد کی یادوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی اس پیالہ کی تاریخ بھی فراموش کردی گئی تھی۔ لیکن قدیم گندھارا بودھ مت کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے اور قندھار میں اس پیالہ کی موجودگی سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں موجودہ قندھار شہر کا وادی پشاور سے ضرور کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہوگا۔

اسلامی دور میں وہ مسلمان مورخ جو سیستان میں زرنج کے مقام پر قائم کئے ہوئے مرکز سے مسلمانوں کی پیش قدمی کے واقعات قلم بند کرتے ہیں قندھار شہر کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے۔ اراکوسیا کا علاقہ جو موجودہ قندھار کے مترادف ہے اور جسے عرب الرخج کہتے تھے پرانے دارالحکومت بست کے آس پاس تھا۔ بست وہی شہر ہے جہاں نویں صدی عیسوی میں صفاریوں کے سکے ڈھلتے تھے۔ غزنوی دور کی تحریروں میں بھی قندھار شہر کا تذکرہ ناپید ہے۔ البیرونی کا قندھار در حقیقت گندھارا ہے۔ جب تک ۱۱۵۰ء میں علاوالدین جہاں سوز نے بست کو تباہ نہیں کر دیا قندھار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ چغتائی چنگیزی دور میں اس شہر کا تذکرہ آتا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ ۱۲۸۱ء میں ہرات کے کرت خاندان میں سے جو منگولوں کا باجگزار تھا ایک حکمران نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس شہر کو تیمور لنگ نے فتح کیا اور اپنے پوتے پیر محمد کو بخش دیا۔ بعد میں یہ شہر ہرات کے حسین بے قرا کی سلطنت کا حصہ بن گیا (۱۵۰۵-۱۴۳۸ء) بیقرا بھی تیموری خاندان کا تھا اور بابر کا رشتہ کا بھائی تھا۔ اس کے دور حکومت میں سب سے پہلے قندھار کا نام سکہ پر درج ہوا۔ اس کی وفات پر یہ شہر تیموری خاندان کے باج گزاروں کے ہاتھ لگ گیا۔ پھر تین فریق اس کے دعویدار بن بیٹھے۔ از بک شیبانی خان (جس نے بابر کو ماوراءالنہر سے نکال دیا تھا) پہلا صفوی شہنشاہ اسماعیل اور بابر۔ ان میں سے ہر ایک قندھار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے بابر نے ۱۵۰۴ء

میں کابل فتح کیا۔ اس کے بعد وہ بیس سال تک ہندوستان پر حملہ کے لئے راستہ ہموار کرنے اور اس راستہ پر مورچے مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ وہ قندھار پر قبضہ بھی ضروری سمجھتا تھا اور سرحدی علاقہ پر متعدد حملوں کے درمیانی عرصہ میں وہ قندھار فتح کرنے کی بھی جدوجہد کرتا رہا یہاں تک کہ وہ ۱۵۲۲ء میں اس جدوجہد میں کامیاب ہوگیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بابر کابل پر قبضہ اور ہندوستان کی فتح کے درمیان بیس سال تک دونوں قندھاروں یعنی قدیم گندھارا اور اس کے جنوب مغرب میں نئے شہر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ اتنے طویل عرصہ تک ان دونوں علاقوں میں اس کی مصروفیت کا یقینی طور پر خخے خیل اور غوریہ خیل قبائل کے قصہ سے ضرور کوئی تعلق ہے جیسا کہ یہ قبائل خود بیان کرتے ہیں۔

نسب ناموں کے باب میں درج کئے ہوئے دوسرے گوشوارے پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خخے اور غوریہ خیل کون ہیں (۱)۔ اور اپنے آپ کو آپس میں قرابت دار کیوں سمجھتے ہیں۔ اس مرحلہ پر اتنا جاننا کافی ہے کہ خخوں میں اہم قبائل یوسف زئی (شمولیت مندڑ یوسف زئی) اور گگیانی ہیں اور غوریہ خیل میں خلیل اور مہمند قبائل کو اہمیت حاصل ہے۔ محمد زئی ان سب کے قرابت دار ہیں لیکن نسل کے اعتبار سے خخے یا غوریہ نہیں ہیں۔ گوشوارہ میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ آج کل یہ قبائل کس کس علاقہ میں آباد ہیں۔ یہ سب کے سب سڑبنی ہیں۔ اور اس طرح ترین اور ابدالیوں کے رشتہ دار ہیں لیکن الگ شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب کے سب خود کو صحیح النسب افغان سمجھتے ہیں۔ یہ قبائل وادی پشاور میں اور اس کے شمال میں سوات، دیر اور باجوڑ میں آباد ہیں۔ ان میں سے کوئی قبیلہ صحیح معنی میں کرلانی یعنی پہاڑی قبیلہ نہیں ہے۔ ان سب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو کھلے میدانوں یا سوات پنج کوڑہ اور باجوڑ جیسی وسیع وادیوں میں آباد ہیں کچھ یوسف زئی اور کچھ مہمند پہاڑی علاقہ میں بھی رہتے ہیں لیکن یہ

---

(۱) اس کتاب میں قبائل کے مختلف خیل اور گھرانوں کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں۔ یوسف زئیوں کے شجرہ کی تفصیلات (McMAHON) کی کتاب دیر سوات اور باجوڑ کے قبائل میں درج ہیں۔ پرانی ملٹری رپورٹ میں جو اب کمی اور اعتبار سے کار آمد نہیں رہی تمام قبائل کے شجرے پوری تفصیل سے درج ہیں۔

علاقے خاص طور پر زرخیز ہیں یا شاہراہ کے قریب واقع ہیں۔ یہ علاقے تیراہ یا وزیرستان کی طرح نا قابل گزر نہیں ہیں۔

خخے خیل

قبائلی روایت کے مطابق جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے خخے اور غوریہ خیل دونوں مکڑ کے آس پاس کے رہنے والے ہیں یہ دونوں قبیلے دریائے غزنی سے سیراب ہونے والے طاس کے اس حصہ میں جو اب ایستادہ تک پھیلا ہوا ہے اور قندھار کے شمال مشرق میں بالائی وادی ترناک میں رہتے تھے۔ (اب یہ سب غلجیوں کا علاقہ ہے) چودھویں صدی کی ابتدا میں (وقت کا یقین بھی محض قیاسی ہے لیکن الفنسٹن نے اس کا حوالہ دیا ہے) خخے اور غوریہ قبیلوں میں یا اخون درویزہ (۱) کے بیان کے مطابق خخوں اور ترین میں جو درانیوں کے اجداد اور اب قرابت دار ہیں کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام خخوں کو گھر بار چھوڑنا پڑا اور وہ شمال میں کابل کی طرف چل پڑے۔ (اس موقع پر کسی بیان میں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ قبائل اپنے اصل ٹھکانے پر واپس آ رہے تھے یا ابتدا میں وہ پشاور کی طرف سے آئے تھے) اس کے بعد تقریباً ایک صدی کا خلا ہے اور یہ خلا غیر معمولی نہیں ہے۔ پھر ہمیں خخوں کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کابل کے آس پاس آباد ہوگئے اور انہوں نے تیموری خاندان کے مرزا الغ بیگ بن ابو سعید کی حمایت شروع کردی۔ ابو سعید پندرھویں صدی کے وسط میں تیموری شہزادوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ بابر کا دادا تھا۔ اس طرح وہ دہلی کے حکمران مغلیہ خاندان کا مورث اعلیٰ ہے۔ ۱۴۶۹ء میں اس نے دریائے سندھ کے پار کے وہ تمام علاقے جو تیمور لنگ نے فتح کئے تھے یعنی کابل، غزنی اور ان کے باج گزار علاقے اپنے بیٹے الغ بیگ کو بخش دئے۔ الغ بیگ جس نے کابل کو اپنا دارالحکومت بنایا ان علاقوں پر قابض رہا یہاں تک کہ وہ ۱۵۰۱ء میں فوت ہوگیا۔ اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے تین سال بعد اس وراثت پر اس کا بھتیجا بابر قابض ہوگیا۔

---

(۱) اخوند درویزہ جن کی تصنیف مخزن افغانی مروجہ پختو میں سب سے پرانی کتاب ہے۔ وہ اکبر کے ہم عصر (سولھویں صدی کا نصف آخر) تھے اور مقلد ہونے کی حیثیت سے روشنیہ تحریک کے مخالف تھے۔

بہت سے مصنفوں کو اس الغ بیگ پر مشہور و معروف الغ بیگ کا دھوکا ھوا ھے جو ماھر تعمیرات سائنس دان اور ماھر فلکیات تھا۔ وہ شاہ رخ کا بیٹا اور تیمور کا پوتا تھا اس نے سمرقند پر دو سال کے مختصر عرصہ تک حکومت کی پھر اسے ۱۴۴۹ء (۸۵۳ ھجری) میں قتل کر دیا گیا۔ وہ اور بابر کا چچا دونوں تیموری خاندان سے ھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ھیں اور دونوں زمانوں میں دو پشتوں کا فرق ھے۔ ماھر فلکیات الغ بیگ اپنے ھمنام کے دادا کا گہرا دوست اور رشتہ کا بھائی تھا۔ اور اپنے دوست کے بیٹے ابو سعید کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا قصہ مشہور ھے کہ ابو سعید نے ماھر فلکیات الغ بیگ کی یاد میں اپنے بیٹے کا نام بھی الغ بیگ رکھا۔

بہر حال یہ الغ بیگ ثانی ھی تھا جس کی خدمت میں یوسف زئی اور دوسرے خخے قبائل کابل میں حاضر ھوئے۔ قبائلی وقائع میں اس کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی لیکن یہ واقعہ ۱۴۶۹ء اور ۱۵۰۱ء کے درمیانی زمانہ کا ھے جبکہ الغ بیگ ثانی شہر کا حاکم تھا اور ھم قیاساً یہ کہ سکتے ھیں کہ یہ واقعہ قریباً ۱۴۷۰ء کا ھوگا۔ کیونکہ یہ مشہور ھے کہ یوسف زئیوں نے الغ بیگ کو تخت پر بٹھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور پھر ایک دشوار علاقہ پر اس کی حکومت کی حمایت کی۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد الغ بیگ نے ان قبائل کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا کیونکہ وہ تخت پر قابض رھنے کے لئے ان کی مدد کا محتاج تھا لیکن الفنسٹن کے قول کے مطابق یوسف زئیوں کی آزاد روی حاکم اعلیٰ کے ساتھ بے تکلفی کے لئے موزوں نہیں تھی۔ پھر جوں جوں یہ قبائل خوشحال ھوتے گئے ان کی سرکشی میں بھی اضافہ ھوتا گیا۔ انہوں نے الغ بیگ کے اقتدار کو پس پشت ڈال دیا اس کے دیہات لوٹ لئے اور اس کے دارالحکومت میں افرا تفری پھیلا دی۔ اس وقت تک الغ بیگ کی طاقت میں اضافہ ھو چکا تھا۔ کیونکہ بہت سے چغتائی ترک اس کے جھنڈے تلے جمع ھوگئے تھے۔ الغ بیگ نے اپنے وحشی دوستوں سے پیچھا چھڑانے کی ٹھان لی۔ اس نے پہلے تو یوسف زئیوں اور ان کے قرابت دار خخے اور گگیانیوں میں پھوٹ ڈلوائی پھر گگیانی قبیلہ اور اپنی فوج کی مدد سے یوسف زئیوں پر حملہ کر دیا۔ یہ

لڑائی غوڑہ مرغے(۱) کے نام سے مشہور ہے اور اس کے بیان میں میدان جنگ اور کشت و خون کا نقشہ موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لڑائی میں الغ بیگ شکست کھا گیا اور ذلت کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس صلح کی خوشی منانے کے لئے اس نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا جس میں اس نے یوسف زئی قبیلہ کے تمام ملکوں کو بلایا۔ ان کی تعداد سات سو تھی۔

اس مشہور ضیافت سے صرف چھ افراد بچ کر آسکے۔ باقی سب کو تہہ تیغ کردیا گیا۔ قتل عام کے بعد الغ بیگ نے حکم دیا کہ تمام نعشوں کو شہر سے باہر لے جاکر دفن کر دیا جائے۔ یہ نعشیں کابل سے تین خدنگ کے فاصلہ پر شمال مشرق میں سیاہ سنگ پہاڑی کے دامن میں دفن کردی گئیں۔ یہ قبرستان اب بھی شہیداں کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں یوسف زئیوں کی ملی زئی شاخ (دیر) کے شیخ عثمان کا مزار بھی ہے جہاں کچھ عرصہ پہلے تک لوگ زیارت کے لئے جاتے تھے۔ جو لوگ قتل کئے گئے ان میں قبیلہ کا سربرآوردہ ملک اور ملک شاہ منصور کا باپ ملک سلیمان بھی تھا۔ ملک شاہ منصور ھی ہے جس نے بعد میں اپنی بیٹی بابر کے عقد میں دے دی تھی۔ سلیمان کا بھتیجا ملک احمد جو اس وقت کم عمر تھا اور بعد میں یوسف زئیوں کا لیڈر بنا ان چھ خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جو الغ بیگ کی ضیافت سے زندہ بچ کر آگئے تھے۔

قبائلی وقائع میں اس قتل عام کی تاریخ نہیں بتائی گئی لیکن کابل پر الغ بیگ ثانی کی حکومت کے عہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ واقعہ ۱۴۸۰ء اور ۱۴۹۰ء کے درمیان ھوا ھوگا۔ بابر قریب قریب اسی زمانہ میں پیدا ھوا۔ قتل عام کسی افغان کے ایما پر نہیں بلکہ چغتائی ترک کے ایما پر ھوا تھا۔ لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاھئے کہ افغانوں کی روایات بھی اس قسم کے بد نما واقعات سے پاک نہیں ھیں۔ ایک طرف تو مہمان نوازی پر بہت زور دیا جاتا ہے اور دوسری طرف سیاسی حکمت عملی کی خاطر یا ذاتی انتقام لینے کے لئے اس قسم کی تقریبات کو بہانہ بنایا جاتا ہے۔ غلجی میر محمود نے الغ بیگ کی قائم کی ھوئی اس مثال کی تقلید کرتے

---

(۱) مرغہ سے مراد مرغزار یا سبزہ زار ہے۔ اس گھاس کو پختو میں کبل اور اردو میں دوب کہتے ھیں۔ غوڑہ سے مراد پھسلن۔ یعنی خون کی وجہ سے پھسلن ھو رھی تھی۔

ہوئے ۱۷۲۲ء میں اصفہان کے مقام پر ایرانی سرداروں کو قتل کرادیا۔ کہا جاتا ہے کہ میر محمود پاگل تھا۔ لیکن ماضی قریب میں بھی اس سفاکی کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ پچھلی پشت کا واقعہ ہے کہ ایک مہمند ملک نے جس سے میں ذاتی طور پر واقف تھا گنداب میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ یہ ضیافت قبیلہ کے ان لوگوں کے ساتھ صلح صفائی کی خوشی میں کی گئی تھی جنہوں نے اس کے باپ اور دوسرے تمام رشتہ داروں کو قتل کردیا تھا اور صرف اسے بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ جب یہ بچہ بڑا ہوا تو اس نے فراخ دلی کے اظہار کے لئے تمام قبیلہ والوں کو اپنے گھر بلایا۔ جب وہ سب گھر میں آگئے تو اس نے اپنے ساتھیوں اور نوکروں چاکروں کے ساتھ مل کر ایک ایک کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ خاندانی دشمنی کے سامنے مہمان نوازی کے اصول بھی پس پشت ڈال دئے جاتے ہیں۔

میں ۱۹۴۷ء میں اسی گنداب کے مقام پر تقریباً دو سو قبائلیوں کے ساتھ ایک ضیافت میں شریک تھا۔ اس موقع پر صرف میں ہی ایک ایسا شخص تھا۔ جو مسلح نہیں تھا۔ جو ملک بھی دسترخوان پر آکر بیٹھتا تھا اس کے کاندھے پر بندوق لٹکی ہوئی ہوتی، تھی اور جب میں نے میگزین دیکھنے کے بہانے ان کی بندوقوں کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہر بندوق بھری ہوئی ہے۔ اس تیاری کے باوجود ضیافت کے دوران ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی موقع پر مجھے گنداب میں ایک ضیافت کے موقع پر قتل عام کا واقعہ سنایا گیا جس کی میں نے بعد میں تصدیق کی (۱)۔

اس سفر میں یوسف زئیوں کے ساتھ محمد زئی بھی آملے تھے جو خخے خاندان سے نہیں تھے لیکن یوسف زئیوں کی طرح خرشبون کی اولاد تھے اتمان خیل اور جدون بھی یوسف زئیوں کے ساتھ ہوگئے۔ یہ دونوں قبیلے سڑبنی افغان نہیں ہیں بلکہ اتمان خیل کرلانی ہیں اور جدون غورغشت ہیں۔ وہ ہمسایوں کی حیثیت سے یوسف زئیوں کے ساتھ آئے تھے۔ قتل عام کے بعد یوسف زئی اپنے ہمسایوں کو ساتھ لے کر اور وقتی طور پر محمد زئیوں کو چھوڑ کر نہایت مایوسی کی حالت میں درۂ خیبر کے راستے

---

(۱) میں شکار کے سوا اور کسی موقع پر پٹھانوں کے علاقہ میں ہتھیار لے کر نہیں پھرا۔ ان پر اعتماد ظاہر کرنا ہی بہتر تھا۔ البتہ ویران علاقہ میں بار بار ایک ہی راستہ سے گزرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔

پشاور کی طرف روانہ ہوئے۔ گگیانی بھی جنھوں نے الغ بیگ کا ساتھ دیا تھا ننگرہار (۱) میں رہ گئے۔

وقائع کے مطابق یوسف زئیوں نے یہاں آ کر دیکھا کہ پورے علاقہ پر دلہ زاک قابض ہیں اور ہشت نگر دھقانوں کے قبضہ میں ہے (دھقان کا لفظی مطلب دیہاتی یا مزارع ہے) ریورٹی کا کہنا ہے کہ دھقان سوات کے جہانگیری سلطانوں کی رعیت تھے۔ ان سلطانوں کا دارالحکومت منگلور تھا۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ سلطان اویس نے بابر سے مذاکرات کئے تھے جن کی بنا پر اسے فرار ہو کر دریائے سندھ کے پار ہزارہ میں پناہ لینا پڑی۔ کسی مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ لوگ افغان یا پٹھان تھے۔ دلہ زاک ابھی تک معما بنے ہوئے ہیں۔

نسب نامہ سے دلہ زاک قبیلہ کرلانی اور اورک زئیوں اور اتمان خیلوں کا قرابت دار ظاہر ہوتا ہے۔ بابر نے کئی موقعوں پر ان کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں افغان قرار دیا ہے۔ آج کل دلہ زاک ایک منظم قبیلہ کی حیثیت سے ناپید ہیں البتہ پشاور کے شمال میں داؤد زئی علاقہ میں ان کے نام پر کئی گاؤں آباد ہیں۔ پشاور ویل ھاونڈ (کتوں کا شکار) کے بیان میں اس نام کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بیلیو اور دوسرے مصنفوں کا کہنا ہے کہ اس قبیلہ نے محمود غزنوی کے زمانہ میں اسلام قبول کر لیا تھا اور محمود غزنوی کے ساتھ ایک مضبوط فوجی دستہ سومناتھ اور دوسرے ہندوستانی علاقوں پر حملہ کے لئے بھیجا تھا۔ قبائلی روایات کے مطابق دلہ زاک بھی چند سو سال پہلے ننگرہار اور اس کے مغرب سے چل کر پشاور پہنچے تھے۔ جن قرأین سے ان کے افغان ہونے کی شہادت ملتی ہے وہ قبائلی قصوں میں خان کجو کا رومان ہے خان کجو احمد کے بعد یوسف زئیوں کا لیڈر تھا۔ یہ واقعہ احمد کے ہاتھوں دلہ زاک کی شکست کے بعد کا ہے۔ بابر کی طرح کجو بھی وجیہہ نوجوان تھا اور احمد کے ساتھ ایلچی کی حیثیت سے دلہ زاک قبیلہ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ وہاں وہ دلہ زاک سردار کی لڑکی کے دام عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس لڑائی کے بعد جس میں دلہ زاک قبیلہ کو شکست ہوئی کجو دلہ زاک کا تعاقب کرنے والوں کے ہراول دستہ کی کمان کر رہا تھا۔ وہ دلہ زاک سردار اور اس

---

(۱) موجودہ جلال آباد کی وادی۔

کے خاندان کا تعاقب کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس وقت یہ خاندان دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خان کجو کو دیکھ کر دلہ‌زاک سردار نے اس کی منت کی کہ وہ اپنے آدمیوں کو تعاقب سے باز رکھے تاکہ عورتیں پاراتر جائیں ورنہ ہم سب کے سب دریا میں کود جائیں گے اور گرفتاری پر موت کو ترجیح دیں گے۔ نوجوان کی غیرت جوش میں آگئی اسے دلہ‌زاکوں پر رحم آگیا اور اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو پکار کر کہا ''ساتھیو دلہ‌زاکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ کیونکہ ہماری طرح وہ بھی افغان ہیں''۔ چنانچہ عورتوں نے دریا پار کر لیا مرد آپس میں ہنستے بولتے رہے اور اس طرح خان کجو نے اپنے لئے دلھن حاصل کرلی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ قبائلی لڑائیوں میں پٹھانوں کے لئے یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ دشمن کی عورتوں اور بچوں کو نہ کوئی نقصان پہنچاتے ہیں نہ ان سے تعرض کرتے ہیں اسی طرح وہ دشمن کے مہمان کو جو اس کے گھر میں ہو اور اس کے لواحقین یا ہمسایوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تمام قبائلی وقائع غیر علمی ہیں اور یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اتنے بڑے پیمانہ پر کسی زمانہ میں ترک وطن کا واقعہ پیش بھی آیا ہے یا نہیں۔ اب تک اس کتاب میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کی بنا پر یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وادی پشاور کے لوگ نسل ثقافت یا زبان کے اعتبار سے ان دوسرے قبائل سے بالکل مختلف تھے جن کے ساتھ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اس مرحلہ پر انہیں واسطہ پڑا یہاں بھی نسب نامے ہی ہمارے کام آسکتے ہیں حملہ آور خخے سب کے سب سڑبنی تھے اور اس طرح افغانوں کی بہترین نسل سے تھے۔ دوسری طرف دلہ‌زاک بظاہر کرلانی یعنی پہاڑی قبائلیوں کے قرابت دار تھے جو پٹھان کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اس تمام قیاس آرائی میں صرف ایک ہی یقینی بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ بابر بنیادی طور پر یوسف زئیوں اور ان دوسرے قبیلوں سے جن کے اس نے نام گنوا دئے ہیں دلہ زاکوں کو الگ نہیں سمجھتا تھا۔ اور میرا خیال ہے ہمیں اس کی یہ بات تسلیم کرنی چاہئے۔

یوسف زئیوں کی روایات کے مطابق جب یہ قبیلہ قتل عام کے بعد

تھکا ھارا اور بے بسی کے عالم میں پشاور پہنچا (آمد کی تاریخ نہیں بتائی گئی) تو اس نے اپنے افغان اور مسلمان بھائیوں دلہ زاکوں سے مدد مانگی اور رھنے کا ٹھکانہ طلب کیا۔ دلہ زاکوں نے ایسی دریا دلی کا مظاھرہ کرتے ہوئے جس کی مثال قبائل کے بعد کے حالات میں مفقود ھے انہیں دوآبہ کا علاقہ دے دیا یہ زرخیز علاقہ پہاڑیوں کی ترائی اور کابل اور سوات دریاؤں کے سنگھم سے بننے والا وہ مثلث ھے جہاں اب شب قدر آباد ھے۔ یوسف زئیوں کے نئے سردار ملک احمد نے دلہ زاکوں کا شکریہ ادا کیا لیکن ساتھ ھی ساتھ یہ بھی کہا کہ دوآبہ مختصر سا علاقہ ھے اور قبیلہ کے بہت سے لوگ پیچھے رہ گئے ھیں۔ وہ ٹھکانہ ملتے ھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آ ملیں گے۔ کیا دوآبہ کے علاوہ اور جگہ نہیں ھے؟

دوآبہ پورے سرحدی علاقہ میں سب سے زیادہ زرخیز علاقہ ھے اس طرح یوسف زئیوں کی طلب بہت زیادہ تھی۔ لیکن ایسا معلوم ھوتا ھے کہ دلہ زاکوں نے اس مرحلہ پر بھی فیاضی کا ثبوت دیا انہوں نے احمد سے کہا اگر دوآبہ وسیع نہیں ھے تو باجوڑ تک دانش کول اور امبار کی وادیاں پھیلی پڑی ھیں جن پر یوسف زئی قبضہ کر سکتے ھیں۔ اس کے علاوہ ھشت نگر بھی ھے جسے وہ بزور شمشیر سوات کے جہانگیری (۱) سلطانوں کے دھقانوں سے چھین سکتے ھیں۔ یہ دلہ زاکوں کی بخشش نہیں تھی بلکہ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ دلہ زاک ان علاقوں پر یوسف زئیوں کے قبضہ کی صورت میں حصہ بانٹنے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

یوسف زئیوں اور مندڑوں نے جن میں خود ملک احمد بھی شامل تھا۔ دلہ زاکوں کی پیش کش قبول کرتے ہوئے دوآبہ لے لیا اور تھوڑے ھی دنوں میں ان کے خاندان اور لواحقین اور دوسرے لوگ جو کابل میں قتل عام کے وقت خانہ بدوشوں یا تاجروں کی حیثیت سے باھر گئے ہوئے تھے ان سے آ ملے۔ ان میں سے بہت سے لوگ امبار اور دانش کول کے راستہ باجوڑ کے بالائی علاقہ میں جا گھسے اور اس کی جنوبی وادی لاشوڑہ پر جہاں اب خار آباد ھے قبضہ کی کوشش شروع کر دی۔ اور دائیں طرف اور آگے یعنی جندول تک بڑھتے چلے گئے اور پنج کوڑہ دریا تک پہنچ گئے۔ اسی عرصہ

(۱) کچھ مصنفوں کا جن میں ریورٹی بھی شامل ھیں یہ خیال ھے کہ چترال کے موجودہ فرماں روا اسی جہانگیری خاندان کے اخلاف ھیں۔

میں قبائلیوں کا بڑا حصہ جو دوآبہ میں آباد تھا اپنے مسکنوں سے نکل کر دھقانوں سے ھشت نگر چھیننے اور خاص سمہ (۱) میں چارسدہ کے مشرق میں ھوتی کی کاپانی اور مردان کی طرف دلہ زاکوں کی زمینوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس اثنا میں گگیانی جنہوں نے اپنے یوسف زئی قرابت داروں کے خلاف الغ بیگ کا ساتھ دیا تھا اور جو ایک لحاظ سے سارے جھگڑے کا باعث بنے محمد زئیوں کے ساتھ ننگرھار ھی میں رہ گئے۔ اب ایک نئی صورت حال پیدا ھوگئی خرشبونوں کا دوسرا بڑا حصہ غوریہ خیل جس کی اھم شاخیں خلیل، مہمند اور داؤدزئی ھیں یہ محسوس کرنے لگا کہ مکڑ قندھار کے علاقہ میں اس پر عرصہ حیات تنگ ھوتا جا رھا ھے۔ تیموری خاندان کا زور گھٹ رھا تھا اور مقامی اقتدار ترین قبیلہ کے ھاتھ میں جا رھا تھا۔ اس مرحلہ پر ابدالی (درانی) ترین کہلاتے تھے۔ نسب نامہ پر ایک نظر ڈالنے سے ظاھر ھو جائے گا کہ ایسا کیوں تھا۔ خخوں کی تقلید کرتے ھوئے غوریہ خیل نے بھی شمال کی جانب نقل وطن شروع کردیا ان میں سے کچھ لوگ ننگرھار میں جا گھسے جہاں انہیں گگیانیوں ترکلانیوں (ایک اور خخے قبیلہ) اور محمد زئیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ترکلانی ابتدا میں کابل اور ننگرھار کے درمیان لمغان (لغمان) میں بس گئے تھے لیکن ان کے دانت باجوڑ پر تھے جہاں انہوں نے ایک جماعت صورت حال کا جائزہ لینے بھیج دی تھی۔ گگیانیوں نے بھی جب یہ دیکھا کہ مہمندوں سے نپٹنا مشکل ھے تو انہوں نے باجوڑ میں پاؤں جمانے کی ناکام کوشش کی لیکن ترکلانیوں نے انہیں نکال باھر کیا۔ آخر انہوں نے اپنے سفید ریشوں کو اس حالت میں کہ ان کے گلوں میں پھندے پڑے ھوئے تھے اور منہ میں گھاس لئے ھوئے تھے یوسف زئیوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ معافی مانگیں اور ملک احمد اور دوسرے سرداروں سے التجا کریں کہ ھمارے رھنے کے لئے زمین دی جائے۔ ملک احمد نے خخوں کو ایک طاقتور قبیلہ بنانے کے خیال سے قبائل کی مرضی معلوم کرنے کے بعد انہیں دوآبہ کا علاقہ

---

(۱) نہروں سے پہلے سمہ کا جو حال تھا اسے ایک پشتو ضرب المثل میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ھے:-

سمہ د شگو پل دے چرے جوړ بہ نۂ شی

سمہ ریت کا پل ھے جو کبھی تعمیر نہیں ھو سکتا۔

برطانوی عہد میں یہ علاقہ زرخیز ھو گیا اور ضرب المثل غلط ثابت ھوگئی۔

دے دیا۔ چنانچہ یوسف زئیوں کے خاندان ایک ایک کر کے کڑپہ کے راستے اور گنداب سے نیچے اتر کر اس زرخیز علاقہ میں آ کر آباد ہوگئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دھقانوں کو بھی جن کا سردار میر ھندہ تھا نکال باھر کر دیا گیا۔ اس طرح ھشت نگر کا علاقہ محمد زئیوں کو دے دیا گیا۔ خود یوسف زئی جو نوواردوں کی وجہ سے کافی طاقتور ہوگئے تھے مشرق میں دریائے سندھ کی طرف اور شمال میں سوات اور باجوڑ کی طرف اپنے لئے جگہ بناتے رہے۔

اس طرح قبائل کے اس نظام کی ابتدا ہوگئی تھی جو آج بھی قائم ہے کیونکہ آج بھی گگیانی دوآبہ میں، محمد زئی ھشت نگر میں اور چند مستثنیات سے قطع نظر یوسف زئی لنڈے دریا کے شمال میں سمہ کی پوری وادی پر قابض ھیں۔ یہ بات یوسف زئیوں کی اھم شاخ مندڑ پر صادق آتی ہے۔ اس روایت کی صداقت پر یقین لانا بہت مشکل ہے۔ اس زمانہ میں خاص سمہ میں آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ ایک وسیع لیکن خشک علاقہ تھا۔ اس کے کچھ حصے ریگستان تھے جن میں سے متعدد چشمے مثلاً بگیا کلپانی اور لند خوڑ گزرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں جہاں پانی کی سطح زیادہ نیچے نہیں تھی کنوؤں سے سینچائی ہوتی تھی۔ اس کے برعکس دوآبہ اور ھشت نگر ھموار علاقے ھیں جو کابل اور سوات دریاؤں سے سیراب ہوتے ھیں اور یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ علاقے سیلاب سے سیراب ہوتے تھے۔ یوسف زئی بقول خود اپنی مرضی کے مالک تھے انہوں نے بہترین زمین ان گگیانیوں کو کیوں بخش دی جنہوں نے قبائلی رشتہ کو فراموش کر دیا تھا اور یہ علاقہ محمد زئیوں کو کیوں دے دیا جو خخرے برادری سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے؟ جب یہ بات ذھن میں آتی ہے کہ اس وقت تک پوری وادی کے اصل مالک دلہ زاک ناپید نہیں ہوئے تھے تو اس کہانی پر اعتبار کرنا اور مشکل ہو جاتا ہے ھمیں بتایا گیا ہے کہ گگیانی اس علاقہ میں داخل ہوتے ہی دلہ زاکوں کے ساتھ ایسی سرکشی کے ساتھ پیش آئے کہ ملک احمد نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر بابر ۱۵۱۹ء میں اپنی تیسری سرحدی مہم پر اس علاقہ میں داخل ہوا اور دلہ زاکوں نے اپنا فائدہ دیکھتے ہوئے اور یہ امید رکھتے ہوئے کہ وہ ھشت نگر چھین کر اپنے نقصان کی تلافی کر دیں گے انہوں نے بابر کا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بابر کی واپسی کے

بعد گگیانیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس علاقہ میں جو اب داؤدزئیوں کا علاقہ ہے گل بیلا کے مقام پر لڑائی میں شکست کھا گئے۔

روایت ہے کہ اس شکست کے بعد ملک احمد اور یوسف زئی اپنی حکمت عملی بدل کر نئی چال اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یوسف زئیوں نے دلہ زاکوں کی تمام فیاضی فراموش کر دی اور یہ سوچنے لگے کہ گگیانوں کو شکست دینے کے بعد دلہ زاک بہت سر چڑھ گئے ہیں۔ احمد نے فیصلہ کیا کہ پہلے تو تمام خخوں کو ملا کر ایک قبائلی وفاق بنایا جائے اور پھر دلہ زاکوں سے لڑائی کی جائے۔ اس نے لڑائی کے لئے یہ حیلہ تلاش کیا کہ وہ گگیانیوں کے ساتھ غیر معمولی سختی کے ساتھ پیش آئے ہیں اور سمہ پر قبضہ کرنے والے یوسف زئیوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ گستاخانہ ہے۔ اس مقصد کے لئے احمد تمام یوسف زئیوں مندڑوں اور ان کے ہمسایوں اتمان خیل اور گدون کو اکھٹا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے محمد زئیوں کو بھی اس وعدہ پر اپنے ساتھ ملا لیا کہ انہیں هشت نگر پر قابض رہنے دیا جائیگا۔ کاٹلنگ اور شہباز گڑھ کے درمیانی علاقہ میں زبردست جنگ ہوئی۔ سب سے زیادہ گھمسان کا رن گدڑ چشمہ کی گزرگاہ پر پڑا جہاں دلہ زاک کی بڑی بڑی ٹولیوں کو گھات لگا لگا کر تہ تیغ کر دیا گیا۔ دلہ زاک شکست کھاگئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ پسپا ہو کر دریائے کابل کے جنوب میں اپنے قرابت داروں تک نہیں پہنچ سکتے تو وہ دریائے سندھ کے پار چچھ هزارہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے یہی وہ موقع تھا جب اس کارواں کا عقبی حصہ دریائے سندھ عبور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نوجوان ملک کجو نے، جو اس لڑائی میں حصہ لینے کی وجہ سے خون میں نہایا ہوا تھا دلہ زاک قبیلہ سے دلہن حاصل کر لی۔

کاٹلنگ کی لڑائی کی تاریخ نا معلوم ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اب کسی کو اس کی تاریخ یاد نہیں۔ مقامی شہادتوں کی بنا پر یہ لڑائی اس علاقہ میں بابر کی دوسری مہم ۱۵۱۹ء اور اس کے هاتھوں دهلی کی فتح ۱۵۲۶ء کے درمیان کسی وقت لڑی گئی۔ بابر اپنی دوسری مہم میں کاٹلنگ بھی آیا تھا۔ اگر هم قبائلی روایات کو من وعن صحیح تسلیم کر لیں تو یہ بات ناقابل یقین ہے کہ بابر جس کا اس سے پہلے ان

تمام قبائل سے تعلق رہ چکا تھا کاٹلنگ کے مقام پر دلہ زاکوں کی تباہ کن شکست کا تذکرہ نہ کرتا۔ وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ یہ واقعہ ۱۵۱۹ء میں اس مقام پر اس کی آمد سے پہلے پیش آیا ہو۔ اس بنیاد پر میرے خیال میں یہ لڑائی ۱۵۱۹ء کے بعد اندازاً ۱۵۲۵ء میں ہوئی ہو گی۔

اس لڑائی سے کچھ دنوں پہلے (اس واقعہ کی بھی تاریخ نا معلوم ہے) یوسف زئی نشیبی سوات کا قریب قریب پورا علاقہ اپنے قبضہ میں لا چکے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہشت نگر کے دہقان سوات کے جہانگیری بادشاہ کی رعیت تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جب شکست کھا کر ہشت نگر سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو وہ درۂ مورہ کے راستے جو تھانہ تک جاتا ہے سوات پہنچے جہاں ان کے لیڈر میر ہندہ کی زمینیں واقع تھیں۔ انہوں نے ایک حفاظتی دستہ موگرہ میں چھوڑ دیا جہاں بابر کی بی بی مبار کہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور مالاکنڈ اور غالباً شاہ کوٹ اور ان دونوں کے درمیان درۂ چرات پر بھی قابض ہوگئے۔ سوات کے سلطان اویس نے جس کا دارالحکومت منگلور تھا یوسف زئیوں کے خطرناک ارادوں سے محفوظ رہنے کے لئے ملک احمد کی بہن سے شادی کرلی تھی لیکن یہ خاتون فوت ہوگئی چنانچہ سلطان اویس کو بجا طور پر خخوں کی طرف سے جو آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرتے پھر رہے تھے حملہ کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اسے زیادہ عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یوسف زئی اور مندڑ اپنی مفلسی کے اس زمانہ میں جب انہیں دوآبہ کا علاقہ بخشا گیا تھا روزی کمانے کے لئے سوات میں تجارت کرنے لگے تھے اور انہوں نے اس علاقہ کی خوبصورتی اور زرخیزی کا اندازہ لگالیا تھا۔ قبائلی روایت میں تو یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ ملک احمد نے سوات میں پاؤں جمانے کے ارادہ سے سلطان اویس کے ساتھ اپنی بہن کی شادی خود طے کی تھی۔ یہ شادی سیاسی نوعیت کی تھی۔ یوسف زئیوں نے موقع پاتے ہی اپنی طاقت جمع کی اور درۂ مورہ کے راستے سوات میں گھسنے کی کوشش کی وہ اس کوشش میں کئی بار ناکام رہے۔ دو مہینے تک مسلسل ناکامی کے بعد انہوں نے مغرب کی جانب مالاکنڈ کا جائزہ لینے کے لئے ایک جماعت بھیجی۔ انہیں یہ اطلاع ملی کہ وہاں سلطان اویس کی قیادت میں جو حفاظتی فوج مامور ہے وہ چوکنّی نہیں ہے اور اس پر اچانک حملہ کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ یہ طے پایا کہ رات کے کھانے کے بعد فوج کا بڑا حصہ مالاکنڈ روانہ ہو جائے اور تھوڑے سے لوگ سورہ کی ترائی میں پرانے پڑاؤ میں ٹھہرے رہیں اور مشعلیں روشن کردیں تاکہ سواتی اس دھوکہ میں رہیں کہ پوری فوج حسب معمول پڑاؤ میں ہے۔ اصل فوج تمام رات سفر کرنے کے بعد صبح سویرے مالاکنڈ پہنچ گئی جہاں اس نے دشمن کے حفاظتی دستے کو سوتے میں جالیا۔ سلطان اویس تھانہ کی طرف فرار ہوگیا۔ میر ہندہ بھی جس نے سورہ کا بڑی کامیابی سے دفاع کیا تھا مالاکنڈ کے راستے یوسف زئیوں کے حملہ کی خبر سن کر اپنی فوج کے ساتھ پسپا ہوگیا اور تھانہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہوگیا جو ایک مضبوط مرکز تھا۔

اخون درویزہ، جو ۱۷۱۷ء میں فارسی زبان میں اس علاقہ کی تاریخ مرتب ہونے سے پہلے کے مصنف ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جس درہ کے سامنے افغانوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا وہ سورہ نہیں تھا بلکہ اس سے چند میل مغرب میں درہ شاہ کوٹ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف زئی ان دونوں دروں سے گھسنے کی کوشش کر رہے ہوں گے یہ دونوں راستے پلئی تک پہنچتے ہیں اس لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ افغانوں کا پڑاؤ سورہ کے سامنے تھا یا شاہ کوٹ کے سامنے۔ لیکن اخون درویزہ نے اس واقعہ کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے پورا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے۔ کہ کس طرح یوسف زئی عورتوں نے جو کیمپ میں رہ گئی تھیں اپنے مردوں کی تعریف میں اور ان کے دشمنوں کی بزدلی ظاہر کرنے کے لئے رجزیہ اشعار گانے شروع کئے۔ گانوں میں یہ بھی پیش گوئی کی گئی تھی کہ فیصلہ کن حملہ کل صبح شروع ہوگا۔ یہ گانے سن کر سواتیوں نے اپنی تمام طاقت اس مقام کی حفاظت کے لئے مجتمع کردی اور اب تک جس مستعدی سے مالاکنڈ کی حفاظت کر رہے تھے اس سے غافل ہوگئے۔

یہ واقعہ بھی بڑی تفصیل سے بیان کرنے کے باوجود اس کی تاریخ کا تعین نہیں کیا گیا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قبائلی روایت ایک تاریخی واقعہ پر مبنی ہے۔ آج کسی کو کاٹلنگ کی وہ لڑائی یاد نہیں ہے جس میں یوسف‌زئیوں اور ان کے قرابت داروں نے دلہ‌زاکوں کو فیصلہ کن شکست دی تھی لیکن آپ کسی بھی قبائلی سے پوچھ لیجئے کہ قبائلی مختلف دروں سے کس طرح سوات میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی ہم قیاس کے ذریعہ

اس واقعه کی تاریخ مقرر کر سکتے ھیں۔ لیکن یه قیاس بابر کی تحریر سے نہیں بلکه اس کے افسانۂ محبت کی اس تفصیل سے کیا جا سکتا ھے جو یوسف زئی خود بیان کرتے ھیں۔ کہا جاتا ھے که بابر کی اپنی ھونے والی دلهن سے ملاقات موره ھی میں ھوئی تھی ھم کہہ سکتے ھیں که یه واقعه ۱۵۱۹ء میں پیش آیا۔ اس وقت یوسف زئی اس پورے علاقه پر قابض تھے احمد کا رشته کا بھائی اور مبارکه کا والد ملک شاہ منصور درۂ موره میں قیام کئے ھوئے تھا۔ اس سے یه نتیجه نکلتا ھے کو سوات پر یوسف زئیوں کا قبضه ۱۵۱۹ء سے پہلے یعنی کاٹلنگ کی لڑائی سے چند سال پہلے ھوا ھوگا۔ یه کہنا زیاده غلط نه ھو گا که سوات پر یوسف زئیوں کا قبضه ۱۵۱۵ء میں ھوا۔

احمد نے یوسف زئیوں اور دوسرے قرابت دار قبائل میں زمینیں تقسیم کرنے کا کام کاٹلنگ کی لڑائی اور دله زاکوں کے اخراج کے بعد سنبھالا۔ زمین کے اس بندوبست سے شیخ ملی کا نام نامی ابھی تک وابسته ھے۔ دستاویزات سے ظاھر ھوتا ھے که سروے اور بندوبست کے کام میں اس بات کا پورا خیال رکھا گیا تھا که سوات حتیٰ که بنیر پر بھی یوسف زئی وغیرہ قابض ھو چکے ھیں۔ اس سے ظاھر ھوتا ھے که یوسف زئی میدانی علاقه میں دله زاکوں پر غلبه پانے سے پہلے سمه کے شمال میں پہاڑی علاقه میں داخل ھو چکے تھے۔ یه سروے پورے دوآبه، اشت نگر (ھشت نگر) مشرق میں دریائے سنده اور جنوب میں دریائے کابل تک پورے سمه اور سوات بنیر اور باجوڑ کے ان علاقوں پر محیط تھا جنھیں خخے اور ان کے قرابت دار قبائل زیر کر چکے تھے۔ سروے کے بعد زمینیں صرف یوسف زئیوں اور ان کے بھائیوں مندڑ یوسف زئیوں ھی کو نہیں دی گئیں (احمد خود بھی رزڑ مندڑ تھا) بلکه محمد زئیوں کو جو خخے نہیں ھیں بلکه کرشبون کی اولاد ھیں اور اتمان خیل اور گدون کو بھی جو سڑبنی نہیں تھے حصه دیا گیا۔ آخر میں کچھ زمینیں سادات اور دوسرے بزرگوں کو دی گئیں جو قبائل کے ساتھ ترک وطن کر کے آئے تھے اور جنھوں نے ان کی فتح کے لئے دعائیں کی تھیں۔ خالص افغان قبائل یعنی سڑبن کی اولاد کو جو زمینیں ملی تھیں وہ دفتر کہلاتی تھیں اور سادات وغیرہ کو جو زمینیں دی گئی تھیں وہ سیرئے (ھبه) کہلاتی تھیں۔ نہایت دانشمندی کے ساتھ اس بات کا اهتمام کیا گیا تھا کہ کسی قبیله کی دو

ٹکڑیوں کے دفتروں کے درمیان ایک سیرئے ضرور ہو۔ اس طرح سرے کا مالک جو مقدس شخصیت ہوتا تھا ثالث کے فرائض انجام دے سکے اور ایک ٹکڑی کو دوسری ٹکڑی کی زمین پر قابض نہ ہونے دے۔ شیخ ملی کا بندوبست اور زمین کی تقسیم کا یہ انتظام آج بھی دریائے کابل کے شمال میں پورے علاقہ میں قبائلی لگانداری کے طریقہ کی بنیاد بنا ہوا ہے۔

غیر یوسف زئی قبائل میں سے گگیانیوں کو جن کا بیان گزر چکا ہے دوآبہ مل گیا۔ محمد زئیوں کو ہشت نگر اور اتمان خیل اور گدون کو جو صرف مزارع تھے شمال کا پہاڑی علاقہ ملا۔ یہ سب قبیلے اب بھی ان ہی علاقوں میں آباد ہیں البتہ اتمان خیل قبیلہ اپنے علاقہ سے منتقل ہو گیا ہے۔ شروع میں اس قبیلہ کو نہ صرف اسبہار دیا گیا تھا جہاں وہ آج کل آباد ہے بلکہ سوات اور میدانی علاقہ کے درمیان وہ وسیع پہاڑی علاقہ ہی ملا تھا جو سمہ کے شمالی حصہ تک پھیلا ہوا ہے۔ بعد میں جب سولھویں صدی میں خٹک قبیلہ نے سر ابھارا تو یہ ترتیب بگڑ گئی اور اب کاٹلنگ کے شمالی میدان میں اس قبیلہ کے صرف پانچ چھوٹے گاؤں رہ گئے ہیں۔

شیخ ملی کے عہد کے بعد یوسف زئیوں اور مندڑوں کے درمیان زمین کی تقسیم میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بارہ مہینے جاری رہنے والی نہریں بننے سے پہلے اس وقت یہاں وادی سوات سب سے زیادہ زرخیز تھی اسی وجہ سے پہلے پہل یوسف زئیوں اور مندڑوں دونوں کو سوات میں سے کچھ حصہ ملا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ملک احمد اور شیخ ملی دونوں کے مزار وادی سوات میں ہیں۔ ملک احمد کا مزار اللہ ڈنڈ کے قریب اور شیخ ملی کا مزار غوربندی کے مقام پر ہے۔ اللہ ڈنڈ میں ملک احمد کا مزار پہاڑی کی ترائی میں گاؤں کے جنوب میں ہے جہاں سے شمال کی طرف ادین زئی وادی دور تک نظر آتی ہے۔ احمد جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مندڑوں کی رزڑ شاخ سے تعلق رکھتا تھا شیخ ملی اس کا پیشوائے اعلیٰ تھا جو اسی خیل سے تعلق رکھتا تھا اور اس طرح اس کا وزیر تھا۔ اس کے برخلاف احمد کا جانشین خان کجو مندڑ ہونے کے باوجود صوابی اور مانیری کے درمیان بدرائے چشمہ کے کنارے دفن ہے۔ اس کی قبر سے

سیرے(۱) میرا کے پار وہ پہاڑی نظر آتی ہے جو جدید نقشہ میں گجو غنڈئے کے نام سے ظاہر کی گئی ہے۔ شیخ ملی کے سروے کے بعد کسی وقت جس کا تعین نہیں کیا گیا یوسف اور مندڑ قبائل نے نئے سرے سے اپنی زمینیں آپس میں بانٹ لیں۔ اس طرح یوسف زئیوں نے سوات، پنج کوڑہ، بنیر اور پورا پہاڑی علاقہ لے لیا اور مندڑ سمہ تک محدود رہ گئے۔ اب پہاڑی علاقہ میں مندڑوں کی کوئی آبادی نہیں ہے اور سمہ میں یوسف زئیوں کے صرف تین گاؤں ہیں یہ گاؤں بھی سوات اور بنیر کے متصل پہاڑی دامن میں واقع ہیں۔ شروع میں یوسف زئی قبیلہ سب سے زیادہ خوشحال تھا کیونکہ اس کے علاقہ کی وادیاں جنت نظیر ہیں لیکن اب نہریں بن جانے کے بعد مندڑ زیادہ دولت مند ہوگئے ہیں البتہ ان کے علاقہ کی آب و ہوا اتنی اچھی نہیں ہے۔ نہریں بن جانے کی وجہ سے اس علاقہ میں گنا، تمباکو اور دوسری نقد فصلیں خوب پیدا ہونے لگی ہیں اور اب سمہ اور ھشت نگر کا علاقہ پورے پاکستان کے زرخیز ترین علاقوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ یہ تمام خوش حالی مندڑوں کے حصہ میں آئی ہے۔

شیخ ملی کے ھاتھوں زمین کی تقسیم کی تاریخ کا واضح تعین نہیں کیا گیا۔ ھمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ یہ کام کاٹلنگ کی لڑائی کے بعد اور احمد کے زمانۂ حیات میں ہوا۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ کاٹلنگ کی لڑائی ۱۵۲۵ء میں ہوئی تھی اور زمین کا سروے اس سے تھوڑے عرصہ بعد ہوا تھا تو ہم ۱۵۳۰ء (۹۳۷ ھجری) اس واقعہ کی قرین قیاس تاریخ قرار دے سکتے ہیں۔ یہ چار سال تک دھلی کی بادشاھت کے بعد بابر کی موت کا سال ہے۔ ہم نے اس موقع پر جس استنباط سے کام لیا ہے۔ اس کی پابندی کرتے ہوئے ہم یہ طے کریں کہ کابل میں قتل عام ۱۴۸۵ء میں ہوا تھا اور یہ قیاس کریں کہ ملک احمد جو اس قتل عام سے بچ گیا تھا اس واقعہ کے وقت کم عمر تھا اور اس کا سن پیدائش تقریباً ۱۴۷۰ء ہوگا تو اس طرح ۱۵۳۰ء میں احمد ساٹھ سال کی پختہ عمر کا بزرگ ہوگا اور شیخ ملی کے بندوبست پر عملدرآمد کرانے کے لئے ایک

(۱) سیرے میرا نیچے نیچے ٹیلوں کا دور تک پھیلا ہوا سلسلہ ہے۔ یہ ٹیلے کہیں بھی سمہ سے چند سو فٹ سے زیادہ اونچے نہیں ہیں۔ ان ٹیلوں سے سمہ کے مشرق اور جنوب میں ایک قوس بنی ہوئی ہے جو سمہ کو دریائے سندھ اور لنڈے سے جدا کرتی ہے۔ اسی سلسلہ کے اس سیرے پر جہاں نوشہرہ واقع ہے ۱۸۲۳ء میں سکھوں کے خلاف مشہور لڑائی ہوئی تھی۔

ایسی ہی بزرگ اور معتبر ہستی کی ضرورت ہوگی۔ پورے علاقہ کی وسعت کو دیکھتے ہوئے جس میں طرح طرح کے پہاڑوں اور وادیوں کی موجودگی نے پیچیدگیاں پیدا کی ہوں گی اور اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کہ شیخ ملی نے ہر قبیلہ اور اس کے ہر خیل کے علاقہ کا واضح تعین کیا ہے جو آج بھی قابل تسلیم ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام کم از کم پانچ سال میں اور شاید دس سال میں پورا ہوا ہوگا۔ کابل دریا کے شمال میں پشاور اور مردان کے موجودہ ضلعوں باجوڑ کے کچھ حصے پنج کوڑہ، سوات، بنیر اور اس سے متصل وادی سندھ کا سروے کیا گیا تھا۔ اس پورے علاقہ کے دائرہ کا قطر تقریباً ایکسو میل ہے اور اس میں ایک ہزار فٹ سے دس ہزار فٹ تک بلند پہاڑ اور وادیاں بھی شامل ہیں۔ زمین کا سروے اور تقسیم قابل تحسین کارنامہ تھا اور یہ انتظام اب تک ہر طرح کی آزمائش پر پورا اترا ہے۔ سروے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی سوچ بچار اور تنظیم سے کام لیا گیا ہے۔ کسی قبیلہ کی چھوٹی سے چھوٹی شاخ کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ قبائلی روایات کی مضبوطی بھی مدنظر رکھی گئی ہے۔ پورے انتظام سے منتظم کی عظمت کا پتہ چلتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ واقعہ تاریخی ہے اور تقریباً اسی زمانہ میں پیش آیا جس میں اس کے پیش آنے کا دعوٰی کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ بندوبست سے پہلے مختلف قبیلوں نے ترک وطن کیا تھا کچھ قبیلوں کے گھر بار اجاڑ دئے گئے اور آپس میں لڑائیاں ہوئی تھیں یا نہیں۔ زمین کے بندوبست کی ضرورت کا احساس پیدا ہونے کے لئے یہی کافی تھا کہ بہ یک وقت ایک طاقتور سردار اور ایک لائق عالم دین نے جو اچھا منتظم بھی تھا عروج حاصل کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ فرض کرنا ضروری نہیں کہ یوسف زئی اور ان کے ساتھی اس علاقہ میں نو وارد تھے۔

غوریہ خیل

خخے قبائل اور ان علاقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو انہیں حاصل ہوئے تھے ہم ان کے سڑبنی بھائیوں غوریہ خیل کو بالکل بھول گئے۔ حالانکہ غوریہ خیل اور ترین قبائل کی دشمنی ہی قندھار کے شمال میں اپنے اصلی وطن سے خخے قبائل کے مبینہ ترک وطن کا سبب بنی تھی۔ لیکن خخوں کے ترک وطن کے کچھ عرصہ بعد جس کا یقین نہیں کیا گیا ان کے

غوریہ خیل قرابت دار بھی ان کے نقش قدم پر چل نکلے شاید انہیں قبائلی ہنگاموں اور قندھار کے علاقہ میں تیموری خاندان کے زوال کے بعد ترین قبیلہ کی ہوس ملک گیری نے ترک وطن پر مجبور کردیا تھا۔ جیسا کہ ہمیں پہلے معلوم ہوچکا ہے قبائلی وقائع کے مطابق کابل میں قتل عام کے بعد ننگرھار میں غوریہ خیل کے ہراول دستہ کی آمد سے گگیانی اور اور ترکلانی ایک بار پھر بے گھر ہوگئے اور مشرق کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ دونوں وہ خخے قبائل تھے جو کابل میں قتل عام کے بعد پیچھے رہ گئے تھے۔

غوریہ خیل کی شاخیں خلیل، مہمند، داؤدزئی اور چمکنی ہیں۔ (ایک مشہور گاؤں کے سوا جو پشاور سے چھ میل کے فاصلہ پر ان کے نام پر آباد ہے چمکنیوں کا موجودہ قصبہ سے کوئی تعلق نہیں ان کی زمینیں وادی کرم کے پاس واقع ہیں) بابر نے ان سب میں سے صرف مہمندوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے بابر کو غلجیوں کے خلاف ایک لڑائی میں واسطہ پڑا تھا۔ اس وقت مہمند مکڑ یعنی اپنے اصل ٹھکانے پر آباد تھے۔ اس طرح اس معاملہ میں بابر غوریہ خیل کی قبائلی روایت کی تصدیق کرتا ہے۔ بابر نے کسی موقع پر خلیل یا داؤد زئیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کچھ یوسف زئی خخے جنہیں دوآبہ تنگ معلوم ہوتا تھا پہلے اسبار اور پھر وہاں سے جندول کے راستہ باجوڑ چلے گئے تھے۔ انہیں یہ ترغیب سمہ میں بسنے والے دلہ زاکوں نے دلائی تھی۔ لیکن اس معاملہ میں باجوڑ کے ملک ھیبو کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جو باجوڑ میں رہنےوالے دلہ زاکوں کی عمر خیل شاخ کا سردار تھا۔ کسی نے اس کی مرضی دریافت نہیں کی تھی چنانچہ اس نے بھی روایتی خودسری سے کام لیتے ہوئے نوواردوں کو زمین دینے سے انکار کر دیا۔ یوسف زئیوں نے مدد کے لئے ادھر آدھر نظر دوڑائی آخر خلیل قبیلہ کا ایک بہت بڑا حصہ جو ننگرھار سے آیا تھا اور اس وقت باقی غوریہ خیل سے مصروف پیکار تھا ان کی مدد کو پہنچ گیا۔ مہمندوں نے جو اس وقت سب سے زیادہ طاقتور غوریہ خیل قبیلہ تھا یہ خیال کیا کہ کہیں وہ خلیل سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ ادھر ترکلانی بھی جو اس وقت تک واحد خخے قبیلہ کی حیثیت سے ننگرھار ھی میں تھا ملک ھیبو اور

اس کے حریفوں یوسف زئیوں اور خلیل میں صلح صفائی کرانے کے ارادے سے باجوڑ پہنچ گیا۔ لیکن ھیبو اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ نووارد ثالث کی حیثیت سے غیر جانبدار رھیں گے یوسف زئی اور خلیل قبائل پر حملہ کردیا۔ مہمند اور ترکلانی بھی لڑائی میں کود پڑے ھیبو کو شکست ہوئی اور برھان نامی ایک ترکلانی نے تلوار کے ایک ھی وار سے اس کا سر تن سے جدا کردیا۔ میر جمال نامی ایک مندڑ نے ھیبو کے بدن سے اس کی زرہ اتار لی۔ مجھے یاد ھے کہ شیر درہ کے مقام پر جو بنیر سے نیچے درۂ امبیلا کے قریب واقع ھے یہ زرہ سالہا سال تک میر جمال کے اخلاف کو قیمتی میراث کی طرح باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہی۔

اس کے بعد یوسف زئیوں اور خلیل نے باجوڑ کا علاقہ آپس میں تقسیم کر لیا لیکن تھوڑے ھی عرصہ بعد وہ بھی آپس میں لڑ پڑے۔ پہلے لڑائی میں خلیل جیت گئے کیونکہ اس وقت تک سمہ کے یوسف زئی الگ تھے اور صرف باجوڑ کے یوسف زئیوں کو شکست ہوئی تھی۔ باجوڑ کے یوسف زئیوں نے ملک احمد سے مدد مانگی۔ ملک احمد نے فیصلہ کیا کہ خخوں کی طاقت کو منظم کیا جائے تاکہ غوریہ خیل آئندہ کوئی ایسی معاندانہ کارروائی نہ کر سکیں جیسی وہ پہلے کر چکے تھے اور جس کی بنا پر خخوں کی پہلی پشت ترک وطن کرنے اور مارے مارے پھرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس لئے طے پایا کہ سرکش خلیل قبیلہ پر دو طرف سے حملہ کیا جائے۔ باجوڑ کے یوسف زئی ننواتے(۱) کے لئے ملک ھیبو کے بیٹوں کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے خود کو دلہ زاکوں کے سپرد کردیا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ عمر خیل نے نہ صرف انہیں معاف کردیا بلکہ ایک مضبوط دستہ بھی ان کے ساتھ کردیا۔ آخر خاص وادی باجوڑ میں اس مقام کے قریب جہاں اب خار آباد ھے صف آرائی ہوئی۔ اسی اثنا میں سمہ کے یوسف زئی گنداب اور پنڈیالی کے راستے سے یعنی مہمندوں کے موجودہ علاقہ کے جنوبی حصہ سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے اور دانش کول پار کر کے ناوگئی کے قریب پہنچ گئے۔

---

(۱) پشتو لفظ بہ معنی خود کو دشمن یا مخالف کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس سے معافی مانگنا۔

ناوگئی کے قریب جو لڑائی ہوئی اس میں خلیل ہار گئے۔ لڑائی کا فیصلہ عمر خیل دلہ زاک کے ایک دستہ کی جنگی چال کی وجہ سے ہوا اس دستہ کی قیادت میرجمال کر رہا تھا جس نے ہیبو کو قتل کیا تھا لیکن اسے ہیبو کے بیٹوں اور لواحقین کی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ دستہ خلیل کے سنگر (آڑ کے لئے کچی دیوار) پر ٹوٹ پڑا جس کے پیچھے انہوں نے اپنے بال بچوں اور مال متاع کو حفاظت کے خیال سے جمع کر رکھا تھا۔ خلیل سراسیمہ ہوکر منتشر ہونے لگے سنگر اور عورتوں کو قبضہ میں لے لیا گیا۔ اور جنگ کا فیصلہ ہوگیا۔ اس لڑائی کے بعد احمد اور میرجمال نے ہیبو کے لڑکوں کے مشورہ سے جنگ میں گرفتار ہونے والوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں اس شرط پر رہا کیا گیا کہ خلیل پھر کبھی شمالی پہاڑی علاقہ میں قدم نہیں رکھیں گے۔ اس شرط کی ابھی تک پابندی کی جا رہی ہے۔

باجوڑ میں غوریہ خیل کا یہ داخلہ جس کی تاریخ ریورٹی نے ۱۵۱۷ء بتائی ہے بڑے پیمانہ پر اس قبیلہ کے وادی پشاور اور آس پاس کے علاقہ میں آکر آباد ہونے کی ابتدا تھی۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت عملی طور پر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ہمایوں کے حصہ میں ہندوستان آیا اور کابل، غزنی اور قندھار کے صوبے اور دریائے سندھ تک ان صوبوں کے باج گزار علاقے اس کے بھائی مرزا کامران کو ملے۔ کہنے کو ہمایوں بادشاہ تھا اور کامران محض اس کا مقرر کردہ حاکم لیکن آئندہ صدی میں اکبر کے بھائی حکیم کی طرح کامران بھی بڑے بڑے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی آزادی منوانے پر تلا ہوا تھا چنانچہ اس نے اپنے بھائی کی جگہ حاصل کرنے کے لئے لڑائی چھیڑنے کے سوا ہر حربہ استعمال کیا۔ اس تمام عرصہ میں حالات ہمایوں کے خلاف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۵۳۰ء سے جبکہ ہمایوں تخت پر بیٹھا ۱۵۴۵ء تک جبکہ (دہلی پر شیر شاہ کے قبضہ کے بعد) وہ کامران سے کابل چھیننے میں کامیاب ہوگیا سرحدی علاقہ ہمایوں کے زیر اقتدار نہیں تھا۔ مزید لڑائی کے بعد ۱۵۵۳ء میں شمالی پنجاب کے سردار آدم خان نے کامران کو پکڑ کر ہمایوں کے حوالہ کردیا اور اس کی آنکھیں نکلوادی گئیں۔ اس وقت تک بھی ہمایوں پشاور کے علاقہ کا موثر حکمران نہیں تھا۔ بابر کی وفات سے ۱۵۵۰ء تک بیس سال کے عرصہ میں کامران کی پالیسی اور منصوبے اس علاقہ کے واقعات

پر گہرا اثر ڈالتے رہے ہیں۔

روایت میں لکھا ہے کہ دریائے کابل کے شمال میں خخوں کے آباد ہو جانے کے بعد بھی دلہ زاک دریا کے جنوب میں پوری وادی پر یعنی درۂ خیبر سے سندھ کے کنارے خیرآباد تک قابض تھے۔ وقائع میں خٹک کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور ہمیشہ یہ فرض کیا جاتا رہا ہے کہ اس وقت تک یہ قبیلہ نمودار نہیں ہوا تھا۔ غوریہ خیل نے جس سے اس قبیلہ کی طاقتور شاخیں خلیل اور مہمند مراد ہیں جب یہ دیکھا کہ وہ باجوڑ کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتے تو وہ ننگرھار سے وادی پشاور آگئے اور خخوں کی پرانی چال سے کام لیتے ہوئے دلہ زاک سے درخواست کی کہ انہیں زمین دی جائے۔ دلہ زاک کافی سبق حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے یہ درخواست نا منظور کر دی۔ اس پر خلیل اور مہمند نے کامران کی ہمدردیاں حاصل کر لیں۔ کامران اس وقت اپنے بھائی کے خلاف اپنی سرحدوں کو مضبوط بنانے میں مصروف تھا اس مقصد کے لئے اس نے ان قبائل کو جو مشرق میں سندھ کی طرف بڑھ رہے تھے موثر مدد دی۔ وقائع میں لکھا ہے کہ کامران کی مدد سے غوریہ خیل نے اس نقل وطن کی تکمیل کی جو ان کے یوسف زئی بھائیوں نے شروع کی تھی اور دلہ زاک کو جو دریائے کابل کے جنوب میں آباد تھے دریائے سندھ کے پار بھگا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق اٹک تک کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ اس نقل و حرکت کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی لیکن اس کہانی میں کامران کا جتنا حصہ ہے اس سے ایک خاص مدت یعنی ۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۵ء کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ۱۵۴۵ء میں ھمایوں ایران میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد ایک بار پھر کامران سے کابل کا علاقہ حاصل کر چکا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیل درۂ خیبر کے راستے آئے تھے۔ ان کا افریدیوں کے ساتھ ھمیشہ قریبی تعلق رہا ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب محض یہ نہیں ہے کہ دونوں قبیلوں کے علاقے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ ان کے سردار جنھیں ارباب کہہ کر پکارا جاتا تھا افریدی طور طریقوں اور سیاست کے متعلق ھمیشہ قریبی معلومات رکھتے ہیں چنانچہ سکھوں اور ابتدائی دور کے انگریز حاکموں نے افریدیوں کے معاملات میں ان سے ایجنٹوں کا کام لیا۔ دوسری طرف مہمند دریائے کابل کے نشیبی علاقہ میں



ایک یوسف زئی

لال پورہ سے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ خاندان گوشتہ اور بوھئے ڈاگ کے راستوں سے آئے تھے جو گنداب اور دوآبہ تک پہنچتے ھیں۔ ان کی بڑی بڑی آبادیاں اب بھی اس پہاڑی سلسلہ کے مغرب میں جو پشاور کو ننگرھار سے جدا کرتا ھے لال پورہ، کامہ اور گوشتہ کے آس پاس واقع ھیں اور موجودہ افغانستان کی حدود کے اندر ھیں۔ مہمند ان پہاڑوں میں بڑی بڑی بستیاں بسانے کے بعد پشاور کی طرف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ انہوں نے باڑہ (۱) سے سیراب ھونے والا علاقہ خلیل قبیلہ کے ساتھ بانٹ لیا۔ داؤدزئیوں کی نقل و حرکت کے بارہ میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ایک موقع پر وہ بھی خان کجو کی خدمت میں حاضر ھوئے تھے اور انھوں نے جنوبی سمہ میں کلپانی کے کنارے یوسف زئیوں سے زمین حاصل کر لی تھی۔ آخرکار انہیں پشاور کے شمال میں دریائے کابل کی شاخوں کے ساتھ اس سرسبز و شاداب خطہ میں بسا دیا گیا جس سے پشاور ویل ھاونڈ (کتوں کا شکار) سے تعلق رکھنے والے اچھی طرح واقف ھیں۔

اسی زمانہ میں یوسف زئیوں کے رہنما ملک احمد فوت ھو گئے (غالباً ۱۵۳۵ء میں) اور خان کجو ان کے جانشین ھوئے۔ خلیل اور مہمند قبیلے جو پشاور کے آس پاس کے علاقے اور ھندوستان جانے والی شاھراہ پر قابض تھے چونگی وصول کرنے لگے وہ اتنے زیادہ دولت مند اور سرکش ھوگئے کہ یوسف زئیوں کے لئے ان کا وجود ناقابل برداشت ھوگیا۔ مہمند قبیلہ کی پہاڑیوں میں بھی ان قبیلوں کی بستیاں تھیں اس لئے وہ گنداب سے گزرنے والوں اور لال پورہ سے نیچے کی طرف بیڑے کے ذریعہ دریا میں سفر کرنے والوں سے بھی محصول وصول کر سکتے تھے۔ وہ گنداب میں یوسف زئیوں کے قافلے لوٹ لیتے تھے اور سمہ میں بھی لوٹ مار مچاتے رہتے تھے۔ خان کجو تھوڑے دنوں تک صبر سے کام لیتا رہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس نے نوداروں پر حملہ کیا تو اسے گگیانیوں یا محمد زئیوں کی مدد حاصل ھو گی چنانچہ وہ موقع کی تاک میں رہا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دوآبہ

---

(۱) باڑہ ایک چھوٹی سی ندی ھے جو تیراہ سے نکلتی ھے اور پشاور کے قریب مہمند اور خلیل قبائل کی زمینوں کو سیراب کرتی ھے۔ یہ ندی تیراہ کے پہاڑوں سے جہاں بڑے بڑے بھیڑوں کی گلے چرائے جاتے ھیں۔ کیچڑ وغیرہ بہاتی ھوئی لاتی ھے جس سے زمینوں میں بڑی زرخیزی آ جاتی ھے۔ باڑہ ندی یہی کے قریب لنڈے میں آ ملتی ھے۔

اور هشت نگر دولت مند علاقے تھے اور مہمند ان علاقوں کے باشندوں کو دو طرف سے پریشان کر سکتے تھے اور کرتے رہتے تھے۔ اسی قسم کے ایک حملہ میں ان کے ہاتھ سے ایک گگیانی ملک قتل ہو گیا جسے پیر سمجھا جاتا تھا یہ شخص دوآبہ سے پشاور جاتے ہوئے خلیل قبیلہ کی ایک مسجد میں داخل ہوا اور نماز کی حالت میں اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ واقعہ لڑائی کا سبب بن گیا۔ لیکن یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جو پٹھان انتقام لینے پر تلے ہوئے ہوں انہیں مذہبی احکام مہمان نوازی کے اصولوں کی طرح خون بہانے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ مجھے عدالت میں پیش آنے والے کئی ایسے مقدمے یاد ہیں جن میں لوگوں کو نماز کی حالت میں انتقام کا نشانہ بنا دیا گیا۔

میں اب اپنا کام کر سکتا ہوں۔ اس وقت وہ نماز ادا کر رہا ہے۔
میں اسے ابھی قتل کروں گا تاکہ وہ سیدھا جنت میں چلا جائے
اور میرا جذبۂ انتقام سرد ہو جائے۔

مجھے اس قسم کا کوئی واقعہ یاد نہیں کہ ان مقدمات میں ماخوذ ملزم نے کوئی غیر معمولی ندامت یا ذلت محسوس کی ہو۔ ان مقدموں میں وکیل اور فریقین وہی خیالات ظاہر کرتے تھے جو ہیملٹ کے ذہن میں آئے تھے۔

لیکن اس قتل سے خان کجو کو بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اس نے تمام خخرے قبائل اور ان کے حلیفوں محمد زئی، اتمان خیل اور گدون قبائل کی ایک لاکھ (۱) فوج جمع کی۔ ترکلانیوں نے بھی جو اس وقت تک باجوڑ میں اچھی طرح پاؤں نہیں جما سکے تھے دو سو شہسوار مہیا کئے۔ وقائع میں لکھا ہے کہ یہ لڑائی دریائے کابل کی انتہائی جنوبی شاخ شاہ عالم کے جنوب میں اس جگہ کے آس پاس لڑی گئی جہاں آج کل پل بنا ہوا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں غوریہ خیل کو فیصلہ کن شکست

(۱) الفنسٹن کا بیان ہے کہ یوسف زئی نو لاکھ مسلح سپاہی میدان میں لا سکتے تھے۔ یہ مبالغہ دھلی کے کسی منشی کی غلطی پر مبنی ہے جو پختو کے یو (ایک) کو اردو کا نو سمجھ بیٹھا۔ دونوں کے املا میں صرف نقطوں کا فرق ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی یوسف زئی نو لاکھ فوج میدان میں نہیں لا سکتے تھے۔

ہوئی- یہ لڑائی شیخ تاپور کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے- اس کی تاریخ غیر یقینی ہے لیکن ریورٹی نے بڑی پیچیدہ بحث کے بعد جو اس موقع پر بیان نہیں کی جا سکتی اس کی سن ۱۵۵۰ء (۹۵۷ ھجری) مقرر کیا ہے- یہ لڑائی خاص طور پر اس لئے مشہور ہے کہ فریقین نے بڑی بہادری کے ساتھ ایک دوسرے کو للکارا تھا- جب خان کجو اپنی فوج لے کر دریا کے قریب پہنچا- تو اس نے دیکھا کہ غوریہ خیل دریا کے دوسرے کنارے پر صفیں باندھے کھڑے ہیں- اس نے پکار کر کہا "تربورو (۱) ہمیں لڑنا ضرور ہے لیکن ہم دریا کے اندر نہیں لڑ سکتے نہ آر پار کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر تیر برسا سکتے ہیں- دریا خون سے سرخ ہوجائے گا اور ہماری بہنیں پانی نہیں بھر سکیں گی- اس کے علاوہ مرد کی شان یہی ہے کہ وہ اپنے دشمن سے دو دو ہاتھ کر سکے- اس لئے آپ دریا پار کریں میں اپنی فوج پیچھے ہٹائے لیتا ہوں تاکہ آپ کو راستہ مل جائے"- لیکن غوریہ خیل یہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑائی میں دریا ان کے عقب میں ہو وہ پسپائی کی صورت میں پشاور تک راستہ کھلا رکھنا چاہتے تھے- چنانچہ انہوں نے بھی جواب میں یہی پیشکش دہرائی- کچھ خخوں نے کجو کو مشورہ دیا کہ وہ دریا عبور نہ کرے اور بتایا کہ اس طرح وہ فریب میں آ جائے گا اور دریا اس کے عقب میں ہو جائے گا- لیکن کچھ نے پکار کر اعلان کر دیا کہ اسے یہ پیش کش منظور ہے- پھر خلیل کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا "دیکھو وہ پیچھے ہٹ رہے ہیں اور ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور آج کی جنگ کا بھی نتیجہ یہی ہوگا- چنانچہ ایسا ہی ہوا-

مجھے خخے خیل کے ہاتھوں غوریہ خیل کی شکست کا یہ روایتی بیان ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے- مبینہ شکست کے باوجود خلیل اور مہمند قبائل ان ہی علاقوں میں آباد رہے جو انہوں نے منتخب کئے تھے اور اس وقت سے اب تک پشاور کے قرب و جوار میں سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے زیادہ اہم قبائل ہیں- اس کے علاوہ شب‌قدر کے شمال مغرب میں ڈیورینڈ لائن کے ساتھ ساتھ مہمند بڑی اہم طاقت کے مالک ہیں- وہ اب بھی پہاڑوں کے مغرب میں افغانستان تک پھیلے ہوئے ہیں اور افریدیوں

(۱) پختو اور پشتو میں تربور (چچا زاد بھائی) دشمن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے-

اور محسود جیسے اہم قبائل سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر درد سر بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے گذشتہ چالیس سال میں محمد زئیوں اور یوسف زئیوں سے انتہائی زرخیز نہری زمینیں خریدی ہیں اور سرحد کا مقبول ترین قبیلہ بنتے جا رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ قبائلی آبادکاری کے زمانہ کو وقائع میں قبائلی لڑائیوں کا عہد قرار دے دیا گیا ہو اور اس میں کہیں کہیں بانکپن کے مظاہروں کی داستانیں شامل کردی گئی ہوں۔ پشاور اور مردان میں مہمندوں کا حالیہ داخلہ فوجی نہیں بلکہ اقتصادی نوعیت کا تھا۔ میرے خیال میں سولھویں صدی میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا البتہ اس وقت کوئی موثر حکومت نہ ہونے کی وجہ سے زور زبردستی سے کافی کام لیا گیا ہوگا۔ اس کے باوجود یہ قبائل انفرادی طور پر نہ سہی لیکن پورے قبیلہ کی حیثیت سے مذاکرات کے ذریعہ معاملات طے کرنے کی بڑی اہلیت رکھتے ہیں اور قبائلی لڑائیاں زیادہ عرصہ جاری نہیں رہتیں۔

ہمیں ان روایات کا جائزہ لیتے ہوئے بابر نامہ کو بھی سامنے رکھنا ہوگا جو نسبتاً زیادہ معتبر ہے۔ غلطی کی گنجائش رکھتے ہوئے قبائلی وقائع میں کابل اور پشاور کے درمیان وسیع پیمانے پر ہجرت اور آبادکاری کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ (قندھار سے کابل منتقل ہونے کے واقعات غیر یقینی ہیں) کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات ۱۴۸۵ء سے ۱۵۵۰ء یعنی الغ بیگ کے ایما پر کابل میں قتل عام سے شیخ تاپور کے مقام پر غوریہ خیل کی شکست تک تقریباً پنسٹھ سال کے عرصہ میں پیش آئے۔ اس عرصہ میں وقائع میں مندرجہ ذیل اہم واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ۱ - قریباً ۱۵۲۵ء میں شمال کے علاقہ میں خخوں کے مقابلہ پر دلہ زاک کی شکست۔ ۲ - کچھ عرصہ پہلے یعنی اندازاً ۱۵۱۵ء میں خخوں کا قبضہ۔ ۳ - قریباً ۱۵۳۰ء میں شیخ ملی کا بندوبست اراضی۔ ۴ - ۱۵۳۵ء میں جنوبی علاقہ میں غوریہ خیل کے ہاتھوں دلہ زاک کی شکست اور ۵ - قریباً ۱۵۵۰ء میں خخوں کے مقابلہ پر غوریہ خیل کی شکست۔ ان میں سے بیشتر واقعات ۱۵۱۵ء اور ۱۵۳۵ء کے درمیان پیش آئے۔ اس عرصہ میں بابر چار مرتبہ سرحدی علاقہ سے گزرا۔ ۱۵۱۹ء میں وہ طویل عرصہ تک سوات میں مقیم رہا یوسف زئی دوشیزہ بی بی مبارکہ سے شادی کی اور سمہ سے گزرا۔ اسے اس علاقہ کے متعلق اتنی معلومات تھیں کہ اس نے یہاں کے خوبصورت مقامات کے متعلق ہمارے لئے ایک طرح گائڈ بک چھوڑی ہے۔ وہ پشاور

اور آس پاس کے علاقوں سے بھی خوب واقف تھا۔ لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ حضرت شعیب حضرت موسیٰ کے زمانہ کی طرح اس زمانہ میں بھی لوگوں نے بڑی تعداد میں ہجرت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم پوری کہانی پر من و عن یقین نہیں کر سکتے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ بہت سے قبیلے جن کا تذکرہ بابر نے ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے اور جن میں سے اکثر اس زمانہ میں بھی ان ہی علاقوں پر قابض تھے جن پر آج ہیں اس وقت جبکہ بابر ان علاقوں سے گزرا تو یہ قبائل شروع شروع میں آباد ہو رہے تھے۔

بابر کی پوری کتاب میں صرف ایک ہی عبارت ہے جو پہلے نقل کی جا چکی ہے جس کے متعلق دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے قبائل کی مبینہ نقل و حرکت کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس عبارت میں بابر یہ بتاتا ہے کہ باجوڑ سوات ہشت نگر اور پشاور کسی زمانہ میں کابل کی حکومت کے زیر اقتدار تھے لیکن اب یہاں کسی کی حکومت نہیں ہے۔ ہمیں اس عبارت سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ بابر کے زمانہ میں قبائل ان علاقوں میں نئے نئے آئے بلکہ اسے ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کی تصدیق سمجھنی چاہئے وہ یہ کہ پندرھویں صدی کے آخیر میں تیموری سلطنت رُو بہ زوال تھی اور طاقتور اور ناقابل گزر قبائلی علاقوں پر اس کا زور نہیں چلتا تھا۔

بابر نامہ اور قبائلی وقائع کے موازنہ سے ایک اور قیاس کی گنجائش نکل آتی ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ایک طرف قندھار شہر سے اور دوسری طرف یوسف زئیوں سے جن میں اس نے شادی کی تھی بابر کو گہری دلچسپی تھی۔ یوسف زئیوں کے اس دعوے کے متعلق کہ وہ قندھار سے آئے ہیں بابر کی کیا رائے تھی؟ یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر نے کبھی یہ سنا تھا کہ قندھار کسی زمانہ میں وادی پشاور کا نام تھا اور آیا بابر کو ناموں کا یہ اتفاق عجیب معلوم ہوا تھا یا نہیں۔ اس سلسلہ میں بابر نامہ میں ایک بھی جملہ درج نہیں ہے۔ غالباً بی بی مبارکہ کو قبائل کی اصل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اس مسئلہ پر بابر کی خاموشی کو کسی دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا اور اس کی عبارت کی اس سے زیادہ بال کی کھال نکالنا عبث ہے۔

جو لوگ قبائلی روایات کو من و عن درست تسلیم کرتے ہیں وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ دلہ زاک جنہیں یوسف زئی خلیل اور مہمند قبائل نے مبینہ طور پر اپنے علاقہ سے بالکل نکال دیا تھا افغان قبیلہ تھا البتہ سڑبنی نسل سے نہیں تھا۔ دلہ زاک کو کرلانی یعنی افریدیوں اورک زئیوں، خٹک، وزیر اور دیگر قبائل کا قرابت دار بتایا جاتاہے۔ ان وجوہ کی بنا پر جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں میں نہ یہ ماننے کو تیار ہوں کہ بابر کے زمانہ میں پشاور کے علاقہ کی پوری آبادی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوگئی نہ یہ تسلیم کر سکتا ہوں کہ شیخ تاپور کے مقام پر خخوں نے غوریہ قبائل کو شکست فاش دی۔ ان میں سے ایک بھی نظریہ قابل قبول نہیں۔

جب ہم بعد کے زمانہ یعنی عہد اکبری میں داخل ہوتے ہیں تو اچانک ایک نیا قبیلہ منظر عام پر آتا ہے۔ یہ اتنا اہم قبیلہ ہے کہ اس کے سردار کو اکبر بادشاہ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کے گھاٹ سے قریب قریب پشاور تک شاہراہ کا محافظ مقرر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قبیلہ جنوب میں بنوں تک پھیلا ہوا ہے اور جس نے تھوڑے عرصہ بعد ان زمینوں پر بھی قبضہ کرلیا جو مسلمہ طور پر یوسف زئیوں کی ملکیت تھی۔ تیس چالیس سال بعد کے زمانہ پر نظر ڈالئے تو اسی قبیلہ سے جس کا پہلے کسی نے نام نہیں سنا تھا پٹھانوں کی تاریخ کا سب سے زیادہ مشہور جنگجو شاعر منظر عام پر آتا ہے۔ قبیلہ کا نام خٹک اور شاعر کا نام خوشحال خان ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ خٹک بھی باھر سے آئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ کسی زمانہ میں بنوں اور ٹوچی پر خٹک قبیلہ کا قبضہ تھا۔ لیکن اکبر کے زمانہ تک یہ قبیلہ اکوڑہ کے آس پاس قدم جمائے ہوئے تھا۔ ایسا قبیلہ جو شمال سے جنوب تک ڈیڑھ سو میل کے علاقہ پر قابض ہو راتوں رات پیدا نہیں ہو جاتا۔ اس موقع پر ہمیں دارائے اعظم کی سلطنت کا صوبہ تھتاگوش یاد آجاتا ہے۔

اگر خلیل اور مہمند قبائل نے واقعی دلہ زاک کو دریائے سندھ کے پار بھگا دیا تھا تو ان فتح مند قبائل نے اٹک تک کے علاقہ پر قبضہ کیوں نہیں کیا؟ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ خٹک وھی لوگ ہیں جنہیں اس موقع پر قبائلی وقائع میں دلہ زاک بتایا گیا ہے۔ دلہ زاک کی

طرح خٹک بھی کرلانی ھیں۔ ان کی طرح یہ بھی یوسف زئیوں سے لڑتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یوسف زئی اور خٹک قبائل کی آپس کی لڑائیاں خوشحال خان کے زمانہ (۱۶۱۳-۸۹ء) تک جاری رھیں۔ خوشحال کے والد دادا اور پردادا اکوڑے ان ھی لڑائیوں میں مارے گئے۔ میرے خیال میں دلہ زاک کے خلاف خخے اور غوریہ قبائل کی لڑائیوں کے متعلق وقائع نگاروں کا بیان اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ قبائلی اختلافات کو روایتی اور نیم افسانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی قسم کی مثالیں خٹک اور یوسف زئی قبائل کی روایات میں بھی ملتی ھیں۔

ایک اور دلچسپ بات توجہ طلب ہے۔ پشاور سے تقریباً دس میل جنوب مشرق میں مہمند تپہ اور خٹک قبیلہ کے علاقہ کے درمیان تین بڑے بڑے گاؤں ارمڑ بالا، میانہ اور پایان آباد ھیں۔ یہاں کے باشندے اپنی زبان ارمڑی بھول چکے ھیں اور اب صرف پختو بولتے ھیں لیکن یہ لوگ غالباً اصلی ارمڑی نسل کے نمائندے ھیں۔ جیسا کہ ھمیں معلوم ہے اس قبیلہ کے مورث اعلیٰ کو قبائلی نسب نامہ میں نحوست کے ساتھ شامل کیا گیا ہے اور متبنیٰ سڑبنی قرار دیا گیا ہے جس نے بعد میں ایک اور بچہ کو متبنیٰ بنا لیا اور یہ بچہ تمام کرلانیوں کا مورث اعلیٰ قرار پایا۔ اس قبیلہ کی محض موجودگی وادی پشاور میں جو ایک کھولتا ھوا کڑھاؤ ہے کسی بھی قبیلہ کے خالص ھونے کے دعوے کو باطل قرار دے دیتی ہے۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تاریخ نے وادی پشاور میں الٹ پلٹ اور نسلی آمیزشوں کے بہت سے مناظر دیکھے ھیں۔ یہ بات بھی یقینی ھے کہ بہت سے قبائل ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل ھوئے ھیں کیونکہ بہت سے پٹھان قبائل میں یہ روایت اب تک زندہ ہے کہ وہ کسی زمانہ میں خانہ بدوش تھے۔ اس کے علاوہ یکے بعد دیگرے کئی فاتح اپنی فوجوں کے ساتھ اس علاقہ سے گزرے ھیں۔ لیکن میں سرحدی علاقہ کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ ماننے کو تیار نہیں ھوں کہ ایک کہنہ مشق شاعر نے قبائل کو شطرنج کے مہروں کی طرح بڑی صفائی کے ساتھ قندھار، غزنی یا کابل سے اٹھایا اور اتنی ھی صفائی کے ساتھ ان علاقوں میں رکھدیا جہاں وہ آج کل پائے جاتے ھیں۔ در اصل قبائل سمندر کے پانی کی طرح ھیں۔ طوفانی لہریں آتی ھیں اور سطح سمندر کا

سکون مٹا جاتی ہیں۔ یہ لہریں ہوا کے ساتھ بجی کھچی چیزیں ساحل پر لے آتی ہیں اور ہر طرف جھاگ اڑا دیتی ہیں لیکن پانی جو اصل عنصر ہے دوسری چیزوں کے ساتھ ملتا ضرور ہے پھر بھی پانی ہی رہتا ہے۔

فصل سیزدهم

(مقلد اور غیر مقلد)

وادی پشاور میں قبائلی آبادکاری کی کہانی کتنی ہی بڑھا چڑھا کر کیوں نہ بیان کی گئی ہو اس سے کم از کم ایک بات ضرور واضح ہوجاتی ہے وہ یہ کہ بابر کے زمانہ تک تیموری خاندان اس علاقہ میں، یہاں تک کہ وادیوں یا بڑی شاہراہوں پر بھی کوئی منظم مملکت قائم نہیں کر سکا تھا۔ بابر نامہ سے بھی اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بابر نے طویل عرصہ سرحدی علاقہ میں گزارا تاکہ وہ آگے بڑھ کر ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے اس علاقہ میں ایک مضبوط بنیاد قائم کر سکے لیکن اس کی سرگرمیاں پورے علاقہ کے طول و عرض میں پھیرے لگانے تک محدود رہیں۔ سکندر کی طرح اسے بھی ایک عظیم حملہ آور کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس نے اس علاقہ میں کوئی مضبوط نظم و نسق قائم کیا۔ اس نے مصلحت یہی سمجھی کہ ازدواجی اور دوسرے رشتوں کے ذریعہ طاقتور قبائل کے ساتھ تعلقات قائم کئے جائیں لیکن اسے بار بار دوسری طرف توجہ دینی پڑتی تھی (مثلاً بنگش کا معاملہ) جس کی وجہ سے وہ ان لوگوں پر فتح نہیں پا سکا جن سے وہ معاملات طے کر رہا تھا۔ اس نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ ''مجھے اس علاقہ کے بندوبست پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی''۔ اس نے پٹھانوں کو اتنا متاثر ضرور کیا ہے کہ ان کی ایک فوج ہندوستان پر حملہ کے لئے اس کے ساتھ ہوگئی لیکن اس کے علاوہ اور کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور جب ۱۵۲۶ء میں وہ اس تخت پر بیٹھا جس کے خواب وہ عمر بھر دیکھتا رہا تو اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ بادشاہ بننے کے بعد صرف چار سال زندہ رہا۔ اس نے یہ چار سال بھی پشاور کوہاٹ یا بنوں میں نہیں بلکہ

کسی اور جگہ گزارے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔ ہمایوں ہندوستان کا مالک بن بیٹھا اور اس کے چھوٹے بھائی کامران نے کابل، قندھار، غزنی اور دریائے سندھ تک پھیلے ہوئے باج گزار علاقے ھتھیالئے۔ کامران جو برائے نام اپنے بھائی کا مقرر کردہ حاکم تھا اس کا بدترین دشمن ثابت ہوا اس نے نئی نئی وجود میں آئی ہوئی مغلیہ سلطنت کو مضبوط بنانے کی بجائے سرحدی قبائل پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے دریائے سندھ کے کناروں پر بے چینی پھیلا دی اور پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ ادھر ہمایوں کو بھی تخت پر بیٹھ کر اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ لودھی سلطنت کے عہد کے بچے کھچے بہت سے طالع آزما غلجی اور پٹھان سپاھی غاصب مغل (کم از کم اس وقت ایسا ھی معلوم ھوتا تھا) کے مقابلہ میں ہندوستان کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ محض موقع اور لیڈر کے منتظر تھے۔

یہ لیڈر نامور شیر شاہ کی شکل میں نمودار ہوا جو خود بھی لودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ بہادری میں ہمایوں کا ہمسر تھا لیکن جہاں ہمایوں سادہ لوح تھا وھاں شیر شاہ بڑا دور اندیش تھا۔ ۱۵۳۹ء میں ہمایون نے اپنے حریف کے ھاتھوں جو اس سے کہیں زیادہ ہوشیار تھا شکست کھائی اور سندھ کے راستے فرار ہوکر ایران کی راہ لی۔ اس کے بھائی کامران نے اس سے آنکھیں پھیر لیں اسے کابل اور غزنی نہیں جانے دیا یہاں تک کہ پنجاب میں بھی داخل ہونے سے روک دیا۔ ۱۵۴۵ء تک ادھر ادھر مارے پھرنے کے بعد ہمایون ایران کی مدد سے قندھار اور کابل اپنے بھائی سے واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔ کامران کو غوریہ خیل خلیل اور مہمند قبائل کی مدد پر بھروسہ تھا کیونکہ اس نے پشاور کے آس پاس زمینیں حاصل کرنے میں ان قبائل کو مدد دی تھی۔ ۱۵۵۱ء تک کامران اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اس سال کامران کے ایما پر خلیل اور مہمند قبائل نے ننگرھار میں ہمایوں کے کیمپ پر شبخون مارا۔ اس موقع پر ایسی ھی دست بدست لڑائی ہوئی جیسی ۱۸۹۶ء میں وانا پر محسود قبائل کے حملہ کے موقع پر ہوئی۔ قبائل ہمایوں کے کیمپ میں گھس گئے انہوں نے ہمایوں کے ایک اور بھائی ھندال کا پورا سر تلوار

سے چیر کر اسے ہلاک کر ڈالا۔ لیکن اس موقع پر ہمایوں نے جس ثابت‌قدمی کا مظاہرہ کیا اس کی بنا پر قبائل پسپا ہونے پر مجبور ہوگئے۔ ہمایوں حملہ کا شور سنتے ہی خیمہ سے نکلا اور اس نے کیمپ کے درمیان گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی فوج کو جمع کرنا شروع کردیا۔ اس لڑائی کے بعد کامران نے اندازہ کرلیا کہ اب دریائے سندھ کے مغرب میں افغان دوستوں کے ساتھ رہنا مشکل ہے چنانچہ اس نے لاہور میں شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ کے پاس پناہ لی۔ اسلام شاہ ۱۵۴۵ء میں دھلی کے تخت پر بیٹھا تھا اور کامران کو جس نے لڑے بھڑے بغیر پنجاب شیر شاہ کے حوالہ کر دیا تھا یہ توقع تھی کہ اسے کم از کم پناہ تو ضرور مل جائے گی۔ لیکن جب اس کا ایسا استقبال نہیں ہوا جیسا کہ متوقع تھا تو اس نے شمالی پنجاب کے ایک سردار آدم خان کے پاس پناہ لی ' سور خاندان کی فوجیں اس سردار کے علاقہ میں تھوڑے ہی عرصہ میں دو مرتبہ تباہی مچا چکی تھیں کیونکہ شمال کی طرف سے حملوں کی روک تھام اور اس علاقہ کی نگرانی کے لئے قلعہ روھتاس ان ہی دنوں بن کر تیار ہوا تھا۔ چنانچہ آدم خان ہمایوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اپنے مہمان کو اس کے حوالہ کرنے پر رضامند ہوگیا۔

اس زمانہ میں ہمایوں جو اپنے بھائی سے کابل چھین چکا تھا بابر کی طرح قبائلی علاقہ سے راستہ نکالنے میں مصروف تھا تاکہ وہ ہندوستان پر حملہ کرکے اپنا تخت واپس لے سکے۔ ہمایوں کو یہ بھروسہ نہیں تھا کہ وہ پشاور کے قبائل کے ساتھ نپٹ سکے گا چنانچہ وہ کرم بنگش کے راستے آگے بڑا۔ دُرسمند کے قریب گھمسان کی لڑائی ہوئی جس کے بعد آدم خان کا یہ پیغام پہنچا کہ کامران اس کے بس میں ہے اور اگر بادشاہ اس کے علاقہ میں آجائے تو کامران کو اس کے حوالے کردیا جائے گا۔ ہمایوں دریائےسندھ عبور کر کے مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ اس نے کامران کی آنکھیں نکلوادیں اور اسے مکہ معظمہ جانے کی اجازت دے دی جہاں وہ تین سال بعد فوت ہوگیا۔

ونسنٹ سمتھ نے اس واقعہ کی ہولناک تفصیلات اتنے موثر انداز میں بیان کی ہیں کہ میں یہاں انہیں دوہرانا نہیں چاہتا۔ یہ واقعہ اس عہد کے حالات کا آئینہ ہے۔ اس سے بہ یک وقت ظلم رحم صبر اور شرم کا اظہار

ہوتا ہے۔ دشمن کو اندھا کرنا ترک نسل کے بہت سے حکمرانوں کا معمول رہا ہے وہ جی کڑا کر کے دشمن کی جان نہیں لے سکتے تھے لیکن یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی اور خاص طور پر ان کا سوتیلا بھائی ان کا مقابل بن جائے۔ کچھ صفوی بادشاہوں نادرشاہ اور قاچار بادشاہوں نے جو ایران کے حکمراں تھے لیکن ترکی النسل تھے اس شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ سدوزئی افغان شاہ محمود نے جب بخارا میں پناہ لی تو اس کے سامنے ایک شخص کو اسی طرح اندھا کیا گیا اور وہ اس سے لطف اندوز ہوا۔ اس کے بھائی شاہ زمان نے اپنے ایک اور بھائی کے ساتھ جسے اس نے پنجاب کے مقام لیٹہ میں گرفتار کیا تھا یہی حرکت کی جس کی پاداش میں اسے اپنی آنکھوں سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن دشمن کو تڑپتا دیکھنے کے لئے اسے ایذا پہنچانا یا نظم و نسق کی خاطر ایسی حرکت کرنا پٹھانوں کا شیوہ نہیں۔ جب انہیں کسی سے کدورت ہوتی ہے تو اس کا اظہار بلیوں کی طرح نہیں بلکہ مردانہ تشدد کی شکل میں ہوتا ہے۔

کامران کے راستہ سے ہٹنے اور ۱۵۵۴ء میں اسلام شاہ کی وفات کے بعد ہمایوں نے دہلی فتح کرلی اور صرف چھ مہینے تخت پر بیٹھا۔ آخرکار جنوری ۱۵۵۶ء میں وہ اپنی لائبریری کے زینہ سے اترتے ہوئے پھسل کر نیچے گرا اور ہلاک ہوگیا۔ وہ کبھی طاقتور بادشاہ نہیں تھا اور بابر کی طرح سرحدی علاقہ کے ساتھ اس کے تعلقات بھی اس علاقہ سے راستہ نکالنے تک محدود تھے۔ ۱۵۵۲ء میں کامران کی گرفتاری کے بعد اس نے پشاور اور خیبر کے راستوں پر اختیار رکھنے کے لئے کچھ اقدامات ضرور کئے۔ اس نے بگرام (پشاور) کے قلعہ کی مرمت کرائی اور ایک قازق جنرل سکندر کو اس کا حاکم مقرر کیا۔ قلعہ میں بہت بڑی فوج رکھی گئی تاکہ قبائل کو مرعوب کیا جا سکے۔ لیکن جوں ہی بادشاہ نے کوچ کیا خان کجو نے (یہ اسی کے زمانے کا واقعہ ہے) ایک بڑی فوج لے کر بگرام کا محاصرہ کر لیا لیکن اسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا کیونکہ وہ توپخانہ کے بغیر شہر فتح نہیں کر سکا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بابر اور ہمایوں کی اموات کے درمیان پچیس سال کے عرصہ میں دریائے سندھ کے پار کا پورا علاقہ جس میں وادی پشاور

اور میدان اور پہاڑی علاقے شامل ہیں مغلوں کے زیر اقتدار نہیں رہا۔ کامران جو کابل پر قابض تھا محض اپنی مقصد برآری اور اپنے بھائی سے تخت چھیننے کی کوشش میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اسے قبائل سے فوجی امداد ملتی رہے۔ پشاور میں اس کا اقتدار صرف اس حد تک محدود تھا جو خلیل اور مہمند قبائل نے مقرر کر رکھی تھی یہ اقتدار بھی برائے نام صرف شہر اور لنڈائے دریا کے جنوب میں شاہراہ تک محدود تھا۔ یوسف زئی قبائل جن کا لیڈر کجو تھا اس اقتدار کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ہمایوں ۱۵۵۲ء تک اس راستہ سے نہیں گزرا۔ اس نے بنگش کا راستہ اختیار کیا جو بری حالت میں تھا۔ وہ بڑی مشکل سے عین وقت پر بگرام (پشاور) کو قبائل کے حملہ سے بچا سکا۔ دھلی کے سُور بادشاھوں کی سلطنت صرف بنوں کے مشرق میں دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی جہاں وہ بعد از خرابی بسیار عیسیٰ خیل کے علاقہ میں نیازیوں پر اپنا اقتدار جمانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ شمال کی طرف ان کی سلطنت کی سرحد درۂ مارگلہ تھا جو راولپنڈی سے تھوڑی دور مغرب میں واقع ہے۔ سُور بادشاھوں نے اپنا سرحدی قلعہ روھتاس کے مقام پر بنوایا تھا اور وہ پٹھانوں سے نہیں بلکہ پنجابی قبائل سے مصروف پیکار تھے۔ بنوں اور ڈیرہ جات پر کسی کا اختیار نہیں تھا کسی حکمران نے تیراہ یا وزیرستان پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور بابر کے بعد کوئی بادشاہ سوات دیر اور باجوڑ میں داخل نہیں ہوا۔ بادشاہ کے کوچ کرتے ھی پشاور کا محاصرہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شاھی اقتدار برائے نام تھا۔ اگر کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے تو وہ یہ کہ اسی زمانہ میں شیخ ملی نے قبائلی انداز پر زمینوں کا بندوبست کیا۔ درحقیقت بابر کامران اور ھمایوں کے عہد میں پٹھانوں کے میدان یا پہاڑی علاقہ پر مغلوں کی حکومت نہیں تھی۔ ان حکمرانوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ بڑی مشکل سے اس علاقہ سے اپنے لئے راہ نکالی اور خاندانی لڑائیوں میں قبائل سے فوجی امداد حاصل کی۔ شیر شاہ خود غلجی ہونے کے باوجود اتنی بھی کامیابی حاصل نہیں کرسکا تھا۔

ان حالات میں اکبر جو اشوکا کے بعد ہندوستان اور ملحقہ علاقوں کا سب سے زیادہ عظیم المرتبت حکمراں ہوگزرا ہے ۱۵۵۶ء میں چودہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ یہ بات ناقابل یقین سہی لیکن درست ہے کہ ھمایوں جسے اپنے بھائی کامران کے ساتھ لڑائیوں کا بڑا تلخ تجربہ تھا

ایک فرمان کے ذریعہ اس نے اپنے بیٹے اکبر کے لئے ویسی ہی مشکلات پیدا کر دیں جن سے وہ خود دوچار ہو چکا تھا۔ ھمایوں کی وصیت کے مطابق کابل کی حکمرانی اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم کے حصہ میں آئی۔ ھمایوں کی وفات کے وقت حکیم کی عمر بہ مشکل تین سال تھی۔ اس وقت اکبر بھی کم سن تھا اس لئے یہی قیاس کیا جا سکتا ھے کہ باپ نے دوراندیشی سے کام نہیں لیا اور ھمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کی کمسنی کے سوا اور کسی بات پر غور نہ کر سکا۔ یہ حقیقت ھے کہ کابل کا صوبہ جس میں دریائے سندھ تک پھیلا ھوا علاقہ شامل تھا سرکاری طور پر آزاد علاقہ نہیں تھا بلکہ دھلی کے سلطان کے تحت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن انتظامی ڈھانچہ بالکل ویسا ھی قائم کیا گیا تھا جس کی بنا پر خانہ جنگی ھو چکی تھی چنانچہ ایک بار پھر خانہ جنگی ھوئی۔ درحقیقت اکبر ۱۵۸۱ء تک دریائے سندھ کے پار کسی علاقہ پر حکومت نہیں کر سکا۔ اسے ان علاقوں پر مکمل اقتدار ۱۵۸۵ء میں اپنے بھائی حکیم کی وفات کے بعد حاصل ھوا۔

شروع میں حکیم محض تین سال کا بچہ تھا اور اس بات کی کوئی اھمیت نہیں تھی کہ اسے ورثہ میں ایک وسیع علاقہ کی حکومت ملی ھے۔ چنانچہ سندھ کے پار کے علاقہ کا انتظام ھمایوں کے دربار کے ایک بڑے سردار منعم خاں کے ھاتھوں میں رھا جو اکبر کا اتالیق رہ چکا تھا۔ چار سال بعد جب ۱۵۶۰ء میں بیرم خاں فتنہ پرداز عورتوں کی ایک سازش کا شکار ھوگیا۔ تو منعم خاں کو اس کی جگہ لینے کے لئے کابل سے بلا لیا گیا۔ وہ بیرم کی جگہ دھلی میں خان خانان مقرر ھوا۔ منعم کے دھلی جانے کے بعد کابل کا اقتدار مرزا حکیم کے ماموں فریدون کے ھاتھ آیا۔ یہ سب کچھ بھی ایشیا کے حکمرانوں کی خاندانی روایات کے عین مطابق ھوا۔ ایک بادشاہ اپنی مختلف بیویوں سے دو بیٹے چھوڑ کر مرتا ھے۔ چھوٹے بیٹے کی ماں جو غالباً خود بھی مرحوم بادشاہ کی منظور نظر رہ چکی ھے اپنے بیٹے کو اس کے بڑے سوتیلے بھائی کے مقابلہ پر لانے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتی ھے۔ وہ اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے قدرتی طور پر خود اپنے عزیزوں کی طرف رجوع کرتی ھے۔ اس طرح حکیم کے بچپن میں کابل اور اس کے باج گزار علاقوں کے اصل حکمران اس کی والدہ اور ماموں فریدون تھے۔

۱۵۵۶ء میں سرحدی علاقے میں افرا تفری پھیلی ہوئی تھی۔ کامران مرچکا تھا اور ہمایوں کو امن و امان قائم کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ چنانچہ قبائل میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ ۱۵۵۶ء سے ۱۵۸۱ء تک ربع صدی کے آخری حصہ میں بھی جب حکیم نے جو اب تک اپنے ماموں فریدون کے ذریعہ حکومت کر رہا تھا کابل کی عنان حکومت خود سنبھال لی حالات بہتر نہیں ہوئے۔ وادی پشاور میں فریدون یا حکیم لنڈائے دریا کے شمال میں یوسف زئی علاقہ میں اقتدار قائم نہیں کر سکے۔ دوآبہ اور ہشت نگر پر ان کا اقتدار برائے نام تھا لیکن پشاور کے قریب بھی حکومت کمزور تھی اور اقتدار منوانا اس بات پر منحصر تھا کہ اس کے لئے کتنی فوج مہیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اکبر نے اس علاقہ کی کوئی فکر نہیں کی۔ وہ ہندوستان کے زرخیز صوبوں میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے اور اپنا اقتدار جمانے میں اتنا مصروف تھا کہ سرحدی علاقوں پر توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال اپنے سوتیلے بھائیوں کے سرپرستوں اور مشیروں کو سرکش قبائل سے نپٹنے دیا جائے۔ لیکن جب حکیم سن شعور کو پہنچا تو اکبر کی پالیسی تبدیل ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ تو مذہبی معاملات کے متعلق اکبر کا رویہ اور دوسری وجہ اس کے بھائی کی سرگرمیاں تھیں۔ لیکن ایک تیسری وجہ بھی تھی جو سب سے زیادہ فیصلہ کن تھی لیکن جس پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور وہ سرحدی علاقہ میں ایک نئی تحریک تھی۔ یہ تحریک حکیم کے میدان عمل میں آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس کا تعلق مذہب سے تھا۔

مرزا کامران اور اس کے بعد مرزا حکیم کے عہد میں سرحدی علاقہ میں دو مذہبی پیشوا نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک تو کٹر حنفی سنی تھا اور دوسرا انتہائی غیر مقلد۔ ان میں سے پہلے کا نام سید علی شاہ ترمذی ہے۔ جو اب تک پیر بابا کے نام سے مشہور ہیں اور دوسرے بایزید (یا بازید) انصاری ہیں جو روشنیہ تحریک کے بانی ہیں وہ خود کو پیر روشن کہلاتے تھے لیکن ان کے مخالف انہیں طنزاً پیر تاریک اور ان کے مقلدوں کو تاریکی کہتے ہیں۔

پیر بابا کے حالات یہ ہیں۔ آمو دریا کے کنارے ایک قصبہ ترمذ

ہے وہاں کے ایک صاحب قمبر علی اپنی اہلیہ اور صاحبزادے علی کے ساتھ ہندوستان آئے اور بابر اور ہمایوں کے دربار میں ملازم ہوگئے۔ علی طالب علم بن گئے اور ۱۵۴۰ء میں ان کے والدین اپنے معزول بادشاہ کی معیت میں سندھ کے راستے فارس روانہ ہوئے تو علی پنجاب کے شہر گجرات ہی میں رہ گئے۔ بعد میں گگیانی قبیلہ کے دو ملاؤں نے انہیں ترغیب دلائی کہ وہ پشاور کے قریب دوآبہ کے علاقہ میں پہنچیں اور وہاں زندقہ پھیلنے سے روکیں۔ علی کچھ عرصہ پٹھانوں میں رہے۔ پھر انہیں وطن کی یاد نے ستایا اور انہوں نے ترمذ (ازبکستان) میں اپنے دادا سید احمد کے گھر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ جنہوں نے ان کی پرورش کی تھی اور جن کے ایما پر وہ دینیات کی طرف مائل ہوئے تھے۔ گگیانی ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس علاقہ سے چلے جائیں چنانچہ دولت نامی ایک ملک نے اپنی بہن مریم ان کے عقد میں دے دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصہ یہیں قیام کریں۔ بعد میں وطن کی محبت پھر جاگ اٹھی اور وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر ترمذ روانہ ہو گئے۔ ترمذ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ان کے دادا اور والد وفات پا چکے ہیں لیکن ان کی والدہ فارس کے راستے وطن واپس پہنچ چکی تھیں اور حیات تھیں وہ ایسی خاتون تھیں جو کوئی حیلہ بہانہ سننے کو تیار نہیں تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو واپس جانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ لیکن وہ دوآبہ کی بجائے جہاں گنداب کے راستے آنے جانے والے قافلوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اپنے رہنے کے لئے کسی پر سکون جگہ کے متلاشی تھے۔ انہیں بنیر کے ایک گوشہ میں پاچا کے قریب ایسی جگہ مل گئی۔ وہ وہیں آباد ہوگئے اور اب وہیں مدفون ہیں۔ ان کا نام آج بھی بڑی تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور ان کا مزار سرحدی علاقہ کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے ہر طرح کے لوگ ان کے مزار پر زیارت کے لئے آتے ہیں۔ مردان میں اب سے تیس سال پہلے عام طور پر عدالت میں حلفیہ بیان اس جملہ سے شروع ہوتا تھا ”جب میں پیر بابا کی زیارت کے لئے جا رہا تھا (یا زیارت سے واپس آ رہا تھا)

پیر بابا کا مزار اس سلسلہ کوہ کی ترائی میں جو درۂ کڑاکڑ سے دس میل مشرق میں بنیر کو سوات سے جدا کرتا ہے ایک صاف شفاف

چشمہ کے کنارے واقع ہے۔ مزار کے قریب شمال میں ایک اور درۂ ہے جس سے گزر کرنے پر براہ راست سیدو شریف پہنچ سکتا ہے۔ یہ مقام الگ تھلگ اور پرفضا ہے گاؤں کے عقب میں 'دودسرہ'، اور 'ایلم' کی پہاڑیاں پہریداروں کی طرح سر اٹھائے کھڑی ہیں شمال میں جنگلوں سے ڈھکی ہوئی چٹانیں ہیں جو شمال کی طرف وادی کو بند کئے ہوئے ہیں۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ بنیر کے قبائل میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ کون سی پہاڑ کی چوٹی زیادہ اونچی ہے (۱)۔ یہ جھگڑا ابھی تک طے نہیں ہوا۔ پرانا مقبرہ منقش لکڑی کی بنی ہوئی بوسیدہ سی عمارت ہے اس میں پیر بابا اور ان کے قریبی مرید کی قبریں ہیں۔ جس طرح یہ جھگڑا باقی ہے کہ کون سی پہاڑی اونچی ہے اسی طرح کچھ لوگوں میں اس بات پر حجت چلی آتی ہے کہ کون سا مزار پیر کا اور کون سا مزار مرید کا ہے۔ مقبرہ کے قریب ہی عقیدت مندوں نے ایک نئی مسجد اور مینار بنوائے ہیں پوری عمارت پر پلاسٹر کیا ہوا ہے اور نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اس لئے مقبرہ سے اس کا تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ عمارت پتھروں اور منقش شہتیروں سے بنائی جاتی جیسا کہ اس علاقہ کے پرانے کاریگر (آج بھی) بنا سکتے ہیں مزار تک جانے والے راستہ پر محتاج اندھے اور کوڑھی بیٹھتے ہیں جس طرح وہ سیلوم کے تالاب کے کنارے آس لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ پاس کا گاؤں پورے مغربی پاکستان میں وہ واحد مقام ہے جہاں ہندو حتیٰ کہ سکھ بھی آج تک اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو مقام حقیقی معنی میں مقدس ہوتا ہے وہاں لوگوں میں خود بخود وسیع النظری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مقام بھی بڑا مقدس ہے اور اس کے تقدس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

پیر بابا کے ابتدائی مریدوں میں اخوند درویزہ بھی شامل تھے جو ننگرہار کے تاجک تھے۔ اخوند درویزہ اس لئے مشہور ہیں کہ وہ پختو کے سب سے پرانے مصنف ہیں جن کی تحریر آج تک موجود ہے اور انہوں نے روشنیہ عقائد کی مخالفت میں جن کی وجہ سے سولھویں صدی اور سترھویں صدی کی ابتدا میں سرحدی قبائل میں بے چینی پھیل گئی تھی

(۱) سروے کرنے والوں نے یہ طے کردیا ہے کہ ایلم کی بلندی نو ہزار دو سوفٹ اور دودسرہ کی بلندی دس ہزار فٹ ہے۔ لیکن اس سے تنازعہ ختم نہیں ہوا۔

بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن اخوند درویزہ کی تصنیف مخزن افغانی روشینہ عقائد رد کرنے کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں پیر تاریک جیسے طنزیہ فقرے جو خود مصنف کی ایجاد ہیں استعمال کئے گئے ہیں۔ اگر اکبر جیسا شہنشاہ جو عقائد کے اعتبار سے خود بھی بدعتی تھا سیاسی وجوہ کی بنا پر روشینہ تحریک کے خلاف پیش کی جانے والی دلائل کی حمایت نہ کرتا تو یہ دلائل روشنیہ تحریک کو خاموش نہیں کر سکتے تھے۔ یہ عجیب تضاد ہے کہ اسلام ایک طرف تو دوسرے مذاہب کے ساتھ انتہائی رواداری کا ثبوت دیتا ہے لیکن خود اسلام میں کسی قسم کی تحریف کرنے والوں کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ ملحد کو کافر سے بدتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ ایمان لانے کے بعد مرتد ہوا ہے۔

پیر بابا کی اولاد میں سے متعدد اشخاص یوسف زئیوں اور پٹھان علاقہ کے شمالی حصہ میں بسنے والے دوسرے قبائل میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک رہے ہیں۔ پورے خاندان کو صحیح النسب سیّد سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اخونددرویزہ جو پیر بابا کے مرید تھے ذات کے اعتبار سے سید نہیں تھے بلکہ تاجک تھے۔ تین صدیوں کے بعد ان ہی سادات نے سکھوں کے خلاف اور بعد میں انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے قبائل کو اپنے جھنڈے تلے جمع کیا۔ آج بھی ان میں سے بہت سے سادات قابل تعظیم سمجھے جاتے ہیں۔

بایزید (جنھیں بازید بھی کہا جاتا ہے) انصاری جو روشنیہ تحریک کے بانی ہیں ۱۵۲۵ء میں پنجاب کے قصبہ جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین کانیگروم کے رہنے والے تھے جو محسود وزیرستان کی بالائی بدر وادی میں تقریباً سات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پراسرار قصبہ ہے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ ان کی پیدائش کے تھوڑے عرصہ بعد ان کے والدین کانیگروم واپس آگئے جہاں ان کی پرورش ہوئی۔ کانیگروم میں ایک ایسا مقام ہے جہاں ارمڑ کافی تعداد میں محسود قبائل کے درمیان بسے ہوئے ہیں وہ ارمڑی زبان بولتے ہیں۔ انصار دراصل مدینہ منورہ کے قدیم باشندے تھے۔ جب حضرت محمد صلعم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو مدینہ کے جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا وہ انصار کہلائے۔ جو خاندان انصاری کہلاتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ عرب انصار کی اولاد

میں سے ھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے سید کہلانے والے اپنے آپ کو حضرت علی اور حضرت فاطمہ کے عقد کی وساطت سے پیغمبر کی اولاد قرار دیتے ھیں۔ بازید نے انصاری ھونے کا دعویٰ خود کیا تھا اور دوسرے بھی اس دعوے کی حمایت کرتے ھیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ھے حال آنکہ ارمڑ بعض وجوہ کی بنا پر اس کی تردید کرتے ھیں کہ بازید ارمڑ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ریورٹی جو اس قسم کی روایات کو تاریخی حقائق قرار دینے کے عادی ھیں لکھتے ھیں کہ بازید کے والد عبداللہ انصاری تھے لیکن وہ ایک ھی سانس میں یہ اعتراف کرتے ھیں کہ عبداللہ تاجک تھے اور ارمڑوں کے ساتھ رھتے تھے اور اس سے زیادہ یہ کہ وہ اس سے پہلے لوگر وادی میں بھی دوسرے ارمڑوں کے ساتھ رہ چکے تھے۔ اس علاقہ میں تاجک کا مفہوم عام طور پر اس سے زیادہ کچھ نہیں ھوتا کہ تاجک کہلانے والا پٹھان نہیں ھے۔ اگر عبداللہ ارمڑ نہیں تھا تو وہ ایک سے زیادہ مقاموں پر ارمڑ کے ساتھ کیوں رھتا رھا۔ ابھی ارمڑوں کی اصل کے بارے میں تحقیق باقی ھے لیکن مزید مطالعہ سے ظاھر ھوگا کہ کانیگرم میں ارمڑوں کے ساتھ بسنے والے بہت سے خاندان جو اپنے آپ کو سید یا انصاری بتاتے ھیں دراصل ارمڑ ھیں جنہوں نے خود پسندی کی بنا پر سید اور انصاری کے لقب اختیار کر لئے ھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک پٹھان خان کہلانا پسند کرتا ھے۔ انصاری کا لقب بھی اسلام میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈالنے والے کا مرتبہ بڑھانے کا ایک ذریعہ تھا۔ اگر بازید اور ان کے والد نسلی اعتبار سے ارمڑ نہیں تھے تو کم از کم وہ ارمڑوں کے ساتھ ان مقامات پر زندگی گزار چکے تھے جہاں آج بھی ارمڑوں کی آبادی ھے بازید نسلی اعتبار سے نہیں تو تربیت کے اعتبار سے یقینی طور پر ارمڑ تھے۔ میرا خیال ھے کہ انہوں نے اپنی مذھبی حیثیت بڑھانے کے لئے اور اس خیال سے کہ ان کی بات سنی جا سکے انصاری کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

بازید اور دو پشتوں تک ان کے اخلاف نہایت طبّاع اشخاص تھے اور لازمی طور پر انہوں نے لوگوں پر اپنا گہرا اثر ڈالا ھوگا۔ انہوں نے فوجیں جمع کیں اور حکومت وقت کے خلاف باقاعدہ جنگ کی۔ بازید نے اپنے عقائد کا اظہار اپنی تحریروں میں کیا ھے۔ ان میں سے خیرالبیان اور

خورپان زیادہ مشہور ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ کتابیں بڑی مقبول تھیں لیکن چونکہ ان میں ملحدانہ عقائد درج تھے اس لئے بعد میں کٹر حکام کے فرمان کے ذریعہ ان پر پابندی لگا دی گئی۔ میں نے سنا ہے کہ ان کتابوں کے نسخے اب بھی بہت سے لوگوں نے چھپا رکھے ہیں لیکن چونکہ عام طور پر ان کی حیثیت فحش کتابوں جیسی ہے اس لئے انہیں حاصل کرنا بڑا مشکل ہے بازید کے عقائد کا بیشتر حصہ اس کی اپنی اختراع ہے اور ان کی بنیاد ہمہ اوست کا صوفیانہ فلسفہ ہے اس عقیدہ میں اس نے اواگون بھی شامل کرلیا اس کے علاوہ مختلف فرقوں کے عقائد سے کچھ باتیں خاص طور پر امامت کا عقیدہ اپنا لیا۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اس کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ الوہیت مقدس ہستیوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور خاص طور پر اس کی (بازید کی) شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس نے اپنے مقلدوں کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ جو لوگ ان کے عقیدہ کے نہ ہوں انہیں لوٹ لیا جائے۔ اس سے بازید کے قبائلی مقلدوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔

ریورٹی اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ بازید کے عقائد اسماعیلی عقائد ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ اس نے یہ عقائد عہد شباب میں جالندھر کے مقام پر بدنام زمانہ ملا سلیمان سے حاصل کئے تھے جو جالندھر میں رہتا تھا (ایک روایت یہ بھی ہے کہ سلیمان سے بازید کی ملاقات سمرقند میں ہوئی تھی جہاں وہ گھوڑے خریدنے گیا تھا) اسماعیلی فرقہ جو اب آغا خان سے وابستہ ہے اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ نرم مزاج فرقہ ماناجاتا ہے کسی زمانہ میں اس فرقہ کے حششین کی پر اسرار سرگرمیاں مشہور تھیں۔ ان ہی کے نام سے یورپ کو لفظ اسسینیشن (ASSASINATION) ملا ہے۔ اسماعیلی فرقہ کے لوگ باقاعدہ شیعہ نہیں ہیں جو بارہ اماموں کو مانتے ہیں بلکہ ساتویں امام سے شیعوں اور اسماعیلیوں کا مسلک جدا ہو جاتا ہے اور اسماعیلی آغا خان کو ساتویں امام کا جانشین مانتے ہیں۔

ریورٹی لکھتے ہیں کہ عام طور پر کرلانی افغان اور خاص طور پر بنگش پیر روشن عرف پیر تاریک کے پیرو ہیں۔ بہت سے بنگش قبائل آج بھی علانیۃ یا خفیہ طور پر پیر روشن کے ہم عقیدہ ہیں۔ اس بنا پر انگریز مصنف جو حقائق اور دونوں عقیدوں کے فرق سے ناواقف ہیں انہیں شیعہ

قرار دیتے ھیں۔ حال آنکه شیعه انھیں ملحد سمجتھے ھیں البته شیعوں کو ان سے اتنی شدید نفرت نہیں ھے جتنی سنیوں کو ھے۔ انھیں اسماعیلی یا ملحد قرار دیا جا سکتا ھے کیونکه کئی اعتبار سے بایزید انصاری کے احکام حسن بن صباح اور آغا خان کے احکام سے مطابقت رکھتے ھیں۔ آغا خان وھی ایرانی شہزادہ ھیں جنھوں نے پچھلے دنوں بمبئی میں وفات پائی اور جنھیں ان کی زندگی میں اسماعیلی اپنا پیشوا مانتے تھے۔

ایک اور قرین قیاس نظریه یه بھی ھے که بایزید کے عقائد درحقیقت خارجی فرقه بندی کا احیا تھے۔ آپ کو یاد ھوگا که عباسی خلفا کے دور میں سیستان میں خارجی تحریک کا بڑا زور تھا۔ چنانچه خارجی لیڈر حمزہ نے جو خلیفۂ وقت کا مخالف تھا ۸۰۰ء میں بغاوت کردی تھی۔ ھمیں یه بھی معلوم ھے که اسی خارجی حمزہ نے گردیز شہر کی بنیاد ڈالی تھی جو لوگر اور کانیگرم کے درمیان سرحد پر واقع ھے۔ بازید ان دونوں شہروں میں متعدد بار آیا گیا تھا۔ یه نظریه صحیح معلوم ھوتا ھے۔ یه طے کرنا مذھبی پیشواؤں کا کام ھے که بایزید عقائد کے اعتبار سے ملحد تھا یا نہیں۔ اس موقع پر اتنا ھی کہہ دینا کافی ھے که اس سوال پر اتنے جغرافیائی تاریخی اور اصولی اتفاقات جمع ھوگئے ھیں که ایک نئے مذھبی فرقه کی اصل کے متعلق تحقیق کے لئے اچھا خاصا مواد فراھم ھوگیا ھے۔

ریورٹی اس بات کی تائید کرتے ھیں که آج جن قبائل کو شیعه بنگش، شیعه اورکزئی اور توری کہا جاتا ھے وہ در حقیقت روشنیه تحریک کے بچے کھچے لوگ ھیں جو تشیّع کے پردہ میں چھپے ھوئے ھیں۔ مجھے اورکزئی اور بنگش شیعوں سے طویل عرصه تک واسطه رھا ھے لیکن کبھی کسی نے علانیه یه اعتراف نہیں کیا که وہ واقعی روشنیه تحریک سے تعلق رکھتا ھے اگر کسی سے براہ راست یه سوال کیا بھی جائے تو وہ یقیناً نفی میں جواب دیگا۔ سنیوں کے برخلاف شیعه اخفائے راز کے عادی ھوتے ھیں اور وہ اپنے عقائد اور اصل کے متعلق بحث پر بڑی مشکل سے راضی ھوتے ھیں۔ مزید برآں جب روشنیه تحریک قطعی طور پر مردود قرار دے دی گئی تو عقائد پر پردہ ڈالنے کے لئے کچھ سیاسی اسباب بھی پیدا ھوگئے جو اب بھی موجود ھیں۔ ان واقعات سے قطع نظر مجھے ریورٹی کی اس رائے سے اتفاق ھے که تیراہ کی سرحد پر شیعه فرقه کی ابتدا سے

روشنیہ تحریک کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ روشنیہ فرقہ کے عقائد کا شروع میں خارجی یا اسماعیلی الحاد سے تعلق رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن آج اس علاقہ میں بسنے والے شیعوں کے جو عقائد ہیں ان کا خارجی یا اسماعیلی عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے روشنیہ فرقہ کے لوگوں نے مغلیہ دور میں دباؤ سے مجبور ہو کر اپنے عقائد چھپانے کے لئے خود کو شیعہ مشہور کردیا ہو لیکن ان کے اخلاف نے اصل عقائد فراموش کردئے اور رفتہ رفتہ شیعوں کے عام عقائد اپنالئے۔

بازید کے نئے عقائد کو ان کے والد عبداللہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ دونوں میں جھگڑا ہوا اور لڑائی تک کی نوبت آگئی۔ بازید شدید زخمی ہوا اور وہ دنیا ترک کرکے کانیگرم سے اوپر ایک غار میں زندگی بسر کرنے چلا گیا۔ جب پیغمبروں کی طرح اس کی بھی اپنے وطن میں بےعزتی ہوئی تو وہ فرار ہو کر ننگرہار چلا گیا جہاں مہمند آباد تھے اور وہاں سے خلیل اور محمد زئی قبائل کے پاس چلا گیا۔ اس نے پشاور اور هشت نگر کے آس پاس ان قبیلوں میں سے بہت سے لوگوں کو اپنا هم عقیدہ بنا لیا۔ شروع میں بہت سے یوسف زئی قبائل بھی اس کے عقائد کو ماننے لگے پھر پیر بابا کے مریدوں نے اس کی شدید مخالفت شروع کردی۔ اس مخالفت میں اخوند درویزہ پیش پیش تھے۔ بازید نے تیراہ کو اپنا صدر مقام بنا لیا جہاں افریدی، اورک زئی، خلیل، مہمند اور بنگش اس کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے کیونکہ اب یہ لڑائی کا جھنڈا بن چکا تھا اور وہ لڑائی کی تیاری کر رہے تھے۔ تیراہ میں قیام کے دوران بایزید نے مغل شہنشاہ اکبر کا تختہ الٹنے کے لئے قبائل کو صف بستہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ در حقیقت اسے مرزا حکیم سے مالی امداد مل رهی تھی جو کابل میں اکبر کا گورنر تھا۔ بایزید کو فریدون نے گرفتار کرلیا اور اس کے خلاف الحاد کے الزام میں کابل میں مقدمہ چلایا گیا لیکن مصلحت کی بنا پر اسے رها کردیا گیا کیونکہ کابل کی حکومت اس کے قبائلی مقلدوں سے خائف تھی۔ بایزید چھوٹی چھوٹی متعدد جھڑپوں میں فتح مند رہا۔ آخر مغل جنرل محسن خان نے ایک بڑی لڑائی میں جو ننگرهار میں برو کے مقام پر ہوئی، زبردست خون خرابہ کے بعد اسے شکست دی بایزید کی وفات کا سن عام طور پر ۱۵۸۵ء بتایا جاتا ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر جو آگے بیان ہوں‌گی وہ اس سے پہلے فوت ہوچکا ہوگا۔

بازید روشنی نے بڑا نام پایا ہے۔ اگرچہ یوسف زئی علاقہ میں قبائلی اس کے مخالف ہوگئے تھے لیکن اس کے بیٹوں اور پوتوں نے پہاڑی علاقہ میں بہت سے قبائل کی حمایت حاصل کرلی اور بہت دنوں تک آزادی کی ایک ایسی شان قائم رکھی جسے اکبر اور جہانگیر اپنی تمام کوششوں کے باوجود نہ مٹا سکے۔ ونسنٹ سمتھ کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ اس وقت جو فرقہ وارانہ جذبہ ابھارا گیا تھا وہ اپنی مذہبی شکل میں تو سرد ہوگیا لیکن اس سے وہ قبائلی جذبۂ آزادی قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی جس کی بدولت آج بھی بہت سے قبیلے داخلی طور پر خود مختار چلے آرہے ہیں۔

فصل چہاردھم

اکبر اعظم اور قبائل

میں ۱۹۴۷ء میں میاں گل، گل شہزادہ عبدالودود کے ھمراہ جو اس وقت ریاست سوات کے والی تھے سوات اور بنیر (۱) کے درمیان درۂ کڑاکڑ سے گزر رھا تھا۔ یہ درہ جس میں سے ھم گزر رھے تھےایک حسین خطہ ھے جو بیر کوٹ سے شروع ھو جاتا ھے۔ بیر کوٹ وھی مقام ھے جس کے متعلق خیال ھے کہ سکندر اعظم کے زمانہ کا قصبہ بزیرہ یہی تھا۔ شمال میں یعنی سوات کی طرف دیودار کے درختوں کا جھنڈ ھے۔ یہاں سڑک ایک چشمہ کے ساتھ ساتھ چلتی ھے جو اونچے نیچے کھیتوں اور جنگلات میں سے ھوتا ھوا گزرتا ھے۔ بائیں طرف اور مشرق میں ایلم کی سربفلک چوٹی کے نچلے حصے نظر آتے ھیں۔ بلندی پر پہنچ کر اچانک منظر بدل جاتا ھے اور اسی پہریدار ایلم کی چوٹی کے ساتھ ملی ھوئی پہاڑیاں بتدریج ڈھلوان ھوتی جاتی ھیں اور ان سے آگے بنیر کا طاس شروع ھو جاتا ھے۔ اسی مقام پر ۱۵۸۶ء (۹۹۴ھ) میں سوات اور بنیر کے یوسف زئیوں نے اکبر کی سرحدی فوجوں کو ابتدائی مرحلہ پر شکست دی تھی۔

میں نے میاں گل سے دریافت کیا کہ آیا وہ اس جنگ کے متعلق کچھ بتا سکتے ھیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ھو گئی۔ انہیں پورے واقعات معلوم تھے یہاں تک کہ وہ ان پہاڑیوں کے نام بھی جانتے تھے جن پر سے قبائلی غازیوں نے حملہ کیا تھا اور ھر قبیلہ اور اس کا قائد

---

(۱) سوات کے برخلاف بنیر کا ڈھال دریائے سندھ کی طرف ھے اور یہاں سے بارش کا پانی ایک چھوٹی سی ندی براندو کے ذریعہ دریائے سندھ تک پہنچتا ھے۔ یہ ندی دریائے سندھ کی بالکل مخالف سمت میں یعنی مشرق کی طرف بہتی ھے۔ یہاں کا جغرافیہ مشکل ھے۔

جو اس لڑائی میں شریک ہوا تھا اس کے نام سے واقف تھے۔ وہ جنگ کا پورا نقشہ کھینچ سکتے تھے اور فتح و شکست کے اسباب بھی بیان کر سکتے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں ان کا ایک جملہ گھر کر گیا۔ ”تاریخ کے کسی بھی دور میں اور درانیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے اکبر اور اورنگ زیب کے عہد میں بھی اس علاقہ کے یوسف زئی کسی سلطنت کی رعایا بن کر نہیں رہے“۔

یہ دعوی صداقت پر مبنی ہے۔ دیر سوات اور بنیر کے باشندوں نے کبھی دہلی یا کابل کے بادشاہوں کو خراج ادا نہیں کیا۔ وہ کسی بیرونی قانون یا نظم و نسق کے پابند نہیں رہے۔ اور میاں گل کے الفاظ سے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ یہ کہ آج کے لوگوں کے ذہنوں میں ماضی بعید کے واقعات کتنی اچھی طرح محفوظ ہیں۔ واقعات سے اس قربت کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں میں واقعات سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ یہاں ایک شخص ماضی بعید کے واقعات اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کرے گا جیسے اس نے یہ واقعات اپنے باپ کی زبانی سنے ہیں۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ اس علاقہ کے لوگ داخلی خودمختاری پر کیوں فخر کرتے ہیں مغلیہ دور کی تحریروں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان لوگوں میں عرصۂ دراز سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ انہوں نے کسی کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں کے لوگوں کو یہ بھی یاد ہے کہ اکبر کی فوجوں نے بنیر میں شکست کھائی تھی۔ ایک اور واقعہ کی یاد بھی لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک تازہ ہے وہ یہ کہ مغل اعظم اپنے مذہب سے پھر گیا تھا اس لئے یوسف زئیوں پر اس کی اطاعت واجب نہیں رہی تھی۔

روشنیہ عقائد اس زمانہ کی واحد بدعت نہیں تھی۔ خود اکبر نے بھی ایک نئے مذہب دین الٰہی کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ ایک قسم کا سیاسی مذہب تھا جس کا بانی مبانی خود اکبر تھا۔

ابتدائی مرحلہ پر مصلحتاً اکبر نے اس حقیقت کو اخفائے راز میں رکھا کہ وہ اپنے اسلاف کے مذہب سے برگشتہ ہو گیا ہے۔ اس نے اسلام میں امیرالمومنین کی حیثیت حاصل کرنا چاہی۔ مذہبی برگشتگی سے پہلے

اس نے ۱۵۷۹ء میں اپنی معصومیت کے متعلق ایک فرمان جاری کیا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ شہنشاہ تمام دینی اور دنیاوی امور میں حاکم مطلق ہے۔ اس فرمان کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو تمام علمائے دین سے برتر قرار دے دیا۔ اس زمانہ کے تمام سربرآوردہ علماء کو لالچ یا خوف کی وجہ سے ایک ایسے اعلان پر دستخط کرنے پڑے جو ان کے ضمیر کے خلاف تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ دو قدم اور آگے بڑھ گیا اس نے حکم جاری کیا کہ جمعہ کے خطبہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لیا جائے۔ اکبر محض بدعتی ہی نہیں تھا بلکہ ملحد بن چکا تھا۔

ان تمام باتوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ طبقۂ امرا میں غم و غصہ پھیل گیا جو ۱۵۸۰ء میں بہار اور بنگال میں شدید بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اسی سال باغیوں نے مقامی حملوں کے علاوہ کچھ اور منصوبے بنانے شروع کردئے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ بادشاہ کی تلاش میں تھے چنانچہ انہوں نے بد عقیدہ اکبر کو تخت سے اتار کر اس کی جگہ اس کے سوتیلے بھائی حکیم کو بادشاہ بنانے کی سازش تیار کی۔ باغیوں کی پوزیشن مضبوط نہیں تھی کیونکہ جس طرح آج پاکستان کا نقشہ ہے اسی طرح اس زمانہ میں بھی بنگال اور مرزا حکیم کے علاقہ کے درمیان سینکڑوں میل کا رقبہ پھیلا ہوا تھا جو اکبر کے زیر نگین تھا۔ پھر بھی باغیوں نے کابل کی طرف سے چڑھائی کرنے اور دارالحکومت میں اعلیٰ حاکموں کو ورغلانے کا منصوبہ بنایا۔ ونسنٹ سمتھ لکھتے ہیں ''باغیوں کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ جس شخص کو اپنے عالی دماغ بادشاہ کی جگہ تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں وہ شرابی بزدل اور نکما ہے اور اس عظیم الشان سلطنت کو نہیں سنبھال سکتا جو اکبر نے قائم کی تھی۔ ان کے لئے یہی کافی تھا کہ محمد حکیم کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اس کے عقائد ٹھیک ہیں''۔

۸۱-۱۵۸۰ء کے موسم سرما میں حکیم نے پنجاب پر دو حملے کئے۔ دوسرے حملہ کی قیادت وہ خود کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً ستائیس سال تھی اور اس کی پشت پر اس کے ماموں فریدون کا ہاتھ تھا جس نے اس سے کہا تھا کہ تم لوٹ مار نہ مچاؤ تو پورا ملک تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔ حکیم نے روھتاس کے حاکم کو ورغلانے کی کوشش کی

اور جب یہ کوشش ناکام رہی تو وہ لاہور چلا گیا جہاں اس نے شہر سے باہر ایک باغ میں پڑاؤ ڈالا۔ اسے امید تھی کہ اس کے لئے شہر کے دروازے کھول دئے جائیں گے لیکن لاہور کا گورنر اکبر کا دست راست کچھواہہ راجپوت مان سنگھ تھا اور وہ اپنا فرض بجا لانا جانتا تھا۔ فریدون کی توقع کے برخلاف پنجاب میں بغاوت نہیں ہوئی اور جب حکیم کو یہ خبر ملی کہ اکبر اس کے مقابلہ پر آرہا ہے تو اس نے راہ فرار اختیار کی۔

بنگال کے باغیوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہو رہی تھی اور باوجودیکہ حکیم چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا اکبر کے لئے بھی صورت حال نازک تھی۔ لیکن اکبر جس کا دماغ ہمیشہ ٹھیک بات سوچتا تھا اچھی طرح جانتا تھا کہ اصل خطرہ شمال مغرب کی طرف سے لاحق ہے اس نے اپنے مشیروں کی اس درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی کہ وہ بہ نفس نفیس جنوب مشرق میں باغیوں کی سرکوبی کے لئے پہنچے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کابل کی طرف سے ایک کامیاب حملہ دہلی اور آگرہ کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے اور ممکن ہے یہ دونوں شہر شاہی خزانہ سمیت ہاتھ سے نکل جائیں اور اس کی قائم کی ہوئی شاندار سلطنت ایک ہی حملہ میں تباہ ہوجائے لیکن اگر یہ حملہ ناکام ہوگیا تو وہ اطمینان کے ساتھ مشرق میں پھیلی ہوئی بغاوت سے نپٹ سکتا ہے۔ حکیم کی نقل و حرکت سے اکبر کو صورت حال کا اندازہ ہوگیا تھا چنانچہ اس نے فوری اقدام کیا۔ اکبر نے اس موقع پر جو فیصلہ کیا تھا وہ آج کے پاکستان کی جنگی صورت حال پر بھی صادق آتا ہے۔ فروری ۱۵۸۱ء میں وہ اپنے نئے دارالحکومت فتح پور سیکری سے کابل کی مہم پر روانہ ہوا۔

سرہند پہنچ کر اکبر کو معلوم ہوا کہ حکیم پسپا ہوگیا ہے۔ اکبر نے پیش قدمی جاری رکھی اور لاہور کا راستہ چھوڑ کر جون ۱۵۸۱ء میں دریائے سندھ پر پہنچ گیا۔ اسی موقع پر اس نے اس قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا جو اٹک کے مقام پر واقع ہے۔ اکبر نے یہ کام اپنے منظور نظر برھمن راجہ بیربل کے سپرد کیا۔ جیسا کہ اکبر کا مزاج تھا اس نے یہ حکم دے دیا تھا کہ اس سفر میں پادری مانسریٹ (MONSERRATE) اس کے ہمرکاب رہے۔ اکبر شام کا وقت پادری کے ساتھ مختلف مذاہب کے موازنہ پر

تبادلہ خیالات میں گزارتا تھا۔ مانسریٹ نے لاطینی زبان میں ایک ڈائری چھوڑی ہے جو اس زمانہ کے مسلم وقائع نگاروں کی تحریروں کے مقابلہ میں زیادہ مفصل ہے اور جسے ان واقعات کے متعلق سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس وقت شاہی فوج دریائے سندھ پر پہنچی اس علاقہ میں گرمی اپنے شباب پر آچکی تھی اور سیلاب کی وجہ سے پل تعمیر نہیں ہو سکتا تھا۔ فوج کو انتہائی اذیت رساں موسم میں پچاس روز تک قیام کرنا پڑا۔ جون اور جولائی میں اٹک کی گھاٹی دوزخ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ فوج اور جرنیلوں میں بے چینی پھیل گئی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حکیم کی پسپائی کے بعد مہم کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ لہذا اکبر کو واپس چلنا چاہئے۔ اکبر نے اس موقع پر اس سے زیادہ ثابت قدمی دکھائی جتنی سکندر نے انیس صدی پیشتر دریائے بیاس پر دکھائی تھی۔ اس نے اپنے پادری دوست کی بات سنی ان سنی کردی جس نے ایک مذہبی رہنما اور امن پسند انسان کی حیثیت سے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑے کو زیادہ طول نہ دے۔ اکبر نے مسکرا کر بات ٹال دی۔ وہ فرصت کا وقت آس پاس کی پہاڑیوں میں اڑیل کے شکار میں اور رات کا وقت مانسریٹ کے ساتھ مذہبی مباحثہ میں گزارتا رہا۔ فوج کو کشتیوں کے ذریعہ دریا کے پار اتارا گیا اور مان سنگھ کو آگے بھیج دیا گیا تاکہ وہ پشاور پر قبضہ کر لے۔ مان سنگھ نے پشاور پہنچ کر دیکھا کہ مرزا حکیم شہر خالی کرنے سے پہلے اسے نذر آتش کر چکا ہے۔ اس کے بعد اکبر نے بھی کوچ کیا لیکن ایک مضبوط دستہ قلعہ اٹک کی تعمیر کے لئے چھوڑ دیا اور مان سنگھ کو شہزادہ مراد کے ساتھ خیبر کے راستہ کابل روانہ کردیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب درۂ خیبر میں ایسی سڑک بنائی گئی جس پر گاڑیاں گزر سکتی تھیں۔ یہ سڑک اکبر کے چیف انجنیر قاسم خان نے بنائی تھی۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں کہ ”وہی سڑک جس پر گھوڑے اور اونٹ بہ مشکل گزر سکتے تھے جب قاسم خان نے اسے درست کردیا تو اس پر گاڑیاں آسانی کے ساتھ گزرنے لگیں،، اکبر قاسم کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے بعد میں اسے صوبہ کابل کا گورنر بنادیا لیکن اکبر کو یہ بات بعد میں محسوس ہوئی کہ محض راستہ دشوار گزار نہیں ہے بلکہ وہ اور اس کے جانشین، قبائل کے ساتھ سمجھوتہ کر کے یا

فوجی طاقت ھی کے بل پر اس راستہ سے گزر سکتے ھیں۔

فریدون نے کابل کے قریب مان سنگھ کی فوجوں پر دو حملے کئے لیکن دست بدست لڑائی کے بعد اسے بھگا دیا گیا۔ فریدون اور اس کا بھانجا حکیم پہاڑیوں میں جا چھپے اور ۹ اگست ۱۵۸۱ء کو اکبر اپنے دادا کے دارالحکومت میں داخل ھوا۔ موسم کافی گزر چکا تھا اور اپنی طاقت کا مظاھرہ کرنے کے بعد اکبر یہ ارادہ کئے ھوئے تھا کہ سردیوں سے پہلے اپنی فوج کو اس علاقے سے واپس نکال لے جائے۔ اس لئے وہ کابل میں صرف سات دن ٹھیرا۔ مسلم وقائع نگاروں کا کہنا ھے کہ اکبر نے حکیم کو معاف کر دیا اور اسے پھر حاکم بنا دیا۔ لیکن قیاس یہ ھے کہ مانسریٹ کا بیان زیادہ صحیح ھے وہ لکھتے ھیں کہ حکیم اکبر کے سامنے آنے سے ڈرتا تھا چنانچہ اکبر نے کابل اس کی بہن بخت‌النسا کے حوالہ کر دیا۔ بخت‌النسا کے دریافت کرنے پر اکبر نے نفرت کے ساتھ یہ جواب دیا کہ میں دوبارہ حکیم کا نام بھی سننا نہیں چاھتا اور میں جب چاھوں گا کابل کا صوبہ واپس لے لوں گا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میرا بھائی کابل میں رھتا ھے یا نہیں لیکن اگر اس نے پھر حکم عدولی کی تو اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔ ایسا معلوم ھوتا ھے اکبر کے واپس جانے کے بعد بخت‌النسا نے مرزا حکیم کو پھر حکومت سنبھالنے کا موقع دے دیا۔ اکبر نے جس صلہ رحمی کا سلوک کیا تھا اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ اس نے اپنے شرابی بھائی کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ حکیم چار سال بعد کثرت مے نوشی کی وجہ سے فوت ھوگیا اور اس طرح اکبر کو یہ موقع مل گیا کہ وہ کچھ کہے سنے بغیر کابل کو اپنی سلطنت میں شامل کر لے۔ اکبر کو یقین تھا کہ اس کا بھائی زیادہ عرصہ تک کثرت مے نوشی کے اثرات کا متحمل نہ ھو سکے گا۔ اور حکیم کے ساتھ جو حقارت آمیز سلوک کیا گیا ھے اس کے بعد نہ تو کٹر مذھبی فرقہ اسے اپنا آلۂ کار بنا سکے گا نہ اسے تخت کا دعویدار بنا کر پیش کیا جا سکے گا۔

اپنی طاقت کے اس کامیاب مظاھرہ کے بعد اکبر شاھانہ شان و شوکت کے ساتھ اور کسی عجلت کے بغیر اسی راستہ سے واپس ھوا جس راستہ سے آیا تھا اور دسمبر ۱۵۸۱ء کے اوائل میں فتح پور سیکری پہنچ گیا۔ اس مرتبہ اس نے دریائے سندھ کشتیوں کے ایک پل کے ذریعہ پار کیا جو

قاسم خان نے بنایا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ قلعہ اٹک کی بنیادیں اچھی طرح ڈالی جا چکی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر وہ ہر اعتبار سے بڑا مطمئن تھا لہذا اس نے مراحم خسروانہ کا ثبوت دیتے ہوئے ایک نوجوان کی تقصیر معاف کردی جو اٹک کے مقام پر اس کے سامنے اس الزام میں پیش کیا گیا تھا کہ وہ ایک خطرناک فرقہ کا لیڈر ہے اور اس نے امن و امان کو تباہ کر رکھا ہے۔ یہ نوجوان بازید روشنی یا تاریکی کا پانچواں بیٹا جلال‌الدین تھا جسے پٹھان ہمیشہ جلالہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے روشنی فرقہ نے شروع میں یوسف زئیوں میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی لیکن بعد میں یہ قبائل اس فرقہ کے دشمن ہوگئے اس کی ایک وجہ تو بنیر کے سادات کا اثر تھا جو پیر بابا کے مرید تھے اور دوسری وجہ یہ تھی (جو بغور جائزہ کے بعد ظاہر ہوئی) کہ وہ زیادہ عرصہ تک کسی کی حاکمیت برداشت نہیں کر سکتے تھے خاص طور پر جبکہ انہیں عشر بھی ادا کرنا پڑے، خان کجو فوت ہوچکا تھا اور کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جسے پورا قبیلہ تسلیم کرتا ہو۔ اکبر کے عہد میں بازید کے بیٹوں کو قریب قریب اسی صورت حال کا سامنا تھا جو سید احمد بریلوی کو تین سو سال بعد پیش آنے والی تھی۔ ایک دوسرے سے حسد رکھنے والے ملک اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ کوئی بیرونی شخصیت مقبول عام نہ ہوسکے۔ وہ قبیلہ کے اندر مختلف ٹکڑیوں کی چشمک کو ہوا دے رہے تھے۔ بازید کے چار بیٹے شیخ عمر، خیرالدین، نورالدین اور جلالہ دریائے سندھ پر بسنے والے یوسف زئیوں میں سے عیسیٰ زئی کی اکو زئی شاخ سے بھڑ گئے جن کا لیڈر ملک حمزہ تھا۔ چنانچہ ٹوپی سے دو میل شمال میں جہاں دریائے سندھ پہاڑیوں سے نیچے اترتا ہے باڑہ کے مقام پر لڑائی ہوئی جس میں بازید کے بیٹوں کو شکست ہوئی۔ شیخ عمر اور خیرالدین فرار ہو کر تور بیلہ پہنچے جہاں یوسف زئیوں کے اتمان زئی گھرانے والوں نے انہیں قتل کردیا۔ نورالدین بھاگ کر ہشت نگر پہنچا جہاں محمد زئیوں نے اسے پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جلالہ جو ابھی لڑکا ہی تھا لڑائی میں بری طرح زخمی ہوا۔ لیکن ابھی اس کی زندگی باقی تھی۔ اور وہ یوسف زئیوں کی ایک اور ٹکڑی کے ہاتھ پڑ گیا جس نے اس کی خوبصورتی اور کم سنی پر رحم کھا کر قتل کا ارادہ بدل دیا اور اکبر کی خدمت میں پیش کردیا۔ وقائع نگاروں نے یہ بات ظاہر نہیں کی

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکبر نے اس لڑکے کو معاف کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جلالہ اور اس کے ہم عقیدہ امامت کے جس اصول کے قائل تھے اس کی بہت سی باتیں بادشاہ کے عقیدہ سے ملتی جلتی تھیں۔ بہر حال اکبر نے جلالہ کی رہائی کا حکم دیا۔ عفو تقصیر کے اس اقدام کا یہ نتیجہ نکلا کہ اکبر اس کے بیٹے اور پوتے کو ایسی بد امنی کا سامنا کرنا پڑا جو پچاس سال تک جاری رہی۔

ساتھ ہی ساتھ دوسرے روشنیوں کے خلاف سخت کارروائی کی گئی جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے جلالہ کے تین بھائی لڑائی میں مارے گئے انصاریوں کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان میں بازید کی بیوہ بھی شامل تھی جسے ایک فقیر کے حوالہ کردیا گیا۔ بازید کا تابوت جسے اس کے بیٹے ساتھ لئے ہوئے تھے توڑ دیا گیا ہڈیاں جلا دی گئیں۔ اور راکھ دریائے سندھ میں بہا دی گئی۔ یہ واقعہ ۱۵۸۱ء کا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بازید ۱۵۸۵ء سے پہلے بلکہ اکبر کی کابل کی مہم سے بھی پہلے فوت ہوا ہوگا۔ اس مہم کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بظاہر قبائل نے خیبر یا کسی اور علاقہ میں شاہی مہم کی مخالفت نہیں کی اور اکبر کی خدمت میں جلالہ کی حاضری کے سوا سرحدی قبائل کے معاملات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ جہاں تک سرحدی علاقہ کا تعلق ہے اس پر مہم کا واحد نشان خیبر میں بنائی ہوئی قاسم خان کی سڑک اور قلعہ اٹک ہے جو ۱۵۸۶ء میں بن کر تیار ہوا۔ اس وقت اکبر کو ایک بار پھر سرحدی علاقہ میں آنا پڑا۔

جیسا کہ توقع تھی حکیم جولائی ۱۵۸۵ء میں بتیس (۳۲) سال کی عمر میں کثرت مے نوشی کی وجہ سے فوت ہوگیا۔ اس طرح بادشاہ کو اس فکر سے نجات مل گئی کہ تخت کا کوئی اور بھی دعویدار اٹھ کھڑا ہوسکتا ہے اور اس نے خاموشی کے ساتھ شمال مغربی صوبوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس طرح وہ غیریقینی صورت حال ختم ہوگئی جس میں پہلے کامران اور پھر حکیم کے تحت دریائے سندھ کے پار کے علاقے برائے نام سلطنت ہند کے باج گزار سمجھے جاتے تھے لیکن عملی طور پر یہ علاقے ایک خود مختار مملکت بنے ہوئے تھے ان علاقوں کو باقاعدہ ہندوستان میں شامل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا خاص طور پر جبکہ ۱۵۸۱ء

کی مہم سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ دوسرے مسلم حکمرانوں کے دور کے مقابلہ میں اکبر کے زمانہ میں شمال مغربی علاقہ کی سلطنت دھلی میں شمولیت حقیقت سے زیادہ قریب ہوگئی تھی۔ پھر بھی اکبر نے ایک بار پھر شمال کا قصد کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسے کابل پر اپنے اقتدار کے متعلق کچھ شبہ تھا بلکہ کچھ اور اسباب تھے جن کا آپس میں قریبی تعلق تھا۔ ایک تو طویل عرصہ سے اس کی خواہش تھی کہ کشمیر کو جس پر اس زمانہ میں سلطان یوسف خان کی حکومت تھی ھندوستان میں شامل کیا جائے اور دوسرے وہ چاھتا تھا کہ شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقہ کو فتح کیا جائے اور وادی پشاور اور آس پاس کی پہاڑیوں کے قبائل کو جنہوں نے بابر، کامران یا مرزا حکیم اور ان سے پہلے دھلی اور کابل کے کسی مسلم بادشاہ کی حاکمیت تسلیم نہیں کی تھی اپنے تحت لایا جائے۔ اس مہم میں اکبر کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اکبر کے مقامی افسروں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا شدید مقابلہ مندڑ اور یوسف زئی قبائل کر رھے ھیں۔ ان پر قابو پا لیا گیا تو باقی تمام قبائل بہ آسانی اکبر کی حاکمیت تسلیم کر لیں گے۔

اکبر نے مان سنگھ کو آگے بھیج دیا تاکہ وہ کابل پہنچ کر قدم جما لے۔ وہ خود ایک بڑی فوج کے همراہ پہلے راولپنڈی پہنچا اور وھاں سے جنوری ۱۵۸۵ء میں اٹک پہنچ گیا۔ جب اکبر اٹک پہنچا جہاں راجہ بیربل کی نگرانی میں شاھی قلعہ کی تعمیر تکمیل کے قریب تھی اسے خوش خبری ملی کہ مان سنگھ کسی مزاحمت کے بغیر کابل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ھوگیا ھے اور اس نے حکیم کے بیٹوں اور حکیم کے ماموں فریدون سے جو اکبر کے لئے درد سر بنا ھوا تھا ھتھیار رکھوالئے ھیں۔ فریدون کو کچھ عرصہ نظربند رکھا گیا۔ پھر اسے مکہ معظمہ بھیج دیا گیا کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر یہی سزا دی جاتی تھی۔ اب میدان صاف نظر آتا تھا۔ لیکن اکبر نے قبائل کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگایا تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کتنی بڑی مصیبت ھیں۔ اکبر کا خیال تھا کہ وہ بہ یک وقت کشمیر پر بھی حملہ کرے گا اور قبائل کے خلاف بھی کارروائی جاری رکھے گا۔ چنانچہ اس نے یہی کوشش کی۔ وہ کشمیر فتح کرنے میں کامیاب ھوگیا۔ لیکن یوسف زئیوں اور افریدیوں کے خلاف جنہیں خیبر اور باژار کی وادیوں میں مہمند اور خلیل قبائل کی حمایت

حاصل تھی اکبر کی مہمات بالکل ناکام ہو گئیں۔ خیبر میں اکبر کی فوجوں کے مقابلہ پر قبائل کو بازید کے بیٹے جلالہ نے منظم کیا تھا جسے اکبر نے ۱۵۸۱ء میں معافی دی تھی۔

ہمیں تاریخ کے اس مرحلہ پر پہلے پہل خٹک قبیلہ کا نام سنائی دیتا ہے۔ جب اکبر اٹک پہنچا تو اس کی خدمت میں پیش ہونے والے پٹھان ملکوں میں ملک اکوڑے بھی شامل تھا جس کے متعلق مان سنگھ اور دوسرے مصاحب اکبر کو بتا چکے تھے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے تو وہ اٹک سے پشاور جانے والی شاہراہ کی حفاظت کر سکتا ہے خیال یہ تھا کہ اکوڑے اور اس کا قبیلہ طاقتور یوسف زئیوں کے حملوں کا تدارک کرے گا جو اٹک سے مغرب کی طرف شاہراہ سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لینے کے عادی تھے۔ چنانچہ اکوڑے کو دربار میں بلایا گیا۔ وہ یہ ذمہ داری سنبھالنے پر رضامند ہو گیا۔ اس کے صلہ میں اسے جاگیر عطا کی گئی۔ اس جاگیر کی حدیں اس مقام سے جہاں اب اٹک کا پل ہے چند میل کے فاصلہ سے شروع ہو کر موجودہ نوشہرہ چھاؤنی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسے اس سڑک پر چونگی وصول کرنے کا بھی اختیار دے دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے نام کی خاطر اکوڑے نے لنڈے دریا کے بائیں کنارے ایک ڈھلوان میدان میں اکوڑہ کے چھوٹے سے قصبہ کی بنیاد ڈالی۔ یہاں سے سرائے میرہ کی پہاڑیوں کا نیچا سلسلہ جو جنوب میں یوسف زئی سمہ کی حد فاصل ہے صاف نظر آتا ہے۔

اکوڑے خوشحال خاں خٹک کا پردادا تھا۔ ہم تک جو تحریریں پہنچی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں یہ قبیلہ ضلع کوہاٹ میں ٹیری کے مقام سے جہاں اکوڑے کی زمینیں تھیں اٹک اور نوشہرہ کے درمیان آباد ہونے کے لئے آیا تھا۔ یہ نتیجہ اس بات کی وضاحت کے لئے نکالا گیا ہے کہ اکبر کے عہد سے پہلے خٹک قبیلہ کا نام کبھی سنائی نہیں دیا۔ قبائلی وقائع کے مطابق اس علاقہ میں صرف دلہ زاک رہتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر جو میں قبائلی وقائع کی روشنی میں سولھویں صدی کے اوائل میں وادی پشاور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے پیش کر چکا ہوں یہ بات یقینی ہے کہ اکوڑے کی اصل خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب ۱۵۸۶ء میں اکبر نے شاہراہ کی حفاظت کی ذمہ داری خٹک قبیلہ کے سپرد کی تو یہ قبیلہ اس علاقہ میں نمودار نہیں تھا۔ یہ

ذمہ‌داری کسی ایسے قبیلہ کے سپرد نہیں کی جا سکتی تھی جو مقامی حالات سے واقف نہ ہوں اور جس علاقہ کی حفاظت اس کے سپرد کی گئی ہو، اس پر اس کا حق مشکوک ہو۔ جو بات زیادہ قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ خٹک قبیلہ کو اس علاقہ میں اپنا حق قائم کئے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا البتہ یوسف زئی خلیل اور مہمند قبائل ان کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کرتے رہتے تھے اسی لئے وہ بادشاہ کی خدمت کے لئے آمادہ ہو گئے تاکہ دوسرے قبائل ان پر زیادہ دباؤ نہ ڈال سکیں۔

تھوڑے ھی عرصہ بعد اکبر دو طرفہ قبائلی جنگ میں الجھ گیا۔ جب اکبر اٹک پہنچا تو سب سے پہلے جو جرگہ اس کی خدمت میں پیش ھوا اس میں خلیل مہمند اور دوسرے قبائل کے ملک شامل تھے۔ ان میں خٹک قبیلہ کے ملک بھی شامل تھے لیکن کسی وجہ سے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہ لوگ یوسف زئیوں اور منڈڑ یوسف زئیوں کے خلاف شکایت لے کر آئے تھے۔ اس جرگہ نے بادشاہ کو بتایا کہ لوٹ مار اور دوسری کارروائیوں کی تہمت ان قبائل پر لگائی جاتی ھے حالانکہ ان کارروائیوں کے ذمہ‌دار یوسف زئی ھیں جو دریا کے پار سے حملہ کرتے ھیں اور یہ کہ اگر بادشاہ کابل جانے والی سڑک پر امن و امان قائم رکھنے کا خواھشمند ھے تو اسے ایسا قدم اٹھانا چاھئے جو آج تک کسی حکمراں نے نہیں اٹھایا اور ان لٹیروں کو اپنا محکوم بنا لے۔ اکبر خود بھی یہ چاھتا تھا کہ یوسف زئی اور منڈڑ علاقہ کو اپنی قلمرو میں شامل کر لے، چنانچہ اس نے جرگہ کی یہ تجویز بڑے شوق سے سنی۔ یہ شبہ بھی ظاھر کیا جاتا ھے کہ خود اکبر ھی نے اس جرگہ کا انتظام کیا ھو تاکہ اس کے منصوبے ٹھوس شکل اختیار کر لیں۔ چنانچہ اکبر نے زین خاں کو اس مہم پر بھیجنے کا قصد کیا کیونکہ مان سنگھ کی غیر موجودگی میں جو کابل کے علاقہ میں تھا وھی بہترین جنرل تھا۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ھیں کہ ”یہ مہم یوسف زئی اور منڈڑ قبائل کے خلاف تھی جو سوات اور باجوڑ میں اور کچھ دشت میں رہتے تھے“ ابوالفضل اس مہم کے اصل مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ھیں:-

”سوات اور باجوڑ بڑے خوبصورت علاقے ھیں یہاں خوبصورت سبزہ زار اور ڈھلوانیں ھیں جن کے تصور ھی سے دل کو طراوت محسوس ھوتی ھے“۔

لیکن اس سے پہلے کہ یہ مہم شروع کی جاتی اکبر درۂ خیبر میں ایک اور مہم میں الجھ گیا۔ بازید کا بیٹا جلالہ تاریکی جو ۱۵۸۱ء میں جبکہ اکبر نے اس کی تقصیر معاف کی تھی صرف چودہ سال کا تھا اس نے بلا تاخیر اپنے باپ کی گدی سنبھال لی۔ وہ بھاگ کر تیراہ پہنچا تھا جہاں بہت سے افریدی اس کے ساتھ ہوگئے۔ خلیل اور مہمند قبائل میں سے بھی بہت سے لوگ اس سے آملے۔ اس نے شاہ افغان کا لقب بھی اختیار کیا۔ اس کے بعد دو سو سال تک اس علاقہ کی تاریخ میں کسی حکمراں نے یہ لقب اختیار نہیں کیا۔ بات اس وقت بگڑی جب مرزا حکیم کی وفات کے بعد اکبر نے صوبۂ کابل کا انتظام سنبھالنے کے لئے مان سنگھ کو روانہ کیا۔ کابل جاتے ہوئے بھی مان سنگھ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پورے راستہ پر تاریکی فرقہ کے قبائل رہزنی میں مصروف تھے لیکن یہ فرقہ مان سنگھ کے مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھا لہذا وقتی طور پر مان سنگھ کابل تک راہ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب مان سنگھ کابل پہنچ گیا تو تاریکیوں نے بگرام (پشاور) کے قلعہ پر حملہ کردیا اور قلعہ دار سید حامد کو جو قلعہ سے باہر نکل کر ان کے خلاف صف آرا ہوا تھا قتل کر ڈالا۔ اب یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ قبائل سے نپٹنے کا وقت آگیا تھا۔ مان سنگھ کو بتا دیا گیا تھا کہ جھگڑے کی جڑ افریدی ہیں لیکن پشاور کے آس پاس بسنے والے خلیل اور مہمند قبائل میں سے بھی بہت سے لوگ ان کے حامی ہیں۔ اس لئے یہ طے پایا کہ مان سنگھ خود جلال آباد سے تیراہ کی طرف کوچ کرے اور دوسری فوج جو اکبر نے اٹک سے روانہ کی تھی آگے بڑھے اور پشاور میں مورچے مضبوط بنا کر خیبر میں مان سنگھ کی فوج سے جا ملے۔

مان سنگھ ننگر ہار کے قصبہ پیش بلاک میں بیمار ہو گیا لہٰذا ان فوجی کارروائیوں میں تاخیر ہو گئی۔ مہمند اور خلیل قبائل جو سید حامد پر فتح پا چکے تھے اور بھی دلیر ہو گئے اور درۂ خیبر میں داخل ہو گئے جہاں انہوں نے خندقیں کھود لیں اور درہ کو بند کر دیا۔ جب مان سنگھ صحت یاب ہونے کے بعد مہم پر روانہ ہوا تو وہ درۂ خیبر سے آگے وادی بازار میں داخل ہو گیا اور افریدیوں پر حملہ کر دیا۔ اسے اس حملہ میں کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن وہ بڑی دشواری کے بعد علی مسجد تک پہنچ سکا۔ جلالہ اور اس کے پیرو تاریکی قبائل شاہی

لشکر کے میمنہ میسرہ اور عقب پر برابر حملے کر رہے تھے۔ علی مسجد میں مان سنگھ کے کیمپ کو گھیر لیا گیا اور کافی جانی نقصان کے بعد فوجی کمک کی مدد سے جو اٹک سے روانہ کی گئی تھی وہ درہ کے اس سرے پر پہنچا جو پشاور کی طرف واقع ہے۔ جلالہ کا لشکر منتشر ہو گیا تھا جیسا کہ قبائلی لشکر عام طور پر منتشر ہو جاتے ہیں لیکن نہ تو درۂ خیبر میں شاہراہ صاف ہوسکی اور نہ باغیوں کا صفایا کیا جا سکا۔ اس جنگ میں خلیل اور مہمند قبائل نے جو کردار ادا کیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے یوسف زئیوں کے خلاف اکبر سے مدد مانگی تھی۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ تاریکی تحریک کی حمایت میں اپنی کارروائیوں کی طرف سے بادشاہ کی توجہ ہٹا دی جائے اور بادشاہ کو اس قبیلہ کی مخالفت پر اکسایا جا سکے جو ہمیشہ سے ان کا رقیب چلا آرہا تھا اور جس نے پیر بابا کے زیر اثر آکر تاریکی تحریک کی حمایت چھوڑ دی تھی۔

شمال میں یوسف زئی اور منڈڑ قبائل کے خلاف اکبر کی کارروائیاں اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئیں۔ چونکہ یہ مہم ۱۸۹۵ء سے پہلے شمالی پہاڑیوں کے باشندوں کو محکوم بنانے کی آخری کوشش تھی اس لئے مناسب ہے کہ اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا جائے۔ تھوڑے ہی دنوں میں زین خان نے یہ اطلاع دی کہ وہ باجوڑ میں تو داخل ہوگیا ہے لیکن کمک حاصل کئے بغیر وہ سوات نہیں پہنچ سکتا جو باقی قبائل کا مرکز ہے کمک کے لئے آنے والی فوجوں کو چاہئے کہ وہ سمہ میں منڈڑ قبیلہ کی بستیوں پر حملے کریں اور انہیں تباہ کردیں تاکہ یہ قبائل پہاڑوں میں بسنے والے اپنے بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں۔ اکبر نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور دو فوجی دستے کمک کے لئے روانہ کر دئے۔ ایک دستہ کی قیادت اکبر کے چہیتے برہمن راجہ بیر بل (۱) (بیر بل کے معنی ہیں بہت طاقتور) اور دوسرے دستہ کی قیادت اکبر کے ایک اور رتن حکیم ابوالفتح کے سپرد تھی۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی کبھی میدان جنگ میں فوج کی کمان نہیں سنبھالی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر نے یہ

---

(۱) بیر بل جس کا اصل نام مہیش داس تھا ایک غریب برہمن تھا جو ۱۵۲۸ء میں کالپی (بنارس کے قریب) پیدا ہوا تھا۔ ابوالفتح ایران کے شہر گیلان کے رہنے والے تھے۔ وہ ان واقعات سے تین سال بعد فوت ہوئے اور حسن ابدال میں دفن ہیں۔

اندازہ نہیں لگایا تھا کہ قبائل لڑائی میں کتنے خونخوار ہیں ورنہ وہ اپنے نورتنوں میں سے دو رتنوں کو ان کے مقابلہ پر نہ بھیجتا۔ بیربل کا فوجی تجربہ اس بات تک محدود تھا کہ وہ برائے نام قلعہ اٹک کی تعیر کا نگراں رہا تھا اور حکیم کی قابلیت یہ تھی کہ وہ بنگال کا گورنر رہ چکا تھا۔ بیربل اکبر کا درباری شاعر عالم اور بذلہ سنج تھا۔ مسلم مورخوں نے اس کے لئے اکبر کا ''مغرور اور لاڈلا برہمن،، کا فقرہ استعمال کیاھے حکیم ابوالفتح بھی ایک اچھا شاعر اور مذھب کے معاملہ ھیں آزاد خیال تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ھے کہ اس شخص نے اکبر کو اسلام کے صحیح عقیدہ سے برگشتہ کیا تھا۔ اس کے برخلاف زین خان جو اکبر کی دایہ کا بیٹا اور اکبر کا رضاعی بھائی تھا بےجگری سے لڑنے والا اور بہادر انسان تھا۔ وہ بے پڑھا لکھا تھا لیکن ایک اھل کمانڈر تھا جو معمولی سپاھی سے ترقی کرکے اس مرتبہ پر پہنچا تھا (۱)۔ اس سے زیادہ متضادطبیعتوں کے تین افراد کا اکٹھا ھونے کی مثال ملنا مشکل ھے۔

شروع میں بیربل کی فوج پہاڑی علاقہ میں کسی بھی مقام پر پیش‌قدمی نہ کر سکی۔ اس کے بعد اکبر نے بیربل کی فوج کو حکم دیا کہ وہ حکیم ابوالفتح کی فوج کے ساتھ مل کر پیش قدمی کرے۔ زین خان جسے سمہ میں ان فوجوں کی کارروائی کی ذمہ‌داری سے نجات مل گئی تھی تلاش کے راستہ سوات پہنچنے اور چکدرہ کے گھاٹ پر جہاں آج کل پل بنا ھوا ھے مورچے قائم کرنے میں کامیاب ھوگیا۔ اس مرکز سے اس نے درۂ مالاکنڈ پر بھی قبضہ کرلیا جس سے بیربل اور حکیم کی فوجوں کو سوات میں داخل ھونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ پوری فوج اور اس کے تینوں کمانڈر چکدرہ کے مقام پر جمع ھوئے جہاں جنگی کونسل کا ایک زوردار اجلاس ھوا۔

بیربل نے یہ کہہ کر جھگڑے کی ابتدا کی کہ وہ زین خان کے خیمہ میں حاضر ھونے کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ بیربل کا مطالبہ تھا کہ

(۱) بعد میں زین خاں کو پنج ہزاری منصب ملا اور اسے کابل کا گورنر بنا دیا گیا وہ ھرات کا ترک تھا۔ اکبر کے بیٹے سلیم کو جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر بنا زین خاں کی بیٹی سے محبت ھو گئی اور سلیم نے اس سے شادی کر لی (نورجہاں جہانگیر کی دوسری بیوی تھی) زین خاں کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ۱۲۰۲ء میں فوت ھوگیا۔

اجلاس شاہی پرچم کے سایہ میں اس کے خیمہ میں ہو۔ زین خان غصہ کو پی گیا اور بیربل کے خیمہ میں پہنچ گیا۔ ابوالفتح بھی وہیں آگئے۔ جلسہ شروع ہوتے ہی زین خان اور ابوالفتح نے ایک دوسرے کو متہم کرنا شروع کر دیا۔ اس مرحلہ کے بعد زین خان نے مطلب کی بات شروع کی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ فوج کا ایک حصہ چکدرہ میں ٹھیرا رہے اور مرکزی مورچہ سنبھالے رہے اور فوج کا دوسرا حصہ بنیر کی طرف روانہ ہوجائے جہاں قبائل نے بڑا سر اٹھا رکھا تھا اور جہاں کہیں ممکن ہو قبائل پر حملہ کرے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ تازہ دم فوج قبائل پر حملہ کرے گی اور وہ اپنی فوج کے ساتھ جو جنگ کی کافی صعوبتیں جھیل چکی تھی چکدرہ میں بیٹھا رہے گا۔ لیکن اگر اس کے ساتھی چاہیں تو وہ چکدرہ میں ٹھیر جائیں۔ اس صورت میں وہ خود درہ کڑاکڑ کے راستہ بنیر کی طرف روانہ ہوگا اور وہاں باغیوں (۱) سے نپٹے گا۔

لیکن اس تجویز پر بیربل اور ابوالفتح میں سے کوئی بھی رضامند نہیں ہوا ان کی دلیل یہ تھی کہ شاہی حکم یہ ہے کہ قبائلی علاقہ میں لوٹ مار مچائی جائے اس پر قبضہ نہ کیا جائے لہذا تینوں کمانڈروں کو پوری فوج لے کر درہ کڑاکڑ کی طرف روانہ ہونا چاہئے جہاں بدامنی پھیلی ہوئی ہے سرکش قبائل کو سزا دینی چاہئے اور پھر اس راستہ سے اٹک میں شاہی کیمپ میں پہنچ جانا چاہئے۔ بیربل نے یہ بھی کہا کہ پتہ نہیں اس خطرناک علاقہ میں پہاڑوں پر چڑھائی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ کڑاکڑ جنوب مشرق میں اٹک کی طرف واقع ہے اور اس کے نزدیک گھر واپس جانے کا یہ مختصر راستہ تھا۔ فاصلہ کے لحاظ سے تو واقعی اس کا اندازہ درست تھا لیکن وہ اس علاقہ کے جغرافیائی حالات سے نابلد تھا۔

زین خان نے بہتیرا احتجاج کیا کہ اتنی مصیبت کے بعد جو علاقہ حاصل ہوا ہے اسے ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے لیکن اگر وہ اس بات پر تلے ہوئے ہیں تو انہیں مالاکنڈ کے آسان راستے سے واپس چلنا چاہئے جہاں کے علاقہ سے وہ بخوبی واقف ہیں اور فوج بھی قدم جما سکتی ہے۔ لیکن

(۱) ان وقائع میں پٹھانوں کے لئے باغی سرکش جنونی جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے علاقہ پر حملہ اور قبضہ کی مزاحمت کی تھی۔ یوسف زئی پہلے بھی مغلوں کے وفادار نہیں تھے اس لئے وہ باغی نہیں تھے۔

کسی علاقه کو مرکز بنائے بغیر پوری فوج کو بنیر کی دشوارگزار پہاڑیوں میں جھونک دینا دیوانگی ہے۔ زین خان کی بات کسی نے نہیں مانی لیکن وہ جانتاتھا که اس کے بغیر بیربل اور ابوالفتح بےبس ہیں اس لئے اس نے سپاہی کا فرض نباہنے کے لئے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے یه بھی سوچا ہوگا که اکبر کے ایک ہی مصاحب کی ہمراہی کچھ کم حیثیت نہیں ہے یہاں تو دو مصاحبوں کا ساتھ ہے۔ ہوسکتا ہے که اکبر نے بھی یہی سوچا ہو که بیربل اور ابوالفتح آپس میں جھگڑتے رہ جائیں گے اور زین خان کو من مانی کرنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور شاہی فوج کے برے دن آلگے۔

یه ایک بڑا ڈرامائی منظر ہے جو واقعات کے تذکرہ سے نگاہوں میں پھر جاتا ہے بد مزاج پنڈت جسے اپنے آقا کی نظر میں اپنی وقعت پر ناز ہے اور جو نہایت چرب زبان ہے اکھڑ مسلمان سپاہی کو دبائے ہوئے ہے اور ایرانی حکیم اور شاعر ابوالفتح بات بات پر بیربل کو داد دے رہا ہے اور زین خان کو یه جتا رہا ہے که ابھی کل ہی کی بات ہے که وہ اور بیربل اکبر سے مل چکے ہیں اور اس کے ارادوں سے بخوبی واقف ہیں۔ دوسری طرف بےچارہ سیدھا سادہ اکھڑ سپاہی تھا جو ان شاہی مصاحبوں کے مقابلہ پر نہیں جم سکتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یه بھی جانتا تھا که وہ انہیں موت کے منه میں بھی نہیں جھونک سکتا تھا۔ وہ یه اچھی طرح جانتا تھا که مرکزی مقام کے بغیر ان پہاڑوں میں سے گزرنا جن پر جنگجو قبائل کا قبضه ہے ایک ایسا جنگی اقدام ہوگا جو دشمن خدا سے چاہتا ہے۔ قبائل اس اقدام کو پسپائی سمجھیں گے اور شاہی شکر کا ناک میں دم کر دیں گے۔ لیکن وہ دو کے مقابله میں تنہا تھا اور ایک پنڈت کے تکبر اور ایک شاعر کی نازک مزاجی کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچه اس نے تن به تقدیر بیربل اور ابوالفتح کی تجویز مان لی لیکن مردانگی کا ثبوت دیتے ہوئے یه فیصله کیا که وہ فوج کے پہلے حصه کے ساتھ رہے گا۔ بیربل جو پہاڑوں کی بھول بھلیوں سے نکلنے کے لئے بےچین تھا ہراول دسته کے ساتھ رہا۔

چکدرہ سے رخصت ہونے کے دو دن بعد جب فوج بیرکوٹ سے گزر کر درۂ کڑاکڑ کے شمالی حصه کے قریب پہنچی تو قبائل کے زبردست

حملوں نے اس کا راستہ روک دیا۔ پورا دن درہ کی چوٹی تک راستہ صاف کرنے میں گزر گیا۔ جب فوج کا ہراول دستہ چوٹی پر پہنچا تو لشکر کے بڑے حصہ اور پہلے حصہ کے آملنے تک ٹھہرنے کی بجائے ہراول دستہ بنیر کی طرف ڈھلوان راستہ پر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ زین خان نے قبائل کے متواتر حملے پسپا کر دئے اور چار قبائلی سرداروں کو اپنی بندوق سے ہلاک کیا۔ پھر وہ بھی ڈھلوان راستہ پر آگے بڑھنے پر مجبور ہو گیا پورے لشکر میں ابتری پھیلی ہوئی تھی کیونکہ یہاں سے بڑا ڈھلوان راستہ شروع ہوتا ہے جس پر ہاتھی اور بھاری سامان نہیں گزر سکتا۔ بھٹنی قبیلہ کا ایک بہادر نوجوان حسن خان زین خان کے محافظ دستہ کا سالار تھا اور وہ یوسف زئیوں کو آگے بڑھنے سے برابر روک رہا تھا۔ اگلی رات اور پورا دن قبائل کے متواتر حملے روکنے میں گزر گیا اور آخرکار شاہی فوج بنیر کی طرف ہموار میدان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ تورسک کے قریب پھر جنگی کونسل کا اجلاس ہوا۔

زین خان اس علاقہ سے تھوڑا بہت واقف تھا۔ شاہی فوج بڑی مشکل سے اور بڑا نقصان اٹھانے کے بعد بنیر کے تاس میں کھلے میدان میں پہنچی تھی۔ زین خان نے چکدرہ میں جو مشورہ دیا تھا اس پر اب بھی عمل کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ فوج کے پاس پانی اور رسد کی کمی نہیں تھی اور اس پر پہاڑیوں سے حملہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہذا مناسب یہ تھا کہ فوج کی از سر نو تنظیم کی جائے مورچے بنائے جائیں اور خیمہ گاہ کو مرکز بناکر قبائل پر چڑھائی کی جائے۔ قبائل زیادہ عرصہ تک جم کر نہیں لڑ سکتے تھے۔ موجودہ حالات میں صرف یہی جنگی حکمت عملی کامیاب ہو سکتی تھی۔ زین خان نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا کہ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ درہ کڑاکڑ سے سلامت چلے آئے لیکن آگے کڑپتا (۱) اور ملندرے کی چڑھائیاں ہیں جو اور بھی زیادہ دشوار گزار ہیں۔

لیکن اس نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ زین خاں کی بات کسی نے نہیں مانی۔ بیربل کو جس پر خوف طاری ہو چکا تھا صرف یہ فکر تھی کہ وہ فوج کے ہراول دستہ کے ساتھ رہے تاکہ سب سے پہلے میدانی

---

(۱) یہ ایک اور کڑپہ ہے۔ ایک کڑپہ مہمند علاقہ میں گنداب کے راستہ پر واقع ہے۔

علاقہ میں پہنچ جائے۔ فوج نے ایک بار پھر کوچ کیا۔ زین خاں حسب معمول فوج کے پہلے دستہ کے ساتھ رہا۔

اس مرتبہ یوسف زئیوں نے پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ شاہی فوج ڈگر کے جنوب میں کڑپا کی چوٹی پر پہنچ کر یہ سمجھی کہ وہ اپنی منزل یعنی سمہ تک پہنچ گئی ہے لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی فوج کو ابھی ایک اور تنگ گھاٹی سے گزرنا تھا جہاں سے دائیں طرف درۂ ملندرے تک کا راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔ فوج میں ایک بار پھر افراتفری پھیل گئی۔ فوج کا اگلا حصہ اور بڑا حصہ کسی ترتیب کے بغیر آگے بڑھ گیا۔ صرف پہلے حصہ میں جس کی کمان زین خاں کر رہا تھا تنظیم باقی رہی۔ قبائل چوٹی تک جانے والے راستے کی متوازی پہاڑیوں پر پہرے جمائے کھڑے تھے انھوں ۔ لشکر پر جس کا حال پہلے ہی خراب تھا تیر اور پتھر برسانے شروع کر دئے۔ رات ہوتے ہی شاہی لشکر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ چونکہ راستہ کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا اس لئے فوج پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں پھنس گئی۔ بہت سے سپاہی آگے بڑھنے کے شوق میں کھڈوں میں گر گئے اور پہاڑیوں سے نیچے پھسل گئے۔ بھیڑ کی وجہ سے راستہ رک گیا اور ہاتھی گھوڑے اور انسان آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس کے بعد جو بے ترتیب لڑائی ہوئی اس میں بیربل اور اکبر کے لشکر کے آٹھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں بہادر بھٹنی حسن خاں بھی شامل تھا۔ شاعر ابوالفتح ڈر کے مارے ایک جھاڑی میں چھپ گیا تھا۔ اسے وہاں سے زین خاں نے نکالا اور فوج کے اس واحد دستہ کے ساتھ جس میں ابھی تنظیم باقی تھی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ گھمسان کی لڑائی کے بعد زین خاں اور ابوالفتح ملندرے کی چوٹی کے قریب ایک جگہ پہنچے اور رات گزارنے کے لئے ٹھیر گئے۔ یوسف زئی جو جی بھر کر قتل و غارت گری کر چکے تھے اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے گئے۔ اور تین دن بعد زین خاں بچے کھچے لشکر کو لے کر اٹک پہنچا تاکہ بادشاہ کو روداد سنا سکے۔

اکبر نے دو روز تک زین خاں یا ابوالفتح کو دربار میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اسے اس بات پر غصہ تھا کہ وہ بیربل کی نعش کریاکرم کے لئے کیوں نہیں لائے۔ تیسرے روز خبر آئی کہ یوسف زئی

اور مندڑ قبائل بڑی تعداد میں اٹک پر چڑھائی کے لئے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ چنانچہ دفاعی بندوبست کے متعلق مشورہ کے لئے اکبر زین خاں اور ابوالفتح کو دربار میں بلانے پر مجبور ہو گیا۔ ایک بار پھر زین خاں کو اکبر کے بیٹے مراد کے ساتھ میدان جنگ میں بھیجا گیا اور وہ قبائل کا جوابی حملہ پسپا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاہی فوج کی شکست کے بعد بھی میدانی علاقہ میں قبائل اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اکبر نے اس علاقہ میں اپنی سرگرمیاں محدود کر دیں۔ البتہ وہ سمہ میں قبائل کو پریشان کرنے کے لئے مہمات بھیجتا رہا اور اس نے ضلع مردان کو قابو میں رکھنے کے لئے اہم مقامات پر فوجی چوکیاں بنائیں۔ اس میں سے ایک چوکی ہوتی مردان سے چھ میل مشرق میں گڑھی کپورہ میں قائم کی گئی تھی دوسری تورو کے قریب لنگرکوٹ کے مقام پر تھی جس کا اب نشان موجود نہیں ہے اور تیسری سندھ کے گھاٹ پر اوھنڈ یا ھنڈ کے مقام پر تھی۔

اس شکست فاش کے باوجود اکبر نے یوسف زئیوں اور تاریکیوں کو جن کا سردار جلالہ تھا دبانے کی مہم جاری رکھی۔ ۱۵۸۷ء میں مطلب خاں کو بنگش بھیجا گیا۔ تاکہ وہ تیراہ میں مورچہ بندی کرے ادھر زین خاں جسے پھر سپہ سالار بنادیا گیا تھا ۱۵۸۷ء سے ۱۵۹۲ء تک باجوڑ اور سوات کے طول و عرض میں متعدد لڑائیاں لڑتا رہا لیکن اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ہوئی۔ مغل مورخ اپنی تصنیفات میں بار بار "باغیوں کو سخت سزا دینے" اور "شدید جنگ کے بعد فتح" کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ "خدائے تعالیٰ کے فضل سے باغیوں پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا گیا وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور پورے علاقہ پر مغل فوج کا قبضہ ہوگیا"۔ اخوند درویزہ لکھتے ہیں کہ ہرجگہ سے قبائل کو بھاگنا پڑ رہا تھا۔ ایک اور مورخ کا بیان ہے کہ بارہ سال تک مغلوں کے مقابلہ پر جمے رہنے کے بعد یوسف زئی منتشر ہوگئے۔ لیکن یہ سب شاہی مصاحبوں کے خوشامدانہ بیانات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ باغی ۱۵۹۳ء میں بھی اتنے طاقتور تھے کہ انہوں نے خود پشاور میں مغل قلعہ دار کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ زین خاں کی خاص کوشش کی وجہ سے اٹھا لینا پڑا۔ سوات، بنیر اور باجوڑ کے پہاڑی علاقوں کے متعلق اس بات کا اور بھی واضح ثبوت موجود ہے کہ یہ علاقے کبھی بادشاہ کے قبضہ

میں نہیں آئے۔ ابوالفضل آئین اکبری میں ان علاقوں کو صوبہ کابل کے تحت سوات کی سرکار قرار دیتا ہے۔ پورے آئین اکبری میں گوشوارے بنے ہوئے ہیں جن میں مختلف علاقوں کے نام درج ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر علاقہ سے شاہی خدمات کے لئے کتنے آدمی دستیاب ہیں اور کتنا لگان ملتا ہے۔ لیکن سوات باجوڑ وغیرہ کے متعلق یہ خانے بالکل خالی ہیں۔ ریورٹی لکھتے ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ مغل حکمران اس علاقہ میں قتل عام اور غارت گری کے باوجود یہاں اپنے قدم نہیں جما سکے وہ کبھی یہ معلوم نہیں کر سکے کہ ضرورت پڑنے پر انہیں اس علاقہ سے کتنے آدمی اور کتنی رقم مل سکتی ہے چنانچہ آئین اکبری کے کسی نسخہ میں یہ تفصیلات درج نہیں ہیں،، مغل اپنی زبردست فوج کی مدد کے بغیر اس دشوار گزار علاقہ میں چپہ بھر زمین پر بھی قدم نہیں رکھ سکے اور اس کے باوجود ان کی شاہراہ پر برابر رہزنی ہوتی رہی۔

اب تک ہم جو واقعات بیان کرتے چلے آئے ہیں وہ سب کے سب وادی پشاور یا اس سے متصل پہاڑی علاقوں میں رونما ہوئے۔ لیکن اس مرحلہ پر یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پٹھانوں کے جنوبی علاقہ میں بھی اکبر کا اقتدار قائم نہیں ہو سکا۔ بنوں کا میدان اور دوڑ اور عیسیٰ خیل کی وادیاں بھی سوات کی طرح صوبہ کابل کی سرکار میں شامل تھیں لیکن آئین اکبری اس بارے میں بھی خاموش ہے کہ اس علاقہ کو شاہی خدمت کے لئے کتنے آدمی اور کتنی رقم مہیا کرنا پڑتی تھی۔ ان علاقوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے کیونکہ سوات کی طرح یہ علاقے بھی عملی طور پر آزاد تھے۔

اکبر جلالہ کو بھی گرفتار نہیں کر سکا۔ تین مہمات ناکام ہوجانے کے بعد ۱۵۹۲ء میں اکبر نے آخری مہم بھیجی جس کے نتیجہ میں چودہ ہزار تاریکی گرفتار کر لئے گئے گرفتار ہونے والوں میں جلالہ کی بیوی اور بچے بھی شامل تھے لیکن خود جلالہ بچ نکلا۔ اس کا انجام بالکل مختلف ہوا اور وہ شاہی فوج سے لڑتے ہوئے نہیں مارا گیا۔ وہ ۱۵۹۹ء میں جنوب کی طرف نکل گیا اور اس نے بنوں یا ڈیرہ جات کے لوھانی قبائل کی مدد سے کسی حیلہ سے کام لیکر غزنی پر قبضہ کر لیا۔ تاریکی حملہ آوروں نے غزنی کے گورنر شریف خان کو بھگا دیا اور بہت زیادہ مال غنیمت

حاصل کیا۔ جلالہ پورے مال کو چوری سے خود حاصل کرنا چاھتا تھا چنانچہ اس کے ٹولی اور ہزارہ قبائل کی ایک ٹولی میں جھڑپ ہوگئی اور وہ شخص جسے پوری شاھی فوج قابو میں نہیں لا سکی تھی اتفاقیہ گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد اس کے بھتیجے احداد نے تاریکیوں کی قیادت سنبھال لی۔

اکبر کے بعد اس کے کسی جانشین اور مغلیہ دور کے بعد درانیوں میں سے بھی کسی نے سوات اور دوسرے پہاڑی علاقوں کو باقاعدہ حکومت کے تحت لانے کی سنجیدگی کے ساتھ کوشش نہیں کی اور سمہ میں بھی حکومت کا کنٹرول کمزور رہا۔ لیکن سمہ میں اکبر کی تباہ کاریوں کا ایک نتیجہ ضرور نکلا۔ خٹک قبیلہ نے جو اکوڑے اور اس کے جانشینوں کی قیادت میں مغلوں کا وفادار تھا نہ صرف دریائے کابل کے شمال میں اکوڑہ کے بالمقابل یوسف زئیوں کے ایک وسیع علاقہ کو تاخت و تاراج کردیا بلکہ ان پہاڑیوں کی تلہٹی میں جو یوسف زئی اور مندڑ علاقہ کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ھیں بائے زئی کے علاقہ میں اپنی نو آبادی بھی قائم کرلی۔ اس طرح سوات کی سرحد پر خٹک قبیلہ کے دیہات لوند خوڑ جمال گڑھی اور کاٹلنگ کی بنیاد پڑی۔ یوسف زئیوں کے خلاف مغلوں کی تمام لڑائیوں میں خٹک قبیلہ نے نمایاں حصہ لیا۔ اس رقابت کی گونج اکوڑے کے پڑپوتے خوشحال خان کی شاعری میں سنائی دیتی ھے۔

تاریخ کی ترازو میں تولا جائے تو مغلوں نے جتنی جدوجہد کی انہیں اتنا صلہ نہیں ملا۔ اکبر کو کسی قبیلہ پر فیصلہ کن غلبہ نہیں ہوا۔ یہ اور بات ھے کہ بعض قبائل نے اپنی غرض سامنے رکھتے ہوئے شاہراہ کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔

فصل پانژدهم

خوشحال خان اور اورنگزیب

۱۶۰۵ء (۱۰۱۴ ھجری) میں اکبر کی وفات کے بعد اب ھم مغلیہ عہد کے اس دور کے قریب پہنچ گئے ھیں جس کے متعلق خٹک قبیلہ کے سردار اور ملک اکوڑے کے پرپوتے خوشحال خان (۱۶۱۳-۸۹) نے ضخیم کتابیں لکھی ھیں۔ ھم تک اس کی جو تصنیفات پہنچی ھیں ان میں سے بیشتر پختو شاعری کے مجموعے ھیں۔ ان میں سے بہت سے اشعار ھر پٹھان کی نوک زبان پر ھیں۔ لیکن اس نے نثر میں بھی مذھب اور فلسفہ سے لے کر کھیلوں اور باز کے شکار تک مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ھے اس نے اکوڑے کے زمانہ سے اپنے عہد تک کے واقعات پر مشتمل ایک تاریخ بھی لکھی ھے۔ اس کا کچھ حصہ فارسی میں تھا۔ یہ تصنیف بیشتر ضائع ھوچکی ھے پھر بھی خوشحال کے بہت سے خیالات اور مقولے حوالوں کی شکل میں تاریخ مرصع میں محفوظ ھیں جو اس کے پوتے افضل خان نے مرتب کی ھے اس کی عبارت سادہ ھے اور خوشحال کی مرصع اور پرتکلف شاعری سے بالکل مختلف ھے۔ جب اکبر کا جانشین جہانگیر ۱۶۲۷ء میں فوت ھوا اس وقت تک خوشحال خان کو خٹک قبیلہ کی سرداری نہیں ملتی تھی اور وہ اس وقت تک سن شعور کو نہیں پہنچا تھا۔ وہ ۱۶۴۱ء میں قبیلہ کا سردار بنایا گیا۔ لیکن خوشحال سے پہلے اس کے دادا یحییٰ خان اور والد شہباز خان جہانگیر کے عہد میں قبیلہ کے سردار تھے اور خوشحال نے اپنی تحریروں میں اپنے آبا کے کارناموں کا بھی تذکرہ کیا ھے۔

۱۶۰۵ء میں اکبر کی وفات سے لیکر ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات تک ایک صدی کے عرصہ میں سرحدی علاقہ میں جو واقعات رونما

ہوئے انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصہ میں جہانگیر کے واقعات آتے ہیں اور دوسرے میں اورنگ زیب کے عہد کے واقعات شامل ہیں۔ پہلا دور یوسف زئیوں اور پہاڑی قبائل کے خلاف جو روشنیہ اتحاد کے زیر اثر آگئے تھے اکبر کی لڑائیوں کے عواقب اور قندھار پر قبضہ کے لئے ہندوستان کے مغلوں اور ایران کے صفویوں کی کشاکش میں گزر گیا۔ زیر بحث صدی کا نصف آخر خوشحال کی اپنی زندگی کے گونا گوں واقعات اور اورنگ زیب کے خلاف خٹک قبیلہ جو کبھی مغلوں کا وفادار تھا اور کچھ دوسرے قبائل کی بغاوت پر محیط رہا۔ اس بغاوت کی روح رواں خود خوشحال تھا۔

قندھار پر قبضہ کے لئے کشاکش اس کتاب کے دائرہ بحث سے باہر ہے لیکن اس سے بعد میں افغانوں کے مختلف گروہوں کے رابطہ اور امتیازات پر اتنی گہری روشنی پڑتی ہے کہ اس کا بیان تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے اسی کے ساتھ ابدالیوں کے ظہور کا قصہ بھی وابستہ ہے (جو بعد میں درانی کہلانے لگے) جن کا اس موقع پر پہلے پہل تذکرہ ملتا ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں ہمایوں اور اکبر کے عہد پر نظر ڈالنا ہوگی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے۔ ہرات کے حسین بیقرا کی وفات کے بعد چند سال تک اس کا تخت خالی پڑا رہا اور آخر بابر نے جو بیقرا کا عزیز تھا ۱۵۲۲ء میں قندھار پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کی وفات کے بعد قندھار ہمایوں کے چھوٹے بھائی مرزا کامران کے قبضہ میں چلا گیا۔ آخر ہمایوں نے ایران کی مدد سے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کرنے کے منصوبہ کی پہلی کڑی کے طور پر ۱۵۴۵ء میں اس پر پھر قبضہ کرلیا۔ ہندوستان پر ہمایوں کا قبضہ ۱۵۵۵ء میں ہوا۔ ہمایوں نے قندھار کو اپنے مشیر بیرم خاں کی جاگیر میں دے دیا جو ایک ترکمان تھا اور بعد میں اکبر کا اتالیق بنا۔ لیکن ہمایوں نے قندھار پر قبضہ ایران کے صفوی بادشاہ کی مدد سے کیا تھا اور بادشاہ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان پر قابض ہوتے ہی قندھار شہر اور صوبہ ایران کے حکمران کے حوالہ کردے گا۔

ہمایوں دہلی پر دوبارہ قابض ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد فوت ہوگیا اور اپنے وعدہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس نے شاہ محمد کو بیرم خان کے نائب کے طور پر جس کی یہ جاگیر تھی قندھار کا حاکم

مقرر کیا تھا۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی وفات کے بعد ہمسایہ صوبہ زمین داور کے حاکم نے قندھار پر حملہ کر دیا۔ شاہ محمد کو معلوم تھا کہ نو عمر اکبر اور اس کا اتالیق بیرم خان ہندوستان میں اپنی حکومت مستحکم کرنے میں اتنے مصروف ہیں کہ وہ شاہی فوج قندھار نہیں بھیج سکتے۔ چنانچہ اس نے شاہ ایران سے مدد مانگی اور ہمایوں کے ساتھ معاھدہ یاد دلایا۔ شاہ نے ایک طاقتور فوج قندھار بھیج دی جس نے حملہ آوروں کو مار بھگایا اور پھر قندھار پر قبضہ کرنے کا قصد کیا۔ لیکن شاہ محمد نے جس کا مقصد پورا ہوچکا تھا سمجھوتہ کے اس حصہ پر عملدرآمد سے انکار کر دیا۔ شاہ نے غضب ناک ہو کر شہر کا محاصرہ کرلیا۔

یہ ۱۵۵۸ء کا واقعہ ہے اس وقت اکبر کی عمر صرف سولہ سال تھی اور اسے بہت سے مسائل درپیش تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان پابندیوں سے بھی تنگ آیا ہوا تھا جو اس کے اتالیق بیرم خان نے اس پر عائد کر رکھی تھیں۔ غالباً اکبر نوجوانی کے جوش میں کوئی ایسا قدم اٹھانے کے خلاف نہیں تھا جس سے اس کے سرپرست کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ بہرحال شاہ محمد کو یہ واضح حکم بھیج دیا گیا کہ ہمایوں کے ساتھ جو معاھدہ ہوا تھا اس کی پابندی کی جائے۔ قندھار شاہ فارس کے افسروں کے حوالہ کیا جائے اور اپنے کئے کی معافی مانگی جائے۔ ساتھ ھی ساتھ شاہ محمد کو حاضر دربار ہونے کا بھی حکم دیا گیا۔ چنانچہ اس نے ایسا ھی کیا اور قندھار شہر اور صوبہ آئندہ سینتیس (۳۷) سال تک صفوی سلطنت کا حصہ بنا رہا۔ پھر یہ صوبہ ایرانی شہزادہ سلطان حسین مرزا کو جاگیر میں ملا اور اس سے اس کے بیٹے مظفر مرزا کو وراثت میں ملا۔

۱۵۸۷ء میں یعنی بیربل کی وفات سے اگلے سال عباس اعظم اصفہان میں صفوی تخت پر بیٹھا۔ قندھار اس وقت تک اس کی سلطنت کا حصہ تھا دو سال بعد ملک سدو کو قندھار کے آس پاس رہنے والے ابدالیوں کا سردار چن لیا گیا۔ اس وقت سے ملک سدو کا قبیلہ سدوزئی کہلانے لگا۔ یہ ابدالیوں کا پہلا تاریخی تذکرہ ہے حالانکہ بعد کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابدال ترین کا تیسرا بیٹا تھا اور محمود غزنوی کا ہم عصر تھا اور زیرک جو پوپل زئیوں (جن کی ایک شاخ سدوزئی بھی ھیں) اور بارک زئیوں کا جد امجد ہے تیمور لنگ کا ہم عصر تھا۔ جس طرح ملک

اکوڑے نے اکبر کے حکم پر ہندوستان کی طرف سے پشاور جانے والی سڑک کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا اسی طرح اس کے ہم عصر ملک سدو نے شاہ عباس کے ایما پر یہ ذمہ داری قبول کر لی تھی کہ وہ ایران سے ہرات کے راستہ قندھار تک جانے والی سڑک کی حفاظت کرے گا۔ بہ الفاظ دیگر خٹک اور ابدالی تاریخ میں قریب قریب بہ یک وقت نمودار ہوتے ہیں۔ اول الذکر قبیلہ مغلوں کے اہلکار کی حیثیت سے اور موخرالذکر ایرانیوں کی رعایا کی حیثیت سے۔

۱۵۹۵ء میں اکبر قندھار پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ یہ قبضہ فریب کے ذریعہ ہوا۔ اس نے مظفر مرزا اور اس کے بھائیوں کے باہمی تنازعہ کو ہوا دی اور انہیں ازبکوں سے بچ کر ہندوستان میں پناہ لینے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہوگیا۔ ادھر وہ در پردہ ازبکوں کو قندھار پر چڑھائی کے لئے اکسا رہا تھا۔ آخر بڑی حکمت عملی سے کام لے کر مظفر مرزا سے اکبر کی خدمت میں یہ درخواست بھجوائی گئی کہ وہ قندھار کا انتظام سنبھالنے کے لئے کوئی افسر بھیج دے۔ اکبر نے اس موقع پر شاہ ایران کے ساتھ اپنے والد کا معاہدہ بالکل فراموش کردیا اور مظفر کی درخواست فوری طور پر منظور کرتے ہوئے شاہ بیگ کو قندھار بھیج دیا۔ یہ وہی شاہ بیگ ہے جو اکبر کے بھائی مرزا حکیم کی طرف سے پشاور کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس کے بعد قندھار ۱۶۲۲ء تک مغلوں کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ جہانگیر نے ایک بار پھر اسے ہاتھ سے کھو دیا اور شاہ عباس نے جو ستائیس سال پہلے شہر پر اکبر کے قبضہ کو بھولا نہیں تھا اس پر پھر قبضہ کرلیا۔ شاہ عباس ۱۶۲۹ء میں فوت ہوگیا اور مغل حکمران شاہ جہان نے ۱۶۳۸ء میں دغابازی سے پھر اس پر قبضہ کرلیا (یہ دغا صفوی گورنر علی مردان نے کی تھی) لیکن ۱۶۴۹ء میں پھر ہاتھ سے کھو دیا۔ شاہ جہان کے دور حکومت میں اس کے بیٹوں اورنگ زیب اور دارا نے قندھار کو ایک بار پھر مغل سلطنت میں شامل کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن اس مرتبہ یہ صوبہ ہمیشہ کے لئے مغلوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ مغلوں نے دونوں مرتبہ دغا بازی سے قندھار حاصل کیا اور ایرانیوں نے دونوں مرتبہ بزور بازو اسے واپس لے لیا۔

اس دگرگوں کشاکشی کی تفصیلات ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ یہ ظاہر ہوجانے سے کہ قندھار کی قسمت مغلوں کے ساتھ نہیں بلکہ ایران کے ساتھ وابستہ تھی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ قندھار کے علاقہ میں افغان قبائل کو علاحدہ کس طرح عروج حاصل ہوا۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں مجموعی طور پر قندھار تقریباً پچاس سال تک مغلوں کے قبضہ میں رہا ۱۶۳۹ء کے بعد اس پر ایران کا قبضہ ہوگیا اور ۱۷۰۸ء میں غلجیوں کی بغاوت کے وقت تک ایران ہی کے قبضہ میں رہا۔ تیس سال کے وقفہ کے بعد جس میں اس پر غلجیوں کی حکومت رہی قندھار ایک بار پھر نادرشاہ کے عہد میں ایرانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

شاہ عباس اعظم کے زمانہ میں ملک سدو نے صرف ایرانی حکمران کی شاہراہ کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ ۱۶۲۲ء میں اس علاقہ کو جہانگیر سے چھیننے کے سلسلہ میں ایسا کار نمایاں انجام دیا کہ اسے میر افاغنہ کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے قبیلہ نے ہمیشہ دہلی اور کابل کے حکمرانوں کے مقابلہ پر اصفہان کے حکمرانوں کا ساتھ دیا اور صفوی حکمران اس قبیلہ کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتے رہے۔ یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کیونکہ قریباً تمام افغانوں کی طرح ابدالی بھی حنفی العقیدہ سنی تھے اور مغلوں کا بھی یہی مذہب تھا (بہ استثنائے اکبر، جس نے الحاد کا راستہ اختیار کیا تھا) اور ایرانی شیعہ تھے۔ میرا خیال ہے ریورٹی کی یہ رائے درست ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ صفویوں کے تحت قبائل کو کبھی کسی ہندو کی اطاعت کی ذلت برداشت نہیں کرنی پڑی۔ وہ اپنے اس حنفی بھائی پر جو انہیں اس طرح ذلیل کر سکتا تھا شیعہ کو ترجیح دیتے تھے۔

ہمیں بعد میں چل کر معلوم ہوگا کہ قندھار پر قبضہ کی کشاکش کے دوران ملک سدو اور ایران کے حکمراں صفوی خاندان میں جو تعلقات پیدا ہوئے ان ہی کی بنیاد پر ایک صدی بعد نادر شاہ نے ابدالیوں سے اپنی فوج کے ہراول کا کام لیا۔ اور نادر کی وفات کے بعد احمد خان ابدالی جو ملک سدو کے اخلاف میں سے تھا نادر کی مٹی ہوئی سلطنت کی بنیادوں پر تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک افغان سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا

جس پر فارس کا رنگ غالب تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ھے کہ شاہ عباس اعظم کے عہد سے صدیوں پہلے ابدالیوں کے اسلاف کا فارس سے کوئی تعلق ھی نہیں رھا تھا۔

قندھار پر قبضہ کے لئے اس طویل کشاکش کا ایک اور نتیجہ برآمد ھوا۔ ۱۶۳۸ء اور ۱۶۴۹ء کے درمیان کے مختصر عرصہ میں جبکہ شاہ جہاں علی مردان خان کی غداری کی بدولت مغلوں کی طرف سے قندھار پر آخری بار قبضہ کرنے میں کامیاب ھوگیا تو آس پاس کے افغان قبیلوں خاص طور پر ابدالیوں میں مغلوں کے حامی پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی گئی۔ ابدالی قبیلہ کی وہ ٹکڑیاں جو ملک سدو کی ٹکڑی کی مخالف تھیں اور ان میں کچھ سدوزئی گھرانے بھی شامل تھے مغلوں کی حامی بن گئیں جب ۱۶۴۹ء میں صفوی بادشاہ عباس دویم نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو یہ قبائل فرار ھوکر اورنگ زیب کی فوج میں شامل ھوگئے جسے شاہ جہان نے قندھار پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ ۱۶۴۹ء اور ۱۶۵۳ء کے درمیانی عرصہ میں اورنگ زیب اور اس کے بھائی دارا شکوہ نے شہر پر قبضہ کرنے کی بار بار کوشش کی۔ ان کوششوں میں ابدالی قبائل نے نمایاں حصہ لیا۔ جب قندھار دھلی کی حکومت کے قبضہ میں نہ آسکا تو ابدالی قبیلہ کی ان ٹولیوں نے فارس کی حکومت کے سامنے ھتھیار ڈالنے پر اپنے گھر بار چھوڑنے کو ترجیح دی۔ جب اورنگ زیب بادشاہ بنا تو ان قبائل کی حمایت اور وفاداری کے صلہ میں اس نے انہیں ملتان میں بسادیا جہاں ان کے بہت سے اعزا اور نوکر چاکر ان سے آملے اور وہ سب کے سب ملتانی افغان کہلانے لگے۔ ملتان اور آس پاس کے ڈیرہ جات کے گورنروں کے عہد سے ان ھی آبادکاروں میں سے کسی ایک خیل سدوزئی یا علی زئی کے پاس چلے آتے رھے۔ یہ سلسلہ مغلوں کے زوال کے عہد کے آخر تک قائم رھا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے شروع میں رنجیت سنگھ نے ملتان اور ڈیرہ جات فتح کرلئے۔ ان ملتانی افغانوں کے اخلاف کو آج بھی مغربی پاکستان کی سیاست اور سرکاری محکموں میں نمایاں حیثیت حاصل ھے۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنی اصلی زبان پشتو بھول چکے ھیں لیکن وہ اپنے خاندان اور تاریخ پر آج بھی فخر کرتے ھیں۔

قندھار کے لئے رسہ کشی نے اکبر کے جانشین کو خود اس کی

قلمرو کے آس پاس قبائلی جھگڑوں سے نجات نہیں دلائی۔ جہانگیر کو سرحدی علاقہ سے پہلے پہل ۱۶۰۷ء میں اپنی حکومت کے تیسرے سال واسطہ پڑا جبکہ وہ کابل پہنچا اور اس موقع پر اس نے اپنے دادا بابر کی تربت پر سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ جہانگیر عیش و عشرت کا دلدادہ تھا پھر بھی اس نے اس علاقہ میں امور سلطنت پر توجہ دینے کے لئے وقت نکال ھی لیا۔ اس کی نظر میں اس کے باپ کے زمانہ کا سب سے کامیاب افسر شاہ بیگ تھا جس نے بارہ سال پہلے قندھار پر قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے کابل، تیراہ، بنگش، سوات، اور باجوڑ کی سرکار کی گورنری اسی کے حوالہ کر دی اور اس پورے علاقہ کا جہاں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اختیار اس کے حوالہ کر دیا افغان علاقہ اس کی جاگیر میں دے دیا اور اسے خان دوراں کا لقب بھی عطا کیا۔ تیراہ اور بنگش کا خاص طور پر تذکرہ بے وجہ نہیں ہے۔ روشنیہ تحریک پھر زور پکڑ گئی تھی اور حکومت کے لئے درد سر بنی ہوئی تھی۔

جلالہ کی وفات کے بعد روشنیہ فرقہ کی قیادت اس کے بھتیجے احداد کے سپرد ہوئی جو بایزید کے سب سے بڑے بیٹے شیخ عمر کا بیٹا تھا۔ احداد نے جلالہ کی بیٹی بی بی علائی سے شادی کی تھی جو حسین اور بلند کردار تھی۔ خوشحال خاں جو حسین چہرہ سے ہمیشہ متاثر ہو جاتا ہے اس کے متعلق لکھتا ہے کہ ''وہ پورے روشنیہ فرقہ کی منظور نظر تھی،، تیراہ کے قبائل افریدیوں اورکزئیوں اور بنگش سے احداد اور علائی کے بہت سے مرید تھے اور وہ ایک پہاڑی مورچہ سے دوسرے پہاڑی مورچہ پر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ شاہ بیگ ہمیشہ یہ کوشش کرتا رہا کہ روشنیہ فرقہ کے ساتھ کھلم کھلا مقابلہ کی نوبت آئے لیکن جب ۱۶۲۰ء میں اس کی جگہ مہابت خاں کابل کا گورنر بنا تو کھلم کھلا لڑائی کے سوا چارہ نہ رہا۔ یہ مہابت خاں وھی ہے جو بعد میں ملکہ نورجہاں کا دشمن ہو گیا تھا اور جس نے دریائے جہلم کے کنارے شہنشاہ جہانگیر کو نظربند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے روشنیوں کے ساتھ بھی قریب قریب ایسا ھی سلوک کیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ احداد کے حامیوں کی بڑی تعداد دولت زئی شاخ کے اورکزئیوں سے تعلق رکھتی ہے اور یہ لوگ کوھاٹ کے قریب رھتے ھیں تو اس نے ان سب کو اپنے پاس بلایا ان کی ضیافت کی اور انہیں خلعت پہنانے کے بہانہ ھتھیار رکھوالئے

پھر ان سب کو جن کی تعداد تین سو تھی قتل کرادیا۔ مہابت خان نے یہ سمجھ کر کہ دشمن کی کمر ٹوٹ چکی ہے اپنے ایک ملازم غیرت خان کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ احداد اور اس کے باقی ساتھیوں کو جو تیراہ میں بالائی مستورہ وادی میں قدم جمائے ہوئے تھے نیست و نابود کردئے۔

مغل فوج کوھاٹ سے خانکی ھوتی ھوئی درہ سمپگا تک پہنچ گئی یہ خانکی سے مستورہ جانے کا آسان ترین راستہ ھے اور اسی راستے سے انگریز فوج ۱۸۹۷ء میں سمانا اور درگئی پر قبضہ کرنے کے بعد تیراہ میں داخل ھوئی تھی۔ درہ بجائے خود زیادہ دشوارگزار نہیں ھے اور اس کے جنوبی حصہ کا سامنے کی سمانا پہاڑیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ھے لیکن پوری چڑھائی بڑی طویل اور تھکا دینے والی ھے اور درہ کی چوٹی سطح سمندر سے چھ ھزار فٹ بلند ھے۔ خوشحال خان اور جہانگیر دونوں نے اس لڑائی کی تفصیلات لکھی ھیں۔ چوٹی پر افریدیوں اور اورکزئیوں کا قبضہ تھا جن کی قیادت احداد اور ایک اورکزئی ملک تور (سیاہ) کے ھاتھ میں تھی۔ مغل کماندار غیرت خان آگے بڑھتا ھوا چوٹی تک پہنچ گیا جہاں دست بدست لڑائی شروع ھوگئی۔ حملہ آور فوج نے وادی سے اوپر کی طرف تین ھزار فٹ کی چڑھائی طے کی تھی اور ان کی سانس پھولی ھوئی تھی۔ پنجو نامی ایک فیروز خیل اورکزئی نے غیرت خان کو تاکا۔ وہ آگے بڑھکر غیرت خان سے گتھم گتھا ھوگیا۔ دونوں زمین پر گر کر ایک دوسرے پر لڑھکنے لگے۔ پنجو ھومر کے انداز میں چلایا ”بھائیو حملہ کرو۔ مجھے بھی ساتھ ھی قتل کردو لیکن اسے نہ جانے دو“ انہوں نے ایسا ھی کیا اور ان دونوں کو اس حالت میں کہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے قتل کر دیا اس کے بعد گھمسان کا رن پڑا لیکن مغل فوج دب رھی تھی کیونکہ اول تو وہ اس علاقہ سے ناواقف تھی اور دوسرے چڑھائی چڑھنے کی وجہ سے تھکی ھوئی تھی چنانچہ قبائل کے حوصلے اور بڑھ گئے جہانگیر لکھتا ھے ”غیرت خان جو بہت تند مزاج تھا اور دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے لئے تلا رھتا تھا اس نے کسی کی نصیحت نہ مانی اور آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے چڑھائی پر پیش قدمی شروع کی اور قبائل نے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح ھر طرف امنڈ آئے تھے پوری فوج کو نرغہ میں لے لیا۔ انہوں نے غیرت خان کے گھوڑے کے پاؤں قلم

کردئے اور اسے گھوڑے سے نیچے اتار کر ساتھیوں سمیت قتل کردیا۔ جس وقت غیرت خان نے حملہ کیا اس وقت جلال خان گھکڑ جس نے غیرت کو حملہ سے باز رکھنے کا مشورہ دیا تھا اور دوسرے سرکاری ملازم جان کے خوف سے اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گئے اور کوتل کے ہر حصہ سے فرار ہوگئے افغانوں نے کوتل کے ہر حصہ سے ان پر پتھر اور تیر برسائے فرار ہونے والوں کو نرغہ میں لے لیا اور فوج کے بڑے حصہ کو بے دردی سے قتل کردیا۔ ہلاک ہونے والوں میں جلال اور غیرت دونوں شامل تھے اور یہ تمام نقصان غیرت خان کی جلد بازی اور تیز مزاجی کی وجہ سے ہوا،،۔

اس فتح سے چھ سال بعد احداد ضلع کوہاٹ کے جنوب میں لواغر کی پہاڑیوں میں نئے گورنر کے بیٹے مظفر خان کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا۔ وہ پتھروں کے ایک سنگو کے پیچھے سے نکل کر دوسرے سنگر کی آڑ میں جا رہا تھا کہ اسے قتل کردیا گیا۔ احداد کا سر، عصا اور مہر جہانگیر کے سامنے اس وقت پیش کی گئیں جبکہ بادشاہ ۱۶۲۶ء میں کابل کے سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔ احداد کے پیرو اس کی حسین بیوہ کی قیادت میں ایک بار پھر تیراہ میں جمع ہوگئے۔ بعد میں اس عورت نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اپنے بیٹے عبدالقادر کو جو احداد کی پشت سے تھا فرقہ کا امام بنوا دیا۔ ایک سال بعد جہانگیر فوت ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا شاہ جہان تخت پر بیٹھا۔

احداد کے قاتل مظفر خان کو اس کارنامہ کے صلہ میں اپنے باپ کے نائب کے عہدہ سے ترقی دیکر صوبہ کا گورنر بنادیا گیا۔ شاہ جہان کے دور حکومت کے پہلے ہی سال مظفر خان نے کابل سے پشاور پر چڑھائی کا قصد کیا۔ اسے لاکھ سمجھایا گیا۔ کہ ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد جو بے چینی پھیلتی ہے اسے فرو ہونے دے لیکن اس نے ایک نہ سنی اور آخر درۂ خیبر پہنچ کر مصیبت میں پھنس گیا۔ شاہ جہان نے بادشاہ نامہ میں لکھا ہے ''اس پہاڑی علاقہ کے جنگجو افاغنہ میں سے دو قبیلے یعنی اورک زئی اور افریدی شکاری پرندوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ یہ لوگ بظاہر وفا شعار ہیں لیکن بہ باطن افرا تفری سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور لوٹ

مار کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں (۱)۔ چنانچہ قبائل نے مظفر خان کا راستہ روک لیا اور فوج کا سامان لوٹنا شروع کردیا۔ مظفر خان نے کسی تجربہ کار افسر کو فوج کے پچھلے حصہ کی حفاظت پر مامور نہیں کیا تھا اس لئے بہت سا سامان لٹ گیا۔ مظفر خان نے اس افراتفری پر قابو پانے اور لوٹ مار روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی یہاں تک کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے پلٹنا یا ٹھہرنا بھی گوارا نہ کیا،،۔

یہ حملہ بی بی علائی اور اس کے بیٹے عبدالقادر کی سر کردگی میں ہوا تھا۔ مظفر خان فرار ہو گیا اور اس کے زمانہ کی حسین و جمیل عورتیں تک قبائیلوں کے قبضہ میں آئیں۔ صرف ایک خاتون کو کوہاٹ کے نائب گورنر سید خان کی کوششوں سے اور یرغمال دے کر چھوڑا لیا گیا۔ سید خان نیا نام ہے جس سے اس علاقہ میں مغلوں کی پیہم شکست کی کہانی میں نیا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

مظفر خان کی ذلت آمیز شکست کے بعد قبائلی علاقہ میں عام بغاوت پھیل گئی۔ اس بغاوت کی قیادت روشنیہ فرقہ کا قائد عبدالقادر کر رہا تھا۔ صرف پشاور کے قریب بسنے والے خلیل مہمند اور داؤد زئی اور خٹک قبیلہ کا بڑا حصہ جس کی قیادت شہباز خان کے ہاتھ تھی بغاوت سے الگ رہا شہباز خان خوشحال خان کا باپ اور ملک اکوڑے کا پوتا تھا۔ افریدی اورک زئی بنگش مچنی سے لالپورہ تک پھیلے ہوئے پہاڑی ، مہمند، یوسف زئی، محمد زئی، گگیانی، اور ترکلانی یہاں تک کہ بنوں اور دوڑ کے قبائل اور توری اور جاجی ایلم گدر کے مقام پر جہاں باڑہ دریا پشاور کے میدان میں داخل ہوتا ہے ایک بڑے لشکر کی شکل میں جمع ہوئے۔ اس لشکر نے خود پشاور کے محاصرہ کا قصد کیا۔ ۱۲ جون ۱۶۳۰ء کو بالکل اسی طرح جس طرح ان کے اخلاف ٹھیک تین سو سال بعد جون ہی کے مہینے میں پشاور کا محاصرہ کرنے والے تھے انہوں نے شہر کی دیواروں کو گھیر لیا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ دیواریں اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ ہر مقام پر ان کی حفاظت کے لئے فوج کافی نہیں ہے۔

(۱) مغل وقائع نگار بعد میں آنے والے بعض انگریز مصنفوں کی طرح قبائل کے لئے جو اپنی آزادی کی خاطر جنگ کر رہے تھے اسی قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں۔

جو لوگ پٹھانوں کو تاریخ میں ان کی جرأت اور زیرکی کے شایان شان مقام دلانے کے حامی ہیں انہیں اس واقعہ کے متعلق خوشحال خان کا بیان بطور عبرت پڑھنا چاھئے وہ لکھتا ھے "مغل فوج کو جو پشاور میں چھاؤنی ڈالے ہوئے تھی قلعہ میں محصور ہو جانا پڑا اور پورے شہر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس مرحلہ پر سید خان جو بنگش کا فوجدار تھا محصور فوج کی امداد کے لئے کوھاٹ سے کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ شروع میں محاصرہ کی ذمہ داری صرف عبدالقادر اور اس کی فوج کے سپرد تھی پھر جب دوسرے قبائل بھی اس کی مدد کے لئے آپہنچے تو پٹھانوں کی روایتی کج فہمی اور ھٹ دھرمی نے اپنا رنگ دکھایا۔ وہ اسی عبدالقادر سے حسد کرنے لگے جس کی مدد کے لئے وہ یہاں آئے تھے اور یہ سوچنے لگے کہ محاصرہ کا پورا اعزاز صرف عبدالقادر ھی کو حاصل ہو رہا ھے چنانچہ انہوں نے عبدالقادر کے متعلق معاندانہ باتیں شروع کر دیں۔ ادھر عبدالقادر کو بھی یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ یہ قبائل مغلوں کے ساتھ مل کر اسے دشمن کے حوالہ نہ کر دیں۔ یہ سوچ کر وہ ایک رات چپکے سے خیمہ سے نکل گیا اور واپس تیراہ پہنچ گیا۔ دوسرے قبائل بھی منتشر ہونے کی تجویز پر غور کرنے لگے۔ اس وقت تک سید خان کوھاٹ سے پشاور پہنچ چکا تھا اور قلعہ میں محصور مغل فوج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ کچھ قبائل منتشر ہو چکے ھیں چنانچہ وہ سید خان کی قیادت میں قلعہ سے نکلی اور جو پختون موجود تھے ان پر حملہ کر دیا۔ اور بہت سوں کو قتل کر دیا۔ بہت سے قبائل جنہیں اپنے ساتھیوں کے منتشر ہو جانے کا حال معلوم نہیں تھا بے خبری میں سڑکوں پر اور گلیوں میں گھر کر قتل ہو گئے۔ اس لڑائی میں بہت سے یوسف زئی اور گگیانی بھی مارے گئے خوشحال خان آخر میں لکھتا ھے کہ "اس لڑائی کے بعد صوبہ میں مغلوں کا اقتدار تسلیم ہونے لگا"۔

شاہ جہان سید خان سے اتنا خوش ہوا کہ اسے کابل کا گورنر بنادیا اور اسے پنج ہزاری منصب عطا کر دیا۔ اسی پر بس نہیں ہوا بلکہ سید خان کا وقار اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے کچھ چالاکی اور کچھ دباؤ سے کام لے کر بی بی علائی اور اس کے بیٹے عبدالقادر کو جان کی امان کی ضمانت پر ھتھیار ڈالنے پر امادہ کرلیا۔ سید خان صرف بہادر ھی نہیں تھا بلکہ منصف مزاج بھی تھا۔ ھتھیار ڈالنے کے چند ماہ بعد عبدالقادر خان طبعی

موت مرگیا۔ اس کی ماں علائی اپنے ایک بھائی رشید خان اور بہت سے تاریکیوں کے ساتھ جو پشاور اور کوہاٹ کے علاقہ میں بغاوت پھیلائے ہوئے تھے دھلی میں شہنشاہ کے دربار میں پیش ہوئی۔ ان سب لوگوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا گیا اور اعزاز کے ساتھ دکن بھیج دیا گیا جہاں انہیں اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ سلطنت کی خدمت کے لئے اپنے متبعین کو بھی اپنے پاس بلا سکتے ھیں۔ بحیثیت مجموعی شاہ جہان نے پیر روشن یا پیر تاریک کے اخلاف کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ رشید خان دریائے گنگا کے کنارے فرخ آباد کے قریب عزلت گزیں ہو گیا اور ۱۶۴۷ء میں وھیں فوت ھوا۔ اس کا ایک اور عزیز مرزا انصاری جس کا کلام پختو شاعروں میں سب سے زیادہ صوفیانہ ھے دکن میں شاھی فوج کی طرف سے لڑتے ھوئے ۱۶۳۳ء میں ھلاک ھوا۔ راسخ العقیدہ سنیوں کا کہنا ھے کہ مرزا انصاری نے مرنے سے پہلے اپنے دادا کے عقائد سے توبہ کرلی تھی اور ایمان لے آیا تھا چنانچہ آج بھی ان سنیوں میں اس کی کم عزت نہیں ھے۔ لیکن میرا خیال ھے کہ اس کے اشعار کچھ اور ھی ظاھر کرتے ھیں کیونکہ وہ لکھتا ھے:۔

ھر ولی جو کوئی پیغام لے کر اٹھتا ھے
اس سے کرامات ظاھر ھوتی ھیں
مرزا کے تمام شبہات دور ھو چکے ھیں اور اب کوئی شبہ نہیں رھا
اور اس کی زبان سے میاں روشن مصروف گفتگو ھیں

اور کم عمری میں موت کے متعلق لکھتا ھے ع

جس طرح گلاب کھلتا ھے اسی طرح مرجھا بھی جاتا ھے
گلاب کی طرح میری زندگی بھی مختصر ھے
لیکن میرے لئے موت زندگی سے بہتر ھے
کیونکہ میں نے اپنی جان اپنے محبوب کی محبت کے لئے وقف کردی ھے۔

ایک منظم تحریک کی حیثیت سے روشنیوں یا تاریکیوں کا کوئی نشان باقی نہیں رھا۔ لیکن اس نے تیراہ میں آذارمیر اور کے زئی اور یوسف افریدی جیسے پیرو چھوڑے ھیں جو ایسے زبردست شمشیرزن تھے کہ آج تک ان کے کارنامے گیتوں میں گائے جاتے ھیں۔ یہ فرقہ ختم ھو چکا ھے

لیکن تیراہ کی آزادی میں افریدیوں کا دخل ایک روایت بن چکا ہے جو ایک زندہ روایت ہے اور جسے قائم کرنے میں اس فرقہ کا بڑا ہاتھ ہے۔

پشاور کے محاصرہ میں عبدالقادر کا دست راست کمال الدین نامی اس کا ایک مرید تھا جو انصاری خاندان سے نہیں تھا لیکن پٹھان تھا اور اس کا باپ جہانگیر کے مصاحبوں میں سے تھا۔ چونکہ وہ روشنیہ تحریک کے لیڈروں کے خاندان سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود ملحد تھا اس لئے اس پر خاص طور سے لعنت بھیجی جاتی ہے اور اس کا نام بایزید کے بعد اس کے پہلے خلیفہ جلالہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کی گزرگاہ میں اس مقام پر جہاں اس دریا میں لنڈائے دریا آکر ملتا ہے اٹک کے قریب دو چٹانیں ہیں جو جلالیہ اور کمالیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سیلاب کے دنوں میں بہت سی کشتیاں ان چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہیں راسخ العقیدہ سنیوں کا کہنا ہے کہ اسی طرح یہ دونوں روحیں پیر تاریک کے عقائد سے ٹکرا کر پاش پاش ہوچکی ہیں۔ اس کے علاوہ چراٹ کے قریب ایک پہاڑی ہے جو خٹک علاقہ میں سب سے اونچی ہے یہ پہاڑی جلالہ سر کہلاتی ہے، اور چٹانوں کے مقابلہ میں بایزید، اس کے بیٹوں اور پوتوں کی طاقت اور ذہانت کی یاد دلاتی ہے۔ ان کے مذہبی عقائد خواہ کچھ بھی ہوں لیکن تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پٹھانوں کا جذبۂ آزادی بہت کچھ ان ہی کا رہین منت ہے۔ ان کا ایک کارنامہ ان کے مخالف اخوند درویزہ کی تمام تحریروں سے زیادہ دل پر اثر کرتا ہے۔ خوشحال خان جو حنفی العقیدہ ہونے پر فخر کرتا ہے مرزا انصاری اور اخوند درویزہ کے متعلق لکھتا ہے:-

میں نے پختو شاعری کا فن کسی سے نہیں سیکھا
مرزا جو بڑے پیارے اشعار کہتا تھا مدت ہوئی مر چکا ہے
میں نے اخوند درویزہ کی کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں
اور مجھے ان میں کوئی شاعرانہ خوبی نظر نہیں آئی

خوشحال نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ اور جو کچھ کہا ہے وہ حنفی العقیدہ کے دعوے کے باوجود کہا ہے

جو لوگ پیغمبر کے ساتھیوں اور اہل بیت کے دشمن ہیں
میں انہیں نیست نابود کرنے پر تلا ہوا ہوں

سچا عقیدہ رکھنے والے چار ہیں پانچ نہیں ہیں
میں حنفی العقیدہ سنی ہوں۔

خوشحال ہمیشہ جہانگیر اور اکبر کا تذکرہ تعریف کے ساتھ کرتا ہے یہ درست ہے کہ خوشحال کے سن شعور کو پہنچنے سے پہلے جہانگیر فوت ہو چکا تھا۔ جہانگیر کی وفات کے وقت خوشحال کی عمر چودہ سال تھی۔ اس لئے جہانگیر کے متعلق اس کی یادیں اپنے باپ شہباز سے سنے ہوئے واقعات پر مبنی تھیں جن پر اس کے لڑکپن کے انداز فکر نے اور رنگ چڑھا دیا تھا جب ہی تو وہ لکھتا ہے کہ جہانگیر کے دور حکومت میں ہندوستان جنت تھا۔ لیکن خوشحال شاہ جہان کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور اس کی خدمت کر چکا تھا۔ وہ شہنشاہ کی پالکی کے ہمراہ کئی بار درۂ خیبر سے گزر چکا تھا اور اس بادشاہ سے عقیدت بھی رکھتا تھا۔ اس نے شاہ جہان کے لئے قدرداں شاہ جہان کا فقرہ استعمال کیا ہے اور کئی موقعوں پر یہ افسوس ظاہر کیا ہے کہ اس کے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں کہ وہ شہنشاہ کے شایان شان اس کی تعریف کر سکے۔ ۱۶۴۱ء میں خوشحال کا باپ شہباز اپنے باپ دادا اکوڑے اور یحییٰ خان کی طرح یوسف زئیوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا اور شاہ جہان نے خٹک قبیلہ کی سرداری اور پشاور تک جانے والی شاہراہ کی حفاظت خوشحال کو سونپ دی۔ خوشحال خان دہلی پہنچا جہاں وہ دو نامور سرداروں امانت خان اور اصالت خان سے وابستہ ہوگیا اور ان کی معیت میں کانگرہ بلخ اور بدخشاں میں کئی مہمات میں حصہ لیا اور کافی امتیاز حاصل کیا۔

لیکن خوشحال کے خاندان کے واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ان دنوں وادی پشاور میں یوسف زئیوں اور خٹک قبیلہ میں لڑائی جاری تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب بیربل کی ہلاکت کے بعد اکبر نے یوسف زئیوں کو دبانے کی کوشش کی تو خٹک قبیلہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لنڈے دریا کے شمال میں سمہ کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے دونوں قبیلوں میں دشمنی پیدا ہوگئی جو ایک صدی تک جاری رہی۔ اس عرصہ میں خوشحال کے پردادا، دادا اور والد بقول خوشحال شہیدوں کی موت مرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے زمانہ سے اورنگ زیب کے زمانہ تک مغلوں کے غلبہ کی مخالفت

میں یوسف زئی پیش پیش تھے جبکہ مغلوں کے حامی، ملک اکوڑے اور اس کے جانشینوں کو اپنا لیڈر سمجھتے تھے۔ اس لئے یوسف زئی اور خٹک قبیلوں کی لڑائی خاندانی بھی تھی قبائلی بھی اور قومی بھی۔

۳ ۔ ۱۶۴۹ء میں خوشحال نے جو خٹک قبیلہ کا سردار بن چکا تھا بیرونی علاقوں میں لڑائیوں کے بعد وطن واپس آکر اپنے علاقہ میں یوسف زئیوں کے ساتھ اپنے جھگڑے کو اور آگے بڑھانے کا قصد کیا اور شاہ جہان کو جو اس وقت تک شہنشاہ تھا اس بات پر رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ لنڈے دریا کے شمال میں یوسف زئیوں کے کچھ اور دیہات اس کی جاگیر میں شامل کردئے جائیں۔ اس پر یوسف زئی بھڑک اٹھے۔ انہوں نے بھی سوچا کہ برائے نام تخت دھلی کی اطاعت قبول کرلی جائے اور دیکھا جائے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ان کا سردار بہاکو خان دربار میں حاضر ھوا اور شہنشاہ کے بدقسمت بیٹے دارا شکوہ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ھوگیا۔ دارا شکوہ نے شاہ جہان سے درخواست کی کہ یوسف زئیوں کا قصور معاف کر دیا جائے، یوسف زئیوں کا علاقہ خوشحال کی جاگیر سے واپس لےلیا جائے اور بہاکو کے سپرد کردیا جائے۔ اس طرح یوسف زئی اور خٹک قبیلوں کی چشمک درباری سازشوں کا حصہ بن گئی اور شاہ جہان کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لئے رسہ کشی میں الجھ کر رہ گئی۔ تخت کے لئے رسہ کشی میں بہاکو نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے دارا شکوہ کا ساتھ دیا۔ خوشحال خان نے، جس سے دارا شکوہ نے مدد کی درخواست کی تھی لیکن اسے دھتکار دیا گیا تھا، یوسف زئیوں کو سمہ میں دارا شکوہ کو پناہ دینے سے روک دیا۔ اس نے یوسف زئیوں کے اس لشکر کو مار بھگایا جو دریا کے کنارے مفرور شہزادہ دارا شکوہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لئے جب اورنگ زیب تخت کا وارث بن گیا تو شروع میں اس نے خوشحال خان کے ساتھ حسن سلوک کا اظہار کیا اور اس کی سرداری کی توثیق کر دی۔

اس زمانہ میں مہابت خان کابل کا گورنر تھا۔ یہ وہ مہابت خان نہیں ہے جس کا نام جہانگیر کے دور حکومت میں مشہور ھوا کیونکہ وہ تو ۱۶۳۴ء میں دکن میں فوت ھوچکا تھا۔ یہ مہابت خان صفوی سردار علی مردان خان کا بیٹا تھا جس نے دھوکہ سے قندھار پر شاہ جہان کا قبضہ

کرادیا تھا۔ یہ وہ مہابت خان ہے جس کی بنوائی ہوئی پشاور کی مسجد مشہور ہے۔ مہابت خان بھی خوشحال کا طرفدار تھا لیکن ۱۶۶۱ء میں اورنگ زیب نے اسے دکن بھیج دیا۔ اور اس کی جگہ سید امیر کو کابل کا گورنر مقرر کردیا۔ ساتھ ھی عبدالرحیم کو پشاور میں نائب گورنر مقرر کیا گیا۔ مغلوں کے زمانہ میں کابل کے گورنر موسم کے اعتبار سے کابل یا پشاور میں رھتے تھے ان کا صدر مقام کابل ھی ھوتا تھا لیکن ان کا نائب بارہ مہینے پشاور میں رھتا تھا اور موسم گرما میں جب گورنر کابل میں ھوتا تھا تو سردیوں کے صدر مقام کی بھی نگرانی کرتا تھا۔

ایسا معلوم ھوتا ہے کہ عبدالرحیم یوسف زئیوں خاص طور پر ان کے سردار بہاکو خان کا طرفدار تھا۔ اس نے ایک فرمان حاصل کرلیا جس کی رو سے دریائے سندھ کے گھاٹ کی چونگی ختم کردی گئی چونگی کی عام معافی کا اعلان اورنگ زیب کے تخت نشین ھونے کے تھوڑے ھی دن بعد کردیا گیا تھا لیکن اس کا اطلاق سرحدی علاقہ پر نہیں ہوا تھا جہاں مخصوص حالات درپیش تھے۔ اکبر کے عہد سے اٹک پر چونگی کی وصولی ملک اکوڑے اور اس کے وارثوں کا حق چلا آرھا تھا۔ نئے حکم کا خوشحال پر بہت برا اثر پڑا اور اسے بڑا غصہ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ چونگی عام لوگوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے معاف کی گئی تھی لیکن اگر اس اقدام کو خالصتاً یوسف زئیوں کی رقابت اور خاندانی دشمنی کے خلاف ریشہ دوانی پر محمول نہ کیا جائے تب بھی کم از کم یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس اقدام کی پشت پر ان عناصر کا ھاتھ ضرور تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ خوشحال اور اس کا خٹک قبیلہ کافی عرصہ تک شاھی عنایات کا اجارہ دار بنا رھا ہے اور اس سے دوسرے قبیلہ کو نقصان پہنچا ہے جو نسبتاً زیادہ خطرناک قبیلہ ہے۔

خوشحال نے نئے حکم کے خلاف صریحی قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن ۱۶۶۴ء میں سید امیر نے اسے پشاور بلایا اور اکیاون سال کی عمر میں اسے پابہ زنجیر کر کے دھلی بھیج دیا جہاں سے اسے دو سال کی قید بھگتنے کے لئے رنتھمبھور کے قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ رنتھمبھور سے رھائی کے بعد بھی اسے گھر میں نظربند رکھا گیا اور وطن واپس جانے کی اجازت نہیں دی گئی سید امیر سات سال تک گورنر رھا لیکن سرحدی علاقہ میں خاص طور پر

یوسف زئیوں کے علاقہ میں امن قائم نہ رہ سکا۔ آخر کار خوشحال کو رہا کردیا گیا اور خود اسی کے بیان کے مطابق شہنشاہ نے اسے دربار میں بلایا اور اس سے مشورہ طلب کیا کہ سرحدی علاقہ کا حاکم کسے مقرر کیا جائے۔ ۱۶۶۸ء میں سید امیر کو بر طرف کر دیا گیا اور مہابت خان پھر اپنے پرانے عہدہ پر فائز ہوگیا۔ مہابت خان کی خصوصی درخواست پر خوشحال خان کو رہا کردیا گیا۔ اور خوشحال خان مہابت خان کے ساتھ پشاور روانہ ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۶۷۰ء کے اوائل میں مہابت خان کو ہٹا کر محمد امین (۱) کو جو لاہور کا گورنر رہ چکا تھا اس عہدہ پر فائز کردیا گیا۔ محمد امین گولکنڈہ کے ایک جوہری کا بیٹا تھا جو اورنگ زیب کی نظروں میں چڑھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اتنے اعلیٰ عہدہ پر فائز کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائی مغرور بدچلن اور بددماغ تھا اور کوئی شخص اس کے آگے دم نہیں مار سکتا تھا۔ اسے اپنی خود سری کی جلد سزا مل گئی۔

کچھ سپاہیوں نے، جو وادیٔ کونڑ میں امین کے مقرر کردہ حاکم حسین بیگ کے تنخواہ دار تھے، صافی قبیلہ کی ایک عورت کی بے حرمتی کی تھی۔ یہ قبیلہ اسی علاقہ میں آباد تھا اور بڑا سرکش تھا چنانچہ قبیلہ والوں نے تین سپاہیوں کو قتل کردیا۔ حسین بیگ نے صافی قبیلہ کے سرداروں کو حکم دیا کہ مجرموں کو اس کے حوالہ کیا جائے۔ سرداروں نے انکار کردیا۔ چنانچہ صافی قبیلہ کے دیہات نذر آتش کرنے کے لئے آس پاس کے دوسرے قبیلوں اور ان کے ہمسایوں کو طلب کیا گیا۔ یہ قبائل ان شرائط کے تحت جن کی بنا پر انہیں جاگیریں ملی ہوئی تھیں سرکاری حکم کی تعمیل کرنے کو تیار ہوگئے لیکن دوسری طرف انہوں نے چپکے سے صافیوں کو صورت حال سے باخبر کردیا اور یہ بھی کہلا دیا کہ تم نے جو کچھ کیا ہمارے نزدیک وہ مردانہ اقدام تھا۔ چنانچہ حملہ کو ناکام بنادیا گیا اور کونڑ سے تیراہ تک پورے قبائلی علاقہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔

حسین بیگ نے گورنر کو صورت حال کی اطلاع پہنچادی۔ چنانچہ گورنر امین معمول سے پہلے کابل کے سالانہ دورہ پر اس قصد کے ساتھ

(۱) یہاں وہ سید امیر مراد نہیں ہے جس نے خوشحال خان کو نظر بند کر دیا تھا۔

پشاور سے روانہ ہوا کہ وہ راستہ میں صافیوں کو سبق دیتا ہوا جائے گا مہمند اور صافی قبیلوں نے شاہی فوج کا راستہ روکنے کے ارادہ سے آپس میں اتحاد کر لیا اور بہت سے افریدی اور شنواری بھی ان سے آملے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے درۂ خیبر کی چوٹی پر لوارگی کے میدان میں موجودہ لنڈی کوتل اور لنڈی خانہ کے درمیان جہاں سڑک افغانستان کی طرف وادی میں اترتی ہے مورچہ بنا لیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں پنڈت نہرو پر ۱۹۳۶ء کے موسم خزاں میں جب وہ درۂ خیبر آئے تھے حملہ کیا گیا تھا۔

امین خان ۱۶۷۲ء کے موسم بہار کے آغاز میں کابل کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ پشاور کے قریب میدانی علاقہ میں بسنے والے مہمندوں کے ارباب، کچھ اورک رئی سردار اور خوشحال خان تھے۔ خوشحال خان اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا بلکہ اسے بطور یرغمال رکھا گیا تھا۔ گورنر کو خبر پہنچ چکی تھی کہ قبائل نے راستہ روک رکھا ہے۔ چنانچہ فوج نے پشاور کی طرف جمرود میں پڑاؤ ڈال دیا اور ارباب کو جرگہ کے ساتھ آگے بھیجا گیا۔ جس نے قبائل سے مطالبہ کیا کہ شاہی فوج کو راستہ دیا جائے۔ یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا چنانچہ فیصلہ ہوا کہ بزور شمشیر راستہ نکالا جائے۔ امین علی مسجد تک پہنچ گیا اور اس نے اس سے آگے کا تنگ راستہ بھی کسی بھاری نقصان کے بغیر طے کر لیا لیکن جب وہ لوارگی پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گھاٹیوں میں رکاوٹیں کھڑی کر کے کوتل کو بالکل بند کر دیا گیا ہے۔ فوج کو جنگ کے لئے اس طرح صف بستہ کیا گیا کہ ہاتھی سب سے آگے رکھے گئے اور حملہ کا حکم دے دیا گیا۔

شاہی فوج کے مقابلہ پر قبائل کو منظم کرنے میں دو افریدی سرداروں ایمل خان اور دریا خان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس زمانہ کے پختون ناموروں کی حیثیت سے خوشحال کی شاعری اور دوسری تحریروں میں ان دونوں کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ چھوٹے بڑے پتھر پہلے ہی جمع کر لئے گئے تھے جو حملہ آوروں پر برسائے گئے۔ میمنہ اور میسرہ کے مغل کمانڈار مارے گئے اور مغل فوج کو بھاری نقصان کے بعد پسپا ہونا پڑا۔ قبائل تلواریں سونت کر پسپا ہونے والے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے خوب تلوار کے جوہر دکھائے۔ تمام دن لڑائی جاری رہی لیکن مورچے

قائم رہے اور شاہی فوج کو آگے بڑھنے کا راستہ نہ مل سکا۔

امین خان کو بتایا گیا کہ کوہ تاترہ کی بلندی پر تاترہ ندی کے کنارے کنارے پیش قدمی کی جا سکتی ہے جہاں پانی دستیاب ہے اور وہاں جم کر جنگ بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ محض دغابازی تھی اور شکست خوردہ فوج جو تاترہ کے راستہ روانہ ہوئی وہ تباہی سے ہم کنار ہو گئی۔ راستہ میں ایک قبائلی نے جو امین کا وفادار تھا اسے خبردار کیا کہ اگر وہ تاترہ کے راستہ سے اور آگے بڑھا تو جان گنوا بیٹھے گا۔ اس قبائلی نے امین کو چور راستہ سے پشاور واپس پہنچانے کی پیشکش کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس مہم میں خود امین اور صرف چار افراد جانبر ہو سکے۔ فوج خزانہ ہاتھی بیوی بچے جن میں امین کی بیوی والدہ بہن اور بیٹی شامل تھیں اور اس کے تحت کام کرنے والے افسروں کی بیویاں اور اقارب قبائل کے ہاتھ لگ گئے۔ بعد میں فدیہ دے کر کچھ عورتوں کو واپس لے لیا گیا لیکن امین کی بیوی نے غیرت کے مارے واپس جانے سے انکار کر دیا اور تارک الدنیا ہو گئی۔ خوشحال خان کی زبانی قبائل کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس لڑائی میں مغل فوج کے چالیس ہزار افراد ہلاک کئے۔ یہ واضح نہیں ہے کہ لڑائی کے دوران خوشحال کیا کرتا رہا۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ جمرود سے آگے نہیں گیا۔

اس کے بعد ۱۶۷۳ء میں گنداب میں اور ۱۶۷۴ء میں درۂ خاپخ میں مغل فوج کو مزید ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہ دونوں مقامات شب قدر کے شمال مغرب میں مہمند پہاڑی علاقہ میں واقع ہیں۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امین خان کو برطرف کر دیا گیا اور ایک بار پھر مہابت خان کو گورنر مقرر کیا گیا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ مہابت خان ہی ایک ایسا آدمی ہے جو سرحدی علاقہ میں سرکش قبائل پر قابو پا سکتا ہے۔ ۱۶۷۴ء میں بادشاہ بہ نفس نفیس شمال میں قبائل کے خلاف فوجی کارروائی کی نگرانی کے لئے گیا۔ خیبر میں امین خان کی شکست کے بعد مہابت خان نے خوشحال کو پھر اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ خٹک قبیلہ کے سردار کی حیثیت سے مغلوں کا وفادار بن جائے لیکن خوشحال نے جواب دیا کہ وہ مغلوں اور ان کے طور طریقوں کو کافی آزما چکا ہے اور وہ کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا۔ ۱۶۷۴ء میں خاپخ میں اورنگ زیب

کی فوجوں کی شکست سے تھوڑے دن پہلے خوشحال اور ایمل خان افریدی نے مل کر نوشہرہ پر حملہ کیا اور یہ حملہ کامیاب رہا۔ وہ اپنے قبیلہ کی سرداری سے بھی اپنے بڑے بیٹے اشرف کے حق میں دست بردار ہو گیا اور اپنے آپ کو حکومت کا باغی سمجھنے لگا۔ اس کے بعد خوشحال خان زندگی بھر لڑائیاں لڑتا رہا۔ مدد حاصل کرنے کے لئے مختلف قبائلی علاقوں میں مارا مارا پھرتا رہا کبھی حکام سے طوعاً کرھاً سمجھوتا کرتا رہا اور خود اپنے بیٹوں سے جھگڑتا رہا۔ اس کے کئی بیٹے خاص طور پر بہرام اس کے مخالف ہو گئے تھے اور مغلوں کے طرفدار ہو گئے تھے۔ بادشاہ فوجی طاقت سے جو کام نہ کر سکا وہ آخر میں روپیہ کے ذریعہ بڑی حد تک پورا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

خوشحال ۱۶۸۹ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے اشرف کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور ۱۶۸۳ء میں حکومت کے قیدی کی حیثیت سے بیجاپور بھیج دیا گیا جہاں وہ دس سال تک جیل میں سڑنے کے بعد فوت ہو گیا۔ اس نے اپنی بپتا مختلف اشعار میں بیان کی ھے کیونکہ وہ خود بھی شاعر تھا۔ بعد کی تاریخی تصنیفات خاص طور پر اشرف کے بیٹے افضل کی تحریروں سے یہ ثابت ہوتا ھے کہ اورنگ زیب کے دور حکومت کے آخری دس سال میں موجودہ اضلاع کوہاٹ اور بنوں کا کوئی حصہ موثر طریقہ سے مغلوں کے زیر نگین نہیں تھا۔ افضل قبائلی علاقہ میں شہنشاہ کے بیٹے شاہ عالم کا ملازم خاص تھا بعد میں شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کی خبر ملی تو افضل اٹک کے مقام پر شاہ عالم کے ساتھ تھا اسے اس کی خاندانی ذمہ داری یعنی پشاور جانے والی سڑک کی حفاظت سونپ دی گئی۔ اس کے بعد ۱۷۳۹ء میں نادر کے حملہ کے وقت تک بیشتر عرصہ میں صوبہ کابل اور اس کے ساتھ پشاور میں کوئی گورنر مقرر نہیں کیا گیا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نادر کو اپنے عہد میں ھمیشہ یہ شکایت رھی کہ مغلوں نے قبائل کی معاندانہ سرگرمیوں کا سد باب نہیں کیا۔ نادر یہی سمجھتا رہا کہ مغل قبائل کو قابو میں رکھ سکتے تھے لیکن وہ ایسا نہیں چاھتے تھے۔ حال آنکہ مغلوں کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی قبائلی علاقوں پر مغلوں کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ ریورٹی لکھتے ھیں کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے وسط میں (وہ اکبر کا عہد لکھتے تب

بھی یہ بات درست تھی) مغلوں کا اقتدار برائے نام تھا جو بعد میں قریب قریب ختم ہوگیا اسی وجہ سے نادر شاہ کے لئے مغل سلطنت پر حملہ اتنا آسان ہوگیا۔ کیونکہ اس کے مقابلہ پر اکا دکا قبائل کے سوا اور کوئی نہیں آیا خود ہندوستان میں ایسی طوائف الملوکی افرا تفری اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی کہ حملہ آور کو اپنے کام میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

خوشحال کی وہ نظمیں جو حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں ان کی پشت پر دو جذبے کارفرما ہیں ایک شہنشاہ اورنگ زیب کے لئے جذبہ نفرت و حقارت اور دوسرے افغان یا پختون ننگ۔ اس نے افغان اور پختون دونوں نام آزادانہ استعمال کئے ہیں اس میدان میں اس نے جو کچھ لکھا ہے ذیل میں اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

پہلی نظم جو ''بیا لہ کومہ راپیدا شو دا بہار،، سے شروع ہوتی ہے اس کا ترجمہ انگریزی کی رجزیہ نظموں کے انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ پختو کی اصل روح کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ باقی آزاد منظوم ترجمہ ہے جو نوے اور ستر سال پہلے کے ریورٹی اور بڈلف کے ترجمہ کی بنیاد پر کیا گیا ہے البتہ مطلب کی وضاحت کے لئے کہیں کہیں ردوبدل بھی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ الفنسٹن نے خیال ظاہر کیا ہے پہلی نظم میں جو رجزیہ نظم ہے بہار کا تذکرہ قدیم انگریزی رومانی نظموں کی یاد دلاتا ہے جو اسی قسم کی تمہید سے شروع ہوتی ہیں جس کا اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پھر کہاں سے آگئی یہ بہار، (۱)
کہ تمام وطن کو گل و گلزار بنا دیا۔
ارغوان، ضمیران (نازبو) سوسن اور ریحان کھلے ہوئے ہیں،
یاسمین، نسترن، نرگس اور انار کے پھول۔
بہار کے پھول ہر قسم کے، شمار میں،
مگر لال بھبوکا لالہ ان میں بہت نمایاں ہے۔
لڑکیاں ڈھیر سارے پھول اپنے گریبان میں ڈول رہی ہیں،
اور نوجوان اپنی پگڑیوں میں گلدستے لگا رہے ہیں۔
مطرب! سارنگی بجانا شروع کر!،
ہر ہر تار اور پردے سے نغمے نکال!۔

---

(۱) خوشحال خان خٹک کی نظم کا یہ اردو ترجمہ منتخبات خوشحال خان مطبوعہ پشتو اکیڈیمی سے لیا گیا ہے۔ اور انگریزی عبارت کا اردو ترجمہ نہیں کیا گیا۔ (مترجم)

ساقی آ، اور بھر بھر کر پیالے دے،
کہ شراب کے نشے میں سرشار ہوجاؤں۔
پشتون نوجوانوں نے پھر اپنے ہاتھ سرخ رنگ لئے،
جیسے کہ باز شکار سے اپنے پنجے رنگ لے۔
سفید چمکدار تلواروں کو خون سے رنگ کے گلال بنالیا،
جیسے اساڑھ کے مہینے میں لالہزار کھل پڑا ہو۔
ایمل خان اور دریا خان، خدا کرے دونوں کبھی نہ مریں،
دونوں نے اپنی اپنی جگہ ذرا بھی بے ہمتی نہیں کی۔
خیبر کے درّے کو خون میں رنگ دیا،
اور کنڑپہ میں بھی دھواں دھار مچادی۔
کنڑپہ سے باجوڑ تک تمام میدانی اور پہاڑی علاقہ کو،
کئی کئی دفعہ ہلا کے رکھ دیا۔
یہ پانچواں سال ہے کہ آدھر،
ہر روز چمکیلی تلواروں کی جھنکار چل رہی ہے!۔
اور میں جو یہاں آیا ہوں تو سارا معاملہ خراب ہوگیا،
اب نہ جانے میں برا ہوں، یا یہ لوگ نابکار ہیں۔
کہتے کہتے تھک گیا کہ ''لشکر جمع کرو''، ''لشکر کشی کرو''،
مگر یہ بہرے، نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار۔
یوسف زئی قبیلے کا حال اب مجھ پر کھلا،
نہ ''لواغر''، میرے لئے اچھا تھا نہ ''دم غار''۔ (پہاڑوں کے نام)
خٹکوں کے تو کتے بھی یوسف زئیوں سے اچھے ہیں،
اگر چہ خود خٹک خو بو میں کتوں سے بدتر ہیں۔
تمام پشتون، قندھار سے لیکر اٹک تک،
غیرت اور ناموس کے معاملے میں، ظاہر و باطن سب ایک ہیں۔
دیکھو، ہر طرف کتنی لڑائیاں لڑی گئیں،
مگر یوسف زئیوں کو کوئی شرم نہیں آتی۔
پہلی لڑائی ''تاترہ'' میں لڑی گئی، (پہاڑ)
جس میں چالیس ہزار مغل تہس نہس ہوئے۔
انکی مائیں، بیٹیاں، پشتونوں کی قید میں آئیں،
بےشمار گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی غنیمت میں ہاتھ لگے۔

دوسری جنگ میر حسینی کی، ''دوآبہ،، میں، (علاقہ)
جس میں سانپ کی طرح اس کا سر کچلا گیا۔
اس کے بعد ''نوشہرہ،، کی لڑائی تھی،
جس میں، میں نے مغلوں پہ اپنا غصہ اتارا۔
پھر جسونت سنگھ اور شجاعت آئے،
ایمل نے ''گنداب،، میں ان کی سیخ کنی کی۔ (بیخ)
چھٹی جنگ، مکرم خان اور شمشیر خان دونوں کی تھی،
جس میں، ایمل نے ''خاپخ،، میں انہیں مار بھگایا۔
مجھے جو یاد ہیں، بڑی لڑائیاں یہیں ہیں،
جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں اور جھڑپوں کی تو کوئی گنتی نہیں۔
ہمیشہ فتح و نصرت تو اب تک ہماری ہی رہی،
اس کے بعد بھی اسی کردگار پر بھروسہ ہے۔
سال بھر سے اورنگ میرے لئے ڈیرے ڈالے پڑا ہے،
ظاہر میں حیران و پریشان اور باطن میں دل افگار۔
ہر سال اس کے امرا یہاں آ آ کر ناکام و تباہ ہوتے ہیں،
اور جو فوجیں تباہ ہوئیں، انکا تو کوئی شمار ہی نہیں۔
ہندوستان کے خزانوں کے منہ کھل گئے ہیں،
سونے کی اشرفیاں ہیں کہ کوہ سار میں گھسی چلی آ رہی ہیں۔
یہ تو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا،
کہ اس ملک میں یہ واقعات رونما ہوں گے۔
بادشاہ کی بدنیتی میں بھی کوئی کمی نہیں،
اسی بدنیتی کی وجہ سے اس نے اپنے باپ کو آزار پہنچایا۔
اسی لئے تو اب کسی کو اس پہ اعتبار نہیں رہا،
کہ، بدنیت بھی ہے، بد عہد بھی اور مکار بھی۔
دوسری اور کوئی صورت تصفیے کی نظر نہیں آتی،
یا مغل یکلخت دفع ہوں یا پشتون سب کے سب ذلیل و خوار۔
اگر آسمان کی گردش یونہی رہی جیسی نظر آ رہی ہے،
تو پھر ہماری باری آگئی ہے، اگر خدا نے چاہا۔
آسمان ہمیشہ ایک سی گردش نہیں کرتا،
کبھی پھول کے لئے سازگار ہوتا ہے تو کبھی خار کے لئے۔

ایسے موقع پر، جب کہ ننگ و نام کا وقت ہے،
یہ بے غیرت پشتون کیا کر رہے ہیں!-
پشتون اگر کچھ اور تدبیریں کر رہے ہیں تو یقیناً نا سمجھ ہیں،
اس وقت سوائے تلوار اٹھانے کے، استخلاص کی اور کوئی راہ نہیں-
پشتون بہادری میں مغلوں سے اچھے ہیں،
کاش! عقل و دانش میں بھی پشتون کچھ اور بہتر ہوتے-
عوام جب آپس میں اتفاق کرلیتے ہیں،
تو بادشاہ بھی ان کے آگے سر جھکا دیتے ہیں-
نفاق ہے چاہے اتفاق، جہالت ہے خواہ سمجھ بوجھ،
ہر ایک کا معاملہ خدا کے ھاتھ میں ہے-
دیکھو، آفریدی، مہمند اور شنواری اب کیا کرتے ہیں؟،
مغلوں کی فوج ''ننگرہار،، میں پڑاؤ ڈالے پڑی ہے-
میں اکیلا ھی ننگ و ناموس کے لئے فکرمند ھوں،
یوسف زئی اطمینان سے اپنی اپنی کھیتی باڑی میں لگے ھوئے ہیں-
یہ جو آج اپنی عزت اور قومی غیرت سے لا پرواھی برت رہے ہیں،
انجام کار اس کا نتیجہ ظاہر ھوجائےگا ان پر-
میں اس زندگی سے موت کو بہتر سمجھتا ھوں،
جو عزت و آبرو کے ساتھ نہ گزرے-
اس دنیا میں زندگی تو دائمی نہیں ہے،
مگر خوشحال خٹک کی یادگار رہ جائے گی-
میں نے ''برمول،، میں یہ اشعار لکھے،
جب کہ جمادی‌الاول کی پہلی تاریخ اور سال غفو (۱۰۸۶ھ) تھا-

یہ نظم نہ صرف خوشحال کی ذاتی صفات کا مظہر ہے بلکہ اس سے یہ بھی ظاھر ھوتا ہے کہ جب عام طور پر پٹھان کسی خاص جذبہ سے سرشار ھو تو وہ کس کردار کا مظاھرہ کرتا ہے- اس نظم کے ایک ایک لفظ سے استقلال اور سیدھی سادی مردانگی ظاھر ھوتی ہے- نظم میں کوئی بات گھما پھرا کر نہیں کہی گئی- اکثر پٹھانوں کی طرح خوشحال بھی زمانہ سازی سے نفرت کرتا تھا اور زندگی کو دو متضاد عناصر کا تصادم سمجھتا تھا- خدا اور دوستوں کے ساتھ غیر مشروط وفاداری اور دشمنوں اور ذلیلوں کے ساتھ نفرت اور حقارت-

اس جنگجو شاعر نے سب سے زیادہ غصہ اور نفرت کا اظہار شہنشاہ اورنگ زیب کے خلاف کیا ہے۔ اس کی بیس سے زائد نظمیں اسی موضوع پر ہیں ساتھ ہی اس نے اورنگ زیب کے ہاتھوں اس کے باپ کی قید اور بقول خود مذہبی ریاکاری کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی آڑ میں ایک ظالم حکمراں اپنی وہ تمام پالیسیاں مرتب کرتا تھا جو خوشحال کی نظر میں گناہ عظیم تھیں۔ اس نے اورنگ زیب کی ذات پر شدید ترین حملہ مندرجہ ذیل نظم میں کیا ہے :-

میں اورنگ زیب کے حق و انصاف،
دینداری عبادت اور ریاضت سے اچھی طرح واقف ہوں۔
اس نے یکے بعد دیگرے اپنے بھائیوں کو قتل کرایا،
اور باپ کو میدان جنگ میں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔
ایک شخص ہزار مرتبہ مسجدوں میں سر رگڑے،
یا روزے رکھ کر اس کا پیٹ کمر سے لگ جائے۔
لیکن جب تک اس کی نیت نیک نہ ہو،
اس کی تمام عبادت اور ریاضت محض فریب ہے۔
جس شخص کی زبان پر کچھ اور دل میں کچھ اور ہے،
اس کے ٹکڑے اڑا دینے چاہیئں۔
بظاہر سانپ کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے،
لیکن اس کے اندر زہر بھرا ہوتا ہے۔
سچا آدمی کام زیادہ کرتا ہے اور دعوے کم کرتا ہے،
لیکن جھوٹے کے کام بہت کم اور برے، اور دعوے بہت ہوتے ہیں۔
اس دنیا میں خوشحال کا ہاتھ ظالم کی گردن تک نہیں پہنچ سکتا،
اس لئے اے خدا قیامت میں ظالم پر رحم نہ کرنا۔

مورخوں کا ایک موثر مکتبۂ خیال اورنگ زیب کو لوگوں کی نظروں میں چڑھانے میں مصروف ہے۔ یہ مورخ اکبر کے الحاد اور جہانگیر کی عیاشی کے برعکس اورنگ زیب کی دینداری اور پرہیزگاری کے مداح ہیں۔ اورنگ زیب کو ایک ولی بنا کر پیش کیا جاتا ہے جس نے بادشاہت

میں قرون اولیٰ کے اسلام کو زندہ کیا۔ اس نے بھائیوں اور باپ کے خلاف اس وقت کے حالات کے مطابق حفاظت خود اختیاری میں لڑائیاں لڑیں اور ان بھائیوں کا مقابلہ کیا جو داد عیش دینے کے لئے خود تخت پر قابض ہونا چاہتے تھے اس کے برعکس اورنگ زیب کے متعلق خوشحال جیسے لوگوں کا وہی رویہ ہے جو پروٹسٹنٹ فرقہ کے انگریزوں کو اسپین کے فلپ ثانی کے متعلق سکھایا جاتا ہے یعنی ایک ایسا شخص جس کے مذہبی جذبہ نے غلط رنگ اختیار کر لیا تھا جو جزئیات پر بہت زور دیتا تھا لیکن در حقیقت ایک بدکار حاکم تھا جس کے ہر اقدام کی آڑ میں ایک ناپاک ارادہ کارفرما ہوتا تھا۔ ہمیں ان دو متضاد نظریوں کی حقیقت جانچنے سے کوئی سرو کار نہیں ہے ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ مغل سلطنت کے سرحدی صوبہ میں پٹھانوں کے ذہن پر بادشاہ کی کارروائیوں کا کیا اثر پڑا۔

اس مسئلہ پر بحث میں دو باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ خوشحال کے لئے ایسے بادشاہ سے نفرت کرنے کا جواز موجود تھا جس نے اسے گھاٹ پر محصول وصول کرنے کے حق سے محروم کردیا تھا۔ اس کے اجداد کو یہ حق اکبر کے زمانہ سے حاصل تھا پہلے پہل اکوڑے کو یہ حق ملا تھا جو لوگ اورنگ زیب کے طرفدار ہیں ان کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے محض خوشحال کو اس حق سے محروم نہیں کیا بلکہ ہر گھاٹ، شاہرا اور سرحد پر وصول کئے جانے والے تمام محصول معاف کردئے تھے اس کا مقصد یہ تھا کہ عام لوگوں کو فائدہ پہنچے اور تجارت کو فروغ ہو۔ یہ ایک مدبرانہ اقدام تھا اور خوشحال اور دوسرے لوگوں کی طرف سے اس کی مخالفت خود غرضی اور کوتاہ نظری پر مبنی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ خوشحال اور اس کے خٹک قبیلہ کے بادشاہ کی نظر سے گر جانے میں اس قبیلہ کے ساتھ یوسف زئی قبیلہ کی حریفانہ چشمک کا بڑا دخل تھا۔ ایک موقع پر دونوں قبیلوں میں صلح کی کوشش کی گئی تو خٹک قبیلہ کے سردار کے گھرانے نے یہ بات نہیں مانی۔ ان حالات میں مقامی افسروں کو جن میں اس وقت کا گورنر سید امیر بھی شامل تھا اپنا مطلب نکالنے اور سازش کرنے کا موقع مل گیا۔ بہ الفاظ دیگر خوشحال کو اپنا غصہ اس دانشمند اور نیک نیت بادشاہ پر نہیں اتارنا چاہئے تھا جس کا واحد قصور یہ تھا کہ اس نے مفاد عامہ کے پیش نظر ایسا فرمان جاری کیا جس سے بعض لوگوں کے ذاتی مفاد پر ضرب پڑتی تھی۔ اسے تو اپنا غصہ

یوسف زئیوں اور ان افسروں پر اتارنا چاہئے تھا جنہیں یوسف زئیوں نے گمراہ کیا۔

اس دلیل میں وزن ضرور ہے لیکن خوشحال کے حق میں بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے چونگی وصول کرنے کا حق چھن جانے کی مخالفت نہیں کی اور اس سوال پر حکومت سے بغاوت نہیں کی۔ لیکن وہ بیس سال تک ذاتی طور پر سلطنت کی خدمت کر چکا تھا اور اس سے پہلے اس کے باپ دادا اور پردادا نے سلطنت کی خدمت میں عمر گزاری تھی لیکن ۱۶۶۴ء میں اسے پشاور میں گرفتار کر لیا گیا پا بہ زنجیر دہلی بھیجا گیا دو سال تک رنتھمبھور میں قید رکھا گیا اور ۱۶۶۸ء میں اس وقت رہا کیا گیا جب مہابت خان نے ذاتی طور پر اس کی سفارش کی۔ اورنگ زیب کے حامی اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اگر یہ بات سامنے رکھی جائے کہ خوشحال نے بادشاہ پر کتنے پرجوش حملے کئے اور اس کی رہائی کی وجہ سے سلطنت کی دشوار سرحد پر بغاوت پھیلی جس میں شاہی فوجوں کو گھمسان کی چھ لڑائیوں میں شکست ہوئی تو یہ خوشحال کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چار سال کی قید اور نظربندی کے بعد رہا ہوگیا۔ اورنگ زیب اس کا سر اڑا دیتا تو اسے مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے ایسا نہیں کیا اس سے اس کی فراخ دلی کا ثبوت ملتا ہے خوشحال کی غداری کے ثبوت میں یہ کہا جاتا ہے کہ خیبر کی لڑائی سے پہلے خوشحال امین کے ساتھ تھا لیکن اس کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے کماندار اور مربّی امین کی شکست کو مزے لے لے کر بیان کیا بلکہ اپنے بادشاہ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا اور باقی عمر اسی حالت میں گزاری۔

خوشحال میں یقیناً اپنے قوم کی کمزوریاں موجود تھیں جو کبھی مستقل طور پر حکومت کی وفادار رہنے کی عادی نہیں تھی اور اس کے ساتھ اس کی دانست میں جو ذلت آمیز سلوک کیا تھا خوشحال اسے کبھی نہ بھول سکا۔ ایسے لوگ کسی حکومت کے نہیں بلکہ ذاتی طور پر کسی حاکم ہی کے وفادار رہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سردست ہر بادشاہ اور شمالی علاقہ میں اس کے خودسر ملازم کے درمیان اس قسم کے ذاتی رشتہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پٹھانوں میں آج بھی قبائلی جذبہ اتنا شدید ہے کہ

ان پر حکم جتایا جائے تو وہ بلبلا اٹھتے ہیں۔ تین سو سال پہلے ذرا سی سختی پر پٹھان کی یہ قبائلی جبّلت بیدار ہو جاتی تھی۔ وہ آزاد ہو جانے، ہر پابندی کو توڑنے اور پٹھان کی ننگ کے سوا ہر قانون سے انحراف کے لئے بے چین ہو جاتے تھے۔ خیبر کی لڑائی کے بعد خوشحال کی نظر میں یہ بات جرم نہ رہی ہوگی کہ وہ حکومت وقت کا باغی بن جائے۔ اسے شہنشاہ کا غیر جذباتی انداز فکر محض ریاکاری معلوم ہوتا ہوگا۔ ان سب باتوں کے باوجود ہمیں دو شخصیتوں کا موازنہ کرنا ہے۔ ان دونوں میں سے کون زیادہ قابل اعتبار ہے۔ وہ بادشاہ جس نے اپنے بھائیوں کو قتل کر دیا اور باپ کو قید میں ڈال دیا اور اپنی فطانت اور ثابت قدمی کے باوجود اپنی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کردیں۔ یا وہ جنگجو شاعر جس کے الفاظ آج بھی اس کے معتقدوں کے دلوں میں آگ لگا دیتے ہیں۔ پٹھانوں سے محبت رکھنے والا بغیر جھجھک خوشحال خان ہی کو قابل اعتبار سمجھے گا۔ پھر بھی پٹھان ایک ماتحت کی حیثیت سے عام طور پر سرکش اور خودسر ہوتا ہے۔ خود خوشحال نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ قبائل میں نظم و ضبط کا احساس نہیں وہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی نیت پر ہمیشہ شبہ کرتے ہیں یہ بات تو یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اورنگ زیب کی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کی بدولت پٹھان کبھی اس کے وفادار نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اس رنجش میں خٹکوں اور یوسف زئیوں کی باہمی چشمک کا بڑا دخل تھا۔ اکبر کے عہد سے یوسف زئیوں کے خلاف جنہوں نے شاہی فوج کو بڑی زک پہنچائی تھی خٹکوں کی اہمیت بڑھانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ خوشحال کی بغاوت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ طاقت کا توازن بدل گیا تھا۔ اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس بغاوت میں خوشحال کے پورے قبیلہ یہاں تک کہ خود اس کے خاندان نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا چھوٹا بیٹا بہرام مغلوں کا ساتھ دیتا رہا وہ اپنے باپ کے خلاف لڑتا رہا اور اس نے یہ بھی کوشش کی کہ خوشحال خان کو پکڑ کر حکومت وقت کے حوالہ کر دے۔ ان واقعات سے خوشحال کے اس قول کا ایک اور پہلو اجاگر ہوتا ہے کہ اس کی قوم نظم و ضبط کی پابند نہیں ہے۔ جہاں تک یوسف زئیوں کا تعلق ہے خوشحال نے بغاوت کرنے کے بعد اس بات کی پوری کوشش کی کہ سوات کے

یوسف زئی اور سمہ میں بسنے والے ان کے بھائی قبائلی جھگڑے فراموش کر دیں اور خٹک قبیلہ کے ساتھ مل کر شہنشاہ کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیں۔ جیسا کہ خوشحال کی ایک بہاریہ نظم سے ظاہر ہوتا ہے خوشحال کو دریا خان اور ایمل خان کے زیر قیادت بہادر افریدیوں کی عملی حمایت حاصل ہو گئی تھی لیکن وہ یوسف زئیوں کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس کی ناکامی قریب قریب ناگزیر تھی کیونکہ اس کے کچھ تاریخی اسباب تھے۔ جس زمانہ میں حکومت یوسف زئیوں سے مصروف پیکار تھی اس وقت خٹک مغلوں کی نظروں میں چڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے شاھی امداد کے بل بوتے پر یوسف زئی علاقہ کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب جبکہ خٹک قبیلہ حکومت وقت کی نظروں سے گر گیا تھا تو یوسف زئیوں کو اس کی امداد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی بلکہ ان پر الٹا اثر ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوشحال یہ بات نہ سمجھ سکا۔ وہ یوسف زئیوں کو بزدلی اور موقع پرستی کے طعنے دیتا رہا۔ خوشحال نے یوسف زئیوں کے متعلق جو اشعار لکھے ھیں ان میں سے کچھ اشعار مضحکہ خیز معلوم ہوتے ھیں لیکن ان پر مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں غور کرنا چاھئے۔ خوشحال کی نظر میں یوسف زئی انتہائی بدطینت تھے اول تو وہ خوشحال کے خاندانی دشمن تھے اور دوسرے جب خوشحال ان کے پاس صلح کا پیغام لے کر گیا تو انہوں نے اس کی پیشکش ٹھکرا دی۔ خوشحال لکھتا ھے :-

مجھے صرف اپنی قوم کی عزت کا خیال ھے۔
یوسف زئی چین کی بنسی بجا رھے ھیں اور اپنے کھیت جوت رھے ھیں۔

وہ ایک اور موقع پر لکھتا ھے۔

پٹھان کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے
تقدیر کا لکھا یہی ھے کہ وہ چھوٹی باتوں میں الجھے رھیں
میں انہیں درست کرنا چاھتا ھوں لیکن وہ درست نہیں ھوتے
بدنیت لوگوں کی نگاہ بھی بد ھوتی ھے۔
یوسف زئیوں کو پختو (۱) کا کوئی خیال نہیں
اے خوشحال ان ذلیل پختونوں سے کوئی واسطہ نہ رکھو۔

---

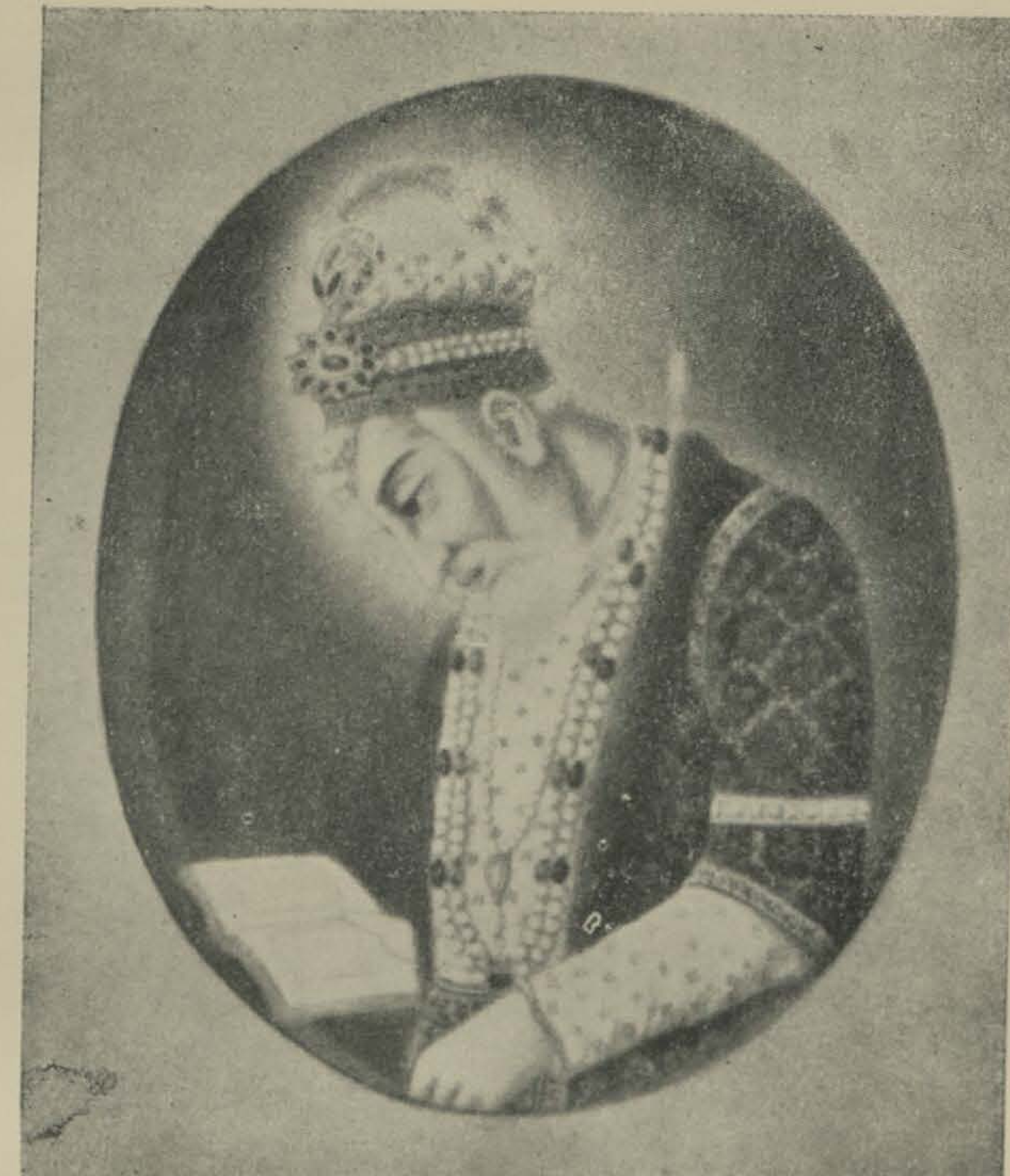
(۱) پختو سے صرف پختو زبان ھی نہیں بلکہ پٹھانوں کا مکمل ضابطۂ اخلاق مراد ھے۔

یوسف زئیوں سے کمک حاصل کرنے کی کوشش میں مارے مارے پھرتے ہوئے خوشحال وادی سوات تک جا پہنچا۔ اس زمانہ میں خٹک قبیلہ کے کسی شخص کے لئے یہ سفر غیر معمولی تھا کیونکہ قبائلی عام طور پر اپنے اپنے علاقہ سے باہر نہیں جاتے تھے۔ خوشحال نے سوات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے اول تو وہاں کے آدمیوں کے متعلق اس کا بیان بڑا دلچسپ ہے دوسرے اس سے شاعر کی ایک اور خصوصیت آشکا ر ہوتی ہے اور وہ ہے قدرتی مناظر خاص طور پر پھولوں اور سبزہ سے اس کا لگاؤ۔ اس معاملہ میں وہ بابر سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہر پٹھان میں وہ جذبہ ضرور ہوتا ہے جو ورڈز ورتھ کی شاعری میں ملتا ہے۔

"اس لئے میں ابھی تک
سبزہ زاروں جنگلوں
پہاڑوں اور اس ہر منظر کا دلدادہ ہوں
جو سرسبز زمین پر نظر آتا ہے"۔

خوشحال سوات کے متعلق لکھتا ہے۔

آب و ہوا کے اعتبار سے سوات شاندار جگہ ہے اور کابل سے کہیں بہتر ہے
کابل بے رنگ ہے سوات کی آب و ہوا میں نرمی اور لطافت ہے
یہاں کی ہوا اور سبزہ زار کشمیر جیسے ہیں
البتہ کشمیر کی طرح وسیع نہیں
ہر گھر میں آبشاریں اور فوارے ہیں۔
یہاں عمدہ بستیاں اچھے مکانات اور صاف ستھرے بازار ہیں
یہ علاقہ جہاں کی آب و ہوا اتنی اچھی ہے جہاں چشمے بہتے ہیں
جہاں کا گوشہ گوشہ قدرتی طور پر پھولوں کا باغ ہو۔
اس میں نہ تو کوئی گھر اور نہ کوئی باغ ہے اور خوشبو اور تازگی
کا نام و نشان تک نہیں۔
کیونکہ یوسف زئیوں نے اسے ریگستان بنا دیا ہے
سوات بادشاہوں کے دلوں کو فرحت بخشتا ہے
یہاں کا ہر مقام شہزادوں کے شایان شان ہے
لیکن یوسف زئیوں کو اس کا کوئی احساس نہیں ہے
انہوں نے اسے ایک ویران سرائے بنا رکھا ہے۔



اورنگ زیب عالمگیر



خوشحال خان خٹک

ان اشعار کا موازنہ ان اشعار سے کیجئے جو خوشحال نے اپنے وطن یعنی خٹک کی پہاڑیوں کے اس سلسلہ کے متعلق لکھے ھیں جو دریائے سندھ اور لنڈے دریا کے سنگھم کے قریب پھیلا ھوا ھے۔ یہ وھی علاقہ ھے جس کی یاد نے اسے قلعہ گوالیار میں قید کے دوران بےچین کر رکھا تھا:۔

"اکوڑے پر خدا کی رحمت ھو جس نے سرائے میں اپنا گھر بنایا
میری بات مانو، کیونکہ میں سب جانتا ھوں، یہ سب سے اچھی جگہ ھے۔
ھوڈی کے کالے پہاڑ تیراہ تک پھیلے ھوئے ھیں
نیلاب اور لنڈے دریا اس پہاڑ کے قدموں میں پڑے ھوئے ھیں
ان دریاؤں کے کنارے ھند سے خراسان جانے والی سڑک ھے
اور یہیں اٹک کا گھاٹ ھے جس سے گزرتے ھوئے شہزادہ اور بھکاری سب لرزتے ھیں
زمین جو بھی خزانہ اگلتی ھے وہ یہیں آتا ھے
اور جب بارش ھوتی ھے تو بہار کتنی دلکش ھوتی ھے۔
اس علاقہ سے سوات، ھشت‌نگر، پشاور یا دوسرے علاقوں کا کیا مقابلہ
سب علاقے اس کے سامنے سر جھکاتے ھیں اور سب کی دولت یہیں آتی ھے
ھر طرف شکار ھی شکار ھے شکرے، باز اور شکاری کتوں کے لئے کافی شکار ھے
کلپانی خوش باش تیری جنت میں شکار کا تعاقب کتنا پر لطف ھے
یہاں کے نوجوان مضبوط اور تنومند ھیں اور ھر کام پھرتی سے کرتے ھیں
ان کی آنکھیں چنچل ھیں رنگ سرخ سفید ھے وہ دراز قد ھیں
اور ان کا ڈیل ڈول قابل دید ھے
میرے بیٹے پوتے خاندان اور قبیلہ
اور دوسرے لوگ جو اس علاقہ میں رہتے ھیں خدا کی حفاظت میں رھیں
میں بدنصیب ھوں تقدیر نے مجھے وطن سے دور لا پھینکا ھے۔ تقدیر پر کس کا بس ھے
خوشحال اپنی مرضی سے کبھی سرائے سے باھر نہ جاتا"

خوشحال کو ایک اور موقع پر جب اپنا گھر یاد آیا تو اس نے ایک حزنیہ نظم لکھی:۔

اے بادِ صبا اگر تو کبھی خیر آباد سے گزرے
یا سرائے ندی پر تیرا گزر ھو

تو ان سے بار بار میرا سلام کہنا
میں جنہیں پیار کرتا ہوں انہیں سلام کرنا
عظیم المرتبت اباسین (۱) کو بلند آواز میں سلام کہنا
لیکن لنڈے کو سر گوشی کے انداز میں سلام پہنچانا۔
شاید مجھے لنڈے (۲) کا پانی پھر کبھی پینا نصیب نہ ہو
میں ہمیشہ گنگا اور جمنا کے کنارے نہیں رہوں گا
ہند کے دریاؤں کا پانی ٹھنڈا نہیں ہے جس سے پیاس بجھائی جا سکے
ہند میں کتنے ہی عیش کے سامان کیوں نہ ہوں اس پر خدا کی لعنت ہو
خدا وہ دن نصیب کرے کہ میں پھر اپنے محبوب سے جا ملوں
خوشحال ہمیشہ ہند میں نہیں رہے گا۔

خوشحال نے بہت سے عشقیہ اشعار لکھے ہیں اور وہ عشاق میں اپنا مرتبہ بہرام گور کے برابر سمجھتا تھا اس کے تیس (۳۰) بیٹے تھے اور بیٹیوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے وہ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:-

"مجھے اپنے آپ میں اور دنیا میں دو چیزیں پسند ہیں
اپنے آپ میں اپنی آنکھیں اور دنیا میں خوبصورت عورتیں
جب میں کسی حسینہ کے حسن پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ خدا مل گیا
پاک محبت اور نفسانی خواہش میں تھوڑا ہی فرق ہے"

لیکن ایک زبان کی عشقیہ شاعری دوسری زبان میں آسانی سے منتقل نہیں ہو سکتی۔ خوشحال کی دو عشقیہ نظمیں بہت مشہور ہیں اور فارسی غزل کے گھسے پٹے انداز سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں۔ ایک نظم میں درۂ کوھاٹ میں رہنے والی افریدی دوشیزاؤں کا جسمانی حسن تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:-

آدم خیل قبیلہ کی دوشیزائیں سرخ سفید ہیں
ان میں ہر قسم کی حسین صورتیں نظر آتی ہیں
ان کی آنکھیں بڑی، پلکیں گھنی اور بھویں تیکھی ہیں
وہ شیریں لب، گل رخ اور قمر جبیں ہیں

---

(۱) دریاؤں کا باپ یعنی دریائے سندھ۔
(۲) دریائے کابل۔

ان کے دھن نیم وا کلیوں کی طرح تنگ ھیں
ان کے دانت ھموار اور سفید ھیں
ان کی جلد انڈے کے چھلکے کی طرح صاف شفاف اور بے بال ھے
ان کے پاؤں نازک ٹانگیں بھری بھری اور کولھے شاندار ھیں،
ان کے شکم نازک چھاتیاں سخت اور بھری ھوئی اور کمر پتلی ھے
ان کا قد الف کی طرح سیدھا اور رنگت گوری ھے
میں شہباز کی طرح پہاڑوں پر پرواز کرتا رھا ھوں
اور میں نے بہت سے خوبصورت تیتر شکار کئے ھیں
شہباز، جوان ھوں یا بوڑھے، سب شکار پر جھپٹتے ھیں
لیکن بوڑھے شہباز کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا
اے خوشحال محبت آگ کی طرح ھوتی ھے
شعلہ چھپا ھوا ھو تب بھی دھواں نظر آ ھی جاتا ھے

دوسری نظم کو من و عن انگریزی میں بیان کرنا ممکن نہیں ھے ہر شعر اس فقرہ پر ختم ھوتا ھے ''کیا یہ ٹھیک نہیں ھے؟''، انگریزی زبان میں اس فقرہ میں شعریت نہیں ھے لیکن پختو میں اس فقرہ کی تکرار ڈھول کی تھاپ یا گھنٹہ کی گونج معلوم ھوتی ھے:-

وار کرنے کے لئے تلوار تیز کی جاتی ھے- ٹھیک ھے نا؟
یار کی خاطر زلفیں سنواری جاتی ھیں- ٹھیک ھے نا؟
تم مجھ سے کیوں یہ کہتے ھو کہ حسینوں کو مت دیکھو
مجھے آنکھیں دیکھنے ھی کے لئے دی گئی ھیں- ٹھیک ھے نا؟
زاھد نماز روزہ کرے اور رند جام اٹھائے
ھر شخص کو الگ کام کے لئے بنایا گیا ھے ٹھیک ھے نا؟
تُو کہتا ھے میرے ھونٹوں کا بوسہ مرھم ھے،
میں تجھ سے اپنے زخم کا مداوا چاھتا ھوں ٹھیک ھے نا؟
تو میرے دل کا لہو پیتا ھے- یہ کام صرف تو ھی کر سکتا ھے
میرا دل تجھ جیسے ظالم ھی کے لئے بنایا گیا تھا- ٹھیک ھے نا!
تو اپنے محبوب کے سیاہ زلفوں کی یاد میں کیوں روتا ھے
تونے یہ روگ خود ھی پالا ھے- ٹھیک ھے نا!
اے خوشحال یہ شراب ھے یہ رباب ھے یہ نے ھے اور یہ تیرا محبوب ھے
باغ میں چل- کیا تُو باغ میں نہیں جائے گا؟

خوشحال کی ایک مختصر سی نظم اور بھی ہے جو عورت کی بےوفائی کے متعلق رابرٹ برج کی نظم سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ نظم کے بہترین ترجمہ کے مقابلہ پر برج کی نظم پیش کردینا ہی بہتر ہے :-

ہر عورت جو دنیا میں پیدا ہوئی ہے ایسی بےوفا ہے-
کہ کس مرد کو عورت کی وفا کی ڈینگ نہیں مانا جائے
اگر دنیا میں کوئی ان سے اچھا نہیں ہے تو ان سے برا بھی نہیں ہے
آدم کی بیوی سے لے کر جو نحوست ثابت ہوئی
حال آنکہ خدا نے اسے رحمت بنا کر بھیجا تھا-
آج تک جو عورت بھی پیدا ہوئی ہے وہ بےوفا نکلی ہے
کسی مرد کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی عورت اس سے سچی محبت کرتی ہے

بغور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوشحال کے اشعار میں لطیف اور سادہ جذبۂ ایمانی کارفرما ہے- مجازی محبت نے اسے رحمت خداوندی سے مایوس نہیں کیا- وہ رحمت ایزدی کا امیدوار ہے-

میں تو صرف ایک بادشاہ کو جانتا ہوں اور اس کا حکم مانتا ہوں
اس کے اوامرونواہی میری زندگی میں کارفرما ہیں
ایمل خان او دریا خان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں
میں اسی دنیا میں ہوں اے مالک میں تیری دھلیز پر منتظر ہوں
ایک روز میں حکم مانوں گا "میرے پاس آؤ"

پھر تیرا غلام بےتابی سے تیری طرف دوڑے گا-
میں تجھے جو درخواستیں بھیجتا ہوں وہ تو چاک کر دیتا ہے
لیکن میں تجھ سے دعا مانگتا رہوں گا-

افریدی سردار جو جنگوں میں خوشحال کے دوش بدوش لڑے تھے اور جنہیں خوشحال بڑا عزیز رکھتا تھا اس سے پہلے جان بحق ہوچکے تھے اور اس کی تمنّا تھی کہ وہ بھی ان کا ساتھ دے سکے-

خوشحال کی زندگی اور خیالات کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرنا بےجا نہیں ہے کیونکہ وہ اصل پٹھان ہے اپنی تمام کمزوریوں اور شیخیوں کے

باوجود یہ شخصیت شاندار ہے اس کی شخصیت دوسروں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ خوشحال کو سمجھ لینا پٹھانوں کو سمجھنے کی ابتدا ہے (۱)(۲)

گذشتہ سال موسم بہار کے آخر میں پشاور سے پنجاب آتے ہوئے میں ”خراسان سے ہند،، جانے والی شاہراہ سے چار میل ہٹ کر شاعر کی قبر پر پہنچا۔ وہاں پہاڑیوں کے نشیب میں دو چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں جو بالائی سرائے کہلاتے ہیں۔ نقشہ میں ان کا نام غلطی سے ایسوڑی درج ہے۔ ایک گاؤں کا نام؟ اس شفاف ندی کے نام پر رکھا گیا ہے جو مزار سے تھوڑے سے فاصلہ پر اوپر کی طرف وادی سے نکلتی ہے۔ قبرستان کا رخ شمال کی طرف ہے اور پہاڑ کی ترائی میں اتنی بلندی پر واقع ہے کہ وہاں سے لنڈے دریا اس کے پار سمہ اور بنیر اور سوات کی پہاڑیاں صاف نظر آتی ہیں۔ یہ پورا علاقہ وہی ہے جس میں مرحوم شاعر پہلے جنگیں لڑتا رہا اور پھر یوسف زئیوں سے مدد مانگنے کے لئیے جو اسے کبھی حاصل نہیں ہوئی مارامارا پھرتا رہا۔ میں جس وقت مزار پر پہنچا وہ غروب آفتاب کا وقت تھا۔ میدان سے دھوپ جا چکی تھی البتہ بادلوں سے چھن کر دور پہاڑوں کے برف پر پڑتی ہوئی کرنیں اب بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جنوب میں خٹک علاقہ کی پہاڑیوں پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسی طوفان کی آمد سے پہلے محسوس ہوا کرتی ہے۔ اس وقت فضا گردوغبار سے پاک تھی مزار کی عقبی وادی میں ندی دھیرے دھیرے بہ رہی تھی تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ مزار کے

---

(۱) اکوڑے کے موجودہ خان محمد زمان خاں ساتویں پشت میں خوشحال خاں کے حقیقی خلف ہیں۔ وہ کافی ضعیف ہیں ان کی عمر قریباً نوے سال ہے اور بینائی جاتی رہی ہے وہ کسی تصنع کے بغیر بڑی سادگی اور متانت کے ساتھ اپنے اسلاف کی روایات برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ ان کا حجرہ بڑی خوبصورت جگہ واقع ہے۔ وہاں سے لنڈے دریا نظر آتا ہے۔ اپنے اجداد کی طرح وہ بھی شاعر ہیں اور ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲) پرانے زمانہ کے بہت سے پٹھان شاعر مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ شہرت عبدالرحمان کو حاصل ہے جو رحمن بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ پشاور کے قریب ہزار خوانی گاؤں کے ایک مہمند تھے اور خوشحال کے پوتے افضل کے ہم عصر تھے۔ ان کے کلام پر تصوف کا رنگ غالب ہے اور موضوع مذہبی ہیں۔ پٹھان ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

اوپر گنبد بنا ہوا ہے جو بعد کی نسل میں سے کسی خدا ترس نے بنوا دیا ہے میں نے مجاور سے دریافت کیا کہ یہ مزار اسی سنسان جگہ کیوں بنایا گیا ہے اس نے جواب دیا کہ شاعر کی یہی خواہش تھی کیونکہ اسے آبادی سے دور کے میدان اور پھول پسند تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شاعر کی یہ تمنا تھی کہ شاہراہ سے گزرنے والی گھوڑ سوار مغلی فوج اس کی ابدی نیند میں خلل نہ ڈالے۔

مزار پر ایک سادہ سی مرمر کی لوح نصب ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے

میں نے افغان ننگ کی خاطر تلوار باندھی ہے
میں اپنے دور کا غیرت مند خوشحال خٹک ہوں۔

حصہ سویم

درانی اور سکھ

۱۷۰۷-۱۸۴۹ء (۱۱۱۹ھ تا ۱۲۶۶ھ)

فصل شانزدهم

احمد شاہ

افغان

ڈرامہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے ایسے ایسے واقعات اور مناظر سامنے آتے جاتے ہیں جن کی نظیر دوسری قوموں کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہی قوم جسے الفنسٹن نے قبائلی 'دوَل مشترکہ کے مجموعہ سے تعبیر کیا ہے ایک ایسی ہراول فوج بنی رہی جس کی مدد سے کئی فاتحوں نے سلطنتیں حاصل کر لیں لیکن خود یہ قوم اپنے وطن میں وفاق تو کیا بناتی ایک ریاست بھی نہیں بنا سکی۔ البتہ ان ہی قبائل سے تعلق رکھنے والے فوجی جانبازوں نے اتنی طاقت ضرور حاصل کی کہ وہ شمالی ہندوستان کے بیشتر حصہ پر حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پٹھان خاندان تین مرتبہ خلجی لودی اور سور بادشاہوں کے روپ میں دہلی کے تخت پر بیٹھ چکا تھا اور پٹھان شہزادوں کا حکم نربدا کے کنارے مانڈو سے لے کر دور دراز بنگال تک چلتا تھا۔ دہلی کے تمام حکمران اور دوسرے بیشتر حاکم غلجی نسل سے تھے۔ لیکن ان تمام صدیوں کے دوران مشرقی افغان قبائل نے پہاڑی علاقہ میں کلی طور پر اور میدانی علاقہ میں ایک حد تک کسی سلطنت کو قدم نہیں جمانے دیا اور سترھویں صدی میں مغلوں کے انتہائی عروج میں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ قبائل عملی طور پر خود مختار ہیں۔

اب بات اٹھارویں صدی کے اوائل تک آپہنچی ہے اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ کابل اب بھی دہلی کی مغلیہ سلطنت کا حصہ ہے اور اس سلطنت کا مالک اورنگ زیب ابھی تک تخت نشین ہے۔ قندھار جسے ۱۶۴۹ء میں صفویوں نے شاہ جہان سے چھین لیا تھا مغلوں کی تمام کوششوں کے

باوجود ھندوستان کی طرف شہنشاہ اصفہان کا سرحدی شہر بنا ہوا ہے۔ وادی پشاور، روہ کی پہاڑیاں اور سلسلہ کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے درمیان کا تمام نشیبی علاقہ اب بھی برائے نام سلطنت مغلیہ کی حدود میں ہے لیکن مغلوں کا حکم پہاڑی علاقہ میں بالکل نہیں چلتا اور میدانی علاقہ میں بھی طوعاً و کرھاً ھی مانا جاتا ہے۔ اھم ذرائع مواصلات مثلاً خیبر سے گزرنے والی شاھراہ پر رکاوٹیں پیدا کردی جاتی ھیں اور نظم و نسق جس میں مغلوں کا مفصل نظام لگانداری خاص طور پر قابل ذکر ہے شہروں اور شاھراھوں کے قریبی علاقوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں مانا جاتا۔ پشاور بھی برائے نام مغلیہ صوبہ کابل کا حصہ ہے جہاں ڈپٹی گورنر متعین ہے۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب رحلت کر گئے۔ ۱۷۰۸ء میں سکھوں کے دسویں اور آخری گورو گوبند سنگھ ختم ھوئے۔ انہیں گھوڑوں کے ایک پٹھان تاجر کے بیٹے نے انتقاماً قتل کردیا۔ اس تاجر کو چند سال پہلے گوبند سنگھ نے غصہ میں آکر ھلاک کردیا تھا (۱)۔ ۱۷۰۷ء میں غلجی سردار میرویس نے قندھار میں فارس کے حکمراں صفوی خاندان کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ دونوں سال دو بڑی مسلم سلطنتوں یعنی مغلیہ اور صفوی سلطنتوں کے زوال کے ابتدائی سال تھے۔ یہ وھی سلطنتیں ھیں جو گزشتہ دو سو سال سے مشرقی ایران کے وسیع خطہ پر حکمراں تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں کے سرحدی صوبے الگ ھوگئے۔ اور اس خلا میں دو نئی مملکتیں یعنی افغانستان اور سکھوں کی سلطنت قائم ھوئی۔ آخرکار افغانوں کو بھی اپنے وطن میں ریاست کا قیام نصیب ھوگیا۔

زمانہ قبل اسلام میں خاص فارس اور اس کے سرحدی علاقوں کے ساکا اور کشان خاندانوں نے ایک ایسی سلطنت قائم کی تھی جو اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے ایرانی تھی اور اس میں موجودہ افغانستان بھی شامل تھا۔ لیکن ۱۰۰۰ء کے بعد ھرات سے دریائے سندھ تک کا پورا علاقہ یا تو ترک اور ترک منگول ریاستوں میں تقسیم رہا یا فارس اور

(۱) گووند نے مغلوں کے خلاف لڑائیوں کے لئے بہت سے پٹھان سپاھی بھرتی کر رکھے تھے جن سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ گووند نے مرتے وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کا انجام ٹھیک ھی ھوا ہے اور اس نے اپنے قاتل کو معاف کر دیا تھا۔ لیکن یہ پٹھانوں اور سکھوں کی دشمنی کی ابتدا تھی۔

ھندوستان کی بڑی سلطنتوں میں بٹ گیا۔ قندھار میں میر ویس کا خروج ایک جداگانہ مشرقی ایرانی ریاست کے قیام کی ابتدا ثابت ھوا۔ دھلی کے پٹھان بادشاھوں کی طرح اس موقع پر بھی ایک غلجی ھی نے اس کامیابی کے لئے میدان ھموار کیا اور اس کی بنیاد رکھی۔

یہ فارس کے واقعات نہیں ھیں۔ بلکہ جس طرح ظہور اسلام سے پہلے ھم دیکھ چکے ھیں کہ سرحدی علاقہ کی قسمت مغربی ایران میں بلکہ دریائے دجلہ کے کنارے رونما ھونے والے واقعات کے ساتھ وابستہ تھی اسی طرح اٹھارویں صدی میں بھی جو عمارت بنی اس کی بنیاد بھی ایرانی تھی۔ اس لئے کہ میرویس کا تذکرہ نادرشاہ پر ختم ھوتا ھے اور نادر جس نے ایران کے تخت پر قبضہ کیا تھا صحیح معنی میں افغانستان کی درانی سلطنت کا بانی تھا۔ اسے درانیوں کا بیان بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ روہ کے واقعات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک ان واقعات کا تذکرہ نہ کیا جائے جن کی بدولت ایک عرصہ تک درانی حکمران دریائے سندھ بلکہ اس سے آگے تک کے علاقہ میں پھیلے ھوئے افغانوں اور پٹھانوں کو اپنی سلطنت میں شامل کئے رھے۔ جو تقاضے آج بھی اس علاقہ کی بین الاقوامی پالیسیوں پر اثر انداز ھوتے ھیں وہ ایک حد تک ان ھی عوامل کا نتیجہ ھیں جن کی ابتدا اٹھارویں صدی میں ھوئی اور جس عہد میں ایران اور ھندوستان کی صفوی اور مغلیہ سلطنتیں ختم ھوگئیں۔

میر ویس ایک بہادر جنگجو تھا وہ قندھار کے قریب بسنے والے غلجیوں کی ھوتک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے قندھار کے ایرانی گورنر کے خلاف بغاوت کردی جسے افغان مصنفوں نے سخت مزاج جارجی بتایا ھے اور اسے گورگین کے نام سے یاد کیا ھے۔ افغان مصنفوں کے بیان سے ظاھر ھوتا ھے کہ گورگین بھی اسٹالین کی طرح سنگدل اور لوگوں سے متنفر تھا البتہ اسٹالین کی طرح عیار نہیں تھا۔ میر ویس نے خوشامد فریب اور طاقت سے کام لے کر اپنے جارجی حریف کو شکست دی اور اسے قتل کر دیا اور شہر کا مالک بن بیٹھا۔ جن دنوں میرویس اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کر رھا تھا ان ھی دنوں وہ صفوی سلطنت کے دارالحکومت اصفہان پہنچا جہاں وہ صفوی بادشاہ کی نظروں میں چڑھ گیا۔ تیاری کے اسی زمانہ میں میر ویس اور اس کے بیٹے میر محمود پر ایرانی سلطنت کی کمزوریاں اور

زوال کے آثار عیاں ہوگئے۔ اس زمانہ سے آج تک ایک روایت چلی آرہی ہے وہ یہ کہ ہر افغان ایرانی کو مردانہ صفات سے عاری سمجھتا ہے اور ہر ایرانی افغانوں کو اکھڑ اور گنوار سمجھتا ہے۔

۱۷۱۵ء میں میرویس کی وفات کے بعد اس کے بھائی عبدالعزیز اور بیٹے میر محمود میں اقتدار کے لئے جنگ شروع ہوگئی یہاں تک کہ ۱۷۱۷ء میں محمود نے اپنے چچا کو قتل کر دیا۔

چچا کو ختم کرنے کے بعد محمود نے اپنے غلجی قبیلہ کی مدد سے ایرانیوں کے خلاف کامیاب جنگی مہمات شروع کردیں۔ ۱۷۲۰ء میں اس نے کرمان فتح کرلیا اور شقاوت کے لرزہ خیز مظاہروں کے بعد طویل محاصرہ کرکے صفوی پایۂ تخت اصفہان پر بھی قابض ہوگیا۔ شاہ طہماسپ اس کے ہاتھ گرفتار ہوا اور اس نے وہی کھیل پھر کھیلا جو مرزا الغ بیگ ثانی نے یوسف زئیوں کو کابل میں بلا کر کھیلا تھا۔ محمود کو یقین تھا کہ صرف دہشت گردی ہی کے ذریعہ ایرانیوں کو اطاعت گزار بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک بڑے میلہ کا اہتمام کیا اور تمام سر برآوردہ ایرانی سرداروں کو میلہ میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ بےچارے اپنے نئے بادشاہ کو خوش کرنا چاہتے تھے اور انہیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ بادشاہ کے ارادے کتنے خطرناک ہیں چنانچہ ایکسو چودہ ایرانی سرداروں نے میلہ میں شرکت کی۔ انہوں نے دیکھا کہ شاہی باغ میں ضیافت کے اہتمام کی بجائے غلجی ہتھیار سنبھالے بیٹھے ہیں۔ یہ تمام ایرانی سردار ایک ایک کرکے قتل کر دئے گئے۔

قتل عام کے اس شوق نے محمود کو بھی اسی طرح پاگل بنادیا جس طرح چار صدی پہلے دھلی کے سلطان علاوالدین خلجی کو پاگل بنادیا تھا وہ قتل سے لطف اندوز ہونے لگا اور اس نے اپنے ہی قبیلہ کے لوگوں کو اس ایذا پسندی کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ قبائل ہر بات برداشت کرنے کو تیار تھے لیکن اپنے ساتھ غداری برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ محمود کی یہ حرکتیں جان لیوا ثابت ہوئیں۔ اس کے کٹے ہوئے سر کو اس کے چچازاد بھائی اشرف نے نشان ظفر کے طور پر بلند کر دیا۔ اس طرح اشرف نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ حملہ آوروں نے اشرف کو اپنا لیڈر

تسلیم کر لیا۔ اشرف فن جنگ کا ماہر تھا۔ اس نے ایک طاقتور عثمانی فوج کا صفایا کردیا جو صفوی خاندان کے زوال سے فائدہ اٹھا کر ایران پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ ترکوں کی نظر میں اشرف کی جو وقعت تھی وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ پورٹ نے ۱۷۲۷ء میں اسے ایران کا جائز فرماں روا قرار دیا ہے۔

غلجی لڑائی تو جیت سکتے تھے لیکن حکومت کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ امور سلطنت سے بالکل ناواقف تھے حالانکہ دنیا میں ایک قدیم ترین تہذیب کے فاتحوں کی حیثیت سے ان پر حکومت کی زبردست ذمہ داری آپڑی تھی۔ نادر قلی خان جس نے بعد میں تخت پر قبضہ کیا ترکمانوں کی افشار شاخ سے تعلق رکھتا تھا اس نے غلجیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور پورے ایران کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ ۱۷۳۰ء تک اشرف مہمن دشت اور شیراز کے قریب زرغن کے مقامات پر دو فیصلہ کن لڑائیوں میں شکست کھا چکا تھا۔ اور جیسا کہ آپس کی دشمنی کی وجہ سے غلجیوں میں ہوتا چلا آیا ہے اس فوجی دستہ سے فرار کی کوشش کرتے ہوئے مارا گیا جو اس کے چچا زاد بھائی حسین سلطان نے بھیجی تھی۔ حسین ۱۷۳۸ء تک قندھار پر قابض رہا یہاں تک کہ نادر نے جو اس وقت تک شاہ فارس بن چکا تھا ہندوستان پر چڑھائی کے لئے جاتے ہوئے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور اس طرح بدقسمت غلجی غاصبوں کا سلسلہ ختم کر دیا۔ افغان مورخ بھی انہیں شاہ فارس کے معزز لقب سے یاد نہیں کرتے۔ یہ حکمراں محض میر کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

ایک طرف تو غلجی اس غلط راستہ پر گامزن تھے اور دوسری طرف مغرب میں بسنے والا بڑا افغان قبیلہ ابدالی ہرات اور مشہد کے درمیان زوال پذیر فارس کے علاقے دبا کر اپنے قبائلی علاقہ میں توسیع کر رہا تھا۔ یہ قبیلہ جو تعداد اور علاقہ کے اعتبار سے غلجی'' قبیلہ کے برابر ہے اور غالباً دولت میں غلجیوں سے بڑھا ہوا ہے اس کا تذکرہ پہلے پہل شاہ عباس اعظم کے عہد (۱۵۸۷-۱۶۲۹ء) میں سنائی دیتا ہے۔ شاہ عباس نے ملک سدو کو قندھار کے قرب وجوار میں سلطنت کی خدمات کے صلہ میں اس قبیلہ کا سردار بنا دیا تھا۔ صفویوں کے زوال اور نادرشاہ کے عروج کے ساتھ اس قبیلہ کا نام بھی چمکا۔ چونکہ یہ قبیلہ دوسرے افغان قبائل کے مقابلہ

میں سب سے زیادہ مغرب میں آباد تھا اس لئے اس کا فارس سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس قبیلہ کے سردار نے اہل فارس کے طور طریقے اور لباس اپنا لیا تھا اور اس زمانہ میں بھی تمام سرکردہ ابدالی اپنی بگڑی ہوئی فارسی بولتے تھے حال آنکہ غلجیوں کی طرح وہ بھی بظاہر اہل فارس کو زن صنعت اور حقیر سمجھتے تھے۔ آج کی طرح غالباً اس زمانہ میں بھی بہت سے ابدالی اپنی پشتو روایات اور پشتو زبان بھول چکے تھے اور پشتو بولتے بھی تھے تو ملائم لہجہ کے ساتھ بولتے تھے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ الفنسٹن نے، جو ۱۸۰۹ء میں ابدالیوں سے ملے تھے ان کا جو سراپا بیان کیا تھا وہ قدیم مورخ ہیروڈوٹس کے سگاریتائے کے سراپا سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔ اخامنشی نقشہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سگاریتوئے کس علاقہ میں آباد تھے۔ غالباً یہ لوگ صوبہ ایریا میں ہرات کے قریب آباد ہوں گے۔ آج بھی ابدالی قریب قریب اسی علاقہ میں آباد ہیں یعنی قندھار سے گرشک اور فرح کے راستہ ہرات تک پھیلے ہوئے علاقہ کے وسطی حصہ کے جنوبی کنارے پر۔ ہیروڈوٹس کے بیان کردہ سگاریتائے کی طرح ابدالی بھی زبان کے اعتبار سے فارسی اور لباس کے اعتبار سے آدھے فارسی اور آدھے پکھتوان ہیں۔

ابدالی ایک مرتبہ محمد زمان خان (۱) اور حاجی جمال کی قیادت میں ایرانیوں سے مشہد چھین لینے میں کامیاب ہو گئے۔ نادر ان دنوں جنوب میں غلجیوں کے ساتھ الجھا ہوا تھا اس لئے اسے ابدالیوں سے نپٹنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ۱۷۲۹ء میں چار گھمسان کی لڑائیوں کے بعد نادر شاہ ان پر غالب آگیا۔ اس کے بعد غلجی سردار اشرف کو شیراز کے قریب قطعی شکست دینے کے بعد نادر ایک بار پھر ابدالیوں کی طرف متوجہ ہوا اور گھمسان کی لڑائی کے بعد جس میں کبھی ایک فریق کا اور کبھی دوسرے کا پلہ بھاری معلوم ہوتا تھا انہیں ہرات تک مار بھگایا۔ اس نے ہرات کا محاصرہ کر لیا اور اسے ۱۷۳۲ء میں فتح کر لیا۔ تین مرتبہ صلح ہوئی اور تینوں مرتبہ ابدالی جنھیں کمک پہنچنے کی امید تھی معاہدہ سے پھر گئے اور جنگ چھیڑ دی۔ لیکن ان کی اس علانیہ عہد شکنی کے ساتھ نادر شاہ بڑی فیاضی سے پیش آیا۔ اسے معلوم ہو گا کہ ایک صدی

---

(۱) محمد زمان ملک سدو کے اخلاف میں سے تھا۔ وہ احمد شاہ کا باپ تھا اور اس طرح سدو زئی بادشاہوں کا جد امجد تھا۔ حاجی جمال پائندہ خان کا باپ تھا اور بارک زئی خاندان کا سلسلہ اسی سے شروع ہوا۔

پہلے ان کے اسلاف نے شاہ عباس کی کتنی شاندار خدمات انجام دی تھیں پھر اس نے ابدالیوں کی اہل فارس کے ساتھ قربت بھی محسوس کی ہو گی نادر شاہ ابدالیوں کی جنگی صلاحیتوں سے واقف تھا اور یہ تہیہ کئے ہوئے تھا کہ فیاضانہ سلوک کے ذریعہ انہیں اپنا حامی بنا کر اپنی فوج میں شامل کر لے۔ یہ منصوبہ پورا کرنے میں نادر شاہ نے بڑی سیاسی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ وہ ابدالیوں کا اتحاد حاصل کرنے میں کامیاب ھو گیا اور ان کی حمایت کے بھروسہ پر وہ غلجیوں کے ساتھ اپنے معاملات طے کر کے قندھار چلا گیا۔ نادر شاہ نے ۱۷۳۸ء میں قندھار کا محاصرہ کیا اور اس شہر کو آخری غلجی میر سلطان حسین سے چھین لیا۔ وھاں ابدالی ملک محمد زمان خان کے بیٹے ذوالفقار اور احمد موجود تھے جو غلجیوں کی پناہ میں آئے تھے۔ احمد اس وقت قریباً پندرہ سال کا لڑکا تھا۔ نادر ان کے بہادرانہ اطوار سے بڑا متاثر ھوا ان کے ساتھ بڑی فیاضی سے پیش آیا اور انہیں وطن سے دور، زندران بھیج دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد احمد نئی افغان فوج میں بھرتی ھونے کے لئے جو نادر بھرتی کر رھا تھا نادر کے پاس پہنچ گیا۔

یہ افغان دستہ اخامنشیوں کے غیر فانی دستہ کی طرح نادر کی فوج کا سب سے زیادہ معتمد دستہ بن گیا۔ افغان فوج میں سب سے زیادہ تعداد ابدالیوں کی تھی لیکن نادر غلجیوں سے بھی صبر آزما لڑائیاں لڑ چکا تھا۔ اس لئے اس قبیلہ کے بھی بہت سے سپاھیوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا تھا مختلف اندازوں کے مطابق افغان دستہ کی تعداد چار ہزار کے درمیان تھی صحیح تعداد خواہ کچھ بھی ہو لیکن تمام مورخوں نے یہ ضرور لکھا ھے کہ افغان شہسوار دستہ نادر کا ذاتی محافظ تھا اور نادر صرف اسی دستہ پر اعتماد کرتا تھا۔ اس دستہ کی کمان آٹھ ابدالی اور دو غلجی ملکوں کے ھاتھ میں تھی۔ پورے دستہ کی اعلیٰ کمان پہلے پہل نور محمد خان کے سپرد کی گئی جو ابدالی قبیلہ کی علی زئی شاخ سے تھا۔ یہ افغان دستہ نادر کے ساتھ ھندوستان گیا جہاں اس نے تمام خطرات اور کامیابیوں میں نادر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ان ھی میں سے چند سپاھیوں کو جب دھلی کے ایک ھجوم نے ھلاک کر دیا تھا تو نادر نے غصہ میں آ کر قتل عام کا حکم دیا تھا۔ اس واقعہ کی بنا پر نادر شاھی حکم کا فقرہ شمالی ھندوستان کی زبانوں میں شامل ھو گیا ھے۔ ان افغانوں نے غالباً سب سے زیادہ شاندار

خدمت اس وقت انجام دی جب انہوں نے نادر کی فوج کو جو ہندوستان فتح کرنے کے بعد واپس آتے ہوئے درۂ خیبر میں سے گزر رہی تھی افریدی اور دیگر قبائل کے ہاتھوں مکمل تباہی سے بچا لیا۔ اس موقع پر اس ایرانی فاتح کو بڑی ہی نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اور صرف اس وجہ سے بچ نکلا کہ اس کی فوج کے افغان دستہ نے حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر بھی اسے اس وقت تک چھٹکارا نہ ملا جب تک اس نے قبائل کو جنھوں نے اس کا راستہ بند کر دیا تھا بھاری رقم نہیں دی۔ بعد میں نادر نے اپنی افغان فوج کے ساتھ جو ترجیحی سلوک کیا اس کی وجہ سے اس کے اپنے قبیلہ ترکمان کے فوجیوں میں جو قزلباش کے نام سے مشہور ہیں شدید حسد پیدا ہو گیا اور یہی حسد محمد خان قاچار کے ہاتھوں اس کے قتل کا سبب بنا۔ محمد خان قاچار اس خاندان کا بانی ہے جو نادر شاہ کے بعد فارس کے تخت پر بیٹھا۔

نادر کو ہندوستان سے واپس ہوئے چند ہی سال ہوئے تھے کہ ۱۷۴۷ء میں اسے اپنے خیمہ میں قتل کر دیا گیا۔ ان دنوں افغان فوج کے ابدالی دستہ کی کمان احمد خان کے ہاتھ میں تھی۔ شوروغل سن کر احمد اور اس کے ساتھی خیمہ کے جھنڈے کی طرف بڑھے تاکہ اپنے بادشاہ کی حفاظت کریں۔ قزلباشوں نے جو تعداد میں افغانوں سے کہیں زیادہ تھے ان کا راستہ روک لیا۔ لیکن احمد خان جو بادشاہ کا وفادار تھا مارتا کاٹتا راستہ صاف کر کے شاہی خیمہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ نادر کی نعش جس کا سر غائب تھا خون میں لتھڑی پڑی ہے۔ ابدالی سچے دل سے بادشاہ کے وفادار تھے۔ انہیں ایک طرف تو ایک قابل اعتماد سردار سے محرومی کا صدمہ تھا اور دوسری طرف یہ ندامت تھی کہ بادشاہ ان پر اتنا بھروسہ کرتا تھا لیکن وہ وقت پر اس کے کام نہ آسکے۔ انہیں اپنے غم کے اظہار کا موقع مل گیا۔ انہوں نے ایک بار پھر لڑ بھڑ کر راستہ نکالا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر قندھار روانہ ہو گئے۔

احمد خان نے قندھار جاتے ہوئے تیزی سے اپنا دماغ دوڑایا۔ نادر مر چکا تھا۔ لیکن پہلے زمانہ کے ایرانی حکمرانوں کی طرح وہ مشرق میں کافی دور تک ایرانی سلطنت کو وسیع کر چکا تھا۔ یہ درست ہے کہ ایک صدی پہلے اس وقت سے جب قندھار شاہ جہان سے چھین لیا گیا تھا

یہ شہر ایرانی سلطنت میں شامل تھا لیکن جب تک نادر نے کابل فتح نہیں کیا یہ علاقہ مغلیہ سلطنت کا صوبہ رہا تھا اور پشاور اسی صوبہ کا حصہ تھا۔ ملتان اور ڈیرہ جات بھی مغلیہ سلطنت کا حصہ تھے لیکن نادر نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ نادر نے دھلی کی فتح کے بعد امن کی قیمت کے طور پر نہ صرف تخت طاؤس اور بیش قیمت مغلیہ خزانہ (جس میں کوہ نور (۱) بھی شامل تھا) ہی حاصل کیا تھا بلکہ ماورائے سندھ کے تمام اضلاع جن میں پشاور بھی شامل ہے فارس میں شامل کر لئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ نادر پر دھلی کی سلطنت کی کمزوریاں آشکار ہو گئی تھیں۔ احمد نے سوچا کہ کیوں نہ ایرانی فاتح سے سرداری حاصل کی جائے اور نہ صرف صفوی سلطنت کا مشرقی حصہ حاصل کیا جائے بلکہ ان تمام زرخیز مغلیہ صوبوں پر بھی قبضہ کر لیا جائے جو ایرانی فوج نے فتح کر لئے تھے۔ یقیناً ان خیالات کے ساتھ احمد کے دماغ میں ایک پشت پہلے غلجیوں کی حیرت انگیز کامیابی بھی تھی جو بعد میں فوری طور پر تباہی

(۱) کوہ نور وہی ھیرا ھے جس کے متعلق بابر نے اپنی تزک میں لکھا ھے کہ سب سے پہلے یہ ھیرا علاوالدین خلجی نے (۱۲۹۲-۱۳۱۲ء) میں حاصل کیا تھا۔ بعد میں یہ ھیرا گوالیار کے ہندو راجاؤں کے ھاتھ آ گیا۔ راجہ بکرماجیت (جو ۱۵۲۶ء میں پانی پت میں مارا گیا) کے خاندان نے جو اپنی جان بخشی کے لئے ھمایوں کا مرھون منت تھا ھمایون کو پیش کر دیا۔ ھمایون نے یہ ھیرا بابر کو پیش کیا جس نے یہ ھیرا دعاؤں کے ساتھ ھمایون ھی کو واپس کر دیا۔ بعد میں دو سو سال تک یہ ھیرا مغلوں کے موروثی خزانہ میں رھا اور باری باری اکبر جہانگیر شاہ جہان اور اورنگ زیب کے جسم کی زینت بنتا رھا۔ جب نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دھلی فتح کی تو اس نے اس ھیرے پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور جیسا کہ اس عبارت میں بیان کیا گیا ھے نادر شاہ کے دوسرے خزانہ کے ساتھ یہ ھیرا بھی ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ سدوزئی کے ھاتھ آیا۔ کوہ نور ۱۸۰۰ء تک سدوزئیوں کے قبضہ میں رھا۔ پھر شاہ زمان نے جو جان بچاتا پھر رھا تھا اسے شنواری علاقہ میں ملا عاشق کے قلعہ کی دیوار میں چھپا دیا۔ یہاں سے یہ ھیرا شاہ شجاع کے ھاتھ آیا اور ۱۸۱۳ء تک اسی کے قبضہ میں رھا۔ پھر شجاع سے رنجیت سنگھ نے یہ ھیرا چھین لیا۔ جب انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قبضہ کیا تو یہ ھیرا برٹش انڈیا کمپنی کے ھاتھ لگا جس نے اسے اگلے سال ملکہ وکٹوریہ کی نذر کر دیا۔ جب الفنسٹن ۱۸۰۹ء میں بالا حصار میں شاہ شجاع کے دربار میں حاضر ھوا تھا تو اس نے یہ ھیرا بادشاہ کے بازوبند میں ٹکا ھوا دیکھا تھا۔

میں بدل گئی۔ وہ کامیابی حاصل کرنے میں غلجیوں کی تقلید کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس جنوبی ایشیا کی بہترین فوج تھی اور غلجیوں کی طرح تباھی سے بچنے کے لئے اس نے یہ سوچا کہ وہ مغرب کی بجائے مشرق کی طرف بڑھے گا۔ وہ اپنے حوصلوں اور امنگوں کا مرکز وسطی ایران کو نہیں بلکہ مغلیہ سلطنت کی سرحد سے ملنے والے افغان علاقوں کو بنائے گا۔

امیر عبدالرحمن نے اپنے سوانح میں احمد کے شاہ افغانستان منتخب ہونے کے واقعہ کی بڑی اچھی تصویر پیش کی ھے جو کابل کی ڈائری میں درج ھے۔ کہا جاتا ھے کہ نادر کے قتل کے بعد مختلف قبائل کے سردار جن کی قیادت حاجی جمال بارک زئی کر رھا تھا نیا بادشاہ منتخب کرنے کے لئے قندھار کے قریب شیر سرخ کے مزار پر جمع ہوئے۔ ہر سردار سے باری باری اس کی رائے معلوم کی گئی۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ مجھے بادشاہ بنا دیا جائے اور میں کسی اور کی اطاعت قبول نہیں کروں گا۔ احمد سے جو عمر میں سب سے چھوٹا تھا اس کی رائے سب سے بعد میں معلوم کی گئی۔ وہ خاموش رھا اور اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس پر ایک بزرگ صابر شاہ (۱) نے گندم کی ایک بال اپنے ھاتھ میں لی اور اسے احمد کے سر پر رکھ کر اعلان کیا کہ یہی وہ واحد شخص ھے جس نے نفاق نہیں پھلایا اور یہی بادشاھت کا مستحق ھے۔ دوسرے سردار احمد کی کمسنی پر نظر رکھتے ہوئے اس انتخاب کا مذاق اڑانے والے تھے کیونکہ احمد کی عمر صرف چوبیس سال تھی۔ لیکن بعد میں سرداروں نے سوچا کہ احمد سدوزئی خیل سے تعلق رکھتا ھے جو بڑے کمزور قبیلہ پوپلزئی کی شاخ ھے۔ اس لئے سدوزئی خیل سے چنا ہوا بادشاہ طاقتور قبائل کے اشاروں پر نہ چلا تو اسے آسانی سے معزول کیا جا سکتا ھے۔ اس انتخاب پر تمام سردار متفق ہو گئے اور سب نے یہ ظاھر کرنے کے لئے کہ وہ بادشاہ کے مال مویشی ھیں اپنے اپنے منہ میں گھاس لے لی اور اطاعت کے اظہار کے لئے اپنی اپنی گردنوں کے گرد کپڑا ڈال دیا اور بادشاہ کو زندگی اور موت کا اختیار دے دیا۔

بعد میں اس قصہ میں یہ بات بھی جوڑ دی گئی کہ حاجی جمال نے جو سب سے زیادہ طاقتور بارک زئی قبیلہ کا سردار تھا بادشاہ سے یہ

---

(۱) دوسرے مصنفوں نے اس کا نام مستان شاہ بتایا ھے۔

وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اپنا وزیر اسی قبیلہ سے منتخب کرے گا۔

احمد خان فطری لیڈر تھا اور یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حالات اس کی کوششوں کے بغیر اتنی آسانی سے سازکار ہو گئے ہوں۔ واقعات خواہ کچھ بھی ہوں وہ احمد شاہ کے نام سے قندھار میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ُدر ُدر ّاں کا لقب اختیار کیا۔ اس کی یہ وجہ بتائی جاتی ہے کہ اسے موتیوں کی بنی ہوئی کانوں کی بالی پہننے کا شوق تھا۔ اسی زمانہ سے اس کا قبیلہ جو پہلے ابدالی کہلاتا تھا درانی کے نام سے مشہور ہوا۔

ایک واقعہ نے جسے مورخوں نے محض اتفاق قرار دیا ہے احمد کے عزائم اور بھی مستحکم کر دئے۔ کہا جاتا ہے کہ قندھار جاتے ہوئے احمد کو وہ قافلہ ملا جو نادر کے لئے ایک کروڑ روپیہ کی مالیت کا خزانہ اور لوٹ کا مال لئے جا رہا تھا۔ یہ مال نادر کے ہندوستان پر حملہ کا صلہ تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس خزانہ میں کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا۔ احمد نے اس خزانہ پر قبضہ کر کے نئی افغان مملکت کی بنیاد ڈالی اور اپنی تخت نشینی کی تقریبات کے اخراجات پورے کئے اور باقی رقم خزانہ میں رکھ دی۔ یہ بات کہیں نہیں بتائی گئی حال آنکہ یہ اظہرمن‌الشمس ہے کہ خزانہ کے ساتھ محافظ دستہ موجود ہو گا اور یہ دستہ نادر کے معتمد افغان دستہ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ یہ بات قابل یقین نہیں ہے کہ نادر شاہ جیسے لالچی بادشاہ نے اپنے تاج کے ہیرے اس حالت میں اپنی فوج سے الگ بھیج دئے ہوں کہ ان کی حفاظت نہ کی جا سکے۔ اس کے علاوہ ہندوستان فتح ہوئے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ یہ پورا واقعہ قبائلی اصول اور طریقہ کا مظہر ہے۔ قبائل کسی عظیم شخصیت کے ساتھ محبت کی حد تک وفاداری کرتے ہیں۔ یہ لوگ جس کسی کے حامی ہوجائیں اس کی خاطر جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ پیشہ‌ور سپاہیوں کی حیثیت سے افغانوں نے شاندار کارنامے انجام دئے ہیں لیکن وہ کسی ایسے اصول پر قائم نہیں رہ سکتے جو ان کی وقتی اور ذاتی غرض کے منافی ہو۔ قائد کے منظر عام سے ہٹتے ہی قبائل وہ راستہ اختیار کرتے ہیں جس میں انہیں فوری طور پر ذاتی فائدہ نظر آتا ہے۔ یہ طرز عمل خلاف معمول نہیں تھا۔ احمد شاہ کے اس اقدام کو قابل تعریف حکمت عملی قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اس بادشاہ کا خزانہ لوٹ کر جس کی اس نے خدمت کی تھی اپنے مصرف

میں لے آیا۔ اس کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا یہ اقدام سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تھا۔ اسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قسمت ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔

اپنے چھبیس سالہ (۱۷۴۷-۷۳ء) دور حکومت میں احمد شاہ نے سندھ پار کے علاقہ پر آٹھ حملے کئے اور پنجاب کو تاخت تاراج کرتا ہوا دھلی تک پہنچا۔ حکومت کے ابتدائی دو سالوں میں اس کے دو حملوں کا مقصد یہ تھا کہ پشاور اور ماوُرائے سندھ کے جو دوسرے علاقے نادر کے قبضہ میں چلے گئے تھے ان پر مغل بادشاہ سے اپنی حکومت کی توثیق کرا لی جائے۔ ۱۷۵۲ء میں اس کا تیسرا حملہ ایک بڑا مقصد لئے ہوئے تھا۔ اسی مہم میں اس نے لاھور اور ملتان فتح کیا پورے مغربی پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور موجودہ مغربی پاکستان کی مشرقی سرحد سے آگے سرھند کے مقام پر اپنی سلطنت کی سرحد قائم کی اسی سال درانی کشمیر کے بھی مالک بن گئے۔ انہوں نے کشمیر یوسف زئیوں اور پشاور کے آس پاس بسنے والے دوسرے قبائل کی مدد سے فتح کیا اور ان ھی کی مدد سے اس پر قابض رھے۔ اسی وقت سے پٹھانوں کو اس حسین سر زمین سے خاص تعلق خاطر پیدا ھو گیا ھے جو آج تک قائم ھے۔ مغربی افغانوں کے لئے کشمیر ان کے وطن سے بہت دور تھا اور وہ اپنے وطن خراسان کی مردانہ خوبصورتی کو یاد کرتے رھتے تھے۔ لیکن مشرقی افغان اور کرلانی قبیلوں کے ذھنوں میں کشمیر کا تصور ایک محبوبہ جیسا ھے۔ جو قبائل اس سے محبت کرتے ھیں وہ احساس جرم کے ساتھ اس کی خوبصورتی کے مزے لیتے ھیں لیکن کشمیر کی خوبصورتی کے قائل ھونے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے وطن کا خیال آجاتا ھے جو ان کا جائز مسکن ھے۔ جذبات کے اس تصادم کو اس ضرب‌المثل کی شکل میں ابدیت دے دی گئی ھے۔ ”ھر شخص کے لئے اپنا وطن کشمیر ھے۔“

۱۷۶۱ء میں مہینوں بڑے صبر کے ساتھ جوڑ توڑ اور جھڑپوں میں مصروف رھنے کے بعد احمد شاہ نے دھلی سے پچاس میل شمال میں پانی پت کے میدان میں تمام مرھٹوں کی زبردست فوج کو شکست دی اور اسے تتر بتر کر دیا۔ عام طور پر اس لڑائی کو دنیا کی فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار کیا جاتا ھے اور یہ کہا جاتا ھے کہ اس سے شمالی ھندوستان

مرہٹوں کی دست برد سے بچ گیا اور برطانیہ کے لئے پہلے دہلی اور پھر پنجاب تک اقتدار قائم کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔ لیکن اب احمد شاہ کی مہمات کو ایک وسیع نکتۂ نظر سے پرکھا جا سکتا ہے۔ احمد شاہ کے حملوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کے جس سقوط کا آغاز کیا تھا احمد شاہ نے اسے بڑی تیزی سے مکمل کر دیا اور پنجاب میں طوائف الملوکی پھیلا دی جس سے ایک نئی طاقت یعنی سکھوں کا ابھرنا ممکن ہو گیا۔ اس نے ایسے حالات پیدا کر دئے کہ لاہور اور ملتان اور پشاور اور ڈیرہ جات نئے سرے سے مغرب کی طرف آس لگانے لگے یہ بات خلاف معمول تھی۔ مسلمانوں کے عہد سے پہلے اور پھر محمود غزنوی کے دور میں ان علاقوں کا مرجع مغرب ہی تھا لیکن احمد شاہ سے پہلے کئی صدیوں سے یہ علاقے دہلی سے آس لگائے چلے آرہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہی رویہ خواہ ذہن میں واضح نہ ہو لیکن مغربی پاکستان کی حب الوطنی کی جذباتی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ بہ الفاظ دیگر کم از کم برصغیر کے مغربی حصہ میں ۱۹۴۷ء کی تقسیم صرف مذہبی اختلاف کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کا ایک تاریخی پس منظر بھی تھا۔ لیکن اس مسئلہ کے قطعی تصفیہ سے پہلے سکھوں کے ساتھ طویل جنگ ہوئی۔ اس تصفیہ کی بنیادیں دو صدیوں کی تاریخ کے سینہ میں پیوست ہیں۔

پانی پت میں مرہٹوں کی شکست اور احمد شاہ کے کابل واپس چلے جانے کے بعد سکھوں نے طاقت حاصل کرنی شروع کی۔ فوجوں کے گزر کی وجہ سے جو غیر یقینی حالات پیدا ہو گئے تھے ان کی بدولت پنجاب باقاعدہ نظم و نسق سے محروم ہو گیا۔ اور سکھ مثل (۱) میں سے بہت سے لیڈر محفوظ مقامات پر قلعے بنانے لگے اور احمد شاہ کے مقرر کردہ حاکموں کی حکم عدولی کرنے لگے ان ہی سکھ لیڈروں میں رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ بھی شامل تھا۔ احمد شاہ کے بیٹے تیمور نے ۱۷۵۷ء میں سکھوں کے مقدس شہر امرت سر کو لوٹا تھا اس پر سکھوں میں جو غصہ کی آگ بھڑکی اسے فوجی تیاری کی شکل دے دی گئی۔ (۱۷۶۲-۶ء) کے درمیان احمد شاہ کے آخری تین حملوں کا مقصد سرکش سکھوں کو قابو میں لانا تھا۔ سکھ

---

(۱) وہ بارہ جتھے یا گروہ جن میں سکھ فرقہ شروع شروع میں منظم کیا گیا تھا۔ ہر جتھ کسی گاؤں یا سردار کے نام سے مشہور تھا۔ اردو میں مثل کا مطلب ہے ترتیب یا تنظیم۔ دفتری فائل کو بھی مثل کہتے ہیں۔

اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ سکھوں نے مساجد کی جو بے حرمتی کی تھی اس کا انتقام لینے کے لئے امرت سر میں سکھوں کے دربار کو تباہ کیا گیا اور اس کی بےحرمتی کی گئی۔ لیکن احمد خود زیادہ عرصہ ہندوستان میں قیام نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صحت گرتی جارھی تھی۔ جب احمد شاہ آخری بار کابل واپس ھوا تو اسی کے پیچھے سکھ بھی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے انہوں نے روھتاس کے مقام پر شیر شاہ کا قلعہ ھتھیا لیا اور شمال میں راولپنڈی تک کے علاقہ پر قابض ھو گئے۔

ہندوستان پر ان تمام حملوں کے دوران احمد کو پشاور اور اس کے آس پاس کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور نادر شاہ کی طرح اس کی فوجوں کو بھی بارھا مختلف دروں سے گزرنے سے روکا گیا۔ الفنسٹن کا کہنا ھے کہ احمد شاہ نے تمام مشرقی قبائل کو بردرانی کا لقب دیا تھا ممکن ھے اس زمانہ میں کبھی یہ نام استعمال کیا گیا ھو لیکن اب سننے میں نہیں آتا۔ ان قبائل سے نپٹنے کے لئے اس کی پوزیشن مضبوط تھی۔ اول تو وہ خود افغان تھا اس نے نئی افغان مملکت قائم کی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے اپنی فوج میں بہت سے قبائل کو بھرتی کر کے دولت کمانے کا موقع دیا تھا۔ ان ھی وجوہ کی بنا پر اس نے ان خطرات پر قابو پا لیا جو ایک بار نادر شاہ کی فوجوں کو تباھی کے کنارے تک لے آئے تھے۔ لیکن احمد شاہ نے بھی جو پہلا اور سب سے زیادہ طاقتور افغان بادشاہ گزرا ھے کرلانی قبائل کے پہاڑی علاقوں اور وادی سوات کو اپنے باقاعدہ نظم و نسق کے تحت لانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بابر کا طریقہ اپنایا اور قبائلی ملکوں کی بیٹیوں سے شادیاں کر کے قبائل کو اپنا دوست بنا لیا۔ وہ خیبر کے افریدیوں اور شنواریوں کو برابر ٹیکس دیتا رھا اور اس نے بہت سے یوسف زئی، اورکزئی خلیل اور مہمند قبائل کے سرداروں کو جاگیریں عطا کیں۔ اس کے علاوہ اس نے ھر قبیلہ سے کہا کہ وہ سرسری اعداد و شمار جمع کر کے یہ اندازہ لگائیں کہ وہ شاھی فوج کے لئے کتنے سپاھی دے سکتے ھیں۔ آج بھی کوئی وزیر یا محسود قبائلی آپ کو اپنے قبیلہ کی تاریخ کا کوئی واقعہ بتا سکتا ھے تو وہ یہ ھے کہ احمد شاہ نے وزیرستان سے حاصل ھونے والے لشکر کا اندازہ لگایا تھا۔ اعداد و شمار یہ ھیں۔



تیمور شاہ کے دور میں درانی سلطنت

احمد زئی وزیر	۳۰۰۰۰	بھٹنی	۱۲۰۰۰
اتمان زئی وزیر	۳۰۰۰۰	دوڑ	۱۲۰۰۰
محسود	۱۸۰۰۰	میزان	۱۰۲۰۰۰

آج بھی لڑائی یا جرگہ کے موقع پر مختلف قبائل کو ان ھی اعداد و شمار کی بنا پر نمائندگی دی جاتی ھے حال آنکہ موجودہ اندازہ کے مطابق محسود قبیلہ کی طاقت اور تعداد احمد شاہ کے بتائے ھوئے اعداد کے مقابلہ میں غالباً دوگنی ھے۔

احمد کا بیان ختم کرتے ھوئے سکھوں کے مورخ کننگھم نے رومی شہنشاہ گیلبا کے متعلق ٹیسی ٹس کا جملہ دوھرایا ھے۔ وہ احمد شاہ کو افغان مزاج کی بہترین مثال قرار دیتا ھے اور لکھتا ھے کہ احمد جفاکش اور حوصلہ مند تھا وہ فتح کرنا جانتا تھا لیکن سلطنت نہیں سنبھال سکتا تھا وہ رعب دار ضرور تھا لیکن صوبے ھاتھ سے گنواتا رھتا تھا اور فتح کرتا رھتا تھا۔ یہ بیان پنجاب اور سکھ خالصہ کے نقطۂ نظر سے درست ھے لیکن احمد شاہ اس سے کہیں زیادہ اھمیت کا مالک تھا۔ اس نے افغان بادشاھت کی بنیاد ڈالی جو پائدار ثابت ھوئی اور آج بھی افغانستان کا شاھی خاندان احمد شاہ کے درانی قبیلہ سے تعلق رکھتا ھے یہ اور بات ھے کہ دونوں کے خیل الگ الگ ھیں اس کا گھرانا یعنی پوپلزئی درانیوں کی سدوزئی شاخ اتنی مشہور ھوئی کہ آج بھی افغان باشندے اس کی محبت کا دم بھرتے ھیں اور ایک حد تک یہ محبت بین الاقوامی سرحد کو بھی نظر انداز کر دیتی ھے۔ احمد شاہ کے کارناموں کی یاد آج بھی مغربی پاکستان کے محبان وطن میں نیا جوش پیدا کر دیتی ھے۔ احمد فطری طور پر لیڈر تھا وہ بڑا دلیر تھا اور دوسروں سے حکم منوا سکتا تھا۔ وہ افراد اور قبیلوں سے نپٹنے کا فن خوب جانتا تھا۔ وہ جنگ کا مرد میدان ضرور تھا لیکن وہ فطرتاً رحمدل اور صلح پسند تھا اور جہاں بھی گنجائش ھوتی تھی صلح صفائی کر لیتا تھا۔ وہ ایسا بادشاہ تھا جس نے اپنے درانی اور غلجی مصاحبوں کے ساتھ باھمی ربط نہیں چھوڑا الفنسٹن کا کہنا ھے کہ قبائلی سرداروں کے ساتھ احمد شاہ کا رویہ مساویانہ تھا جیسا کہ بادشاھت کے قیام سے پہلے خوانین کا قاعدہ تھا۔ وہ خود بھی ولی تھا اور شعر کہتا تھا سب سے بڑی بات یہ ھے کہ وہ فارسی میں نہیں بلکہ پشتو میں شعر کہتا تھا۔ وہ بذات خود صالح کہلانا زیادہ پسند کرتا۔

تمام افغانوں میں شیر شاہ سب سے زیادہ نامور گزرا ہے اور اس نے موثر حکومت اور اقتدار کی بڑی شاندار مثال چھوڑی ہے لیکن وہ بھی انسان دوستی اور دوسروں کے دل میں گھر کرنے والی ان صفات سے محروم تھا جن کے لئے پہلا سدوزئی بادشاہ بجا طور پر مشہور ہے۔

احمد صرف پچاس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ عمر کے آخری حصہ میں وہ چہرے کی کسی بیماری میں جو غالباً سرطان تھا مبتلا ہو گیا۔ اس بیماری نے اسے بڑی تکلیف پہنچائی۔ وہ اچکزئی ٹوبہ کی پہاڑیوں میں مرغہ کے مقام پر فوت ہوا جہاں وہ قندھار کی گرمی سے پناہ لینے گیا تھا۔ اس کا مزار قندھار میں ہے اور آج بھی اسے مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔

احمد کے بعد اس کا لاڈلا بیٹا تیمور شاہ تخت پر بیٹھا جو اس کا سب سے بڑا بیٹا نہیں تھا اور مزاج کے اعتبار سے اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ بعد میں آنے والے بڑے بڑے درانیوں کی طرح تیمور شاہ بھی پشتو زبان سے نابلد تھا۔ وہ ۱۷۴۶ء میں ایران کے شہر مشہد میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کی زندگی میں زیادہ عرصہ پنجاب میں رہا۔ اس کی بہت سی بیویوں میں ایک مغل شہزادی بھی شامل تھی اور بعد میں وہ ھرات کا گورنر بن گیا جہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ فارس اور فارسی کے ساتھ اس قریبی تعلق کی وجہ سے وہ اپنے زمانہ کے اعتبار سے ذوق لطیف کا مالک بن گیا۔ اسے تمام فنون لطیفہ خاص طور پر محلات کی آرائش اور باغات لگانے سے گہرا شغف تھا۔ وہ درانی سرداروں کے اکھڑ پن کو ناپسند کرتا تھا چنانچہ اس نے اپنے مصاحبوں میں ایرانی منشیوں اور وقائع نگاروں کو خاص طور پر شامل کیا۔ اس نے برائے نام خوانین کے وہ منصب برقرار رکھے جو اس کے والد نے عطا کئے تھے لیکن نئے عہدے قائم کر کے اور انہیں زیادہ اہمیت دے کر اس نے نظم و نسق کے لئے دوہرے افسر مقرر کر دئے اور اپنے تنخواہ داروں کو بااختیار بنا دیا۔ اس نے قبائلی فوج کو منتشر کر دیا اور اپنے لئے قزلباشوں کا محافظ دستہ قائم رکھا جو غلام شاہ کہلاتا تھا۔ اس دستہ کی وفاداری کی وجہ سے تیمور شاہ کی جان سلامت رہی اور دارالحکومت میں امن و امان قائم رہا لیکن دور دراز کے صوبے اس وفاداری سے آزاد ہو گئے جو احمد شاہ کو پیش کی گئی تھی اور سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگے۔ باپ کی عظمت نے جو شان و شوکت

پیدا کر دی تھی وہ بیٹے کی بیس سالہ سلطنت کے بعد بھی باقی رہی لیکن تیمور کے زمانہ میں جو زوال شروع ہوگیا تھا وہ ۱۷۹۳ء میں اس کی وفات سے تھوڑے ہی عرصہ بعد منظر عام پر آگیا۔

تیمور کا خاندان بہت بڑا تھا۔ اس کی متعدد بیویوں کے بطن سے تیئس (۲۳) بیٹے اور بے شمار بیٹیاں تھیں۔ وہ اپنے باپ کی اس پالیسی پر قائم تھا کہ مختلف قبائل کی بیٹیوں سے شادی کر کے ان قبائل کو اپنا وفادار بنا لیا جائے۔ اس قسم کی شادیوں کے مطالعہ سے قبائلی ہمدردی اور جذبہ کا ایک پہلو سمجھ میں آجاتا ہے ان شہزادوں کو جو ایک ہی ماں کے بطن سے ہیں اور دوسرے شہزادوں کو جو دوسری ماؤں کی اولاد ہیں الگ الگ نگاہ میں رکھئے۔ یہ ایک قطعی اصول ہے کہ مشرقی ممالک کے شاہی خاندانوں میں سوتیلے بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ اس کا سبب محض یہ نہیں ہے کہ ان کی ماؤں کا آپس کا حسد انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتا ہے۔ بلکہ عام طور پر کم عمر بیویوں کے بیٹے حکمران باپ کی آنکھ کا تارا بن جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بغاوت کی صورت میں ایک ماں کے تمام بیٹے ایک ہی طرف ہوتے ہیں۔ ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔ قبائلی شادی کی بدولت قبائل کسی حکمران کے اس قدر وفادار نہیں بن جاتے جس قدر تیمور توقع رکھتا تھا البتہ اس شادی کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوتی ہے ماں کا قبیلہ اس کے ساتھ بڑی وفاداری کرتا ہے خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ اسی قبیلہ کی کسی عورت نے اس بچہ کو دودھ پلایا ہو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

تیمور کے بہت سے بیٹوں میں سے سب سے بڑا بیٹا ہمایوں پوپلزئی کے شاہی خاندان سدوزئی سے تعلق رکھنے والی ماں کے بطن سے تھا۔ اپنی پیدائش اور خاندان کی بدولت اسے باپ کا جانشین ہونا چاہئے تھا لیکن جب احمد شاہ فوت ہوا تو ہمایوں قندھار میں تھا جہاں اسے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت بھیج دیا گیا تھا۔ ایک اور بیٹا محمود جس کی ماں پوپلزئی قبیلہ کی کسی اور شاخ سے تعلق رکھتی تھی ہرات میں تھا۔ ان دونوں سے چھوٹا عباس تھا جس کی ننھیال کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ وہ پشاور میں موجود تھا لیکن وہ پست حوصلہ تھا اور اس کا کوئی

اثر و رسوخ نہیں تھا۔ اس کے بعد زمان اور شجاع کا نمبر تھا جو ایک ہی ماں کی اولاد تھے۔ یہ عورت یوسف زئی قبیلہ کی تھی اور احمد شاہ کی چہیتی ملکہ تھی۔ تیمور کی وفات کے بعد جو بادشاہ گردی کا دور آیا اور جس میں پشاور کے کئی قبائل نے شاہ شجاع کو پناہ دینے کی پیشکش کی اسے ان ہی حقائق کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔

تیمور کو اپنی یوسف زئی ملکہ سے جو تعلق خاطر تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغلیہ دور کی طرح درانیوں کے زمانہ میں بھی یوسف زئی قبیلہ کو قابل فخر مقام حاصل تھا۔ اس طرح تیمور کا یہ ترجیحی سلوک سیاسی توجیہ سے مبرا نہیں تھا۔ ریورٹی نے اصل کتابوں کا حوالہ دیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دریائے سندھ کے مشرق میں چچھ کے علاقہ کی چند بستیوں کو چھوڑ کر یوسف زئی قبیلہ کا اصل اور بڑا حصہ درانی حکومت کے اقتدار سے بالکل آزاد تھا۔ ان پر شاہی فوج کے لئے سپاہی مہیا کرنے کی کوئی پابندی عائد نہیں تھی اور وہ اپنے سرداروں کے سوا کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے تھے۔ سمہ میں بسنے والے مندڑ قبیلوں کے متعلق ریورٹی نے لکھا ہے کہ وہ بھی تیمور کو ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے البتہ جنگ کے زمانہ میں بادشاہ علماء کی ایک جماعت کو ان کا جذبۂ حب الوطنی بیدار کرنے کے لئے بھیج دیتا تھا جو انہیں یہ ترغیب دیتے تھے کہ وہ شاہی فوج کے لئے تھوڑے بہت سپاہی مہیا کر دیں۔ یوسف زئی اور مندڑ قبائل نے متعدد بار تیمور کے بیٹوں زمان اور شجاع کے کمزور موقف کی حمایت کی ان دونوں کی ماں یوسف زئی تھی اس لئے یہ قبائل ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔

احمد کا دارالحکومت قندھار تھا۔ اس نے متعدد مہمات کے دوران گاہے گاہے موسم گرما میں کابل کو بھی دارالحکومت بنایا تھا لیکن اسے آرام سے وقت گزارنے کی کبھی فرصت نہیں ملی۔ پشاور سے وہ محض اس حیثیت سے واقف تھا کہ اس نے پنجاب پر حملوں کی ابتدا یہیں سے کی اور یہاں اسے قبائلی وفاداریوں اور وعدہ خلافیوں کے نازک مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب احمد موسم گرما میں کسی سرد مقام کی ضرورت محسوس کرتا تھا تو وہ قندھار اور کوئٹہ کے درمیان ٹوبہ کی پہاڑیوں میں منتقل ہو جاتا تھا جہاں وہ اپنے دن اکھڑ اچک زئی قبائل کے ساتھ گزارتا تھا۔

یہ قبائل بھی درانی تھے لیکن غریب تھے۔ البتہ بادشاہ ان سیدھے سادے لوگوں کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔

تیمور نے یہ تمام طریقے بدل دئے۔ وہ بابر کی طرح موسم گرما میں کابل اور موسم بہار میں پھولوں سے لدے ہوئے پشاور کا دلدادہ تھا۔ اس نے ان ہی دو مقامات کو موسم گرما اور سرما کا صدر مقام بنا رکھا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر افغانوں کی عادت ہے وہ بھی موسم کے ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہو جاتا تھا۔ اس نے دونوں شہروں میں محل بنوائے۔ کابل میں بنوائے ہوئے محل پہلی افغان جنگ تک اپنی جگہ قائم تھے۔ ہمیں اس زمانہ کی جو آبی اور چھپی ہوئی تصویریں ملی ہیں (۱) ان میں یہ محلات خاص طور پر دکھائے گئے ہیں۔ ان عمارتوں میں مسلم طرز تعمیر کی شاندار روایات کو سیدھے سادے طریقہ سے منقش لکڑی کے کام کے ذریعہ برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بدقسمتی سے ان عمارتوں کی جگہ ملے جلے طرز کی عمارتیں بنا دی گئی ہیں جن میں پرانے طرز تعمیر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا اور نیا طرز تعمیر بھی پوری طرح سمویا نہیں جا سکا۔ تیمور نے پشاور کے بالا حصار کے اندر اور سامنے جو خوبصورت محل اور باغات بنوائے تھے انہیں سکھوں نے ۱۸۲۳ء میں تباہ کر دیا۔ یہ وہی محل ہے جس میں شاہ شجاع نے شان و شوکت کے ساتھ ۱۸۰۹ء میں مانسٹوارٹ الفنسٹن کی خاطر مدارات کی تھی۔ ۱۸۳۲ء میں الیگزینڈر برنس جب یہاں پہنچا تو یہ محل کھنڈر بن چکا تھا۔ سکھوں نے باغات تک کو ویران کر دیا اور درخت کاٹ کر لکڑیاں جلالیں۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں پہلے ان کھنڈروں اور ویرانوں کی پھر مرمت کی گئی ہے اور پشاور ایک بار پھر خوابوں کا شہر بن گیا ہے اب اس شہر کے گرد پھر ویسے باغات اور دلکش مناظر پائے جاتے ہیں جیسے اس وقت پائے جا۔ تھے جب ایک صدی پہلے یہ شہر یوروپی باشندوں کی آنکھوں میں کھب گیا تھا۔

---

(۱) ان میں سے کچھ اصل تصویریں لفٹننٹ ایٹکنس نے بنائی تھیں اور کبھی یہ تصویریں انڈیا آفس میں آویزاں تھیں اب یہ تصویریں دولت مشترکہ اور وزارت خارجہ کے دفتروں میں آویزاں ہیں۔ ان تصویروں کی نقلیں بھی شائع کی گئی ہیں جو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں آویزاں ہیں۔

پشاور کی سوسائٹی میں سدوزئی شہزادوں کی یاد آج بھی تازہ ہے اور سدوزئی نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ جب بادشاہ‌گردی کا پہلا دور شروع ہوا تو بہت سے سدوزئی معززین نے جلاوطنی میں تیمور کے بیٹوں کا ساتھ دیا لیکن یہ یاد خود تیمور کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے بیٹے شاہ شجاع کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ یاد خاص طور پر یوسف زئیوں اور افریدیوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ اس کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ شجاع کی والدہ ان ھی قبیلوں میں سے تھی اور دوسرا سبب یہ ہے کہ شجاع نے ان قبیلوں سے پناہ طلب کی اسے پناہ دے دی گئی اور اس نے ایک مہمان کی حیثیت سے قبائل کے دل میں بڑی عزت حاصل کی۔ تیمور نے مہمند ملک ارسلا خان کو جس نے اعتبار پر اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالہ کردیا تھا اس کے دشمنوں کے سپرد کر کے تمام افغان روایات کو پامال کردیا تھا۔ تیمور نے اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا کہ ارسلا خان اپنی مرضی سے اس کے پاس چلا آیا ہے اور اسے اسی کے قبیلہ کے ان لوگوں کے سپرد کر دیا جو اس کی جان کے دشمن تھے چنانچہ اسے فوراً قتل کر دیا گیا (۱)۔ ایک پٹھان کے نزدیک تیمور کی یہ حرکت ذلت کی بدترین مثال تھی۔ اور اس واقعہ کی وجہ سے تیمور کو اب تک برائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ارسلا خان نے بغاوت کی تھی لیکن اس واقعہ سے بغاوت کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بادشاہ کا حکم مہمند قبائلی علاقہ پر اس سے زیادہ نہیں چلتا تھا جتنا کہ پہلے دنوں تک چلتا تھا۔ کسی باغی کی گرفتاری کے لئے دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ باغی ہتھیار ڈالتا تو اس شرط پر کہ اسے ستایا نہیں جائے گا۔ ایسی صورت میں جرمانہ قبائلی روایات کے مطابق طے کیا جاتا اور سزائے موت کا سوال ھی پیدا نہ ھوتا۔ یہی حرکت کچھ کم مذموم نہیں تھی کہ امان کا وعدہ بالائے طاق رکھ کر ارسلا خان کو قتل کر دیا گیا لیکن ایک بادشاہ کی یہ حرکت کہ اس نے اپنے سر سے ذمہ داری ٹالنے کی نیت سے قبائلی دشمنی کی آڑ لے کر ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا انتہائی ذلت آمیز تھی۔ یہ منطق کہ اس ذلت میں ارسلا خان کے دشمنوں کا بھی ھاتھ تھا ایک پٹھان کے ذھن میں نہیں بیٹھ سکتی۔

(۱) ریورٹی نے لکھا ہے کہ ارسلا کو ایک ھاتھی کے اگلے پاؤں سے باندھ دیا گیا اور ھاتھی نے اسے کچل کر مار دیا۔ لیکن مہمندوں کا بیان اس سے مختلف ہے۔

تیمور شاہ پشاور سے کابل جاتے ہوئے ۱۷۹۳ء کے موسم بہار میں فوت ہو گیا۔ اسے پشاور سے محبت تھی لیکن یہاں اس کا نام عزت سے نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ قبائلی آج بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ پٹھان نہیں بلکہ فارسی وان تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے پشاور کو درانیوں کا موسم سرما کا صدر مقام بنا کر ایک طویل داستان کی ابتدا کی تھی جو اب ختم ہو رہی ہے۔ آج کل افغانوں میں اپنے مرکز کی طرف مراجعت کا جو رجحان پایا جاتا ہے اس کی بنیاد وہ تاریخ ہے جو اس عہد سے شروع ہوئی۔

تیمور کی وفات کے بعد اس کی چہیتی یوسف زئی بیوی کا بیٹا زمان مرزا شاہ زمان کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

فصل ہفت دہم

سدوزئی اور ماؤنٹ سٹوارٹ الفنسٹن

احمد اور تیمور کے عہد میں گورو گووند کے پیرو پنجاب میں زور پکڑتے جارہے تھے۔

جب ۱۷۹۳ء میں تیمور فوت ہوا تو صورت حال یہ تھی کہ پنجاب پر سرحد کے مقام تک برائے نام درانی بادشاہی کی بالادستی قائم تھی اور لاہور اس صوبہ کا دارالحکومت تھا۔ لیکن درحقیقت کابل کے بادشاہ کا حکم دریائے سندھ کے مشرق میں نہیں چلتا تھا۔ لاہور اور راولپنڈی سکھوں کے قبضہ میں تھے اور سرحدی علاقہ کے خالصہ سردار جن کا لیڈر رنجیت سنگھ کا باپ موہا سنگھ تھا درہ مارگلہ اور حسن ابدال تک چھائے ہوئے تھے۔ قلعہ روہتاس کے شاندار برجوں کے نیچے ایک چشمہ کے کنارے سکھوں کے ایک دھرم شالہ کی موجودگی آج بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اس زمانہ میں کوہستان نمک کے علاقہ میں خالصہ طاقت کتنی بڑھ گئی تھی۔ اس وقت تک دریائے سندھ کے مغرب میں سکھوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پشاور اور ڈیرہ جات افغان علاقے ہونے کی وجہ سے درانیوں کے زیر نگیں تھے۔ ہرو ندی کے کنارے کی زرخیز زمین میں لوٹ مار کرنے کے لئے طرفین سے چھوٹے موٹے حملے اور جوابی حملے ہوتے رہتے تھے۔ رنجیت سنگھ جو اس وقت تیرہ سال کا لڑکا تھا ان جھڑپوں میں حصہ لے چکا تھا۔

جب شاہ زمان کابل کے تخت پر بیٹھا تو اس کے درباریوں نے یک زبان ہو کر اسے یہی مشورہ دیا کہ نام پیدا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پنجاب پر حملہ کرے۔

انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ محمود بت شکن کے عہد سے جہاد کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں احمد شاہ نے سچا جانباز ہونے کا ثبوت دیا لیکن گورودوارہ امرتسر سے جس نئی بت پرستی نے سر ابھارا ہے اس کی بدولت احمد شاہ کے کارناموں پر پانی پھر جانے کا اندیشہ ہے انہوں نے یہ نہیں سوچا اور وہ یہ جانتے بھی نہ تھے کہ اسلام کا سکھ مذہب پر کتنا بڑا احسان ہے۔ اس نئے مذہب میں توحید کتنی گہرائی تک سرایت کر چکی ہے اور اس کی رہنمائی کے لئے ایک مقدس کتاب موجود ہے۔ مرہٹوں کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان والیان ریاست نے جن میں اودھ کے نواب وزیر آصف الدولہ پیش پیش تھے نئے درانی بادشاہ پر زور دیا کہ وقت آگیا ہے کہ وہ انہیں نجات دلائے اور اس دور میں اسلام کی خدمت بجا لائے۔

شاہ زمان یہ تمام باتیں غور سے سنتا رہا۔ لیکن احمد شاہ کے بعد وادی سندھ کے علاقہ میں صورت حال بدل چکی تھی اور کسی وقفہ کے بغیر طویل جنگوں کے سوا کسی اور طریقہ سے کامیابی ممکن نہیں رہی تھی۔ زمان اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکا کہ نادر شاہ دھلی کا تمام خزانہ لوٹ چکا ہے اور لاهور میں اور اس کے آس پاس جو اکھٹی کی ہوئی دولت موجود تھی وہ پنجاب پر زمان کے دادا احمد شاہ کے آٹھ حملوں کے دوران بالکل لٹ چکی ہے۔ حملہ کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا وہ یہ کہ پنجاب کی طاقت ختم کی جائے اور اس پر قبضہ برقرار رکھا جائے لیکن یہ مقصد جلد بازی کے ساتھ اکا دکا حملہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ احمد شاہ کے زمانہ میں سکھوں کا یہ وطیرہ تھا کہ جب شاہی فوج پنجاب پر حملہ کرتی تھی تو سکھ منتشر ہو جاتے تھے اور فوج کے واپس ہوتے ہی پھر اپنی جگہ آجاتے تھے۔ احمد شاہ کے پوتے کے مقابلے پر بھی سکھ یہی حربہ استعمال کرنے والے تھے۔ زمان شاہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ سکھوں کی اس چال کو اس طرح ناکام بنایا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں اتنی فوج رکھی جائے جو اس علاقہ پر قابض رہ سکے۔ اس پالیسی پر کامیابی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سدوزئی بادشاہ مضبوط ارادہ سے کام لے کر بابر کی طرح اپنا دارالحکومت اور دربار کابل سے منتقل کر کے لاهور لے آتا۔

ایسی دور رس پالیسی سوچنا زمان شاہ جیسے آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اسے تو صرف یہی نظر آیا کہ روھتاس پر سکھوں کا زرد پرچم لہرا رہا ہے اور وہ حسن ابدال (۱) کے مقدس نام کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ چنانچہ بے بنیاد امیدیں باندھ کر زمان شاہ نے ۱۷۹۵ء میں دریائے سندھ عبور کیا۔

پہلے حملہ میں زمان شاہ نے اس پر اکتفا کیا کہ اس نے حسن ابدال پہنچ کر وہاں سکھوں کے مقدس مقامات کو تباہ کر دیا اور روھتاس کا برائے نام قبضہ حاصل کرنے کے لئے ایک دستہ کو آگے بھیج دیا۔ اسے فوراً کابل واپس آنا پڑا کیونکہ ھرات میں اس کے سوتیلے بھائی محمود نے اس کے خلاف بغاوت پھیلا دی تھی۔ اس نے دوسری مرتبہ ۱۷۹۷ء میں اور تیسری مرتبہ ۱۷۹۸ء میں پنجاب پر حملے کئے اور دونوں مرتبہ قصور (۲) کے خویشگی سردار نظام الدین خان کی مدد سے لاھور پر اپنا سکہ بٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ زمان شاہ نے سکھ سرداروں سے جن میں رنجیت سنگھ بھی شامل تھا جو ان جھگڑوں سے الگ رہا نپٹنے کے لئے نظام الدین کی خدمات حاصل کی تھیں۔ نظام الدین نے جسے سکھوں پر دباؤ ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا بجا طور پر یہ اندازہ لگا لیا کہ احمد شاہ کے حملوں کی طرح اس کے پوتے زمان شاہ کے حملوں کا اثر بھی دیر پا نہیں ہو گا لہذا اس نے سوچا کہ اپنے ان ھمسایوں پر کیوں ظلم کیا جائے جو بعد میں اس سے بدلہ لے سکتے ہیں۔ اس کا جو نتیجہ نکلا کننگھم نے مندرجہ ذیل عبارت میں اسے بخوبی واضح کیا ہے۔

”شروع میں اکا دکا جھڑپیں ہوئیں لیکن محمود کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے جسے فارس کی حمایت حاصل ہو گئی تھی ایک بار پھر بد قسمت بادشاہ کو مغرب کی طرف مراجعت پر مجبور کر دیا اور وہ ۱۷۹۹ء کے آغاز میں لاھور روانہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے حملہ میں رنجیت سنگھ کی شخصیت

---

(۱) پہاڑی پر حسن ابدال کا مزار ہے اور پہاڑی کے نیچے سکھوں کا مشہور گوردوارہ پنجہ صاحب بنا ہوا ہے۔

(۲) پٹھانوں کی بستی خویشگی جو لاھور کے قریب واقع ہے بابر کے زمانہ میں بسائی گئی تھی۔

نہ صرف دوسرے سکھ لیڈروں بلکہ خود درانی بادشاہ پر بھی اثر انداز ہوئی۔ رنجیت کے لاہور پر دانت تھے کیونکہ اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ جس نے لاہور پر قبضہ کر لیا وہی بادشاہ بن گیا (۱)۔ زمان اپنا بھاری توپ خانہ دریائے جہلم کے پار نہیں لے جا سکتا تھا جس میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ اس نے موقع کے متلاشی سکھ سردار کو یہ بات جتا دی کہ توپیں دریا کے پار پہنچانا بہت بڑی خدمت تصور کیا جائیگا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ جتنی توپیں بھیج سکتا تھا اس نے بادشاہ کی روانگی کے بعد دریا کے پار پہنچا دیں اور اس کے عوض اپنے دل کی مراد پالی یعنی پنجاب کے صدر مقام کا حاکم بننے کے لئے شاہی فرمان حاصل کر لیا۔

رنجیت سنگھ نے اس موقع پر طاقت اور عیاری کا جو مظاہرہ کیا اس کی زندگی میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ کابل کا فرماں روا اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے لاہور میں اپنا وائسرائے بنا دیا۔ اس کے بعد پنجاب کی بیشتر تاریخ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے گرد گھومتی ہے۔ رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھ نہ صرف دریائے سندھ کی گزرگاہ پر قابض ہو گئے بلکہ انہوں نے وسطی ایشیا اور ستلج کے پار مسلم ریاستوں کے درمیان آمدو رفت اور رسد کے ذرائع بھی مسدود کر دئے۔ ۹۹-۱۷۹۸ء میں زمان شاہ کے اس آخری اور ناکام حملہ کے ساتھ تقریباً آٹھ سو سال کی ایک تاریخ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طویل عرصہ میں ہندوستان کے مسلمان فرماں روا کوہ سلیمان کے پار اپنے اجداد کے وطن سے فوج بھرتی کر کے اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھے سکھوں کی ریاست قائم ہو جانے سے ایک دیوار حائل ہو گئی جس نے اس بات کا امکان ختم کر دیا کہ کوئی نیا حکمراں خاندان شمالی علاقہ سے طاقت حاصل کر کے دھلی یا لاھور کی اجڑی ہوئی سلطنتوں کے کھنڈروں پر ایک نئی سلطنت قائم کر لے۔

پنجاب میں شاہ زمان کی ناکامی کا یہ نتیجہ نکلا کہ چند سال بعد خود اس کے اپنے وطن میں درانیوں کی سدوزئی شاخ کا زوال آگیا اور

---

(۱) ۱۹۵۵ء میں جب مغربی پاکستان کی ایک وحدت بنائی گئی تو لامحالہ لاھور ھی کو اس کا صدر مقام بنایا گیا۔

افغان شہنشاہیت ختم ہو گئی اس کے بعد بادشاہ گردی کا جو دور شروع ہوا وسطی ایشیا کی تاریخ میں بھی اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس افراتفری سے افغان سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ بعد میں جو طوائف الملوکی برپا ہوئی اگر اس موقع پر اسے مختصر طور پر بیان کر دیا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ تفصیلات بعد میں مناسب موقع پر بیان کی جائیں گی۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ خود سدوزئی بادشاہ ایک بڑی حد تک طاقتور بارک زئی سرداروں کے ہاتھ میں مہرے بن گئے۔ یہ سردار بادشاہ گر بن بیٹھے اور انہوں نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔

پنجاب سے شاہ زمان کی واپسی کے قریباً ایک سال بعد اس کے سوتیلے بھائی محمود نے اسے تخت سے اتار دیا اور اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ برادران یوسف جیسا سلوک کرنے کے بعد جو افغانوں کا نہیں بلکہ ترکوں کا شیوہ رہا ہے محمود چین سے حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ محمود پہلی بار صرف تین سال تک تخت پر قابض رہا۔ ۱۸۰۳ء میں اسے کابل میں زمان کے سگے بھائی شجاع کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ شاہ شجاع نے جو ایک یوسف زئی ماں کے بطن سے تھا برسراقتدار آنے والے دوسرے بادشاہوں کی طرح نہ اپنے بھائیوں کی آنکھیں نکلوائیں نہ کسی اور ذلت آمیز طریقہ سے انتقام لیا بلکہ پہلے تو محمود کو بالاحصار میں قید کر دیا اور پھر اسے جلاوطن کر کے مغرب کی طرف بھیج دیا۔ محمود ہرات اور آس پاس کے علاقوں کا حاکم بن بٹھا یہاں تک کہ چھ سال بعد ۱۸۰۹ء میں اس نے شاہ زمان کی طرح شاہ شجاع کو تخت سے اتار دیا اور دوبارہ کابل کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ وہ کابل میں ۱۸۱۸ء تک خدا کی مخلوق پر ظلم ڈھاتا رہا ۱۸۱۸ء میں اپنے اذیت پسند اور پاگل بیٹے کامران کے کہنے پر اس نے اپنے بارک زئی وزیر فتح خان کو جس نے اسے دو مرتبہ تخت دلوایا تھا ایسی سخت اذیتیں دے کر ہلاک کیا کہ آج بھی ان کے تذکرہ سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بارک زئیوں میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے فتح خان کے اکیس (۱) بھائیوں کی قیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ بھائی جو قبیلہ کی محمد زئی شاخ سے تعلق رکھتے تھے بعد میں پائندہ خیل کے نام سے

---

(۱) امیر عبدالرحمان نے اپنے سوانح حیات میں بیس بھائیوں کے نام درج کئے ہیں۔ وہ سہواً اپنے جد امجد کے دو عظیم المرتبت بھائیوں کے نام نظرانداز کرگئے ہیں۔

درانیوں کے حکمراں خاندان

پہلا خاندان ۔ سدوزئی پوپل زئی

محمد زمان خان

- احمد شاہ ۱۷۴۷-۷۳
  - تیمور شاہ ۱۷۷۳-۹۳ (۲۶ بیٹے)
    - دوسری بیوی
      - شاہ محمود ۱۸۰۰-۳، ۱۸۰۹-۱۸
        - کامران مرزا
    - پہلی بیوی
      - شاہ زمان ۱۷۹۳-۱۸۰۰
      - شاہ شجاع ۱۸۰۳-۰۹، ۱۸۳۹-۴۲
        - تیمور مرزا
- ذوالفقار

دوسرا خاندان - محمد زئی بارک زئی

- حاجی جمال خان
  - پائندہ خان (۲۲ بیٹے)
    - فتح خان وزیر ۱۸۱۸ میں فوت ہوا
    - محمد اعظم خان ۱۸۲۳ میں فوت ہوا
    - سلطان محمد خان (پشاوری سردار جو نیچے تیسرے خاندان کی ذیل میں درج ہیں)
    - دوست محمد خان (کابل سردار ۱۸۲۶-۶۳)
      - اکبر ۱۸۴۷ میں فوت ہوا۔
      - افضل ۱۸۶۵-۶۷
        - عبدالرحمان ۱۸۸۱-۱۹۰۱
          - حبیب اللہ
            - عنایت اللہ ۱۹۲۹ (صرف ۵ دن)
            - امان اللہ ۱۹۱۹-۲۸
          - نصر اللہ
      - اعظم ۱۸۶۷-۶۹
      - شیر علی ۱۸۶۳-۶۵، ۱۸۶۹-۷۸
        - ایوب خان
        - یعقوب خان ۱۸۷۸-۱۸۷۹
    - کوہان دل، شیر دل وغیرہ (قندھار کے سردار)

تیسرا خاندان - محمد زئی بارک زئی

- سلطان محمد خان (۵۰ بیٹے)
  - یحییٰ خان
    - یوسف خان
      - نادر شاہ ۱۹۲۹-۳۳
        - ظاہر شاہ ۱۹۳۳
      - محمد عزیز
        - داؤد خان
        - نعیم خان
      - ہاشم خان
      - شاہ محمود خان
      - شاہ ولی خان

مشہور ہوئے۔ محمود کو ایک بار پھر ہرات میں پناہ لینی پڑی جہاں وہ اور اس کا بیٹا کامران اپنے ڈگمگاتے ہوئے اقتدار کو ۱۸۴۲ء تک قائم کئے رہے۔ بعد میں انہیں پشاور تو کیا کابل یا قندھار جانا بھی نصیب نہیں ہوا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ مختصر سے عرصہ میں چار حکمراں بدلے یعنی زمان کی جگہ محمود، محمود کی جگہ شجاع، شجاع کی جگہ پھر محمود اور آخر میں سدوزئی خاندان کی جگہ بارک زئی خاندان برسراقتدار آگیا۔ درانی شہنشاہیت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ آمارت قائم ہوگئی۔ انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں حکومت کی ان چار تبدیلیوں کا گہرا اثر ہی تھا جس سے دوسرے اسباب کے مقابلہ پر سب سے زیادہ رنجیت سنگھ کو اس بات کا موقع مل گیا کہ اس نے رفتہ رفتہ کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے درمیان میدانی علاقہ میں احمد شاہ کی سلطنت کے تمام حصوں پر قبضہ کر لیا۔

حاجی جمال نے جن کا نام تمام بارک زئی شجروں میں سرفہرست آتا ہے نادر کے خلاف ابدالیوں کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ الفنسٹن نے ۱۸۰۹ء میں یعنی سدوزئیوں کی جگہ بارک زئیوں کے برسراقتدار آنے سے چند سال پہلے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی بنیاد پر وہ لکھتے ہیں کہ پوپلزئی (جس کی ایک چھوٹی شاخ شاہی خاندان سدوزئی ہے) کے مقابلہ میں بارک زئی بہت بڑا خیل ہے اور تمام افغان قبیلوں میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''بارک زئی جوشیلا اور جنگجو قبیلہ ہے اور اب جبکہ فتح خان ان کا سردار بن گیا ہے وہ افغان قبائل میں ممتاز حیثیت کے مالک بن گئے ہیں۔ آج کل وزیر اعظم اور تمام اعلیٰ حاکم بارک زئی ہیں اور انہیں یہ مرتبہ اپنے قبیلہ کی جوانمردی اور وفاداری کی بدولت حاصل ہوا ہے''

درانیوں کی قبائلی تنظیم کی تفصیل، افغان حکمرانوں سے اس کا رشتہ اور بادشاہ گر کی حیثیت سے اس کی طاقت اس کتاب کے نفس مضمون سے تعلق نہیں رکھتی (۱)۔ ان نکات پر سیر حاصل بحث اسی وقت کی جاسکتی

(۱) اس کا ابتدائی پس منظر الفنسٹن نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

ہے جب افغان مملکت کا جائزہ مقصود ہو۔ سرحدی قبائل پر یہ نکات بالواسطہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں آنے والے سدوزئیوں کی طرح بارک زئی سردار خاص طور پر ان کی ایک مخصوص شاخ کا پشاور سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور انہیں یہ شہر بڑا عزیز ہے۔ یہ تعلق خاطر آج تک قائم ہے۔ اس لئے اس مرحلہ پر بارک زئی قبیلہ کی سربرآوردہ شخصیتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ پشاور اور آس پاس کے علاقوں سے براہ راست درانیوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد بھی قبائل کے ذہن پر ان سرداروں کا گہرا اثر قائم رہا۔

حاجی جمال کے بیٹے پائندہ خان کو بارک زئی قبیلہ کا سردار تسلیم کر لیا گیا تھا اور تیمور نے اسے سرفراز کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ الفنسٹن اور بعض دوسرے مورخ غلطی سے اس کا نام سرفراز خان بھی لکھتے ہیں۔ یہ وہی پائندہ خان ہے جس کے مفاد کی تیمور شاہ کی یوسف زئی ملکہ نے حفاظت کی تھی تاکہ شاہ زمان کو تخت پر بٹھایا جا سکے۔ بعد میں زمان وفادار نامی ایک اور سدوزئی کی باتوں میں آگیا جسے خود اس نے بلند مرتبہ پر پہنچایا تھا۔ وہ احمد شاہ کی تاجپوشی کا واقعہ بھول گیا اس نے پائندہ خان اور دوسرے بارک زئی سرداروں کو ذلیل کیا اور اپنے گرد خوشامدیوں کو جمع کر لیا۔ پائندہ نے بیزار ہوکر اس جماعت کو اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دی جو اس بات کے درپے تھی کہ زمان کو تخت سے اتار دیا جائے اس کے وزیر وفادار سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور زمان کے بھائی شجاع کو تخت پر بٹھایا جائے۔ درحقیقت پائندہ کسی خفیہ سازش میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس نے محض زمان کی حرکتوں پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

پائندہ کی گرفتاری کے لئے ایک افسر بھیجا گیا۔ جب یہ افسر پائندہ کے مکان پر پہنچا تو سب سے پہلے اس سے پائندہ کے سب سے بڑے لڑکے فتح خان نے ملاقات کی اس نے اس موقع پر ان ہی اعلیٰ خدمات کا مظاہرہ کیا جن کی وجہ سے وہ بعد میں مشہور ہوا اور کسی قسم کا خوف یا شبہ ظاہر نہیں کیا بلکہ اس بات پر معذرت طلب کی کہ اس کا باپ موجود نہیں ہے اور کہا کہ میں اپنے باپ کو بلا کر لاتا ہوں۔ اس نے باپ کو جا کر بتایا کہ اسے گرفتار کرنے کے لئے گارد آئی ہے۔ اس نے اپنی

تیز قوت فیصلہ سے کام لیتے ہوۓ جس کا اس نے بعد میں بار بار مظاہرہ کیا یہ تجویز پیش کی کہ افسر کو ہلاک کر دیا جائے اس کے محافظوں کو گرفتار کر لیا جائے اور قندھار سے راہ فرار اختیار کی جائے۔ لیکن پائندہ خان نے ایک نہ سنی وہ سب سے طاقتور خیل کے سردار کی حیثیت سے بڑا مغرور تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ افسر کی ہمراہی میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو گیا۔ اگلے روز اسے اور سازش کرنے والے دوسرے تمام اشخاص کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔

باپ کے مرنے پر فتح خان نے فرار ہو کر گرشک کے مقام پر اپنے خاندانی قلعہ میں پناہ لے لی۔ اس نے قلعہ میں بیٹھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ بارک زئی علاقہ کے لوگوں کی نیت کیا ہے اور جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر اس نے حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک جرأت مندانہ کوشش کا فیصلہ کیا۔ محمود ہرات میں تھا اور گزشتہ پانچ سال سے اس بات کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ کابل کے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے فارس کے حکمران قاچار خاندان سے مدد حاصل کرے۔ اسے فتح خان نے مشورہ دیا کہ وہ ٹوٹی ہوئی لاٹھی کا سہارا نہ لے بلکہ قندھار پر چڑھائی کرے اور یہ اطمینان رکھے کہ درانی اس کا ساتھ دیں گے۔

محمود ہرات سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ بہ مشکل پچاس سوار تھے لیکن فتح خان نے قبائل کے احساسات کا غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ بارک زئی محمود کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور اس نے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ شروع میں محاصرہ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا لیکن فتح خان نے جان پر کھیل کر دروازہ کھولنے کی تدبیر نکال لی۔ وہ ایک رات تن تنہا شہر میں داخل ہوا اور ننناواتے کی رسم پوری کرتے ہوئے اپنے آپ کو قلعہ کے کماندار عبداللہ خان کے حوالہ کر دیا اور کہا کہ میری عزت آپ کی عزت ہے۔ عبداللہ خان درانی قبیلہ کی نور زئی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ پشتو کامیاب رہی عبداللہ نے محمود کی حمایت کا اعلان کر دیا اور شہر اس کے حوالہ کر دیا۔

اس اثنا میں زمان پشاور میں ہندوستان پر ایک اور حملہ کی تیاری میں سرگرمی کے ساتھ مصروف تھا۔ قندھار کا انجام معلوم ہونے پر اس

کے ہوش ٹھکانے آئے اس نے اپنے بھائی شجاع کو بہت بڑی فوج کا کماندار بنا کر پشاور میں چھوڑا اور خود یہ سوچ کر کابل روانہ ہوا کہ وہ اس بار بھی اپنے سوتیلے بھائی کو آسانی سے تخت سے اتار دے گا جیسا کہ وہ پہلے اتار چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس پر حقیقت حال روشن ہوئی۔ اب تک وہ فاتح پنجاب کی حیثیت سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہے لیکن اب اچانک وہ سراسیمہ ہو گیا۔ آخرکار وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ ایک افغان حکمراں طاقتور افغان قبیلوں کی حمایت کے سہارے ہی حکومت کر سکتا ہے۔ اسے درانیوں پر بھروسہ نہیں تھا لہٰذا اس نے غلجیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن دوستی کا ہاتھ بے بسی کے عالم میں بڑھایا گیا تھا اسے قبول نہیں کیا گیا۔ بادشاہ کے اوسان خطا ہو گئے اور اس کی سراسیمگی لوگوں میں بھی پھیل گئی۔ زمان اپنی قسمت آزمانے کے لئے جو فوج لے کر آیا تھا وہ محمود سے جا ملی۔ فتح خان کی ایک اور چال نے هراول دستہ کے کماندار احمد خان کو زمان سے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ فتح خان نے احمد کے بھائی عبداللہ کو گرفتار کر لیا۔ یہ وہی عبداللہ ہے جس نے قندھار محمود کے حوالہ کیا تھا۔ اور دھمکی دی کہ احمد خان محمود سے آ کر نہ ملا تو عبداللہ کو قتل کر دیا جائیگا۔ عبداللہ نے مصیبت کے وقت محمود کا ساتھ دیا تھا اور اس کی وفاداری شک و شبہ سے بالا تر تھی۔ لیکن فتح خان جانتا تھا کہ احمد کو اپنے بھائی سے کتنا گہرا تعلق خاطر ہے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس کے لئے جو ذرائع کام میں لائے جارہے ہیں وہ درست ہیں یا نہیں۔

شاہ زمان فرار ہو کر اپنے بھائی سے جا ملنے کے لئے پشاور روانہ ہو گیا اور خیبر سے مغرب کی طرف ایک منزل کے فاصلہ پر شنواری علاقہ میں ملاعاشق کے قلعہ میں پہنچ گیا۔ ملاعاشق زمان کا تنخواہ دار رہ چکا تھا۔ اس نے زمان کی بڑی خاطر مدارات کی لیکن اسے آگے جانے نہیں دیا اور ایک قاصد محمود کے پاس روانہ کر دیا۔ جب زمان نے یہ محسوس کیا کہ اس کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائید ہیں تو اس نے ملاعاشق کو یہ ترغیب دلانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنے اس مہمان کو جو اس کا بادشاہ اور مربی رہ چکا ہے دشمنوں کے حوالہ کرنے کی مذموم حرکت نہ کرے جب باتوں سے کام نہ چلا تو اس نے طاقت سے کام لیا لیکن یہ کوشش

بھی ناکام ہوئی۔ اس کے بعد زمان نے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ کابل واپس جا رہا تھا کہ راستے میں اسے محمود کے گماشتے ملے جنھوں نے نشتر سے اس کی آنکھیں پھوڑ دیں۔ پھر اسے کابل لے جا کر بالاحصار میں قید کر دیا گیا۔

چھ سال بعد الفنسٹن نے راولپنڈی میں زمان سے ملاقات کی۔ جب تک اس کا حقیقی بھائی حکمراں رہا اسے قید سے رہائی ملی رہی لیکن جب شجاع کو بھی محمود کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تو زمان بھی دوبارہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ محمود کو ایک بار وہی بادشاہ گر فتح خان برسراقتدار لے آیا تھا۔ مناسب ہے کہ اس موقع پر اس ملاقات کا بیان نقل کیا جائے۔

”ہمیں اس بادشاہ کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا جس کا شہرہ ایک زمانہ میں پورے فارس اور ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ ہم اس کے حضور میں باادب کھڑے رہے یہاں تک کہ اس نے ہمیں بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ اس کا لباس سادہ لیکن حلیہ شاہانہ تھا۔ اس کا چہرہ اور شخصیت بڑی جاذب نظر تھی اس کی آواز اور انداز شاہ شجاع سے بہت مشابہ تھے لیکن اس کا قد زیادہ لمبا اور چہرہ نسبتاً لمبوترا اور خدو خال زیادہ واضح تھے اس کی داڑھی بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ کسی طرح نابینا معلوم نہیں ہوتا تھا اس کی آنکھوں میں زخموں کے نشان ضرور تھے لیکن ان میں اتنی سیاھی ضرور برقرار تھی جس سے اس کا چہرہ پروقار معلوم ہوتا تھا وہ جس سے بات کرتا تھا اپنی آنکھیں اسی پرگاڑ دیتا تھا۔ البتہ اس کے چہرے پر ایک عجیب اداسی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ... وہ کہنے لگا کہ بادشاہوں پر مصائب آتے ھی رہتے ہیں اور اس نے انقلابات کے تاریخی واقعات بیان کئے۔ ... اگر وہ ایشیا کی پوری تاریخ چھان مارتا تب بھی اسے قسمت پلٹنے کی اپنے سے زیادہ کوئی اور واضح مثال نہ ملتی۔ اس کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں تخت سے اتار دیا گیا اور جلاوطن کر کے اس ملک میں بھیج دیا گیا جہاں وہ دو مرتبہ حکومت کر چکا تھا۔“

بدقسمت زمان اور اس کے بھائی شجاع کی یاد بہت سے مشرقی افغانوں اور پہاڑی قبائل خاص طور پر افریدیوں کے دلوں میں آج بھی تازہ ہے۔ یوسف زئی انہیں عزت سے یاد کرتے ہیں کیونکہ ان کی ماں اسی قبیلہ سے تھی اور زمان اور شجاع کے متعلق عام طور پر یہ خیال ہے کہ پٹھان کے ذہن میں ایک بادشاہ کا جو معیار ہے دونوں اس پر پورے اترتے تھے۔ جنہوں نے ان کی عزت کی وہ بھی بھلے دنوں میں ان کے ساتھ عزت سے پیش آئے اور جب قسمت نے ساتھ چھوڑا تو انہوں نے صبر سے کام لیا۔ اچک زئی درانی ملک گلستان خان جس کے نام پر خوجہ عمران (۱) کی تلہٹی میں گلستان نامی گاؤں آباد ہے زمان اور شجاع کی حمایت میں لڑتے لڑتے مارا گیا۔ گلستان کارکردگی جوانمردی اور وفاداری میں مشہور تھا اور پشاور میں جہاں وہ ایک زمانہ میں شاہ شجاع کا گورنر تھا آج بھی اس کی یاد باقی ہے۔ افریدیوں نے برے دنوں میں شاہ شجاع کو چورہ کے مقام پر کئی مرتبہ پناہ دی اور دو مرتبہ پورا قبیلہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ جدو جہد ناکام رہی لیکن سدوزئی بادشاہوں کی اس یاد نے افریدیوں میں اس وقت جذبہ وفاداری پیدا کیا جب تقریباً ایک صدی بعد پورا قبیلہ نواب سر اسلم خان سدوزئی کے اشارہ پر چلنے کو تیار ہو گیا جنہوں نے خیبر رائفلز کی بنیاد ڈالی تھی۔

محمود پہلی مرتبہ صرف تین سال تک حکمران رہا۔ اس کی حکومت اتنے عرصہ محض فتح خان کی جوانمردی کے بل بوتے پر قائم رہی۔ فتح خان نے نہ صرف گھمسان کی تین لڑائیوں میں پورے غلجی قبیلہ کی بغاوت کو کچل دیا بلکہ شجاع نے اپنا کھویا ہوا تخت حاصل کرنے کے لئے پشاور کی طرف سے جو پیش قدمی کی اسے بھی ناکام بنا دیا۔ شجاع دس ہزار مشرقی قبائل کا لشکر لے کر جس میں بیشتر یوسف زئی اور افریدی تھے ۱۸۰۱ء میں پشاور سے روانہ ہوا۔ جلال آباد سے مغرب میں چند میل کے فاصلہ پر سرخ رود کے مقام پر فتح خان سے اس کا مقابلہ ہوا۔ لڑائی کے آغاز میں شجاع کی فوج کی فتح ہوئی۔ اس کی ہر دورانی فوج بڑی بے جگری کے ساتھ لڑی۔ اس کے سپاھی قبائلی جنگ لڑنا خوب جانتے تھے لیکن بڑے پیمانہ پر لڑائی کے نظم و ضبط سے ناواقف تھے۔ جوں ھی انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ انہیں فتح حاصل ہوگئی ہے وہ شاھی

---

(۱) پہاڑوں کا وہ سلسلہ جو کوئٹہ پشین کی سطح مرتفع کو قندھار سے جدا کرتا ہے۔

خزانہ لوٹنے کے ارادے سے اپنی اپنی صفیں چھوڑ بھاگے۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر فتح خان نے بارک زئی قبائل کی مدد سے ازسرنو حملہ کر دیا اور میدان جیت لیا۔ شجاع افریدی علاقہ میں فرار ہو گیا جہاں اس نے چورہ کے مقام پر پناہ لی۔

ایک سال بعد شجاع بارہ ہزار افریدیوں کو لے کر پھر میدان میں اترا۔ اس نے پشاور پر حملہ کیا جس پر سرخ رود کی لڑائی کے بعد محمود کا قبضہ ہو گیا تھا۔ پشاور پر یہ حملہ موسم گرما میں ہوا تھا خیبر کے قبائل کو شکست ہوئی ان کے بہت سے آدمی جنگ میں مارے گئے اور بہت سے اپنے پہاڑی مسکنوں تک پہنچنے سے پہلے پیاس اور گرمی کی شدت سے ہلاک ہو گئے۔ شجاع کی قسمت اچھی تھی کہ وہ واپس چورہ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چورہ سے تیراہ کے میدان میں چلا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں جب سرخ پوش تحریک کا بڑا زور تھا افریدیوں نے موسم گرما میں دو مرتبہ پشاور شہر پر حملہ کیا اور دونوں مرتبہ بھاری جانی نقصان اٹھایا اور شکست کھائی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چند ماہ بعد جب مجھے ان واقعات کے متعلق بعض قبائلی ملکوں سے تبادلۂ خیالات کا اتفاق ہوا تو انہوں نے ان واقعات کا موازنہ افریدیوں کے اس حملہ سے کیا جو ایک صدی پہلے شاہ شجاع کی حمایت میں کیا گیا تھا۔ قبائل کے پاس ان واقعات کی کوئی قلم بند تاریخ نہیں تھی لیکن یہ واقعات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے آئے تھے۔

افریدیوں کی اس شکست کے بعد فتح خان خود پشاور آیا اس نے شہریوں اور آس پاس کے قبائل پر بھاری جرمانے عائد کئے اور جس راستہ سے بابر ۱۵۰۵ء میں اپنی پہلی مہم پر روانہ ہوا تھا اس راستہ سے کوہاٹ ہنگو، ٹل اور بنوں ہوتا ہوا دامان پہنچا۔ وہ راستہ میں جہاں سے بھی گزرا وہاں کی آبادی پر محصول لگایا۔ اس نے ٹل اور بنوں کے درمیان بسنے والے وزیر قبائل کو قابو میں لانے کی کوشش پر بڑا وقت صرف کیا لیکن اپنے پیش رو اور بعد میں آنے والے حکمرانوں کی طرح وہ بھی اس کوشش میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے نظم و نسق کے میدان میں کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑا۔ اسے پشاور کے علاقہ میں اس باغ کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے جو اس نے ۱۸۰۲-۳ء میں شہر کے جنوب میں لگوایا

اور جو وزیر باغ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ باغ سرو کی گھنی قطاروں اور جنگ اور میلہ کے موقع پر قبائل کے اجتماع کے لئے بڑا مشہور ہوا۔ فتح خان کا چھوٹا سوتیلا بھائی سلطان محمد خان جب تک پشاور کا حاکم رہا اسی باغ میں اپنے بیوی بچوں سمیت مقیم رہا۔

فتح خان کی غیر موجودگی میں کوئی محمود کو صحیح مشورہ دینے والا نہ رہا۔ وہ دارالحکومت میں غلام شاہ قزلباش محافظوں پر پورا بھروسہ کرتا تھا جو تند مزاج فوجی ہونے کے علاوہ اپنی پوری قوم کی طرح عیاش بھی تھے اور کھلم کھلا شیعہ ہونے کا دم بھرتے تھے۔ کابل کی سنی آبادی کی نظروں میں ان کی یہ حرکت گناہ کبیرہ تھی۔ اپنے محافظوں پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے لوگوں کو یہ الزام لگانے کا موقع مل گیا کہ محمود اپنے عقیدہ سے برگشتہ ہو گیا۔ یہ الزام تراشنے میں ایک درانی سردار مختار الدولہ کا بڑا ہاتھ تھا جس نے ایک سازش تیار کی اور شجاع کو تخت پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ عقلمندی کا تقاضا یہ تھا کہ بادشاہ فتح خان کی واپسی کا انتظار کرتا جو قندھار سے روانہ ہو چکا تھا لیکن اس نے وقت کے تقاضے کو نہ سمجھتے ہوئے یہ سوچا کہ میری عافیت اسی میں ہے کہ مختار کو کسی تاخیر کے بغیر گرفتار کر لیا جائے۔ مختارالدولہ بچ نکلا اور شجاع سے جاملا۔

شجاع ۱۸۰۲ء میں چورہ سے رخصت ہو گیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ پشاور میں فتح خان جیسے طاقتور دشمن کی موجودگی کی وجہ سے وہ افریدی پہاڑیوں میں پناہ لے کر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ وہ ژوب کے راستہ شل (کوئٹہ) پہنچا جہاں ملک گلستان اور دوسرے سرداروں کی مدد سے اس نے ایک بہت بڑے کارواں کے سالار سے بھاری رقم قرض لے کر اپنی مالی حالت درست کر لی۔ (شجاع کی یہ بات قابل ستائش ہے کہ اس نے بادشاہ بننے کے بعد قرضہ کی رقم واپس کر دی)۔ مختار سے اس کی ملاقات وزیر علاقہ کی سرحد پر ہوئی وہاں سے وہ کابل پہنچا جہاں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور محمود بالاحصار میں محصور تھا۔ شجاع اور مختار نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے شہر سے باہر پڑاؤ ڈالا اور فتح خان کے مقابلہ کے لئے جو دس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر کابل کے قریب پہنچ چکا تھا اپنی فوج صف بستہ کر لی۔ شروع میں فتح خان کو کامیابی ہوئی لیکن لوگ

محمود سے بہت بیزار تھے چنانچہ بہت سے سپاہی فوج چھوڑ کر بھاگ گئے اور بارک زئیوں کی جو قسمت ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی تھی اس موقع پر ساتھ چھوڑ گئی۔

اگلے دن شاہ شجاع تخت پر بیٹھ گیا۔ محمود کو جس کا سب نے ساتھ چھوڑ دیا تھا قید میں ڈال دیا گیا لیکن اس کی آنکھیں نہیں نکالی گئیں۔ نئے بادشاہ نے سب سے پہلے اپنے بھائی زمان کو رہا کرایا جس کی آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔ نئے بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کے بعد صرف ایک شخص کو قتل کیا گیا اور وہ ملا عاشق تھا جسے اپنے سابق بادشاہ کے ساتھ غداری کرنے کی سزا ملی۔ شجاع نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جس فیاضی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اس کی وجہ سے درانی حکمرانوں کے تذکرہ میں اس بادشاہ کی شہرت بہت بڑھ گئی لیکن وہ اپنے خاندان کے نام پر لگا ہوا دھبہ نہیں مٹا سکا۔ اس خاندان کے دوسرے حکمرانوں نے ایسے مظالم ڈھائے تھے کہ انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شاہ شجاع کو صرف چھ سال تک حکومت کرنا نصیب ہوا۔ اس کے بعد اسی سوتیلے بھائی نے جسے شجاع نے تخت سے اتارا تھا اور جس نے ایک بار پھر فتح خان بارک زئی کو اپنے معاملات کا مختار بنا دیا تھا شجاع کو اس کی سلطنت سے نکال دیا۔ شجاع کا دور حکومت ختم ہی ہوا تھا جب ۱۸۰۹ء کے موسم بہار میں ماونٹ سٹوارٹ الفنسٹن جسے سلطنت کابل میں سفیر مقرر کیا گیا تھا پشاور پہنچا اور ایک انگریز (۱) مدبر اور عالم نے پہلی مرتبہ نہ صرف درانی شہزادہ بلکہ دریائے سندھ کے پار بسنے والے قبائل سے رابطہ قائم کیا۔ جن دنوں الفنسٹن یہاں آئے اس وقت تک دریائے سندھ کے مغرب میں سکھوں کے اقتدار کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ زمان کی معزولی سے ۱۸۰۹ء تک دس سال کے درمیانی عرصہ میں درانی سلطنت اور سکھ مہاراجہ کی فوجوں میں براہ راست کوئی تصادم نہیں ہوا تھا۔ رنجیت سنگھ پنجاب میں اپنے قدم جمانے میں مصروف تھا۔ ۱۸۰۹ء کے موسم گرما میں جب الفنسٹن پشاور سے ہندوستان

---

(۱) الفنسٹن اسکاٹلینڈ کے ایک بیرن (نواب) خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس زمانہ کے دوسرے اسکاٹلینڈ کے باشندوں کی طرح انہوں نے بھی انگلستان کے متعلق انگریزی ہی میں کتابیں لکھی ہیں۔

واپس آرہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سکھ ریاست کی حدیں حسن ابدال اور راولپنڈی کے درمیان غالباً درہ مارگلہ میں واقع ہیں۔ الفنسٹن نے لکھا ہے ''پورا پنجاب رنجیت سنگھ کے زیر نگین ہے جو ۱۸۰۵ء تک بہت سے سکھ سرداروں میں سے ایک تھا لیکن جس نے ہماری اس علاقہ میں آمد تک پنجاب میں تمام سکھ سرداروں پر بالا دستی حاصل کر لی تھی اور بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا... اس نے جس طاقت اور عیاری سے کام لے کر اپنے فرقہ کے سرداروں کو زیر کیا اب وہ اپنے کمزور ہمسایوں پر قابو پانے کے لئے بھی ان ہی سے کام لے رہا ہے''۔

رنجیت سنگھ نے زمان سے اپنی حاکمیت کا فرمان حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نااہل بھنگی مثل سرداروں سے لاہور اور امرت سر چھین لیا۔ اس نے یہ کامیابی کونیہ اور اہلوالیہ مثلوں کی مدد سے حاصل کی جو امرت سر اور گورداسپور پر قابض تھے حالانکہ بھنگیوں کو قصور کے پٹھان حاکم نظام الدین خان کی حمایت حاصل تھی۔ ملتان کی طرف پیش قدمی اور کوہستان نمک کا علاقہ فتح کرنے کے بعد اس نے اس بات کا قطعی فیصلہ کیا کہ قصور کی نئی بستی کو جو خویشگی پٹھانوں کا مضبوط گڑھ تھا اور جس کا حاکم ان دنوں قطب الدین تھا ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ بستی اس کے دارالحکومت سے اس قدر نزدیک ہے کہ اسے باج گزار علاقہ کی حیثیت سے باقی رکھنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ ۱۸۰۷ء میں ایک ماہ تک محاصرہ کے بعد قطب الدین نے ہتھیار ڈال دئے اور اسے گزارہ کے لئے ستلج کے جنوب میں تھوڑی سی زمین دے دی گئی جہاں اس نے جلال آباد نامی نیا قصبہ بسا لیا اور ممدوٹ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کامیابی کے بعد رنجیت نے ملتان کے قلعہ بند شہر پر چڑھائی کر دی لیکن اس موقع پر شہر فتح نہ ہو سکا۔ اس کی کوششیں ناکام ہوئیں اور وہ بھاری رقم لے کر واپس آ گیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس پر برطانوی حکومت جو دہلی پر قابض ہو چکی تھی اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ نپولین کا ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان کو بھی جنگ کی لپیٹ میں لے لیا جائے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ دونوں کے پاس ایلچی بھیجے جائیں جو دفاعی تنظیم کے لئے فریقین کو آمادہ کر سکیں۔



عزت مآب مونٹسٹوارٹ الفنسٹن

الفنسٹن کو افغان دربار میں ایلچی بنا کر بھیجا گیا۔ وہ یہ سوچ کر کہ قندھار میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری ہے بہاولپور اور ملتان کے راستہ روانہ ہوا۔ دسمبر ۱۸۰۸ء کے آخیر میں خبر ملی کہ شاہ شجاع کابل روانہ ہو چکا ہے چنانچہ الفنسٹن نے شمال کا رخ کیا اور دریائے سندھ پار کر لیا۔ اس نے دریائے سندھ کے متعلق لکھا ہے ''دریائے سندھ اپنے نام کی طرح عظیم ہے اور ہندوستان کی سرحد کی حیثیت سے اور اپنی وسعت کی وجہ سے اور ان پہاڑیوں کی بدولت جو پس منظر میں دکھائی دیتی ہیں دریائے سندھ بڑا دلچسپ ہے''۔ الفنسٹن جنوری ۱۸۰۹ء میں ڈیرہ اسماعیل خان پہنچا۔ وہاں اسے اطلاع ملی کہ شاہ شجاع اسے پشاور میں شرف ملاقات بخشے گا جو ان دنوں موسم سرما کا صدر مقام تھا۔ بادشاہ نے ایلچی کو حفاظت سے لانے کے لئے اپنے ایک درباری ملا جعفر کو متعین کیا تھا جس کی رہنمائی میں انگریزوں کی جماعت پہاڑپور کے راستہ پنیالہ روانہ ہوئی۔

پنیالہ لودیوں کی بلوٹ شاخ کا وطن ہے جس کے سردار اپنی سادہ اور روایتی مہمان نوازی میں مشہور ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سید بتاتے ہیں۔ الفنسٹن نے اس نخلستان کا تذکرہ بڑی خوبی سے کیا ہے جو ان کا وطن ہے۔

> ''ہمارا خیمہ پنیالہ گاؤں کے نزدیک ایک خوبصورت اور دلکش مقام پر لگایا گیا تھا۔ ایسا مقام عرب کے کسی نخلستان ہی میں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک ریتلی وادی تھی جس کے دونوں طرف پتھریلی گھاٹیاں واقع تھیں اور جسے ایک چھوٹا سا چشمہ سیراب کرتا تھا۔ جا بجا کھجور کے درختوں کے جھنڈ اور مکئی کے ہرے ہرے کھیت نظر آتے تھے۔ خود پنیالہ گاؤں کھجوروں کے ایک گھنے باغ میں ایک پہاڑی کے کنارے واقع تھا جس سے بہت سے چشمے پھوٹتے تھے جو گھنے جنگلوں میں زمین کے اندر ہی اندر بہ کر آتے تھے''۔

اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد یہ جماعت کالا باغ پہنچی جس کا بڑے اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے ''یہاں کی زمین خون کی طرح سرخ ہے ساتھ ہی ساتھ نمک کی عجیب اور خوبصورت چٹانیں نظر آتی ہیں اور دریائے سندھ جو بہت گہرا اور صاف شفاف ہے بلند و بالا

پہاڑیوں سے اتر کر اس عظیم‌الشان قصبہ کے پاس سے گزرتا ہے۔ پھر وہ آگے بڑھے اور بھنگی خیل کی اونچی نیچی پہاڑیوں سے گزرے اور انہوں نے ان پہاڑیوں کی چوٹی سے پہلی مرتبہ سفید کوہ کی برف پوش خوبصورتی دیکھی۔ انہیں پہاڑیوں کے پیچھے دریائے سندھ بھی دکھایا گیا ہے جو اس مقام پر چھوٹا سا چشمہ معلوم ہوتا ہے۔ وہاں سے یہ لوگ ڈوڈہ اور کوہاٹ گئے۔ کوہاٹ کو دیکھ کر یہ لوگ بہت ہی محظوظ ہوئے اور بہت سے انگریزوں کی طرح جو اس علاقہ میں پہلے پہل آتے ہیں انگریز ایلچی کو بھی خواہ مخواہ یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ پہلے بھی یہاں آیا ہے۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا گویا وہ اپنے وطن واپس آگیا ہے۔

ماہ فروری میں کوہاٹ کے آس پاس کی پہاڑیاں بڑی خوبصورت تھیں اور مختلف مناظر پیش کر رہی تھیں۔ جو پہاڑیاں شہر سے دور تھیں وہ برف پوش تھیں۔ میدان سرسبز اور سیراب تھا اور ہر طرف درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ تھے۔ آب و ہوا بڑی لطیف تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں ہر خطہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوہاٹ میں سیب اور آم ساتھ ساتھ پکتے ہیں۔ اس شمالی حصہ میں کوہاٹ واحد علاقہ ہے جہاں آم پیدا ہوتا ہے۔ شہر نہایت صاف ستھرا تھا اور ایک مصنوعی ٹیلہ پر چھوٹا سا قلعہ بنا ہوا تھا پاس ہی ایک صاف شفاف چشمہ کی تین دھاریں بہتی تھیں۔ جن لوگوں کو کوہاٹ سے محبت ہے وہ جنگل خیل چشموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہاں انہیں ایک باغ نظر آیا جس کی سیر سے وہ بہت ہی محظوظ ہوئے۔ شاید اس باغ کی دلکشی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ اس میں بہت سے انگریزی پودے تھے جن کے نظارہ سے یہ جماعت ہندوستان کی آب و ہوا میں رہتے ہوئے محروم ہو گئی تھی۔

باغ میں پیچ دار چشمے بہ رہے تھے اور اس کی باڑھ کروندوں اور جنگلی بیروں کی تھی۔ باغ کے اندر آڑو اور ناخ کے درختوں پر پھول لدے ہوئے تھے۔ بید مجنوں اور سفیدہ کی نئی کونپلیں پھوٹنی شروع ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ سیب اور دوسرے درخت تھے جو پت جھڑ کی وجہ سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ باغ میں انگور کی بہت سی بیلیں جو خودرو معلوم ہوتی تھیں درختوں کے گرد پیچ کھائے ہوئے تھیں۔ روشوں پر سبزہ کے تختے لگائے گئے تھے جو انگریزی معلوم ہوتے تھے کیونکہ نئے

سال کی بھر پور تازگی کے ساتھ کچھ مرجھائی ہوئی گھاس بھی نظر آرہی تھی۔ باغ میں شفتل، چک ویڈ، پلانٹین، رب گراس، ڈنڈیلین کامن ڈاک اور دوسرے بہت سے انگریزی پودے موجود تھے۔ ان دنوں درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے اور نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جس سے اس جماعت کی نظر میں باغ کی خوبصورتی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اور بڑھ گئی تھی۔

یہاں ایک پرندہ نظر آیا جو یورپ کی سنہری چڑیا سے مشابہ تھا۔ اتنا ھی بڑا ایک اور پرندہ نظر آیا جس کے پر بہت خوبصورت تھے۔ اس کے سر اور بازوؤں کے پر سیاہ اور باقی پر تیز ارغوانی تھے۔ (انہیں سرخ دھنیر نظر آگئی تھی جو عام طور پر کوھاٹ کے باغوں میں نظر آتی ھے)۔ کچھ لوگوں کو یہ بھی خیال گزرا کہ انہوں نے یوروپ کے خوش الحان پرند تھرش اور بلیک برڈ دیکھے ھیں اور ان کی آواز سنی ھے۔ اس باغ میں مشہور درخت بید مشک بھی تھا۔ الفنسٹن یہ دیکھ کر بہت محظوظ ھوا کہ بید مشک دراصل ایک قسم کا بید ھے جس پر خوشبودار زرد پھول کھلتے ھیں جن پر شہد کی مکھیاں عاشق ھوتی ھیں اور یہ درخت انگلستان میں پام کہلاتا ھے۔

اب اس چشمہ کے کنارے ڈپٹی کمشنر کی گنبددار کوٹھی واقع ھے جو کیویگناری نے اطالوی نمونے پر بنوائی تھی۔ اس کے ساتھ ایک باغ ھے جو الفنسٹن کے شاعرانہ بیان پر پورا اترتا ھے۔ موسم بہار میں اس باغ میں بنفشہ اس کثرت سے پھولتی ھے کہ اس کی یاد بڑے دنوں تک تازہ رھتی ھے۔

کوھاٹ سے تین میل شمال میں یہ جماعت ایک 'زبردست پہاڑی' کے دامن میں پہنچی۔ مشرق میں چڑھائی شروع ھونے تک پرانی سڑک صرف ڈیڑھ میل لمبی تھی۔ اب جو سڑک شروع ھوئی وہ بہت ھی ڈھلوان تھی اور بڑی بڑی چٹانوں کے اوپر سے گزرتی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی پر کچھ بنگش سردار ایلچی کی جماعت سے آملے۔ انہوں نے کھلی جگہ میں دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کی دعوت دی دسترخوان پر روٹیاں اور بھنے ھوئے مرغ رکھ دئے گئے۔ سب حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور بڑے دوستانہ ماحول میں ھاتوں سے کھانا کھایا۔ یہ وہ جگہ ھے جس سے صوبہ سرحد کا ھر باشندہ اچھی طرح واقف ھے۔ یہ ایک اونچا ٹیلہ ھے جس کے اوپر ایک

قلعہ بنا ہوا ہے۔ اس کے جنوب میں پچاس میل تک خٹک پہاڑیاں دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں اور بنوں کا میدان واقع ہے اور شمال میں قبائلی رائفلیں بنانے والے آدم خیل افریدیوں کی خشک اور تنگ وادیاں ہیں اب اس جگہ کندہ کئے ہوئے پتھر کی یادگار نصب ہے کانسٹیبلری کے ایک مشہور کمانڈر ہینڈی سائڈ کے نام پر بنائی گئی ہے۔ وہ ایک بہادر آدمی تھا جسے کانسٹیبلری کے سپاہی اور وہ قبائلی لٹیرے جن کا وہ پیچھا کیا کرتا تھا اور جن کے ہاتھوں اس کی موت واقع ہوئی یکساں طور پر عزت سے یاد کرتے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد بستی خیل وادی میں جو خیبر کے لٹیرے قبیلہ کی ملکیت ہے اترائی شروع ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں مولی ایلس کو کوہاٹ سے اغوا کر کے اسی وادی کے راستہ لے جایا گیا تھا۔ الفنسٹن کے زمانہ میں قبائل نے درہ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی اور درہ(۱) سے بحفاظت گزرنے کے لئے طاقتور محافظ دستہ کی ضرورت تھی۔ الفنسٹن اور اس کے ساتھیوں کو راستہ میں بہت سے مشہور لٹیرے نظر آئے لیکن ان کے سامان کی حفاظت کا سخت بندوبست تھا۔ انہوں نے اگلی رات زرغن خیل میں گزاری جہاں اب رائفل سازی کے کارخانے واقع ہیں۔ اس سفر میں پہاڑیاں اتنی اونچی اور وادیاں اتنی تنگ تھیں کہ سروے کرنے والے پیمائش کے لئے نصف النہار کے وقت بھی سورج کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

آخر کار یہ جماعت درہ کے شمالی دہانہ پر پہنچ گئی جہاں سے برف پوش پہاڑوں کا طویل سلسلہ نظر آنے لگا اور ہندو کش کی پہاڑیاں نظر آنے لگیں جن کے نظارہ کا جواب نہیں۔ اس کے بعد یہ جماعت ۲۵ فروری ۱۸۰۹ء کو پشاور پہنچی۔ یہ تاریخ یاد رکھنے کی ہے کیونکہ اس سے ایک طویل رابطہ کا آغاز ہوا جو آج تک ختم نہیں ہوا۔
یہ ڈرامہ جتنا اہم تھا اس میں حصہ لینے والے بھی اتنے ہی اہم تھے۔

''وہ شخص بڑا ہی کندذہن ہوگا جو ماؤنسٹوارٹ الفنسٹن کے متعلق کوئی کتاب پڑھتے ہوئے یا اس کے متعلق لکھتے ہوئے اس شخصیت سے قلبی لگاؤ محسوس نہ کرے۔۔۔ اس نے جو کچھ

---

(۱) اگر صرف لفظ درہ استعمال کیا جائے تو اس سے درہ کوہاٹ مراد ہوتا ہے درۂ خیبر نہیں۔ درہ خیبر کے لئے صرف خیبر استعمال کیا جاتا ہے۔

لکھا ہے یا جو کچھ کہا ہے اس سے اور خود اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی ہے لیکن اس کے مزاج میں بے دلی نفرت یا خود پسندی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ اپنی دھن میں مست، خوش طبع اور راضی برضا ضرور تھا لیکن وہ کسی بھی معاملہ میں بچوں کی طرح گہری دلچسپی لے سکتا تھا،،۔

''کابل کا بادشاہ شاہ شجاع ایک وجیہہ انسان تھا . . اس کا چہرہ پُر وقار اور پسندیدہ تھا اور اس کا بات کرنے کا انداز شاہانہ تھا . . . اس بات پر مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی شاہانہ وقار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا،،۔

وہ افغانوں کے کردار کے متعلق لکھتا ہے:۔

''ان کی کمزوریوں میں انتقام، حسد لالچ، لوٹ مار، اور ہٹ دھرمی شامل ہے لیکن دوسری طرف وہ آزادی کے دلدادہ ہیں اپنے دوستوں کے وفادار ہیں اپنے اهل و عیال پر مہربان ہیں مہمان نواز جری، جفاکش کفایت شعار، سخت کوش اور دور اندیش ہیں۔ وہ اپنی ہمسایہ قوموں کی طرح جھوٹے، سازشی اور دغا باز نہیں ہیں،،۔

الفنسٹن اپنے محافظ ملا جعفر کے متعلق لکھتا ہے:۔

''وہ ایک سنجیدہ مزاج بزرگ ہے وہ ہوشیار اور سمجھدار ہے اور خوش طبع ہے لیکن صاف گو اور ایک حد تک جذباتی ہے،،۔

اب تک انگریزی میں جو سرکاری رپورٹیں لکھی گئی ہیں ان میں کابل کے متعلق الفنسٹن کی رپورٹ غالباً سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ رپورٹ الفنسٹن کے دورہ کابل سے پانچ سال بعد ۱۸۱۴ء میں مکمل ہوئی جب مصنف پونا میں تھا۔ اس کے باوجود آج بھی اس رپورٹ کو صوبہ سرحد کے حالات اور اطوار کے متعلق بہ یک وقت وسیع ترین اور ساتھ ہی ساتھ بڑی جامع و مانع اور ہمدردی کے ساتھ لکھی ہوئی تحریر سمجھا جاتا ہے۔ الفنسٹن نے ہر مقام کو صحیح طور پر بیان کیا ہے ہر قبیلہ کا تذکرہ

اس کی اہمیت کے مطابق کیا ہے اور جو کچھ بھی بیان کیا ہے صحیح اور دل آویز تناسب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ پہاڑوں اور میدانوں، ریت اور ہریالی اور آب و ہوا اور موسم کے تضاد کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جیسے اس سرزمین سے محبت رکھنے والا کوئی شخص محسوس کر سکتا ہے۔ بادشاہ ہو یا سردار، کاروباری ہو یا تاجر، مولوی ہو یا کسان اس کی نظر میں سب برابر کی توجہ کے مستحق ہیں۔ وہ ان کی کوتاہیوں پر بھی مسکراتا ہے اور ان پر محبت سے نظر ڈالتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے اس وقت ملا تھا جب لڑائیوں اور چڑھائیوں کی وجہ سے ان کے مزاج میں انگریزوں کی طرف سے تلخی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے وجدان سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ انگریزوں کا رابطہ قائم ہو کر رہے گا۔ اگر سرحدی علاقہ میں الفنسٹن کے بعد اسی جیسی شخصیت انگلستان کی نمائندگی کرتیں تو بعد میں جو کچھ ہاتھ سے نکل گیا وہ برقرار رہتا اور جو فتح حاصل ہوئی تھی وہ شکست میں نہ بدلتی۔ ماؤنسٹوارٹ الفنسٹن کی گہری انسان دوستی اور جبلّی معاملہ فہمی کے سامنے ایڈورز کی حق پسندی نکلسن کی عالی حوصلگی کویگناری کے مزاج کی بوقلمونی اور روس کیپل کی بھوری اور جذبات سے عاری آنکھیں سب ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

الفنسٹن نے دریائے سندھ کے پار چھ مہینہ سے بھی کم عرصہ گزارا (۷ جنوری تا ۲۰ جون) اس میں سے بھی چار مہینہ سے کم عرصہ (۲۵ فروری تا ۱۴ جون) پشاور میں گزارا۔ لیکن پھر بھی وہ اس علاقہ اور وہاں کے باشندوں کے متعلق اتنی وسیع معلومات حاصل کر کے واپس آیا جو کم صلاحیت رکھنے والے لوگ سرحد میں ساری عمر گزارنے کے باوجود بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ وہ پشاور سے آگے نہیں گیا لیکن اس نے اپنی طبع رسا اور تجسس کی بدولت پورے علاقہ کے بارے میں ایک متوازن تصویر ذہن نشین کر لی تھی۔ اس تصویر میں وادیوں اور باغات میں بسا ہوا کابل غلجیوں کا بالائی علاقہ، افریدی اور وزیر قبیلوں کے دور دور تک پھیلے ہوئے پیچ در پیچ پہاڑ، بلوچستان کے شمالی حصے اور (حالانکہ مجھے ان شہروں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں) اس زمانہ کے قندھار اور بلخ بھی شامل تھے۔ اس نے اپنے مشن کے متعلق خود کہا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا

اعلیٰ سرکاری عہدہ حاصل کرنے کا شوق ختم ہو گیا اور بعد میں اس نے بڑے سے بڑا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اسے گورنر جنرل بننے کے لئے ایک محقق اور مورخ کی زندگی کو خیر باد کہنا پڑتا۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ کہ انگریز قوم کے جس فرد نے پہلے پہل پٹھانوں سے رابطہ قائم کیا وہ ایسے نفیس بے لوث اور اچھے دماغ کا مالک تھا۔ اس نے کلکتہ میں قیام کے دوران سنسکرت اور فارسی کا مطالعہ کیا تھا لیکن اس کا دماغ ان زبانوں کی نزاکتوں میں نہیں الجھا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ عیسائی مبلغ پینسل کے اس بیان کا قائل تھا جس میں زندگی کے متعلق ایک طرف عیسائی اور مسلمان اور دوسری طرف ہندو کے نظریہ کا فرق ظاہر کیا گیا ہے۔ عیسائی اور مسلمان دونوں کا یہ عقیدہ ہے یا یوں کہئے کہ یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ کوئی انسان محض اپنے لئے نہ زندہ رہتا ہے نہ مرتا ہے۔ دوسری طرف اپنے آپ میں کھویا ہوا ہندو آواگون کے چکر سے نجات حاصل کرنے کی دھن میں لگا رہتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے گرد و پیش رہنے والے انسانوں کی طرف سے جن سے وہ کبھی بے تعلق نہیں ہو سکتا اس پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کسی قوم کو الفنسٹن سے بہتر غیر ملکی مفسر نہیں مل سکتا کیونکہ اس کی عمیق نظر تجزیہ کرتے وقت مفاہمت سے کام لیتی تھی اور کوتاہیوں کو انسانیت دوستی کے ساتھ پرکھتی تھی (۱)۔

ایشیا میں برطانوی راج کتنے عرصہ قائم رہے گا؟ اس کے متعلق الفنسٹن نے کہا تھا کہ جب لوگوں کا معیار اتنا بلند ہو جائے گا کہ غیر ملکی طاقت کے لئے ان پر راج کرنا ممکن نہ رہے تو برطانوی راج خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الفنسٹن شمالی علاقہ میں جن لوگوں سے ملا تھا وہ اس وقت تک انگریزوں کے محکوم نہیں تھے لیکن اس نے اس نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ان لوگوں کی صفات کا اندازہ ضرور لگا لیا تھا۔

---

(۱) سرحدی علاقہ کا ایک افسر جس کے باپ دادا ملتان کے درانی گورنر رہ چکے تھے الفنسٹن کی کتاب پڑھنے کے بعد ایک بار باتوں باتوں میں مجھ سے کہنے لگا کہ اس علاقہ اور یہاں کے لوگوں کے متعلق انگریزی کی کتاب جتنی پرانی ہو گی اتنی ہی دلچسپ، صحیح حالات پر مبنی اور عمدہ ہو گی۔

الفنسٹن پہلا انگریز تھا جس نے اس علاقہ کا جائزہ لیا اور آخری انگریز تھا جس نے درانی حکومت کو پشاور میں اس عہد میں برسراقتدار دیکھا جب اس حکومت پر پاس کے علاقہ میں رنجیت سنگھ کی موجودگی کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ لہذا آئیے ہم تھوڑا سا توقف کریں اور اس حسین منظر کو ایک بار جی بھر کر دیکھ لیں جسے بعد میں سکھوں کی یُورش نے تباہ کر دیا۔

الفنسٹن نے پشاور اور آس پاس کے علاقہ کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے وہی تصویر ابھرتی ہے جو آج بھی نظر آتی ہے۔ کسی اور سرکاری افسر یا زمانۂ حال کے سیاح نے اس علاقہ کا اس سے بہتر نقشہ پیش نہیں کیا۔ اپنے بعد میں آنے والوں کی طرح الفنسٹن بھی اس منظر سے بڑا متاثر ہوا کہ پشاور کا میدان ایک قریبی پہاڑی قلعہ سے گھرا ہوا ہے جو دور سے بڑا ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اس علاقہ کے شمال کی طرف ھندوکش کا سلسلہ اور مغرب کی طرف سفید کوہ کی چوٹی نمایاں ہیں۔ جس وقت الفنسٹن کی جماعت فروری میں اس علاقہ میں پہنچی تو ارد گرد کے اونچے پہاڑ برف سے ڈھک چکے تھے اور میدان پر گھنا سبزہ چھایا ہوا تھا انہیں یہاں کی آب و ہوا بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ بہت سے درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے لیکن کافی درخت اس وقت بھی برگ پوش تھے جس سے پورے منظر میں بوقلمونی پیدا ہو گئی تھی۔ آئندہ دس روز میں جب بے شمار باغات اور دور دور تک پھیلے ہوئے درخت نئی اور چمکدار پتیوں سے ڈھک گئے تو انگریزوں کے دل خوشی سے اچھلنے لگے کیونکہ انہوں نے ہندوستان میں جہاں بارہ مہینے گرمیوں کا موسم رھتا ہے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میدانی علاقہ میں بہت سے چشمے بہ رہے تھے جن کے کنارے بید اور پھول دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پورے علاقہ میں پھیلے ہوئے باغیچوں میں کثرت سے شفتالو، ناک، بہی اور انار کے درخت لگے ہوئے تھے جو پھولوں سے ایسے لدے ہوئے تھے کہ اس جماعت نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جہاں کھیت نہیں تھے وھاں سبزہ کا فرش بچھا ہوا تھا۔ انگلستان کے سوا یہ منظر کہیں اور بہ مشکل ہی دکھائی دیتا ہے۔ میدانی علاقہ کے بیشتر حصے میں خوب کھیتی باڑی ہو رہی تھی اور آبپاشی کے لئے بہت سے اعراب اور نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ الفنسٹن کی آمد سے بہت پہلے باڑہ نہر، جوئے شیخ

اور جوئے زرداد تعمیر ہو چکی تھیں۔ آج کی طرح اس زمانہ میں بھی گاؤں بڑے بڑے اور صاف ستھرے تھے۔ ہر گؤں کے آس پاس درخت لگے ہوئے تھے۔ چشموں اور نالوں پر مغلی اینٹوں کے چھوٹے اور خوبصورت پل بنے ہوئے تھے۔ بہت سے راستوں کے کنارے شہتوت کے درختوں کی دو رویہ قطاریں تھیں اور کہیں کہیں پیپل یا برگد کے شاندار درخت کھڑے ہوئے تھے۔ کھجور کے درخت صرف شہر کے شمال میں اُگے ہوئے تھے اس لئے کہ پشاور میں اتنی شدید سردی ہوتی ہے کہ کھجور پک نہیں سکتی۔ لیکن قبرستانوں میں بکثرت کھجور سے مشابہ تاڑ کے درخت لگے ہوئے تھے جو اپنے سرو جیسے پتوں کی وجہ سے بڑے اداس معلوم ہوتے ہیں۔

پشاور میں لکڑی اور کچی اینٹوں کے تین تین یا اس سے بھی زیادہ منزلوں کے مکان بنے ہوئے تھے۔ سڑکیں تنگ اور پختہ تھیں سڑکوں کا ڈھال اس طرح بنا ہوا تھا کہ پانی نالیوں میں بہ جاتا تھا۔ برسات میں ان سڑکوں پر بڑی پھسلن ہوتی تھی۔ دو تین نالے شہر کے اندر بہتے تھے اور ان کے کنارے بید اور شہتوت کے درختوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ بازاروں میں بڑی بھیڑ ہوتی تھی۔ مختلف قوموں کے لوگ طرح طرح کی بولی بولتے ہوئے طرح طرح کے لباس میں نظر آتے تھے اور طرح طرح کے چہرے دکھائی دیتے تھے۔ دکانیں اونچے مکانوں کی نچلی منزلوں میں تھیں وھاں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ میوے اور اخروٹ روٹی، گوشت، چپل، گھوڑوں کی زین اور ساز، کپڑوں کی گانٹھیں لوہے کا سامان، تانبے کے برتن، کتابیں، اور پوستینیں سب اپنی اپنی جگہ قرینے سے سجی ہوئی ہوتی تھیں۔ سب سے زیادہ خوبصورت دکانیں پھلوں کی ہوتی تھیں جہاں سیب سردا آلوچے اور نارنگی ہندوستانی پھلوں کے ساتھ رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد طعام خانوں کا نمبر تھا جہاں ہر چیز چینی کے مانند مٹی کے روغنی برتنوں میں پیش کی جاتی تھی۔

پھیری والے بھیڑ بھاڑ میں شور مچا مچا کر اپنا مال بیچتے نظر آتے تھے۔ اس بھیڑ میں شہر کے لوگ سفید عمامے باندھے نظر آتے تھے اہل فارس اور افغان ڈھیلی عبا اور سیاہ قراقلی ٹوپی پہنے ہوئے ہوتے تھے۔ خیبر کے قبائل چپل اور علاقہ کا لباس پہنے نظر آتے تھے اور ان کے انداز سے پہاڑی علاقہ کا اکھڑ پن جھلکتا تھا۔ ہندوؤں کے چہرے اپنی مخصوص

بناوٹ کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے تھے لیکن ان کا لباس اسی علاقہ کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔ ہزارہ قبائل اپنے چوڑے چہروں اور چھوٹی آنکھوں سے زیادہ داڑھی منڈانے کی وجہ سے ممتاز نظر آتے تھے کیونکہ باقی تمام شہریوں کے منہ پر ڈاڑھی ہوتی تھی۔ اس بھیڑ بھاڑ میں اکا دکا عورتیں بھی نظر آ جاتی تھیں جن کا سفید لمبا برقع ٹخنوں تک لٹکتا تھا اور بادشاہ کے کچھ نوکر چاکر گھومتے نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی مسلح سواروں کا دستہ بازار میں ٹاپوں کی گونج پیدا کرتا ہوا گزر جاتا تھا۔ ان کے گھوڑوں کے لگام کی جھنجھناہٹ ان کی آمد کی خبر دیتی تھی۔ کبھی کبھی جب بادشاہ کی سواری گزرتی تھی تو بازار میں شہسواروں اور پیادوں اور توپوں سے لدے ہوئے اونٹوں کی کثرت سے راستہ بند ہو جاتا تھا۔ سانڈنی سوار سرخ اور سبز پرچم اڑاتے ہوئے جاتے تھے۔ ان سانڈنیوں پر محافظ بیٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ہر وقت مال سے لدی ہوئی سانڈنیاں اور باختری اونٹ جن کے بال نیچے تک لٹکتے ہوتے تھے آہستہ آہستہ بازار سے گزرتے نظر آتے تھے۔ اور خچر جنھیں دن بھر کی محنت کے بعد آٹھ آٹھ دس دس کے حلقہ میں باندھ دیا جاتا تھا گرمی سے بے چین ہو کر گھونٹے کے گرد گھومتے نظر آتے تھے۔ ان کے مالک یا تو کھانے کے لئے طعام خانے چلے جاتے تھے یا بازار میں قلیان کا کش لگاتے رہتے تھے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں جب کسی فرنگی کا گزر ہوتا تھا تو کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا البتہ کوئی مسافر اسلام علیکم کہہ دیتا تھا اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر تعظیم بجا لاتا تھا یا پھر کوئی بھکاری صدا لگا دیتا تھا اور گزرنے والے کو یاد دلاتا تھا کہ دنیا فانی ہے یہاں کا دیا ہوا وہاں ساتھ جائیگا۔

شہر سے باہر بھی سڑکوں پر چہل پہل نظر آتی تھی۔ لوگ گھوڑوں پر سوار یا پیدل ٹولیاں بنا کر سفر کرتے نظر آتے تھے۔ ٹولی میں سے کوئی شخص اپنے ساتھیوں کا دل بہلانے کے لئے پختو گیت چھیڑ دیتا تھا۔ لوگ اپنے ہاتھ پر باز بٹھائے ہوئے اور ایڑی پر مہمیز لگائے نظر آتے تھے اور جگہ جگہ چڑی ماروں کی ٹولیاں گیہوں کے کھیتوں میں بٹیریں پکڑتی دکھائی دیتی تھیں۔ کھیت کے ایک سرے پر جال لگا دیا جاتا تھا۔ سامنے کے کنارے پر دو افراد ایک رسی کے سرے کو پکڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور رسی کو تانے ہوئے جال کی طرف بڑھتے تھے جس سے گیہوں کے پوری کھیت کو جھٹکتے تھے اور بٹیروں کو گھیر

کر جال کی طرف لے جاتے تھے۔ جوں ہی بٹیریں جال میں داخل ہوتی تھیں جال گرا دیا جاتا تھا۔

الفنسٹن آگے چل کر لکھتے ہیں ''اول تو یہ علاقہ ہی بڑا دلچسپ تھا اور ہمارے لئے نیا بھی تھا دوسرے اس کی دلچسپیاں اس لئے اور بڑھ گئی تھیں کہ ہم یہ توقع لگائے رکھتے تھے کہ ان عجیب و غریب لوگوں میں جو بڑے جوشیلے اور موجودہ تہذیب سے دور ہیں ہمیں کوئی نیا منظر دکھائی دیگا یا انوکھا واقعہ پیش آئے گا۔ چنانچہ ہماری صبح کی سیر بڑی فرحت بخش اور دلچسپ ہوتی تھی۔ شام کو بھی جب ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو ہماری سیر کم دلچسپ نہیں ہوتی تھی۔ ہم شہر کے آس پاس باغوں میں جا کر وہاں کے مناظر کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان باغات سے پرے چاروں طرف اداس لیکن شاندار پہاڑ نظر آتے تھے جو اکثر بادلوں یا طوفان کی لپیٹ میں ہوتے تھے جبکہ ہم میدان کی دھوپ اور سکون کا لطف لیتے تھے''۔

یہ تمام تاثرات اس سے بہتر کبھی بیان نہیں کئے گئے اور جو لوگ چشم بینا رکھتے ہیں ان کے لئے یہ تاثرات آج بھی موجود ہیں۔ لیکن الفنسٹن کے زمانہ میں بالاحصار اور اس کے اندر شاہی محل موجود تھا جسے ۱۸۲۳ء میں سکھوں نے مسمار کر دیا۔ بالاحصار سے نیچے کی طرف شمال میں شاہی باغ تھا اسے بھی سکھوں نے تباہ کر دیا اور ایک ایک درخت کاٹ پھینکا۔ موجودہ شاہی باغ اسی جگہ بنایا گیا ہے جہاں اصل شاہی باغ تھا لیکن اصل اور نقل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

انگریز ایلچی نے شاہی دربار میں اپنی حاضری کا جو موثر نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے:۔

> ''بڑی دیر کے بعد چاؤش باشی ہمارے پاس آیا۔ وہ بڑی دیر سے ہمارے نام ادا کرنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ آخر جب وہ ان عجیب الفاظ کا تلفظ ادا نہ کر سکا تو اس نے مایوس ہو کر کوشش چھوڑ دی۔ اس نے بڑے ادب کے ساتھ ہمیں دربار کے اداب بتائے اور ہم سے التجا کی کہ جب وہ دربار میں ہمیں اپنا ہاتھ لگائے تو ہم چپکے سے اسے اپنا نام بتا دیں۔

پھر وہ ہمیں ایک ڈھلوان راستے اور ایک دروازہ سے گزار کر لے گیا جس کے بعد ہم ایک جالی کے پیچھے پہنچ گئے اور ہم اچانک ایک بڑے دربار میں آنکلے جس کے ایک سرے پر بادشاہ ایک اونچی عمارت میں بیٹھا تھا۔

دربار لمبا تھا اور اس کی دیواریں اونچی تھیں جن پر سرو کی تصویریں بنی ہوئی تھیں درمیان میں ایک حوض تھا جس میں فوارے اچھل رہے تھے۔ آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بادشاہ کے محافظ آگے پیچھے تین صفوں میں کھڑے تھے۔ اور دربار میں مختلف جگھوں پر شاہی افسروں کو اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے جگہ ملی ہوئی تھی۔ دربار کے سرے پر ایک اونچی عمارت تھی جسے محرابوں سے آراستہ کیا گیا تھا لیکن اس میں دروازے اور کھڑکیاں نہیں تھیں۔ اس عمارت کے اوپر ایک اور منزل تھی جس کی چھت ستونوں اور انتہائی آراستہ محرابوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ وسطی محراب میں بادشاہ ایک بہت بڑے تخت پر جو سونے کا تھا یا اس پر سونے کا ملمع تھا جلوہ افروز تھا۔ اس کا حلیہ شاندار اور شاہانہ تھا۔ اس کے تاج اور لباس میں لگے ہوئے جواہر آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہے تھے۔ دربار میں مکمل خاموشی تھی۔ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی ہم سب نے اپنے ہیٹ اتار دئے اور خوب جھک کر تعظیم بجا لائے۔ پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے گویا بادشاہ کے لئے دعا کر رہے ہیں اور اس کے بعد فوارہ کی طرف بڑھے جہاں چاؤش باشی نے القاب یا تعظیم کے لئے کسی لفظ کا اضافہ کئے بغیر ہمارے نام دوہرائے اور آخر میں کہا کہ ”بادشاہ سلامت میں آپ پر قربان ہو جاؤں یہ لوگ یوروپ سے ایلچی بن کر آئے ہیں،،۔ بادشاہ نے بلند اور بارعب آواز میں ”خوش آمدید،، کہا جس پر ہم نے اس کے لئے پھر دعا کی اور دوبارہ تعظیم بجا لائے،،۔

یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ الفنسٹن شاہ شجاع کی شخصیت سے کتنا متاثر ہوا اس کے بعد ایک اور عبارت آتی ہے جس میں ظاہری تفصیلات بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ الفنسٹن لکھتا ہے۔

''شروع میں ہمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ بادشاہ جواہر کی زرہ پہنے ہوئے ہے لیکن غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہمارا خیال غلط تھا۔ بادشاہ کا اصل لباس سبز قمیص تھی جس پر بڑے بڑے سنہرے پھول بنے ہوئے تھے اور جواہر ٹکے ہوئے تھے۔ قمیص کے اوپر سامنے ہیروں کا بہت بڑا زیور تھا جو تین پتیوں کے پھول کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ کہنیوں کے اوپر زمرد کے بڑے بڑے بازو بند تھے اور جسم کے مختلف حصوں پر اور بہت سے زیور تھے۔ ایک بازو بند میں دنیا کا سب سے بڑا ہیرا کوہ نور جڑا ہوا تھا۔ تاج کوئی نو انچ اونچا تھا۔ پورا تاج ایسا پیچیدہ بنا ہوا تھا اور اتنا چمکدار تھا کہ اس کے نمونے کو سمجھنا بڑا مشکل اور بیان کرنا ناممکن تھا ... دربار کا کمرہ چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا۔ وسط میں چار اونچے اونچے ستون تھے جن کے درمیان سنگ مرمر کا فوارہ تھا۔ فرش پر انتہائی بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور حاشیہ پر زردوزی کے کام کے ریشمی تھان بچھے ہوئے تھے جن پر بڑے بڑے خان کھڑے ہوتے تھے۔ ہال سے بڑا خوبصورت منظر دکھائی دیتا تھا۔ عمارت سے باہر ساتھ ہی نیچے کی طرف ایک وسیع باغ تھا جس میں سرو اور دوسرے درخت لگے ہوئے تھے۔ اور ذرا سے فاصلہ پر بہترین سبزہ نظر آتا تھا۔ جا بجا چشمے اور حوض بنے ہوئے تھے۔ پورے منظر کے گرد پہاڑ نظر آتے تھے جن میں سے کچھ سیاہ اور کچھ برف پوش تھے''۔

شاہی عظمت کے دور میں پشاور کا یہ نقشہ تھا۔ اور باغ کے متعلق الفنسٹن لکھتا ہے :۔

''یہ شاہ لیمان کا باغ کہلاتا ہے۔ اس کی شکل مستطیل ہے۔ بالاحصار کی کچھ خوبصورت عمارتیں جو جنوب میں واقع ہیں اور اس پہاڑی کا ایک حصہ جس پر بالاحصار واقع ہے باغ میں شامل ہے۔ باغ کی دوسری اطراف میں دیواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ باغ کا شمالی حصہ جو پورے باغ سے الگ ہے اونچا نیچا بنایا گیا ہے اور اس میں طرح طرح کے درخت ہیں۔

باقی باغ چوکور ہے جس کے درمیان سے دو بڑی بڑی خیابانیں ایک دوسرے کو درمیان میں کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔ جو روش مشرق سے مغرب کی طرف جاتی ہے اس کے کنارے سرو اور سفیدہ کی شاہانہ قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ قطاریں اس طرح ہیں کہ ایک سرو ایک سفیدہ پھر ایک سرو پھر سفیدہ۔ باغ میں تین اور متوازی روشیں اور پوست کے دو بڑے بڑے تختے ہیں۔ شمالاً جنوباً کھلی جگہ کے چاروں طرف سرو اور سفیدہ کا حاشیہ لگایا ہوا ہے ان درختوں کے سایہ میں سرخ سفید پیلے اور چینی گلاب کی گھنی جھاڑیاں سفید اور پیلی یاسمین پھولدار جھاڑیاں (CISTUS) اور دوسری پھولدار بیلیں لگی ہوئی ہیں جن میں سے کچھ میں انگلستان اور ہندوستان میں دیکھ چکا تھا اور کچھ میرے لئے نئی تھیں۔ اس میدان کے شمالی سرے پر ایک بارہ دری ہے۔ روشوں کے درمیانی قلعہ میں چھ لمبے لمبے حوض بنے ہوئے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں اس طرح کہ پانی ایک حوض سے دوسرے میں گرتا رہتا ہے اور باغ کے وسط میں ایک تالاب میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اس تالاب کے وسط میں ایک دو منزلہ سیرگاہ بنی ہوئی ہے جس کے چاروں طرف فوارے بنے ہوئے ہیں۔ اور ہر حوض میں وسط تک فواروں کی قطار ہے کل انہتر فوارے ہیں اور ہم نے جو دن باغ میں گزارا یہ فوارے تمام دن اچھلتے رہے انہیں دیکھ کر بڑا سرور محسوس ہوتا تھا کیونکہ گرمی کافی پڑنے لگی تھی۔ باقی باغ میں بکثرت پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے یہ وہی درخت ہیں جو پشاور میں پائے جاتے ہیں اور جن کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ کچھ درخت اتنے گھنے تھے کہ دوپہر کے وقت بھی ان میں سے دھوپ نہیں چھن سکتی تھی اور اس طرح وہ سایہ دار ٹھنڈی اور خوبصورت آرام گاہ کا کام دیتے تھے.... دوپہر کے کھانے کے بعد ہم ایک بارہ دری میں جا پہنچے جہاں قالین بچھے ہوئے تھے۔ یہاں ہمارے لئے پھل لائے گئے۔ ہم نے اپنا وقت دیواروں پر لکھے ہوئے فارسی اشعار پڑنے میں گزارا۔ بیشتر اشعار میں دنیا کی بے ثباتی کا

نقشہ کھینچا گیا تھا۔ کئی اشعار بادشاہ کی حالت پر بعینہ صادق آئے تھے۔ قریباً تین بجے ہم ٹہلنے کے لئے نکلے۔ مشرقی اور مغربی خیابانوں سے بڑے حسین مناظر نظر آئے تھے اور ہر منظر ایک اونچے پہاڑ پر ختم ہوتا تھا۔ لیکن شمال اور جنوب کے درمیانی حصہ میں جو منظر دکھائی دیتا تھا اس کی مثال ایشیا کا کوئی باغ پیش نہیں کر سکتا۔ ہم بالاحصار کے نیچے کھڑے تھے جہاں سے یہ قلعہ بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے۔ فوارے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ سورج کی کرنیں ایک طرف درختوں جھاڑیوں اور پھولوں کو چمکا رہی تھیں اور دوسری طرف گہرے سایے ڈال کر ایک عجیب تضاد پیدا کر رہی تھیں۔ عمارتیں صناعی کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی تھیں اور ہلکی پھلکی تھیں اس لئے باغ کے ساتھ بڑی موزوں معلوم ہو رہی تھیں۔ باغ سے باہر کھلا میدان بھی سرسبز تھا اور اس میں جا بجا کہیں درختوں کے جھنڈ اور کہیں الگ الگ لگے ہوئے درخت نظر آ رہے تھے۔ اور پہاڑ جو اس علاقہ میں کافی اونچے ہیں پورے منظر کا دلکش حاشیہ بنے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے کئی سلسلے ہیں جو ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر ہیں اس لئے ان کے رنگ اور ہیئتیں طرح طرح کی ہیں .... ہم غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے باغ سے رخصت ہوئے،،۔

سکھوں نے اس حسین عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور کوئی پتھر کوئی شہتیر اور کوئی درخت اپنی جگہ نہ رہنے دیا۔ بالاحصار کی جگہ اب جو پشاور کا قلعہ نظر آتا ہے وہ سکھوں نے بارکوں کے طور پر استعمال کے لئے بنوایا تھا جس میں برطانیہ کے فوجی انجنیروں نے اصلاح اور ردو بدل کر لی۔ موجودہ شاہی باغ جو اس خطہ کے کچھ حصہ میں واقع ہے جہاں کبھی شاہ لیمان تھا اس میں نہ کوئی سحر آفرینی ہے اور نہ کوئی حسین منظر لیکن سکھوں کے بعد انگریزوں نے پشاور کو ایک بار پھر باغوں کا شہر بنانے کی کوشش کی البتہ شاہانہ شان و شوکت کی بجائے سادگی کا خیال رکھا۔ انگریزوں نے حتی المقدور ایک روایت کو پھر زندہ کیا اور پاکستان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس

روایت کو برقرار رکھے (۱)۔

جب الفنسٹن پشاور سے روانہ ہوا تو اس نے پیچھے مڑ کر حسرت بھری نظرڈالی ۔ تین روز کے سفر کے بعد اس نے موجودہ نوشہرہ چھاؤنی کے قریب خیمہ لگایا جہاں دریائے کابل سڑک کے قریب بہتا ہے۔ اسے یہ جگہ بڑی پسند تھی یہاں سبزہ تھا دریا کے کنارے درختوں کا سایہ تھا اور مغرب کی طرف خیبر کی محافظ تاترہ کی چوٹی نظر آتی تھی۔ ایک ہفتہ بعد یہ جماعت حسن ابدال پہنچ گئی۔ جس طرح پٹھان شمال کی طرف آتے ہوئے اس وادی میں داخل ہو کر روح میں بالیدگی محسوس کرتے ہیں اسی طرح اس انگریز نے جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے یہ محسوس کر لیا کہ ہندوستان جانے والے راستہ پر یہ آخری منزل ہے جہاں سے ہندوستانی اثرات محسوس ہونے لگتے ہیں۔ حسن ابدال کی وادی میں پہنچ کر الفنسٹن کو اس علاقہ کی خوبصورتی یاد آگئی جہاں سے وہ رخصت لے کر آ رہا تھا۔ حسن ابدال ایک فرودگاہ تھا جہاں مغل کشمیر جاتے ہوئے قیام کرتے تھے۔ یہاں کی فضا میں وہی تابدار لیکن خواب کی سی کیفیت تھی جو ایرانی طرز پر بنے ہوئے باغوں میں ہوتی ہے۔ الفنسٹن کو وہ دلکش منظر یاد آگیا جو اس نے کوہاٹ میں دیکھا تھا۔ قریب ہی واہ گارڈن جہاں وہ سیر کرنے گیا اجڑا پڑا تھا۔ آج کی طرح اس وقت بھی باغ کے کئی تالابوں میں آس پاس کے چشموں کا صاف شفاف پانی بھرا ہوا تھا کچھ اجڑی ہوئی عمارتیں تھیں جن میں سے ایک بڑی نفیس تھی۔ اور یہاں آخری بار سفیدہ کا درخت نظر آیا جو مغرب کے باغات میں آرائش کے طور پر لگایا جاتا ہے۔

الفنسٹن کی نگاہ میں واہ گارڈن کے خوبصورت کھنڈرات گویا اس امید کو تقویت بخشتے تھے جو اس کی جماعت اپنے ساتھ لے کر سرحد گئی تھی اور اس کے استقبال کی شان و شوکت اور سرحدی علاقہ کے مناظر کی خوبصورتی تھی جہاں اس نے مقصد برآری کے لئے جدو جہد کی تھی۔ لیکن جس طرح اس کی امید بارآور نہ ہو سکی اسی طرح سرحد کی یہ آخری چوکی بھی ویران

(۱) کننگھم باغ میں بھی جو اب جناح پارک کہلاتا ہے اور جو سرجارج کننگھم نے بنوایا تھا۔ شاہ شجاع کے باغ کی کچھ زمین شامل ہے۔ اس باغ کے پھلنے پھولنے کے بعد پشاور کا اجڑا ہوا حسن کچھ نکھر آئے گا۔

اور اداس تھی- اسے اپنی یا شاہ شجاع کی ناکامی کا خیال آ گیا - لیکن شاید اس مایوسی میں بھی اسے تھوڑی بہت تسکین ضرور تھی- اسے یہ ضرور معلوم ہو گا کہ اس نے ایک ایسی شمع جلائی ہے کہ اس کی نسل کے لوگ چاہیں تو اس شمع کی روشنی میں آگے بڑھ سکتے ہیں-

فصل ہشت دہم

سید احمد بریلوی اور سکھ

الفنسٹن ابھی پشاور ہی میں تھا کہ ۱۸۰۹ء کے موسم بہار میں خبر آئی کہ شاہ شجاع کا سوتیلا بھائی محمود جسے وہ اپنی دانست میں ایک سال پہلے فیصلہ کن شکست دے چکا تھا ایک بار پھر فتح خان کی مدد سے کابل کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شجاع اس خبر سے بڑا پریشان ہوا کیونکہ اس کی بہت سی فوج کشمیر کے راستہ کی پہاڑیوں میں جہاں وہ ایک بغاوت کچلنے گئی تھی تتر بتر ہو گئی تھی۔

اس سانحہ سے پوری حکومت کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور اس کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں قاصد یہ مصدقہ خبر لے کر آئے کہ محمود نے کابل پر قبضہ کر لیا ہے اور اب بظاہر وہ پشاور پر چڑھائی کرے گا۔ اس وقت باہمی دفاع کے سمجھوتہ کے لئے جو بات چیت ہورہی تھی اس کی بنا پر بادشاہ اور اس کے مشیروں کی یہ کوشش تھی کہ الفنسٹن سے یہ وعدہ لے لیا جائے کہ برطانوی حکومت داخلی معاملات میں شاہ شجاع کی حمایت کرے گی لیکن انگریز سفیر یہ وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے سلطنت کے حقیقی فرماں روا سے معاہدہ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا نہ اس لئے کہ وہ داخلی معاملات میں حصہ لے یا تخت کے کسی دعویدار کے خلاف کسی ایک بادشاہ کی حمایت کرے۔ الفنسٹن نے لکھا ہے کہ اس کے انکار کو بڑے احترام اور پوری توجہ کے ساتھ سنایا گیا۔ اس سے اس وعدہ کے لئے اصرار نہیں کیا گیا اور بادشاہ اور اس کے مصاحبوں کا یہ رویہ قابل تعریف ہے کہ باوجودیکہ الفنسٹن نے

انہیں سخت مایوس کیا تھا انگریز سفیر اور اس کے ساتھیوں کی خاطر مدارات اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔

الفنسٹن کی موجودگی ہی میں کشمیر میں فوج کی تباہی کی تلافی اور جنگ کے لئے نئی فوج منظم کرنے کی زبردست کوشش کی گئی۔ دونوں جماعتیں قریب قریب ایک ہی روز پشاور سے روانہ ہوئیں۔ شاہ شجاع اپنی فوج لے کر اپنے تخت کے لئے جنگ کے ارادہ سے روانہ ہوا اور الفنسٹن اس جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرنے کے لئے اپنی جماعت کے ساتھ حسن ابدال روانہ ہو گیا۔

الفنسٹن کو شاہ شجاع کی شکست کی خبر حسن ابدال میں ملی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ چند روز بعد جب وہ راولپنڈی پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا نابینا بھائی معزول شاہ زمان شاہی گھرانے کی عورتوں بچوں اور سامان کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ ایک ایسے بادشاہ سے جو انقلاب سے دوچار تھا الفنسٹن نے باہمی دفاع کے جس معاہدہ کے متعلق بات چیت کی تھی وہ بے کار ثابت ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشن ناکام ہوگیا ہے۔ لیکن مستقل اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ الفنسٹن کی شریف النفسی اور مکارم اخلاق کی یاد برسوں تازہ رہی اور اگر یہ یاد کم حیثیت لوگوں کی وجہ سے محو نہ ہو جاتی تو بڑے اچھے نتائج برآمد ہوتے۔ پھر بھی آج تک جو لوگ پشاور کے آس پاس رہتے ہیں ان میں انگریزوں کی اخلاقی اور ذہنی بلندی اور ذاتی عظمت کے متعلق ایک روایت چلی آتی ہے۔ میرے نزدیک اس روایت کی بنیاد یہ ہے کہ انہیں سب سے پہلے جس انگریز سے واسطہ پڑا وہ الفنسٹن تھا جس کی بھولی بسری یاد نے روایت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

شاہ شجاع کی شکست کی خبر رنجیت سنگھ کو وزیر آباد میں ملی جہاں وہ یہ علاقہ ایک اور سکھ سردار کی ملکیت سے جو مر چکا تھا اپنی ملکیت میں لینے میں مصروف تھا۔ اس نے یہ بھی سنا کہ پشاور اور آس پاس کا علاقہ ابھی تک شجاع کے ہاتھ سے نہیں نکلا اور وہ یہ موہوم امید لے کر کہ ان ہی دنوں انگریزوں سے باہمی دفاع کا جو معاہدہ ہوا ہے اس کی بنا پر وہ کچھ امداد حاصل کر سکے گا دریائے سندھ کے اس

پار آیا۔ رنجیت سنگھ اس بات کے لئے بے چین تھا کہ درانی سلطنت کے کسی نمائندہ کو اپنے قبضہ میں رکھے چنانچہ اس نے کہا میں شاہ شجاع کے استقبال کے لئے خود جاؤں گا تاکہ شاہ کو ہندوستان کا سفر اختیار کرنے کی زحمت برداشت نہ کرنا پڑے۔ دونوں کی ملاقات ساھیوال میں ہوئی جہاں رنجیت سنگھ شجاع کو اس ادھورے وعدے سے بہلاتا رہا کہ دونوں مل کر ملتان اور کشمیر دوبارہ فتح کریں گے اس مجوزہ مہم کی تفصیلات طے نہ ہو سکیں کیونکہ شجاع کو یہ خبر مل چکی تھی کہ یوسف زئی اور علاقہ پشاور کے دوسرے قبائل اس کے وفادار ھیں۔ شجاع کو جب اپنی کامیابی کی کچھ امید نظر آئی تو وہ سکھ مہاراجہ سے کوئی صریحی وعدہ کرنے سے کترانے لگا کیونکہ اسے رنجیت سنگھ کے خلوص کا اعتبار نہیں تھا اور یہ بے اعتباری بے وجہ نہیں تھی۔

شجاع اور رنجیت کے مذاکرات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور شجاع واپس اٹک چلا گیا جہاں وہ قبائل سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے کشمیر سے بھی کمک مل گئی کیونکہ کشمیر کے گورنر نے محمود کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ چنانچہ شجاع ۱۸۱۰ء کے موسم بہار میں پشاور پر قابض ہو گیا۔ وہ موسم گرما میں شہر پر قابض رہا اس کے بعد محمد اعظم خان نے جو پائندہ کے بائیس بیٹوں میں فتح خان سے چھوٹا تھا اسے پسپا ہوکر ڈیرہ جات چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ وھاں سے اس نے ملتان کے درانی گورنر کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جو ناکام رھی۔ شجاع نے شہر سے باھر اپنا خیمہ لگایا تب بھی گورنر نے اسے شہر میں داخل نہیں ہونے دیا اور اس کے ساتھ اخلاق سے پیش نہیں آیا۔ شجاع شمال کی طرف چلا گیا اور جب اس نے دیکھا کہ مشرقی قبائل میں اس کے ماننے والوں کی تعداد اب بھی کافی ھے تو وہ دو لڑائیوں کے بعد ایک بار پھر پشاور پر قابض ہونے میں کامیاب ہوا۔ اسے پہلی لڑائی میں شکست اور دوسری میں فتح نصیب ہوئی۔ لیکن شجاع غداروں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے گرد ایسے آدمی تھے جو اسے رنجیت سنگھ کی طرح اپنی قید میں رکھنا چاھتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۱۲ء میں اٹک کے گورنر جہاں داد خان نے اسے پشاور میں گرفتار کر لیا اور پہلے تو قلعہ اٹک میں محبوس رکھا اور پھر اسے کشمیر بھیج دیا جہاں وہ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک رھا۔

جن دنوں شجاع ملتان کے قریب مارا مارا پھر رہا تھا اس کا حریف محمود پشاور آیا اور اس نے کشمیر کے گورنر کو دھمکانے کے لئے جس نے اس کے سوتیلے بھائی کی طرفداری کی تھی دریائے سندھ عبور کیا۔ یہ واحد موقع تھا جب محمود پشاور آیا تھا۔ ان دنوں رنجیت سنگھ بھمبر راجوری اور کشمیر جانے والے مغلوں کے پرانے راستہ پر پیر پنجال کے نشیب میں دوسرے مقامات کے سرداروں کو زیر کرنے میں مصروف تھا۔ وہ وہاں سے فوراً شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا مقصد بظاہر درانی فرماں روا سے رسمی ملاقات تھا لیکن درحقیقت اسے اپنے آپ سے پہلے کشمیر پر قابض ہونے سے روکنا تھا کیونکہ رنجیت کشمیر پر اپنا قبضہ جمانے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ مارچ ۱۸۱۱ء میں دونوں کی ملاقات راولپنڈی میں ہوئی۔ بات چیت کا کوئی واضح نتیجہ نہ نکلا۔ رنجیت درانی شہزادوں سے نپٹنا خوب جانتا تھا۔ وہ فخرو مباہات کے پردہ میں اشارتاً امداد کی پیشکش اور اظہار وفاداری کے ذریعہ چاپلوسی کرتا رہتا تھا اور زہرخند کے ساتھ بڑی بے رحمی سے اپنی بات منوانے پر اڑا رہتا تھا۔

وہ ایسی دو عملی اختیار کرتا تھا جو درانی کے دل پر اثر کرنے میں شاذو نادر ہی خطا کرتی تھی۔ شروع میں وہ اپنے آپ کو عمدہ نسل کے گھوڑوں کا شوقین ظاہر کرتا تھا اور درانی شہزادہ یہ سمجھتا تھا کہ اسے کلغی دار اور حناآلود گھوڑا بطور تحفہ دینا مناسب ہو گا۔ افغان شہزادہ اپنے دل میں یہ سوچتا تھا کہ اس طرح سکھ سردار اس کا مرہون احسان ہو گیا ہے یا رقم خرچ کر کے سکھ سردار کو اپنا طرفدار بنا لیا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے لگتے تھے اور پھر باہمی دوستی کا ایک اور مظاہرہ کیا جاتا تھا وہ یہ کہ آپس میں پگڑیاں بدلی جاتی تھیں جس کا یہ مطلب ہوتا تھا کہ دونوں کی دوستی نسل اور مذہب سے بالاتر ہے۔ اس مرتبہ رنجیت کی چال کامیاب رہی اور محمود واپس چلا گیا۔

۱۸۱۲ء کے آخر میں دو معزول بادشاہوں زمان اور شجاع کے اہل خانہ لاہور میں پناہ لینے کے لئے روانہ ہوئے۔ کشمیر دور ضرور تھا لیکن محمود کے دشمنوں کے لئے محفوظ نہیں رہا تھا۔ یہ بات مشہور تھی کہ فتح خان جیسا طاقتور سردار پورا جھگڑا قطعی طور پر اپنے بادشاہ

کے حق میں طے کرانے کے لئے بذات خود حملہ کا منصوبہ بنا رہا ھے۔ رنجیت سنگھ ایسا کاھل نہیں تھا کہ اس موقع کو ھاتھ سے جانے دیتا۔ وہ کشمیر کے جنوب میں پہاڑی علاقوں کے سرداروں کو زیر کرنے میں مصروف تھا تاکہ بعد میں وادی کشمیر پر قبضہ کیا جائے۔ اس کی ھمیشہ یہ کوشش ھوتی تھی کہ اسے جو کامیابی ھو وہ ھر طرح مکمل ھو اور آسانی سے حاصل ھو اور ظاھر یہ کیا جائے کہ وہ دوسروں کی خدمت بجا لانے میں مصروف ھے۔ چنانچہ رنجیت نے شجاع کی بیوی سے کہا کہ وہ اس کے شوھر کو کشمیر کی گورنری دلا دے گا اور جب یہ کوشش کامیاب ھو جائے گی تو اسے امید ھے کہ شجاع کی بیوی اس احسان کے بدلہ میں اسے کوہ نور ھیرا عطا کر دے گی۔

اس مرحلہ پر رنجیت کے دو مقصد تھے۔ کشمیر کی فتح اور شجاع کو اپنے قبضہ میں رکھنا۔ جموں پر اس کے بیٹے کھڑک سنگھ کا قبضہ ھو چکا تھا اس لئے پہلا مقصد پورا ھو جانے کے آثار پیدا ھوگئے تھے۔ لیکن اس مرحلہ پر ۱۸۱۲ء میں فتح خان کی آمد سے گتھی الجھ گئی۔ فتح خان اس ارادہ سے آیا تھا کہ پچھلے سال محمود جس مہم میں ناکام رھا تھا اسے سر کیا جائے۔ دونوں حریف ٹکر کے تھے اور دونوں کا پلہ برابر معلوم ھوتا تھا۔ لیکن رنجیت فتح خان سے بھی زیادہ چالاک تھا۔ دونوں کی ملاقات ھوئی۔ نہ پگڑیاں تبدیل ھوئیں نہ گھوڑوں کا تذکرہ ھوا۔ رنجیت نے کہا کہ میں اٹک کے گورنر کو جس نے شجاع کو قید کیا تھا سزا دوں گا اور ملتان کے گورنر کو بھی سزا دوں گا جس نے شجاع اور محمود دونوں کی تعظیم بجا لانے سے انکار کر دیا تھا۔ فتح خان جس کا مقصد کشمیر کی فتح تھا اس مقصد کے حصول کے لئے ھر وعدہ کرنے کو تیار تھا تاکہ اسے رنجیت کی مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دونوں میں سے ھر ایک کی یہ نیت تھی کہ دوسرے کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ آخر یہ تجویز ھوا کہ دونوں مل کر کشمیر پر قبضہ کر لیں۔ دونوں میں سے ایک بھی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ھوا۔ کشمیر پر ۱۸۱۳ء کے موسم بہار میں قبضہ ھوا اور درانی سکھوں سے بازی لے گئے۔ فتح خان کا دعویٰ تھا کہ اس نے تنہا کشمیر فتح کیا ھے اس لئے رنجیت کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں ھے۔ فتح خان شاہ شجاع کو فراموش کر چکا تھا۔ اس معزول بادشاہ نے اس ڈر سے کہ

محمود جو کابل پر حکمراں ہے اس کی آنکھیں نہ نکلوا لے یا اسے قتل نہ کرا دے سکھ فوج کے ساتھ ملنا پسند کیا اور رنجیت کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ اس بار کشمیر رنجیت کے ھاتھ سے نکل چکا تھا لیکن دوسرے علاقے اور خود طاقت کا توازن رنجیت کے ھاتھ آنے والا تھا۔ اٹک کا باغی گورنر کشمیر میں فتح خان کی کامیابی سے خائف ہو گیا تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ خود فتح خان کے ھاتھ نہ لگ جائے چنانچہ رنجیت سنگھ نے بڑی آسانی سے بہلا پھسلا کر اکبر کا مشہور قلعہ اس سے لے لیا۔ فتح خان کو طیش آگیا اور اس نے لڑائی کی ٹھان لی۔ ۱۲ جولائی ۱۸۱۳ء کو قلعہ کے شمال مشرق میں مانسر کے میدان میں سکھوں اور درانیوں کے درمیان پہلی مرتبہ جم کر لڑائی ھوئی۔ فتح خان کو قبائل کی امداد حاصل نہیں تھی کیونکہ وہ سب کے سب شجاع کے حامی تھے چنانچہ سکھ فوج نے جس کی قیادت محکم چند کر رھا تھا فتح خان کو شکست دے دی۔ اٹک کی یہ لڑائی اس لئے بھی مشہور ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ فتح خان کے چہیتے بھائی دوست محمد خان کا تذکرہ آتا ہے جس کا پائندہ خان کے بیٹوں میں پندرھواں نمبر ہے۔ اس وقت دوست محمد کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔

شاہ شجاع جو لاھور میں تھا مہمان ھی کی حیثیت سے سہی پھر بھی رنجیت کی مٹھی میں تھا چنانچہ رنجیت نے اپنی چال چلی۔ وہ چاھتا تھا کہ سب سے پہلے شجاع کے ذریعہ کشمیر حاصل کیا جائے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ رنجیت کو یہ معلوم تھا کہ پشاور کے قبائل معزول بادشاہ کے ساتھ ھیں اس لئے وہ درانی نام کی آڑ میں پشاور پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کا کوہ نور ھیرا حاصل کرنے کا شوق بھی سرد نہیں ھوا تھا کیونکہ لوگوں کے ذھنوں میں اس ھیرے کا نام مغلوں کے دور حکومت کی عظمت سے وابستہ تھا۔ سکھ مورخوں کا بیان ہے کہ شروع میں شاہ شجاع تمام مطالبات کو ٹالتا رھا اور یہاں تک کہ اس نے نقد معاوضہ کی پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ آخرکار رنجیت سنگھ بہ نفس نفیس اس سے ملنے گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کا اظہار کیا اور پھر آپس میں پگڑی بدلنے کی مشہور رسم ادا ھوئی اس طرح کوہ نور ھیرا رنجیت کے ھاتھ آگیا شاہ کو اپنے گزارے کے لئے پنجاب میں جاگیر مل گئی اور اس سے وعدہ کیا گیا کہ

کابل فتح کرنے کی مہم میں اس کی مدد کی جائے گی۔ لیکن افغان مورخوں کا بیان بالکل مختلف ہے۔

امیر عبدالرحمان لکھتے ہیں ''رنجیت سنگھ نے شجاع کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک کیا اور اسے قید میں ڈال دیا۔ اس نے کوہ نور ہیرا جو آج کل ملکہ وکٹوریہ کے پاس ہے شجاع سے جبراً چھین لیا۔ مورخوں نے بڑے موثر انداز میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ کس طرح جب شجاع نے یہ ہیرا اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو وہ پیلا پڑ گیا اور بہت افسردہ ہو گیا دوسری طرف وہ شخص جسے یہ ہیرا ملا تھا بہت خوش تھا اور غیر متوقع طور پر اتنی بیش قیمت چیز ہاتھ لگنے پر پھولا نہیں سماتا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا میں نصف آبادی کے رنج باقی نصف آبادی کی خوشیاں ہیں۔ لیکن ایک فریق دوسرے فریق کو جنگ میں ہلاک کرنے کے بعد اپنی فتح کی خوشیاں مناتا ہے اور دوسرا فریق مرنے والوں کی موت اور اپنی شکست کا سوگ مناتا ہے،،۔

سکھ مورخ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہیرا مفت حاصل نہیں کیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ رنجیت سنگھ نے کوہ نور کے بدلے جو ذمہ داریاں قبول کی تھیں وہ انہیں پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ کابل کے تخت پر شجاع کے دوبارہ قبضہ کی حمایت کرتا رہا اس نے اس سلسلہ میں صرف معاہدہ ہی نہیں کیا جس میں ۱۸۳۳ء میں برطانوی حکومت بھی شامل ہو گئی بلکہ شجاع کی فوجی امداد بھی کی اور اسے مضبوط چوکیاں اور ذرائع آمدورفت مہیا کئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رنجیت پہاڑوں اور دریائے سندھ کے درمیان افغان علاقہ پر دانت لگائے بیٹھا تھا چنانچہ اس نے یہ علاقہ حاصل کر لیا اس کا کوہ نور ہیرے کے لین دین سے کوئی تعلق نہیں۔ رنجیت کو کشمیر بھی مل گیا۔ تمام باتوں کے باوجود رنجیت سنگھ کا یہ کارنامہ فخر کے ساتھ پیش کرنے کے لائق نہیں ہے کہ اس نے مکر سے یا زبردستی اپنے مہمان سے جس نے اس کے پاس پناہ لی تھی اس کی سب سے بڑی دولت لے لی۔

دریائے سندھ کے پار اب بھی یہی کہا جاتا ہے کہ سکھ دوسروں کی ملکیت جن طریقوں سے چھینتے تھے اور اپنے قبضہ میں لاتے تھے کوہ نور

ھیرا حاصل کرنے کا واقعہ اس کی واضح مثال ھے چنانچہ سندھ کے پار بسنے والے ابھی تک اس واقعہ کو نہیں بھولے۔ چند سال بعد سکھوں کے دور حکومت میں ان کے متعلق یہ جائزہ عملی طور پر صحیح ثابت ھوا۔ ان تمام باتوں کے باوجود طوعاً و کرھاً رنجیت سنگھ کی عیاری اور ارادہ پر جمے رھنے کا اعتراف کیا جاتا ھے۔ یہی وہ صفات تھیں جن سے کام لے کر رنجیت سابقہ درانی سلطنت کے مشرقی علاقہ میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ھوا۔

وقائع سے ظاھر ھوتا ھے کہ ۱۸۱۴ء کے آخر میں شجاع کی بیوی فرار ھو کر ستلج کے پار برطانوی سرحدی اسٹیشن لدھیانہ پہنچنے میں کامیاب ھو گئی۔ چند ماہ کے بعد خود شجاع بھی فرار ھو گیا لیکن رنجیت اپنے ان قیدیوں سے اپنا مطلب نکال چکا تھا اور ان دونوں کا فرار اسی کے ایما پر ھوا تھا اور اس کی دانست میں تھا۔ شجاع کشمیر کی پہاڑیوں میں جا پہنچا جہاں وہ کشتواڑ کے ایک باھمت سردار کی مدد سے فتح خان کے بھائی محمد اعظم سے جسے فتح خان سری نگر میں کشمیر کا گورنر بنا کر چھوڑ گیا تھا کشمیر چھین لینے میں قریب قریب کامیاب ھو گیا تھا لیکن آخرکار یہ مہم بھی ناکام ھو گئی اور شجاع کلو اور اس مقام کے قریب سے ھوتا ھوا جہاں اب شملہ آباد ھے ۱۸۱۶ء کے موسم خزاں میں برطانیہ کا وظیفہ خوار بن کر اپنے بال بچوں سے آملا۔ ابھی اس کی قسمت میں مزید چھبیس سال تک جدو جہد کرنا باقی تھا۔

۱۸۱۵ء میں رنجیت نے خود کشمیر پر حملہ کیا لیکن وہ کشمیر کو فتح نہ کر سکا۔ اس کی فوج نے مغلوں کے راستہ پر چل کر گجرات سے بھمبر کے راستہ پیر پنجال کی پہاڑیاں عبور کیں۔ رنجیت شوپیاں تک پہنچ جانے میں کامیاب ھو گیا جو وادی میں پہاڑوں کے بڑے سلسلہ کے شمال میں وادی کا پہلا قصبہ ھے اور پہاڑی کے دامن میں آباد ھے۔ لیکن اسے یہاں سے پسپا کر دیا گیا اور اسے بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ رنجیت نے تیزی کے ساتھ پیچھے ھٹ آنے ھی میں عافیت سمجھی۔ اس موقع پر اعظم نے بڑی مردانگی کا ثبوت دیا اور سکھوں کے ھراول دستہ کے ساتھ رحم سے پیش آیا۔ اس کا کہنا ھے کہ اس نے محکم چند کا لحاظ کرتے ھوئے جو دو سال پہلے اٹک کی لڑائی سر کر چکا تھا اور اس دستہ کے کماندار

کا دادا تھا پورے دستہ کی جان بخشی کر دی۔ رنجیت سنگھ نے کشمیر میں اپنی پیش قدمی رک جانے کی تلافی ۱۸۱۸ء میں کر لی وہ اس طرح کہ اس نے ملتان فتح کر لیا۔ اب وہ شمالاً جنوباً یعنی اٹک سے لے کر ملتان کے نیچے پنج ند تک جہاں پانچوں دریا سندھ میں مل جاتے ھیں دریائے سندھ پر پہنچ چکا تھا۔

دریائے سندھ کے مشرق میں درانی صرف کشمیر اور ھزارہ کے پہاڑی علاقہ تک محدود ھو گئے تھے اس علاقہ پر بھی ان کی حکومت بڑی کمزور تھی۔ پشاور اور کابل سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے انہیں اٹک کے شمال میں جہاں کے قلعہ پر رنجیت سنگھ کا قبضہ تھا گھاٹ اور اتھلا راستہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کی وفات کے وقت سے ۱۸۱۸ء تک افغانوں کی خاندانی تاریخ احمد شاہ کی اولاد سدوزئیوں کی محلاتی سازشوں اور بادشاہ گردی پر مشتمل ھے۔ ۱۸۱۸ء میں اس بادشاہ گردی نے بالکل نئی شکل اختیار کر لی اور سدوزئیوں کی جگہ محمد زئیوں نے لے لی۔ جس طرح سدوزئی پوپل زئی قبیلہ کی شاخ ھیں اسی طرح محمد زئی بارک زئی درانیوں کا ایک خیل ھیں۔ سب سے مشہور۔محمد زئی (۱) خاندان پائندہ خیل کا ھے جو نادر شاہ ایرانی اور احمد شاہ ابدالی کے زمانوں کے سربرآوردہ بارک زئی سردار حاجی جمال کی اولاد میں سے تھا۔ پائندہ خان کا سب سے بڑا بیٹا فتح خان وزیر تھا۔

جب سے ۱۸۰۹ء میں محمود دوبارہ کابل کے تخت پر بیٹھا تھا حکومت کی باگ ڈور فتح خان کے ھاتھ میں تھی۔ محمود کی یہ عادت تھی کہ وہ مہینوں گوشہ نشین رھتا تھا اپنے مشیروں سے متنفر ھو جاتا تھا اور جب بڑے جبرو اکراہ سے اپنی اس گوشہ نشینی سے باھر آتا تھا تو ظالمانہ اور غلط احکام صادر کر دیتا تھا۔ اس نے تخت حاصل کرنے کی جدو جہد میں اپنی اوائل عمر کا بیشتر حصہ ترک قاچاروں کے ساتھ اور بخارا کے ازمنہ وسطیٰ کے طرز کے دربار میں گزارا تھا اور ایک اچھے

---

(۱) فصل اول میں پہلا اور دوسرا گوشوارہ ملاحظہ فرمائیے۔ محمد زئی درانی ھشت نگر کے وہ محمد زئی نہیں ھیں جن کا تذکرہ بابر نے کیا ھے۔

شاگرد کی طرح ان سنگدل شہزادوں سے ایذارسانی کا ذوق لطیف حاصل کر لیا تھا۔ محمود خاص طور پر اسی لئے مشہور ہے کہ وہ بڑی انوکھی اذیتیں ایجاد کرتا تھا اور جو اذیتیں دیتا تھا ان سے بڑا لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کا بیٹا کامران جو اس سے بھی زیادہ شقی‌القلب تھا ہرات کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ جس سال رنجیت نے ملتان فتح کیا یعنی ۱۸۱۸ء میں فتح خان ہرات پر ایرانیوں کا ایک حملہ پسپا کرنے گیا تھا۔ اس شہر پر ایرانیوں کے حملے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنے چہیتے بھائی دوست محمد کو جو پانچ سال پہلے اٹک کی لڑائی میں اس کے ساتھ شکست میں بھی شریک تھا اپنے ساتھ ہرات لے گیا تھا۔ فتح خان نے ایرانیوں کا حملہ پسپا کر دیا اور اس کی بڑی تعریف ہوئی۔ لیکن ہرات میں اسے اپنے ارادے اس شہر کے گورنر کامران کے عناد اور نااہلی کی وجہ سے پورے ہوتے نظر نہ آئے۔ کامران نے مقامی خزانہ فتح خان کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر فتح خان نے دوست محمد کو ہدایت کی کہ وہ محل میں داخل ہو جائے۔ ضرورت پڑے تو جبر سے کام لے اور کامران سے خزانہ اگلوا لے۔ دوست محمد سکھ سردار جے سنگھ اٹاری والا کو ساتھ لے کر جو رنجیت سنگھ کی حکومت سے بیزار ہو کر اس سے آ ملا تھا اس مہم پر روانہ ہوا۔ ان دنوں سکھوں کا اثر و رسوخ اس حد تک پہنچ چکا تھا۔ دوست محمد اور اس کے سکھ ساتھی نے یہ مہم سر کر لی اور اس مہم میں شاہی خاندان کی ایک خاتون کی عزت کا بھی خیال نہیں کیا اور اس پر دست درازی کی۔ کم از کم کامران کا یہی دعویٰ تھا۔ اس نے اپنی بہن کی بے حرمتی کا بہانہ بنا کر بادشاہ گر فتح خان سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ یہ ظاہر کر کے کہ ہرات کے نجات دہندہ کی حیثیت سے اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا فتح خان کو اپنے باپ کے دربار میں حاضر ہونے پر رضامند کر لیا۔ جب فتح خان محمود کے دربار میں آیا تو کامران نے اپنے سر بھرے باپ سے مطالبہ کیا کہ فتح خان کو انتہائی عبرت ناک سزا دے کر ہلاک کیا جائے کیونکہ اس کی بدولت ایک کافر نے شاہی خاندان کی ایک خاتون پر دست درازی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فتح خان کی زندہ کھال کھنچوا دی گئی اور بادشاہ اور اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے۔ غالباً سب سے زیادہ قابل اعتبار تفصیل وہ ہے

جو امیر عبدالرحمان نے اس واقعہ سے ۸۰ (اسی) سال بعد لکھی ہے۔

امیر لکھتے ہیں ''۱۸۱۸ء میں محمود نے اپنے دغاباز بیٹے کامران اور ان دوسرے لوگوں کی باتوں میں آکر جو وزیر فتح خان کے اثرو رسوخ سے حسد کرنے لگے تھے فتح خان کو جس نے محمود کو دو مرتبہ تخت پر بٹھایا تھا اور جاں نثاری کے ساتھ خدمات بجا لایا تھا طرح طرح کی اذیتیں دیں اور اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ آخر میں جب فتح خان نے اپنے بھائیوں کے ساتھ غداری کرنے سے انکار کر دیا تو اس بادشاہ کے حکم سے اور اسی کی موجودگی میں جو فتح خان کے بل پر بادشاہ بنا اس کا ایک ایک عضو کاٹ دیا گیا۔ اس طرح ایک شاندار آدمی جو افغانستان کا رستم تھا فوت ہو گیا۔ وہ جس جماعت کا ساتھ دیتا تھا اپنی ذہانت اور بہادری کی وجہ سے اسے عروج پر پہنچا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بہادر فیاض اور خوش اخلاق شخص کی حیثیت سے اس کی شہرت اس کے چھوٹے بھائی دوست محمد خان کو کابل کا تخت دلانے میں بڑی ممد ثابت ہوئی۔''

پشاور میں وزیر باغ اسی نے بنوایا تھا اور اس باغ میں سرو کے درخت اسی کی یادگار ہیں۔ وزیر باغ ایک اداس جگہ ہے جہاں دوسرے باغوں کی طرح سکون میسر نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فتح خان کی بے چین روح پھرتی ہے۔ فتح خان کی زندگی لڑائیوں میں گزری تھی اور اس باغ میں لڑائی پر جانے والے قبائل جمع ہوا کرتے تھے۔

یہ بہیمانہ قتل تمام پائندہ خیل کی بغاوت کی ابتدا تھا۔ اعظم جو اب خاندان میں سب سے بڑا تھا اپنے ایک اور بھائی جبار کو کشمیر میں چھوڑ کر وہاں سے بہترین فوج لے کر تیزی کے ساتھ روانہ ہوا۔ چند ہی مہینوں میں اس نے محمود کو کابل غزنی اور قندھار سے نکال باہر کیا۔ محمود اور اس کا سر پھرا بیٹا صوبہ ہرات میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور کئی سال تک اکا دکا جھڑپیں ہوتی رہیں۔ سرحدی قبائل نے سابقہ حکومت کی وفاداری کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور نئی حکومت کے ساتھ وفاداری کا عہد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ آٹھ سال تک پورے علاقہ میں افراتفری پھیلی رہی آخر اعظم کی وفات کے بعد ۱۸۲۶ء میں دوست محمد کابل میں اپنے پاؤں جمانے اور محمود کو ہرات میں محصور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ قندھار پر قبضہ کے لئے اور مدت درکار تھی۔

رنجیت سنگھ ایسا آدمی نہیں تھا جو اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا۔ ۱۸۱۸ء ختم ہونے سے پہلے اور اعظم کے پیچھے پیچھے اس نے بھی اٹک سے اوپر دریائے سندھ عبور کیا اور پشاور جا پہنچا جہاں پائندہ خیل میں سے ایک اور بھائی یار محمد گورنر بنا بیٹھا تھا۔ گورنر کے پاس کوئی فوج نہیں تھی کیونکہ تمام فوج اعظم کے ہمراہ محمود کے خلاف جنگ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ لہٰذا گورنر شہر خالی کر دینے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن رنجیت بڑا چالاک تھا وہ جانتا تھا کہ اب بھی اس کی پوزیشن نازک ہے اور اس نے زیادہ خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا اس کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ کسی معاملہ میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ وہ پہلے اپنا راستہ نکالتا تھا پھر بڑی احتیاط کے ساتھ بنیاد ڈالتا تھا۔ اس موقع پر رنجیت کو یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ وہ پشاور اور آس پاس کے علاقہ پر قبضہ کر لے۔ اس نے صرف اتنا بھانپ لیا کہ یہ علاقہ بڑا اچھا ہے اور وہاں سے واپس چلا آیا۔ پھر اس نے اٹک کے سامنے خیرآباد کے مقام پر قلعہ تعمیر کرایا۔ خیرآباد سے جو نسیم گزرتی تھی اور جس کی یاد میں خوشحال سرد آہیں بھر چکا تھا اب اس میں سکھوں کا جھنڈا لہراتا تھا۔ دریا کے آر پار دونوں قلعوں کے درمیان سکھ کمانڈروں کے سگنل نظر آتے تھے۔

رنجیت ایک اور مہم سر کرنے کے لئے جو اسے زیادہ عزیز تھی پشاور سے واپس ہوا تھا۔ اور اعظم کا اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام لینے کے لئے روانہ ہونا ایک اور لحاظ سے اہم ثابت ہوا۔ اگلے سال ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کی ہمراہی میں اعظم کے چھوٹے بھائی جبار خان کو کشمیر سے نکال کر آخرکار ریاست پر قبضہ کر لیا۔ کشمیر پر درانیوں کی حکومت ستاسٹھ سال برقرار رہی۔ احمد شاہ نے کشمیر کی وادی ۱۷۵۲ء میں مغلوں سے چھین لی تھی اس سے پہلے قریباً دو سو سال تک کشمیر مغلیہ حکومت کا صوبہ تھا اور اس سے بھی پہلے یہ علاقہ ۱۳۴۱ء سے مسلمانوں کے قبضہ میں چلا آرہا تھا۔ قریباً پانچ سو سال تک افغان اور پٹھان کشمیر میں نہ صرف گورنر کے تحت اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کی حیثیت سے ممتاز تھے بلکہ انہوں نے بہت سی بستیاں بھی بسا لی تھیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ آج بھی سرحدی علاقہ کے لوگ کشمیر اور اس کی قسمت سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آئندہ وادی کشمیر اور

آس پاس کے علاقوں کی قسمت کا فیصلہ ہوتے وقت پٹھانوں کی اس دلچسپی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

درانی اب دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر اپنے تمام علاقوں سے محروم ہو چکے تھے اور سکھوں نے دریا کے اس کنارے پر بھی جدھر افغانوں کی حکومت تھی پل بنانے کے لئے ٹھکانہ حاصل کر لیا تھا۔ آئندہ دو سال میں رنجیت نے ڈیرہ غازی خان کو فتح کر لیا اور ڈیرہ اسماعیل خان کو جاگیر کی حیثیت سے حاصل کر لیا اور حسن ابدال کے شمال میں ہزارہ قبائل کو زیر کر کے جو کشمیر جانے والا ایک راستہ روکے ہوئے تھے اپنی پوزیشن اور بھی مضبوط بنا لی۔

درانی حکومت کو جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس کا مقابلہ ضروری تھا۔ ۱۸۲۲ء میں اعظم اس ارادہ سے کہ خیرآباد پر حملہ کیا جائے اور رنجیت سنگھ کو دریا کے پار بھگا دیا جائے مفرور سکھ سردار جے سنگھ اٹاری والا کے ہمراہ پشاور پہنچا۔ ابھی لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ اندرون ملک میں گڑبڑ کی وجہ سے اعظم کو واپس جانا پڑا لیکن رنجیت سنگھ بھاگم بھاگ اپنے علاقہ کی سرحد پر پہنچ گیا اور اس نے پشاور کے گورنر یار محمد کو پیغام بھجوایا کہ خراج ادا کیا جائے۔ یار محمد نے جو اپنے بھائی اعظم کے ارادوں سے بھی اتنا ہی خائف تھا جتنا وہ رنجیت سنگھ سے ڈرتا تھا ساز سے آراستہ اور خوش رفتار گھوڑوں کا تحفہ پیش کیا۔ رنجیت گھوڑوں کا بڑا شائق تھا۔ مہاراجہ مسکرایا اور اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اس تحفہ سے مطمئن ہے۔ وہ تھوڑے عرصہ کے لئے اپنی بدمزاج ساس سے نپٹنے چلا گیا جس سے دریائے ستلج پر ایک قلعہ کے متعلق اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔ یہ جھگڑا نپٹا کر رنجیت ایک بار پھر دریائے سندھ پر پہنچ گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اعظم یار محمد کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوا کہ اس نے رنجیت کو گھوڑوں کا تحفہ دیا ہے اور اعظم پھر پشاور آ رہا ہے۔ یار محمد اپنے بھائی کے عتاب سے ڈر کر یوسف زئی علاقہ سوات چلا گیا۔ پشاور کی حیثیت اتنی اہم تھی کہ اس کے لئے بڑے سے بڑا داؤ لگایا جا سکتا تھا۔ آخر مشہور جنگ نوشہرہ کے لئے بساط

بچھ گئی (۱)۔

یہ مارچ ۱۸۲۳ء کا واقعہ ہے۔ اس سال موسم بہار کی بارش وقت پر نہیں ہوئی تھی اور دریائے سندھ پایاب تھا۔ رنجیت نے وہی کیا جو اس سے پہلے غالباً سکندر اعظم اور پھر کئی بار محمود غزنوی نے اور پھر بابر نے کیا تھا۔ اس نے نہڈ کے قریب جس کا پرانا نام وائے ہند یا او ہند ہے دریا کا گھاٹ عبور کیا۔ غازی اور پہور سے نیچے جہاں دریائے سندھ ہزارہ کی پہاڑیوں سے گزر کر آتا ہے اور خیرآباد سے اوپر جہاں لنڈائے دریا آ کر ملتا ہے اور جہاں سندھ اٹک کی تنگ گھاٹی میں داخل ہوتا ہے یہ دریا یوسف زئی سمہ اور چھچھ کے درمیان وسیع میدان میں پھیل جاتا ہے اور اس کی تین اور کبھی چار دھاریں بن جاتی ہیں۔ کسی کسی سال اس مقام پر مضبوط ارادہ کے شہسوار دریا عبور کر سکتے ہیں۔ جہاد کی تبلیغ ہو چکی تھی اور قبائل یوسف زئی علاقہ میں دریا کے کنارے صفیں باندھے کھڑے تھے وہ نعرہ ہائے جنگ بلند کر رہے تھے اور سکھ شہسواروں کو للکار رہے تھے۔ سکھوں نے جوش میں آ کر اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور کبھی پیرتے ہوئے اور کبھی پایاب دریا میں گھوڑے بڑھاتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس اثنا میں بہت سے سکھ اور ان کے گھوڑے دریا میں بہہ گئے۔ اس کے بعد رنجیت اپنی فوج کے بڑے حصہ کے ساتھ ثابت قدمی سے آگے بڑھا۔ وہ کشتیوں کو یکجا کرتا جاتا تھا اور اس نے اپنی توپیں ہاتھیوں پر لاد رکھی تھیں۔ اس وقت تک یوسف زئی اور خٹک قبائل کا بیس ہزار کا لشکر جمع ہو چکا تھا اور اس کی قیادت بنیر کے پیر بابا کے خاندان کے ایک مشہور سید اکبر شاہ کے سپرد تھی۔ پٹھان پیر سباک کے ٹیلہ پر جمع تھے جو موجودہ رسالپور سے تھوڑی دور مشرق میں لنڈائے دریا کے شمالی (بائیں) کنارے پر واقع ہے۔ لشکر کے دوسرے حصہ نے ایک میل کے فاصلہ پر مغرب کی طرف دوسری پہاڑیوں پر جو پٹھانوں میں ترکئی کے نام سے اور انگریز سپاہیوں میں ''ماربل راکس'' کے نام سے مشہور ہیں صف آرائی کی تھی۔ اس وقت تک اعظم کابل سے اپنی فوج لے کر پشاور سے بڑی سڑک پر کافی آگے

(۱) آگے جو بیان آیا ہے وہ اس لڑائی کے متعلق شہامت علی، الیگزینڈر برنس اور کننگھم کی تحریروں اور یوسف زئیوں اور خٹکوں کی بیان کی ہوئی قبائلی روایات پر مبنی ہے۔

بڑھ آیا تھا لیکن اسے یہ بھروسہ نہیں تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر قبائلی لشکر اس کا ہم نوا ہے اور اسے اپنے بھائیوں کی وفاداری پر بھی شبہ تھا اس لئے اس نے دریا پار نہیں کیا اور موجودہ نوشہرہ چھاؤنی سے تین میل مشرق کی طرف ٹھیر گیا۔ یہ لڑائی نوشہرہ چھاؤنی کے نام پر مشہور نہیں کیونکہ اس وقت تک یہاں کوئی چھاؤنی نہیں تھی بلکہ نوخار نامی قصبہ یا گاؤں کے نام پر مشہور ہے جو لنڈائے دریا کے شمالی (بائیں) کنارے پر آباد ہے۔ چونکہ لڑائی کا زور پیر سباک کی پہاڑیوں پر رہا تھا اس لئے کبھی کبھی اسے پیر سباک کی لڑائی بھی کہا جاتا ہے قصہ مختصر یہ کہ باقاعدہ درانی فوج جس کی قیادت اعظم کر رہا تھا اور قبائلی لشکر کے درمیان چوڑا اور گہرا لنڈائے دریا حائل تھا۔

مہاراجہ نے اپنی فوج کا چھوٹا دستہ دریا کے جنوبی (دائیں) کنارے اس کام پر مامور کیا کہ وہ اعظم کو آگے بڑھنے سے روکے اور مہاراجہ کی توپوں کی حفاظت کرے جو سڑک کے راستہ آگے بھیجی جا رہی تھیں۔ اس مقام پر سڑک دریا کے متوازی ہے۔ اس نے اپنی شہسوار اور پیدل فوج کا بڑا حصہ قبائل کے مقابلہ پر صف آرا کر دیا جن کے پرچم پیر سباک کی پہاڑی اور اس کے پیچھے ترکئی کے ٹیلوں پر لہرا رہے تھے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کون سا دشمن زیادہ طاقتور ہے اور اس نے درانی حاکم اور اس کی فوج کی طاقت کا بھی اندازہ لگا لیا تھا جنگ کا آغاز قبائلی غازیوں اور سکھ اکالیوں کے درمیان زبردست دست بدست لڑائی سے ہوا۔ امرتسری اکالیوں کا وحشی لیڈر پھولا سنگھ لڑائی میں مارا گیا اور شہسوار سکھ پیدل قبائل کو مرعوب نہ کر سکے کیونکہ وہ ان ٹیلوں پر مضبوط مورچے لگائے بیٹھے تھے جو اس علاقہ میں پورے میدان میں بکھرے پڑے ہیں۔ ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑائی کا فیصلہ سکھوں کے خلاف ہوگا۔ جنگجو یوسف زئی اور خٹک قبائل کے دل بادل بڑی بے جگری سے سکھوں کی منظم پیدل فوج پر ٹوٹ پڑے اور اس فوج کی صفیں الٹ دیں۔ اس سے قبائل کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ آگے بڑھنے لگے لیکن مہاراجہ کی فوج کی ایک گورکھا بٹالین نے پیش قدمی کرتے ہوئے قبائل پر مسلسل گولیاں چلا کر انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ دوسرے کنارے سے سکھوں کے توپخانے نے خوب گولے برسائے اور دشمن کی پیش قدمی روک دی۔

لیکن قبائل کی ہمت پست نہیں ہوئی تھی۔ لشکر پھر پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ سکھوں نے تین مرتبہ پیر سباک کی چوٹی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا ہر حملہ پسپا کر دیا گیا۔ چوتھے حملہ میں اس چوٹی پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا وہ بھی اس طرح کہ رنجیت سنگھ اپنی گورکھا بٹالین کے بچے کھچے سپاہیوں اور اپنے محافظ شہسوار دستہ کا دل بڑھانے کے لئے خود موجود رہا۔ رنجیت نے کرنل ویڈ سے جو اس کے دربار میں برطانوی ایجنٹ تھا اعتراف کیا کہ اس کی پوری منظم فوج میں سے صرف گورکھے ہی تھے جو قبائل کے حملہ کے وقت جمے رہے۔

اس اثنا میں اعظم دریا کے دوسرے کنارے پر بے کار بیٹھا رہا۔ اس نے دریا عبور نہیں کیا یہاں تک کہ سکھ توپ خانے کا جو جنوبی کنارے سے گولے برسا رہا تھا اثر زائل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس شام کو وہ پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اس کے اس رویہ کا کوئی معقول جواز پیش نہیں کیا گیا۔ نو سال بعد الیکزینڈر برنس نے پشاور میں لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ اعظم کو اپنے خزانہ کی فکر تھی یا پھر اس کی فوج دریا کے شمالی کنارے پر کھڑے ہوئے اکالیوں کے نعروں سے مرعوب ہو گئی۔ ان کے نعروں کا یہ مطلب لیا گیا کہ سکھوں کو کمک پہنچ گئی ہے۔

اس موقع پر قبائل کو جو جانی نقصان ہوا اس کا اندازہ نوشہرہ کے قریب ترکئی کے ٹیلوں کے جنوب میں وسیع قبرستان سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ قبریں اس قربانی کی شہادت دیتی ہیں جس کی یاد آج بھی تازہ ہے۔ اتنے بھاری جانی نقصان کے باوجود اگلی صبح کو قبائل پھر صف بستہ ہو گئے اور اپنے پیرزادہ اکبر کی قیادت میں لڑائی جاری رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اعظم واپس جا چکا تھا اور انہیں کسی طرف سے کوئی امداد نہ ملی لہذا رنجیت نے میدان مار لیا۔

جنگ سے تھوڑے دنوں بعد اعظم جسے لڑائی میں کوئی زخم نہیں پہنچا تھا دلی صدمہ سے مر گیا۔ البتہ اس لڑائی میں اس نے جو کردار ادا کیا وہ آج بھی باقی ہے۔ کوئی یوسف زئی افریدی یا خٹک کسی محمد زئی سردار کے وعدے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسے یہی شک رہتا

ہے کہ وعدہ وفا نہیں کیا جائیگا۔ سدوزئی شاہ شجاع جو آزاد منش افریدیوں اور یوسف زئیوں کی قدر کرتا تھا اور ان پر بھروسہ کرتا تھا اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی جو ناکام جدو جہد کی اس کا تذکرہ آج بھی بھلائی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ قبائل بدطینت سدوزئیوں محمود اور اس کے بیٹوں سے واقف نہیں تھے کیونکہ ان سے قبائل کو بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔

اعظم کے ساتھ ساتھ پائندہ خیل کے باقی بیس بھائیوں کا ظاہری اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ اعظم کی جگہ کابل میں دوست محمد نے اور پشاور میں یار محمد نے سنبھال لی۔ یار محمد کے ساتھ تین اور بھائی بھی تھے ان میں سب سے بڑا بھائی سلطان محمد بھی تھا جس کے متعلق مزید تفصیل آگے آئے گی۔ پانچ بھائیوں کا ایک اور گروپ یعنی پردل، کوھان دل، شیر دل، مہر دل اور رحم دل جو غلجی ماں کے بطن سے تھے قندھار پر قابض تھا۔ ھرات میں سدوزئی محمود اور اس کا بیٹا کامران ابھی تک ڈانواڈول اقتدار کے مالک تھے۔

جنگ کے بعد رنجیت سنگھ قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتا ھوا پشاور پہنچا۔ اس نے بالاحصار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اس کے اندر محل کو جہاں چودہ سال پہلے شاہ شجاع نے اتنی شان و شوکت کے ساتھ الفنسٹن کو شرف باریابی بخشا تھا تاخت تاراج کر دیا۔ اس نے قلعہ سے نیچے شاہ لیمان کے باغ میں سرو چنار کے تمام درخت کٹوا دئے اور حوضوں کو گدلا کر دیا۔ رنجیت کی فوج کے گھوڑوں نے ایک مربع میل کے رقبہ میں لگے ھوئے باغ کو جس میں ناشپاتی ناک آڑو اور زرد آلو کے درخت لگے ھوئے تھے اور جن پر پشاور کو ناز تھا روند ڈالا۔ آج بھی معلم اور طلبا بدانتظامی اور ظلم کے اظہار کے لئے سکھ شاھی کا فقرہ استعمال کرتے ھیں۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ شہر کی بڑی مسجد یعنی مہابت خان کو بھی مسمار کیا گیا۔ یہ مسجد اورنگ زیب کے گورنر نے ۱۶۷۰ء میں بنوائی تھی اور کہا جاتا ھے کہ اصل مسجد لاھور کی بادشاھی مسجد کے نمونے کی لیکن اس سے چھوٹی تھی۔ اب سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی جگہ چونے اور مصالح سے اجڑی ھوئی عمارت کو درست کر دیا گیا ھے۔ یہ کام برطانوی عہد

کی ابتدا میں ہوا ہے۔ موجودہ مسجد صاف ستھری ضرور ہے لیکن عام مساجد جیسی ہے۔ پشاور میں کوئی یادگار عمارت موجود نہ ہونے کا اصل سبب ۱۸۲۳ء کی تباہی ہے۔

لیکن رنجیت سنگھ نے پشاور میں قیام نہیں کیا اس نے یار محمد کو جس نے اس کی اطاعت کر لی تھی اپنا نائب بنا دیا اور خود جنوب کی طرف چلا گیا۔ یقیناً اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اس کے چاروں طرف نفرت کا لاوا ابل رہا ہے۔

۱۸۱۸ء میں فتح خان کے قتل اور ۱۸۲۳ء میں جنگ نوشہرہ کے درمیانی عرصہ میں شاہ شجاع نے جو عادتاً بے چین واقع ہوا تھا اپنا تخت واپس لینے کی ایک اور کوشش کی۔ ۱۸۱۶ء میں اسے لودھیانہ میں باعزت پناہ حاصل ہو گئی تھی لیکن اس کا دل کابل میں یا کم از کم پشاور میں پڑا ہوا تھا اور اس نے انگریزوں کے اس خیال کی تردید کی کہ اس نے پناہ مانگی ہے۔ شروع میں اعظم نے اسے امداد کی امید دلائی لیکن بعد میں وہ اس پیشکش سے دست بردار ہو گیا۔ شجاع نے سندھ اور ڈیرہ غازی خان میں اپنی قسمت آزمائی۔ وہ کچھ عرصہ ان دونوں علاقوں پر قابض رہا اور وہاں سے شمال کی طرف بڑھ کر چند روز کے لئے پھر پشاور پر قبضہ کر لیا لیکن اسے پھر نکال دیا گیا اور اس نے تیسری بار خیبر کی پہاڑیوں میں افریدیوں کے پاس پناہ لی، چورہ بڑی سڑک کے قریب ہونے کی وجہ سے ایک بار پھر غیر محفوظ ثابت ہوا اور شجاع سندھ واپس چلا گیا جہاں وہ صرف ایک سال قیام کر سکا۔ حیدر آباد کے سرداروں پر اعظم کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے شجاع کو سندھ چھوڑنا پڑا۔ ۱۸۲۱ء تک شجاع پھر لودھیانہ پہنچ چکا تھا۔

اس عرصہ میں رنجیت پشاور کوہاٹ بنوں اور ڈیرہ‌جات کو برائے نام زیر نگیں لانے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن سکھ اپنے مہاراجہ کی سلطنت کے اس نئے صوبہ پر پوری طرح کبھی غلبہ نہ پا سکے۔ ان علاقوں میں بھی جہاں رنجیت درانی گورنروں کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا اس کی فوجیں قبائل کے خلاف طویل جنگوں میں الجھی رہیں۔ اپنے قبضہ کے ابتدائی چند سال تک وہ سندھ پار کے علاقہ

میں جو اٹک سے شمال مشرق میں پھیلا ہوا ہے۔ اور جس میں اب زیریں ہزارہ شامل ہے امن و امان قائم نہ رکھ سکا۔ جنگ نوشہرہ سے صرف ایک سال بعد ۱۸۲۴ء میں یوسف زئی اور اٹک سے اوپر کی طرف دریا کے دونوں کناروں پر بسنے والے دیگر قبائل اپنے پیرزادہ سید اکبر شاہ کی قیادت میں بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ وہی شخص ہے جس نے ایک سال پہلے پیر سباک کی پہاڑیوں پر قبائل کو رنجیت کی فوج کے خلاف لا کھڑا کیا تھا۔ وہ سادات کے اس مشہور خاندان سے، جن کے مورث اعلیٰ سید علی ترمذی پورے یوسف زئی علاقہ میں پیر بابا کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا مزار پورے قبائلی علاقہ میں سب سے زیادہ مقدس زیارت گاہ ہے۔ سید زمان شاہ جو پیر بابا کی اولاد میں سے تھے انہیں بعد کے زمانہ کے مغل سوات اور بنیر کا با اثر قائد تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کو ہزارہ میں جاگیر اور کمان ملی ہوئی تھی تاکہ وہ اپنی حیثیت برقرار رکھ سکیں۔ یہ اکبر شاہ ان شاہ زمان کے پوتے ہیں۔ سوات بنیر کی سرحد پر رنجیت کے زمانہ سے بیسویں صدی کے اوائل تک جو واقعات پیش آئے ان میں اس سید خاندان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس خاندان نے پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے خلاف قبائل کو منظم کیا اور پھر اپنے علاقہ میں مجاہدین، جنھیں انگریز مصنفوں نے ''ہندوستانی سر پھرے،، قرار دیا ہے، ان کی بستیاں آباد کرائیں۔ وہ دیر کی سرحد سے لے کر ہزارہ میں پکھلی تک پورے علاقہ پر بار بار اپنے اثر سے کام لیتے رہے۔ سید اکبر کے عظیم المرتبت بھتیجے سید عبدالجبار شاہ ابھی تک ستانا میں حیات ہیں (۱) جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ انہیں اپنے خاندان کی روایات کا احساس ہے اس لئے وہ بھی سوات اور بنیر کی قبائلی سیاست میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا خاندان ہے جو کئی پشتوں تک اعلیٰ پیمانہ پر یہ ثبوت دے چکا ہے کہ اس کے افراد ذہن رسا کے مالک بھی ہیں اور مرد میدان بھی۔ یہ دونوں صفات ایسی ہیں کہ جس شخص میں جمع ہوں پٹھان اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

---

(۱) اس کتاب کے معرض تحریر میں آنے سے تھوڑے دن بعد عبدالجبار شاہ نومبر ۱۹۵۶ء میں وفات پا گئے۔

سکھوں کی طرف ہری سنگھ ناوہ تھا جو مثالی سکھ سپاہی تھا۔ وہ اکھڑ لیکن قابل اعتبار بہادر اور مخلص اور رنجیت کے جرنیلوں میں سب سے زیادہ جانباز تھا۔ جب رنجیت ۱۸۲۳ء میں لاہور واپس گیا تو پشاور کی مشکل اور خطرناک کمان ہری سنگھ کے سپرد کر گیا۔

سید اکبر کا قلعہ ستانہ میں تربیلا کے مقابل اس مقام سے چند میل اوپر کی طرف تھا جہاں دریائے سندھ اپنے پہاڑی گہوارہ سے نکل کر چھچھ اور صوابی کے ہموار میدان کے درمیان جہاں بابر گینڈے کا شکار کھیلا کرتا تھا کھلے میدان میں کئی دھاروں میں بٹ کر بہتا ہے۔ دریا کے دونوں کناروں کی زمینیں آج کی طرح اس وقت بھی مندڑ یوسف زئی قبیلہ کی شاخ اتمان زئی کے قبضہ میں تھیں۔ اس قبیلہ نے سید اکبر کی قیادت میں وہ لشکر فراہم کیا تھا جس نے پیر سباک میں رنجیت کی بے قاعدہ فوج کو قریب قریب شکست دے دی تھی۔ ہری سنگھ نے جب یہ دیکھا کہ مقامی آبادی سکھوں کی جانی دشمن ہے اور سندھ پار کے علاقہ کو فوجی طاقت کے بل پر قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہے تو اس نے اپنی تمام توجہ زیریں ہزارہ کے قبائل کو زیر کرنے کی طرف منعطف کر دی۔ یوسف زئیوں کے ہمسایہ قبائل مشوانیوں نے جو تربیلا سے اوپر گنگھر پہاڑ کی گھاٹیوں میں آباد ہیں ہری سنگھ کے ذرائع آمدورفت کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا۔ مشوانیوں اور ان کے برائے نام آقا یوسف زئیوں کو جو کلابٹ میں آباد تھے قابو میں رکھنے کے لئے ہری سنگھ نے موجودہ ہری پور کے قریب ایک قلعہ بنوایا جو آج بھی اسی کے نام سے مشہور ہے۔ ستانہ ہری پور سے بہ مشکل پندرہ میل کے فاصلہ پر تھا لیکن دریا کے پار ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا اس لئے یہ جگہ قبائلیوں کی جنگی کارروائیوں کا مرکز بن گئی۔ ہری سنگھ نے پہاڑیوں کے دہانہ پر نارہ کے مقام پر قبائلیوں پر حملہ کیا لیکن اس کا حملہ روک دیا گیا۔ ہری سنگھ کی فوج کو بھاری جانی نقصان پہنچا اور وہ خود بھی زخمی ہو گیا۔ وہ اپاھج بن کر ایک پہاڑی کے کنارے پڑا تھا کہ اس نے ایک یوسف زئی سے اس کی عالی حوصلگی کا واسطہ دے کر مدد مانگی اور اس کی مدد سے ہری پور پہنچا کیونکہ یوسف زئی کو اس کی جرأت نے متاثر کر لیا تھا۔ اس لڑائی کا حال جب رنجیت کو معلوم ہوا تو وہ ستانہ میں سید اکبر کے قلعہ کو مسمار کرنے کے ارادہ سے دھاوے مارتا ہوا

سرحد پر پہنچا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس جگہ دریائے سندھ اتنا گہرا اور تیز رفتار تھا کہ فوج کے لئے دریا پار کرنا مشکل تھا اس نے اسی پر اکتفا کیا کہ ایک بار پھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے چنانچہ اس نے اپنے فرانسیسی کمانڈر جنرل ایلرڈ کی قیادت میں راستہ نکال لیا اور اس کی شہسوار فوج نے پیہور کے مقام پر بڑی بہادری سے پیر کر دریا پار کیا۔ وہاں سے وہ چکر لگاتا ہوا ٹوپی اور کوٹہ کے راستہ سے جہانگیرہ (۱) ہوتا ہوا اٹک پہنچا۔ اس طاقت کے مظاہرہ کا اس سے زیادہ کوئی اثر نہیں ہوا کہ یار محمد نے جو پشاور میں تھا ایک بار پھر اس سے اپنی وفاداری ظاہر کی۔

اس لڑائی کے نتیجہ میں ایک نئی مصیبت اور ایک نئے جذبہ نے سر ابھارا۔ پٹھانوں میں وہ عجیب اور طاقتور جذبۂ بغاوت پیدا ہوا جو کبھی کبھی جنگل کی آگ کی طرح پورے قبائلی علاقہ میں پھیلا کرتا ہے اور ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی ایک رد عمل ظاہر ہوا لیکن ابھی آگ پوری طرح بجھی نہیں ہے۔ یہ آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے اور ہوا چلنے کی منتظر ہے۔

کئی اعتبار سے یہ نئی تحریک شہنشاہ اکبر کے زمانہ کی روشنیہ تحریک کی یاد دلاتی ہے۔ دونوں تحریکوں نے اسلام کی نئی تفسیر پیش کی۔ دونوں تحریکوں کی بنیاد ایک مصلح کے پیغام پر تھی جو مسلح قبائل کا لیڈر بھی تھا۔ شروع میں دونوں کو بڑی کامیابی ہوئی لیکن آخر میں دونوں تحریکوں کے بانی مارے گئے یا جیسا کہ ان کے ماننے والوں کا کہنا ہے انہوں نے شہادت پائی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دونوں تحریکوں میں بہت بڑا فرق بھی ہے۔ بایزید انصاری نے مغلوں سے جنگ کی تھی۔ مغل کم از کم ظاہر تو یہی کرتے تھے کہ وہ حنفی العقیدہ سنی مسلمان ہیں اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بایزید انصاری کی تحریک کے مذہبی پہلو کو الحاد سے تعبیر کیا گیا۔ (یہاں شہنشاہ اکبر کی آزاد خیالی اور دین الٰہی سے بحث نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے بایزید سے ہمدردی ہو لیکن امور سلطنت کا تقاضا کچھ اور تھا اور

---

(۱) یہ لنڈے دریا کے شمالی کنارے پر ان دیہات میں سے ایک ہے جو خٹکوں نے مغلوں کے زمانہ میں یوسف زئیوں سے چھین لئے تھے۔

وہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو راسخ العقیدہ سنی ہی ظاہر کرتا تھا) اب جو مصلح اٹھا تھا اس کا مقابلہ سکھوں کی نئی طاقت سے تھا اور وہ مظلوم مسلمانوں کو اس ظالم حکمراں کے خلاف منظم کرنے میں کامیاب ہو گیا جو کافر اور بت پرست تھا۔ وہ کٹر عقیدہ کی تبلیغ کرتا تھا جسے اس کے مخالف وہابیت قرار دیتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں نے جن میں راسخ العقیدہ مسلمان بھی شامل ہیں اس مصلح کو صحیح مجدّد تسلیم کیا ہے۔ پرہیزگار مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خداوندتعالیٰ عقائد کی اصلاح اور صحیح راستہ پر مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ہر صدی میں ایک مجدّد بھیجتا ہے۔

اس مجدد کا نام سید احمد شاہ تھا۔ اس نام کو سید اکبر شاہ کے نام سے خلط ملط نہیں کرنا چاہئیے جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے البتہ دونوں کے واقعات کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ احمد ہندوستانی تھے اور بریلی میں پیدا ہوئے تھے اسی لئے وقائع نگار انہیں احمد بریلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سید اکبر جیسا کہ ہمیں معلوم ہے بنیر کے پیر بابا کی اولاد میں سے تھے۔ یہ وہ خاندان ہے جو عرصہ سے یوسف زئیوں میں آباد ہے۔ سید احمد بریلوی بدنام زمانہ امیر خان کے ساتھیوں میں سے تھے جو وسطی ہند میں پنڈاریوں کے خلاف انگریزوں کی طرف سے لڑنے والی فوج کا لیڈر تھا۔ جب اس مہم کے بعد امیر خان کی فوج کو منتشر کر دیا گیا اور امیر خان کو راجپوتانہ میں ریاست ٹونک (۱) کا نواب تسلیم کر لیا گیا تو سید احمد کی ملازمت ختم ہو گئی۔ وہ دہلی چلے گئے جہاں ان کے زہد اور پرہیزگاری نے بہت سے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا لیا ان میں بہت سے علما بھی شامل تھے۔ سید احمد توحید پر بہت زور دیتے تھے اور اس زمانہ میں جو بدعتیں رائج ہو گئی تھیں انہیں چھوڑ کر اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کرنے کی بجائے صرف قرآن کے احکام کی تعمیل کی جائے۔ بہت سے پڑھے لکھے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے اور کہا جاتا ہے کہ عوام پر تو ان کی تبلیغ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ دہلی کے درزی تک سلے ہوئے کپڑے کے ساتھ بچی ہوئی کترنیں بھی گاہک کو واپس کر دیتے تھے۔ سید احمد فریضۂ حج کی ادائگی پر بھی بہت زور دیتے تھے اور اسے اصلاح کی ابتدا قرار دیتے تھے۔ انہوں

(۱) یہ وہ ٹانک نہیں ہے جو وزیرستان کی سرحد پر واقع ہے۔

نے حجاز کے لئے جہاز پر سوار ہونے کے ارادہ سے ۱۸۲۲ء میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا جو بڑا کارنامہ ثابت ہوا۔ انہوں نے چار سال عرب میں گزارے اور دھلی واپس آ کر مسلمانوں کو کفار کے خلاف جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔

۱۸۲۲ء میں وہ دھلی سے روانہ ہوئے اور تھوڑے عرصہ ٹونک میں اپنے پرانے آقا امیر خان کے یہاں قیام کرنے کے بعد سندھ کے راستہ قندھار پہنچے۔ اس وقت قندھار پر کوھان دل اور دوسرے پائندہ خیل بھائیوں کی حکومت تھی انہوں نے سید احمد کی حوصلہ افزائی نہیں کی چنانچہ وہ شمال کی طرف چل پڑے اور غلجی علاقہ سے ہوتے ہوئے ۱۸۲۷ء میں پشاور پہنچے۔ ایسا معلوم ہوتا ھے کہ وہ پشاور میں پائندہ خیل بارک زئی گورنر یار محمد کی ھیر پھیر کی باتوں سے بڑے بد دل ہوئے۔ یار محمد دو مرتبہ رنجیت سنگھ کی اطاعت کا اعلان کر چکا تھا۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ یوسف زئی علاقہ کے میدانوں اور پہاڑیوں میں بغاوت کی آگ ابھی تک خوب سلگ رھی ھے چنانچہ وہ لنڈائے دریا اور سمہ عبور کرنے کے بعد پنج تار پہنچے جو صوابی کے شمال میں خدو خیل کی پہاڑیوں میں ایک سر کردہ یوسف زئی ملک فتح خان کا قلعہ تھا۔ یہاں سید احمد نے اپنے پرھیزگار ساتھیوں کی جو بعد میں مجاھدین کہلائے بستی آباد کی۔ انگریز مصنف انہیں ''ھندوستانی سر پھرے،، کے نام سے یاد کرتے ھیں۔

جس عقیدہ کی بنا پر لوگ سید احمد کے مرید بنے وہ واضح نہیں ھے۔ ان کے مخالفوں کا کہنا ھے کہ جب سید احمد عرب میں تھے تو وہ وھابی ہو گئے تھے۔ وھابی حنبلی سنی ہوتے ھیں۔ لیکن ان کے حامیوں کا کہنا ھے کہ وہ حنفی عقیدہ پر قائم رہے۔ ان کے پیغام کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے دین کو اس طریقہ سے پیش کیا جو ایک مجدد ھی کر سکتا ھے۔ یہ بحث عالموں کے لئے ھے اور اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ سید احمد کا عقیدہ خواہ کچھ ھی کیوں نہ ہو لیکن ان کی تبلیغ کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔ وھی قبائل جنھیں اس بات پر فخر تھا کہ انہوں نے اپنی یاد میں برائے نام اطاعت کے سوا مغلوں اور درانیوں سمیت کسی کی فرماں برداری قبول نہیں کی میدان جنگ میں کفار سے شکست کھا چکے تھے۔ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو پٹھانوں کی برداشت سے باھر تھا۔ قبائل

کا یہ دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی تھا کہ ان کی شکست کا سبب بارک زئی سرداروں اور ان کی کابلی فوج کی کاہلی تھی۔ ھری سنگھ اور سکھ فوج کے حملوں اور لوٹ مار نے پٹھانوں کے غصہ کو اور بھڑکا دیا۔ اس وقت ایک نئے پیغام اور ایک نئے لیڈر کی ضرورت تھی۔ پٹھانوں نے سید احمد اور ان کے غازیوں کو اپنا نجات دھندہ سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی آواز پر بڑے جوش کے ساتھ لبّیک کہا۔

قبائل مذہبی جوش اور حب الوطنی کے اس جذبہ سے سرشار ہو گئے جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ غاصبوں کو نکال باہر کیا جائے چنانچہ یوسف زئی اور خٹک علاقہ کے مختلف دیہات سے غیر منظم سپاہیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں آ کر جمع ہونے لگیں۔ سید احمد کے ہندوستانی مرید جن کی تعداد نئی بھرتی کی وجہ سے قریباً ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی ایک ایسا مرکز تھے جس کے گرد نئی فوج کو منظم کیا گیا۔ اس کے علاوہ سید احمد کو خفیہ طور پر پشاور کے بارک زئی سرداروں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ان سرداروں کو جو کبھی خود مختار شہزادے تھے رنجیت سنگھ نے باج گزار گورنر بنا رکھا تھا۔

سید احمد نے سب سے پہلے سکھوں کی اس طاقتور فوج کا سامنا کیا جو بدھ سنگھ سندھانوالیہ کی سرکردگی میں اکوڑہ بھیجی گئی تھی۔ سکھ کمانڈر نے دانشمندی سے کام لے کر اکوڑہ اور جہانگیرہ کے درمیان شیدو کے مقام پر مورچے بنا لئے تھے۔ جہاں سے سکھ فوج قبائل کے پرجوش حملے روکتی رہی لیکن اسے سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا یہاں تک کہ جب لڑائی زوروں پر تھی تو خود بدھ سنگھ بھی مارا گیا۔ سید احمد نے فتح کا اعلان کر دیا اور یار محمد سے جو پشاور میں تھا یہ وعدہ لے لیا کہ وہ یوسف زئی علاقہ کا خیال رکھے گا اور مالیہ وصول کرنے کے لئے اس علاقہ پر چڑھائی نہیں کرے گا۔ ایک سال بعد (۱۸۲۹ء میں) سید احمد نے یہ الزام لگا کر کہ پشاور کے گورنر نے انہیں زہر دینے کی کوشش کی ہے پشاور پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں یار محمد مارا گیا لیکن اتفاق سے اس وقت پشاور میں فرانسیسی جنرل ونتورا کی قیادت میں سکھوں کی ایک فوج موجود تھی جس نے پشاور پر سید احمد کا قبضہ نہ ہونے دیا اور یار محمد کا چھوٹا بھائی سلطان محمد خان شہر

پر قابض رہا۔ حسب سابق اس موقع پر بھی ونتورا رنجیت سنگھ کے لئے ایک اعلیٰ نسل کی گھوڑی لیلیٰ حاصل کرنے آیا تھا۔ یہ گھوڑی اسی نسل کے ایک عمدہ گھوڑے کلہار کا جوڑ تھی جو مہاراجہ نے پشاور میں بارک زئی برادران سے حاصل کیا تھا۔

اس کے بعد سکھ پسپا ہوکر دریائے سندھ کے مشرق میں چلے گئے۔

سید احمد دریائے سندھ عبور کر کے ہزارہ کی پہاڑیوں میں پہنچے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں کو سکھوں کے خلاف بھڑکا کر سکھوں کی ایک فوج پر حملہ کر دیا جس کی قیادت ہری سنگھ اور ایک اور فرانسیسی جنرل ایلرڈ کے ہاتھ میں تھی۔ اس لڑائی میں سید احمد کو شکست ہوئی لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور انہوں نے دریائے سندھ عبور کر کے پشاور پر ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ بارک زئی سردار ہار گیا اور ۱۸۳۰ء کے موسم گرما میں پشاور پر دو ماہ تک سید احمد اور ان کے غازیوں کا قبضہ رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر سید احمد طاقت کے نشہ میں سرشار ہو گئے۔ انہوں نے خود مختار بادشاہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے نام کا سکہ تیار کیا جس پر احمد عادل شمشیر زن حامی دین کی عبارت کندہ تھی۔

پہلی نظر میں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ سید احمد قبائل خاص طور پر یوسف زئی جیسے جنگجو قبیلہ کو متاثر کرنے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ آخر وہ بھی نشیبی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ اس علاقہ کے باشندوں کو پٹھان حقارت کے ساتھ ہندکی کہتے ہیں (اس لفظ سے ہندو مراد نہیں بلکہ ہندوستان یا پنجاب کا مسلمان مراد ہے) یہ بڑے تعجب کی بات تھی کہ پہاڑی علاقہ کے وحشی یوسف زئی قبائل بھی ان کے مرید ہو گئے البتہ یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ سمہ میں بسنے والے منڈڑ یوسف زئیوں کو ان کے عقائد پسند آئے ہوں گے۔ آخر سید احمد ان لوگوں تک کس طرح پہنچے۔

انہیں یہ مرتبہ اور ہر دلعزیزی قریب قریب تمام ترستانہ کے سید اکبر کی دوستی اور حسن سلوک کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ سید اکبر نہ صرف قبائلی جنگوں میں قابل اعتماد قائد ثابت ہو چکے تھے بلکہ اس

سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ پیر بابا کی اولاد میں سے تھے جو ان قبائل کا پیرخانہ ہے۔ یہ ہندوستانی زہدو پرہیزگاری میں بڑی شہرت لے کر آیا تھا اور اسے چار سال حجاز میں بسر کرنے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ یقیناً سید اکبر ان کے خلوص سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ اکبر اور ان کے درمیان خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ دونوں سید تھے بلکہ حالات کچھ اور ہوتے تو یہی بات باہمی رقابت کا سبب بن سکتی تھی۔ دونوں حضرات اس بات پر تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حریف نہیں بنے۔ دونوں ظالم سکھوں سے نفرت کرتے تھے۔ اسی نفرت کی بنا پر دونوں نے باہمی رقابت ختم کر دی اور واحد مقصد حاصل کرنے کے لئے متحد ہو گئے۔ لیکن دونوں میں اور بھی صفات ہوں گی جو ایک دوسرے نے پہچان لی ہوں گی سب سے بڑی صفت بے غرضی ہوتی ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتی ہے۔

ایک لحاظ سے سید اکبر نووارد سید احمد کے مربی تھے۔ لیکن سید اکبر کے اخلاف نے جو کچھ بتایا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سید اکبر اور ان کے چھوٹے بھائی عمر شاہ نے اپنے وطن پر فخر کو بالائے طاق رکھ دیا اور سید احمد کے رفیقوں کی حیثیت سے ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے پر تیار ہو گئے۔ وہ اتنی عظمت کے مالک تھے کہ انہوں نے سید احمد کی اطاعت قبول کی اور اپنے مریدوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ سید احمد مظلوموں کو ایک نئے ظالم سے نجات دلانے آئے تھے اور سید اکبر وغیرہ نے ان میں بزرگی کی چمک ضرور دیکھی ہو گی اسی لئے وہ خوشی خوشی ان کی اطاعت پر کمر بستہ ہو گئے۔

تھوڑے دنوں تک سب ایک مقصد کے لئے متحد رہے۔ پھر رفتہ رفتہ باہمی چشمک پیدا ہوئی۔ یہ اختلاف سید احمد اور سید اکبر میں نہیں بلکہ علما اور قبائلی سرداروں میں پیدا ہوا۔ ذاتی مفاد ایمان پر غالب آگیا اور سید احمد کی کوتاہ اندیشی سے ان کے قبائلی مریدوں کو مخالفت کا موقع مل گیا۔ جہاد کے اخراجات پورے کرنے کے لئے سید احمد نے عشر نافذ کیا تھا اور ابتدا میں اس اقدام کی کوئی مخالفت نہیں کی گئی کیونکہ قبائل کے نزدیک ایک مذہبی پیشوا اس قسم کا محصول لگانے کا

مجاز تھا۔ لیکن جب سید احمد نے یہ تبلیغ شروع کی کہ تمام بالغ لڑکیوں کی فوری طور پر شادی کر دی جائے اور یوسف زئی خوانین اپنا یہ دستور بدل دیں کہ بیٹیاں اور بہنیں بھاری جہیز کے عوض صرف دولت مند لوگوں سے بیاہی جائیں، اس طرح سید احمد نے قبائل کے ایک بہت بڑے اصول کی جڑ کاٹنے کی کوشش کی۔ اس معاملہ میں یوسف زئی قبیلہ کا دستور دوسرے قبائل کے مقابلہ میں بڑا سخت ہے۔ بعض لوگ اس کا سبب لالچ بتاتے ہیں لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے جو کسی بیرونی کی سمجھ میں مشکل ہی سے آ سکتی ہے کہ ایک قبائلی شادی ایک خاندان کی ننگ و حیا اتار پھینکنے کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ بابر کا معاملہ ایک استثنیٰ تھا جس سے اصول کا ثبوت ملتا ہے۔ ورنہ ایک یوسف زئی اپنی بیٹی یا بہن کی شادی اپنے قبیلہ، یہاں تک کہ قبیلہ کے خاص گھرانوں سے باہر نہیں کراتا، اور یہ دستور تھا کہ ہونے والے شوہر کے خاندان سے بھاری جہیز طلب کیا جاتا تھا۔ جب سید احمد پر یہ الزام لگایا گیا جو بہت سے لوگوں کے خیال میں انصاف پر مبنی نہیں تھا کہ وہ اپنے ضرورت مند ہندوستانی مریدوں کو دوشیزائیں دلوا رہے ہیں تو لوگوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے سید احمد کے خلاف سازش کی۔ نومبر ۱۸۳۰ء میں انہوں نے ایک مقررہ خراج کے عوض پشاور سلطان محمد کے حوالہ کیا اور خود چند مریدوں کی معیت میں ہزارہ روانہ ہو گئے جہاں وہ چند ماہ تک اکا دکا جھڑپوں میں مصروف رہے۔ آخر مئی ۱۸۳۱ء میں سکھوں کی ایک فوج اچانک سر پر آ پہنچی اور اس نے سید احمد کو بالاکوٹ کے مقام پر جو وادی کاغان کے دہانہ پر واقع ہے شہید کر دیا۔

اس کہانی کا انجام بڑا اندوہناک ہے۔ جب سید احمد ہزارہ روانہ ہوئے تھے تو وہ یوسف زئی علاقہ کے بیشتر دیہات میں اپنے نائب چھوڑ گئے تھے۔ یوسف زئی سمہ کے وسط میں کڑہ مار کی تنہا پہاڑی نظر آتی ہے جس پر دیودار کے درخت کھڑے ہیں۔ یہ پہاڑی مردان میں گائڈ میس (GUIDE MESS) کے باغ کی بڑی خیابان سے صاف نظر آتی ہے۔ یہ ایک مقدس مقام ہے اسی لئے وہاں درختوں کا سایہ ہے کیونکہ اس پہاڑی پر درخت کی ذرا سی شاخ تک کاٹنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی سال موسم سرما کی ایک رات کو اس پہاڑی پر ایک شعلہ نمودار ہوا اور اس اشارہ پر سید احمد کے نائبوں کو چن چن کر شہید کر دیا گیا۔ تیس سال پہلے

یوسف زئی علاقہ کے ایک دیہاتی شاعر امان اخوند نے اس موضوع پر ایک گیت لکھا تھا جو میں نے لوگوں کو گاتے سنا ہے۔ یہ گیت جو فخرو مباہات اور غم و اندوہ کا عجیب مجموعہ ہے سید احمد کی یاد میں لکھا گیا تھا جسے قبائل ایک عرصہ تک اپنا پیشوا مانتے رہے اور پھر انہوں نے رو گردانی کر لی۔ لیکن سید احمد نے مجاھدین کی جس جماعت کی بنیاد ڈالی تھی وہ بعد میں کافی دنوں باقی رھی اور خود سید احمد کی یاد کو بھی پیر بابا کے خاندان کے سادات نے جو اس علاقہ میں ان کے سب سے بڑے مرید تھے تازہ رکھا۔

شیر شاہ اور اس کے جانشینوں کی طرح سید احمد کے مختصر عروج کی کہانی بھی پٹھانوں کے قبائلی نظام کی طاقت اور کمزوری کا آئینہ ہے۔ ایک قائد اٹھتا ہے اور ایک مقصد کے لئے جس کے آگے سب کچھ فراموش کر دیا جاتا ہے قبائل کو متحد کر لیتا ہے۔ تھوڑے دنوں تک باھمی چشمک کی نوبت نہیں آتی اور ہر شخص ایک مقصد کے لئے جان دینے کو تیار نظر آتا ہے۔ افراد اس مقصد عظیم کی خاطر جانیں تک قربان کرنے کو تیار نظر آتے ھیں اور ذاتی نقصان کی کوئی پروا نہیں کرتے ہر طرف قربانی کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اب کوئی رکاوٹ حائل نہیں رہے گی اور کامیابی یقینی ہے۔ پھر قائد تکبر کا شکار ہو جاتا ہے۔ جو جذبہ اتحاد کا باعث تھا وہ سرد پڑ جاتا ہے اور رشک و حسد سر ابھارتے ھیں۔ حاصل کئے ہوئے مقصد کو برقرار رکھنے کے لئے جس مسلسل جدو جہد اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے وہ قبائل کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جتنی کامیابی حاصل ہو چکی ہوتی ہے اس پر بھی پانی پھر جاتا ہے قائد پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور اسے مردود قرار دے دیا جاتا ہے۔

”ماضی میں پٹھان ھند کے بادشاہ تھے
اور اب بھی وہ میدان عمل میں مغلوں سے آگے ھیں
لیکن پٹھان اتحاد سے واقف نہیں ھیں اور انہوں نے
اتحاد کے متعلق خدا کے حکم کی نافرمانی کی ہے اسی لئے
انہیں ادبار نصیب ہوا
اے اللہ ! پٹھانوں کو اتحاد کی نعمت عطا کر
یہ دعا قبول ہو جائے تو خوشحال قبر سے جوان ہو کر اٹھے گا“۔

فصل نوازدھم

دوست اور پشاوری سردار

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جب یار محمد ان زخموں کی وجہ سے 'جو اس، نے ۱۸۲۹ء میں سید احمد کے خلاف جنگ میں کھائے تھے فوت ہو گیا تو اس کا بھائی سلطان محمد پشاور اور اس کے باج گزار علاقوں کا سردار بن گیا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی پیر محمد اور سید محمد بھی اس کے ساتھ تھے۔ اور یہ تینوں پائندہ خیل بارک زئی پشاوری سرداروں کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان سرداروں اور دوست محمد خان کے درمیان امتیاز ضروری ہے جو اس وقت تک بلا خوف تردید اعظم کی جگہ کابل پر قابض ہو چکا تھا اور غلجی ماں کے ان بیٹوں سے بھی امتیاز ضروری ہے جو قندھار پر قابض تھے جن میں سے ایک کا نام کوھان دل اور دوسروں کے نام میں بھی لفظ ' دل ، شامل تھا۔ بعد میں یہی پشاوری سردار مصاحبان خاندان کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔ مصاحب کا مطلب درباری ہے۔ اس کے بعد انہیں سلطان محمد کے بیٹے یحییٰ خان کے نام پر یحییٰ خیل بھی پکارا جانے لگا۔ سلطان محمد نہ صرف اس وجہ سے ناقابل فراموش ہے کہ اس نے سکھوں کے دور میں پشاور کے اسٹیج پر نمایاں کردار ادا کیا تھا بلکہ اس لئے بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ موجودہ افغان حکمران خاندان کا مورث اعلیٰ ہے۔ نادر خان جو موجودہ خاندان کا پہلا حکمران اور افغانستان کے موجودہ بادشاہ کا والد تھا سلطان محمد کا پر پوتا تھا۔ پشاور اور قندھار کے تمام سردار عمر میں دوست محمد خان سے بڑے تھے جو ان سے سبقت لے کر پایۂ تخت کابل پر قابض ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے بڑے بھائی اس سے حسد کرنے لگے تھے۔ دوست کی کامیابی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ فتح خان نے اس میں خود اعتمادی

پیدا کر دی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اسے قزلباش محافظ دستہ کی حمایت حاصل تھی کیونکہ اس کی والدہ قزلباش تھیں۔ اسے ابتدا میں یہ فوائد حاصل تھے جن کی بنیاد پر اس نے شاندار عمارت بنائی۔ اس عمارت کی مضبوطی کا سبب خود اس کا استقلال تھا۔ اس کے مقابلہ میں اس کے بھائی مستقل مزاج نہیں تھے۔

دوست محمد نے اس خیال سے کہ اس کے بھائیوں کے دل میں حسد کی آگ نہ بھڑکے شاہ کا لقب اختیار کرنے سے گریز کیا تھا۔ وہ بخارا کے منگیت سرداروں کی طرح اپنے آپ کو امیر کہلانے پر قانع رہا جو ایک مبہم لفظ ہے اور بادشاہ اور سردار دونوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بڑے بھائیوں خاص طور پر ان بھائیوں کی نیت کچھ اور تھی جو پشاور میں تھے۔ وہ دوست محمد کی اطاعت خوشی سے قبول کرنے کو تیار نہ تھے حالانکہ کابل کے عملی حکمران کی حیثیت سے وہ اس کا مستحق تھا۔ افغان بڑی پرانی باتیں یاد رکھتے ہیں۔ اس رشک و حسد کا ایک صدی بعد رونما ہونے والے واقعات پر اثر پڑا جب نادر خان جو سلطان محمد کی اولاد میں سے تھا دوست محمد کے خاندان کے آخری بادشاہ امان اللہ کے خالی کئے ہوئے تخت پر بیٹھ گیا۔

انگریز مصنفوں نے سلطان محمد اور اس کے کارناموں کا جو جائزہ پیش کیا ہے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ جس انگریز کو سب سے پہلے اس سے واسطہ پڑا اور جس نے اسے پسند کیا وہ الیکزینڈر برنس تھا جو پشاور کے راستہ بخارا جاتے ہوئے پہلی مرتبہ افغان اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ برنس ۱۸۳۲ء کے موسم بہار میں ایک ماہ تک موسم سرما کے دارالحکومت میں سلطان محمد خان کا مہمان رہا۔ اس نے اپنی کتاب سفر نامہ بخارا میں اہل پشاور کی دلچسپ صحبتوں، پرفضا دیہات، اور سلطان محمد اور اس کے بھائیوں کی مہمان نوازی کی تعریف میں طویل عبارتیں لکھی ہیں۔ اس نے اس علاقہ کے رواج کے مطابق اپنے نام کی ایک مہر بھی کندہ کرائی جس پر 'سکندر برنس' درج تھا۔ وہ موسم بہار میں اس علاقہ کی شادابی، ایک پکنک کے موقع پر شفتالو کی کلیوں سے اپنے لادے جانے، اپنے مہمانوں کی بے تکلفی اور دوستی اور افغانوں کی سادگی اور آزادروی کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتا ہے اور اس کی تحریر

خاصی دلچسپ ہے۔ لیکن الفنسٹن کے مقابلہ میں برنس گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی عبارت توازن اور پس منظر سے مبرا ہے اور اس کے الفاظ اور فقروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندہ دلی کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ وہ پشاور کی خواتین کے متعلق لکھتا ہے ''چہرے پر نقاب پڑی ہوئی ہوتی ہے اور بہت سے حسین چہرے دیکھے بغیر شرما جاتے ہیں... عورت کو اشارہ کرنے کے شبہ پر قتل کر دیا جاتا ہے،،۔ یا ایک موقع پر جب سردار مقدموں کا فیصلہ کے لئے ایک گاؤں میں گیا تھا اور وہ بھی سردار کے ساتھ تھا، وہ لکھتا ہے ''جب میں نے بگڑی ہوئی نعشوں کو دیکھا اور شوہر کی زبانی اس بیوی کے قتل کا جواز سنا جس کے بطن سے اس کے تین بچے تھے تو میرا خون سرد پڑ گیا۔ سردار نے اس گاؤں سے گزرتے ہوئے مختصر سماعت کے بعد مقدمہ کا جو فیصلہ کیا وہ اس اندوہناک منظر کا معمولی حصہ تھا،،۔

یہ الفاظ مصنف کی اپنی کمزوریوں اور اس کے انجام کی پیش گوئی ہیں۔ چھ سال اسی طرح گزر گئے۔ میسن (۱) کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب یہی سکندر کابل میں دوست محمد کے دربار میں ایلچی تھا تو اس کی رنگ رلیوں کی وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ جن لوگوں نے الفنسٹن کا نام اور شہرت سنی تھی انہیں توقع تھی کہ انگریز ایلچی وقار کا ثبوت دے گا۔ ایسے شہر میں جہاں کینہ اور عناد عام بات ہے اس ایلچی کے گھر میں گانے بجانے والوں اور سیہ چشم دوشیزاؤں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ ان خطرات کو بالکل بھول گیا تھا جو اسے چند سال پہلے پشاور میں داد عیش دیتے ہوئے پیش آئے تھے۔ وہ رات ان رنگ رلیوں میں بسر کرتا تھا اور دن کے وقت منکسرالمزاج بن جاتا تھا۔ وہ دوست محمد کے دربار میں معمول سے زیادہ ادب و احترام کا مظاہرہ کرتا تھا اور بڑی خاکساری کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا تھا اور امیر کو ہمیشہ غریب نواز کہہ کر پکارتا تھا۔ یہاں تک کہ شہر کے بازار میں اس کا اپنا نام غریب نواز خان

---

(۱) میسن ایک سیاح اور ماہر آثارقدیمہ تھے۔ انہیں آکلینڈ نے ان کی مرضی کے خلاف کابل میں برطانوی خبرنگار مقرر کر دیا تھا۔ دوست محمد اور افغان سردار ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی تحریریں بڑی دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہیں۔

مشہور ہو گیا۔ اس منکسرالمزاجی کو بالائے طاق رکھ کر وہ یکایک آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور اس کی باتیں سننے والے اس بات پر حیرت کرتے تھے کہ یہ شخص بھی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو آج دنیا پر حکومت کر رہی ہے۔

سکندر برنس نے کبھی اپنے ملک کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور اس کے غلط اقدامات کا نتیجہ پہلی افغان جنگ کی شکل میں نمودار ہوا۔ لیکن آخر میں اس نے بھی اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ جب اس کا موت سے سامنا ہوا جس سے وہ ہمیشہ ڈرتا آیا تھا اور یہ موت بھی ایک مشتعل ہجوم کے ہاتھوں واقع ہوئی اس ہجوم میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی بیویوں کو اس نے ورغلایا تھا تو اس نے بہادری کے ساتھ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر موت کا سامنا کیا۔

بابر کی طرح سکندر بھی مناظر کا نقشہ بڑے موثر طریقہ سے کھینچتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ جب اس کی جماعت پشاور جاتے ہوئے پبی اور پیر پائی کے درمیان کھلے میدان میں پہنچی تو وہ اپنی روح میں بالیدگی محسوس کرنے لگا۔ فضا بنفشہ اور دوسرے پھولوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ اور وہاں کے سبزہ کو دیکھ کر اسے اپنا دورافتادہ وطن یاد آ گیا۔ اس وقت تک پشاور کے آس پاس کے باغیچوں کو سکھ تباہ کر چکے تھے لیکن پھر بھی ناگمان کے کنارے اور دوآبہ میں کچھ پرفضا مقامات باقی تھے۔ نوروز کے موقع پر جو قریباً ۲۵ مارچ کو منایا جاتا ہے سکندر کو شب قدر کے قریب ایک باغ میں جہاں تمام درخت شگوفوں سے لدے ہوئے تھے ایک ضیافت میں مدعو کیا گیا۔ میزبان کے چھوٹے بھائی پیر محمد نے ایک چبوترے پر جو پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا مہمان کو لا بٹھایا۔ چبوترے پر قالین بچھے ہوئے تھے مہمانوں کے بیٹھنے سے پہلے ڈالیاں ہلا دی گئیں جس سے وہ شفتالو اور ناک پھولوں کے انبار میں دب گئے۔ وہاں گانے والے بھی تھے جنھوں نے رباب پر پشتو اور فارسی گانے سنائے اور سردار کے بچے جو مٹھائی کے ڈھیر کے پاس کھیلتے پھر رہے تھے برف کی طرح پھول ایک دوسرے پر پھینک کر مصنوعی لڑائی لڑ رہے تھے۔ سکندر کا کہنا ہے کہ ”میں نے موسم بہار میں پشاور سے زیادہ پرفضا مقام کوئی نہیں دیکھا یہاں کی آب و ہوا باغات اور پھول

دل و دماغ پر جادو کر دیتے ھیں اور ان تمام باتوں پر مستزاد یہ کہ ھماری خوش قسمتی سے لوگ بھی مہمان نواز ھیں،،۔

وہ پشاور کے سردار سلطان محمد کے متعلق لکھتا ھے ''اس کا قد ذرا لمبا اور رنگ پختہ ھے میرا خیال تھا وہ جاھل افغان ھو گا لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور شریف النسل ھے جس کی بے تکلفی اور حسن اخلاق نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ ایسی شخصیت ھے جو سوجھ بوجھ سے زیادہ حسن اخلاق کا مالک ھے۔ وہ اپنے تمام معاملات خود ھی نپٹاتا ھے۔ وہ ایک بہادر سپاھی ھے۔۔ لیکن اس کے محل میں ھمارا قیام تکلیفوں سے خالی نہ تھا۔ اور ھمیں کوئی موزوں بہانہ بنا کر وھاں سے چلے آنے کیلئے باقاعدہ منصوبہ تیار کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ سلطان محمد کی اپنے بھائی دوست محمد سے جو کابل کا سردار ھے دشمنی تھی اور وہ ھمیں اس بات پر رضامند کرنا چاھتا تھا۔ کہ ھم دوست محمد سے ملے بغیر چپکے سے کابل سے گزر جائیں،،۔ اور اس سے آگے بڑے پتہ کی بات کہی ھے '' پھر سکھوں کا تذکرہ چھڑ گیا اور میں سلطان محمد کی نرم مزاجی سے بڑا محظوظ ھوا وہ رنجیت سنگھ کے متعلق کھل کر باتیں کرتا رھا پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا کاش کوئی ایسی صورت پیدا ھو جائے کہ وہ اپنے بیٹے کو بطور یرغمال لاھور میں رکھنے کی ذلت سے بچ جائے۔ درمیان میں روسیوں کا بھی ذکر آگیا اور پارٹی کے ایک ممبر نے جو ایرانی تھا دعویٰ کیا کہ اس کا ملک روسیوں کے اثر سے بالکل آزاد ھے۔ سلطان محمد نے بڑی خوش اخلاقی سے جواب دیا کہ یہ خود مختاری ایسی ھی ھے جیسے وہ سکھوں کے اثر سے آزاد ھے۔ مقابلہ کی طاقت نہیں اس لئے صلح پر راضی ھیں۔

پندرہ سال بعد ۱۸۴۷ء میں جب ھینری اور جان کا بڑا بھائی جارج لارنس سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد پشاور آیا تو سلطان محمد خان کے متعلق بہت سی باتیں اس کی نظر سے گزریں۔ سکھوں کی دونوں جنگوں کے درمیانی عرصہ میں سکھ ریاست قائم رھی البتہ یہ ریاست ھندوستان کی برطانوی حکومت کے تحت آگئی تھی اور لاھور میں مہاراجہ کے دربار میں انگریز ریزیڈنٹ مقرر ھو گیا تھا۔ کشمیر نقد رقم کے عوض ڈوگرہ خاندان کے بانی جموں کے گلاب سنگھ کے حوالہ کیا جا چکا تھا شمال

مغربی سرحدی اضلاع جو قریب قریب سکھوں کی پہلی جنگ کا سبب بنے تھے اور جہاں افغانوں اور سکھوں میں اس وقت بھی شدید کشیدگی تھی سکھ دربار ھی کی نگرانی میں رھے البتہ لاھور میں برطانوی ریزیڈنٹ کے اسسٹنٹ اس علاقہ کے نظم و نسق اور امن و امان کے قیام میں مدد دیتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ھے جب جارج لارنس، ایبٹ ایڈورڈز، نکلسن اور دوسرے انگریز پٹھانوں کے علاقہ میں آئے۔ جارج لارنس نے اپنا عہدہ سنبھالتے ھی سکھ دربار کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ سلطان محمد کو لاھور سے پشاور واپس جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ لاھور میں قریباً سات سال یرغمال کی حیثیت سے گزار چکا ھے۔ پشاور پہنچ کر سلطان محمد خان وزیر باغ میں اترا جو اس کے بڑے بھائی فتح خان نے ۱۸۱۸ء سے پہلے اپنی وزارت کے عہد میں بنوایا تھا۔ اور اس نے باغ میں ایک بڑی خوبصورت فرودگاہ بنوائی جہاں اس نے اپنی بیویوں اور بہت بڑے کنبہ کو ٹھیرایا۔ اس فرودگاہ کے آثار اب بھی باقی ھیں لیکن بہت بوسیدہ حالت میں ھیں۔

سلطان محمد بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کرتا رھا کہ وہ لارنس کا فرماں بردار ھے۔ جب ۱۸۴۸ء میں ملتان میں ایگنیو (AGNEW) اور اینڈرسن (ANDERSON) کے قتل کی بنا پر سکھوں کی دوسری جنگ کی نوبت آئی تو سلطان محمد نے ریزیڈنٹ سے ایک طویل ملاقات کی اور یہ یقین دلایا کہ وہ برطانوی حکومت کی حمایت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا کیونکہ اسی حکومت نے اسے قید سے رھا کرایا ھے۔ وہ اس بات کے لئے بے چین نظر آتا تھا کہ اظہار تشکر زبان سے نہیں بلکہ عمل سے کرے۔ بعد میں اس نے شمال میں سکھ جنرل چھتر سنگھ سے خط و کتابت کی اور جارج لارنس کو سکھوں کے ھاتھ قید کرا دیا۔ اس کے عوض پشاور دوبارہ اس کے حوالہ کر دیا گیا۔ لارنس کو سلطان محمد پر اس قدر اعتماد ھو گیا تھا کہ اس نے سلطان محمد سے درخواست کی کہ اس کے بیوی بچوں کو بحفاظت پشاور سے ھندوستان پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے لیکن بعد میں لارنس کو معلوم ھوا کہ چونکہ اس نے سلطان محمد پر بڑا احسان کیا تھا۔ جس پر سلطان محمد کو اس کا مرھون احسان ھونا چاھئے تھا سلطان محمد لارنس کے سامنے آنے سے کترانے لگا۔ جب لارنس نے اسے اس کے وعدے یاد دلائے تو سلطان محمد نے ھمیشہ کی طرح لمبے چوڑے زبانی

دعوے دھرائے۔ جیسا کہ برنس محسوس کر چکا تھا ظاہرداری سلطان محمد کی سب سے بڑی صفت تھی۔ اس کے علاوہ لارنس کی بیوی کو ہندوستان نہیں پہنچایا گیا بلکہ واپس لا کر اس کے شوہر سمیت سکھوں کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور آخیر میں سلطان محمد خود بھی سکھوں سے جا ملا۔

یہ کوئی لطیفہ نہیں ہے۔ اگر سلطان محمد اپنی افغان قوم کے لئے اس چالاکی سے کام لیتا تو اسے حب الوطنی پر محمول کیا جاتا کیونکہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ لیکن وہ محب وطن نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ترپ کا پتہ سکھوں کے ھاتھ میں ہے اور اس کا اپنا مفاد اسی میں ہے کہ وہ سکھوں کے اشارے پر چلے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس شخص اور پشاور میں رہنے والے اس کے چھوٹے بھائیوں کی وعدہ خلافیوں کی وجہ سے ایبٹ کو اپنی ہزارہ کی ڈائری میں یہ لکھنا پڑا کہ سکھوں سے زیادہ درانی قابل نفرت ھیں۔ پٹھان قبائل کی نظر میں وہ خاندان جو ذاتی اغراض کو قومی مفاد پر مقدم سمجھتا تھا اس میں جذبۂ قومی اور حب الوطنی کا شائبہ تک نہ تھا۔ قومی مفاد یہ تھا جیسا کہ سید احمد نے محسوس کیا تھا کہ وطن کو رنجیت سنگھ اور سکھ فوج کے ظالمانہ پنجہ سے چھڑایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پشاوری سردار اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی دوست محمد کے حلقۂ اطاعت سے نکل کر اپنی علحدہ ریاست قائم کرنے یا اس کی جگہ کابل کے تخت پر بیٹھنے کے لئے پوری طرح سکھوں کے ساتھ مل جانے کو تیار تھے۔ چنانچہ ایسا ھوا کہ جب سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد انگریز اس علاقہ میں آئے اور جارج لارنس نے یہ تہیہ کیا کہ پٹھانوں کی ذہنیت اور مقاصد کو سمجھا جائے اور حکومت اور عوام کے تعلقات انصاف کے بنیاد پر استوار کئے جائیں تو اس سردار نے جو پورا سنکی تھا موقع پاتے ھی محسن کشی شروع کر دی۔

اس معاملہ میں دوست محمد کے الفاظ ناطق فیصلہ کی حیثیت رکھتے ھیں۔ اگرچہ سکھوں کی دوسری لڑائی میں اس نے بھی سکھوں سے تعاون کرنا چاھا جیسا کہ آگے چل کر معلوم ھو گا لیکن وہ سلطان محمد کی حرکتوں سے اتنا بیزار ھوا کہ اس نے طیش میں آ کر اپنے بھائی سے کہا ”کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ خوگیانی قبیلہ نے ایک ناپاک خنزیر کی جان بچانے کے لئے جو کتوں سے جان بچا کر ان کے خیموں میں آ چھپا

تھا احمد شاہ اعظم پر تلوار کھینچ لی تھی ،،۔

آئیے اب ہم ۱۸۳۲ء کے واقعات پر نظر واپسیں ڈالیں۔ اس وقت سید احمد کے عروج کا زمانہ ختم ہونے کے بعد پشاور میں جو عجیب حالات پیدا ہو گئے تھے ان کی وجہ سے جوشیلے شاہ شجاع کے دل میں نئی امیدیں پیدا ہو گئیں اور اس نے اپنے تخت کی واپسی میں مدد کے لئے رنجیت سنگھ سے مذاکرات شروع کر دئے لیکن رنجیت پشاور کے متعلق کچھ اور ہی منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ شاہ شجاع کو خالی امیدوں سے بہلاتا رہا یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں ایرانیوں نے ایک بار پھر ہرات پر چڑھائی کر دی اور دوسری طرف سندھ کے امیروں سے دعوت ملنے پر شجاع نے ایک واضح تجویز پیش کی جو سکھوں کے منصوبہ کے عین مطابق تھی۔ سندھ کے امیر انگریز ایلچیوں کی ریشہ دوانیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے یہ پیشکش کی کہ وہ شاہ شجاع کو اپنا بادشاہ ماننے کو تیار ہیں اور اسے قندھار پہنچنے کے لئے راستہ دے دیں گے۔ شاہ شجاع کا خیال تھا کہ اسے قندھار کے راستہ کابل دوبارہ فتح کرنے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے۔ وہ اس خیال خام سے اتنا جوش میں آیا کہ اس نے پشاور خاص اور دریائے سندھ اور پہاڑیوں کے درمیانی ضلعوں پر اپنے حق سے دست بردار ہونے اور کوہ نور حاصل کرنے کا خیال ترک کر دینے کی پیشکش کی۔ وہ یہ سب چیزیں اس شرط پر رنجیت سنگھ کے حوالہ کرنے پر تیار ہو گیا کہ کابل کا تخت حاصل کرنے کے لئے اسے مالی اور فوجی امداد دی جائے۔ چنانچہ اگست ۱۸۳۳ء میں اتحاد کا ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت شجاع نے پشاور اور ملحقہ اضلاع باقاعدہ سکھوں کے حوالہ کر دئے اور اس کے بدلہ میں اسے یقین دلایا گیا کہ اس کی نئی جدو جہد میں سکھ اس کا ساتھ دیں گے۔ ۱۸۳۳ء میں وہ آہستہ آہستہ سندھ کی طرف بڑھا اس نے دریائے سندھ عبور کیا اور سندھ کے امیروں کو شکارپور کے مقام پر شکست دی۔ (اس کے سندھ پہنچتے ہی وہاں کے امیر اپنے وعدہ سے پھر گئے تھے) اور اس طرح ایک اڈہ قائم کرنے کے بعد وہ قندھار جانے کے ارادہ سے بولان پہنچا۔ وہاں وہ چند ماہ اپنا قبضہ جمائے رہا لیکن بعد میں دوست محمد نے اسے جنگ پر مجبور کر دیا اور جولائی ۱۸۳۴ء میں اسے شکست دے دی۔ ۱۸۳۵ء کے موسم بہار تک وہ ایک بار پھر لدھیانہ

پہنچ چکا تھا اور اسے پشاور سکھوں کے حوالہ کر کے جو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا تھا اس کی تلافی کے لئے اسے کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا۔

رنجیت نے اپنے نئے معاہدہ سے فائدہ اٹھانے میں توقف نہیں کیا۔ اس نے اس خیال سے کہ کہیں شجاع اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائے اور پشاور کے سردار سلطان محمد کو اپنا باج گزار نہ بنا لے پشاور پر قبضہ کر لینے کا تہیہ کر لیا۔ یہ موقع بڑا غنیمت تھا کیونکہ دوست محمد قندھار کے قریب شجاع سے نپٹنے کے لئے جنوب کی طرف روانہ ہو چکا تھا اور اگر وہ چاھتا بھی تب بھی اپنے سوتیلے بھائیوں کی جو پشاور کے سردار تھے مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ سکھوں کی زبردست فوج ھری سنگھ کی قیادت میں خیر آباد سے روانہ ھوئی اور پشاور جو ابھی تک باج گزار علاقہ کی حیثیت سے پشاوری سرداروں کے قبضہ میں تھا مئی ۱۸۳۴ء میں باقاعدہ سکھوں کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ ھری سنگھ پشاور کا پہلا سکھ گورنر مقرر ہو گیا۔ اور سلطان محمد اور اس کے بھائی کابل میں دوست محمد کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ سکھ جنرل ھری سنگھ جو اب تک دریائے سندھ کے کنارے اور ھزارہ میں ایک نڈر شہسوار کی حیثیت سے مشہور تھا اب اس کا نام پشاور کے آس پاس گھر گھر تک پہنچ گیا۔ اور خلیل مہمند اور دوسرے قبیلوں کی عورتیں اپنے شریر بچوں کو یہ کہہ کر ڈرانے لگیں کہ ”وہ ھری سنگھ آ گیا“۔

اس شہر پر جو تیمور اور شجاع کا موسم سرما کا دارالخلافہ رہ چکا تھا سکھوں کا قبضہ ایک ایسا صدمہ تھا جس نے افغانوں کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ دوست محمد کا پہلا رد عمل یہ تھا کہ اس وقت انگریزوں سے جو مدد مل سکتی ھے اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اور قندھار کے قریب شاہ شجاع کو شکست دینے سے پہلے ایک بار اس نے تاج برطانیہ کی اطاعت قبول کرنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ شاہ شجاع پر فتح پانے کے بعد اس نے پشاور دوبارہ فتح کرنے کے لئے برطانوی حکومت سے مدد مانگی اور اپنے چھیتے بھتیجے کو جو جبار خان کا بیٹھا تھا ایک طالب علم اور غیر سرکاری ایلچی کی حیثیت سے لدھیانہ بھیج دیا۔ لیکن اس وقت تک برطانوی حکومت کا افغانوں کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی ارادہ نہ تھا لہذا اس نے دوست محمد کی درخواست کا براہ راست

جواب دینے سے احتراز کیا۔ اس طرح دوست محمد اور رنجیت سنگھ کو اپنے اپنے وسائل پر بھروسہ کرنا پڑا۔

رنجیت جانتا تھا کہ اس کا کام کس شخص کے ذریعہ نکلے گا۔ وہ شخص سلطان محمد تھا۔ رنجیت نے اسے دوست محمد سے، جس کے پاس سلطان محمد نے پشاور پر ہری سنگھ کے قبضہ کے بعد پناہ لی تھی دور رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سلطان محمد کو اپنے چھوٹے بھائی سے حسد تھا ساتھ ہی ساتھ اسے بھی یہ اندیشہ تھا کہ سکھ ہار گئے تو دوست محمد پشاور کو اپنے قبضہ میں رکھے گا چنانچہ وہ رنجیت کی ہر بات پر آمنّا صدّقنا کہتا رہا۔ دوست محمد درۂ خیبر کے مشرقی دھانہ جمرود تک آ پہنچا جہاں رنجیت سنگھ اسے حیلہ بہانہ سے روکتا رہا یہاں تک کہ اس کی اپنی فوجیں بھی جمع ہو گئیں۔ ۱۱ مئی ۱۸۳۵ء کو امیر دوست محمد کو قریب قریب گھیرے میں لے لیا گیا۔ اور رنجیت سنگھ نے اگلے دن حملہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ دوست محمد نے پسپا ہونے ہی میں مصلحت سمجھی چنانچہ وہ اپنی دو توپیں چھنوا کر اور اپنا وقار کھو کر پسپا ہو گیا۔ اس نے سکھوں کے ایلچیوں کے ذریعہ جو منصوبہ بنایا تھا وہ محض اس وجہ سے ناکام ہوا کہ اسے عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری سلطان محمد کے سپرد کر دی گئی تھی جو اس وقت تک رنجیت سے جا ملنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ دوست کا ارادہ تھا کہ سکھ ایلچیوں کو بطور یرغمال استعمال کیا جائے لیکن موقع ملتے ہی سلطان محمد نے انہیں فرار کرا دیا اور رنجیت سنگھ سے اس بات کی داد وصول کی کہ ان ایلچیوں کو وہ چھڑا کر لایا ہے۔ اس فرماں برداری کی بدولت مکار سردار اور اس کے بھائیوں کو سکھوں کی طرف سے پشاور اور کوہاٹ میں بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ لیکن انہیں پورا صوبہ واپس نہ مل سکا۔ اس کا فوجی اور دیوانی نظم و نسق ہری سنگھ کے حوالہ کیا گیا۔

اس پسپائی کی ذلت سے دوست محمد کا دماغ کھولتا رہا لیکن وہ بڑا محتاط تھا اس لئے اس نے ایک بار پھر انگریزوں سے اور خود رنجیت سے سلسلہ جنبانی کی۔ انگریز حسب معمول ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ سکھوں نے امیر کو کچھ امید دلائی کہ اسے پشاور پھر مل جائیگا لیکن

جب اس نے چند گھوڑوں کا مطالبہ کیا جس کے متعلق اسے خیال تھا کہ اس طرح دوسروں کو یقین ہو جائیگا کہ اس نے سکھوں کی حمایت حاصل کر لی ہے۔ تو اس کی چالاکی مفید ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوئی۔ دوست پشاور حاصل کرنے کے لئے بے چین ضرور تھا لیکن پھر بھی اس نے دانشمندی سے کام لے کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ رنجیت سنگھ گھوڑے دے کر یہ اعلان کر دے گا کہ یہ بخشش اس لئے نہیں ہوئی کہ موسم سرما کا سرد مقام دوست کے حوالہ کیا جا رہا ہے بلکہ کابل پر دوست کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوستی کے اس اظہار کے باوجود یہ بات سب جانتے تھے کہ ہری سنگھ درۂ خیبر کے دہانہ پر جمرود کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کر رہا ہے اور یہ بھی منصوبہ بنا رہا ہے کہ افریدیوں سے درہ کی دشوار گزار پہاڑیاں چھیننے کے بعد جلال آباد پر چڑھائی کی جائے۔ چنانچہ دوست محمد نے جنگ کا فیصلہ کیا۔

اس مقصد کے لئے اس نے اپنے سب سے زیادہ جانباز بیٹے اکبر خان کی کمان میں اپنی بہترین فوج بھیجی۔ دوست کے بیٹے اکبر کا تذکرہ صرف اسی مرحلہ پر سرحد کی تاریخ میں آیا ہے۔ بعد میں اس نے کابل پر انگریزوں کے قبضہ کے زمانہ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی رہنمائی کی، برطانوی ایلچی سر ولیم میکناٹن (SIR WILLIAM MACNAGHTEN) کو قتل کیا اور جگدلک کے سانحہ کے بعد انگریز عورتیں اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ جارج لارنس کے پشاور پہنچنے کے فوراً بعد وہ ۱۸۴۷ء میں فوت ہو گیا۔ وہ صوبہ سرحد میں جنگ جمرود کی وجہ سے مشہور ہے جس میں اس نے فتح حاصل کی لیکن اسے اس کا ثمرہ نصیب نہ ہوا۔

اکبر اپریل ۱۸۳۷ء میں خیبر پہنچا اور ۳۰ اپریل کو لڑائی ہوئی۔ افغان فوج نے قلعہ جمرود پر حملہ کر دیا۔ وہ قلعہ پر تو قبضہ نہ کر سکی البتہ قلعہ کی حفاظت کے لئے پشاور سے سکھوں کی جو فوج آئی تھی اسے تتر بتر کر دیا۔ ہری سنگھ نے جو فوج کی کمان کر رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی آگے آگے تھا افغان فوج کو دھوکا دینے کے لئے پسپا ہونے لگا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کو میدان میں نکال لائے اور گھاٹیوں سے دور پہنچا دے کیونکہ درہ میں رہ کر

افریدی اور ملاگوری (۱) قبائل سکھ فوج کے میمنہ اور میسرہ پر حملے کرتے رہتے اور افغان فوج قلب لشکر کا مقابلہ کرتی رہتی۔ اس پسپائی کے دوران سکھ کمانڈر ہری سنگھ نے وہی کام انجام دیا تھا۔ وہ پسپا ہوتی ہوئی اور صفیں باندھتی ہوئی فوجوں میں ہر جگہ دوڑتا پھر رہا تھا اور اس آڑے وقت میں ان کا دل بڑھا رہا تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہو کر اس جگہ گر پڑا جہاں اب اسلامیہ کالج اور پشاور یونیورسٹی کی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ جس مقام پر اس نے جان دی وہ جگہ اب بھی برج ہری سنگھ کہلاتی ہے۔ اکبر نے بھی بڑی بہادری اور بے جگری کا مظاہرہ کیا اور سکھوں کی دو توپوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ اسے لڑائی میں فتح حاصل ہوئی۔ لیکن وہ پشاور تو کیا خود قلعہ جمرود پر بھی قبضہ نہ کر سکا۔ قلعہ میں ٹھہری ہوئی سکھ فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ چند روز تک مختلف دیہات خاص طور پر شیخاں میں جو باڑہ روڈ پر واقع ہے لوٹ مار مچانے کے بعد افغان ایک بار پھر جلال آباد واپس جانے پر مجبور ہو گئے۔

ہری سنگھ مر چکا تھا لیکن ابھی سکھا شاہی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مشہور ہے کہ جب رنجیت سنگھ کو ہری سنگھ کی موت کی خبر ملی تو وہ زاروقطار رونے لگا۔ ہری سنگھ وہ واحد سکھ سردار تھا جس کو رنجیت نے اس مرتبہ تک پہنچایا تھا۔ رنجیت سرحدی علاقہ میں اپنی دھاک بٹھانے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اس نے پشاور کی پوری وادی اپنی فوجوں سے پاٹ دی اور خود بھی بیمار ہونے کے باوجود پیش قدمی کرتا ہوا روہتاس تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنے لاڈلے ڈوگرے دھیان سنگھ کو بہترین سکھ فوج کے ساتھ تیزی سے آگے روانہ کیا۔ دھیان سنگھ اس گلاب سنگھ کا بڑا بھائی تھا جو بعد میں مہاراجہ کشمیر بنا اس نے قلعہ جمرود کی تعمیر میں اپنے ہاتھوں سے کام کر کے دوسروں کے لئے ایک مثال قائم کی۔ قلعہ جمرود قریب قریب آج بھی اسی حالت میں ہے جس حالت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ قلعہ ایک جنگی جہاز معلوم ہوتا ہے جسے خیبر کے مشرقی دہانہ کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہو۔ ہری سنگھ کے بعد

---

(۱) یہ ایک چھوٹا سا ہمسایہ قبیلہ ہے جو شروع میں مہمندوں کے زیرحفاظت تھا۔ یہ قبیلہ تاترہ پہاڑ کے آس پاس دریائے کابل کی گھاٹیوں اور خیبر کے درمیان آباد ہے۔

پشاور کی دقت طلب گورنری سونپنے کے لئے مہاراجہ کی نگاہ اپنے ایک یورپی جنرل اویتا بیل (AVITABILE) پر پڑی جو اطالوی تھا، آج بھی پشاور اور اس کے آس پاس حجروں میں اس کے سخت فیصلوں اور فوری اقدام کی داستانیں دوھرائی جاتی ھیں۔ اس کا نام ابوطبیلہ مشہور ھے اور مقامی روایات میں اسے بڑی ذلت کے ساتھ یاد کیا جاتا ھے۔ اس پر خاص طور سے اس لئے لعنت بھیجی جاتی ھے کہ وہ مجرموں کو مسجد مہابت خان کے مینار سے پھانسی پر لٹکا دیتا تھا۔ اس نے شہر کی فصیل کے اندر گورگھٹڑی کے مندر کے قریب ایک نیا قلعہ بنوا کر اس میں رھائش اختیار کی پہلی افغان جنگ کے دوران بہت سے انگریزوں نے کابل جاتے ھوئے اور واپس آتے ھوئے اسی مقام پر اس سے ملاقات کی تھی۔ بعد میں گورگھٹڑی کا وقار ختم ھوگیا اور یہاں اسسٹنٹ پولیس سپرنٹنڈنٹ رھنے لگا جو شہر کے تھانوں کا انچارج ھوتا تھا۔

جنگ جمرود کے ساتھ اب ھم پہلی افغان جنگ کے زمانہ اور ان تبدیلیوں کے قریب آ پہنچے ھیں جو رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد رونما ھوئیں۔ ۱۸۳۸ء تک برطانوی فوج بولان اور کوئٹہ کے راستہ افغانستان پر چڑھائی کرنے کے لئے فیروز پور میں جمع ھو چکی تھی اور سکھ فوج درۂ خیبر میں سے راستہ نکالنے کے ارادہ سے جنوری ۱۸۳۹ء میں لاھور سے روانہ ھوئی شاہ شجاع کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ انگریز فوج کے ساتھ اپنے دل پسند راستہ سے روانہ ھو اور راستہ میں قندھار فتح کر لے۔ دوسری طرف رنجیت نے جو فوج بھیجی ھے اس کے ساتھ شجاع کا بیٹا شہزادہ تیمور سیدھے راستہ سے پشاور ھوتا ھوا کابل پہنچے۔ سکھ فوج کے ھمراہ برطانوی نمائندہ کرنل ویڈ (COL: WADE) اور اس کا پروردہ شہامت علی بھی تھا جس نے اس مہم اور اس کے واقعات کے متعلق دلچسپ ڈائری لکھی ھے۔

ان منصوبوں میں سے کسی کے پورا ھونے سے پہلے رنجیت سنگھ جون ۱۸۳۹ء میں فوت ھو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی قوم کا پرزور جذبہ گھریلو جھگڑوں میں صرف ھونے لگا اور طوائف الملوکی کا ایک ایسا دور شروع ھوا جس کے سامنے درانیوں کی بادشاہ گردی ماند پڑ گئی۔ ان واقعات کا پٹھانوں کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی یہ اس لحاظ سے اھم ھیں کہ ان سے یہ ظاھر ھوتا ھے کہ جو حکومت طاقت اور

مکاری کے بل پر قائم کی گئی ہو اور جس پر ایک ممتاز شخصیت حاوی ہو اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔ شمال مغرب کی طرف سے حملوں کا جو سلسلہ صدیوں سے جاری تھا اسے سکھوں کے اقتدار نے ختم کیا لیکن جس علاقہ میں سکھوں نے لوٹ مار مچائی تھی وہاں تعمیری کام دوسروں کی قسمت میں لکھا تھا جن کے جانشینوں نے آخرکار اس علاقہ میں ایسی مسلم مملکت قائم کی جس کی بنیاد جاگیرداری نہیں ہے بلکہ وہ نئے طریقے ہیں جو سکھا شاہی کے بعد ایک صدی کے دوران سیکھے گئے۔

جو پالیسیاں پہلی افغان جنگ کا باعث نہیں اور اس لڑائی نے جو صورت اختیار کی وہ اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہیں البتہ اتنا ربط ضرور ہے کہ اس میں سرحدی علاقہ خاص طور پر پشاور کی کشش کا بڑا ھاتھ تھا۔ ابھی تک یہ بات واضح طور پر نہیں کہی گئی کہ پشاور اور اس کے آس پاس کے زرخیز علاقہ پر قبضہ کی خواہش ھی اس لڑائی کا اصل سبب تھا اور اسی خواہش نے اس کے بعد انگریزوں اور رنجیت کے جانشینوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کے خاص رخ اور نتائج پر گہرا اثر ڈالا۔ بات اس سے بھی آگے تک پہنچ سکتی ہے۔ آج افغانوں میں اپنے مرکز کی طرف مراجعت کی جو تحریک چلائی جا رہی ہے اس کے پس پردہ بھی یہی خواہش کار فرما ہے جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

رنجیت سنگھ نے افغانوں سے ان کی بہترین علاقے چھین لئے تھے ان میں صرف دریائے سندھ کے مشرق کے علاقے ھی شامل نہیں تھے جہاں کے باشندے افغان نسل سے نہیں ھیں بلکہ پشاور اور بنوں جو زرخیز باغات کی حیثیت رکھتے ھیں اور جو غیرت مند افغانوں اور پٹھانوں کا مسکن ھیں ھاتھ سے نکل گئے تھے۔ جس وقت دوست محمد قندھار کے قریب اپنے سدوزئی حریفوں سے الجھا ہوا تھا تو رنجیت سنگھ نے موقع پا کر کابل کے حکمران کے سوتیلے بھائیوں کی پشاور کے سرداروں سے ان کی گدی چھین لی تھی۔ دوست محمد نے موسم سرما کا صدر مقام حاصل کرنے کے لئے لڑائی کی ٹھان لی اسے بھاری نقصان اٹھا کر فتح نصیب ہوئی لیکن وہ پشاور شہر پر پھر بھی قبضہ نہ کر سکا۔ رنجیت نے اپنی جگہ یہ بات واضح کر دی کہ وہ پشاور پر اپنے قبضہ کو کتنا اہم سمجھتا ہے۔

الفنسٹن کے زمانہ کے بعد اس صورت حال میں ایک اور پہلو کا

اضافہ ھوا وہ یہ کہ اب انگریز بالا دست طاقت کی حیثیت سے برصغیر میں قدم جما چکے تھے۔ ان کی حکومت کی سرحد دریائے ستلج تھی لیکن یہ سرحد مضبوط نہیں تھی۔ جب روس نپولین کے حملوں کے بعد سنبھلا تو وسطی ایشیا میں اس کی سرحدی چوکیاں آھستہ آھستہ جنوب کی طرف بڑھنے لگیں۔ ۱۸۲۸ء میں معاھدہ ترکمان کے تحت روس نے ایران کو کاکیشیا کے علاقہ سے دست بردار ھونے پر مجبور کر دیا اور اب ایران کیسپین سے آگے ترکستان میں روس کی پیش قدمی کی راہ میں حائل نہیں رھا رنجیت سنگھ کی موت (۱۸۳۹ء) کے موقع پر روس نے ارل اور کیسپین کے درمیان جنوب کی طرف اور ارل کے مشرق کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی تاکہ شمالی ترکستان پر کائن ساری اور دوسرے قازق سرداروں کا اقتدار ختم کر دیا جائے۔ ۱۸۳۲ء میں الیکزینڈر برنس کے سفر سے یہ واضح ھو گیا تھا کہ برطانوی ھند اور روسی ایشیا کے درمیان روس کی طرف صرف قرون وسطیٰ کے طرز کی بخارا خیوا اور کوقند کی امارتیں حائل ھیں اور ھندوستان کے قریب درانیوں اور سکھوں کی سلطنتیں ھیں جن میں بے چینی پھیلی ھوئی ہے۔ کلکتہ اور شملہ سے جو گورنر جنرل کی موسم گرما کی قیام گاہ بن چکا تھا یہ بات مناسب معلوم ھونے لگی تھی کہ افغانوں اور سکھوں کے درمیان ایک دیانت دار ثالث کے فرائض انجام دئے جائیں اور فریقین میں مذاکرات کے ذریعہ ایسا سمجھوتہ کرا دیا جائے جو دونوں کی نظر میں باعزت ھو۔ برنس کی رپورٹوں اور نوشہرہ اور جمرود کی لڑائیوں کے درمیانی عرصہ (۱۸۲۳-۳۷ء) کے واقعات سے یہ ثابت ھو چکا تھا کہ اصل جھگڑا وادی پشاور اور وہ زرخیز علاقے ھیں جنھیں درانی نہ صرف اپنی قیمتی متاع سمجھتے ھیں بلکہ وھاں درانیوں کے قریبی عزیز آباد ھیں۔ چنانچہ تاجروں کی قائم کی ھوئی حکومت کے نمائندے نے سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ درانی اور سکھ سلطنتوں میں اپنے ایسے ایلچی مقرر کئے جائیں جن کی بات دونوں فریق مانتے ھوں اور جن کی عزت کرتے ھوں۔ رنجیت کی خواھشات کپتان کلاڈ ویڈ (CAPT: CLAUD WADE) کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی تھیں جو بعد میں شہزادہ تیمور کے ساتھ کابل گیا تھا دوسری طرف کپتان الیکزینڈر برنس جس نے اپنی کتاب سفر نامہ بخارا میں جو ان ھی دنوں شائع ھوئی ہے۔ افغانوں کے متعلق بڑے دلچسپ پیرایہ میں اور دلی ھمدردی کے ساتھ بہت کچھ لکھا

تھا درانی سلطنت میں یہی کام انجام دے سکتا تھا۔

لیکن لارڈ آکلینڈ جو ۱۸۳۶ء سے گورنر جنرل چلے آرہے تھے انصاف سے کام لینا چاہتے تھے۔ وہ برنس کی شگفتہ اور جوشیلی طبیعت سے بہت متاثر ہو چکے تھے۔ برنس نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ دوست محمد پشاور کے علاقہ سے دست بردار نہ ہو گا اور چونکہ آکلینڈ اس اصول کے قائل تھے جو آج کل حق خودارادیت کہلاتا ہے اس لئے یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ آکلینڈ تو کیا خود برنس بھی پٹھان ذہنیت سے اچھی طرح واقف نہ تھے ورنہ وہ یہ ضرور محسوس کرتے کہ بعض قبائل مثلاً یوسف زئی درانیوں کو بھی اتنا ہی برا سمجھتے ہیں جتنا وہ سکھوں سے نفرت کرتے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ڈھلمل یقین اور خود غرض درانیوں کے مقابلہ میں صاف طبیعت اور سفاک سکھوں کی زیادہ عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ آکلینڈ نے جو حق خودارادیت کے حامی تھے اور جنھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس حق کا انحصار کن عوامل پر ہے پشاور درانیوں کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کر کے رنجیت کے دربار میں ویڈ کے کام کو ناممکن بنا دیا۔ اور جب برنس برطانوی حکومت کی طرف سے مصالحت کی پیشکش لے کر کابل پہنچا تو جیسا کہ پہلے ہی اس کی نیت تھی اس نے آکلینڈ کی حمایت سے پورا فائدہ اٹھایا اور پشاور کے حصول کے لئے دوست محمد کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے برنس نے اپنے خطوط میں اور میسن نے جو افغانستان میں اس کا ہم عصر تھا اپنی تحریروں میں موزوں طریقہ سے بیان کیا ہے۔ میسن نے جو کچھ لکھا ہے کابل میں بیٹھ کر لکھا ہے جہاں سے وہ تمام حالات کا غیر جانبداری سے جائزہ لے سکتا تھا چنانچہ اس نے تمام پردے چاک کر دئے ہیں اور ہماری تاریخ کے اس گھناؤنے ورق کے اصل محرکات اور مقاصد کو کھول کر رکھ دیا ہے برنس کے اپنے احساسات اور ان کے بنیاد پر قائم کی ہوئی دوست محمد کی امیدیں اپنی جگہ واضح ہیں۔ مختصراً اس کا مشورہ یہ تھا کہ پشاور شہر اور صوبہ پشاور سکھوں سے لے کر دوست محمد کو دے دیا جائے۔ اس بات کے بھی اشارات ملتے ہیں جن کی میسن نے نشان دہی کی ہے اور برنس کے ہندوستانی منشی موہن لال نے تصدیق کی ہے کہ بعد میں یہ بھی خیال پیدا ہوا تھا کہ پشاور دوست محمد کے حوالہ کرنے کی بجائے سلطان محمد کو دے دیا جائے۔ یقیناً

سکندر برنس کو چھ سال پہلے کی وہ ضیافتیں اور وہ گلدستے یاد تھے جو اسے پشاور میں دئے گئے تھے۔ موھن لال نے ان واقعات پر بڑی دلچسپ حاشیہ آرائی کی ھے جس سے درانیوں کا کردار بے نقاب ھو جاتا ھے اس نے لکھا ھے کہ امیر کا خیال تھا کہ پشاور کا صوبہ سکھوں کے قبضہ میں رھے تو اس کے لئے یہ زیادہ بہتر ھوگا بہ نسبت اس کے کہ یہ صوبہ اس کے بھائی کے حوالہ کر دیا جائے۔ درانیوں کی حب الوطنی کا یہ حال تھا۔ قبائل نے ان کے متعلق کوئی غلط رائے قائم نہیں کی تھی۔

لیکن یہ اسکیم کامیاب نہیں ھو سکتی تھی۔ رنجیت موقع پر موجود تھا وہ طاقتور تھا اور پشاور پر اسی کا قبضہ تھا۔ اسے ھٹا کر ایک رعیت کو اس کی جگہ نہیں بھٹایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ مذاکرات ناکام ھو گئے اور وہ بھی محض پشاور کی وجہ سے۔ دیانتدار ثالث اپنی کوشش میں ناکام رھا اب کیا کیا جائے۔ آکلینڈ پریشان تھے۔ کیا ان جھگڑالو شہزادوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے نظریات وسیع ھوں جو دیانتداری کے ساتھ سودا کر سکے اور لین دین کے اصولوں پر قائم رھے؟ یقیناً ایسا آدمی موجود تھا۔ کم از کم ایک درانی جو اس زمانہ کے حکمران گھرانے سے نہیں تھا ایسا ضرور تھا جس نے پشاور کے علاوہ دریائے سندھ اور پہاڑیوں کے درمیان کے تمام اضلاع سے دست بردار ھونے پر آمادگی ظاھر کی تھی۔ اس درانی نے یہاں تک کیا تھا کہ اپنی پیشکش کو ۱۸۳۳ء میں رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک تحریری معاھدہ کی شکل دے دی تھی۔ اس بات کی کوئی اھمیت نہیں تھی کہ وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جسے زوال آچکا تھا۔ برنس نے مایوسی کی حالت میں آخری حربہ کے طور پر یہ مشورہ دیا کہ اس درانی یعنی شجاع الملک کو ایک بار پھر کابل کے تخت پر بٹھا دیا جائے اور اس طرح پشاور کا جھگڑا ختم کیا جائے۔

آکلینڈ رضامند ھو گئے۔ پشاور اور سرحدی علاقوں کے قبضہ کے متعلق ایک معاھدہ کی ضرورت کے پیش نظر برطانوی حکومت کو ایسی پالیسی اختیار کرنا پڑی جس کے تحت شاہ شجاع زیر نگرانی شہزادہ کی حیثیت سے اپنے آبائی تخت پر بیٹھ گیا اور رنجیت سنگھ کو اس کی منشا کے مطابق سرحدی اضلاع مل گئے۔ اس پالیسی کو سہ فریقی معاھدہ کی

شکل دے دی گئی جس پر ۲۵ جون ۱۸۳۸ء کو شملہ میں گورنر جنرل، رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع نے دستخط کر دئے۔

یہ اہم دستاویز ''حکومت برطانیہ کی تائید اور حمایت کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع الملک کے درمیان اتحاد اور دوستی کا معاہدہ،، کہلائی اور اس میں پانچ سال پہلے کے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے معاہدہ کی توثیق کی گئی۔ گویا اس معاہدہ میں برطانوی حکومت بوڑھی خالہ کی حیثیت سے شامل ہو گئی۔

معاہدہ کی دفعہ ارل کے تحت شاہ شجاع کشمیر اٹک چھچھ ہزارہ کھبل اسب اور اس کے باج گزار علاقوں، پشاور اور یوسف زئی علاقہ، خٹک، ہشت نگر، مچنی، کوہاٹ، ہنگو اور درۂ خیبر تک پشاور کے تحت آنے والے تمام علاقے، بنوں، وزیر (۱) علاقہ دوڑ (۲) ٹانک گرنگ کالا باغ اور خوشحال گڑھ اور اس کے ماتحت علاقوں ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان (جن کے نام اس وقت کچھ اور تھے) بالائی سندھ کے تین کچھ اور صوبہ ملتان پر اپنے، اپنے ولی عہد اور جانشینوں اور تمام سدوزئیوں کے حق سے دست بردار ہو گیا۔ کشمیر اور ملتان کو چھوڑ کر جو کسی زمانہ میں درانی سلطنت کا حصہ رہ چکے تھے مقامات کی فہرست میں جامع طور پر سندھ پار کے اضلاع سیس اندس ہزارہ (بشمولیت چھچھ اور اٹک) شامل ہیں جن پر کرزن کا بنایا ہوا شمال مغربی سرحدی صوبہ مشتمل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں ڈیرہ غازی خان اور دریائے سندھ کے مغرب میں عیسیٰ خیل تحصیل پنجاب کے کچھ حصے اور درۂ بولان جانے والی سڑک پر بالائی سندھ کے اضلاع بھی شامل ہیں۔

اس معاہدہ کی باقی دفعات اہم نہیں ہیں بلکہ تفنن طبع کے لئے شامل کی گئی ہیں۔ شاہ نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ وہ طے شدہ رنگوں اور چال کے پچپن گھوڑے مہاراجہ کو بھیجے گا اور مہاراجہ اس کے بدلہ

---

(۱) سکھ کبھی وزیرستان میں داخل نہیں ہوئے۔ یہاں سپر کے اور دوسرے وزیری مراد ہیں جو بنوں میں آباد ہیں۔

(۲) دوڑ وادی ٹوچی کا نام ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی سب ڈویژن ہے جو پہاڑوں کے نزدیک واقع ہے۔ ان دونوں میں ڈرفسٹمین کے ذہن کے سوا اور کہیں بھی کوئی ربط نہیں ہے۔

میں پچپن شالیں دے گا۔ شاہ نے یہ بھی ذمہ داری سنبھالی کہ وہ دریائے کابل کے راستہ کابل کے مشہور سردے پشاور بھیجے گا اور مہاراجہ نے وعدہ کیا کہ باڑہ کا جو چاول پشاور میں مشہور ہے اس کے پچپن خروار کابل بھیجے جائیں گے۔ اور جب فریقین کی فوجیں ایک ہی جگہ خیمہ زن ہوں تو گائے کا ذبیحہ نہیں ہو گا۔

جہاں تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے اٹھارہ دفعات پر مشتمل اس معاہدہ میں اس کا برائے نام ہی ذکر آتا ہے سوائے اس کے کہ اسے دو فریقوں کے درمیان بظاہر جو خود ہی مصالحت پر آمادہ تھے مصالحت کنندہ اور نیک نیت خیر خواہ کی حیثیت حاصل ہے۔ معاہدہ میں یہ دفعہ بھی شامل تھی کہ جب بھی برطانوی اور سکھ حکومتیں اتفاق رائے سے ضروری سمجھیں تو مہاراجہ کو اپنی مسلم افواج میں سے پانچ ہزار سپاہی شاہ کی حمایت کے لئے پشاور کے علاقہ میں متعین کرنے پڑیں گے۔ بعد میں معاہدہ کی اس دفعہ کا واسطہ بھی دیا گیا۔ معاہدہ کی کوئی دفعہ ایسی نہیں تھی جس کے تحت انگریزوں کو بلا شرکت غیرے کوئی حق یا اختیار حاصل ہو۔ جن لوگوں نے پہلی جنگ افغان کا منصوبہ بنایا تھا ان پر جتنے بھی غیر معمولی اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سے ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ آکلینڈ کو ایسے معاہدہ کا سہارا لے کر اپنی سرحدوں سے پانچسو میل دور انگریز سپاہیوں کو جنگ میں جھونک دینے کا مشورہ دیا گیا۔

جنگ کی تفصیلات، کابل پر قبضہ، شاہ شجاع کی دوبارہ تخت نشینی، دو ایلچیوں میکناٹن اور برنس کا قتل ۱۸۴۱ء کی تباہ کن پسپائی، اگلے سال کے شروع میں کابل کے قریب مصیبت زدہ شجاع کا اپنی ہی رعایا کے ہاتھوں مارا جانا بعد میں ۱۸۴۲ء میں کابل پر جنرل پولک کا دوبارہ قبضہ۔ ان میں سے ایک کے سوا باقی تمام باتیں پٹھانوں کے قصہ سے غیر متعلق ہیں۔ دوسرے فوجی لیڈروں کی ناکامی کے بعد پولک اپریل ۱۸۴۲ء میں درۂ خیبر میں سے راستہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے یہ کامیابی ایک نئی چال کے ذریعہ حاصل کی جو ان دنوں ایشیا میں نئی تھی۔ چال یہ تھی کہ درہ میں سے گزرنے والی فوج کی حفاظت کے لئے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر محافظوں کی چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ اس کا تذکرہ اس

لئے ضروری ہے۔ کہ افریدیوں کو یہ واقعہ اب بھی یاد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پولک خود ان ہی کی چال سے کام لے کر اپنی فوج درہ سے گزار لے جانے میں کامیاب ہوا۔ قبائل کی یہ فطرت ثانیہ ہے کہ وہ پہاڑیوں ٹیلوں وغیرہ پر چڑھ کر دشمن پر حملہ کرتے ہیں۔ ایک شخص نے جو تیس سال پہلے محسود قبیلہ پر اچانک حملہ کے ایک موقع پر موجود تھا بتایا ہے کہ کس طرح قبائل فوری طور پر پہاڑیوں اور ٹیلوں کی طرف بھاگے جہاں سے وہ دشمنوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا اور جس فوج نے بے خبری میں ان پر حملہ کیا تھا اسے بھاگنا پڑا۔ جس کمانڈر کو بھی قبائل کے خلاف لڑنے کا اتفاق ہوا ہے اس نے یہ ضرور بتایا ہے کہ اپنے علاقہ میں لڑائی کے موقع پر قبائلی جبلی طور پر میدان جنگ میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ یہ علاقہ بڑا دشوار گزار ہے اور پھر قبائل آزادی کے متوالے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج تک وہ سلطنتیں جن کی فوجیں ان پہاڑوں میں سے گزرنے والی شاہراہ سے گزری ہیں ان میں سے کوئی بھی قبائلی علاقہ کے بڑے حصہ میں دیر پا نظم و نسق قائم نہیں کر سکی۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ یہ پہاڑ ہر جگہ بنجر ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر قبضہ کیا جائے۔ یہ ایک غلط خیال ہے جو بری طرح رواج پا گیا ہے۔ ”بھوکا پٹھان اپنے بنجر پہاڑوں سے نیچے کی طرف سرسبز میدانوں کو تکتا رہتا ہے۔۔۔“ یہ محض من گھڑت افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے شمالی علاقہ میں جس میں کشمیر بھی شامل ہے سوات سے زیادہ زرخیز کوئی علاقہ نہیں ہے اور باجوڑ کی وادیوں اور ملحقہ بالائی مہمند علاقوں سے بہتر گندم کی فصل کہیں کہیں پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تیراہ اور وزیرستان میں بھی بھیڑیں پالنے کے لئے بہترین چراگاہیں موجود ہیں اور اس علاقہ کے ڈھلوان پر بہترین جنگل پائے جاتے ہیں جو کشمیر میں لکڑی کی تجارت بند ہو جا۔ ' کی وجہ سے برباد ہو رہے ہیں۔ ٹیری اور شکردرہ کے درمیان خٹک کی پہاڑیاں اور ڈیرہ جات کے وہ علاقے جہاں نہریں نہیں ہیں برسوں سے باقاعدہ نظم و نسق کی نگرانی میں ہیں۔ لیکن زرخیزی میں سوات اور وزیرستان کے محدب علاقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قبائلی علاقہ کے مسلسل سیاسی آزادی کا سب سے بڑا سبب یہ

ہے کہ قبائل آزادی کے متوالے ہیں وہ آزادی کی خاطر جان کی بازی لگانے کو تیار ہیں اور اپنے علاقہ میں لڑنا بھی خوب جانتے ہیں۔ لیکن بھوکے پٹھان کا جو قصہ مشہور ہو گیا ہے وہ بہ مشکل ذہنوں سے محو ہو گا۔

حالات کو معمول پر لانے میں ناکامی اور شاہ شجاع کی وفات کی وجہ سے سہ فریقی معاہدہ ۱۸۳۸ء میں ختم کر دیا گیا۔ لیکن اس کی دفعات کا نتیجہ دیرپا ثابت ہوا کیونکہ اس کی بدولت پشاور اور سندھ پار کے دوسرے اضلاع پر سکھوں کے قبضہ کی سفارتی پیمانہ پر توثیق ہو گئی اور ایک ایسا تاثر پیدا ہو گیا جو ان واقعات کے فوراً بعد رونما ہونے والی سکھوں کی جنگوں کے وقت تک قائم رہا یہاں تک کہ انگریزوں نے پنجاب کے ساتھ سندھ پار کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس معاہدہ نے لوگوں کے ذہنوں میں ایسا اثر بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے افغان سلطنت کے بارک زئی حکمران اپنا وہ حق جتانے سے باز رہے جس سے سدوزئی دست بردار ہو چکے تھے کیونکہ بارک زئیوں کے لئے سکھوں اور ان کے جانشینوں کے مقابلہ پر یہ حق حاصل کرنا بڑا مشکل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پشاور اور سندھ پار کے علاقے ۱۸۲۳ء ہی میں جبکہ نوشہرہ کے مقام پر اعظم کو شکست ہوئی کابل کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اگرچہ اس علاقہ کی جو منتقلی زبردستی ہوئی تھی اس کی قانونی دستاویز چار سال بعد منسوخ کر دی گئی لیکن معاہدہ میں علاقہ کی منتقلی کے محض تذکرہ کی وجہ سے انگریزوں کو سرحدی [illegible]ہ میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے میں بڑی مدد ملی۔

اس وقت کی جنگ اقتدار میں پشاور کا کردار ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ جب انگریز ۴۱-۱۸۴۰ء میں شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر دوبارہ بٹھانے میں عارضی طور پر کامیاب ہو گئے اور دوست محمد ہتھیار ڈالنے کے بعد قیدی کی حیثیت سے ہندوستان روانہ ہو گیا وہاں سے وہ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۸۴۳ء تک واپس نہ آیا تو انگریز ایلچی سر ولیم میکناٹن نے شاہ شجاع کے نئے نئے حاصل کئے ہوئے تخت کو مستحکم کرنے کے لئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ لاہور میں محلاتی سازشوں کی وجہ سے جن کا اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے سکھ کسی گنتی میں نہیں رہے تھے اور میکناٹن نے اپنی حکومت سے مشورہ کئے بغیر یہ تجویز



شاه شجاع

پیش کی کہ شجاع کو معاہدہ کی شرائط سے بری الذمہ کر دیا جائے، معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا جائے اور پشاور اور دوسرے اضلاع پھر اسی بادشاہ کو دے دئے جائیں جو ان سے سکھوں کے حق میں دست بردار ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ میکناٹن نے یہ قدم برنس کے کہنے پر اٹھایا تھا جو اس وقت تک کابل میں تھا۔ کلکتہ کی برطانوی حکومت نے اس تجویز کو جلد بازی کا نتیجہ قرار دیا لیکن اس کی پالیسی یہ معلوم ہوتی تھی کہ ابھی اس تجویز کو بیچ میں لٹکائے رکھا جائے لیکن حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ ۱۸۴۱ء کے آخر میں انگریز فوج کی تباہی اور میکناٹن اور برنس کی مظلومانہ موت اور پھر بگڑتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کے لئے پشاور کو فوجی مرکز بنانے کی ضرورت نے انگریزوں کو اس خیال سے باز رکھا۔ لیکن لاہور کے دربار کو اچھی طرح معلوم تھا کہ برنس ان کی سلطنت دوست محمد کے حوالہ کرنا چاہتا ہے اور میکناٹن یہی سلطنت شاہ شجاع کے سپرد کرنے کے حق میں ہے۔ چنانچہ سکھ فوج جس کے دل میں ہری سنگھ کی یاد تازہ تھی، اور جسے یہ بھی یاد تھا کہ ہری سنگھ افغانوں کے دعووں کا کتنا زبردست مخالف تھا، اس نتیجہ پر پہنچی کہ برطانوی حکومت اسے گھیرے میں لینے اور کمزور کرنے کے لئے ایسے دشمن سے ساز باز کر رہی ہے جسے سکھ ایک بار شکست دے چکے ہیں۔ بہر حال یہ ظاہر تھا کہ سکھ اپنے آپ کو خطرہ میں گھرا ہوا سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے لڑائی کی ٹھان لی۔ ایک بار پھر پشاور کی کشش نے جنگ کی نوبت پہنچا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ سکھوں کی جنگوں کا اصل سبب یہی تھا۔

سکھوں کی پہلی جنگ فروری ۱۸۴۶ء میں سوبراں (SOBRAON) کی موت کے ساتھ ختم ہوگئی۔ رنجیت کی سلطنت سکڑ کر رہ گئی۔ کشمیر اور شمالی پہاڑی علاقے ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ھاتھ لگ گئے۔ اور انگریزوں نے ستلج اور بیاس کے درمیان دوآبہ جالندھر پر قبضہ کر لیا۔ لاہور اور ملتان کے آس پاس کا علاقہ سکھ سلطنت میں شامل رہا لیکن انگریزوں کے تحت آ گیا۔ طے یہ پایا کہ گورنر جنرل کا ایجنٹ یا ریزیڈنٹ سکھوں کے دارالحکومت لاہور میں رہا کرے گا۔ سکھوں کی دو لڑائیوں کے درمیان دو سال کی قلیل مدت میں مشہور انگریز ایبٹ، لارنس، ایڈورڈز نکلسن، لمسڈن (LUMSDEN) سرحدی علاقہ کی اسٹیج پر پہلی بار نمودار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ

شروع میں براہ راست اس علاقہ کے نظم و نسق کے ذمہ دار نہیں تھے کیونکہ دوآبہ جالندھر کی طرح ابھی یہ علاقہ انگریزوں کی سلطنت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ لاہور میں برطانوی ایلچی کے اسسٹنٹ تھے اور برائے نام ھی سہی، لیکن سکھ دربار کے ماتحت تھے۔ ان کی کہانی سکھوں کے عہد سے نہیں بلکہ انگریزوں کے عہد سے تعلق رکھتی ھے۔ لیکن سکھوں کی دوسری لڑائی میں سکھوں کی سلطنت کے خاتمہ سے پہلے سرحدی علاقہ میں ایک واقعہ کا تذکرہ ضروری ھے۔

اپریل ۱۸۴۸ء میں ملتان میں ایگنیو اور اینڈرسن کا قتل اس لڑائی کی ابتدا ثابت ھوا۔ دوست محمد نے جسے اب کابل کے تخت پر بیٹھے ھوئے پانچ سال گزر چکے تھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد یہ تہیہ کیا کہ وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھائے اور پشاور پر قبضہ کرنے کے لئے ایک اور کوشش کرے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ھیں سلطان محمد جارج لارنس کو سکھوں کے حوالے کر کے ان کی پناہ میں آ چکا تھا۔ اور اپنی پرانی جگہ پر قائم تھا۔ دوست محمد نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ھے ایک طرف تو وہ سکھوں کو، جو اپنی مشرقی سرحدوں پر انگریزوں سے الجھے ھوئے ھیں یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دے گا کہ پشاور اس کے قبضہ میں آ چکا ھے اور ساتھ ھی ساتھ وہ اپنے سوتیلے بھائیوں کو جو اس کے لئے مسلسل درد سر بنے ھوئے تھے ایسی جگہ نہیں رہنے دے گا جہاں سے وہ اپنی غرض اور آرام کی خاطر سکھوں سے مدد مانگ سکیں اور ان سے ساز باز کر سکیں۔ امیر دسمبر ۱۸۴۸ء میں پشاور پہنچا اس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور لنڈائے دریا کے جنوب کا علاقہ روند ڈالا۔ اس نے یوسف زئی علاقہ کو ھاتھ تک نہیں لگایا۔ اس کے سوتیلے بھائی فرار ھو کر کوھاٹ پہنچ گئے اور ضرورت پڑنے پر اس کے پنجہ سے بچنے کے لئے جنوب کی طرف بھاگنے کے لئے تیار ھو گئے۔ دوست محمد نے اپنے پوتے یعنی اکبر کے بیٹے کو (اکبر ۱۸۴۷ء میں مر چکا تھا) گورنر مقرر کیا اور باغی سکھ جنرل چھتر سنگھ سے جا ملنے کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ اس نے خیرآباد پر قبضہ کر کے سکھوں کو سندھ کے پار آنے سے روک دیا اور ان کی سرگرمیاں چھچھ کے ساحل اور اٹک تک محدود کر دیں۔ دوست محمد نے چھتر سنگھ کو یہ ترغیب دلائی کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں اس کا ساتھ دے۔ دوست محمد نے ایبٹ کو جو ان دنوں گنگھر کی

پہاڑیوں میں سری کوٹ کے مقام پر اپنے مشوانی دوستوں کے پاس مقیم تھا خط لکھا کہ میں پشاور ڈیرہ جات اور ہزارہ پر قبضہ کرنے آیا ہوں۔ اس کے بعد میں بڑی خوشی سے انگریزوں اور سکھوں میں مصالحت کرانے کو تیار ہوں۔ اس نے سکھ فوجوں کی پوری مدد کی یہاں تک کہ ایک مضبوط شہسوار دستہ بھیجا جس نے گجرات کی لڑائی میں جس میں سکھوں کو شکست فاش ہوئی سکھ فوج کے دوش بدوش لڑائی میں حصہ لیا۔ لڑائی کے بعد دوست محمد اور اس کے شہسواروں کا کوہستان نمک، مرگلہ، حسن ابدال دریائے سندھ کے پار پشاور کے میدانوں یہاں تک کہ درۂ خیبر کے دھانہ تک تعاقب کیا گیا اور وہ درہ میں اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے بھاگ گئے جو سپاھی اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے وہ مارے گئے۔ اس کے بعد کسی افغان فوج کو وادی پشاور میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ھے اور ممکن ھے ایسا ھی ہو کہ پہلی افغان جنگ کے پس منظر میں اعلیٰ پیمانہ پر جو حکمت عملی کام کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ روس وسطی ایشیا کو پار کر کے جنوب کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور برطانوی طاقت جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اس پیش قدمی کو روکنا چاھتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مقامی طور پر سکھوں اور درانیوں دونوں کے ذہنوں میں پشاور کے حسین شہر اور صوبہ کا نام انہیں جنگ پر اکسا رہا تھا اور ان کے ذریعہ برطانوی حکومت پر بھی اپنا اثر ڈال رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہی جھگڑے کی جڑ ایک لحاظ سے سکھوں کی پہلی لڑائی کا بھی سبب بنی اور اسی کی وجہ سے افغان امیر نے سکھوں کی دوسری لڑائی میں براہ راست حصہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سرحدی اضلاع انگریزوں کے قبضہ میں آ گئے جنہوں نے سکھوں کی جگہ سنبھالی تھی۔ اور مجموعی طور پر بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ھے کہ خود سرحدی علاقہ کے باشندے جن سے اس سلسلہ میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا ایبٹ کی اس رائے کے حامی معلوم ہوتے تھے کہ قبائل سکھوں کے مقابلہ میں درانیوں سے کم نفرت نہیں کرتے۔ سدوزئی اور بارک زئی دونوں درانی خاندانوں نے قبائل کو لوٹا کھسوٹا تھا اور خاص طور پر پشاور کے سرداروں نے تو کئی بار مال اور مرتبہ کے لالچ میں انہیں سکھوں کے ھاتھ فروخت

کر دیا تھا۔ شاہ شجاع اور دوست محمد کی ریشہ دوانیوں سے قبائل کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا تھا بلکہ ان پر جنگ اور پریشانی نازل ہوئی تھی۔

پشاور کوہاٹ بنوں اور ڈیرہ جات غرض ہر جگہ سکھا شاہی صرف پہاڑوں کی گہرائی تک پہنچی تھی اور وہاں بھی اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ اس زمانہ میں سکھ حکمران پہاڑی علاقہ یاغستان یعنی باغیوں کے علاقہ کے باشندوں سے جو تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے تو وہ پٹھان دلالوں کے ذریعہ قائم کرتے تھے۔ ان میں پشاور کے آس پاس کے خلیل اور مہمند ارباب مشہور ہیں۔ ارباب رب کی جمع ہے جو خدا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور جس کے لفظی معنی ہیں مالک۔ یہ لفظ درانی اور غالباً مغلیہ دربار میں خطاب کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خاص طور پر یہ خطاب درۂ خیبر کے پاس میدان میں بسنے والے قبائل کے خاندانی سرداروں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ درانی اور سکھ حکمران افریدی اور ان دوسرے قبائل سے اپنے معاملات طے کرنے کے لئے جن کی زبان خود درانی بھی نہیں سمجھتے تھے ان ہی سرداروں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ تہکال لنڈی اور پشاور کے آس پاس دوسرے دیہات میں بہت سے خاندان اب بھی یہ خطاب خاندانی امتیاز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سکھوں نے پہاڑی علاقوں پر قبضہ کرنے یا وہاں کے باشندوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ کبھی سوات، بنیر، باجوڑ، وادی کرم یا وزیرستان میں داخل نہیں ہوئے۔ پہاڑی قبائل کے ساتھ براہ راست سیاسی تعلقات اور کابلی حکمرانوں کے ساتھ سرحدوں کا تعین برطانوی عہد کی باتیں ہیں۔ لیکن بعد میں آنے والے بہت سے واقعات جن میں نظم و نسق کی علاقائی حد بندی بھی شامل ہے اس کی ابتدا پشاور پر سکھوں کے قبضہ ہی کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں سرحدی علاقہ کے ان ہی واقعات سے کابل کے موجودہ حکمرانوں کی تحریک کے آغاز کا بھی سراغ ملتا ہے جس کا مقصد افغانوں اور پٹھانوں کو مرکز کی طرف واپس لانا ہے۔ پشاور درانیوں کا موسم سرما کا صدر مقام رہ چکا ہے وادی پشاور اور صوبہ سرحد کے میدانوں کے کچھ دوسرے حصے درانی سلطنت کا

سب سے زیادہ حسین حصے تھے۔ بہت سے قبائل جو لوٹ کھسوٹ کے عادی بارک زئی بھائیوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے سدوزئیوں کی حمایت میں لڑ چکے تھے۔ سدوزئی اور بارک زئی جنگ کے بغیر کبھی پشاور سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ سلطان محمد اور اس کے بھائیوں کا مصاحبان خاندان برسوں پشاور میں رہا تھا اور اس شہر کو پسند کرتا تھا۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کے جانشین جو کابل کے حکمراں ہیں ایک پرانی تمنا پوری کرنے کے لئے بدلتے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے چین اور تیار نظر آتے ہیں۔ عہد حاضر میں پختونستان کی تحریک کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

جو لوگ پختونستان کے حامی ہیں انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۸۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک صدی کے عرصہ میں قبائل کے لئے ایک وسیع میدان کھل گیا ہے۔ اب ان کی تقدیر ایک ایسے مقصد سے وابستہ ہو گئی ہے جو کابل کے تخت پر بیٹھنے والے ایک دوسرے خاندان کی حمایت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عظیم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہی قبائل جن کی نمائندگی کا دعویٰ آج درانی خاندان کی زبان پر ہے اس خاندان کے اسلاف نے ان کے لئے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے لئے قبائل ان کے شکرگزار ہوں۔ اس لئے، یہ درست ہے کہ افغانستان کے موجودہ وزیر اعظم سردار داؤد خان ایک پرانے دعوے میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ جن قبائل سے مخاطب ہیں وہی ان کے اس دعوے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

سکھوں کے خلاف پٹھانوں کی جدوجہد کے ہیرو نہ درانی ہیں نہ شاہ شجاع اور نہ دوست محمد۔ سلطان محمد پشاور اور کوہاٹ میں اتنے عرصہ رہے اور قبائل کا خیال رکھنے کے باوجود اس زمرہ میں قطعاً شمار نہیں ہو سکتا۔ اصل ہیرو بے جگری سے لڑنے والے اور کسی مدد کی پروا نہ کرنے والے یوسف زئی اور خٹک قبائل ہیں جنھوں نے نقصان کی پروا نہ کی اور پیر سباک کی لڑائی میں رنجیت سنگھ کی فوجوں کو جنھیں فرانسیسی جنرل نے تربیت دی تھی شکست کے کنارے لا کھڑا کیا۔ وہ نامور ان قبائل کے رہنما سید احمد اور سید اکبر شاہ ہیں۔

سید اکبر کی اولاد میں سے ایک شخص نے بڑے پراثر انداز میں مجھ سے کہا ''سید احمد بریلوی مجدد کی حیثیت سے تشریف لائے تھے اور ہمارے اجداد ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور انہیں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ ہم مظلوموں کو ظالم سکھوں کے پنجہ سے نجات دلانے آئے تھے۔ انہیں خود سب سے بڑی قیمت ادا کرنی پڑی یعنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے لیکن دنیا جانتی ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد پندرہ سال کے اندر سکھا شاہی بھی ختم ہو گئی''۔

حصہ چہارم

انگریزوں کا عہد اور بعد کے واقعات

۱۸۴۶-۱۹۵۷ء (۱۲۶۳-۱۳۷۷ھ)

فصل بستم

سرفروش

انگریز جب ۱۸۴۹ء میں دوست محمد کی سوار فوج کا تعاقب کرتے ہوئے پشاور پہنچے تو ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور ان کی آمد کو قابل نفرت سکھا شاہی سے نجات کا پیغام سمجھا گیا ۔ انگریز فوج کے ہراول دستہ کی قیادت سر جان گلبرٹ (Sir John Gilbert) کر رہے تھے۔ جب تک درانی فوج کا ایک ایک شہسوار جمرود سے آگے نکل کر درۂ خیبر میں شادی بگیاہ کے قریب پہاڑیوں میں غائب نہیں ہو گیا انگریز فوج نے اپنی باگیں نہیں کھینچیں۔ اس طرح پہاڑوں اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقہ میں نہ صرف سکھوں بلکہ درانیوں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔ شادی بگیاہ کے مقام پر جہاں گلبرٹ نے اپنی فوجوں کو روکا تھا اب بڑی شاہراہ اور وہ ریلوے لائن نکلتی ہے جو اس انتہائی دشوار گزار درہ سے گزرتی ہے ۔ اس جگہ ایک دروازہ اور ایک کنواں بنا ہوا ہے جو صاحبزادہ (۱) کا کنواں کہلاتا ہے ۔ یہ کنواں ایک تعلق اور ایک تصور کی یادگار کے طور پر بنایا گیا ہے جو اس سے پہلے اس درہ سے گزرنے والوں کے تصورات سے کہیں زیادہ پائدار ہے ۔ اس کے بعد درۂ خیبر کے اس دروازہ سے ایسے اثرات داخل ہوئے جو فوجوں اور لٹیروں کے چھوڑے ہوئے اثرات سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں ۔ درۂ خیبر نہ صرف وسطی ایشیا تک پہنچنے کے لئے راستہ بن گیا بلکہ مشرق کی طرف سفر کرنے والوں کے لئے یہ مقام سرحد کے دارالعلوم اور کوہ تاترہ کے

---

(۱) صاحبزادہ عبدالقیوم روس کیپل کے تحت خیبر کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے انہوں نے روس کیپل کے ساتھ مل کر اسلامیہ کالج کی بنیاد ڈالی وہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پہلے وزیر تھے۔

سایہ میں بنائے ہوئے آرٹس اور سائینس کالج کی دھلیز بن گیا۔ لیکن اس وقت گلبرٹ کی شہسوار فوج کی نظر میں یہاں کی سیاہ پہاڑیاں سکھوں کی سلطنت کی سرحد تھیں اور یہ فوج یہیں رک گئی۔

ان کے پیچھے گاف (Gough) کی قیادت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج آئی جس میں انگریز رجمنٹوں کا رنگ سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس فوج نے پشاور اور دوسرے سرحدی اضلاع کو بھی پنجاب کے حصہ کے طور پر جو پہلے ھی انگریزوں کی تحویل میں آ چکا تھا قبضہ میں کر لیا۔ اس نئے صوبہ کی شمال مغربی سرحد نچلی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ اس سرحد پر قائم کی گئی جہاں تک سکھ اپنا علاقہ سمجھتے تھے اور مالیہ وصول کرتے تھے اس سے آگے نہیں۔ اس وقت پہاڑی علاقہ میں گھسنے یا درۂ خیبر اور ایسے ھی دوسرے پہاڑی دروں سے راستہ نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ وادی پشاور کی طرح بنوں اور ڈیرہ جات میں بھی زیراثر علاقہ کی سرحد پہاڑی علاقہ شروع ہوتے ھی ختم ہو جاتی تھی جس طرح سمندر کی لہر پہاڑ سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ھے۔ دامان کے نشیبی علاقوں سے آگے تخت سلیمان کے علاقہ میں کوئی داخل نہیں ہوا اور کرم 'ٹوچی' اور گومل دریاؤں نے پہاڑوں میں جو قدرتی راستے بنا دئے تھے انہیں بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ البتہ وسطی ضلع کوھاٹ میں نئے حکمران نچلی خٹک پہاڑیوں میں ضرور آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ میران زئی وادی سے گزرتے ہوئے ٹل کے مقام پر دریائے کرم کے کنارے تک جا پہنچے۔ تھوڑے ھی عرصہ کے بعد انہوں نے آدم خیل افریدیوں کو درۂ آدم خیل میں سے راستہ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس مختصر سے راستہ سے پشاور اور کوھاٹ کا درمیانی فاصلہ صرف چالیس میل ھے۔ بصورت دیگر پہاڑیاں شروع ہوتے ھی برطانوی قلم رو ختم ہو جاتی تھی اور عام طور پر جو صورت حال اس وقت تھی وھی آج بھی ھے۔ سکھوں کی پرانی سرحدوں پر جو سرحدیں قائم کی گئی تھیں وھی آج بھی آباد ضلعوں اور سرحدی علاقوں کے درمیان حد فاصل ھیں۔ یہ بالکل اسی طرح ھے جس طرح وسطی ایشیا کے نقشہ پر پہاڑوں کا ایک سلسلہ دکھایا جاتا ھے۔

دریائے سندھ سے لے کر پہاڑوں تک انگریزوں نے چار اضلاع قائم کئے جو شمال سے جنوب کی طرف بالترتیب پشاور کوھاٹ بنوں اور

ڈیرہ اسماعیل خان (۱) کہلاتے ہیں۔ جنوب کی طرف اور آگے بلوچ علاقہ سے ملا ہوا ایک اور ضلع ڈیرہ غازی خان بھی ہے جو بالائی سندھ کے اضلاع سے اور نیچے کی طرف واقع ہے اور پہاڑی سلسلہ کے ساتھ اس علاقہ تک واقع ہے جہاں کوئٹہ اور قندھار جانے والی سڑک پر کچی کا ریگستان جنوبی کوہ سلیمان میں بڑی خلیج تک پھیلا ہوا ہے اور پٹھان قبائل کی جگہ بلوچ اور بروھی قبائل کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلی افغان جنگ کے نتیجہ میں سندھ ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۴ء کے درمیانی عرصہ میں سکھوں کی لڑائیوں سے پہلے ھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی قلم رو میں شامل ھو چکا تھا کیونکہ آمدورفت کا راستہ سکھر اور بولان سے ھو کر گزرتا تھا۔ شاہ شجاع نے اسی راستہ افغانستان پر چڑھائی کی تھی۔ کابل میں انگریزوں کی شکست کی وجہ سے سندھ کے امیر لڑائی پر آمادہ ہوگئے ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کا ستارہ گردش میں آگیا ہے چنانچہ انہوں نے چارلس نیپیر (Charles Napiers) کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ انگریزوں کے ساتھ دوستی کا معاھدہ کر لیا جائے۔ آخر میانی اور حیدر آباد کے مقامات پر لڑائیوں میں داد شجاعت دینے کے بعد سندھ کے امیر اپنے علاقے انگریزوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن سندھ کی سرحد کی نگرانی بمبئی کی حکومت کے سپرد کردی گئی اور بڑے عرصہ کے بعد (۱۸۷۶-۸۰ء) جب سنڈیمان (Sandeman) خان قلات کی مدد سے بروھی اور بلوچ علاقہ کے مرتفع میدانوں میں داخل ھوا تو اس سرحد کا مناسب بندوبست کیا گیا۔ انگریزوں کی تحویل میں آنے کے بعد قریباً تیس سال تک اس علاقہ کا انتظام سرحدیں بند رکھنے اور سرحد کے نزدیک جوابی حملہ کی پرزور پالیسی کے ذریعہ کیا گیا جس کی وجہ سے جیکب آباد کے بانی جان جیکب (John Jacob) کا نام مشہور ہے۔

پشاور سے ڈیرہ غازی خان تک سندھ پار کے پانچ شمالی اضلاع اور دریائے سندھ کے دوسری طرف انتہائی شمال میں ہزارہ نئے صوبہ پنجاب کے سرحدی اضلاع کہلائے اور انہیں دو کمشنریوں کے تحت کر دیا گیا۔ ایک پشاور کی کمشنری اور دوسری ڈیرہ جات کی کمشنری۔ پنجاب کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی ہر ضلع ایک ایک ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ پنجاب اس زمانہ میں نان ریگولیشن صوبہ

---

(۱) شروع میں ڈیرہ اسماعیل خان اور بنوں کا ایک ھی ضلع تھا۔

تھا لیکن عملی طور پر اس امتیاز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ریگولیشن والے صوبہ کے مقابلہ میں یہاں کے ڈسٹرکٹ افسر کو فوجداری کے بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے اور بعد میں جب غدر ختم ہونے پر تاج برطانیہ نے کمپنی سے اختیارات لے لئے تو اس صوبے کے اعلیٰ افسروں کا کاڈر (CADRE) صرف انڈین سول سروس کے افسروں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں بہت سے فوجی افسر بھی شامل تھے جو سول ملازمتوں کے لئے رکھے گئے تھے۔ یہ ملا جلا کاڈر پنجاب کمیشن کہلاتا تھا اور ۱۹۰۰ء تک اس میں فوجی افسر شامل ہوتے رہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب کرزن (Curzon) نے سرحدی اضلاع کو ایک علحدہ نظم و نسق کا علاقہ بنا دیا تو اس نئے شمال مغربی سرحدی صوبہ کا انتظام پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے سنبھالا جو بعد میں پولیٹیکل سروس کہلانے لگا۔ اس محکمہ کے لئے بھی سول اور فوجی افسروں کے ملے جلے کاڈر کا طریقہ برقرار رکھا گیا۔ لیکن فوجداری اور دیوانی قوانین، مال، پولیس تعمیرات عامہ اور نظم و نسق کی تمام تفصیلات میں ۱۸۴۹ء کا پنجاب برطانوی ہند کے دوسرے علاقوں سے مختلف نہیں تھا سوائے اس کے کہ گورنر جنرل ڈلہوزی (Dalhousie) نے اس صوبہ کا نظم و نسق چلانے کے لئے ایسے افسر چن کر رکھے تھے جو اس کی نظر میں بہترین تھے۔ شمال میں بسنے والے وحشی اور جنگجو لوگوں کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے نظم و نسق کے لگے بندھے ڈھانچہ میں ردوبدل کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ لاہور میں چیف کورٹ قائم کیا گیا اور دوسرے لوگوں کی طرح پٹھانوں سے بھی یہ توقع کی جانے لگی کہ وہ اپنی سوسائٹی کو جو غلطی کی تلافی دشمن کا خون بہا کر کرتی ہے برطانوی ہند کے قانون کے پنے تلے سانچے میں ڈھال لیں گے۔ لارڈ میکالے (Lord Macaulay) اس وقت تک حکومت کے قانون ساز کی حیثیت سے ہندوستان کا دورہ کر کے واپس جا چکے تھے اور ان کی عظیم الشان تعزیرات ہند مرتب ہو رہی تھی اور ۱۸٦۰ء میں شائع ہونے والی تھی۔ بہرحال ان تعزیرات کے اصول درست تھے اور جہاں تک اس پر عمل کا تعلق ہے انگریزی نظام عدالت کو مکمل اور اعتراض سے مبرا سمجھا جاتا تھا۔

خوش قسمتی سے انگریزی حکومت بدنام ہونے سے بچ گئی کیونکہ قبائل کو اس کڑے سانچے میں ڈھانے کے لئے جو لوگ منتخب کئے گئے وہ تنگ نظر نہیں تھے۔ انہیں بڑی آسانیاں حاصل تھیں کیونکہ شروع میں

حالات سازگار تھے۔ وہ ایسی حکومت کے جانشین تھے جس سے ہر پٹھان شدید نفرت کرتا تھا چنانچہ انگریزوں کو نجات دھندہ سمجھ کر ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ ساتھ ھی ساتھ سکھوں کی طرح سلطان محمد اور دوسرے پشاوری سردار بھی جو اپنی غرض کے لئے سکھوں کے ھاتھ میں کھلونا بنے ھوئے تھے ان کے خلاف بھی نفرت پھیلی ھوئی تھی۔ پشاور پر دوست محمد کے عارضی قبضہ سے اس کا کھویا ھوا وقار بحال نہیں ھوا تھا خاص طور پر اس لئے کہ وہ سکھوں سے جا ملا تھا اور پھر اسے بڑی ذلت کے ساتھ فرار ھو کر درۂ خیبر میں پناہ لینا پڑی تھی۔ اس کے علاوہ ڈلہوزی نے جن افسروں کو چن کر بھیجا تھا ان میں سے ہر ایک کا سکھوں کی دو لڑائیوں کے درمیانی عرصہ میں پٹھانوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ اور یہ حاکم اور ان کے محکوم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور پتہ کی بات یہ تھی جیسا کہ الفنسٹن لکھ چکا تھا کہ انگریزوں اور پٹھان کا مزاج ایک تھا۔ اور دونوں نے اندازہ لگا لیا کہ انہیں انسانوں سے واسطہ پڑا ھے۔ انہوں نے جو وعدے کئے بعض مرتبہ ان کی خلاف ورزی بھی ھوئی ان لوگوں میں وحشی بھی تھے اور مذھبی جنونی بھی۔ جہاں ایک طرف قاتلوں نے اپنے ھاتھ رنگے وھاں دوسری طرف جذبۂ انتقام کھل کر کھیلا لیکن بندھن ٹوٹ نہ سکا اور باھمی احترام اور تعلق خاطر قائم رھا۔

شروع میں حالات جس قدر سازگار تھے ان کا خیال رکھتے ھوئے بھی اس عہد کے انگریز افسر قابل ستائش لوگ تھے۔ وکٹوریہ کے عہد میں ان لوگوں میں سے کچھ کے نام گھر گھر مشہور ھوگئے۔ جان نکلسن، (J. Nicholson) ھربرٹ ایڈورڈز، (Herbert Edwardes) فریڈرک میکسن، (Frederik Mackeson) جیمس ایبٹ (James Abbott) یہ تمام لوگ اپنے عہد میں نامور سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں نے ایسا نام چھوڑا ھے جو تیس سال پہلے تک بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ بوڑھے لوگ اپنے باپ دادا سے سنے ھوئے قصے بیان کرتے تھے اور میں ایک ایسے بوڑھے ملک سے بھی ملا ھوں جو ایبٹ سے ملاقات کر چکا تھا۔

ان سب لوگوں میں نکلسن جو آئرلینڈ کا رھنے والا تھا اسے اپنے عہد میں اپنے ھم وطنوں کا نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ سالہا سال تک نیلسن (Nelson) اور ولف (Wolfe) کے مقابلہ پر دیوتاؤں کا منظور نظر سمجھا جاتا رھا۔ وہ

کم عمری ہی میں انتہائی عروج پر پہنچ کر فوت ہو گیا۔ وہ شیر پنجاب کہلاتا تھا اور مشہور ہے کہ ہزارہ میں ایک نکلسینی فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو اسے اپنا گورو سمجھ کر اس کی پرستش کرنے لگا تھا اور اس کی موت کے بعد اس کا ماتم کرتا رہا۔ دوسروں پر چھا جانے والی شخصیت، بے نور اور کرخت چہرہ، جابر آنکھیں، گھنی سیاہ نوکیلی داڑھی فاخرانہ انداز اداس نظر میں جو مسکرانا نہیں جانتی تھیں۔ یہی اس شخص کا حلیہ تھا جو اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ کشمیری گیٹ پر اس حملہ کے دوران جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں دہلی پر یلغار کا پیش خیمہ ثابت ہوا بری طرح زخمی ہوا اور چونتیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کے ہم عصر اس کا نام اتنے احترام سے لیتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسے دیوتا سمجھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نکلسنیوں کا جو فرقہ پیدا ہو گیا تھا اس میں وہ بھی شامل ہیں۔ اس کے دوستوں ہربرٹ ایڈورڈز اور جان بیکر نے اس کا ماتم وکٹوریہ کے عہد کے مبالغہ آمیز انداز میں کیا ہے۔ انہوں نے اس کی عظمت بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے اور اسے ایسا شہاب ثاقب قرار دیا ہے جو طوفانی رات میں آسمان پر چمکا اور غائب ہو گیا۔ لیکن سب سے زیادہ موثر خراج عقیدت رابرٹس نے پیش کیا ہے جو خود بھی عظیم‌المرتبت انگریز سپہ سالاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں غدر سے پہلے جب رابرٹس پشاور میں تھے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ وادی پشاور کے جنوب میں خٹک علاقہ کی پہاڑیوں میں چراٹ (۱) کی چوٹی انگریز سپاہیوں کے لئے سینے ٹوریم بنانے کے لئے مناسب رہے گی یا نہیں۔ رابرٹس چند روز تک چوٹی کا سروے کرتا رہا اور پانی تلاش کرتا رہا۔ رات کے وقت چوٹی پر ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا کیونکہ افریدی لٹیرے آس پاس چھپے ہوئے تھے چنانچہ وہ ہر روز شام کے وقت چوٹی سے میدان میں اتر آئے تھے جہاں ان کا خیمہ نصب تھا۔ ایک روز انہوں نے دیکھا کہ ان کی غیر موجودگی میں وہیں ایک اور خیمہ لگ گیا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ڈپٹی کمشنر نکلسن کا

---

(۱) بعد میں چراٹ اسی وجہ سے مشہور ہو گیا اور اس کی چٹانوں پر برطانوی رجمنٹوں کے بے شمار نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ چراٹ اس درۂ چراٹ سے مختلف ہے جو یہاں سے ساٹھ میل شمال کی طرف واقع ہے اور جس سے وادی سوات کو راستہ جاتا ہے۔

خیمه ہے۔ نکلسن نے انہیں رات کے کھانے پر بلا لیا۔ رابرٹ لکھتے ہیں ''نکلسن کا نام پورے پنجاب میں مشہور تھا۔ میں نے لوگوں کو ان کا نام جس احترام بلکہ عقیدت سے لیتے ہوئے سنا تھا اس طرح کسی اور کا نام لیتے ہوئے نہیں سنا۔ وہ ان ہی دنوں بنوں سے تبدیل ہو کر پشاور آئے تھے۔ بنوں ایک ایسا ضلع تھا جس کا نظم و نسق بڑا مشکل تھا۔ نکلسن نے جس خوبی سے اس ضلع کا نظم و نسق چلایا اس سے پہلے کسی نے نہیں چلایا تھا .... نکلسن نے مجھے جتنا متاثر کیا اس سے پہلے یا بعد میں کسی اور نے متاثر نہیں کیا۔ میں نے اس جیسا کوئی اور آدمی نہیں دیکھا۔ اس میں ایک سپاہی اور ایک شریف انسان کی تمام صفات جمع تھیں۔ اس کا حلیہ ممتاز اور دوسروں پر چھا جانے والا تھا۔ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص بڑی طاقت کا مالک ہے۔ میرا خیال ہے وحشی اور آزاد منش قبائل کے ساتھ رہنے سہنے سے اس میں یہ بات پیدا ہوئی تھی... اگر نکلسن سے میری دوبارہ ملاقات نہ ہوتی تو میں یہی سمجھتا کہ مجھ پر ان کا اتنا گہرا اثر اس لئے ہوا ہے کہ میں نے ان کی طاقت اور اثر کے متعلق بہت سی حیرت خیز کہانیاں سن رکھی ہیں لیکن جب چند ہفتہ بعد مجھے ان کے اسٹاف افسر کی حیثیت سے کام کرنا پڑا اور ان کی شاندار خوبیوں اور اعلیٰ لیکن سیدھے سادھے دماغ کی جولانیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان سے میری عقیدت اور بھی بڑھ گئی''۔

ایک ایسے شخص کے قلم سے جو خود بھی نامور ہے ایسی تحریر واقعی قابل تعریف ہے۔

رابرٹس نے نکلسن کی اس بے پناہ اثر خیز شخصیت کے راز کو پا لیا تھا۔ ان میں یہ بات غیور قبائل کے ساتھ ملنے جلنے سے پیدا ہوئی تھی وہ قبائل جن کی مردانگی نے نکلسن میں مردانہ صفات کو ابھار دیا تھا یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو چیلنج کرنا جانتے ہیں صحیح قیادت کی تقلید کرتے ہیں اور ایسی دلیری کی پرستش کرتے ہیں جو کامیابی سے ہم کنار ہو۔ لیکن میرے نزدیک تمام شان و شوکت اور عظمت کے ساتھ نکلسن میں کوئی ایسی بات تھی جو انسانوں کو اس سے دور رکھتی تھی۔ اس کے نام سے اپنے خیمہ میں غصہ کی حالت میں ٹہلتے ہوئے اکلیس (Achilles)

کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ نکلسن بڑا جابر اور غیر متحمل مزاج تھا۔ وہ اتنا مغرور تھا کہ لوگ بہ آسانی اس سے لگاؤ پیدا نہیں کر سکتے تھے وہ جائز پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تمام عمر شادی نہیں کی اور وہ مزاج کے اعتبار سے ایسا تھا جیسے ایک عفریت کو قید سے رہا کر دیا گیا ہو۔ بنوں اور حسن ابدال میں (اس کا اردلی حیات خان (۱) واہ کا رہنے والا تھا) نکلسن عوام کے سرپرست کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جابر محنتی اور اپنی مرضی کے مالک سردار کی حیثیت سے مشہور ہے۔ وہ مصنف مزاج ضرور تھا لیکن جو لوگ اس کی کسی بات کی مخالفت کرتے تھے ان کے لئے مصیبت تھا۔

ہندوستان اور پاکستان میں نکلسن کی بہت سی یادگاریں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کانسہ کا بنا ہوا مجسمہ ہے جو دھلی میں کشمیری گیٹ سے باہر دو سو گز کے فاصلہ پر ایک باغ میں نصب ہے (۲)۔ اس میں نکلسن کو اس حالت میں دکھایا گیا ہے کہ وہ بڑے فخر کے ساتھ سر اٹھاتے ہوئے ہے اس کا ھاتھ تلوار کے قبضہ پر ہے اور وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے شہر کی فصیل کے اس شگاف کو دیکھ رہا ہے جہاں وہ گر کر فوت ہوا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ نمایاں یادگار ایک مستطیل لاٹ ہے جو ۱۸٦۸ء میں درۂ مارگلہ (۳) کے ایک ٹیلہ پر نصب کی گئی ہے۔ یہ جگہ راولپنڈی سے سولہ میل شمال مغرب میں واقعہ ہے اور سرحدی علاقہ در اصل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نکلسن نے اس مقام پر ۱۸۴۸ء کے شروع میں سکھوں کی دوسری جنگ کے دوران چھتر سنگھ کے خلاف میدان جنگ میں انگریز فوج کی کمان کرتے ہوئے داد شجاعت دی تھی۔ یہ لاٹ درہ کے اوپر پہاڑی چوٹی پر نصب ہے۔ نیچے اس درہ میں سے ریلوے لائن اور جرنیلی سڑک گزرتی ہے۔ یہ لاٹ دونوں طرف بیس بیس میل کے فاصلہ سے صاف نظر آتی ہے۔ نیچے سڑک کے کنارے ایک باؤلی بنی ہوئی ہے جو چٹان کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ اسی چٹان پر نکلسن کے

---

(۱) واہ کے مشہور خاندان کے مورث اعلیٰ سردار حیات خان سی ایس آئی۔

(۲) ۱۹٦۱ء میں یہ مجسمہ دھلی سے ہٹا دیا گیا اور TYRONE کے ROYAL DUNGANNON SCHOOL کے احاطہ میں نصب کر دیا گیا جہاں نکلسن نے تعلیم پائی تھی۔

(۳) A YEAR ON THE PUNJAB FRONTIER

کارنامے کندہ ہیں۔ جب میں آخری مرتبہ یہ جگہ دیکھنے گیا تو باؤلی کے فوارہ میں پانی آنا بند ہو چکا تھا۔

سب سے زیادہ پر اثر یادگار وہ لوح ہے جو بنوں کے چھوٹے سے گرجا میں آج بھی نصب ہے۔

وہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں سے مالا مال تھا
وہ قلم اور تلوار دونوں کا دھنی تھا
غزنی کے پہاڑ اس کی مستقل مزاجی کی گواہی دیتے ہیں
پنجاب کے گیتوں میں اس کے مردانہ کارنامے بیان کئے جاتے ہیں
سرحد میں امن و امان اس کی مستحکم حکومت کا ثبوت ہے
اس کے ملک کے دشمنوں کو اچھی طرح معلوم ہے
کہ وہ میدان جنگ میں کتنا خوفناک تھا
اور ہم اس کے دوست
بار بار اس کی شرافت، فیاضی اور صداقت کو یاد کرتے ہیں۔

ہربرٹ ایڈورڈز نکلسن کے دوست اور اس کے اعلیٰ افسر تھے۔ ایڈورڈز بنوں میں نکلسن سے پہلے رہ چکے تھے اور جب وہ پشاور میں کمشنر تھے تو نکلسن ڈپٹی کمشنر تھے۔ نکلسن کا طمطراق تھوڑا بہت ایڈورڈز کے حصہ میں بھی آیا تھا لیکن وہ زیادہ انسان دوست تھے ان تک رسائی آسان تھی اور وہ ہنسی مذاق پسند کرتے تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ اپنی بے مثال کتاب (۱) میں لکھا ہے جو در اصل ان کے اس زمانہ کے روزنامچوں کا خلاصہ ہے۔ اس میں ۱۸۴۹ء سے بعد کے واقعات ہی درج نہیں ہیں جب پنجاب برطانوی ہند کے ایک صوبہ کی حیثیت سے انگریزوں کی تحویل میں آ چکا تھا بلکہ ۱۸۴۷-۴۸ء کے واقعات بھی درج

ضروری نوٹ:- یہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۶۴ فٹ نوٹ نمبر ۳ کے لئے پڑھا جائے اور صفحہ ۳۶۴ کا فٹ نوٹ نمبر ۳ اس کے لئے پڑھا جائے۔

(۱) مارگلہ میں نکلسن کی لاٹ کے قریب جو گاؤں آباد ہے وہ سنگ جانی (جان کا پتھر) کہلاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس گاؤں کا نام جان نکلسن کے نام پر رکھا گیا ہے جن کی لاٹ قریب ہی واقع ہے۔ لیکن یہ خیال جارج لارنس کی ڈائری کی ایک عبارت سے جو ۱۲ فروری ۱۸۴۷ء کو لکھی گئی ہے غلط ثابت ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ ۱۲ فروری ۱۸۴۷ء کو سنگ جالی گئے۔ یہ تاریخ مارگلہ میں نکلسن کی لڑائی سے چند مہینے پہلے ان کی موت سے قریباً دس سال پہلے اور اس یادگار کے نصب ہونے سے اکیس سال پہلے کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ سنگ جانی کسی اور جان کے نام پر آباد ہوا ہے۔

ہیں۔ یہ سکھوں کی دو لڑائیوں کے درمیان عارضی سکون کا زمانہ تھا جب ایڈورڈز اور دوسرے حاکم لاہور میں انگریز ریزیڈنٹ نہری لارنس کے نائبین کی حیثیت سے شمال مغربی سرحد پر وہ کام کرنے آئے تھے جو سکھ نہیں کر سکے تھے یعنی پٹھان قبائل کو اعتماد میں لینا اور نظم و نسق کو انصاف کی بنیاد پر قائم کرنا۔ سکھ مالیہ وصول کرنے کے لئے اپنی فوج بھیج دیتے تھے جو خوب لوٹ مار مچاتی تھی۔ وہ اضلاع کے صدر مقامات کے سوا کسی اور علاقہ پر قبضہ نہیں کر سکے تھے۔ نووارد انگریز حاکموں کی یہ کوشش تھی کہ عوام سے معاملات طے کر لئے جائیں اور ان ھی لوگوں میں سے ریزرو فوج بھرتی کرنے کے ساتھ ساتھ رعایا کی مرضی اور خیر سگالی بھی حاصل کی جائے۔ اس کام میں ایڈورڈز نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔ بنوں میں جہاں وہ سب سے پہلے متعین ہوئے ان کی آمد کے وقت لوگ قلعوں میں محصور رہتے تھے اور جب وہ تبدیل ہو کر گئے تو پوری آبادی کو مطمئن اور شاد و خرم چھوڑ کر گئے۔ جب سکھوں کی دوسری لڑائی چھڑی تو ایڈورڈز نے بنوں سے فوج بھرتی کی اور ملتان پر چڑھائی کر دی۔ اس نے اپنی موجودگی اور بہادری سے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ ایڈورڈز فوج بھرتی کرنے میں اس لئے کامیاب ہوا کہ اس نے کچھ مستقل مزاجی اور کچھ چالبازی سے کام لیا لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔

نکلسن کی طرح ایڈورڈز بھی لمبا تڑنگا تھا اس کی بھی گھنی داڑھی تھی اور اس کی شخصیت دوسروں پر چھا جاتی تھی۔ لیکن نکلسن کے مقابلہ میں وہ بھاری بھر کم اور موٹا تازہ تھا۔ ایک مرتبہ وہ اور نکلسن چھٹی پر لندن گئے ہوئے تھے اور پکاڈلی میں ٹہل رہے تھے دونوں اپنی متضاد شخصیتوں کی وجہ سے مرٹن اور میکڈالین کے مینار معلوم ہو رہے تھے۔ جیسا کہ وکٹوریہ کے عہد میں رواج تھا ایڈورڈز بھی پرانے خیال کے پابند مذہب عیسائی تھے۔ جب وہ پشاور میں تھے تو انہوں نے سرحدی علاقہ میں عیسائی مبلغوں کو بلوایا اور شہر کے مشہور کالج کی بنیاد رکھی جو ان ھی کے نام سے مشہور ہے اور ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔ نکلسن کے برخلاف ایڈورڈز مرنجاں مرنج انسان تھے ان تک رسائی آسان تھی اور وہ دوسروں کی کوتاہیوں کو درگزر کرنا جانتے تھے۔

اسی لئے ان کی یاد اس سرفروش کے مقابلہ میں جو ان کا ماتحت تھا زیادہ تازہ ہے یہ اور بات ہے کہ اس یاد کے ساتھ اتنا طمطراق وابستہ نہیں ہے۔ ایڈورڈز کی موجودگی میں فضا میں کبھی گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ یاروں کا یار تھا۔

ہم نے کبھی نکلسن سے کسی ایک پٹھان کے بارے میں نہیں سنا جس سے وہ متاثر ہوا ہو۔ دیوتا ایسے نہیں ہوتے۔ اور نامور لوگ کبھی اچھے ساتھی نہیں بن سکتے۔ ایڈورڈز کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بنوں میں جس پٹھان کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے وہ اسپرکئی احمد زئی وزیر سوان خان تھا جسے ایڈورڈز سواھن خان وزیری کہتے تھے۔ جب ایڈورڈز بنوں پہنچے تو انہیں جو کام انجام دینے تھے ان میں سب سے مشکل یہ تھا کہ ان وزیری قبائل سے معاملات طے کئے جائیں جو اپنا وطن چھوڑ کر بنوں کے نخلستان پر قبضہ کر رہے تھے کیونکہ میدان میں رہنے والے شیتک بنوچیوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ مستقل مزاج تھے اور لڑنا بھی خوب جانتے تھے۔ روزنامچوں میں اس طاقتور وزیر سردار سے ایڈورڈز کی پہلی ملاقات کا حال بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے (۱)۔

”ہمسایہ وزیر قبیلہ کا سردار ملک سوان خان میری دعوت پر میرے کیمپ میں مجھ سے ملنے آیا۔ وہ ایک طاقتور سردار ہے اور اس کے ہم وطنوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی بادشاہ کو خراج نہیں دیا بلکہ دوسرے تمام قبیلوں کو لوٹ کر ان سے مال غنیمت کی شکل میں خراج وصول کرتے رہے ہیں۔ سوان خان بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ اس قبیلہ کے سردار کو ہونا چاہئے۔ وہ بڑا لمبا چوڑا انسان ہے اور اس کا گلہ شیر جیسا اور ہاتھ برفانی ریچھ جیسا ہے۔ وہ بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھا جس کے چھلّوں میں چمڑے کے تسمے پڑے ہوئے تھے۔ وہ دیوتاؤں کی شان سے میرے قالین کو پامال کرتا ہوا آیا۔ ہندوستانی ملازم سکتے میں آگئے اور

(۱) سوان خان کا بیٹا مانی خان بھی احمد زئی وزیر قبیلہ کا سردار تھا وہ بڑا لحیم شحیم انسان تھا۔ اس کا قد چھ فٹ چھ انچ اور ہاتھ پاؤں دیو جیسے تھے سوان خان کا پوتا میر اعظم خان میرے شناساؤں میں سے تھا۔

ڈرنے لگے کہ کہیں زمین شق نہ ہو جائے۔ وہ میلے سوتی کپڑے پہنے ہوئے تھا البتہ اس نے اپنے سینہ پر گلابی لنگی ڈال رکھی تھی اور سر پر جس میں کبھی کنگھی نہیں ہوئی تھی ایک قیمتی سیاہ رنگ کی شال رکھ چھوڑی تھی۔ میں نے تصنع کے بغیر اس حالت میں ایسا شاندار انسان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تعظیم کے لئے نہیں جھکا بلکہ سیدھے طریقہ سے سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا،،۔

یہ ایک وزیر ملک کی صحیح تصویر ہے۔ ایڈورڈز نے یہ بات جتا دی کہ وہ وزیر قبائل کو حکومت کے تحت لانے کے لئے وزیرستان میں داخل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لیکن اس نے سوان خان پر یہ بات واضح کر دی کہ جن وزیریوں نے بنوں کے میدان کی زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے انہیں لگان ادا کرنا ہو گا۔ ایڈورڈز نے یہ بات بھی بھانپ لی کہ اسے وزیر قبیلہ کا اعتماد حاصل ہو گیا تو بنوں ضلع میں بندوبست اراضی کے کام میں بڑی مدد ملے گی۔ اس لئے اگر مذاکرات کے دوران کوئی ایسی بات ہو گئی جس سے لڑائی کی نوبت آگئی تو بنوچی قبائل طاقتور وزیریوں سے مدد مانگ لیں گے اور انہیں میدان میں لا کھڑا کریں گے۔ اگلے روز ملک ایڈورڈز سے پھر ملنے آیا۔

''... میں نے اسے بتایا کہ میں نے سنا ہے اس کے کچھ قبیلہ والوں نے بنوں میں زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے اگر ایسا ہے تو انہیں بھی بنوچیوں کی طرح مہاراجہ کو لگان ادا کرنا چاہئیے،،۔ ''لیکن انصاف تو کیجئے۔ ہم نے تو اس شرط پر زمین خریدی ہے کہ ہم اس کی قیمت یکمشت ادا کر دیں گے۔ کیا زمین فروخت کرنے والوں کو ہمیشہ لگان ادا کرتے رہنا پڑے گا؟ کیا یہ معاملہ ہے؟ کیا میں جھوٹا ہوں؟ نہیں تم وزیری ہو اور وزیری کبھی جھوٹ نہیں بولتے للهذا میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ معاملہ کس طرح طے ہو گا۔ میں آ کر زمینیں دیکھوں گا دونوں فریقوں کا مقدمہ سنوں گا اور پھر تمہیں بتاؤں گا کہ میری کیا رائے ہے۔ اس کے بعد اگر تم یہ سمجھو کہ انصاف یہی ہے کہ تم لگان ادا کرو تو میں

تم سے لگان وصول کروں گا اور اگر تم یہ سمجھو کہ انصاف یہی ہے کہ تم لگان ادا نہ کرو تو میں لگان کی معافی کی سند لکھ دوں گا۔ لیکن تمہیں ایک وزیری کی حیثیت سے اپنی عزت کا خیال رکھنا ہو گا۔ اس پر سوان خان نے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا میرا ہاتھ پکڑا اور اتنی زور سے جھٹکا کہ معلوم ہوتا تھا میرا کاندھا اتر جائے گا۔ وہ چنگھاڑا۔ ''راضی۔راضی۔ یہی انصاف ہے''۔

ایڈورڈز نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ اکھڑ سردار جس میں بہت سی خوبیاں اور ایک وحشی قوم کی معدودے چند کوتاہیاں تھیں اس سلوک کو کبھی فراموش نہ کر سکا۔ بعد میں جب ایک مرتبہ مچن خان گاؤں میں میرا گزر ہوا تو ''اس سردار نے مجھے اپنے مضبوط بازؤں میں جکڑ لیا اور اتنی زور سے دبایا کہ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ جب یہ سردار ہمارے کیمپ میں ہوتا تھا تو ہم وزیری قبائل کی چراگاہوں میں اپنے آپ کو ایسا محفوظ سمجھنے لگتے تھے گویا لاہور کے قلعہ میں بیٹھے ہیں''۔ آگے چل کر ایڈورڈز بتاتے ہیں کہ پٹھانوں سے نپٹنے کا راز کیا ہے۔ ''جو شخص یہ کتاب غور سے پڑھے گا اسے اندازہ ہو گا کہ میں ان اکھڑ اور وحشی لوگوں پر کتنا بھروسہ کرتا تھا یہ بھروسہ کتنا صحیح تھا اور اس کے بغیر میں کتنا بے بس ہوتا''۔

اس کے بعد ایک ایسا نکتہ آتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی کمزوریوں کو کتنا سمجھتا تھا اور اس سے ایڈورڈز کے انداز فکر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

وہ لکھتا ہے۔ ''وزیری آداب کا نمونہ یہ ہے کہ آج سوان خان نے کہا مجھے چند روز کی رخصت دیجئے تاکہ میں گھر جا کر اپنی بیوی کے پاس سو سکوں''۔ بنوچی کے آداب کا نمونہ یہ ہے۔ ارسلا خان نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے فرش پر بیٹھنے کی اجازت دوں تاکہ وہ میری یاد میں مستغرق ہو جائے کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ان باتوں کو فلسفیانہ طریقہ سے سوچنا چاہئے کیونکہ کہنے والے کی نیت بری نہیں ہوتی۔

جب میں ۳۲-۱۹۳۰ء میں ضلع پشاور کا ڈپٹی کمشنر تھا اس وقت تک وہ بنگلہ اپنی جگہ موجود تھا جس میں ایڈورڈز اور نکلسن پشاور میں اپنے تعین کے زمانہ میں ساتھ رہتے تھے۔ یہ بنگلہ بڑے خوبصورت ڈیزائن کا بنا ہوا تھا۔ اس کی عمارت کچی اینٹوں کی تھی جن پر سفیدی کی گئی تھی۔ روشنی کے لئے بڑی بڑی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں برآمدوں میں بڑی ٹھنڈ رہتی تھی۔ بنگلہ کے چاروں طرف وسیع سبزہ زار تھے جن پر بڑے بڑے برگد کے درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔ بنگلہ پر سنگ مرمر کی ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا کہ ایڈورڈز اور نکلسن یہاں رہتے تھے۔ انگریزوں کے سرحد سے رخصت ہونے سے کوئی دس سال پہلے کسی نے اصلاح کے جوش میں اس تختی کو اتار پھینکا اور اس کی جگہ اور تختی لگا دی۔ پرانی عمارت کی یہ تختی محفوظ ہے اور نئی عمارت کے آگے لگا دی گئی ہے جس سے غلط مطلب نکلتا ہے۔ کیونکہ تختی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایڈورڈز اور نکلسن موجودہ عمارت میں رہتے تھے۔ باغ آج بھی پہلے کی طرح خوبصورت ہے لیکن اس عمارت کی روح نکل چکی ہے۔

ایڈورڈز نے پشاور کے کمشنر کا عہدہ ۱۸۵۳ء تک نہیں سنبھالا تھا۔ ان سے پہلے اس عہدہ پر فریڈرک میکسن مامور تھے جو اسی سال ایک جنونی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ میکسن ابتدائی برطانوی عہد کے انگریز افسروں میں سب سے پرانے اور سب سے زیادہ تجربہ کار تھے۔ وہ پہلی جنگ افغان کے دوران یعنی ۴۲-۱۸۳۹ء میں سرحد ھی میں تھے۔ انہوں نے درۂ خیبر کھلا رکھا اور افریدیوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ افریدی انہیں پہاڑی علاقہ میں جنگی حکمت عملی کا بہترین ماہر سمجھتے تھے۔ یہ مشورہ میکسن ھی نے دیا تھا کہ جب درہ میں سے فوج گزر رہی ہو تو اس کی حفاظت کے لئے پہاڑی چوٹیوں پر چوکیاں قائم کی جائیں۔ اسی چال کی بدولت پولک ۱۸۴۲ء میں درۂ خیبر میں سے راستہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔

ایڈورڈز کے برعکس میکسن نے کوئی ڈائری نہیں چھوڑی۔ نکلسن کے برخلاف وہ اس برادری میں شامل نہیں تھے جس میں فرد واحد کی عزت ساتھیوں کی نظروں میں بڑھنے کی وجہ سے پوری قوم کی نظروں میں بڑھ



پشاور میں ڈپٹی کمشنر کا پرانا مکان
ہربرٹ ایڈورڈ اور جان نکلسن کی رہائش گاہ

جاتی تھی۔ لیکن میکسن کا نام اور یاد ان لوگوں کے دلوں پر نقش ہے جن کی اس نے خدمت کی ہے۔ رابرٹ واربرٹن جو خود بھی افریدیوں کا محبوب تھا میکسن کے بارے میں لکھتا ہے ”میں پشاور، خیبر، جلال آباد غرض جہاں بھی گیا ہوں میں نے یہی دیکھا ہے کہ میکسن کا نام (سفید ریش اسے کشن کاکا (۱) کہتے تھے) ان تمام انگریزوں کے مقابلہ میں جو سرحد میں رہے ہیں زیادہ ادب اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ آج سے پینتالیس سال پہلے بے وقت موت کی نذر ہو گئے۔ ان کے کردار، کارناموں اور زندگی میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو گی جس کی بنا پر خیبر کی پہاڑیوں میں بسنے والوں کے دلوں میں ان کی یاد آج بھی تازہ ہے“۔

یہ عجیب بات ہے کہ سرفروش ساتھیوں ایڈورڈز، لارنس، ایبٹ اور دوسروں کی تحریروں میں میکسن کا تذکرہ شاذو نادر ہی ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے میکسن ان لوگوں کو نام و نمود کا دیوانہ سمجھتا ہو وہ ان کے مقابلہ میں سن رسیدہ تھا اور خاموشی کے ساتھ کام کرنے کا عادی تھا۔ لیکن واربرٹن نے جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ موجودہ صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرہ میں 'کشن کاکا' کا نام پشاور کے آس پاس دیہات کے ان حجروں میں مشہور تھا جہاں دوسرے نام فراموش کر دئے گئے تھے۔ بہادر ہینڈی سائڈ کو بار بار کشن ثانی یعنی دوسرا میکسن قرار دیا گیا۔

میکسن کی کوئی شبیہہ دستیاب نہیں ہے۔ آج ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان کا ڈیل ڈول خدو خال اور نظریں کیسی تھیں۔ لیکن ان کی یادگار پشاور چھاؤنی کے وسط میں کمپنی باغ کے اونچے درختوں کے درمیان ایک مستطیل لاٹ کی شکل میں ایستادہ ہے۔ یادگار کا کتبہ بڑی شاعرانہ زبان میں لکھا گیا ہے جو ڈلہوزی کے زور قلم کا نتیجہ ہے ”وہ تدبیر میں سرد مزاج، جان پر کھیلنے میں بے باک اور میدان عمل میں طاقتور تھا۔ ہندوستانی فوج کو بجا طور پر اپنے ساتھ اس کی موجودگی پر فخر تھا۔ جنگ افغان کے تاریک صفحہ پر میکسن کا نام درخشاں ہے۔ سرحد اس کی چوکی تھی اور مستقبل اس کا میدان تھا۔ خیبر کی پہاڑیاں

---

(۱) آدم خیل افریدی علاقہ کی پہاڑیوں کے نزدیک میکسن فورٹ اب بھی کشن گڑھ کہلاتا ہے۔

اور کوہ سیاہ کی چوٹیاں یکساں طور پر اس کے کارناموں کی گواہی دیتی ہیں۔ وہ موت کے وقت صف اول میں تھا۔ جو دشمن زیر نہیں ہوئے تھے وہ اس کی موت کے بعد اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے... کرنل میکسن کی موت فتح کی صورت میں بھی ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیتی لیکن موجودہ حالت میں اس کی موت حکومت کے لئے جو اسے بہترین اور بہادر ترین سپوتوں میں شمار کرتی تھی سانحۂ عظیم ہے،،

اس مشہور چوکڑی میں ایبٹ کا نام آخر میں آتا ہے۔ انہوں نے تمام ترکام دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ضلع ہزارہ میں کیا جہاں کا اہم قصبہ ایبٹ آباد اب تک ان ہی کے نام سے مشہور ہے وسطی اور زیریں ہزارہ کے کچھ لوگ پٹھان ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگوں نے جن میں یوسف زئی جدون اور ترین (۱) بھی شامل ہیں شمالی پنجاب کے طور طریقے اور زبان اپنالی ہے۔ شمال میں مانسہرہ کے نام نہاد سواتی سوات کے ان پرانے باشندوں کی اولاد ہیں جنھیں بابر کے عہد سے کچھ پہلے پٹھانوں نے سوات فتح کر کے دریائے سندھ کے پار مار بھگایا تھا۔ کلابٹ اور تربیلا کے ہزارہ یوسف زئی نسل کے اعتبار سے کھرے پٹھان ہیں لیکن غیر پختون قبائل کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ اپنی زبان بھول گئے اور ان کی پختون ولی میں پہلی سی شدت نہیں رہی۔ البتہ ابھی تک مشوانیوں کا ہمسایہ قبیلہ موجود ہے جس نے ہری سنگھ کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ یہ لوگ کھرے پٹھان ہیں اور دریائے سندھ اور وادی ہزارہ کے درمیان گنگھر کی پہاڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان کا مرکز کئی دیہات کا ایک جھرمٹ ہے جو سری کوٹ کہلاتا ہے۔ یہ جگہ پہاڑیوں کے اندر محفوظ علاقہ میں واقع ہے۔ یہاں مشوانیوں نے پٹھانوں کے رہن سہن کے دلچسپ طریقے برقرار رکھے ہیں۔ وہ قرن اور صدیاں گزر جانے پر بھی نہیں بدلے۔ سری کوٹ جانے والے کو اس سے الٹی صورت حال پیش آتی ہے جو رپ وین ونکل (۲) کو آئی تھی اور بابر کے زمانہ کے پٹھانوں کی زندگی اس کی نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اگر کوئی مسافر گھوڑے پر سوار ہو کر کسی تنگ گھاٹی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھے

---

(۱) صدر محمد ایوب خان بھی اسی ترین قبیلہ سے ہیں۔

(۲) RIP VAN WINKLE ایک افسانوی کردار ہے جو اصحاب کہف کی طرح سالہا سال تک سویا رہا تھا۔

(گنگر تک پہنچنے کا ایسا کوئی راستہ نہیں ہے جس پر موٹر جا سکتی ہو) تو پہلے تو اسے دیکھتے ہی بندوقوں کے تڑاقوں کی آواز گونجے گی اور پھر اسے قبائلی آ کر گھیر لیں گے جو صورت سے لٹیرے معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں فوج کے پنشن یافتہ صوبیدار ہیں۔ وہ بڑے پیارے اور وفادار لوگ ہیں۔

جب سکھوں کی دوسری لڑائی کے پہلے سال (۱۸۴۸ء) چھتر سنگھ اور دوست محمد نے پشاور اور زیریں ہزارہ پر قبضہ کر لیا تھا تو جیمس ایبٹ نے ان ہی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی۔ اس پناہ گاہ سے ایبٹ جسے حسن ابدال کی طرف سے نکلسن کی مدد حاصل تھی پکھلی (علاقہ مانسہرہ) کی سکھ فوج کو چھتر سنگھ کے ساتھ جا ملنے سے روکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن دھمتوڑ کے جدونوں نے اس کے ساتھ دغا کی اور اسے میدان میں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایبٹ کو فرار ہو کر مشوانی علاقہ میں پناہ لینا پڑی اور اس قبیلہ میں سے اپنے دوستوں کی مدد سے وہ اپنی پوزیشن پر قائم رہا یہاں تک کہ گجرات کی لڑائی میں انگریزوں کو فتح ہوئی اور بچی کھچی سکھ فوج نے ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء کو راولپنڈی کے سرسبز اور دھوپ میں چمکتے ہوئے میدان میں ہتھیار ڈال دئے اس موقع پر جیمس ایبٹ جو غیور مشوانی فوج کی کمان کر رہا تھا راولپنڈی سے آنے والی سڑک پر درۂ مارگلہ پر مورچہ جمائے ہوئے تھا اور اس نے سڑک بند کر رکھی تھی جس کی وجہ سے سکھ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ مشوانیوں نے برے اور بھلے ہر موقع پر اس کا پوری طرح ساتھ دیا۔ انہوں نے یہ رویہ اس لئے اختیار کیا کہ وہ ایبٹ سے محبت کرتے تھے اور وہ اسے ابھی تک نہیں بھولے۔

جیمس ایبٹ مختصر سا لیکن چست و چالاک انسان تھا۔ وہ بڑا دبلا پتلا تھا اور نکلسن اور ایڈورڈز سے بالکل مختلف تھا جو لمبے چوڑے بارعب اور باریش تھے۔ اس کی مونچھیں اکڑی ہوئی تھیں اس کے سبزۂ خط میں سے دو تیز آنکھیں چمکتی نظر آتی تھیں۔ ایک لحاظ سے وہ رابرٹس سے ملتا جلتا تھا اور لوگ بھی رابرٹس کی طرح اس سے بھی بہت مانوس تھے۔ ۱۸۴۹ء کے بعد ایبٹ ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا اور چار سال تک اس عہدہ پر فائز رہا یہاں تک کہ برطانوی حکومت سرحدی

علاقه کے لوگوں کے اس لیڈر کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگه تلاش نه کر سکی که اسے کلکته کے قریب ایشا پور کے بندوقوں کے کارخانه میں بھیج دیا۔

ایبٹ کے روزنامچے آج بھی دستیاب ھیں اور ان سے لکھنے والے کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ھے۔ وہ لکھتا ھے ''میرا اپنا ارادہ یه تھا که میں درہ چلا جاؤں لیکن میرے لوگوں نے مجھے بتایا که اس سے یه غلط فہمی پیدا ھو جائے گی که میں ڈر کر بھاگ گیا ھوں، 'میرا خیال ھے اگر میں خود وھاں پہنچ سکوں تو میں فوج کو اس بات پر تیار کر سکتا ھوں که وہ اپنی ڈیوٹی پر واپس آ جائے، مجھے یقین ھے که اگر میں ناڑہ کے مقام پر سکھ فوج کا مقابله کروں تو پہاڑی باشندے ضرور میرا ساتھ دیں گے (ناڑہ گنگر پہاڑ کی ترائی میں ھری پور کے قریب واقع ھے جہاں سری کوٹ جانے والی بڑی وادی کشادہ ھوتی ھے) ''چھتر سنگھ کا خیمه ھری پور میں میری چوکی کے سامنے نصب ھے یه جگه گنگر پہاڑ کی ترائی میں ھے۔ مجھے یقین ھے که میرے لوگ مردانه‌وار ثابت قدمی کا ثبوت دینے کے وعدے پر قائم رھیں گے... اگر راسته نکالنے کے لئے میرے پاس ایک بھی رجمنٹ ھوتی تو میرے لوگ میرے ساتھ ھو لیتے۔ لیکن وہ کھلے میدان میں توپوں اور شہسواروں کے مقابله پر نہیں ٹھہر سکتے،، میں نے اپنے لوگوں کو جو گنگر کی پہاڑیوں میں رھتے ھیں اکٹھا کیا اور انہیں یه بتانے کے بعد که میں محض ان کی حفاظت کے خیال سے ھزارہ میں ٹھیرا ھوا ھوں انہیں یه یقین دلایا که میں ان کی مرضی کے خلاف اس علاقے میں ایک گھنٹه بھی نہیں ٹھہروں گا۔ پھر میں نے ان سے پوچھا که میں یہاں قیام کروں یا کہیں اور چلا جاؤں۔ سب نے مجھ سے یہیں قیام کرنے کی درخواست کی۔ میں نے جواب دیا که میں اپنے ساتھیوں کی بزدلی کی وجه سے ذلیل ھونے کے لئے یہاں نہیں ٹھہر سکتا (جیسا که دھمتوڑ میں ھو چکا تھا) اور میں نے یه بھی کہا که اگر میں یہاں ٹھہر کر اپنی زندگی آپ کے لئے خطرہ میں ڈالتا ھوں تو ساتھ ھی ساتھ مجھے آپ سے بھی یہی توقع ھے که آپ آخری دم تک میرا ساتھ دیں گے۔ ان سب نے قسم کھائی که وہ ایسا ھی کریں گے اور میں وھاں قیام کرنے پر رضامند ھو گیا۔ یه پہاڑ بڑا خطرناک ھے اس پر صرف ایک ھی بار قبضه ھوا ھے اور وہ بھی دھوکه سے۔ اگر میں مر

جاؤں تو میرا ملک محض فرد واحد سے محروم ہو گا جو اس کے سپوتوں میں سب سے حقیر ہے،، ایبٹ اور اس کے مشوانی ساتھی تمام خطروں اورحملوں کے باوجود کامیابی کے ساتھ گنگر کی حفاظت کرتے رہے۔

جیمس ایبٹ نے نہ صرف اس قصبہ کی بنیاد ڈالی جو اس کے نام سے مشہور ہے بلکہ اس نے مری اور گلیات اور خاص طور پر دو پہاڑی چوٹیاں میران جانی اور مخس پوری دریافت کیں جو شمال میں نتھیاگلی کے اوپر سنتری بنی کھڑی ہیں۔ سینکڑوں انگریز جو چیل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی ان پہاڑیوں پر سکون حاصل کرنے کے لئے آ چکے ہیں انہیں کھیل کا یہ میدان اب بھی یاد ہے۔ ایبٹ نے ہزارہ کے لوگوں میں ایسا نام چھوڑا ہے جو محو نہیں ہو سکتا۔ وہ سیدھا سادہ بہادر اور پیارا آدمی تھا۔ واربرٹن نے ہزارہ کے ایک شخص کا قول نقل کیا ہے جو آج سے پچاس سال پہلے کا ہے ''ایبٹ صاحب سے اس ضلع کے لوگ بڑی محبت کرتے تھے اور اب بھی لوگ ان کا نام ادب سے لیتے ہیں۔ وہ درویش منش تھے اور ہمیشہ اپنے لوگوں کے بارے میں سوچتے رہتے تھے،، ایبٹ نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں 'میرے لوگ، 'میرے لوگ، کا فقرہ بار بار آتا ہے۔

میں ۱۹۲۷ء میں چند ماہ تک ہزارہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر رہا ہوں میں اس زمانہ میں تربیلا کے دورہ پر گیا تھا جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر گنگر کی ترائی میں اتمان زئی مندڑ قبائل کے علاقہ میں واقع ہے۔ یوسف زئیوں کی یہی شاخ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر دو اور گاؤں 'کایا، اور 'کھبل، میں بھی آباد ہے اس زمانہ میں کھبل میں قاسم خان نامی ایک بوڑھا جس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی حیات تھا۔ اس زمانہ میں اس نے اپنی عمر کے سو سال پورے کئے تھے۔ اس نے اپنی عمر کے ثبوت میں دریائے سندھ کے اس سیلاب (۱) کی تفصیلات بتائیں جو ۱۸۴۱ء میں آیا تھا اس وقت اس کی عمر چودہ سال تھی۔ ایبٹ ۱۸۴۷ء

(۱) اس سیلاب کی یاد ابھی تک باقی ہے۔ ایک اور سیلاب کی طرح جو ۱۹۲۹ء میں آیا تھا یہ سیلاب بھی دریا کے بالائی حصہ میں برفانی علاقہ کا ایک بند ٹوٹنے سے آیا تھا۔ سیلاب سے کایا کھبل اور تربیلا زیر آب ہو گئے تھے اور لنڈے دریا تک میں پانی چڑھ گیا تھا۔ سیلاب سے ان دنوں نوشہرہ میں سکھوں کا ایک قلعہ بھی مسمار ہو گیا تھا۔

میں ہزارہ آئے تھے اس وقت قاسم خان کی عمر بیس سال تھی۔ میں نے بوڑھے سے دریافت کیا کہ کبھی ایبٹ سے بھی ملے ہو۔ اس نے جواب دیا ہاں کئی مرتبہ اور مجھے ایبٹ صاحب اچھی طرح یاد ہیں۔ وہ چھوٹے سے قد کے تھے اور مجھ سے زیادہ لمبے نہیں تھے (قاسم خان کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا) میں اس جرگہ میں موجود تھا جس میں ایبٹ صاحب نے ہم سے پوچھا تھا کہ اگر میں سکھوں کا مقابلہ کروں تو کیا تم میرا ساتھ دوگے۔ ہم نے قسم کھائی کہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ ہماری آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ایبٹ صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلکنے لگے۔ اور ہم نے ایبٹ صاحب کا ساتھ دیا۔ وہ ہمارا باپ تھا اور ہم اس کے بچے تھے۔ اب ایبٹ صاحب جیسے انگریز نظر نہیں آتے،،۔

قاسم دو سال بعد مر گیا لیکن جو کہانی وہ بیان کر گیا وہ باقی رہے گی کیونکہ پٹھانوں کی لوک کہانیاں صرف سو سال نہیں بلکہ صدیوں تک باقی رہتی ہیں۔

گلبرٹ ۲۱ مارچ ۱۸۴۹ء کو پشاور پہنچے۔ دس روز بعد ڈلہوزی نے فرمان جاری کر کے دلیپ سنگھ کو تخت سے اتار دیا اور سکھا شاہی کو قطعی طور پر ختم کر دیا۔ سندھ پار کے تمام اضلاع اور ضلع ہزارہ باقی پنجاب کے ساتھ کمپنی کے محروسہ علاقوں میں شامل ہوگئے۔ میکسن پشاور کے پہلے کمشنر مقرر ہوئے اور جارج لارنس (۱) جنہیں چھتر سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ نے چند روز پہلے رہا کیا تھا پشاور کے پہلے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے۔ سر کولن کیمبل (Sir Colin Campbell) جو بعد میں لارڈ کلائڈ (Lord Clyde) کہلائے اور جنھوں نے جنگ کریمیا میں کمانڈر کی حیثیت سے اور لکھنؤ میں انگریزوں کی محصور فوج کو کمک پہنچا کر بڑا نام پیدا کیا سرحدی علاقہ کی کمان سنبھالنے آئے (۲)۔ اس وقت اس علاقہ میں راولپنڈی اور دریائے جہلم کے کنارے تک کا تمام علاقہ شامل تھا۔ یہ کولن کیمبل ہی تھے جنھوں نے شہر کے شمال مغرب میں خیبر کی طرف پشاور چھاؤنی کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے چھاؤنی کو افریدیوں اور دوسرے لٹیروں سے محفوظ

---

(۱) آپ کو یاد ہوگا کہ سلطان محمد نے جارج لارنس کو چھتر سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ ۱۸۴۹ء کے بعد سلطان محمد کو کابل میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

(۲) کیمبل پور ان ہی کے نام پر آباد کیا گیا ہے۔

رکھنے کے لئے یورپی فوج اور کمپنی کی فوج دونوں کو کم سے کم جگہ میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بارکیں اور گارڈ روم شمال مغرب کی طرف ہیں اور ان کے بیچ میں جا بجا رھائیشی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ پچاس سال تک پشاور کو پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ گندی چھاؤنی سمجھا جاتا رہا ہے۔ پشاور کا جاڑا بخار ضرب المثل تھا اور اس کا سبب یہ بتایا جاتا تھا کہ اول تو یہاں کی آبادی بہت گنجان ہے اور دوسرے پشاور کے آس پاس دلدلی زمینوں سے جہاں کھیتی باڑی نہیں ہوتی ابخرات اٹھتے رہتے ہیں۔ ۱۹۰۰ء اور اس کے بعد کی لکھی ہوئی سول اور فوجی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملیریا کا اصل سبب کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ مچھروں سے ملیریا پھیلتا ہے اور آخری بیس سالوں میں اس بیماری پر قابو پا لیا گیا جس سے یہاں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ سال میں آٹھ مہینہ تک پشاور کی آب و ہوا اتنی عمدہ رہتی ہے کہ دنیا میں کہیں بھی اس کا جواب نہیں ہے۔ باقی چار مہینے میں گرم علاقوں سے بھی زیادہ برا موسم رہتا ہے۔ مئی کے وسط سے جولائی کے وسط تک درجۂ حرارت بہت ہی زیادہ رہتا ہے لیکن گرمی خشک ہوتی ہے اس لئے صحت کے لئے مضر نہیں ہوتی۔ اس کے بعد ستمبر کے وسط تک گرمی اور حبس دونوں انتہا کو پہنچ جاتے ہیں اور اس زمانہ میں جتنی بے چینی محسوس ہوتی ہے اس کی مثال صرف خلیج فارس کے علاقہ ہی میں مل سکتی ہے۔

پشاور شہر آج بھی قریب قریب ویسا ہی ہے جیسا الفنسٹن کے زمانہ میں تھا۔ آج بھی پشاور کے متعلق کوئی بیان الفنسٹن کے بیان سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتا۔ چھاؤنی ہر موسم میں خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ چھاؤنی کے بیچ سے گزرنے والی بڑی سڑک جو مال روڈ کہلاتی ہے۔ دو رویہ مکانوں کے باغات پر سایہ کئے ہوئے تناور درختوں میں سے ہلکے ہلکے بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ پرانے کمپنی باغ سے جہاں میکسن کی یادگار نصب ہے اور جس کے گرد جیسا کہ وہاں جانے والوں نے دیکھا ہو گا پیپل برگد چیل اور تاڑ کے تناور درختوں کے گھنے جھنڈ ہیں مختلف اطراف میں سڑکیں

نکلتی ہیں۔ یہ تناور درخت علی مردان خان (۱) کے اس مشہور باغ کے باقیات ہیں جس کا تذکرہ الفنسٹن نے کیا ہے۔ اس باغ میں ایک مکان بھی تھا جس میں اب بریگیڈ ہیڈ کواٹر ہے۔ یہ ان دو پرانی عمارتوں میں سے ایک ہے جو پشاور چھاؤنی میں باقی رہ گئی ہیں۔ کرکٹ گراؤنڈ اور کمپنی باغ کے آس پاس اسی قسم کے اور بہت سے درخت بھی غالباً اسی زمانہ کے ہیں۔ مال روڈ گویا ریڑھ کی ہڈی ہے اور اس کے دونوں طرف بہت سی سڑکیں پسلیوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں ان سڑکوں سے بنفشئی رنگ کے پہاڑ جو زیادہ دور نہیں ہیں صاف نظر آتے ہیں اور طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت بڑے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ چھاؤنی کے مشرقی سرے پر ایک ٹیلے پر خوبصورت گورنمنٹ ہاؤس ہے جس کے سبزہ زار دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چھاؤنی کے حدود سے آگے ہری بھری کھیتیاں نظر آتی ہیں جن کے گرد جیسا کہ الفنسٹن نے بیان کیا تھا نوکیلی پہاڑیوں کا شاندار حلقہ ہے ان پہاڑیوں کے عقب میں گرمیوں میں بھی مطلع صاف ہو تو برف پوش پہاڑ دکھائی دیتے ہیں جو خواب کی دنیا کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں درخت چھوٹے تھے لیکن یہ وہ ماحول تھا جس میں ہمارے ملک سے آئے ہوئے پیش روؤں نے سو سال پہلے اس علاقہ میں کام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ جو پیش رو سکھوں کے عہد میں اور کولن کیمبل سے پہلے آئے تھے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہاں کا کام محض فوج کے بس کی بات نہیں ہے۔ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی پہلی لڑائی ختم ہوتے ہی انگریز ریزیڈنٹ ہینری لارنس نے ہیری لمسڈن کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ ایک بے قاعدہ فوج بھرتی کرے۔ یہ فوج گائڈز کہلائی۔ اس میں سوار اور پیادے دونوں ہی شامل تھے۔ اس کا لباس پریڈ کے لئے نہیں بلکہ موٹے چھوٹے کاموں کے لئے تھا اور اس میں قابل اعتبار مقامی افراد

---

(۱) یہ وہ علی مردان خان نہیں جس نے ۱۶۳۸ء میں قندھار پر دھوکہ سے شاہ جہان کا قبضہ کرا دیا تھا یہ وہ علی مردان خان بھی نہیں ہے جو شاہ جہان کے زمانہ میں کابل کا گورنر تھا اور مغل پورہ لاہور میں دفن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علی مردان خان تیمور شاہ کے عہد(۹۳-۱۷۷۳ء) کا کوئی درانی سردار تھا۔ دوسری پرانی عمارت ایک مقبرہ ہے جو کسی زمانہ میں گائڈز کا میس تھا اور بعد میں سی ایم ایس مشن کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔

بھرتی کئے گئے تھے تاکہ وہ میدان میں باقاعدہ فوج کی مدد کریں اور اس کی آنکھوں اور کانوں کا کام دیں۔ اس اصول کے پیش نظر لال کرتی کی جگہ خاکی رنگ کی ڈھیلی ڈھالی وردی استعمال کی گئی جو بعد میں پوری دولت مشترکہ کی میدانی فوجوں کی جنگی وردی بن گئی۔ پہلا گائیڈ ۱۸۴۶ء کے آخر میں پشاور میں بھرتی کیا گیا اور چند سال بعد پوری کور مردان منتقل ہوگئی جہاں سوار اور پیادے دونوں برقرار رہے یہاں تک کہ دو عظیم جنگوں کے درمیان نئی تنظیم کے تقاضوں کے پیش نظر اس تعلق کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو اسی (۸۰) سال سے قائم تھا۔ لیکن آج بھی گائڈ رسالہ کا کوئی بھی افسر یا سپاہی ایسا نہیں ہے جو مردان کو اپنا روحانی مرکز نہ سمجھتا ہو۔ اور آج پٹھانوں میں بھی گائیڈ پلٹن اور رسالہ کے نام سے وہ یادیں ابھر آتی ہیں جو جذباتی لحاظ سے بڑی قیمتی ہیں۔

سرحد کے متعلق انگریزی میں جو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بے شمار لڑائیوں اور جھڑپوں کی تفصیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان ہی لڑائیوں اور جھڑپوں کو سو سالہ برطانوی عہد کی سرحد کی تاریخ سمجھ لیا گیا ہے۔ میرا اس کتاب میں اس نسخہ پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن گائڈز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سرحد کا تانا بانا ہیں ہیری لمسڈن جو ۱۸۶۲ء تک گائڈز کمانڈر تھا مردان میں یوسف زئی علاقہ کا پہلا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ اور گائڈز کے بہت سے سپاہی یوسف زئی اور خٹک تھے جو اس علاقہ میں آباد ہیں۔ لمسڈن بھی کئی اعتبار سے اتنا ہی بڑا آدمی تھا جتنے انگریزی عہد کے ابتدائی ایام کے سرحد کے دوسرے پولیٹیکل افسر تھے جن کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ رجمنٹ کا مورخ لکھتا ہے ''رجمنٹ کے کمانڈر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور چند ہی کمانڈروں کی یاد باقی رہ جاتی ہے لیکن گائڈز پر لمسڈن کا اثر آج تک گہرائی تک اترا ہوا ہے۔ ہر وقت تیار اور چوکنے رہو۔ اچانک مصیبت آ پڑنے پر ہمت نہ ہارو۔ اچھے ساتھی اور خوش اخلاق انسان بنے رہو یہ وہ سیدھے سادے اصول ہیں جو ایک بہترین سپاہی نے اپنے ساتھیوں کے لئے چھوڑے ہیں''۔

دلاور خان جہانگیرہ کا خٹک تھا۔ جہانگیرہ لنڈائے دریا کے شمال

میں خٹک قبیلہ کے ان دیہات میں سے ہے جو سترھویں صدی کے آغاز میں خوشحال خان کے خاندان نے یوسف زئیوں سے چھین لئے تھے۔ دلاور خان اس علاقہ کا رابن ہڈ تھا۔ وہ جو مہم بھی سر کرتا تھا اس میں ظرافت اور انصاف کے پہلو ضرور شامل ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ مشہور ڈاکوؤں کی طرح لوگوں سے اخلاق کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اس کے سر کی قیمت مقرر ہوگئی تھی۔ اور اسے پکڑنا لمسڈن کے فرائض میں شامل تھا۔ ایک روز لمسڈن اپنے خیمہ سے باہر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی تک دلاور خان کو کیوں نہیں پکڑ سکا۔ اسے خیال آیا کہ یہ شخص جو اس علاقہ کے چپہ چپہ سے واقف ہے بڑا مفید گائڈ بن سکتا ہے۔ لہذا اس نے دلاور کو پیغام بھجوایا کہ وہ اس کے پاس چلا آئے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جب دلاور خان وہاں آیا تو لمسڈن نے اس سے جو باتیں کیں ان کا مفہوم یہ تھا کہ یا تو تم واپس چلے جاؤ میں تمہیں کبھی نہ کبھی گرفتار کر لوں گا اور پھر تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ یا گائڈز میں بھرتی ہو جاؤ تمہاری قسمت نے ساتھ دیا تو تمہیں کمیشن مل جائے گا بعد میں پنشن بھی ملے گی اور لڑائیوں میں بھی حصہ لینے کا کافی موقع ملے گا۔ تمہاری کیا مرضی ہے؟ دلاور نے صرف قہقہہ لگایا اور چپ چاپ واپس چلا گیا۔ چھ ہفتہ بعد وہ پھر واپس آگیا اس مرتبہ اس سے باز پرس نہ کرنے کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے کہا مجھے پیشکش منظور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ میں سلو مارچ نہیں سیکھوں گا۔ اس مشکل پر بھی قابو پالیا گیا اور بڑی ردو قدح کے بعد معاملہ طے ہوگیا۔ بعد میں جب دلاور خان اس اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ گیا جہاں تک وہ پہنچ سکتا تھا تو اس نے لمسڈن کو بتایا کہ اس نے لمسڈن کو دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف سمجھا تھا۔ وہ صرف فوجی زندگی کے گر سیکھنے کے لئے گائڈز میں بھرتی ہوا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ یہ گر سیکھتے ہی وہ اپنی پرانی جگہ واپس چلا جائے گا۔ لیکن اس نے کچھ اور بھی سیکھ لیا ہے۔ وہ جان گیا ہے کہ بہادر لوگ دیانتداری اور سچائی کے ساتھ کس طرح معاملہ طے کرتے ہیں لہذا وہ واپس نہیں گیا۔ بعد میں ۱۸۶۹ء میں اسے سروے کے لئے چترال بھیجا گیا۔ یہ ریاست کئی سال پہلے اس زمانہ میں ہندوستانی سلطنت میں شامل ہو چکی تھی۔ اس زمانہ کے مہتر چترال نے دلاور خان کو گرفتار کر

کے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس پر یہ شبہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو مذہب سے برگشتہ ہونے پر اکسا رہا ہے۔ دلاور خان وہاں سے بھاگ نکلا لیکن چترال اور باجوڑ کے درمیان کسی درہ میں برف میں پھنس کر مر گیا۔ اس نے مرتے وقت اپنے ساتھیوں سے کہا "جاؤ پشاور کے کمشنر کو خبر دے دو کہ گائڈ دلاور خان مر گیا وہ آخری دم تک نمک حلال رہا اور مرتے وقت خوش تھا۔ کمشنر سے کہنا کہ یہ خبر لمسڈن تک پہنچا دے"۔

۱۸۴۹ء میں جو سول فورس بھرتی کی گئی تھی جو بعد میں پنجاب فرنٹیرز فورس (پفرز) کہلائی اس میں گائڈز کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کئی سال تک پفرز پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کے تحت رہے پھر جب کچنر نے فوجوں کو ازسرنو منظم کیا تو وہ باقاعدہ ہندوستانی فوج میں شامل ہو گئے۔ لیکن ۱۹۳۰ء تک گڈ پلٹن کا نام یوسف زئی علاقہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرحد کے ساتھ ہمارے رابطہ کی ابتدائی تاریخ سرفروشوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ ٹولی ایک لحاظ سے انجمن تحسین باہمی تھی۔ پھر بھی اس باب میں جن لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے انداز سے اندھیرے میں ستارے کی طرح چمکا اور ان سب نے ایسا نام چھوڑا ہے جو پٹھانوں کو اب بھی یاد ہے۔ جہاں تک حاکموں کی حیثیت سے ان کی کمزوریوں کا تعلق ہے میں اس کی یہ وجہ سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک حاکم بننے سے پہلے فوجی تھا۔ وہ مرد میدان تھے سوچنا اور منصوبے بنانا ان کا کام نہیں تھا۔ وہ الفنسٹن کی طرح جو ان سے پہلے گزرا تھا خوبی اور نفاست کے ساتھ بات کی گہرائی تک پہنچنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن کسی کو اس مغالطہ میں نہیں رہنا چاہئے کہ پٹھان اس شخص کو اچھا نہیں سمجھتے جو بھرپور مردانہ صفات کا مالک ہو۔

لیکن ان میں جتنی بھی عظمت تھی وہ ایک حد تک ان لوگوں کا دین تھی جن سے انہیں واسطہ پڑا تھا۔ مردانگی، ذہانت، رفاقت وفاداری

حتیٰ کہ ناموری بھی ایک طرح سے ان باتوں کا عکس تھی جو وہ ان لوگوں کے متعلق جن کے وہ حاکم بنائے گئے تھے دیکھتے تھے محسوس کرتے تھے اور سنتے تھے۔ یہ سب کے سب یعنی جارج لارنس، میکسن، اڈورڈز، نکلسن، ایبٹ حتیٰ کہ رابرٹس بھی بذات خود آدھے سے زیادہ پٹھان تھے۔

فصل بست و یکم

بند سرحد پالیسی

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وہ پیش رو کس قسم کے آدمی تھے جو الفنسٹن سے چالیس سال بعد دریائے سندھ کے پار آئے تھے اور جنہوں نے وسطی ایشیا کے اس خطہ میں جس کا ہندوستان سے کوئی حقیقی لگاؤ نہیں تھا ایک نئے صوبہ کی سرحدیں منظم کرنے کا کام سنبھالا۔ انہوں نے کن اصولوں پر اور کن ذرائع سے انتشار کو ایک ایسے توازن میں بدلنے کی کوشش کی جو کتنا ہی نازک سہی لیکن جس کی بنیاد پر جنوب میں برصغیر نے اپنا لائحۂ عمل مرتب کیا۔

حالات غیر معمولی حد تک دشوار تھے۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ کم از کم مغلیہ عہد کے بعد میدانی علاقوں تک میں مضبوط نظم و نسق قائم نہیں رہا تھا اور جہاں تک پاس کے پہاڑی علاقوں کا تعلق تھا وہاں کبھی بھی کوئی نظم و نسق قائم نہیں کر سکا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مستحکم سلطنتوں کی سرحدیں واضح طور پر متعین ہوتی ہیں اور جب نیا نظم و نسق قائم ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دائرۂ اختیار کہاں تک ہے۔ تیسری بات جسے اس وقت اچھی طرح نہیں سمجھا گیا یہ تھی کہ پٹھان نسلی، لسانی، جغرافیائی، تاریخی غرض قریب قریب ہر اعتبار سے دوسرے لوگوں یہاں تک کہ پنجاب کے مسلمانوں سے بھی مختلف تھے۔ بالکل ابتداء میں ایک بات نووارد حاکموں کے حق میں تھی۔ کم از کم سکھوں کے مقابلہ میں انہیں زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایک منفی جذبہ تھا اور یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ جذبہ ہمیشہ قائم رہے گا۔

بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ انگریز میدانی علاقوں کے پٹھانوں سے یورپ سے لائے ہوئے نظام حکومت کے معیار کے مطابق نپٹنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہوں نے پاس کے پہاڑوں میں رہنے والے پٹھانوں کو جو قبائلی نظام میں جکڑے ہوئے تھے ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس زمانہ میں سرحد کے دونوں طرف قبائلی رشتے بڑے مضبوط تھے۔ سرحد کے آر پار آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا اور معاشرتی یا اقتصادی اعتبار سے ان میں فرق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ضروری ہے کہ سابقہ حکمرانوں نے جن میں مغلوں اور درانیوں کے علاوہ سکھ بھی شامل ہیں میدانی علاقہ کے قبائل کو اس زمانہ کے تصور کے مطابق مہذب زندگی کی ذمہ داریوں اور فوائد کا خوگر کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ حکمران ان سے ٹیکس وصول کرتے رہتے تھے اور اس کے بدلہ میں انہوں نے کچھ سڑکیں قلعے اور کچھ شہر بھی تعمیر کر دئے تھے۔ لیکن جب انگریز ججوں اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں پولیس، وکیلوں، اپیل کے نظام، ٹیکس جمع کرنے والوں، بندوبست اراضی اور اس قسم کے دوسرے انتظامات کے ساتھ اس علاقہ میں وارد ہوئے تو اس علاقہ کی آبادی پر نیا دباؤ پڑا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ انگریز اپنے ساتھ ایسے قوانین اور قواعد لے کر آئے تھے جو لوگوں کی نظروں میں اس معیار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے جو پٹھان معاشرہ نے قائم کر رکھا تھا۔

یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انگریزوں کی آمد کے موقع پر دوست محمد خان کی افغان سلطنت کے ساتھ ملنے والی سرحدیں متعین نہیں تھیں۔ شروع میں باقاعدہ پولیٹیکل ایجنسیاں نہیں تھیں اور ایک طرف کابل کی سلطنت اور دوسری طرف پہاڑوں کی ترائی میں آباد اضلاع کے درمیان قبائلی علاقہ بھی متعین نہیں تھا۔ ہماری سرحدوں سے آگے قبائلی علاقہ کو کم از کم عملی طور پر آزاد سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عام طور پر یہ علاقہ غیر علاقہ یا یاغستان یعنی باغیوں کا علاقہ کہلاتا تھا۔ نہ صرف انگریز بلکہ کابل کے حکمران بھی اسے یاغستان ہی کہتے تھے امیر عبدالرحمان نے اپنے سوانح حیات میں اس علاقہ کے لئے یہی نام استعمال کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس زمانہ میں ہندوستان کی سرحدیں آباد اضلاع کی سرحدوں تک محدود سمجھی جاتی تھیں۔ اس سے آگے غیر معینہ علاقہ تھا جو دور

تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کے باشندوں کا میلان نسلی اور مذہبی رشتوں کی بنا پر کابل کی طرف ضرور تھا لیکن وہ نہ کابل کی حکومت کو نہ کلکتہ کی حکومت کو اپنا حاکم مانتے تھے۔ کابل کا حکمران بھی عملی طور پر نہیں لیکن زبانی طور پر اپنا تعلق کسی نہ کسی قبیلہ سے ظاہر کرتا تھا۔ اور یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ قبائلی علاقہ سے گزرنے والی شاہراہوں پر ایک طرح سے کابلی حکمرانوں ہی کا حکم چلتا تھا۔ شروع میں خیبر پر انگریزوں کا قبضہ نہیں تھا اور بالائی وادی کرم پر بھی افغان حکومت کی کمزور سی گرفت باقی تھی۔

اس حقیقت حال کے پیش نظر سندھ پار کے اضلاع اور ہزارہ کے انگریز حاکموں کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ سرحد پار کے قبائل سے نپٹنے کے لئے کوئی بندوبست کریں۔ چونکہ آباد اضلاع سے آگے کے علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ نہیں تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ ہر ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع کے قریب کے قبائل کے ساتھ رابطہ کی ذمہ داری اختیار کرے۔ سرحد کے بعض حصوں میں یہ نظام آج تک رائج ہے مثال کے طور پر برطانوی عہد کے خاتمہ تک پشاور کا ڈپٹی کمشنر اہم اور طاقتور مہمند قبیلہ سے معاملات طے کرتا تھا (۱) کوہاٹ کا ڈپٹی کمشنر اورک زئیوں سے، بنوں کا ڈپٹی کمشنر کچھ وزیری قبائل سے ڈیرہ اسماعیل خان کا ڈپٹی کمشنر شیرانیوں اور بھٹنیوں سے نپٹتا ہے۔ یہی حال دوسرے اضلاع کا ہے۔ یہ تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی کہ شروع میں ہمارے افسروں نے سرحد پار رہنے والے قبائل کے ساتھ ان لوگوں کے ذریعہ رابطہ پیدا کیا جو سرحدی دیہات کے خان یا معتبر ہوتے تھے اور جن کے آباؤ اجداد کا اپنے گاؤں سے ملنے والے یاغستان کے علاقہ کے لوگوں سے کئی پشتوں سے تعلق چلا آ رہا تھا۔ پشاور کے آس پاس کے دیہات میں رہنے والے خلیل اور مہمند ارباب جو افریدیوں سے واقف تھے، ہوتی مردان اور سدم کے خان جو دیر سوات اور بنیر کے یوسف زئیوں سے واقف تھے ہنگو کے خان جو اورک زئیوں کو جانتے پہچانتے تھے اور ٹانک کا نواب جو محسود قبائل کو جانتا تھا اور جس کی بیوی بھی اس قبیلہ کی تھی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ قبائل کے ساتھ معاملات طے کرانے کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ ایک ایسا نظام تھا

---

(۱) پاکستان نے اب مہمند پولیٹیکل ایجنسی قائم کر دی ہے۔

جو ھمیں سکھوں سے ورثہ میں ملا تھا جنہوں نے پٹھانوں کی زبان سیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور درانیوں سے ملا تھا جو یہ توقع رکھتے تھے کہ جن کی خدمت میں حاضر ہونے والے فارسی میں گفتگو کریں گے اور جو اتنے کاھل تھے کہ انہوں نے قبائل کے مسائل حل کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔

سرحد پار کے قبائل پوری طرح مسلح تھے اور تاریخ کے مشہور ترین لٹیرے تھے اور چونکہ دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کے آباد اضلاع کے لوگوں سے بھی ھتھیار واپس لئے جا رہے تھے جو ان اضلاع کے مناسب نظم و نسق کے لئے ضروری تھا اس لئے ایک ایسی تنظیم قائم کرنا ضروری سمجھا گیا جو باقاعدہ فوج کے مقابلہ میں زیادہ آسانی سے نقل و حرکت کرسکے اور سول حکام کے تحت کام کرے۔ اس قسم کی تنظیم کا نمونہ گائڈز کی شکل میں موجود تھا۔ اس نمونہ پر ایک بھاری ملیشیا بھرتی کی گئی جو بعد میں پنجاب ارریگولرفورس (Irregular force) یا پفرز کہلائی۔ ابتدائی ایام میں فرنٹیر فورس نام نہاد بارڈر پولیس کی آڑ میں کام کرتی تھی جسے بعد میں فرنٹیر کانسٹیبلری کا باعزت نام دے دیا گیا۔ پولیس جرائم کی تحقیقات اور روک تھام کے لئے نہیں تھی بلکہ فرنٹیر فورس کا بازوئے شمشیرزن تھی۔ زیادہ سنگین صورت حال سے نپٹنے کے لئے وہ باقاعدہ فوج سے مدد حاصل کرتی تھی۔ سرحدوں کا دفاع محض امتناعی کارروائی نہیں تھا بلکہ بعض اوقات جوابی حملے بھی کئے جاتے تھے اور قبائل کو سرکشی کی سزا دینے کے لئے اکثر ان کے علاقہ میں فوج کشی کی جاتی تھی۔ غدر کے بعد بیس سال کے عرصہ میں (۱۸۵۷-۷۷ء) بیارہ مرتبہ فوج کشی کی گئی ان چڑھائیوں کو فوجی مہمات قرار دیا گیا اسی طرح ۱۸۷۷ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیان پانچ سال میں بارہ مرتبہ فوج کشی کی گئی۔ فوج کشی کی یہ خطرناک تعداد سرحد بند رکھنے کی پالیسی پر سختی سے کاربند رکھنے کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرحد پار کے علاقہ میں فوج کے بغیر داخل ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کچھ اور بھی اسباب تھے جنہیں اچھی طرح سمجھ لیا جاتا تو اس فوج کشی کی جگہ امتناعی تدابیر کے فوائد واضح ہو جاتے۔

ھمارے سول یا فوجی حکام کا طاقت استعمال کرنا ان کے رویہ کا

ایک منفی پہلو تھا۔ اور ہمارے حاکم مثبت تدابیر بھی جانتے تھے۔ ان میں سے سب سے واضح تدبیر تحریری معاہدے اور مواجب کا تقرر تھا۔ ابتدائی بیس سال کے عرصہ میں پورے سرحدی علاقہ میں ہر قبیلہ کے ساتھ معاہدہ کیا گیا اور کم از کم کاغذی شکل میں وہ سب کچھ حاصل کرلیا گیا جس کی حکومت کو ضرورت تھی۔ عام طور پر ایک معاہدہ میں بہت سی دفعات ہوتی تھیں۔ معاہدہ کی عام دفعہ میں دوستی اور خیرسگالی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد قبیلہ کی ذمہ داریوں کی تفصیل درج ہوتی تھی مثلاً سرحد کی حفاظت کی جائے گی قانون شکن افراد کو قابو میں رکھا جائے گا اور ذرائع آمدورفت ہوں تو ان کی حفاظت کی جائے گی ایک اور دفعہ کے ذریعہ قبیلہ کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ قانون شکنوں کو پناہ نہیں دے گا اور اس سے اگلی دفعہ میں یہ وعدہ کیا جاتا تھا کہ قبیلہ کا رویہ درست رہا تو اسے ہر سال مقررہ مواجب ملتا رہے گا۔ یہ معاہدہ کھلے جرگہ میں طے پاتا تھا اور قبیلہ کے ملک اور سفید ریش اس پر اپنی مہر یا عام طور پر اپنا انگوٹھا لگا دیتے تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہتی تھیں مواجب کی پہلی قسط ادا کردی جاتی تھی اور دوستانہ فضا سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اب مستقل طور پر امن قائم ہو گیا ہے۔ لیکن شاذونادر ہی امن پائدار ثابت ہوتا تھا۔

قبائل کو جو الاؤنس دئے جاتے تھے وہ مواجب کہلاتے تھے اور کم از کم ابتدائی ایام میں نظم و نسق میں ان کی بڑی اہمیت تھی۔ بعد میں ان کی اہمیت ختم ہوگئی فوج سول کور اور پولیس مین بھرتی کی شکل میں معاشی فوائد کے مفید تر ذرائع مہیا ہوگئے۔ اکثر اوقات اس طریقہ کو بلیک میل قرار دیا جاتا ہے جو بالکل غلط ہے۔ معترضین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قبائل نہ صرف مالیہ سے مستثنیٰ ہیں جو رعایا سے وصول کیاجاتا ہے بلکہ انہیں قانون کا پابند رہنے پر آمادہ کرنے کےلئے الٹی رقم دی جاتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس ابتدائی زمانہ میں قبائل رعایا نہیں تھے ان کے علاقہ میں نہ ہمارا نظام قانون رائج تھا نہ ہمارا حکم چلتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں کبھی یہ دھمکی دے کر کہ تجارت کی سہولتیں ان سے واپس لے لی جائیں گی اور کبھی نقد رقم دے کر اپنے ہمسایوں کو جو آباد اضلاع میں بسے ہوئے تھے لوٹنے سے باز رکھا جائے۔ اس رقم کو ان کے علاقہ سے گزرنے والی سڑک کا معاوضہ یا کسی خاص خدمت

کا صلہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی واضح مثال خیبر کے افریدی ہیں جن کے مواجب اس چونگی کے عوض مقرر کئے گئے تھے جو وہ درہ سے گزرنے والے ہر شخص سے زبردستی وصول کرتے تھے۔ بعد میں افریدیوں کے مواجب میں اس لئے اضافہ کیا گیا کہ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران فرمان بردار رہ کر بہت بڑی خدمت بجا لائے اور پھر انہیں ان کے علاقہ کی سڑکوں، ریلوے اور کیمپوں کا بھی معاوضہ ادا کرنا تھا۔ جو لوگ مواجب کو بلیک میل قرار دیتے ہیں وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مواجب کسی بھی وجہ سے کیوں نہ مقرر کئے گئے ہوں ان کے ساتھ یہ شرط ہوتی تھی کہ قبیلہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی یا کوئی قانون توڑا تو پوری رقم یا اس کا ایک حصہ ضبط کر لیا جائے گا یا آئندہ کے لئے بند کر دیا جائیگا۔ مواجب بند کرنا ایک قانون شکن قبیلہ کے خلاف موثر ترین کارروائی تھی اور اس کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت اس قبیلہ سے نپٹنے میں کتنی بے بس تھی جسے مواجب نہیں ملتا تھا۔

آباد اضلاع میں قبائل کی لوٹ مار روکنے کے لئے تعزیری مہم ہی واحد تدبیر نہیں تھی۔ مواجب بند کرنے کے علاوہ بندش اور برمتہ سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ بندش کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قبیلہ کو پاس کے ضلع کی منڈیوں زمینوں اور چراگاہوں میں داخل ہونے سے روک کر اس پر اقتصادی دباؤ ڈالا جائے یہ دباؤ بعض حالات میں موثر ثابت ہوتا تھا لیکن اس کا اثر سست رفتاری سے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سرحد پر اور خود تجارتی منڈیوں میں اس پر عملدر آمد دشوار تھی۔ آباد اضلاع اور غیر علاقہ کے لوگوں کے درمیان انتظامی سرحد بیشتر حالات میں برائے نام تھی کیونکہ دونوں طرف کے لوگوں کے لئے اس سرحد کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔ آباد ضلعوں کے قصبوں اور دیہات کے تاجروں اور دوسرے لوگوں سے قبائل کے قریبی تعلقات تھے۔ برمتہ ترکی زبان کا لفظ ہے جو وسطی ایشیا سے آیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص یا قبیلہ نے جرم کیا ہے اس کے آدمی، مویشی یا املاک قبضہ میں لے لی جائیں تاکہ وہ نقصان کی تلافی پر مجبور ہو جائے۔ ان تمام طریقوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ قبائلی معاشرہ میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس کار فرما ہو۔ کسی بھی قبیلہ میں جہاں قبائلی روایات زندہ ہیں یہ

خصوصیت ہوتی ہے کہ جس طرح قبیلہ کے ایک فرد کے نفع یا حاصل میں قبیلہ کے تمام افراد شریک ہوتے ہیں اسی طرح اگر قبیلہ کے کسی فرد سے کوئی جرم سرزد ہو تو اس کی ذمہ داری پورے قبیلہ اور قبیلہ کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔ اس اصول کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مظلوم فریق اپنے نقصان کی تلافی کے لئے مجرم قبیلہ کے کسی بھی فرد کو پکڑ سکتا ہے۔ یہ قبائلی ذمہ داری کا خلاصہ ہے کہ حقوق اور دعووں کے تصفیہ کے لئے برمتہ کے طریقہ کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ برمتہ اسی شکل میں زیادہ موثر ہوتا ہے جب قبیلہ کی خاص اس شاخ کو مجبور کر دیا جائے جس سے جرم سرزد ہوا ہے یا جس شاخ سے اصل مجرم تعلق رکھتا ہے۔ جس خیل پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے وہ جتنا مختصر ہوگا اتنا ہی نقصان کی تلافی کا امکان قوی ہوگا۔

سرحدی علاقہ میں دو معاشرے آمنے سامنے تھے ایک معاشرہ آباد اضلاع کا تھا اور دوسرا قبائلی علاقہ کا۔ ان دونوں کی قربت کی وجہ سے مجرموں کو قابو میں لانے کے مسئلہ نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ قریب قریب ہر قبائلی معاہدہ میں یہ شرط شامل ہوتی ہے کہ کوئی قبیلہ کسی مجرم کو قانون کی گرفت سے پناہ نہیں دے گا۔ قبائلی رہنما تعزیری اقدامات سے بچنے کے لئے مذاکرات کے دوران یہ شرط مان لیتے تھے لیکن یہ شرط کبھی پوری نہیں کی گئی جس کا سبب سیدھا سادہ ہے اس شخص کے لئے جس میں پختو کا شائبہ بھی موجود ہے کسی کو پناہ دینے سے انکار ناممکن ہے اگر دشمن بھی ننااواتے کے طریقہ سے جس کا لفظی مطلب 'اندر آنا' ہے پناہ مانگے تو اس کی درخواست ٹھکرائی نہیں جا سکتی۔ یہ مہمان نوازی کی انتہائی شکل ہے۔ ننااواتے کے تحت جو شخص کسی مہربانی کا طلبگار ہوتا ہے وہ اس شخص کے گھر یا خیمہ میں جاتا ہے جس سے مہربانی حاصل کرنا مقصود ہے اور جب تک اس کی درخواست منظور نہ کر لی جائے سائل نہ تو فرش پر بیٹھتا ہے اور نہ وہاں کچھ کھاتا پیتا ہے۔ اگر گھر والا یہ درخواست ٹھکرا دے تو اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ مہمان کی خاطر تواضع ایک قومی افتخار ہے اور جو شخص مہمان کی تواضع نہ کرے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں پختو نہیں ہے یعنی وہ ذلیل آدمی ہے۔ کسی پٹھان کے مہمان کو اپنے گھر لے جانا اس پٹھان کی سب سے بڑی بے عزتی ہے اور پٹھان اپنا غصہ اس مہمان پر نہیں

اتارے گا جو دوسری جگہ چلا گیا بلکہ اس شخص پر اتارے گا جو اس کے مہمان کو لے گیا۔ جو مجرم برطانوی قانون کی زد سے فرار ہو کر غیر علاقہ میں چلے جاتے تھے ان کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا سلوک ہوتا تھا۔

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو کبھی حل نہیں ہوا۔ ہر مجسٹریٹ کی میز پر مفروروں یا فراریوں کی لمبی فہرست ہوتی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ مثال کے طور پر شب قدر کے محمد عمر نے ایک پٹھان کی غیرت سے مجبور ہو کر اپنی بیوی یا بہن کے آشنا کو قتل کر دیا یا قتل کا بدلہ لینے کے لئے کسی کو قتل کر دیا اس طرح اس نے تعزیرات ہند کے تحت قانون کی خلاف ورزی کی۔ یا عمر نے کوئی ایسا جرم کیا جو پختو آداب کے تحت بھی جائز نہیں ہے مثلاً کسی وجہ کے بغیر عمداً قتل کیا یا کسی ڈکیتی کا مرتکب ہوا جس میں تشدد بھی شامل تھا۔ دونوں صورتوں میں پولیس اس کا پیچھا کرے گی۔ جب عمر کا جوش ٹھنڈا ہوگیا تو اس کی نظر اپنے گھر کی صحن یا کھیتوں سے چند میل کے فاصلہ پر نوکیلی پہاڑیوں پر پڑی جہاں پولیس نہیں پہنچ سکتی اور جہاں بے وقوف انگریز کا حکم نہیں چلتا۔ وہ اسی رات کو سرحد پار کر گیا اور سائل بن کر مہمندوں کے ترک زئی علاقہ میں ملک مشکی کے حجرہ میں پہنچ گیا۔ ملک مشکی شب قدر کے بازار میں خریداری کے لئے اکثر آیا کرتا تھا محمد عمر اس سے کئی مرتبہ مل چکا تھا اور ایک بار اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک بھی کیا تھا۔ ملک مشکی اسے دھتکار نہیں سکتا۔ چنانچہ چند روز تک اس کی خوب خاطر تواضع ہوتی رہی۔ اسی اثنا میں اصل قصہ بھی معلوم ہوگیا۔

پٹھان مہمان نوازی میں کتنا ہی فراخ دل کیوں نہ ہو وہ عمر بھر کسی مفت خورے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر عمر اس علاقہ میں رہنا چاہتا ہے تو اسے اپنی روزی کمانی ہوگی وہ ہمسایہ بن جاتا ہے اور اپنے نائک یعنی محافظ کی پناہ میں رہنے لگتا ہے۔ یہ محافظ کسی حالت میں اسے ایسے قانون کے حوالہ نہیں کریگا جو خود اس کی نظر میں الٹا ہے لیکن اگر عمر اس قبیلہ میں گھلنا ملنا چاہے جس سے اس کا نائک تعلق رکھتا ہے تو اسے کچھ کرنا ہوگا۔ چنانچہ وہ مزدور بن کر کسی کی زمینوں میں کھیتی کر کے یا کوئی ہنر جانتا ہو تو اس کے ذریعہ روزی کما سکتا ہے۔ لیکن اکثر حالات میں وہ اپنی روزی کمانے کے لئے

حملہ آور ٹولیوں کا رہنما بن جائے گا وہ ان لٹیروں کو اپنے ھی گاؤں میں لے آئے گا اور اپنے پرانے دشمنوں کو قتل کرادے گا اس طرح سرحد پر بد امنی پھیل جائے گی۔ جس قبیلہ میں ایسے مفروروں کی تعداد زیادہ ہوگی اس کے خلاف اس قسم کی لوٹ مار کے الزامات کی تعداد بھی زیادہ ہوگی۔ اور جب کوئی قبیلہ ان فراریوں کو قانون کے حوالہ نہیں کرتا تھا تو اس زمانہ میں اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ یا تو اس قبیلہ کی بندش کی جائے یا اس پر فوجی دباؤ ڈالا جائے۔

ایک زمانہ میں مصالحتی جرگہ کا طریقہ بھی آزمایا گیا۔ اگر ایک مجرم سے ایسا جرم سرزد ھوا ھے جو پٹھان کے جذبۂ انتقام کا نتیجہ ھے تو عام طور پر یہ مناسب سمجھا جاتا تھا کہ اسے فریق ثانی سے سمجھوتہ کا موقع دیا جائے اور جس فریق کے زیادہ افراد مارے گئے ھیں اسے خون بہا دلا دیا جائے۔ یہ نظریہ تو ٹھیک ھے لیکن بیشتر حالات میں خاندانی دشمنی کے تصفیہ کے لئے خون بہا وصول کرنا پختو آداب کے منافی تھا۔

حقیقت یہ ھے کہ مجرموں کے تبادلہ کے سوا جو صرف برابر کے فریقوں کے درمیان مساوی بنیاد پر ھوا کرتا ھے اور موجودہ صورت میں ناممکن تھا مجرموں کے مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا کیونکہ یہاں ایک آباد معاشرہ جس پر بیسویں صدی کا نظام عدالت نافذ تھا ایک ایسے قبائلی معاشرہ کے ساتھ ساتھ رہ رہا تھا جو دونوں ایک ھی نسل کے تھے ایک ھی زبان بولتے تھے اور دونوں اس بات کے قائل تھے کہ ذاتی انتظام ھی موثر ترین قانون ھے۔ البتہ ان دونوں میں سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرہ یا اس کے حاکم قوانین کی سختی میں عوام کے حقیقی عقائد کے مطابق لچک پیدا کرنے کو تیار ھوتے تو کوئی حل نکل سکتا تھا۔ اور جھگڑے کی جڑ یہی تھی۔

برطانوی نظام عدالت اس کے وکیل، اپیلوں کا طریقہ اور جرائم کی سنگین یا معمولی نوعیت متعین کرنے کا یورپی معیار نہ صرف قبائلی علاقہ بلکہ آباد ضلعوں میں بسنے والے پٹھانوں کے جذبات سے کوئی تال میل نہیں رکھتا تھا۔ پولیس اور مجسٹریٹ جس طرح بندھے ٹکے اصولوں کے پابند تھے انہیں دیکھتے ھوئے بہت سے لوگوں کی نظر میں خود ساختہ سرحد کے پار کی زندگی میں زیادہ آزادی دکھائی دیتی تھی۔ لوگ جن عقائد

کے سختی سے قائل تھے قانون بیشتر حالات میں ان کی مخالفت کرتا تھا۔ قانون جن حالات میں ایسی سزا تجویز کرتا تھا جو رسم و رواج کے مطابق جائز نہیں تھی تو اس سے بچنے کے لئے کسی جھجھک کے بغیر جھوٹی شہادتیں گزار دی جاتی تھیں یا مجرم روپوش ہو جاتے تھے۔ اور جہاں قانون شہادت کا سہارا لے کر ان لوگوں کو چھڑایا جا سکتا تھا جن کے متعلق سب جانتے تھے کہ وہ مجرم ھیں تو یہ کہہ کر قانون سے نفرت کی جاتی تھی کہ اس میں خفیف تفصیلات پر وقت ضائع کیا جاتا ھے موشگافیوں سے کام لیا جاتا ھے اور انصاف نہیں کیا جاتا۔ لیکن جہاں قانون کی باریکیاں دشمن کو ستانے کا موقع فراہم کرتی تھیں وھاں بہت سے چالاک لوگ ان باریکیوں سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ سالہا سال تک یہ نظام اس علاقہ کو موافق نہ آ سکا۔ بعد میں جب ھوش آیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اس خرابی کا علاج خود آباد اضلاع میں ھو سکتا ھے۔

۱۸۷۲ء میں قانون میں لچک پیدا کرنے کے لئے فرنٹیر کرائمز ریگولیشن نافذ کئے گئے جن کے تحت انتقامی قتل، عورتوں کے متعلق تنازعات اور ایسے مقدمات جو پٹھانوں کی غیرت پر اثر انداز ھوتے ھوں اس علاقہ میں مروجہ طریقوں سے طے کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ مجسٹریٹوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ ایسے مقدمات عام عدالتوں سے واپس لے کر قطعی فیصلہ کے لئے جرگہ میں پیش کریں۔ اس مقصد کے لئے جرگہ سے مراد پورے قبیلہ کے تمام ملکوں اور سفید ریشوں کی مجلس شوریٰ نہیں تھی بلکہ مجسٹریٹ فریقین کی تائید سے معتبروں کا ایک گروپ مقرر کر دیتا تھا جو یہ طے کرتا تھا کہ کسی فوجداری یا دیوانی مقدمہ میں ملزم واقعی مجرم ھے یا نہیں۔ بہ الفاظ دیگر جرگہ ایک طرح کی قبائلی جیوری تھا۔ جرگہ قانون شہادت کا پابند نہیں ھوتا اور اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ جائے وقوعہ یا متنازعہ علاقہ کا معائنہ کرے گا اور اپنے طریقوں سے پوچھ گچھ کر کے بتائے گا کہ واقعات کیا ھیں اور مقدموں کا کیا تصفیہ کیا جائے۔ قتل کا جرم ثابت ھونے پر عدالت موت کی سزا نہیں دے سکتی تھی بلکہ اس کی زیادہ سے زیادہ سزا چودہ سال (۱) قید تھی۔ صوبہ سرحد

---

(۱) یہ نرمی قاعدہ کے خلاف تھی لیکن کوئی انگریز حاکم ایک ایسے مقدمہ میں جو برطانوی قانون کے دائرہ سے باہر ھو سزائے موت دینے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا تھا۔

میں یہ ریگولیشن عام عدالتوں کے تتمہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ ریگولیشن کو صرف اسی صورت میں کام میں لایا جائے جب قانون شہادت اور دوسری قانونی موشگافیوں کی وجہ سے عام عدالتی کارروائی کے ذریعہ ایک پٹھان معاشرہ میں مقدمہ کے تمام واقعات کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وکیل ریگولیشن کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ جرگہ کی کارروائی میں کوئی پیشہ ور وکیل پیش نہیں ہو سکتا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ریگولیشن کی مدد سے بہت سے ایسے مجرم کیفر کردار کو پہنچے جو بصورت دیگر بچ نکلتے۔ میرا خیال ہے ایسے واقعات بہت ہی کم ہیں جن میں کسی بے گناہ کو سزا دی گئی ہو۔ پھر بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ چونکہ شمال مغربی سرحد میں یہ ریگولیشن برطانوی ہند کے قانون کا بدل نہیں بلکہ تتمہ تھا اس لئے یہ ناکام رہا کیونکہ اس سے نہ قانون مطمئن ہوتا تھا اور نہ رسم و رواج یہ ریگولیشن مملکت کی طرف سے جرائم کی سزا کا آسان طریقہ بن گیا اور اس کے تحت پٹھانوں کے قانون کے تصور کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ ریگولیشن مقامی روایات کی بنیاد پر رسم و رواج کی بھی پابندی نہ کر سکا اس لئے نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔

اگر ہم یہ بات نظر میں رکھیں کہ قریباً ۱۸۸۰ء میں بلوچستان پر قبضہ کے بعد فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز پر عملدرآمد کا بالکل مختلف طریقہ اختیار کیا گیا تو یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ جب فارورڈ پالیسی کے نتیجہ میں انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں بعض قبائلی علاقوں میں معمولی نظم و نسق قائم ہوگیا تو شمال مغربی سرحد کے کچھ حصوں میں بھی یہ ریگولیشن نئے طریقہ سے نافذ کیا گیا۔ ان علاقوں میں یہ ریگولیشن ان حالات کے لئے متبادل قانون نہیں تھا جب مروجہ قانون کے تحت عدالتی طریقہ ناکام ہوتا نظر آرہا ہو، بلکہ جب بھی فریقین قبائلی ہوتے تھے تو ہمیشہ ریگولیشن کے تحت مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ ان نئے علاقوں میں ریگولیشن کے ذریعہ مقامی رسم و رواج کو قانونی شکل دینے کی کوشش کی گئی اور اسے محض اسٹیٹ کا حکم نافذ کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا گیا۔ اس طرح فوجداری مقدمہ میں سزا یا جرمانہ عام حالات میں اس

سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کا اس علاقہ میں رواج تھا تاوقتیکہ رواج اور حکومت کے اقتدار دونوں کی خلاف‌ورزی نہ کی گئی ہو۔

چند مثالوں سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ فرض کیجئے نمبر الف ایک قتل کا مقدمہ ہے جس میں شیریں خان نے انور کو گولی مار کر ہلاک کردیا ہے کیونکہ انور کے چچا نے شیریں خاں کے بھائی کو قتل کیا تھا۔ پٹھانوں کے رواج کے مطابق شیریں نے وہی کیا جو غیرت کا تقاضا تھا۔ اگر شیرین کو عام عدالت میں پیش کیا جائے جو ایسے قانون کی پابند ہے جو شیرین کی سمجھ سے باہر ہے اور جس سے وہ نفرت کرتا ہے تو وہ یہ جانتے ہوئے کہ اس کا جرم ثابت ہوگیا تو اسے پھانسی ہو جائے گی وہ انصاف سے بچنے کے لئے ہر جتن کرے گا۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس کی طرف سے صفائی کے بہت سے جھوٹے گواہ پیش کئے جائیں گے۔ لیکن اگر اسے جرگہ میں پیش کیا گیا کم از کم بلوچستان میں تو یہی ہوتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کرے گا بلکہ دعویٰ کرے گا کہ اس نے وہی کیا جو غیرت کا تقاضا تھا۔ اب جرگہ کا یہ کام ہوگا کہ ممکن ہو تو وہ خون بہا دے کر یا لڑکی عقد میں دے کر دشمنی ختم کرادے۔ لڑکی عقد میں دے کر دشمنی ختم کرنے کا طریقہ عام ہے۔ ایسی لڑکی 'سورہ' کہلاتی ہے۔ یا پھر کوئی اور طریقہ اختیار کرے مثلاً شیرین اور اس کے حریف سے یہ عہد لے لے کہ وہ امن امان قائم رکھیں گے اور اس عہد کی سنگین ضمانتیں لے لے۔ ایسی صورت میں اسٹیٹ کی طرف سے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

مقدمہ ب میں ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ فلاں خان کی حسین و جمیل بیوی سے عاشق جان کے ناجائز تعلقات تھے۔ عاشق جان نے فلان خان کو قتل کردیا اور اس کی بیوی کو لے کر بھاگ گیا۔ یہ حرکت یعنی بے وجہ قتل اور زنا پٹھانوں کی غیرت کے منافی ہوگا۔ ایسے مقدمہ میں رواج یہ ہے کہ فلاں خان کے رشتہ‌دار عاشق جان اور اس کے ساتھ عورت کو بھی قتل کر دیں تو یہ جائز سمجھا جائے گا۔ لیکن لازمی طور پر اس طرح خاندانی دشمنی کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا اور کسی بھی موقع پر یہ درست نہیں سمجھا گیا کہ برطانوی حکومت کے سایہ میں کوئی ایسا طریقہ رائج کیا جائے جس کے ذریعہ رسم و رواج کے مطابق

سنگین سزا کی تائید کی جائے۔ اس مقدمہ میں اگر ریگولیشن کے تحت مقرر کیا ہوا جرگہ عاشق کو مجرم قرار دے تو وہ قید کی لمبی سے لمبی میعاد یعنی چودہ سال قید اور ساتھ ہی ساتھ شرمانہ کی بھاری رقم ادا کرنے کی سفارش کر سکتا ہے۔

ایک اور مقدمہ ج بھی فرض کیا جا سکتا ہے جس میں ڈیوٹی پر متعین خاصہ دار کو قتل کردیا گیا ہے اس صورت میں نہ صرف مقتول کے رشتہ دار بلکہ اسٹیٹ بھی فریق ہوگی۔ ایسی صورت میں جرگہ خون بہا کی ادائیگی اور ممکن ہو تو سزائے قید کی سفارش کر سکتا ہے اور مجسٹریٹ اسٹیٹ کی طرف سے مزید قید کی سزا دے سکتا ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ پٹھانوں کے رواج کا تقاضا یہ ہے کہ ظالم کو سزا ملے یا نہ ملے لیکن مظلوم کے نقصان کی تلافی ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن ہمارا قانون ظالم کو سزا دینے پر پوری توجہ دیتا ہے اسے مظلوم کے نقصان کی تلافی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ در حقیقت پٹھان یہ سمجھتا ہے کہ ہرجانہ سے جرم کی تلافی ہوسکتی ہے۔

پٹھان معاشرہ میں قانون کو رسم و رواج سے یا رسم و رواج کو قانون سے کس طرح کس کس موقع پر اور کس حد تک بر تر سمجھا جائے یہ وہ سوالات ہیں جو ہم حل نہیں کر سکے اور اب پاکستان کو حل کرنے ہیں۔ یہ ایک واضح اصول ہے کہ ایک طرح قانون معاشرہ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ قانون پورے معاشرہ کا مظہر ہونا چاہئے۔ اگر ایک تہذیب کے قوانین کسی ایسے معاشرے پر مسلط کئے جائیں جس کے معیار بالکل مختلف ہوں تو نتائج تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ سالہا سال کے تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ۱۸۴۹ء میں پشاور کا نظم و نسق بندھے ٹکے اصولوں کی بجائے یہاں کے باشندوں کے مزاج کے مطابق چلایا جاتا تو زیادہ امن و امان قائم رہتا۔ آباد اضلاع قبائلی علاقہ سے اتنے الگ تھلگ نہ ہوتے جتنے اب ہیں اور بعد میں پورا علاقہ زیادہ ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کرتا۔ ہو سکتا ہے اس ناقص صورت حال کی اصلاح کے لئے پاکستان دستور کی دفعہ ۱۹۸ کے تحت قدم اٹھائے لیکن ان تبدیلیوں کے نفاذ کے سلسلہ میں رسم و رواج اور اسلامی اوامرو نواہی دونوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً جو طریقے

اختیار کئے جائیں گے ان ھی پر اس بات کا انحصار ھوگا کہ پٹھان قبائلی علاقہ کو کامیابی کے ساتھ مملکت پاکستان میں ضم کر لیا جا سکتا ھے یا نہیں۔ یہ معاملہ بڑا اھم ھے اور اسے نظر انداز کرنا خطرہ سے خالی نہیں ھے۔

برطانوی عہد کی ابتدا میں جن افسروں نے اس علاقہ کا نظم و نسق سنبھالا وہ محض اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ھوگئے۔ نکلسن نے ھنری لارنس کو لکھا تھا۔ ''میں سمجھتا ھوں مجھ سے ریگولیشن کا کام نہیں ھو سکتا۔ اور میں سوجھ بوجھ انصاف اور عوام یا مملکت کے مفادات کو قانون کی ظاھری پابندی پر قربان نہیں کر سکتا،،۔ جان لارنس نے نکلسن کو لکھا تھا ''اب اور لوگوں کو براہ راست سزائے موت نہ دینا۔ جب کسی کو سزائے موت دو تو مقدمہ کا خلاصہ انگریزی میں ڈپٹی کمشنر کی معرفت بھیجو،،۔ نکلسن کے سوانح نگار نے لکھا ھے کہ ایک مرتبہ نکلسن کے ایک دوست نے اسے دفتر میں بیٹھے ھوئے دیکھا نکلسن کے سامنے قوانین اور قواعد کا پلندہ پڑا ھوا تھا۔ اس نے پلندہ کو ٹھوکریں مار کر فرش سے دور پھینک دیا اور ھنس کر کہنے لگا ''میں ان چیزوں سے اسی طرح پیش آتا ھوں،،۔

۱۸۵۷ء کے بعد نظم و نسق ان لوگوں کے ھاتھ میں چلا گیا جو اتنے باعظمت نہیں تھے۔ ایڈورڈ جیسا باعظمت شخص باقاعدہ نظم و نسق کی خوبیاں محسوس کر سکتا تھا اور تحمل کے ساتھ یہاں کے حالات کے مطابق قوانین نافذ کر سکتا تھا اور جہاں بھی ضرورت ھوتی ان میں ترمیم بھی کرا سکتا تھا۔ لیکن ایسے متضاد حالات میں جن کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ھوں چند ھی افسر ایسے رہ گئے تھے جنہیں سرحدی علاقہ کا تجربہ تھا کیونکہ ان مشکلات پر تجربہ ھی کی بنا پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ لاھور کافی فاصلہ پر تھا اور ایسا معلوم ھوتا تھا کہ وھاں بیٹھے ھوئے حاکم سرحد کو محض ضمنی ذمہ‌داری سمجھتے تھے سروس میں عملہ تھوڑا تھا بیشتر افسروں کا ملک کے جنوبی حصہ میں تبادلہ ھوتا رھتا تھا۔ افسروں کو سرحد کی زبان سیکھنے یا پٹھانوں کا دل موہ لینے کے طریقے معلوم کرنے کی فرصت ھی نہ ملتی تھی۔ ایسا معلوم ھوتا تھا کہ نظم و نسق بگڑتا جا رھا ھے۔

یہ اسی تجربہ کا فقدان تھا کہ قبائل کے ساتھ بچودیوں کے ذریعہ

معاملات طے کرنے کا طریقہ اتنے دنوں تک جاری رہا جس کے بڑے برے نتائج ظاہر ہوئے۔ اگر ایک ڈپٹی کمشنر اتنی پشتو جانتا ہوتا کہ وہ نہ صرف ملاقات کے لئے آئے ہوئے قبائلیوں سے بات چیت کر سکتا بلکہ پورے جرگہ میں روانی سے بول سکتا اور زیر بحث موضوع پر تقریر کر سکتا تو یہ بہتر ہوتا کہ وہ قبیلہ سے براہ راست معاملات طے کرتا اور جزئیات کا تصفیہ بچودیوں کی جگہ اپنے ماتحت افسروں پر چھوڑ دیتا۔ تمام پٹھانوں کو اعتراف ہے کہ ۱۹۰۱ء کے بعد پچاس سال کے عرصہ میں انگریز افسرون نے جس قدر پشتو زبان سیکھی ہے اس کا معیار کافی بلند ہے اور اسی وجہ سے وہ براہ راست تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ کرزن کے زمانہ میں سرحد کا الگ صوبہ بن جانے کا نتیجہ تھا۔ جب تک یہ علاقہ پنجاب میں شامل رہا اس زمانہ میں معدودے چند ایسے افسر تھے جو پٹھانوں سے قریبی رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ورنہ عام طور پر حاکم اور محکوم ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔

اس نظام میں تبدیلی کا سہرا بڑی حد تک واربرٹن کے سر ہے۔ وہ پہلے پولیٹیکل ایجنٹ تھے جو آباد ضلع کی ذمہ داری سنبھالے بغیر سرحدپار کے قبائلی علاقہ کے انچارج بنے۔ واربرٹن ایک انگریز فوجی افسر کے بیٹے تھے جو پہلی جنگ افغان میں شاہ شجاع کی فوج میں رہ چکے تھے اور انہوں نے ایک افغان خاتون سے شادی کی تھی جو 'دوست' کی بھانجی تھی۔ اس طرح واربرٹن نسلی طور پر آدھے پٹھان تھے۔ دوسری جنگ افغان کے بعد واربرٹن کو خیبر اور اس کے قبائل کی ذمہ داری سونپ دی گئی جو جنگ کے نتیجہ کے طور پر افغان حکومت سے لیا گیا تھا۔ وہ خیبر میں قریباً سولہ سال مقیم رہے اور پھر پولیٹیکل افسر بن کر تیراہ کی مہم پر جانے والی فوج میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے اپنی کتاب (۱) میں لکھا ہے کہ میرا پختہ یقین ہے کہ پنجاب کی سرحد پر رہنے والے قبائل اور حکومت کے درمیان جتنی بھی لڑائیاں ہوئیں ان میں سے بیشتر ارباب اور ان دوسرے لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھیں جو سرحدپار قبائل سے معاملات طے کرانے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔

اس نظریہ کے ثبوت میں وہ ۱۸۷۷ء میں بُنیر پر لشکرکشی کی

(۱) EIGHTEEN YEARS IN THE KHYBER

حیرت خیز داستان بیان کرتے ہیں اس موقع پر بنیروال لشکر ملندرئے اور امبیلا کے درے عبور کر کے آباد علاقہ میں داخل ہو گیا تھا اور اس نے سدم کے سرحدی دیہات میں خوب لوٹ مار مچائی تھی۔ واربرٹن خیبر میں متعین ہونے سے پہلے اس یوسف زئی سرحد کا انچارج تھا اور اس ڈرامہ میں حصہ لینے والے تمام کرداروں سے ذاتی طور پر واقف تھا۔

سدم بنیر کی پہاڑیوں کے سامنے سمہ کے بالائی حصہ کا وہ علاقہ ہے جو مقام کے اس چشمہ سے سیراب ہوتا ہے جس کی سیر سے بابر بہت محظوظ ہوا تھا۔ یہ ایک ایسی وادی ہے جو نعل کی شکل میں تین طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے ان میں پجا (۱) کی دندانہ دار چوٹی سب سے نمایاں ہے۔ بنیر کی طرف کے تمام دروں کا مرکز ایک ہے جو وادی میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ تھیٹر کے بغلی راستہ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے جنوب میں مرتفع اسٹیج کی طرح کڑامار کی پہاڑی ہے جو سفیدہ کے درختوں سے گھرا ہوا جزیرہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ پورا میدان تاریخی ہے۔ ملندرئے وہ جگہ ہے جہاں اکبر کا مصاحب بیربل مارا گیا تھا۔ امبیلا وہ جگہ ہے جہاں سرحد کی تاریخ کی ایک انتہائی خوفناک لڑائی ہو چکی ہے۔ کڑامار وہ جگہ ہے جہاں وہ مشعل جلائی گئی تھی جو سید احمد بریلوی کے مریدوں کو قتل کرنے کا اشارہ تھی۔

سدم کے خوانین مندڑ یوسف زئیوں کی امازئی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں وادی اور اس کو گھیرے میں لئے ہوئے پہاڑوں میں رہنے والے باقی لوگوں میں سے اکثر گوجر یا چرواہے ہیں یہاں کا بڑا پٹھان خاندان اپنے مورث اعلیٰ میر بابو خان کے نام پر میر بابو خیل کہلاتا ہے۔ میر بابو خان سید احمد بریلوی کے شناساؤں میں سے تھا لیکن بعد میں وہ سکھوں کی طرف سے لگان وصول کرنے پر مامور ہو گیا۔ جب لمسڈن یوسف زئی علاقہ میں آئے تو میر بابو نے انہیں مدد کی پیشکش کی۔ جارج لارنس نے اپنی تحریروں میں کئی موقعوں پر میر بابو کو نئی حکومت کا اچھا دوست قرار دیا ہے۔ وہ اور اس کے بیٹے عجب اور عزیز سرحد پار بنیر اور چملا (۲) قبائل سے معاملات طے کرانے پر مامور تھا۔

---

(۱) اس سر بلند چوٹی کو سکرہ بھی کہتے ہیں۔
(۲) چملا سرحد کے پار واقع ہے لیکن یہاں مندڑ یوسف زئیوں کی آبادی ہے جو سدم کے خوانین کے قرابت دار ہیں۔

عجب اور عزیز دونوں کی شادیاں بنیر کے خوانین کے خاندان میں ہوئی تھیں۔ انہوں نے سید احمد بریلوی کے زمانہ میں قائم کی ہوئی مجاہدین کی بستیوں سے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔

جب ۱۸۶۳ء میں امبیلا کی مہم کے متعلق عجب اور عزیز سے مشورہ نہ لیا گیا تو اسے دونوں نے اپنی توہین سمجھا۔ عجب نے بنیر میں اپنے دوستوں کو لکھا کہ اگر انہوں نے فوری طور پر کوئی کارروائی نہ کی تو بنیر کا پردہ ہمیشہ کے لئے اٹھ جائے گا۔ یہ جملہ بڑا پرمعنی ہے اور اسے قبائل عام طور پر استعمال کرتے ہیں اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاقہ میں غیروں کو نہیں آنے دیتے اور غیروں کے داخلہ کے خلاف اپنے علاقہ کی اسی طرح حفاظت کرتے ہیں جس طرح ایک عورت کی ناموس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اس خونریز مہم کے بعد عزیز فوت ہوگیا اور عجب بھاگ کر بنیر چلا گیا۔ بابو خیل میں بڑے تفرقے پیدا ہوگئے اور ہر فریق نے دوسرے پر جو الزامات لگائے ہیں ان کے پیش نظر واقعات کی تہہ تک پہنچنا بڑا مشکل ہے۔ بعد میں عجب خان نے جو سدم میں اپنے گؤں چارگلے واپس آچکا تھا حکومت کی نظروں میں اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لئے جیسا کہ بعد میں اس نے اعتراف کیا ۱۸۷۷ء میں بنیر وال قبائل کی مدد سے سدم پر حملہ کر دیا۔ قبائل تمام دروں سے نکل نکل کر نیچے آگئے اور انہوں نے بار نگان، علی اور بازار نامی دیہات کو آگ لگا دی کیونکہ وہاں کے خوانین سے عجب کی دشمنی تھی۔ حملہ آور اس سرحد کے صدر مقام رشمہ تک پہنچ چکے تھے جہاں سے انہیں بڑی مشکل سے اور بڑا نقصان اٹھانے کے بعد پسپا کیا گیا۔ جلد ہی واقعات کی اطلاع مل گئی اور عجب پر تاج کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔

یہ مقدمہ بڑا مشہور ہے اس میں عجب کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چیف کورٹ نے اس وقت تک اتنا طویل فیصلہ کبھی نہیں لکھا تھا۔ اپنی اپیل کا فیصلہ سننے کے بعد عجب نے اعتراف جرم کرلیا۔ پھانسی کے تختہ پر چڑھنے سے پہلے عجب نے قبائلی ملکوں کی موجودگی میں جو وہاں جمع ہوگئے تھے جو تقریر کی وہ بڑی پرزور اور باوقار تھی اور اس کے بکثرت حوالے دئے جاتے ہیں۔ عجب خان بڑا

لمبا چوڑا اور شاندار آدمی تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے بھی کافی اونچا اور خدوخال بہت اچھے تھے اس کی داڑھی سیاہ اور لمبی تھی۔ اس کی گردن میں ایک ڈوری میں چاندی کا ایک خلال لٹکا رہتا تھا۔ اور وہ بڑی ملائم آواز میں بولتا تھا۔ آج بھی لوگ مزے لے لے کر بیان کرتے ھیں کہ کس طرح عجب پھانسی کے تختہ پر کھڑے ہو کر اپنا خلال گھماتا رہا اور اس نے مدھم لیکن پر اثر آواز میں اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس کی تقلید نہ کریں اس نے کہا ''میں حملہ آوروں کو پہاڑوں سے جمع کرکے نیچے لایا تھا تاکہ انہیں سرحد پر جنگ میں جھونک دوں اور اس طرح اپنی طاقت کا مظاھرہ کروں اور حکومت کی نظروں میں دوبارہ عزت حاصل کرلوں۔ میں ناکام ھوگیا اور مجھے ناکام ھی ھونا چاھئے تھا۔ یہ ایک پرانا کھیل ھے اور آپ سب کو میری آخری نصیحت یہ ھے کہ ایسے حالات پیدا نہ کریں جو خدا کے ھاتھ میں ھیں''۔

واربرٹن سرحد پار کے قبائل سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے بچودیوں کی خدمات حاصل کرنے کا مخالف تھا اور اس کی معقول وجوہ تھیں۔ سرحد بند رکھنے کا طریقہ آزمایا جا چکا تھا اور ناکام ثابت ھوچکا تھا۔ اور اب زیادہ جرأت‌مند پالیسی اپنانے کا وقت آگیا تھا۔

فصل بست و دویم

امبیلا

سرحد کے اندر اور سرحد کو مرکز بنا کر دوسرے علاقوں میں جو فوجی مہمات سر کی گئیں ان کی لمبی فہرست بیان کرنا اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن ابتدائی ایام کے دو یادگار واقعات ایسے ہیں جو صرف فوجی ہی نہیں بلکہ دوسرے اعتبار سے بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ پہلا یہ کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کا سرحد پر کیا رد عمل ہوا اور دوسرا ۱۸۶۳ء کی امبیلا کی مہم ہے یہ دونوں باتیں اس قابل ہیں کہ یہاں ان کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ دونوں باتیں باہم مربوط ہیں اس لئے کہ ملک کے نچلے حصہ میں جو غدر پھیلا تھا اس کے بچے کھچے باغیوں ہی نے وہ چنگاری روشن کی تھی جس سے دوسری آگ بھڑکی۔ ان میں سے ایک واقعہ کی تفصیل سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پٹھان قبائل کے رویہ پر پورے برصغیر کے سیاسی استحکام کا کتنا دارومدار ہے۔ دوسرا واقعہ سرحد کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا ایک سرا ماضی میں ان سادات سے ملتا ہے جنہوں نے سکھوں کا مقابلہ کیا تھا اور دوسری طرف اخوند کی وساطت سے سوات کے موجودہ حالات سے وابستہ ہے۔ لیکن اس سے بھی اہم سبب یہ ہے کہ امبیلا کی مہم میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے پٹھانوں کی مخصوص بہادری اور عالی حوصلگی ظاہر ہوتی ہے اور جو اس قابل ہیں کہ ان سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔ آئیے ہم تھوڑی دیر کے لئے واقعات کا تسلسل چھوڑ دیں اور یوسف زئی علاقہ کی سرحد پر نظر ڈالیں۔

شروع میں سرفروش انگریز افسروں کو من مانی کاروائی کا موقع ملا۔ اور غدر سے پہلے آٹھ سال کے عرصہ میں ان خطوط کی بنیاد پر جن کا تذکرہ گزشتہ باب میں ہو چکا ہے سرحد کو قابو میں رکھنے کی بنیاد پڑ گئی۔ جب آزمائش کا وقت آیا تو یہ ڈھانچہ قائم رہا اس لئے نہیں کہ یہ نظام مضبوط تھا بلکہ اس نظام کو چلانے والے مضبوط تھے۔ اور سڈنی کاٹن جو اس وقت پشاور کا فوجی کمانڈر تھا وقت آنے پر زور اور قوت فیصلہ دکھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ہندوستانی رجمنٹوں سے بڑی تیزی کے ساتھ ہتھیار چھین لئے گئے حال آنکہ اکثر حالات میں ان رجمنٹوں کے کرنل شدید احتجاج کرتے رہ گئے۔ مردان میں ایک کمانڈر افسر نے جب دیکھا کہ جن لوگوں پر بھروسہ تھا انہوں نے اسے دغا دی تو اس نے خودکشی کر لی۔ اس علاقہ میں دو رجمنٹیں غدر میں شامل ہوئیں۔ ان میں سے ایک رجمنٹ جو نوشہرہ اور مردان سے تعلق رکھتی تھی اس کے بہت سے آدمیوں کو نکلسن نے تعاقب کرکے ختم کردیا اور جو بچ رہے انہیں سوات میں قبائل نے چن چن کر مار دیا۔ دوسری رجمنٹ جس نے پشاور میں اپنے ہتھیار واپس لینے کے لئے میگزین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی اسے خیبر کی سڑک پر بھاگتے ہوئے ختم کردیا گیا۔

اس طرح جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ ہر طرف کمک پہنچ گئی۔ جلدی جلدی نئی فوج بھرتی کی گئی جس نے ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ گائڈز پہلے ہی اپنے تاریخی سفر پر روانہ کر دئے گئے تھے انہوں نے مردان سے دھلی تک پانچسو اسی (۵۸۰) میل کا فاصلہ اور وہ بھی گرمیوں میں صرف ستائیس دن میں طے کیا۔ ان میں سے پانچ دن سڑک پر مہم میں صرف ہوئے۔ جب گائڈز آخری تیس میل مارچ کرتے ہوئے ۹ جون ۱۸۵۷ء کی صبح کو مردانہ‌وار دھلی کیمپ میں داخل ہوئے تو جس نے بھی ان کے شاھانہ قدوقامت اور دلیرانہ تیوروں پر نظر ڈالی وہ ان کی مدد حاصل کرنے پر فخر محسوس کرنے لگا۔ وہ ایسے استقلال کے ساتھ اور ھلکے پھلکے آئے تھے گویا صرف ایک میل مارچ کر کے آئے ہوں۔ اور آدھ گھنٹہ میں انہوں نے مورچے سنبھال لئے اور تین مہینے تک صف اول ھی میں رہے یہاں تک کہ اسی سال ۲۰ ستمبر کو دھلی فتح ھوگیا۔ پھر چند مہینے تک چھوٹی موٹی مہمات سر کرنے

کے بعد گائڈز یوسف زئی سرحد پر واپس آگئے۔

اس طرح اس آڑے وقت میں سرحد نہ صرف اپنی جگہ قائم رہا بلکہ اس نے جنوب میں کھوئی ہوئی پوزیشن بحال کرنے میں بھی ٹھوس مدد کی۔ ان لوگوں کے پوتوں اور نواسوں کو ۱۸۵۷ء اس حیثیت سے آج بھی یاد ہے کہ ان کی عزت پر داغ نہیں آنے پایا تھا اور جن خاندانوں کے پاس اس زمانہ کی کوئی سند یا ربن نہیں تھا انہیں اپنی محرومی کا احساس تھا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے میں امیر کابل کے رویہ کا بھی بڑا دخل تھا۔ پشاور پر قبضہ کا خواب دیکھنے اور اس حقیقت کے باوجود کہ خود جان لارنس جو ان دنوں پنجاب کے حاکم اعلیٰ تھے اس علاقہ سے دست بردار ہو کر دریائے سندھ کو سرحد بنانے کا منصوبہ سوچ رہے تھے امیر معاہدہ پر قائم رہے۔

ستانہ کے سید اکبر شاہ جو پیر بابا کے خاندان سے تھے ان کی یاد اس لحاظ سے ہمیشہ تازہ رہےگی کہ انہوں نے سید احمد بریلوی کے ساتھ مل کر سکھا شاہی کا مقابلہ کرنے والوں کی قیادت کی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں سید احمد بریلوی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے جو مرید بچے رہے انہیں سید اکبر نے ستانہ میں اپنے قلعہ میں پناہ دے دی۔ یہ وہ قلعہ ہے جو ہری سنگھ سے فتح نہ ہو سکا اور جو ۱۸۲۴ء میں رنجیت سنگھ کے حملہ کے باوجود بھی سر نہ ہوا۔ یہ بستی مجاہدین کے نام سے مشہور ہوئی۔ انگریزوں کے ابتدائی عہد میں تو مجاہدین خاموش رہے لیکن جب بچے کھچے باغی نوشہرہ سے اور دہلی کے آس پاس سے دوسرے لوگ یہ پیغام لے کر پہنچے کہ انگریزوں کی حکومت کی بنیادیں ہل چکی ہیں اور آخری کوشش کا یہی موقع ہے تو مجاہدین میں جوش پھیل گیا۔

خود سید اکبر جنہوں نے مجاہدین کو ستانہ میں پناہ دی تھی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یعنی اسی روز جس روز غدر کی خبر پشاور پہنچی تھی سوات میں فوت ہوگئے تھے۔ لیکن ان کی جگہ ان کے بھائی سید عمر ان کے بیٹے مبارک اور ان کے بھتیجے یعنی عمر کے بیٹے محمود (۱) نے لے لی۔

(۱) میرے دوست سید عبدالجبار شاہ کے والد۔

ان قائدوں نے ۱۸۵۸ء میں یوسف زئی علاقہ کی سرحد پر انگریزوں کے خلاف بغاوت پھیلا دی۔ لیکن سوات اور بنیر میں ستانہ کے سادات کے علاوہ کچھ اور بھی لوگ باثر تھے۔

ان دنوں سوات کے حالات دلچسپی سے خالی نہ تھے۔ ۱۷۸۳ء میں (یہ تاریخ یقینی نہیں ہے) بالائی سوات کے گاؤں جبرائے میں صافی قبیلہ کے ایک چرواھے کے گھر جس نے کسی وجہ سے اپنا قبیلہ چھوڑ دیا تھا اور یوسف زئیوں میں آ بسا تھا ایک بیٹا پیدا ھوا جس کا نام عبدالغفور رکھا گیا۔ یہ خاندان صافیوں کے قندھاری خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ ھوسکتا ھے کہ اس قندھاری نام کا تعلق پرانے گندھارا سے ھو یہی وجہ ھے کہ صافی خود بھی یہ اعتراف کرتے ھیں کہ وہ دوسرے قبائل کے مقابلہ میں بعد میں مشرف بہ اسلام ھوئے ھیں اور اسی لئیے مذھب کے سختی سے پابند ھیں۔(۱) عبدالغفور نے بھی چرواھے کی حیثیت سے زندگی شروع کی وہ اپنے باپ کے ریوڑ کی نگرانی کرتے ھوئے پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ وہ نماز پڑھتا تھا روزے رکھتا تھا اور تنہائی پسند تھا۔ جب اس نے سنا کہ دریائے سندھ کے کنارے بیکا گاؤں میں ایک خدا رسیدہ استاد رھتے ھیں تو اس نے اپنا بستہ سنبھالا سوات سے درہ میں ھوتا ھوا بنیر میں پیر بابا پہنچا اور وھاں سے میدان میں اتر کر بیکا پہنچ گیا۔ وھاں وہ کنویں پر بیٹھا رھتا تھا مویشیوں کی بڑی پیار سے دیکھ بھال کرتا تھا اور گاؤں والوں کی باتیں سنا کرتا تھا۔ وھاں سے وہ ھنڈ اور اس کے آگے مہابن (۲) کے سایہ میں سلیم خان پہنچ گیا۔ یہاں اس نے پوچھ گچھ کے موقع پر گول مول جواب دئے چنانچہ اس پر یہ جھوٹی تہمت لگ گئی کہ ھنڈ کے خان کے قتل میں اس کا بھی ھاتھ ھے۔ کہا جاتا ھے کہ ھنڈ کے خان کو سید احمد شاہ بریلوی کے ایما پر قتل کیا گیا تھا جو انھی دنوں یوسف زئی علاقہ میں پہنچے تھے۔ عبدالغفور سزا سے بچنے کے لئے بھاگ کر

---

(۱) یہ حقیقت ھے کہ علم دین کے طلبا میں بڑی تعداد صافیوں کی ھے۔ اور کئی صافی ممتاز عالم ھوگزرے ھیں۔ قندھاری اور گندھارا کی مماثلت پر معنی ھے۔ غالباً صافی قبیلہ کے نام میں عہد اسلام سے پہلے کی جھلک باقی ھے۔ اس قندھاری کا قندھار شہر یا قندھار صوبہ سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) وہ پہاڑی جو صوابی کے شمال میں واقع ھے کسی زمانہ میں غلطی سے سمجھا جاتا تھا کہ سکندر کے زمانہ کا ارناس یہی ھے۔

مردان کے قریب گوجر گڑھی اور پھر وہاں سے توروڈھیر پہنچ گئے جو اکوڑہ کے قریب خٹک قبیلہ کا ایک گاؤں ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے ان کا پر اسرار تبسم اور معصومانہ اداسی لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا لیتی تھی یہاں تک کہ وہ زیرگ مشہور ہوگئے۔ یہ فارسی لفظ بزرگ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دوست محمد نے بھی ان کی شہرت سنی اور ان کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ سکھوں کے خلاف میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے۔ سکھوں کی فتح کے بعد جب عبدالغفور کو سکون نصیب نہ ہوا جس کے لئے وہ مارے مارے پھرتے تھے تو وہ پہلے تو مالاکنڈ سے تھوڑی دور نیچے کی طرف سم رانی زئی اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد زیریں سوات میں بٹ‌خیلا چلے گئے۔ لیکن یہاں بھی سکھ شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز گونجتی رہتی تھی اور آخر انہیں وادی کے بالائی حصہ میں سیدو کے مقام پر مسکن مل گیا یہ جگہ دریائے سوات کے جنوب کی طرف اس مقام پر تھی جہاں دریا کا ایک معاون چشمہ ایلم پہاڑ کی بلندی سے اتر کر اصل وادی میں داخل ہوتا ہے۔ آخرکار انہیں یہاں سکون نصیب ہوا اور یہیں انہوں نے ترانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔

سیدو میں انہوں نے نکپی خیل کی ایک یوسف‌زئی عورت سے شادی کرلی جس کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ یہ دونوں بیٹے اس میاں‌گل خاندان کے مورث اعلیٰ تھے جس سے سوات کے والی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات کئی موقعوں پر بیان کی جا چکی ہے کہ پٹھانوں میں جب کوئی اپنے قبیلہ سے باہر شادی کرتا ہے تو اپنی بیوی کے خاندان سے جا ملتا ہے۔ یوسف‌زئی عام طور پر غیروں کو اپنی بیٹیاں نہیں دیتے البتہ سادات اور دوسرے بزرگوں کو بیٹیاں دے دیتے ہیں ایسا بھی شاذ و نادر ہوتا ہے (۱)۔ نکپی خیل میں عبدالغفور کی شادی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کو اس پٹھان معاشرہ نے کس طرح اپنالیا۔

عبدالغفور جب سے سیدو آئے تھے بلاشبہ یوسف‌زئیوں میں ان کا شمار سربرآوردہ لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ ان کا حکم ناطق نہیں تھا لیکن ایک شخص اخوند کے لقب سے اسی وقت یاد کیا جاتا ہے جب اس کی

---

(۱) بابر کا واقعہ جو پہلے بیان ہو چکا ہے غالباً وہ واحد واقعہ ہے جس پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔

بہت ہی زیادہ عزت کی جاتی ہو (اخوند فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی استاد ہیں لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو گورو کا ہے) ان کی پیار بھری اور بھولی بھالی باتوں کی داستانیں ابھی تک زبان زد عام ہیں مثلاً کم کے لاما کی طرح وہ کس طرح ایک چنار کے سایہ میں مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے ان کی روح اس مقدس روح میں سمانے کے لئے بے چین تھی جو اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اسی کہانی کے ایک اور کردار محبوب کی طرح یوسف زئیوں پر بھی ان کی روحانیت کا اثر پڑا وہ کشت و خون بھول گئے اور جان گئے کہ پاکیزگی اور روحانیت کیا ہوتی ہے ''میں بعد میں خلا میں داخل ہوں گا، میرے اعمال اسی لئے ہیں۔ عظیم محرکات آپ ہی کی سادگی کا نتیجہ ہیں ''۔

اخوند کی قبر پر مزار (۱) بنا دیا گیا جو مرجع خلائق بن گیا اور پیر بابا کے مزار کا مقابلہ کرنے لگا جو درہ کے پار بنیر میں واقع ہے۔ اخوند کی زندگی میں ان کا دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے خود یہ تجویز پیش کی تھی کہ سوات کا بادشاہ ستانہ کے اکبر شاہ کو بنایا جائے اسلئے کہ اول تو وہ سید ہیں (اخوند سید نہیں تھے) اور پھر انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔

سوات کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ آڑے وقت میں قبائلیوں نے متفق ہو کر کسی سید یا اور کسی بزرگ کو عارضی طور پر تخت پر بٹھا دیا ایک خاص مقصد کے لئے اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے اور انہوں نے قرآن کا حوالہ دے کر جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے خیرات جمع کی۔ کچھ دنوں تک اکبر شاہ بھی اس رتبہ پر فائز رہے اور بادشاہ کہلاتے رہے بادشاہ کا لقب ذو معنی ہے کیونکہ دنیاوی اقتدار کے بغیر بھی محض سادات ہونے کی حیثیت سے سیّدوں کو یہ لقب اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس ابہام کی وجہ سے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سوات میں سید کی اصل حیثیت کیا تھی لیکن یہ حقیقت

---

(۱) بد قسمتی سے لکڑی کے کام کے مقبرہ کا ڈھانچہ جو دیہی کاری گری کا نمونہ تھا برباد کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک بے ڈھنگی سی اینٹ چونے کی عمارت بنا دی گئی ہے۔

ہے کہ اکبر شاہ کو کچھ عرصہ تک ریاست کا حکمران تسلیم کیا جاتا رہا (۱)۔ جب وہ ۱۸۵۷ء میں فوت ہوگئے تو سوات میں اس سوال پر بڑا جھگڑا ہوا کہ آیا ان کی جگہ ان کے بیٹے مبارک شاہ کو بادشاہ بنایا جائے یا نہیں۔ وہ پیر بابا کی نسل سے تھے اس طرح وہ اس علاقہ میں سب سے زیادہ باعزت سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن کافی بحث و تمحیص کے بعد ان لوگوں نے جو اخوند کے زیر اثر تھے مبارک شاہ کو بادشاہ تسلیم کرنے سے انکاز کردیا۔ مبارک طیش میں آکر پنج تار چلے گئے جو سرحد کے دوسری طرف صوابی کے قریب ہے اور اس مقام کو اپنا مرکز بنا کر جیسا کہ اس علاقہ کے باغیوں نے بعد میں بنایا چملا قبیلہ کو انگریزوں کے خلاف بھڑکایا۔ آس سال اس علاقہ میں اس سے زیادہ اور کوئی گڑ بڑ نہیں ہوئی کیونکہ اخوند نے سوات کے یوسف زئیوں کو اس جھگڑے میں پڑنے سے باز رکھا تھا۔

پھر بھی غدر کے عواقب کے طور پر سدم سے دریائے سندھ تک یوسف زئی سرحد سے ملنے والے علاقہ میں کافی گڑ بڑ ہوئی۔ جولائی اور اگست ۱۸۵۸ء میں مجاھدین کے دستوں نے جنھیں مقامی قبائل کی حمایت حاصل تھی نارنجی میں زبردست موچہ قائم کر لیا اور حالات کو معمول پر لانے کے لئے گائڈز کو شدید کارروائی کرنی پڑی۔ بعد میں اسی سال ستانہ میں مبارک شاہ کے قلعہ پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ کے نتیجہ میں مجاہدین کو ان کی محفوظ بستوں سے نکال دیا گیا اور آس پاس کے قبائل نے عہد کیا کہ وہ مجاھدین کو وھا واپس نہیں آنے دینگے۔ اس لڑائی میں اکبر شاہ کے بھائی عمر شاہ جو اس وقت تک حیات تھے شہید ہوگئے اور مبارک شاہ بھی بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے زخمی ہوئے۔ مبارک اپنے بچے کچھے ہندوستانی مریدوں کو لے کر ملکا پہنچ گئے جو نسبتاً محفوظ جگہ تھی۔ یہ جگہ مہابن پہاڑ کے ایک ڈھلوان پر واقع ہے جو وادی چملا سے ملتی ہے۔

اس کمین گاہ سے سادات نے مجاھدین کو آگے رکھ کر مردان اور

---

(۱) سوات کے موجودہ حکمراں خاندان کا بھی یہی حال ہے ۔ یہ حکمراں سید نہیں ہیں لیکن بادشاہ کہلاتے ھیں اس سے دونوں مطلب لئے جا سکتے ھیں یعنی حکمراں اور مذھبی پیشوا ۔ ریورٹی نے یہ لکھ کر بڑی زیادتی کی ہے کہ کسی مذھبی پیشوا کو دنیاوی اقتدار نہیں دیا جا سکتا ۔

صوابی کی سرحدوں پر پھر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اس وقت ان کی نظروں میں برطانوی حکومت سکھا شاھی سے بہتر نہ تھی۔ وہ بھی سب کے سب کافر تھے اس لئے جب بھی موقع ملے ان پر حملہ کرنا جائز تھا۔ آخر ۱۸۶۳ء کے موسم خزاں میں حکومت نے فیصلہ کیا کہ بغاوت کے اس مرکز کا صفایا کر دیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ یہ مہم بنیر کے قبائل سے دشمنی مول لئے بغیر سر کی جا سکتی ھے کیونکہ جب سے انگریز یہاں آئے تھے یہ قبائل پرامن تھے اور ان کے مذہبی پیشوا اخوند کو ستانہ کے سادات اور ان کے ھندوستانی مریدوں سے کوئی ھمدردی نہیں تھی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ھے یہ اندازہ سدم کے عجب خان اور عزیز خان سے مشورہ لئے بغیر لگایا گیا تھا۔ یا کم از کم ان دونوں نے یہی سمجھا اور اپنی ذلت محسوس کی۔ اس کے ایسے نتائج نکلے جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ان کی ناراضگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ملکا امازئی علاقہ میں واقع تھا۔ سدم کے خان بھی قبیلہ کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے البتہ اس سے الگ ھوگئے تھے۔

طے یہ پایا کہ وادی چملا پر حملہ کیا جائے جو بنیر سے جنوب میں شرقاً غرباً پھیلی ھوئی ھے اور جس میں ملکا واقع ھے۔ منصوبہ کے مطابق ایک طاقتور فوج کو مردان کی طرف سے درۂ امبیلا کے راستہ آگے بڑھنا تھا۔ فوج کے ایک اور حصہ کو ٹوپی کے قریب کے علاقہ پر قبضہ کرنا تھا۔ صورت حال کا جو سیاسی جائزہ لیا گیا تھا اس کے تحت بنیر اور چملا کے قبائل کو اس اقدام سے باخبر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ حقیقت یہ ھے کہ ان قبائل کو پہلے سے خبردار کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا کیونکہ فوجی پیش قدمی صیغۂ راز میں رھنی چاھئے۔ غالباً یہی وہ فروگزاشت تھی جس سے عجب خان طیش میں آگیا اور جب فوجی پیش قدمی کی خبر عام ھوگئی تو اس نے بنیر والوں کو طعنہ دیا کہ وہ اپنا پردہ اٹھائے دے رھے ھیں۔

نیویل چیمبر لین اس فوج کا کمانڈر تھا اور سرفروش افسروں کی برادری کا آخری فرد رینل ٹیلر اس کا پولیٹیکل افسر تھا۔ درۂ امبیلا تک پہنچنے کے لئے کوئی چھ میل لمبی تنگ اور پیچدار گھاٹی طے کرنی پڑتی ھے۔ اس گھاٹی میں سے ایک چشمہ بھی پتھروں سے ٹکراتا ھوا

گزرتا ھے۔ گھاٹی میں پیدل سفر کیا جا سکتا ھے گھوڑوں پر بہ مشکل گزرا جا سکتا ھے لیکن سامان سے لدے ھوئے جانوروں کے لئے یہاں سے گزرنا بہت مشکل ھے (۱)۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس کمانڈر نے اس راستہ کا پہلے ھی اندازہ لگا لیا ھو وہ کیسے یہ امید رکھ سکتا تھا کہ اس کی فوج آسانی سے اوپر پہنچ جائے گی۔ فوج کی پہلی صف ۲۰ اکتوبر کی صبح کو تنگ گھاٹی میں داخل ھوئی اور کسی قابل ذکر مزاحمت کے بغیر دوپہر تک کوتل پہنچ گئی۔ لیکن گولہ بارود سے لدے ھوئے خچروں کے سوا سامان سے لدا ھوا اور کوئی جانور شام تک اوپر نہیں پہنچ سکا۔ پورے قافلہ کے سمٹنے اور عقبی حصہ کے آ ملنے میں اڑتالیس گھنٹے لگ گئے۔ اس عرصہ میں مخالف فریق فوج کی آمد کی خبر سے باخبر ھو چکا تھا اور اب اس پر اچانک حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد اس پوزیشن پر قبضہ کر لیا گیا جسے رابرٹس نے دنیا کی مضبوط ترین پوزیشن قرار دیا ھے اور ھیڈ کواٹر کوتل کے وسط میں رکھا گیا جس کے دونوں طرف پہاڑی ٹیلے تھے۔ بعد میں دائیں طرف کا ٹیلہ کریگ پکٹ اور بائیں طرف کا ٹیلہ ایگلز نیسٹ کے نام سے مشہور ھوا۔ سامنے کی طرف وادی چملا تک کھلا میدان ھے۔ اور اگرچہ دونوں طرف جن ٹیلوں پر چوکیاں قائم کی گئی تھیں وہ اس علاقہ کی بلند ترین چوٹیاں نہیں ھیں پھر بھی ان کی چٹانوں کو آڑ بنایا جا سکتا ھے اور جب تک یہ ٹیلے قبضہ میں ھوں پوزیشن محفوظ رھتی ھے۔

اتنی دیر میں بلاوا جا چکا تھا اور قبائلی ھزاروں کی تعداد میں جمع ھو رھے تھے۔ اکبر کے عہد کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب ان پہاڑوں پر فوج کشی کی گئی تھی جو یوسف زئی پٹھانوں کی زرخیز اور حسین وادیوں کا پردہ بنے ھوئے ھیں۔ امبیلا سے چند میل دور ملندرے کے مقام پر مغل فوجوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ درانیوں اور سکھوں نے کبھی یہاں تک آنے کی جرأت ھی نہیں تھی۔ طبل پر چوٹ پڑی اور لشکر صف بستہ ھونے لگے۔ شروع

---

(۱) اب ایک عمدہ سڑک گھاٹی سے ایک ھزار فٹ اوپر تک جاتی ھے۔ یہ سڑک صرف بیس سال پہلے بنائی گئی ھے۔ جب پہلے پہل اس علاقہ میں میرا گزر ھوا تو ان دنوں خوڑ (پہاڑی ندی کی گزر گاہ) سے ھو کر جانا پڑتا تھا جس طرح ۱۸۶۳ء میں فوج نے پیش قدمی کی تھی۔

میں اخوند الگ تھلگ رہے۔ امبیلا کا رخ دریائے سندھ اور ستانہ کے سیدوں کے وطن کی طرف ہے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے اعلان کیا تھا کہ ہم صرف چملا پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور ہم سوات تو کیا بنیر میں بھی داخل نہیں ہوں گے۔ لیکن جب لڑائی طول پکڑ گئی تو وہ بھی قبائل سے آملے اور سادات کے نزدیک انہوں نے وہ عزت غصب کر لی جو سادات کو ملنی چاہئے تھی۔

قبائیلی جنگیں جتنے عرصہ جاری رہتی ہیں یہ لڑائی اس سے کہیں زیادہ طویل عرصہ تک جاری رہی۔ قبائلی صرف چند روز کا توشہ لے کر گھر سے نکلتا ہے اور فوجی رسد جاری رکھنے کا عام طور پر کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر پہلا حملہ ناکام ہو جائے یا جوش ٹھنڈا ہو جائے تو قبائلی فوراً میدان چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن امبیلا میں انگریزوں کی چوکیوں پر کوئی ایک ماہ تک روزانہ حملے ہوتے رہے۔ اس کے بعد بھی ایک مہینے تک گاہے گاہے شدید حملے ہوتے رہے۔ جو لوگ فوجی مہمات کے متعلق اچھی تحریروں کے شائق ہیں انہیں رابرٹس اور ینگ ہسبینڈ (Young Husband) کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان تصنیفات میں برطانیہ کی فوجی تاریخ کے بڑے روشن نام درج ہیں۔ ان میں براؤنلو، (Brownlow,) کیس، (Keyes) نیویل چیمبر لین، گاروک (Garvock) اور خود رابرٹس کے نام شامل ہیں۔ لیکن یہاں جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے قبائلی دشمنی کی حیرت انگیز بہادری کا اعتراف کیا ہے۔ چھ ہزار فوج درہ کی چوٹی پر روک لی گئی اور اسے زندگی اور موت کی لڑائی لڑنی پڑی۔ کریگ پکٹ اور ایگلز نیسٹ پر خوفناک حملے کئے گئے۔ اول الذکر پر چار حملے کئے گئے اور اس پر تین مرتبہ قبائل نے قبضہ کر لیا اور تین مرتبہ انگریزوں نے ان سے چھین لیا۔ انگریز فوج میں مرنے والوں کی تعداد نو سو تک پہنچ گئی اور قبائلی جو بڑی بے جگری سے بندوقوں کی زد پر آرہے تھے اس سے بھی بڑی تعداد میں ہلاک ہوئے۔ خود نیویل چیمبر لین بھی کریگ پکٹ پر حملہ کی قیادت کرتے ہوئے بری طرح زخمی ہوئے۔ کریگ پکٹ آج بھی قتل گاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آس پاس فریقین کے ایک ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ رابرٹس نے قبائیلوں کی بے مثال بہادری اور ینگ ہسبینڈ نے ان کی دلیرانہ شان کی تعریف کی ہے۔

ایگلز نیسٹ پر قبضہ کرنے کے لئے ایک بہت ہی خوفناک جھڑپ کے بعد یہ طے ہوا کہ قبائلی جنگ بندی کے جھنڈے تلے آئیں اور اپنے مردے اٹھا کر لے جائیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی اور ان کے رہنماؤں نے فوج کے کمانڈر نیویل چیمبرلین اور کمشنر رینل ٹیلر سے جو فوج کے ساتھ کھل کر بات چیت کی۔ دشمن نے ہماری پیشکش کے جواب میں بڑی خوش اخلاقی کا ثبوت دیا لیکن یہ بات واضح کر دی کہ وہ اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں جسے انہوں نے آج تک ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ جنگ کے اصولوں کے پابند رہیں گے لیکن آخر دم تک لڑیں گے۔ اس پوری کہانی میں ان سفاکانہ مظالم کا اشارہ تک نہیں ملتا جن کی وجہ سے بعد کی لڑائیوں کی شکل میں بدل گئی۔ گھمسان کی لڑائی کے ساتھ ساتھ فقرے بازی بھی ہوتی رہتی تھی۔ رابرٹس نے لکھا ہے کہ قبائل کو جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ فوج کے ساتھ جو سکھ اور یورپی تھے ان کے مقابلہ میں پٹھانوں اور گورکھے ہراول چوکیوں پر ڈیوٹی میں بڑے مستعد تھے۔ چنانچہ جب قبائلی کیٹیز کے آدمیوں کو دیکھتے تھے تو وہ چلا کر کہتے تھے کہ یہ تو پٹھان ہیں انہیں واپس بلاؤ اور ان لوگوں کو بھیجو جو ہیٹ اور سرخ پگڑی پہنے ہوئے ہیں (یورپی اور سکھ) یہ لوگ لڑنے میں تو اچھے تھے لیکن پہاڑیوں پر نہیں چڑھ سکتے تھے اور اپنے سر نیچے نہیں رکھ سکتے تھے۔

چھ ہفتہ تک لڑائی جاری رہنے کے بعد کمک پہنچ گئی اور فوج وادیٔ چملا میں داخل ہوکر حملہ پر اتر آئی۔ آخرکار بنیر کے قبائل نے پناہ مانگ لی۔ اب یہ طے کرنا تھا کہ ملکا کی بستی کو اجاڑنے کے لئے اتنی بڑی فوج بھیجی جائے جو راستہ میں ہر مزاحمت کا سامنا کر سکے یا یہ کام انگریز افسروں کی نگرانی میں قبائل پر چھوڑ دیا جائے۔ جہاں تک فوج پہنچ چکی تھی وہاں سے ملکا ابھی اکیس میل کے فاصلہ پر تھا۔ سب نے طیش میں آکر موخرالذکر صورت منظور کی۔ مہم کامیاب رہی لیکن جتنی زحمت اٹھائی گئی اتنا بڑا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ رابرٹس افسروں کی اس چھوٹی سی ٹولی میں شامل تھے جو ملکا کی تباہی دیکھنے کے لئے کمشنر رینل ٹیلر گائڈز کے ایک دستے اور بنیر وال قبائل کے ساتھ گئے تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کی تفصیل اپنی کتاب میں بیان کی ہے۔ میں یہاں جو کچھ بیان کر رہا ہوں وہ میں نے تیس سال پہلے بنیر کے ایک

خان سے سنا تھا جو اس کہانی کے ہیرو کے خاندان سے ہے۔

سوات اور بنیر کے لوگ اس فوج کی بہادری سے بڑے مرعوب ہوئے تھے جو ان کے مقابلہ پر صف بستہ تھی۔ پھر ان پر اس بات کا بھی بڑا اثر ہوا تھا کہ جنگ بڑی مردانگی اور عالی حوصلگی کے ساتھ لڑی جا رہی تھی۔ مثلاً جو قبائلی زخمی ہو جاتے تھے انہیں عارضی ہسپتالوں میں لے جا کر ان کا علاج کیا جاتا تھا اور تندرست ہونے پر انہیں واپس کر دیا جاتا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے پٹھان خاص طور پر خٹک یوسف زئی اور افریدی حکومت کی طرف سے لڑ رہے تھے اور بڑی بےجگری سے لڑ رہے تھے اور افسروں اور جوانوں کا باھمی تعلق بڑا مضبوط تھا۔ یہ جنگ سکھوں کے خلاف جنگ سے بالکل مختلف تھی۔ ساتھ ھی ساتھ وہ اس نئی فوج سے کتنے ھی متاثر کیوں نہ ہوں لیکن یہ تہیہ کئے ہوئے تھے کہ اسے سوات اور بنیر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ قبائل کو اس جنگ میں اتنا بھاری نقصان پہنچ چکا تھا۔ اس لئے وہ سوچ رہے تھے کہ بنیر کے خان بیچ میں پڑ جائیں اور فریقین کی عزت رکھنے کے لئے انگریزوں کی ایک مختصر جماعت کو ساتھ لے جا کر ملکا کو اجڑوادیں۔ اگر مقابلہ جاری رہا تو انگریز پوری فوج لے کر وھاں پہنچ جائیں گے اور ھوسکتا ھے کہ وہ بنیر اور پھر سوات میں بھی داخل ھو جائیں اور آخرکار وہ پردہ اٹھا دیں جو قریباً تین سو سال سے اس وقت کے بعد نہیں اٹھا تھا جب اکبر کی فوجوں کو یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔

اخوند بھی اس پالیسی کے حامی تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ سر پھرے مجاھدین اپنی ضد پر اڑے رہے تو قبائل کو نقصان اٹھانا پڑے گا اور وہ اپنی آزادی سے محروم ھو جائیں گے۔ اخوند کا یہ بھی خیال تھا کہ ملکا کی تباھی سے ستانہ کے سادات کا وقار گھٹ جائے گا جس کے نتیجہ میں ممکن ھے اخوند کا وقار بڑھ جائے۔ یہ حقیقت ھے کہ بنیر میں پیر بابا کی زیارت کے مقابلہ میں جہاں سید اکبر اور مبارک شاہ کے مورث اعلیٰ دفن ھیں سیدو میں اخوند کا مزار مرجع خلائق بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ بنیر کے خوانین سے کہا گیا کہ وہ صلح کی پیش کش کریں۔ وہ ڈگر کے زیداللہ خان کی قیادت میں اس بات پر رضامند ھوگئے۔ کہ وہ انگریز کمشنر کو چھوٹے سے محافظ دستہ کے ساتھ ملکا لے جائیں گے ان کے سامنے یہ بستی اجاڑ دی

جائے گی اور مجاھدین کو وھاں سے نکال دیا جائے گا۔

سات افسر جن میں رینل ٹیلر اور خود کمشنر رابرٹس بھی شامل تھے گائڈز کے ایک مختصر سے دستے اور سوات اور بنیر کے قریباً ایک سو سر برآوردہ ملکوں اور سفید ریشوں کی جماعت کے ساتھ روانہ ھوئے۔ اس جماعت کا قائد زیداللہ خان تھا۔ ڈگر جو چھوڑے سے دریا برندو کے کنارے آباد ھے اس وادی کا مرکزی مقام ھے۔ زیداللہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ جو سابقہ لڑائیوں میں اپنی ایک آنکھ اور ایک بازو گنوا چکا تھا۔ اس نے یہ کام پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جیسا کہ ھمیں معلوم ھے ملکا یوسف زئیوں کے امازئی علاقہ میں واقع تھا اور پوری سڑک پر جابجا جنگجو قبائلی کھڑے تھے جو پوری طرح مسلح تھے اور غصہ میں اس جماعت پر آوازے کس رھے تھے۔ لیکن مہم سر کرلی گئی۔ زیداللہ خان نے اس موقع پر اخوند کی طرف سے قبائل کے سامنے موثر تقریر کی۔ جلتے ھوئے گاؤں سے دھوئیں کا ایک بڑا مرغولہ اٹھا اور قبائل میں پھر جوش پھیل گیا انہوں نے نعرے لگائے کہ انگریزوں کو واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔ وہ بڑے زور زور سے نعرے لگا رھے تھے ھاتھ اور منہ سے اشارے کر رھے تھے اور رینل ٹیلر کو گھیرے میں لئے ھوئے تھے جو بڑے اطمینان سے دشمنوں کے نرغہ میں تن تنہا کھڑے تھے(۱)۔ اچانک زیداللہ خان جھپٹ کر ٹیلر کے پاس پہنچ گیا اس کی ایک آنکھ غصہ سے لال بھبوکا ھو رھی تھی اس نے ان لوگوں کو جو دھمکیاں دے رھے تھے بلند آواز میں بتایا کہ بنیر کا جرگہ یہ قول دے چکا ھے کہ ملکا کو تباہ کردیا جائے گا اور انگریز خیر و عافیت کے ساتھ واپس آجائیں گے جرگہ اس وعدہ پر قائم رہنے کا تہیہ کئے ھوئے ھے۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرنا چاھتے ھیں تو انہیں بنیر کی پوری آبادی سے لڑنا ھو گا۔ گؤں میں اور پھر سارے راستے بار بار یہی صورت پیش آئی یہاں تک کہ جماعت کو واپسی کا راستہ مل گیا اس کی سزا ختم ھوئی اور وہ پھر امبیلا پہنچ گئی۔

---

(۱) (REYNEL TAYLOR) نے اس مہم کا تذکرہ کرتے ھوئے لکھا ھے کہ اس میں انگریز افسروں کے ذاتی اثر کا بڑا ھاتھ تھا۔ جب اسلام خطرہ میں ھو تو تنخواہ اور پنشن کی کون پروا کر سکتا تھا لیکن ضرورت کے وقت اس انگریز افسر کو دغا دینا جو منصف مزاج اور شریف ثابت ھو چکا تھا جسے پٹھان خطرہ کے وقت ثابت قدم دیکھ چکا تھا اور جسے وہ اپنے خاندان کے سامنے نامور بنا کر پیش کر چکا تھا۔ پٹھان کے بس کی بات نہیں تھی۔

افریدیوں یا وزیریوں سے اس قسم کا معاملہ طے کرنا ناممکن تھا۔ ان قبائل کا کوئی ملک یا ملکوں کی کوئی ٹولی اس قسم کا عہد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی البتہ کسی لالچ سے اور بعد میں اس کی خلاف ورزی کرنے کی نیت سے ایسا عہد ضرور کر لیتی۔

یوسف زئی اور خٹک بات کے دھنی ھیں اگر ان کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ ان کا وسیع تر مفاد اسی میں ھے یا یہ پختو ننگ کا سوال ھے تو وہ دوسرے قبائل کے مقابلہ میں قول کے زیادہ سچے ثابت ھوں گے۔ یہ بڑا اثر انگیز نظارہ معلوم ھوتا ھے کہ ایک سفید ریش بزرگ جس کی آنکھ جوش غضب سے چمک رھی ھے اپنا ایک بازو ھلا رھا ھے اور محض قول نباھنے کے لئے تمام مخالفتوں کے باوجود بات پوری کر رھا ھے۔

سوات اور بنیر کا پردہ اٹھنے میں ابھی قریباً تیس سال اور باقی تھے۔

فصل بست وسویم

بلوچستان اور فارورڈ پالیسی

برطانوی برطانوی اقتدار کے آغاز سے ۱۹۰۱ء تک تقریباً نصف صدی کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۸ء میں دوسری جنگ افغان کے آغاز تک ہے اور دوسرا حصہ اس تاریخ سے شروع ہو کر کرزن کے زمانہ میں پنجاب سے سرحدی اضلاع کی علیحدگی پر ختم ہوتا ہے۔ وسیع معنی میں ابتدائی تیس سال کا عرصہ وہ زمانہ ہے جب سرحد بند رکھنے کی نام نہاد پالیسی کی آزمائش ہو رہی تھی (باب بست و یکم) اس عرصہ میں قبائلی علاقہ کے کسی نہ کسی حصہ میں فوجی کارروائیاں ہوتی رہیں لیکن اس وقت تک تو اس علاقہ کے کسی حصہ پر مستقل قبضہ نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر آج یہ سوچ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ۱۸۹۵ء تک سوات محض خیالی جنت تھی جس میں کوئی اجنبی داخل نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک کسی یورپی باشندہ نے اس علاقہ کا حسن اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا بلکہ محض داستانیں سنی تھیں۔ ۱۸۹۸ء تک بنیر پر بھی پردہ پڑا ہوا تھا۔ آخری بیس سال کے عرصہ میں فارورڈ پالیسی کو بروئے کار لایا گیا۔

یہ دونوں عرصے ایک حد تک ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہیں۔ نئی پالیسی کی طرف پہلا قدم وائسرائے کی حیثیت سے لٹن (Lytton) کی آمد سے تھوڑے دن پہلے اور افغانستان کے ساتھ جنگ چھڑنے سے دو سال پہلے ۱۸۷۶ء میں اٹھایا گیا۔ یہ قدم شمال مغربی سرحد پر نہیں بلکہ بالائی سندھ سے اس علاقہ میں اٹھایا گیا جو اب بلوچستان کہلاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے

علاقوں میں بھی اہم اقدامات کئے گئے اور ۱۸۹۳ء میں افغانستان کے ساتھ سرحدوں کا تصفیہ کر کے ان اقدامات کو ٹھوس شکل دی گئی۔ یہ تمام کارروائی ڈسرائیلی (Disraeli) حکومت کی اس پالیسی کے مطابق تھی کہ وسطی ایشیا میں روس کے دباؤ کے خلاف ایک دفاعی دیوار قائم کی جائے۔ ڈسرائیلی ۱۸۷۴ء میں وزیر اعظم بن چکے تھے۔

یہاں ہمیں اس پالیسی کے فوجی پہلو سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی پٹھانوں پر اس کا کیا اثر ہوا۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ برطانیہ کے سیاسی افکار و اعمال کی دوسری مثالوں کی طرح اس معاملہ میں بھی دونوں پالیسیوں کے درمیان کوئی منطقی اور واضح حد حاصل نہیں ہے۔ سرحد کے بیشتر حصوں میں سرحد بند رکھنے کی پرانی پالیسی کے بیشتر عناصر برقرار رکھے گئے ساتھ ہی ساتھ قبائلی فارورڈ ایریا میں حکم یہ تھا کہ دو قدم آگے بڑھو اور ایک قدم پیچھے ہٹو۔ اس کے علاوہ فارورڈ ایریا میں بھی دور دور پھیلے ہوئے علاقوں پر کنٹرول کہیں کم اور کہیں زیادہ تھا۔

دوست محمد ۱۸۶۳ء میں فوت ہو چکا تھا (جس سال امبیلا کی مہم سر کی گئی) اور حسب معمول اس کی جانشینی کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ دوست محمد نے اپنے ایک چھوٹے بیٹے شیر علی کو اس بنا پر وارث تخت نامزد کیا تھا کہ وہ درانی ماں کے بطن سے تھا۔ لیکن شیرعلی ۱۸۶۹ء تک تخت حاصل نہیں کر سکا۔ اس مختصر سے درمیانی عرصہ میں دوست محمد کے بڑے بیٹے (۱) افضل اور اعظم جن کی ماں اعلیٰ ذات کی نہیں تھی کابل پر حکمراں رہے۔ اس میں سے بیشتر عرصہ تک جان لارنس ہندوستان کے وائسرائے رہے اور ان کی اس پالیسی پر عمل ہوتا رہا کہ سرحد میں بالکل کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ یہ بات توجہ کی محتاج ہے کہ کابل میں تخت نشینی کے سوال پر جھگڑے کے دوران سرحد میں عام طور پر امن و امان ہی رہا۔ شیر علی کے بر سر اقتدار آنے کے بعد ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۶ء تک جبکہ میو اور نارتھبروک وائسرائے تھے سرحد کے علاقہ میں کوئی تبدیلی رو نما نہیں ہوئی البتہ مغرب اور شمال میں افغان سلطنت کی سرحدیں متعین کرنے کے سوال پر ایران اور روس کے ساتھ گرما گرم

---

(۱) افضل امیر عبدالرحمان کے والد کا نام ہے۔

مذاکرات جاری رہے۔ سیستان پر افغانستان اور ایران کے دعووں کے متعلق ایک فیصلہ کی وجہ سے جو شیر علی کے نزدیک غیر منصفانہ تھا برطانوی حکومت سے اس کی ناراضگی کا اصل سبب بن گیا اسے اور بھی چھوٹی چھوٹی شکایتیں تھیں جو ہندوستان سے ملنے والی افغان سرحدوں کے بارے میں تھیں۔

جب سے انیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے شروع میں سندھ پر قبضہ ہوا تھا ان سرداروں اور قبیلوں سے قریبی تعلق پیدا کرنے کی کسی خاص کوشش کے بغیر جو اس صوبہ کی سرحدی پہاڑیوں اور مرتفع میدانوں پر قابض تھے بالائی سندھ کی سرحد کی کامیابی کے ساتھ حفاظت ہو رہی تھی۔ سندھ کی سرحد سے تھوڑی دور شمال میں ڈیرہ غازی خان ضلع واقع ہے جو دریائے سندھ کے مغرب میں ایک طویل ساحلی خطہ ہے اور جنوب کی طرف ڈیرہ اسماعیل کے دامن کا حصہ ہے اور ڈیرہ اسماعیل کی طرح حکومت پنجاب کے ماتحت ہے۔ جس کا صدر مقام لاہور ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان میں فرق یہ تھا کہ اول الذکر ایک حد تک پٹھانوں کا علاقہ تھا جس کے مغرب میں وزیرستان کی پہاڑیاں ہیں جن میں بڑے طاقتور پٹھان قبیلے آباد ہیں جبکہ موخرالذکر میں بیشتر بلوچ قبائل آباد ہیں جو مغرب کی طرف تخت سلیمان کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلہ میں بھی آباد ہیں۔ وزیریوں کے مقابلہ میں بلوچ قبائل زیادہ متحمل مزاج اور نسبتاً کم مسلح تھے اور اپنے سرداروں کی بات ماننے کو تیار رہتے تھے جو تمان دار کہلاتے ہیں۔ ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع کی سرحد کے پار بسنے والے بلوچوں سے نپٹتا تھا جس طرح شمالی حصہ میں دوسرے ڈپٹی کمشنر پٹھانوں سے نپٹتے ہیں۔ سب کے سب بلوچ جن میں ماڑی اور بگٹی بھی شامل ہیں جو سرحد کے قریب رہتے تھے برائے نام خان قلات کو اپنا حاکم تسلیم کرتے تھے۔ پورے ایران اور افغانستان میں لفظ قلات عام طور پر مستعمل ہے اور یہ قلعہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ خاص قلعہ کوئٹہ سے تقریباً ستر میل جنوب میں ایک سطح مرتفع پر واقع ہے جو قریباً سات ہزار فٹ بلند ہے۔ آپس میں بہت سی شادیاں ہو جانے کے باوجود قلات کے خان کی ذات بروہی ہے بلوچ نہیں ہے۔ اس علاقہ میں بروہی اور بلوچ قبائل آپس میں گڈمڈ ہیں اور خان قلات کی طرح قلات کے اور بہت سے سرکردہ سردار

بھی بروھی نسل سے ھیں (۱)۔

بروھی اور بلوچ کے امتیاز کی بحث کا بظاھر پٹھانوں سے کوئی تعلق نہیں ھے۔ بلوچستان سے لفظی طور پر بلوچوں کا علاقہ مراد ھے لیکن یہ لفظ بلوچستان کے لئے اس معنی میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

وادیٔ شال جو قلات سے قریباً ستر میل شمال میں اور درۂ بولان کے سرے پر سطح سمندر سے پانچ ہزار پانچسو فٹ کی بلندی پر، اس سرحد پر واقع ھے جو دو نسلوں کو علیحدہ علیحدہ کرتی ھے۔ اس وادی کے مرکز میں کوئٹہ شہر ھے۔ شمال میں پورا علاقہ پٹھان خطہ کا حصہ ھے اور اس میں پٹھان قبائل ھی آباد ھیں ان میں ترین، اچک زئی، کاکڑ اور پنڑی سب سے زیادہ اھمیت کے مالک ھیں۔ کوئٹہ کے جنوب میں تمام آبادی بلوچوں اور بروھیوں کی ھے۔ یہ صحیح ھے کہ نام نہاد بلوچستان کا بیشتر حصہ بروھی اور بلوچ قبائل کے قبضہ میں ھے۔ ان قبائل کا علاقہ وسیع مرتفع ریگستانوں پر مشتمل ھے جو کوئٹہ سے مغرب اور جنوب کی طرف سمندر تک پھیلے پڑے ھیں لیکن پوری آبادی میں سے قریباً نصف پٹھان ھیں جو کوئٹہ سے شمال اور شمال مشرق میں نسبتاً زیادہ زرخیز پہاڑیوں اور وادیوں میں آباد ھیں۔ صحیح جائزہ لیا جائے تو بلوچستان میں بھی پٹھان قبائل ھی اھمیت کے مالک ھیں۔ لیکن یہ قبائل بھی تعداد میں بہت تھوڑے ھیں اور سب ملا کر پانچ لاکھ سے بھی کم ھیں (۲)۔ اور اچک زئیوں کو چھوڑ کر جو درانی ھیں یہ قبائل طاقتور نہیں ھیں۔

افغانوں اور پٹھانوں کی کہانی میں بلوچستان کا تذکرہ چھیڑنے کی ایک اور بھی وجہ ھے۔ قلات کے خوانین کے مورث اعلیٰ ناصر خان کا درانی سلطنت کے بانی احمد شاہ سے برائے نام جاگیردارانہ تعلق تھا۔ مستونگ اور قلات کا سردار بروھی ناصر گویا احمد شاہ کے عقبی دروازہ پر متعین تھا اور قندھار سے ھندوستان جانے والی شاھراہ پر سب سے زیادہ

---

(۱) بروھیوں کی اصل غیر یقینی ھے۔ کہا جاتا ھے ان کی زبان دراوڑی ھے۔ ان میں سے اکثر خانہ بدوش ھیں۔ بلوچ نسل اور زبان کے اعتبار سے ایرانی ھیں اور ایران کے اندر تک پھیلے ھوئے ھیں۔ یہ دونوں پٹھانوں اور افغانوں سے بالکل الگ ھیں۔

(۲) اس کے مقابلہ میں شمال مغربی سرحد کی آبادی قریباً ساٹھ لاکھ ھے۔

اہمیت کا مالک تھا۔ قلات کے خوانین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ وہ ایک طرح سے آزاد تھے اور درانیوں کے باج گزار نہیں تھے بلکہ جب نادر مرگیا اور ایرانی سلطنت کے حصے بخرے ہوئے تو ان کے حصہ میں خراب علاقہ آیا۔ لیکن یہ دعویٰ صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ قلات اس زمانہ سے بہت پہلے سے قندھار کا باج گزار چلا آرہا تھا اور جب احمد شاہ نے ۱۷۴۷ء میں اس شہر میں اپنی سلطنت قائم کی تو اس نے بروھیوں کو بھی زیر کرلیا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کی سلطنت کی حدیں سمندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر اس میں کوئی شبہ ہو تو اس کے ازالہ کے لئے اس حقیقت پر نظر ڈالنا کافی ہے کہ احمد شاہ نے اس سردار کو جو نیا نیا مطیع ہوا تھا وفادار بنائے رکھنے کے لئے معمول سے ہٹ کر اسے ایک افغان علاقہ یعنی وادیٔ شال مرحمت کردی جس میں کوئٹہ واقع ہے۔ کوئٹہ کے آس پاس جنوب کے دیہات میں بروھیوں کی آبادی اسی زمانہ سے چلی آرہی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اگرچہ بلوچ اور بروھی علاقوں کی سرحد بند رکھنے کی پالیسی پر بمبئی اور پنجاب دونوں صوبوں کی حکومتیں عمل پیرا تھیں لیکن یہ سب کو معلوم تھا کہ مقبوضہ علاقہ کے عقب میں ایک ایسا علاقہ موجود ہے جس پر پہلی جنگ افغان کے بعد کسی کا قبضہ نہیں ہوا۔ ان دنوں بمبئی کی حکومت سندھ کی نگران تھی اور ضلع ڈیرہ غازی خان حکومت پنجاب کے تحت تھا۔ ہمارے افسر شاہ شجاع کی فوج اور اس کی مددگار برطانوی اور کمپنی کی فوجوں کے ساتھ قندھار جاتے ہوئے بولان اور کوئٹہ سے گزر چکے تھے۔ ایٹکنسن نے آبی رنگوں سے جو خوبصورت تصویریں بنائیں ہیں ان میں اس علاقے کے مناظر بڑی وضاحت سے دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً درۂ بولان کے دھانہ پر ڈاڈر کے مقام پر کیمپ، وادیٔ شال، درۂ خوجک عبور کرتی ہوئی فوجیں وغیرہ وغیرہ۔ جن لوگوں کی قسمت میں جیکب آباد اور سبی کے جہنم میں جھلسنا لکھا تھا انہیں مرتفع میدانوں کی ٹھنڈی ہوا اپنی طرف بلاتی تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس علاقہ کے قبائل خوش اخلاق ہیں۔

۱۸۷۶ء میں جو نارتھ بروک کا آخری سال تھا اور ڈسرائیلی اپنی حکومت قائم کر چکے تھے لٹن کے وائسرائے بن کر ہندوستان آنے سے تھوڑے

دن پہلے حکومت ہند سرحد کے اس حصہ کے انتظام کے متعلق بمبئی اور پنجاب کی حکومتوں کے متضاد نظریات پر غور کر رہی تھی۔ رابرٹ سنڈیمان جو پنجاب کا کمیشن افسر تھا اور جسے ڈیرہ غازی خان میں سرحد کے انتظام کا کافی تجربہ تھا اس بات پر مصر تھا کہ خان قلات سے ایسا سمجھوتہ کر لیا جائے جس کے تحت ریاست قلات کا اقتدار قائم رہے لیکن کوئٹہ کے مقام پر شال کے مرتفع میدان میں انگریز فوج متعین کی جائے اس تجویز پر دونوں صوبوں میں زور دار بحث ہو رہی تھی۔ حکومت پنجاب سنڈیمان کی حمایت کر رہی تھی اور حکومت بمبئی کا کہنا تھا کہ یہ پوری سکیم محض خام خیالی کا نتیجہ ہے۔ حکومت بمبئی کا پوری سکیم کے متعلق یہ خیال تھا کہ سندھ کی سرحدوں پر نسبتاً زیادہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے صیابت رائے کا ثبوت دئے بغیر ایک تجویز پیش کر دی گئی ہے۔ لیکن سنڈیمان اور حکومت ہند جو سنڈیمان کی تجویز کی تائید کر رہی تھی دونوں اس معاملہ پر وسیع النظری سے غور کر رہے تھے۔ ان کے ذہن میں پورے ہندوستان کا دفاع تھا اور اس بات کے لئے بے قرار تھے کہ روس کی ہوس ملک گیری کو روکنے کے لئے خان قلات کی مدد سے آگے کی طرف چوکی قائم کی جائے اور دریائے سندھ کے کنارے تک پیچھے ہٹ کر روس کے حملہ کا انتظار نہ کیا جائے۔ اس زمانہ میں زار کی حکومت بڑی تیزی کے ساتھ روس کی جنوبی سرحدوں کی طرف پنجے پھیلا رہی تھی۔ ترکی کے ساتھ جنگ بدیہی تھی۔ کاکیشیا کے پار کے علاقہ کو محکوم بنانے کے لئے اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا خیوا بخارا اور فرغانہ پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اگر ہندوستان کے حکمرانوں نے اپنی شمال مغربی دفاعی فصیل کو مضبوط نہ کیا تو اندیشہ تھا کہ کابل اور قندھار کا بھی وہی حشر ہوگا جو بخارا اور سمرقند کا ہو چکا تھا۔

قلات کے ساتھ مذاکرات میں ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء دونوں سال گزر گئے اور سنڈیمان نے اپنی بات منوالی۔ اس نے جو معاہدہ کیا اس کے تحت کوئٹہ اور آس پاس کے علاقہ جن میں درۂ بولان بھی شامل تھا کسی معاوضہ کے بغیر مستقل طور پر برطانوی حکومت کو پٹہ پر دے دئے گئے۔ طے یہ پایا کہ یہ علاقے برائے نام قلات ریاست کے تحت رہیں گے لیکن ان کا نظم و نسق کلکتہ کی حکومت مقامی رسم و رواج کے مطابق چلائے گی۔ کوئٹہ میں برطانوی ہند کی فوج نے چھاؤنی ڈال لی اور سنڈیمان پہلے ریزیڈنٹ

مقرر ہوئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ احمد شاہ کے زمانہ سے کابل اور کوئٹہ کی شاہراہ پر کابل کا کنٹرول برائے نام ہی سہی لیکن شیر علی کو ہندوستان کی سرحدوں کا شال تک جا پہنچنا بڑا ناگوار گزرا اور اس کے دل میں اندیشے پیدا ہونے لگے۔ سیستان کے فیصلہ سے زیادہ اس اقدام نے شیر علی کو روسیوں کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور کر دیا اور اس طرح یہ اقدام دوسری جنگ افغان کا باعث بنا۔

۱۸۷۸ء میں شیر علی کابل میں ایک روسی وفد کے استقبال کے لئے کچھ فاصلہ طے کر کے آگے بڑھا اور اس نے ایک برطانوی فوج کو جو درۂ خیبر کے راستے کابل جانا چاہتی تھی درہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان دنوں درۂ خیبر افغانوں کے قبضہ میں تھا۔ کیویگنری (Cavagnari) جو ان دنوں پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے وفد کے پولیٹیکل افسر مقرر کئے گئے تھے اور وفد کے قائد وہی نیویل چیمبرلین تھے جنھوں نے امبیلا کی مہم میں فوج کی کمان کی تھی۔ کیویگنری کو راستہ نکالنے کے لئے آگے بھیجا گیا۔ انہیں درہ کی نصف مسافت پر سبزہ زار میں روک دیا گیا جو علی مسجد سے ذرا نیچے کی طرف واقع ہے اور افغان کمانڈر فیض محمد ان سے آکر ملے۔ فیض محمد اخلاق سے پیش آئے لیکن اپنی بات پر جمے رہے انہوں نے کہا اگر ہم ذاتی طور پر ایک دوسرے کے دوست نہ ہوتے تو میں کیویگنری پر گولی چلا دیتا۔ اور اس طرح دوسری جنگ افغان شروع ہوتی۔

پہلی جنگ افغان کی طرح دوسری جنگ کی تفصیلات بھی اس کتاب کے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمارے لئے اس جنگ کی یہ اہمیت نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کابل میں کیویگنری اور ان کے محافظوں کو کس طرح قتل کیا گیا۔ پیواڑ کوتل چراسیا اور دیگر مقامات پر رابرٹس نے کون کون سی لڑائیاں لڑیں یا وہ کون سے اقدامات تھے جن کے نتیجہ میں شیر علی کے بھتیجے عبدالرحمان کو کابل کا امیر مقرر کر دیا گیا۔ بلکہ ہماری دلچسپی تو اس بات تک محدود ہے کہ اس کی وجہ سے اس زمانہ میں فارورڈ پالیسی کو کتنی تقویت پہنچی۔ یہ صحیح ہے کہ ٹھوس شکل میں اس جنگ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ افغان فوجوں کو خیبر اور کرم سے نکال دیا گیا لیکن بلوچستان کے وسیع علاقہ کے الحاق کے مقابلہ میں خیبر اور کرم کا انخلا بہت معمولی کامیابی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ جنگ سے پہلے کوئٹہ اور بولان پر قبضہ کیا جا چکا تھا لیکن سنڈیمان کے ارد گرد کا پورا علاقہ برائے نام ہی صحیح درانی اقتدار کو تسلیم کرتا تھا۔ خیبر اور کرم کے راستے دو طرفہ پیش قدمی میں کامیابی اور شیر علی کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد اس کے بیٹے یعقوب خان سے ۱۸۷۹ء میں ایک معاہدہ کیا گیا جو معاہدۂ گندمک کہلاتا ہے اس معاہدہ کے تحت یعقوب خان نہ صرف خیبر اور کرم سے دست بردار ہوگیا بلکہ کوئٹہ کے شمال اور مشرق میں پشین سبی اور لورا لائی (بوری) کے وہ پٹھان علاقے بھی ہاتھ آگئے جن کا نئے صوبہ کی تشکیل میں شامل کرنا ضروری تھا۔ ان علاقوں کے قبضہ میں آنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ سرحدیں خوجک کے سلسلہ کوہ کے پار چمن تک پہنچ گئیں جو قندھار سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے اور آئندہ دس سال کے اندر ریل کی بڑی پٹڑی پہاڑی سرنگوں سے گزار کر چمن کی سرحد تک بچھا دی گئی۔ اس نئی پالیسی میں پہلے پہل بلوچستان میں جان پڑی۔

لیکن شمال مغربی سرحد کے دریائے سندھ کے پار کے پرانے علاقوں اور نئے بلوچستان کے درمیان آگے کی طرف کوئی بغلی راستہ نہیں تھا۔ سنڈیمان رخصت ہونے سے پہلے ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیانی عرصہ میں پشین سے آگے بڑھ کر لمبی اور غیر آباد وادی ژوب میں داخل ہو چکے تھے جہاں اپوزئی کے مقام پر جو اب فورٹ سنڈیمان کہلاتا ہے ہیڈ کوارٹر قائم کردیا گیا تھا۔ دریائے ژوب گومل دریا کا معاون ہے اور بڑے عرصہ سے یہ خیال چلا آرہا تھا کہ درۂ گومل کو جسے غلجی کاروان اپنے سالانہ نقل وطن میں استعمال کرتے چلے آئے تھے کھول دیا جائے اور اس طرح بالائی علاقہ میں ایک تنگ راستہ بنا دیا جائے جو بلوچستان کو بھی ملا دے اور ملتان کے راستہ جو عقبی راستہ موجود ہے اس کے علاوہ بھی ایک اور راستہ بن جائے۔ یہ سکیم سب سے پہلے میکالے (Macaulay) نے اٹھائی تھی جو ۱۸۷۸ء میں ڈیرہ اسماعیل خان سے گومل تک گئے تھے میکالے جو غالباً درمیانی عرصہ میں سرحدی علاقہ میں سب سے زیادہ باثر تھے اس سوال پر اعلیٰ افسروں کی کافی حمایت حاصل نہیں کر سکے اور ان کی اسکیم اپنی جگہ رہ گئی۔ اب یہی اسکیم سنڈیمان نے اٹھائی اور ان کے شاگرد بروس (Bruce) نے اسے آگے بڑھایا۔ بروس کا خیال تھا کہ ان کے افسر نے بلوچستان میں جو کچھ کیا ہے بروس کو وہی کام وزیرستان میں

کرنا چاھئے جہاں وہ تبدیل ھو کر آئے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں لینسڈاؤن (Lansdowne) کو جو ان دنوں وائسرائے تھے اس تجویز کا حامی بنا لیا گیا اور فوری کارروائی شروع ھوگئی۔ گومل کے قبائل کے لئے جن میں وزیرستان میں رھنے والے قبائل بھی شامل تھے مواجب منظور کئے گئے اور سنڈیمان نے اپوزئی میں تمام قبائل کا ایک بڑا جرگہ بلایا جس میں بروس بھی شریک ھوئے۔ قبائل روپیہ ھتھیانے کے لئے بے چین تھے چنانچہ ساری باتیں آسانی سے طے ھوگئیں۔ اس وقت ایسا معلوم ھوتا تھا کہ جس طرح سنڈیمان بلوچستان میں کامیاب ھوگئے ھیں اسی طرح شمالی علاقہ میں بھی کامیابی حاصل ھو جائیگی۔ لیکن ایسا نہیں ھوا۔ وزیرستان کے قبائل کوئٹہ کے قبائل نہیں تھے۔ ان سے نپٹنا بہت مشکل تھا۔ یہ قصہ اگلے باب میں بیان کیا جائے گا یہاں اتنا بتا دینا ضروری ھے کہ درۂ گومل کھولنے کی نوبت نہیں آئی۔ یہ درہ آج بھی بند ھے۔

''سنڈیمان کے طریقے،، کی تعریف میں بلند بانگ دعوے کئے جاتے ھیں اور یہ دلیل پیش کی جاتی ھے کہ سنڈیمان جیسی سوجھ بوجھ رکھنے والے افسر شمال مغربی سرحد پر بھی ان ھی طریقوں سے کام لیتے تو پوری تاریخ ھی بدل جاتی۔ آخر یہ طریقہ کیا تھا اور اس کی خوبیاں اور خامیاں کیا تھیں؟

سنڈیمان کے طریقہ کا انحصار اس بات پر تھا کہ قلات اور قبائلی علاقہ میں مرکزی مقامات بھاری فوج کی مدد سے قبضہ میں کرلئے گئے تھے(۱) ان مقامات کو ایسی سڑکوں کے ذریعہ جو اچھے موسم میں کھلی رھتی تھیں ایک دوسرے سے ملا دیا گیا تھا اور قبائل کو یہ آزادی دے دی گئی تھی کہ وہ حسب سابق اپنے معاملات اپنے رواج کے مطابق اور اپنے سرداروں اور ملکوں کی معرفت طے کریں۔ ملکوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ خاصہ دار بھرتی کرائیں گے جنہیں تنخواہ حکومت ادا کرے گی لیکن وہ قبائلی ملازم سمجھے جائیں گے۔ چھاؤنیوں کے سوا جہاں فوج

---

(۱) میں نے اس بیان میں بلوچستان کے صرف پٹھان علاقوں کو شامل کیا ھے جو ریاست قلات میں شامل نہیں تھے۔ ریاست قلات میں جو طریقے اختیار کئے گئے تھے وہ بالکل مختلف تھے اور اس کتاب کے موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

رہتی تھی اور دکاندار اور دوسرے لوگ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے کافی تعداد میں آ گئے تھے نہ کہیں کوئی عدالت تھی نہ پولیس تھی۔ افریقہ کے نمونہ کو سامنے رکھتے ہوئے اسے بالواسطہ حکومت کہا جا سکتا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ جرگوں کے ذریعہ مروجہ قاعدوں پر عمل کراتے تھے اور جو طریقہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس کے مطابق فرانٹیر کرائمز ریگولیشنز استعمال کرتے تھے۔ اس طریقہ میں یہ بھی ضروری تھا کہ سرداروں اور ملکوں کی بات منوائی جائے اور کوئی ان کی بات ماننے سے انکار کرے تو اس کے خلاف طاقت استعمال کی جائے۔ اگر قبائلی علاقہ پر قبضہ نہ کیا جاتا وہاں فوج جمع نہ کی جاتی اور ملکوں کی حمایت حاصل نہ کی جاتی تو سنڈیمان کا طریقہ عضو معطل بن کر رہ جاتا۔

میں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اگر فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز مروجہ قوانین کے انتقام کی تلافی کے لئے نہیں بلکہ پٹھانوں کے رواج کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے جائیں تو یہ بات ایک حد تک قبائلی مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔ اس طرح مملکت کی ضرورتیں اس معاشرہ کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہیں جس پر وہ حکومت کرتی ہے۔ لیکن جب ۱۸۴۹ء میں شمال مغربی سرحد پر قبضہ کیا گیا تھا۔ اس کی بجائے باقاعدہ قوانین نافذ کئے گئے۔ یہ خیال ناقابل تسلیم ہے کہ ۱۸۸۰ء میں بلوچستان جیسے نئے مقبوضہ علاقہ میں جو طریقہ رائج کیا گیا تھا وہ شمال مغربی سرحد میں بھی تیس سال تک عام قوانین نافذ رہنے کے بعد رائج کیا جا سکتا تھا۔ کم از کم غیر ملکی حکومت ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ قوانین کے نفاذ کے طریقوں میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ عدالتیں پولیس، اور نظم و نسق کے جو ادارے اتنے عرصہ سے قائم تھے انہیں ختم کر دیا جائے۔ پھر بھی شمال مغربی سرحد کے دو حصوں کے درمیان یہ امتیاز بہت سی مشکلات کا باعث تھا۔

سنڈیمان کے حامیوں کا یہ جواب ہوگا کہ یہ دشواریاں مسلم ہیں لیکن بلوچستان میں جو اصول سیکھے گئے تھے ان کا شمال مغربی سرحد کے آباد اضلاع کے پار ان قبائل پر اطلاق کرنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی جن کی قبائلیت نئے نظام حکومت کے دباؤ کے باوجود جوں کی توں قائم تھی۔ جواب یہ ہے کہ کرم اور مالاکنڈ میں ایسا ہی کیا گیا جس کی

تفصیل آگے آئے گی۔ جہاں ان اصولوں کا اطلاق نہیں کیا گیا وہاں باز رہنے کی وجہ یہ تھی کہ حالات بالکل مختلف تھے۔

سنڈیمان ایک ایسے علاقہ میں آئے تھے جو قریب قریب ریگستان ہے۔ بلوچستان کی آبادی بہت ہی تھوڑی ہے اور اس علاقہ میں جو ہو کا سماں ہے اس پر دیکھے ہی سے یقین آسکتا ہے۔ صرف پشاور ضلع (جس میں پہلے مردان بھی شامل تھا) جس کا رقبہ بلوچستان کے رقبہ کا قریباً تیسواں حصہ ہے آبادی کے لحاظ سے سمندر کے کنارے تک پھیلے ہوئے بلوچستان سے بڑا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پشاور ایک آباد ضلع ہے اس لئے بلوچستان سے اس کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا تو جواب یہ ہوگا کہ تیراہ اور وزیرستان میں سے ہر ایک علاقہ کی آبادی بھی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی بلوچستان کے پورے پٹھان علاقہ کی ہے۔ سنڈیمان کو بیشتر بروہی اور بلوچ قبائل سے واسطہ پڑا تھا جن پر چند سرداروں کا حکم چلتا تھا اور جو اپنے سرداروں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیکن انہیں پٹھانوں سے نپٹنے میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی۔ انہیں کاکڑوں جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو بروہیوں اور بلوچوں کے ساتھ رہتے رہتے بڑی حد تک ان کے رنگ میں رنگے گئے تھے کچھ قبیلے مثلاً مندو خیل اور زیریں ژوب اپنی روایات پر قائم تھے لیکن وہ شمال میں رہنے والے اپنے بھائیوں کی طرح جنگجو نہیں تھے۔ اب ان کا مقابلہ افریدیوں یا محسود سے کیجئے۔ سنڈیمان کو ایک نیا میدان مل گیا تھا جہاں وہ جس طرح چاہتے چل سکتے تھے لیکن یوسف زئیوں مہمندوں اور وزیریوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بہت سی روایات بن چکی تھیں جنہیں چشم زدن میں محو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سنڈیمان پورے صوبہ کے ہر حصہ میں قریب قریب ایک ہی طریقہ پر عملدرآمد کرا سکتے تھے۔ انہیں ایسے دو معاشروں سے واسطہ نہیں پڑا تھا جو ایک ہی نسل سے تھے لیکن ایک معاشرہ جس پر جدید قوانین نافذ تھے دوسرے معاشرے سے جہاں قبائیت ساری و طاری تھی بالکل الگ تھا۔ دونوں علاقوں کے حالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

کوئٹہ میں سنڈیمان کے کارنامے داستان بن گئے ہیں غالباً یہ داستان اتنی رنگین نہیں جتنی سنڈیمان سے تیس سال پہلے شمال مغربی سرحد میں نمایاں کارنامے انجام دینے والے سرفروشوں کی ہے لیکن پھر بھی اس کا

کافی گہرا اثر ہے۔ وہ یقیناً ایک پیش رو تھے جنہوں نے مستقل مزاجی اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر ایک عمارت کھڑی کی وہی اینٹ گارا استعمال کیا جو دستیاب تھا اور اس عمارت پر مناسب اور پائدار رنگ چڑھایا۔ رابرٹس جو خود بھی ناموروں میں شمار ہوتے ہیں اور جو سنڈیمان سے اس وقت ملے تھے جب نکلسن سے ملاقات کے زمانہ کی طرح کسی بات سے بہ آسانی متاثر نہیں ہو سکتے تھے پوری صورت حال پر سنڈیمان کی موقع شناسی ہمہ اثر اور معلومات سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں " وہ ہر سر کردہ آدمی سے بخوبی واقف تھے۔ اور پورے علاقہ میں زیادہ سے زیادہ دور دراز کوئی گاؤں بھی ایسا نہ تھا جہاں وہ خود نہ گئے ہوں "۔ ان کا نام آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس نام سے لوگوں کو اتنی قریبی وابستگی نہیں ہے جتنی ایبٹ کے نام سے ہے۔ سنڈیمان کی آزمائش اتنی کڑی نہیں تھی جتنی شمال مغربی سرحد کے سرفروشوں کی تھی اور مقامی حالات بھی ایسے تھے کہ کامیابی آسان تھی۔

اگر سنڈیمان کے طریقہ پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ طریقہ بڑا منجمد ثابت ہوا ہے۔ اس نے بلوچستان کے ۱۸۸۵ء کے معاشرہ میں روح نہیں پھونکی۔ ۱۹۵۰ء کا بلوچستان ستر سال پہلے کے بلوچستان سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ قبائلیت کے سیدھے سادے طریقوں کو تسلیم کرنے سے امن اور سکون ضرور قائم رہا لیکن قبائل کو نئے تقاضے اپنانے کے لئے للکارا نہیں جا سکا۔ کوئٹہ اسٹاف کالج۔ رجمنٹیں اور ریلوے قبائلی زندگی میں شامل نہیں ہیں۔ یہ ادارے اس زندگی کی صرف سطح کو چھوتے ہیں۔ دیہات میں ستر سالہ برطانوی راج افکار و اعمال کی رفتار تیز نہیں کر سکا۔ اس خاک میں ذرا بھی خمیر دکھائی نہیں دیتا۔

دوسرے علاقوں میں انگریز یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جہاں اسے پٹھانوں سے واسطہ پڑا اس نے ایک مشعل روشن کی اور پٹھانوں کو ترقی کے لئے للکارا۔ اکثر حالات میں اس چنگاری نے بھڑک کر آگ لگا دی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ آگ روشنی اور گرمی پہنچاتی ہے اور بجھتی نہیں ہے۔

بلوچستان میں بہت سا کام جو ہم نہیں کر سکے ہمارے جانشینوں کو کرنا ہے۔

دوسری جنگ افغان کا جو سب سے اہم نتیجہ نکلا وہ بلوچستان میں پیش قدمی تھی اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں درۂ خیبر میں بھی مستقل طور پر پیش قدمی کی گئی اور افغانوں کو وادیٔ کرم سے نکال دیا گیا (وادی کرم پر بعد میں کئی سال تک قبضہ نہیں کیا گیا) اس وقت تک تمام قبائل کے ساتھ جن میں خیبر کے قبائل بھی شامل ہیں ضلعوں کے ڈپٹی کمشنروں نے ارباب، خوانین وغیرہ کے ذریعہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ لیکن خیبر رینج (شروع میں اس کا یہی نام تھا) اتنی دقت طلب اور اہم تھی کہ اس سے نپٹنے کے لئے پرانا طریقہ استعمال کرنا مناسب معلوم نہ ہوا اور یہ فیصلہ ہوا کہ ایک علیحدہ افسر مقرر کیا جانے اس کے لئے رابرٹ واربرٹن کو منتخب کیا گیا۔ واربرٹن جو ایک افغان خاتون کے بطن سے تھے ان کا تذکرہ پہلے بھی ہوچکا ہے۔ انہیں کیویگنری کے تحت یوسف زئی علاقہ کی سرحد پر تربیت مل چکی تھی جہاں اپنے تعین کے دوران انہیں یقین ہو گیا تھا کہ قبائل کے ساتھ بالواسطہ تعلقات قائم رکھنا مناسب نہیں۔ بنیر قبائل میں عجب خان کی سرگرمیوں کی داستان واربرٹن ہی نے بیان کی ہے۔ انہوں نے اس سبق سے جو بنیر میں حاصل ہوا تھا خیبر میں بیس سال سے زیادہ عرصہ تک تعین کے دوران پورا فائدہ اٹھایا اور ریٹائر ہونے کے بعد اپنے تجربے ایک کتاب میں بیان کئے جس کا شمار پٹھان سرحدوں کے متعلق بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ واربرٹن نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ایک طرف تو اس قبیلہ کی اصل خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں جسے تمام پٹھانوں میں سب سے زیادہ بےوفا سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف مصنف کی حساس طبیعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

واربرٹن درہ خیبر کھولنے اور قبائلی محافظوں کے ساتھ درہ کے مغربی سرے تک آزادانہ گھومنے میں کامیاب ہوگئے انہیں درہ اور دریائے کابل کے درمیان ملا گوری اور شلمان علاقہ اور لواڑگے کے اس مرتفع میدان میں گھومنے پھرنے دیا گیا جہاں اب لنڈی کوتل واقع ہے لیکن وہ کبھی تیراہ کے بالائی افریدی علاقہ میں اس وقت تک داخل نہیں ہوسکے جب تک انہوں نے اس علاقہ پر فوج کشی نہیں کی۔ یہ واحد موقع تھا جب کوئی یورپی باشندہ اس خطہ ممنوعہ مین داخل ہوا تھا۔ جو حال اس زمانہ میں تھا وہی آج بھی ہے آج بھی افریدی کسی اجنبی کو اپنی وسطی

پہاڑیوں میں میدان کے علاقہ میں گھسنے نہیں دیتے لیکن وہ دن ضرور آئے گا جب اس علاقہ میں آمدورفت عام ہوجائے گی۔ یہ جگہ پشاور سے صرف تیس میل کے فاصلہ پر سطح سمندر سے چھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور اس کے اوپر وسطی سفید کوہ کی برفپوش چوٹیاں جھکی کھڑی ھیں۔ یہ جگہ گرمیوں میں موسم کی سختیوں سے بچنے کے لئے کتنی اچھی پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ تمام افریدی اپنے اس پہاڑی آشیانے اور اس کے ملحقہ علاقے راج گل کو کشمیر کا ثانی قرار دیتے ھیں اور یہ حسن ھمیشہ پردہ میں چھپا نہیں رہ سکتا۔

واربرٹن کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسلم خان جیسا افسر ان کا نائب تھا۔ اسلم محمد عثمان خان سدوزئی کا بیٹا تھا جو شاہ شجاع کا وزیر رہ چکا تھا۔ افریدیوں کو جنھوں نے عثمان خان کو کئی مرتبہ وادی بازار میں چورہ کے مقام پر پناہ دی تھی اسلم خان کا نام اب بھی اچھی طرح یاد ہے جب دوست محمد ۱۸۴۳ء میں دوبارہ بر سر اقتدار آیا تو عثمان کو کابل چھوڑنا پڑا اور اس نے پشاور میں پناہ لی۔ جہاں اس کی اور اس کے بیٹے کی بڑی عزت تھی۔ اسلم افریدیوں کو ان کی پرانی وفاداری کا واسطہ دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلم خود بھی دوسروں پر چھا جانے والی شخصیت اور پسندیدہ اخلاق کا مالک تھا۔ یہ اسلم ھی تھا جس نے واربرٹن کے نائب کی حیثیت سے وہ دستہ بھرتی کیا جو ابتدا میں جزائلچی اور بعد میں خیبر رائفلز کے نام سے مشہور ھوا۔ بوڑھا سر اسلم اپنے زمانہ میں پشاور کی سب سے مشہور ھستی تھا اور اس کی شبیہ پشاور کلب میں وھاں کی عیاشیوں کو عقابی نظروں سے گھورتی رہتی تھی (۱)۔ وہ واربرٹن ھی کی دوسری شخصیت تھا بلکہ دونوں میں وھی برتر شخصیت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔

آئندہ دس سال میں کوئی نیا قدم نہیں اٹھایا گیا لیکن پچھلی صدی کے آخری عشرہ میں پھر پیش قدمی کی گئی اور اس مرتبہ اس کے لئے کرم کی سرحد کو چنا گیا۔ کرم تک پہنچنے کا راستہ میران زئی وادی سے

---

(۱) اسلم کے بیٹے بریگیڈیر حسام الدین خان ھیں۔ وہ گزشتہ چالیس سال میں سرحد میں بہت سے انگریز افسروں کے بڑے اچھے دوست ثابت ھوئے۔ (ان کا انتقال ھو چکا ہے)

گزرتا ہے جو انگلی کی طرح آگے کو نکلی ہوئی ہے یہ وادی مغرب میں ہنگو کے پاس سے ہوتی ہوئی ٹل تک چلی گئی ہے اور اس کے بیشتر حصہ میں شمال کی جانب سمانا کے بنجر ٹیلے ہیں جن کے عقب میں خانکی وادی ہے جو تیراہ میں جا کر نکلتی ہے۔ ۱۸۹۱ء میں سمانا پر قبضہ کر لیا گیا تھا۔ اور اس کی چوٹیوں پر قلعے بنا دئے گئے تھے تا کہ اس طرف سے میران زئی پر بغلی حملہ نہ کیا جا سکے۔ آخر کار اگلے سال یہ فیصلہ کیا گیا کہ ٹل سے آگے وادیٔ کرم میں پیش قدمی کی جائے۔ دوسری جنگ افغان میں رابرٹس نے کرم پر ہراول چوکی کی حیثیت سے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ وہاں کچھ عرصہ مقیم رہے تھے اور انہوں نے شلوزان کے خوبصورت گاؤں میں مکان بھی بنوا لیا تھا۔ انہوں نے وادی کے اہم ترین قبیلہ توری پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ دریائے کرم الٹا سفید کوہ کی طرف بہنے لگے تب ہی وہ افغانستان میں شامل ہو سکتے ہیں نیز یہ کہ یعقوب خان گندمک کے ۱۸۷۹ء کے معاہدہ کے تحت ان کی وادی سے دست بردار ہو چکا ہے۔ لیکن لڑائی ختم ہونے پر وادیٔ کرم پر قبضہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت سے اس علاقہ میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی کیونکہ توری کبھی تو اپنے ہمسایہ قبائل پر حملہ کرتے اور کبھی یہ قبائل بدلہ لینے کے لئے توریوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ توری شیعہ ہیں اور ان کے ہمسایہ قبائل سنی ہیں اس سے یہ چپقلش اور بھی بڑھ گئی تھی اور اکثر اسے فرقہ دارانہ رنگ دے دیا جاتا تھا۔ آخرکار جب توری اس فیصلہ پر پہنچے کہ اس قبضہ کا واحد علاج یہ تھا کہ وہ افغان حکومت کے آگے سر تسلیم خم کر دیں اور یہی وجہ تھی کہ سنڈیمان کی طرح ان کا نظم و نسق زیادہ قوی نہیں تھا یہ طریقہ آج تک رائج ہے اور سب اس سے مطمئن ہیں۔

اس طرح روس کیپل (Roos-Keppel) اسٹیج پر آئے جن کے لئے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ اہم کردار ادا کریں۔ پہلے کرم ملیشیا کے ایڈجوٹنٹ اور پھر پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ دریائے کرم اپنا رخ نہیں بدلے گا۔

ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں ایک ایسا تاریخی اقدام کیا گیا جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس سرحد کے تعین سے کسی طرح کم نہیں ہے

جو ڈیورینڈ کہلاتی ہے۔ ان پیش قدموں سے امیر عبدالرحمان ہراساں ہوگئے تھے خاص طور پر اس وجہ سے کہ خوجک کی سرنگ مکمل ہو گئی تھی بلوچستان کے اندر اور چمن تک ریل کی پٹری بچھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے ہراس کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ کرم پر قبضہ کے بعد ایک چھوٹی سی افغان فوج کو جو بلند خیل (۱) میں چھاؤنی ڈالے پڑی تھی نکال دیا گیا تھا۔ ان واقعات کے بارے میں سب سے زیادہ تفصیلات امیر کے خود نوشت سوانح حیات میں درج ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ڈیورینڈ مشن بھیجنے پر کیوں رضا مند ہوئے اور ان مذاکرات کا جو نتیجہ نکلا اس کے بارے میں ان کی اپنی رائے کیا تھی۔

آگے جو اقتباس درج کیا جارہا ہے اس سے امیر عبدالرحمان کے شکی لیکن عملی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔

"سر مورٹیمر ڈیورینڈ(۲) (Sir Mortimer Durand) ۱۹ ستمبر ۱۸۹۳ء کو پشاور سے کابل روانہ ہوئے۔ جب یہ جماعت کابل میں داخل ہوئی تو میرے جنرل غلام حیدر خان چرخی نے اس کا استقبال کیا اور میں نے اپنے بیٹے حبیب اللہ خان کے محل میں اس کی رہائش کا بندوبست کیا۔ پہلے رسمی دربار کے بعد ہم نے اصل معاملات پر گفت و شنید شروع کر دی۔ ڈیورینڈ بڑے زیرک مدبر اور فارسی کے اچھے عالم تھے اس لئے تمام باتیں جلد ہی طے ہوگئیں۔ لیکن تمام گفتگو میں، سر مورٹیمر ڈیورینڈ نے، میں نے اور جماعت کے دوسرے ارکان نے جو کچھ کہا تھا وہ لفظ بہ لفظ تحریر میں لانے کے لئے میں نے میر منشی سلطان محمد خان کو پردے

(۱) بلند خیل دریائے کرم کے دائیں کنارے پر ٹل سے دوسری طرف واقع ہے۔ اس پر افغانستان کے قبضہ سے وادیٔ کرم کی علیحدگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی اور ٹل کا دفاع بھی خطرہ میں پڑ گیا تھا۔

(۲) ڈیورینڈ لینسڈاؤن کے فارن سکرٹری تھے۔ ہندوستان سے واپس جانے کے بعد انہوں نے سفارتی عہدوں پر بڑی ترقی کی۔ انہیں تہران میں وزیر اور میڈرڈ اور واشنگٹن میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ واشنگٹن میں روز ولٹ کے ساتھ ان کی بن نہ سکی۔ یہ قیاس بڑا دلچسپ ہے کہ امیر عبدالرحمان نے درانی اور ڈیورینڈ کی لفظی مماثلت پر نظر کرتے ہوئے اس سفیر کے تقرر کو نیک فال سمجھا ہوگا۔

کے پیچھے بٹھا دیا تھا جہاں نہ کوئی اسے دیکھ سکے نہ سن سکے اور میرے سوا اور کسی کو اس کی موجودگی کا علم نہ ہو تاکہ وہ مجھ سے اور آپس میں انگریزی یا فارسی میں جو کچھ کہیں وہ لفظ بہ لفظ لکھ لیا جائے۔ ڈیورینڈ اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں میر منشی نے انہیں لفظ بہ لفظ شارٹ ہینڈ میں لکھ لیا اور یہ گفتگو تحریری شکل میں ریکارڈ آفس میں موجود ہے۔ بات چیت کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ چترال اور درۂ بروغیل سے لے کر پشاور اور وہاں سے کوہ ملک سیاہ (جہاں ایران افغانستان اور بلوچستان ملتے ہیں) تک سرحد اس طرح طے ہوگئی کہ وخن، کافرستان، اسمار، لالپورہ کا مہمند علاقہ اور وزیرستان کا ایک حصہ (بیرمل) میری سلطنت میں شامل ہوگیا اور میں نئے چمن کے ریلوے اسٹیشن چغی، باقی وزیری علاقہ، بلند خیل، کرم، افریدی، باجوڑ، سوات، بنیر، دیر، چلاس اور چترال کے علاقوں پر اپنے حق سے دست بردار ہوگیا۔

مشن ۱۴ نومبر کو کابل سے روانہ ہوگیا وہ کابل میں قیام کے دوران بڑا خوش رہا۔ ان سرحدی معاملات کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور جھگڑے پیدا ہو رہے تھے وہ ختم ہوگئے اور جب دونوں حکومتوں کے کمشنروں نے مندرجہ بالا سمجھوتہ کے تحت سرحد کی نشان بندی کردی تو ہر طرف امن و امان قائم ہوگیا۔ خداوند تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ یہ امن و امان ہمیشہ قائم رہے،،۔

قارئین کو اس بارے میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ امیر عبدالرحمان معاہدہ سے بہت مطمئن تھے۔ فارسی زبان پر (پختو پر نہیں) ڈیورینڈ کو جو قدرت حاصل تھی اس سے امیر عبدالرحمان بڑے خوش ہوئے اور وقتی طور پر سب ٹھیک ہوگیا۔

میں نے اس معاہدہ کی تفصیلات اور بعد کے افغان حکمرانوں کی طرف سے اس کی توثیق الگ ضمیمہ میں درج کی ہیں۔ اس کا پختونستان کی تحریک سے گہرا تعاق ہے کیونکہ کابلی حکومت کی طرف سے ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ ڈیورینڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم

نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ۱۹۴۷ء میں اختیارات کی منتقلی کے ساتھ ساتھ یہ سرحد بھی کالعدم ہوگئی۔ یہ سوال دفتر ہائے خارجہ کے طے کرنے کا ہے ہمارے لئے تو یہاں صرف یہ بات غور طلب ہے کہ ۱۸۹۳ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے آباد علاقہ کی سرحد اور افغانستان کے درمیان انگریزوں کی نگرانی میں ایک ایسے قبائلی خطہ کا تصور کرنا اور اس کا حوالہ دینا ممکن ہو گیا جس کی سرحدیں دونوں طرف یعنی مشرق اور مغرب میں متعین تھیں اور جن سے تمام متعلقہ حضرات واقف تھے۔ اب دور دراز تک پھیلا ہوا کوئی ایسا خطہ نہیں رہا تھا جس پر کسی کا اختیار نہ ہو اور اب دونوں حکومتیں زیادہ صحت کے ساتھ سوچ سکتی تھیں اور کارروائی کر سکتی تھیں۔ یہ درست ہے کہ ڈیورینڈ لائن کو ہندوستان کی سرحد قرار نہیں دیا گیا تھا بلکہ امیر کی مملکت کی سرحد اور ایسی حد قرار دیا گیا تھا جس سے آگے کوئی فریق مداخلت نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت قبائل کو اپنے آباد اضلاع میں ضم کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ قبائلی علاقہ میں مشرق اور جنوب کی طرف ڈیورینڈ لائن تک اپنے اقتدار کی توسیع کرنے اور امیر کا اقتدار ختم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بین الاقوامی سطح پر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لئے کہ امیر ڈیورینڈ لائن کے پار کے علاقوں پر اپنی بالا دستی سے دستبردار ہوگئے تھے۔

یہاں اس علاقہ کا تذکرہ ضروری ہے جس کے متعلق نقشہ میں سمجھوتہ ہو چکا ہے لیکن اصل علاقہ میں سرحد کی نشان بندی نہیں کی گئی۔ یہ علاقہ کونڑ اور باجوڑ کے تاس تقسیم کرنے والی حد سے شروع ہو کر مہمند علاقہ سے ہوتا ہوا خیبر کے مغربی سرے کو چھوتا ہوا اور وہاں سے سفید کوہ کے شاندار سلسلہ تک بازار وادی کے دامن سے گزرتا ہوا سفید کوہ کی آخری چوٹی سکارم تک مغرب کی طرف جاتا ہے۔ سفید کوہ پر سرحد کی نشان بندی نہ ہونا زیادہ اہم نہیں ہے کیونکہ اس سلسلہ کی چوٹیاں دور سے پہچانی جا سکتی ہیں اور اس پورے علاقہ کی سب سے زیادہ واضح خصوصیت یہی ہے۔ خیبر کے مغرب میں اس فروگزاشت کی ۱۹۱۹ء میں تلافی کرلی گئی۔ لیکن مہمند علاقہ میں کچھ دشواریاں پیش آئیں۔

مشکلات پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ مختلف دریاؤں کے تاس کی

جغرافیائی سرحدیں قبائلی سرحدوں پر منطبق نہیں ہوتیں۔ ڈیورینڈ لائن کا تصور یہ تھا کہ یہ سرحد کونڑ اور باجوڑ کی درمیانی جغرافیائی سرحد کے ساتھ ساتھ دریائے کابل کی طرف وہاں تک جاتی ہے جہاں تک جغرافیائی سرحد واضح ہے۔ اس طرح لالپورہ افغانستان میں رہ جاتا ہے (جیسا کہ عبدالرحمان نے بتایا ہے) اور شنپوخ کے مقام پر دریائے کابل پر پہنچتی ہے اس نشان بندی کے تحت تمام کاما اور گوشتہ مہمند افغانستان کی طرف رہ گئے اور هندوستان کی طرف بائے زئی اور غوئے زئی خیل کے بہت سے بالائی مہمند گھرانے آگئے جن کا پشاور سے کوئی سیاسی تعلق نہیں تھا اور جنہیں مواجب نہیں ملتے تھے۔ بہر حال ایک ایسی سرحد جو ایک قبیلہ کو اس طرح بانٹ دے کہ ایک حصہ ایک ملک کا اور دوسرا حصہ دوسرے ملک کا وفادار ہو بڑی بے چینی پھیلا سکتی ہے۔

آخرکار چند سال بعد امیر کو یہ پیشکش کی گئی کہ ڈیورینڈ لائن نئے سرے سے مقرر کی جائے اور اسے مہمند علاقہ میں مشرق کی طرف اور ہٹا دیا جائے۔ اگر یہ پیشکش قبول کرلی جاتی تو بہت سے بالائی مہمند خیل باقاعدہ امیر کے زیر نگرانی آجاتے۔ پیشکش پر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا لیکن ۱۹۴۷ء تک یہ پیشکش برقرار تھی اور پشاور کی طرف سے طے شدہ اور مجوزہ لائن کے درمیان بسنے والے قبائل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس غیر یقینی حالت کی وجہ سے برطانوی حکام کو کئی مرتبہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور جب قبائل نے اپنے متنازعہ علاقہ کو جس کا محل وقوع یورپ میں السیشیا کی طرح ہے، مرکز بنا کر معاندانہ کاروائیاں شروع کیں تو ان کے خلاف آزادانہ اقدام نہیں کیا جا سکا(۱)۔ پاکستان اور افغانستان میں بھی اس علاقہ کی درمیانی سرحد کے متعلق کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا اس لئے اس سوال پر آئندہ بھی جھگڑا پیدا ہو سکتا ہے۔

وزیرستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سرحد کی نشان بندی کردی گئی لیکن اس کے نتیجہ میں اس علاقہ میں زبردست لڑائی ہوئی۔ اس کی تفصیلات مناسب موقع پر بیان کی جائیں گی۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری

---

(۱) ۱۹۳۳ء میں اور پھر ۱۹۳۵ء میں اس علاقہ یعنی بوھائے ڈاگ کے بالائی مہمندوں نے انگریزوں کے خلاف کاروائیوں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔

ہے کہ اس کے نتیجہ میں وزیرستان کو اس علاقہ کے اندر بیٹھ کر قابو میں رکھنے کی کوشش کی گئی۔ وادی ٹوچی اور وانا پر قبضہ کرلیا گیا اور دو قبائلی ایجنسیوں شمالی اور جنوبی وزیرستان کا قیام عمل میں آیا جنہیں قبائلی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

۱۸۹۵ء میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش قدمی کی کی گئی یعنی مالاکنڈ ایجنسی کا قیام عمل میں آیا جو رسمی طور پر دیر سوات اور چترال کی ایجنسی کہلاتی ہے۔ کئی اعتبار سے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کا تعلق بھی وسیع رقبہ سے تھا یہ اقدام بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا بلوچستان اور کوئٹہ پر قبضہ کا۔ اور یہ نیا اقدام ہر لحاظ سے زیادہ دلچسپ تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ موجودہ پاکستان کی سرحدیں دنیا کے بعض عظیم ترین پہاڑوں کے قلب تک پہنچ گئیں اور قریب قریب بالائی وادی آمو اور پامیر سے جا ملیں۔ پاکستان کی حدود میں ایشیا کی بعض دلچسپ ترین قومیں آگئیں جو دنیا کے حسین ترین پہاڑی علاقوں اور خوبصورت ترین وادیوں میں رہتی ہیں۔ اس علاقہ میں وادی سوات کی جنت نظیر وادی شامل ہے جو مالاکنڈ کے شمال میں سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے اور اس کے برعکس چترال سے آگے پچیس ہزار پانچسو فٹ اونچی ترچ میر ہے جو ہندوکش کے سلسلہ کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایسے پہاڑوں کی ابھرتی اور گرتی ہوئی لہریں ہی لہریں ہیں جو کہیں بنجر کہیں جنگلات سے جمے ہوئے اور کہیں اتنے بلند ہیں کہ ان کی چوٹیاں ہر موسم میں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ان پہاڑوں کے درمیان تیز رو چشمے بہتے ہیں جو کشادہ اور مسکراتی ہوئی وادیوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ سوچ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ۱۸۹۵ء سے پہلے اس میں سے بیشتر علاقہ پر کبھی کسی انگریز کی نظر نہیں پڑی تھی۔ ہر سال بہت سے لوگ یوسف زئی سمہ کے آر پار پیدل یا سواری پر سفر کرتے تھے وہ شمال میں پہاڑوں کے بنائے ہوئے پردہ پر نظر ڈالتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ اس کے دوسری طرف بھی کوئی دنیا ہے لیکن پہاڑوں کا بڑا سلسلہ جو میدان سے صرف چند ہزار فٹ بلند ہے ڈراپ سین کی طرح سوات جیسے قریبی جنت کو بھی نظروں سے چھپائے ہوئے تھا۔ شروع کی یہ پہاڑیاں وہی تھیں جن میں گھومتے ہوئے بابر کی مبارکہ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

یہ آخری پیش قدمی کچھ تو قبائل کی حرکتوں کی وجہ سے اور کچھ پامیر میں روس کی پیش قدمی روکنے کے لئے کی گئی۔ چترال جو انتہائی شمال میں ہے پٹھانوں کا علاقہ نہیں ہے۔ یہ علاقہ کونڑ کی بالائی وادی میں واقع ہے۔ کونڑ نیچے آ کر افغانستان میں جلال آباد کے مقام پر دریائے کابل سے آملتا ہے۔ دریائے کونڑ درۂ بروغیل کے پاس کے برفانی میدانوں سے نکلتا ہے اور پامیر میں وخن کا علاقہ جو چند میل تک زبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا ہے اسے روس سے جدا کرتا ہے۔ سب سے پہلے ولیم لاک ہارٹ (William Lockhart) گلگت کے راستے چترال گئے تھے اور بعد میں اس علاقہ کے حکمران امان الملک سے برطانوی حکومت کے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ ۱۸۹۲ء کے بعد چترال کی گدی پر جھگڑے کی وجہ سے افرا تفری پھیل گئی۔ ۱۸۹۵ء میں گدی کے ایک دعویدار نے جسے جندول کے پٹھان سردار کی حمایت حاصل تھی (جندول باجوڑ میں واقع ہے لیکن دیر کی جاگیر سمجھا جاتا ہے) چترال پر حملہ کردیا اور برطانوی ریزیڈنٹ رابرٹسن کو جو موقع پر حالات کا جائزہ لینے گلگت سے آئے تھے محاصرہ میں لے لیا۔

اب تک چترال کے ساتھ مواصلات صرف گلگت کی طرف سے بارہ ہزار فٹ اونچے درۂ شندور کے راستے قائم تھے۔ اس علاقہ میں پٹھانوں کی آبادی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں وہ مختصر راستہ کسی کو معلوم نہ تھا جو مالاکنڈ سے سوات اور وہاں سے پنج کوڑہ دریا کے پار دیر اور وہاں سے دس ہزار فٹ اونچے درۂ لواری سے ہوتا ہوا چترال جاتا ہے۔ لواری تک یہ پورا خطہ یوسف زئی پٹھانوں کا علاقہ تھا جس میں اس زمانہ تک کوئی بیرونی داخل نہیں ہوا تھا اور انگریزوں نے بھی اس کے متعلق ادھر ادھر سے سنا تھا یا سڑکوں کے نقشوں سے اندازہ کیا تھا۔ امبیلا کی لڑائی سے یہ ظاہر ہوچکا تھا کہ پہاڑی علاقہ کے یوسف زئی یہ تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنا پردہ نہیں ٹوٹنے دیں گے۔ لیکن چترال کی مدد ضروری تھی۔ روس بھی حالات کا جائزہ لے رہا تھا اس لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا اور وہ بھی فوری طور پر۔ آخر یہ طے پایا کہ خطرہ مول لیا جائے اور چترال پر دونوں طرف سے چڑھائی کی جائے۔ ایک زبردست فوج مالاکنڈ سے دیر ہوتی ہوئی آگے بڑھے گی اور دوسری طرف ایک مختصر سی کمک گلگت کی طرف شمال سے آئے گی۔

مالاکنڈ پر اس پیش قدمی کی سختی کے ساتھ مزاحمت کی گئی اور درہ پر قبضہ کے لئے زبردست لڑائی ہوئی اس لڑائی میں گائڈز نے رجمنٹ کے ساتھ مل کر جو بعد میں چوّن ویں (۵۴) رجمنٹ کہلائی جنگ کا پاسہ پلٹ دیا۔ اس فوج نے ان ٹیلوں پر قبضہ کرلیا جو اب تک گائڈز ہل کہلاتے ہیں اور جو پہاڑی چوٹی پر حاوی ہیں۔ اکبر کی فوج کے سالار زین خان کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی فوجی دستہ جنوب کی طرف سے سوات میں داخل ہو کر چکدرہ کی طرف بڑھا تھا جہاں بیربل کے ساتھ زین خان کی گرما گرم کانفرنس ہوئی تھی۔

مزید پیش قدمی سے بالکل نئے سیاسی مسائل پیدا ہوگئے اور یہ ضروری ہوگیا کہ محمد شریف کے ساتھ جو اس زمانہ میں ریاست دیر کا حکمران تھا اور مالاکنڈ سے چترال کی سرحد تک پورے علاقہ کا مالک تھا دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ ان دنوں ریاست سوات قائم نہیں ہوئی تھی اس علاقہ کو عظیم شخصیت اخوند ۱۸۷۷ء میں اور ان کے دونوں بیٹے چند سال بعد فوت ہو چکے تھے اور ان کے چاروں پوتوں میں جو میاں گل کہلاتے ہیں ان کی جانشینی پر جھگڑا چل رہا تھا۔ دیر ریاست اس لحاظ سے منفرد ہے کہ پورے پٹھانوں میں صرف اسی ریاست کے قبائل اپنے آپ ھی میں سے ایک خان کو نہ صرف اپنا سردار یا ملک سمجھتے ہیں بلکہ موروثی حکمراں سمجھتے ہیں جیسے ایک بادشاہ کی طرح اپنی رعایا پر کلی اختیار حاصل ہوتا ہے خود دیر کا حکمراں پائندہ خیل ہے پائندہ خیل علی زئی یوسف زئیوں کی چار شاخوں میں سے ایک ہے۔ یہ چاروں شاخیں اور کچھ اور خیل رعیت ہیں۔ دیر میں نو پشتوں سے ایک حکمراں چلا آرہا ہے۔ پہلا حکمراں اسماعیل خان تھا جو خوشحال خان خٹک کا ہم عصر تھا اور دونوں کی ملاقات بھی ہوئی تھی البتہ اسماعیل خان عمر میں خوشحال سے چھوٹا تھا۔

کہا جاتا ہے اس خاندان میں قاسم اور غزن خان سب سے زیادہ طاقتور حکمراں گزرے ہیں قاسم کے بارے میں الفنسٹن نے لکھا ہے ”قاسم خان کا پورا قبیلہ اس کا مطیع ہے۔ وہ جسے چاہے قید کر سکتا ہے جسمانی سزا دے سکتا ہے اور ہلاک بھی کر سکتا ہے۔ اس نے خاندانی جھگڑے ختم کر دئے ہیں اور پولیس کا اچھا انتظام کیا ہے اس کی حکومت

اس کی یوسف زئی رعایا میں بڑی مقبول ہے پنج کوڑہ کے تمام فقیر اب اس کی رعیت ہیں اور اسے محصول ادا کرتے ہیں لیکن وہ اپنے خیل سے کوئی محصول وصول نہیں کرتا،،۔ قاسم کے بیٹے غزن کے بارے میں رپورٹ لکھتے ہیں کہ وہ ملی زئیوں کا سردار ہے اور دریائے سندھ کے پار سب سے زیادہ طاقتور حکمراں ہے۔ اگر قبیلہ کی تمام شاخیں متفق ہوں تو غزن خان کے بعد اس علاقہ کے مذہبی پیشوا کے مشورہ سے رحمت اللہ ہی حکمراں بنے گا جو اس علاقہ کا سب سے زیادہ طاقتور سردار ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پٹھان قبائل محصول ادا نہیں کرتے لیکن وہ ریاست کی فوج کا کام دیتے ہیں جو ایک طاقتور فوج ہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں کشمیر کی لڑائی میں دیر کے موجودہ حکمراں شاہجہاں خان نے جو پٹھان لشکر بھیجا تھا اس نے لڑائی میں بڑی بہادری دکھائی اور تمام قبائل میں غالباً یہی ایک لشکر تھا جس نے حق ادا کردیا۔ اسی لشکر کو سب سے زیادہ جانی نقصان برداشت کرنا پڑا اور بہت سی پہاڑیوں پر کشمیری شہیدوں کی قبریں آج بھی دکھائی دیتی ہیں۔

مالاکنڈ میں ابتدائی لڑائی کے بعد دیر کے حکمراں نے ہتھیار ڈال دئے اور برطانوی فوج درۂ لواری پار کر کے چترال کی مدد کو پہنچ گئی۔ اس وقت سے اب تک دیر کا حکمراں اپنے معاہدوں کی سختی سے پابندی کرتا چلا آیا ہے اور شمال کی طرف جانے والی اس اہم شاہراہ کی حفاظت کے لئے فوج متعین ہے جس کی تنخواہ حکومت ادا کرتی ہے۔ دیر کو ایک ریاست تسلیم کر لیا گیا جس کے ساتھ برطانوی حکومت نے اتحاد کا معاہدہ کر لیا۔ اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اسی راستے سے ہر تیسرے سال چترال کی چھاؤنی کے لئے فوج بھیجی جاتی رہی۔ موجودہ صدی کے تیسرے عشرہ میں باقاعدہ فوج چترال سے واپس بلا لی گئی اور اب وہاں مقامی ملیشیا متعین ہے۔ لیکن چترال کی سڑک کی اہمیت بدستور موجود ہے اور اس کا استعمال دیر کے ساتھ پرانے تعلقات پر منحصر ہے۔ دیر کا موجودہ حکمراں شاہ جہان خان پرانے طرز کا یوسف زئی ملک ہے اور اپنے وعدہ کا پابند ہے۔

نئی مالاکنڈ ایجنسی کا انتظام سب سے پہلے جس افسر کے سپرد کیا گیا وہ ہیرلڈ ڈین تھے جو بعد میں ۱۹۰۱ء میں شمال مغربی سرحدی

صوبہ بننے پر اس نئے صوبہ کے چیف کمشنر مقرر ہوئے۔ ابتدا ہی سے اس ایجنسی کو اتنا اہم سمجھا جاتا رہا ہے کہ اسے براہ راست مرکزی حکومت کی نگرانی میں رکھا گیا۔ درۂ مالاکنڈ کے دونوں طرف کے علاقے قصبہ تھانہ تک پوری وادی سوات اور سمہ کی طرف پلائی کی پہاڑیاں جہاں بابر گھومتا پھرا تھا ان تمام علاقوں میں ایسا ہی نرم نظم و نسق قائم کر دیا گیا جو بلوچستان اور کرم میں کامیاب ثابت ہو چکا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے دیر کے ساتھ معاہدہ کر لیا گیا اور تھانہ سے آگے سوات اس وقت بھی قبائلی طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ شمال مغرب میں اور افغان علاقہ کونڑ سے ملی ہوئی باجوڑ وادیاں بھی برائے نام مالاکنڈ ایجنسی میں شامل کر لی گئیں لیکن نظم و نسق کو موثر بنانے کے لئے نہ اس وقت کچھ کیا گیا نہ بعد میں اب تک کچھ کیا گیا۔ باجوڑ میں کوئی سڑک نہیں ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ۱۸۹۷ء میں اس علاقہ میں فوج کے داخلہ کے بعد اب تک کسی انگریز یا پاکستانی افسر کا گزر نہیں ہوا۔

اس طرح وہ پانچ ایجنسیاں قائم ہوئیں جو آج تک قائم ہیں اور شمال سے جنوب کی طرف بالترتیب مالاکنڈ، خیبر، کرم، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کہلاتے ہیں۔ (۱۹۴۷ء میں پاکستان نے چھٹی ایجنسی کا اضافہ کر لیا ہے جو مہمند ایجنسی کہلاتی ہے) یہ ایجنسیاں پورے قبائلی علاقہ پر حاوی نہیں ہیں۔ کئی اہم قبیلے مثلاً ضلع ہزارہ کی سرحدوں پر رہنے والے قبائل اورک زئی اور بھٹنی قبائل کے ساتھ متعلقہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کے ذریعہ معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ درۂ کوہاٹ کے آدم خیل افریدیوں کے معاملات بھی مشترکہ طور پر پشاور اور کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنروں کے سپرد ہیں۔ اس علاقہ کے نظم و نسق کا ڈھانچہ قریب قریب ۱۸۹۵ء میں مکمل ہو چکا تھا۔

قبائل اپنی وادیوں میں اس مداخلت کو بڑی تشویش کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈیورینڈ لائن کی نشان بندی اور حریف طاقتوں کے دائرہ ہائے اثر کا یقین، پانچ پولیٹیکل ایجنسیوں کا قیام اور قبائلی علاقوں میں ہر طرف فوجوں کی نقل و حرکت اور ان علاقوں میں چھاؤنیوں کا قیام جو صرف فوجی نقطۂ نظر ہی سے اہم نہیں تھے بلکہ انتہائی زرخیز

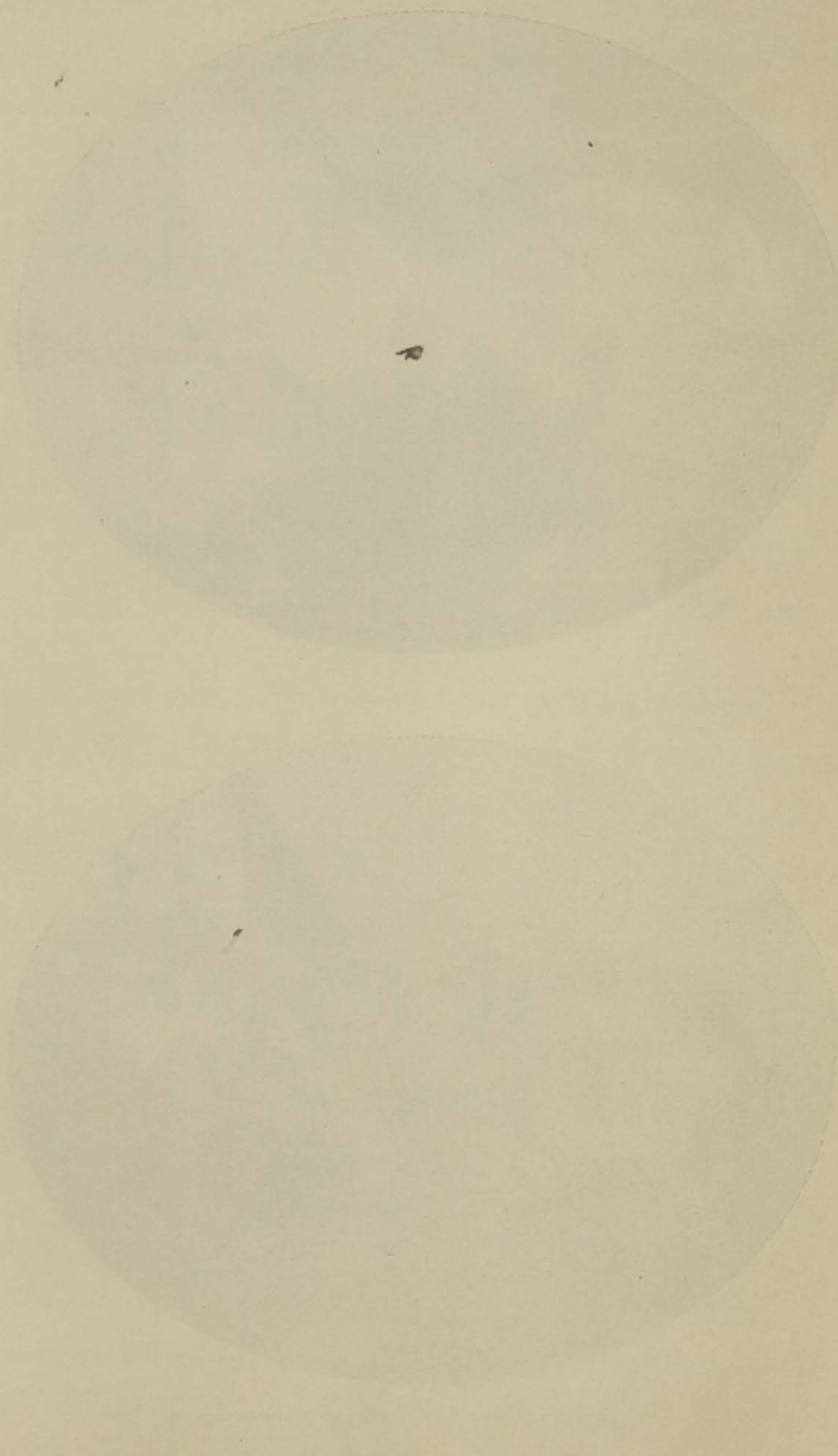


سر جارج روس کیپل



سر هیرلڈ ڈین

سرحد کے برطانوی منصبدار



بھی تھے۔ یہ تمام حرکتیں قبائل کی نظر میں ان کی اس آزادی کے لئے جان بوجھ کر لایا ہوا خطرہ تھیں جسے وہ ہمیشہ عزیز رکھتے چلے آئے تھے یہ خطرہ ضرور تھا لیکن جان بوجھ کر نہیں لایا گیا تھا۔ حکام اپنے ہر اقدام پر قبائلیوں کی سرکشی یا تخریب پسند عناصر کو کچلنے کے ارادہ سے مجبور ہوئے تھے۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن قبائل جس چیز کو سب کے لئے خطرہ سمجھتے تھے اس کے پیش نظر وہ ایک حد تک متحد ہوگئے اس حالت میں بھی وہ اپنی جداگانہ حیثیت سے گہرے لگاؤ کی وجہ سے متحدہ قیادت یا کونسل سے محروم رہے لیکن پوری سرحد میں آگ بھڑکانے کے لئے ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔ آخر ۹۸-۱۸۹۷ء کی لڑائی چھڑ گئی۔

یہ چنگاری بالائی ٹوچی کے مداخیل وزیریوں کے گاؤں میزر میں بھڑکی جہاں جون ۱۸۹۷ء میں پولیٹیکل ایجنٹ ایک محافظ دستہ کے ساتھ حفاظتی چوکی کے لئے جگہ منتخب کرنے کے ارادہ سے گیا تھا۔ پہلے تو نو واردوں کی بڑی خاطر تواضع کی گئی پھر اچانک ان پر حملہ کردیا گیا۔ تمام افسر اس حملہ میں ہلاک یا زخمی ہوگئے لیکن فوجی دستہ پسپا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس موقع پر اس فوجی دستہ کی ہوشیاری اور ثابت قدمی سرحد کی تاریخ میں یادگار بن گئی ہے۔ پندرہ روز بعد مالاکنڈ کے قبائل بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں درہ مالاکنڈ اور چکدرہ کی چھاؤنیوں کے گرد جمع ہوگئے۔ اگست تک مہمند علاقہ بھی اس آگ کی لپیٹ میں آگیا اور شب قدر پر حملہ کردیا گیا۔ پندرہ دن بعد افریدی اور اورکزئی تیراہ نے بھی بغاوت کردی اور درہ خیبر کی چوکیاں انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئیں (ان دنوں واربرٹن چھٹی پر تھے) سمانا کے قلعوں پر بھی حملہ ہو چکا تھا۔ ایک چھاؤنی میں ایک ایک سپاہی کو چن چن کر ختم کردیا گیا تھا اور کرم میں بھی بغاوت کا خطرہ تھا۔ یہ بغاوت جنوب میں اس لئے نہیں پھیل سکی کہ اس کی ابتدا قبائل کے نقطۂ نظر سے قبل از وقت ٹوچی سے ہوگئی تھی۔ تیراہ میں بغاوت پھیلنے سے پہلے وہاں ابتدائی تدابیر اختیار کی جا چکی تھیں اور جو فوجیں ٹوچی میں متعین تھیں انہوں نے تیراہ اور محسود قبائل کے درمیان ایک طرح کی دیوار حائل کردی تھی۔ محسود یوں بھی بغاوت پر آمادہ نہیں تھے کیونکہ تین سال پہلے ۱۸۹۴ء میں ان کے خلاف فوجی کارروائی ہوچکی تھی۔ محسود

جو بڑا طاقتور قبیلہ ہے۔ وہ واحد اہم قبیلہ تھا جس نے ۱۸۹۷ء کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔

اس موقع پر اتنے بڑے پیمانہ پر فوجی کارروائی کرنی پڑی کہ اس سے پہلے سرحد میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بالائی سوات، باجوڑ، بنیر، مہمند اور تیراہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک فوجی نقل و حرکت عمل میں آئی۔ اور ۱۸۹۸ء کے موسم بہار تک امن و امان قائم ہوگیا۔ تیراہ میں داخلہ کی وجہ سے سلسلہ کوہ سمانا کے بازو میں درگئی کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کے لئے مشہور لڑائی لڑنی پڑی اس کے علاوہ اور بھی کئی لڑائیاں ہوئیں جو انگریزوں اور پٹھانوں کے قصہ کا جز بن چکی ہیں۔ آخرکار پٹھان علاقہ کا حسن پنہاں بےنقاب ہوگیا اور زرخیزی عیاں ہوگئی۔ خیبر پر دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ خیبر رائفلز پھر منظم ہوگئے اور نئی سڑکوں اور جدید قلعوں کی تعمیر شروع ہوگئی۔ سرحد نے وہ شکل اختیار کرنی شروع کردی جو قریب قریب آج بھی موجود ہے۔ ان حالات کی وجہ سے جن کے نتیجہ میں قبائلی علاقہ میں پیش‌قدمی کی گئی جس کے بعد بغاوت ہوئی اور جس کی وجہ سے بےشمار مسائل پیدا ہوئے جب کرزن ایک سال بعد وائسرائے بنے تو انہوں نےسرحد کے مسئلہ کا ایک نئے زاویہ سے جائزہ لیا۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قیام کا وقت قریب آچکا تھا۔

جو شخص بھی ۱۸۶۰ء اور ۱۹۰۱ء کے درمیانی عرصہ کی سرحد کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے وہ یہ بات محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرفروش حاکموں کے دور کے مقابلہ میں اس دور میں چند ہی ہستیاں اس قابل ہیں جن کا نام آج بھی باقی ہے۔ افغانستان میں طاقتور حکمراں عبدالرحمان جو سنجیدہ اور ذہن کا پکا تھا۔ پٹھانوں میں غالباً اخوند اور اسلم خان کا نام لیا جاسکتا ہے ان کے سوا اور کوئی نمایاں ہستی نہیں۔ انگریزوں میں اتنی کم مشہور ہستیاں کیوں نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ اس دور کے حالات تو بڑے عہد آفریں تھے۔

کیا ڈیورینڈ قابل ذکر ہیں؟ جی نہیں۔ وہ تو محض پولیٹیکل افسر تھا جو خاص کام پر بھیجا جاتا تھا یا میدان جنگ میں سپہ سالاروں کے ساتھ

ہوتا تھا۔ وہ ۱۸۷۹ء میں کابل میں رابرٹس کے ساتھ تھا لیکن وہ پٹھانوں سے واقف نہیں تھا اور اس کا نام محض نقشہ پر باقی ہے۔ وہ بڑا کامیاب سفیر تھا وہ فارسی زبان میں جو مشرق کی فرانسیسی ہے شعر موزوں کر سکتا تھا لیکن وہ دفتری آدمی تھا اور ایک طرح سے اسے کامیاب میکناٹن قرار دیا جا سکتا ہے وہ سرکاری عہدہ کا متمنی تھا اور اس کا ٹھکانہ شملہ تھا۔

جن لوگوں نے میدان عمل میں نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں ان میں سنڈیمان کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن ان کا دائرہ عمل محدود تھا اور ان کے نام سے قلب کو گرمانے والی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔ ڈیرہ جات میں ایک انگریز ایسا ضرور رہا ہے جس کی یاد باقی ہے۔ وہ میکالے ہے جو سترہ سال ڈپٹی کمشنر رہا جس نے مشہور نہر بنوائی اور جس کا محسود اتنا احترام کرتے ہیں کہ اس سرکش قبیلہ کی ایک شاخ کا نام میکالے خان پڑ گیا۔ میکالے مشہور ماہر عدلیہ اور مؤرخ کا رشتہ دار تھا لیکن تواریخ اور تعزیرات ہند میں مہارت سے زیادہ ہوریشس کی طرح مرد میدان تھا۔ وہ نیلی آنکھوں اور خوبصورت بالوں والا لمبا تڑنگا انسان تھا۔ ان کے علاوہ واربرٹن ہیں جنہیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیویگنری بھی ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ یہ دونوں اور میکالے طویل عرصہ تک ایک ہی عہدہ پر فائز رہے۔ کیویگنری دس سال سے زیادہ عرصہ تک کوہاٹ میں رہے۔ واربرٹن آدھے افغان تھے۔ اور کیویگنری نپولین کے ایک جنرل ایڈولف کیویگنری کے صاحبزادہ تھے اور پیدائش کے وقت ان کا نام پیری لوئی نپولین رکھا گیا تھا وہ بڑے رنگین اور سیماب صفت انسان تھے انہیں اڑتیس سال کی عمر میں کابل میں قتل کر دیا گیا۔ پشاور اور کوہاٹ کے علاقہ میں ان کی دو باتیں مشہور ہیں ایک تو یہ کہ وہ حملہ آوروں کے تعاقب میں گھوڑے پر مارے مارے پھرتے تھے اور گھوڑے کی سواری سے کبھی نہیں تھکتے تھے اور اپنی رپورٹوں میں بڑے چبھتے ہوئے جملے لکھتے تھے۔ ان کی بہترین یادگار وہ کوٹھی ہے جو انہوں نے کوہاٹ میں بنوائی ہے اس کا گنبد بڑا شاندار ہے اور پوری عمارت بڑی کشادہ ہے جو سیوا ٹرڈ میں رہنے والے ان کے اسلاف کے شایان شان ہے۔

یہ لوگ سرحد میں آئے اور بظاہر اس علاقہ کو ویسا ہی چھوڑ گئے جیسا انہوں نے سکھوں سے حاصل کیا تھا۔ ریلوے لائن ۱۸۸۱ء میں

پشاور تک پہنچ گئی تھی۔ اٹک کا پل بن چکا تھا کہیں کہیں سرسبز چھاؤنیاں قائم ہو چکی تھیں اور کئی سڑکیں اور قلعے بھی بن گئے تھے۔ نہروں کی وجہ سے وادی پشاور پہلے سے زیادہ شاداب ہوتی جا رہی تھی۔ البتہ دیہات میں لوگ ان کا لباس اور ان کے دکانات ویسے ہی تھے جیسے صدیوں سے چلے آرہے تھے اور درانیوں کے محلات کے سوا جو کھنڈر بن چکے تھے شہر اور دیہات کے متعلق الفنسٹن کا وہ بیان اب بھی صادق آتا تھا جو انہوں نے ۱۸۰۹ء میں قلم بند کیا تھا۔

فصل بست و چہارم

وزیرستان

موجودہ دور اور پٹھان صوبہ کے قیام سے پہلے گزشتہ صدی کے آخری موڑ تک ہم آپہنچے ہیں۔ اس موقع پر تمام حالات کو ان کی صحیح اہمیت کے ساتھ پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پیش منظر کے ایک شگفتہ گوشہ کا بغور مطالعہ کریں ورنہ پوری تصویر کا مفہوم ہی واضح نہیں ہوگا۔ اس طرح ہم دوصدیوں اور دو نظاموں کے درمیانی خلا کو عبور کر سکیں گے اور اس طرح ان عوامل کا قبل از وقت اندازہ لگا سکیں گے جو آج اس پورے علاقہ میں کار فرما ہیں۔

پٹھانوں کی کہانی بیشتر وادی پشاور کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی ایک وجہ اس وادی کی زرخیزی ہے جو حملہ آوروں اور حملہ بچانے والوں دونوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے مقناطیس کا کام کرتی رہی ہے۔ خیبر کی پہاڑیوں کے مشرق اور مغرب میں دریائے کابل مغرب کی طرف سے آنے والے دریاؤں میں سے دریائے سندھ کا سب سے بڑا معاون دریا ہے اور اس کے کناروں پر وسیع میدانی علاقہ ہے جو ہندوکش کے ان پہاڑی سلسلوں کی تلہٹی میں واقع ہے جو ریڑھ کی ہڈی کی طرح جنوب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دریائے کابل وادی پشاور کے اس حصہ میں بہتا ہے جو کابل اور پنجاب کے میدانوں کے درمیانی راستوں پر واقع ہے۔ درۂ خیبر کے علاوہ جو ان راستوں میں سب سے زیادہ سیدھا ہے لیکن جسے انیسویں صدی تک بہت ہی کم استعمال کیا گیا تھا بازار، گنداب، باجوڑ اور سوات سے گزرنے والے کئی درے بھی اس وادی پشاور میں آکر نکلتے ہیں۔ ان سب میں بہترین بنگشت کا پرانا راستہ ہے جو کرم اور کوہاٹ سے ہو کر گزرتا ہے

یہ بھی قریب قریب پشاور کا ایک بغلی راستہ ہے۔ یہ راستہ اختیار کرنے میں بھی ان ہی قبائل میں سے کچھ قبائل سے واسطہ پڑتا ہے اور اسی قسم کے سیاسی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اس سے آگے اور جنوب میں اس علاقہ میں جو قریباً کرم اور گومل دریاؤں کے درمیان واقع ہے ہمیں بالکل نئے اور مختلف قبائلی نظام سے واسطہ پڑتا ہے یہ علاقہ وزیرستان کہلاتا ہے۔ مختلف سلطنتیں وقتاً فوقتاً سوات باجوڑ یہاں تک کہ تیراہ کے قبائل کو بھی اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں مغلوں اور درانیوں دونوں نے ان قبائل کو اپنا مطیع بنانے کے لئے فوجی کارروائیاں بھی کی ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوسکے لیکن ان علاقوں پر ان کا دعویٰ ضرور تھا۔ لیکن جہاں تک تاریخ ہمارا ساتھ دیتی ہے کبھی کوئی سلطنت وزیرستان کے قبائل کو زیر کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے شمال مشرقی قبائل کو جنوب مغرب میں بسنے والے ان کے بھائیوں سے دریائے کرم اور میران زئی وادی جدا کئے ہوئے ہے جو ٹل سے کوہاٹ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس سرحد پر یا اس سے شمال مشرق میں رہنے والے قبائل کرخت پختو بولتے ہیں۔ اس سرحد سے جنوب مغرب میں بسنے والے ملائم پشتو بولتے ہیں اور ان میں سے اکثر اپنے بال کانوں تک بڑھا کر پٹوں کی شکل میں رکھتے ہیں شمال مشرقی علاقہ کا مرکزی شہر پشاور ہے اور جنوب مغربی علاقہ کا بنوں ہے اور کبھی ٹانک بھی رہا ہے۔ خٹک قبیلہ ہی ایک ایسا قبیلہ ہے جو اس سرحد کے دونوں طرف آباد ہے۔ اس قبیلہ کے جو لوگ اس سرحد کے جس طرف آباد ہیں اسی طرف کی بودوباش اپنائے ہوئے ہیں۔ جنوب مغربی قبائل ایک طرح کے قدرتی جغرافیائی قلعہ پر قابض ہیں جس کی تفصیل ریورٹی اور دوسرے مصنفوں نے بیان کی ہے جن کا خیال تھا کہ پٹھان صرف سولھویں صدی میں شمال کی طرف پھیل گئے تھے۔ ان مصنفوں نے اسے کوہ سلیمان کی حقیقی افغان سر زمین قرار دیا ہے۔

جنوب مغربی پٹھانوں کے علاقہ کو نقشہ پر غیر مساوی الساقین مربع کی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے جو سرحدی پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور جس کے دامن میں بہت سی بلند وادیاں اور محدب میدان واقع ہیں۔ اس

کی شکل دو مستول والی کشتی کے بڑے بادبان سے ملتی جلتی ہے (۱)۔ بادبان کے مستول کی طرف کا کنارہ مشرق میں واقع ہے جو قریب قریب شرقاً غرباً ٹل یا ہنگو سے لے کر تخت سلیمان کی دیوار کے نیچے نیچے ڈیرہ غازی خان کے عرض البلد میں فورٹ منرو تک چلا گیا ہے۔ اس بادبان کا بالائی کنارہ شمال میں سفید کوہ کی چوٹی سکارام سے ٹل تک دریائے کرم ہے۔ اسی بادبان کا سب سے طویل اور مغربی کنارہ کوہ سلیمان کے بیرونی سلسلے ہیں جو گردیز غزنی اور قندھار کے محدب میدانوں کی طرف ڈھلوان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کنارہ سکارم سے شروع ہوتا ہے اور کم و بیش ڈیورینڈ لائن کے ساتھ ساتھ (لیکن خوست اور بیرمل کو شامل کرتے ہوئے) توبہ اور چمن کے پاس تک پہنچتا ہے۔ مغربی کنارہ بڑے بادبان کے بیرونی کنارے کی طرح اوپر کے کنارے سے الگ ہو کر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ بادبان کا نچلا کنارہ جو مغرب میں واقع ہے اور بالائی کنارے کے مقابلہ میں کافی بڑا ہے فورٹ منرو سے کوئٹہ ہوتا ہوا چمن تک اس سرحد کے ساتھ ساتھ جاتا ہے جو پشتون کو بلوچ قبائل سے جدا کرتی ہے۔ ایک طرح سے یہ علاقہ بھی جان آف گانٹ کے زمانہ کے انگلستان سے ملتا ہے البتہ خندقوں کی جگہ پہاڑیوں نے لے لی ہے۔ یہ ایک ایسا قلعہ ہے جو فطرت نے اپنے لئے بنایا ہے اس کی حفاظت وہ پہاڑ کرتے ہیں جو دیواروں کی طرح اس کے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ اس مربع کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ وہ راستہ گزرتا ہے جو خراسان سے قندھار اور کوئٹہ ہوتا ہوا درۂ بولان سے گزر کر سندھ پہنچتا ہے۔ فوجی اور تجارتی قافلے ہمیشہ اس راستہ سے گزرتے رہے ہیں۔ ژوب بوری اور ڈکی میں داخلہ آسان ہے اور مغل اور درانیوں دونوں کی اس علاقہ پر حکومت رہی ہے۔ لیکن اس کے شمال میں وہ قبائل جو کرم ٹوچی اور گومل کے درمیان پہاڑیوں میں آباد ہیں انہوں نے اپنی گردن پر کبھی جوا نہیں رکھوایا۔ یہ قبائل بڑی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئے ہیں۔ محمود غزنوی نے اپنی فوج کے لئے ان قبائل میں سے سپاہی ضرور بھرتی کئے ہوں گے چنگیز تیمور اور دوسرے حملہ آور اس علاقہ کے آس پاس کے بڑے دروں سے ضرور گزرے ہوں گے۔ احمد شاہ درانی نے یہ تخمینہ ضرور لگایا تھا کہ ان قبائل میں سے کتنے سپاہی بھرتی کئے جا سکتے ہیں۔ انگریز ان کی ہر وادی میں بار بار گئے تھے

---

(۱) قبائلی نقشہ پر نظر ڈالنے سے اس نکتہ کی وضاحت ہو جائے گی۔

اور انہوں نے سڑکوں اور قلعوں کا جال بچھا دیا لیکن ان میں سے کوئی بھی قبائل سے ہتھیار چھیننے، ان کے علاقہ کو معمولی نظم و نسق کے تحت لانے یا ان پر ٹیکس لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس پورے علاقہ کا مرکز اور قلب وہ حصہ ہے جو اب وزیرستان کہلاتا ہے۔

اس علاقہ کے مشرق کی طرف بیرونی پہاڑیاں بھٹنیوں کا مسکن ہیں جو نسب نامہ کی رو سے بی بی متو کے واقعہ سے پہلے شیخ بٹن کی اولاد ہیں اور اس لئے غلجیوں کے قرابت دار ہیں لیکن بھٹنی نسبتاً چھوٹا اور کمزور قبیلہ ہے باقی وزیرستان کرلانی پٹھانوں میں سے سب سے زیادہ طاقتور قبیلوں درویش خیل وزیر اور محسود کے قبضہ میں ہے۔ ابتدائی زمانہ میں مورخ ان کا نام تک نہ جانتے تھے لیکن وہ گذشتہ ایکسو سال کے عرصہ میں سرحد کے سب سے زیادہ دلیر اور جنگجو قبائل مشہور ہو گئے ہیں۔ وہ سب کے سب کرلانی ہیں اس لئے ہماری درجہ بندی کے مطابق افغان نہیں بلکہ پشتون ہیں۔ ان قبائل میں ایک کمزور سی روایت مشہور ہے کہ وہ ہندوکش کے شمال میں ترکستان کے علاقہ میمانہ سے آئے تھے لیکن یہ بھی طرح طرح کی ان روایات میں سے ایک ہے جو پٹھانوں کی اصل کے متعلق مشہور ہیں اور دوسری روایات سے زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ ان کی کرلانی ذات اور دشوار گزار پہاڑیوں میں سکونت سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً وہ پہاڑی قبائل میں سب سے پرانی اور خالص نسل سے ہیں۔

وزیر اور محسود قبائل کے اجداد بھی قرابت دار ہیں لیکن موجودہ حالات میں محسود ایک الگ قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ پہاڑوں کے مرکزی سلسلہ میں آباد ہے جو کوہان کی طرح ابھرا ہوا ہے۔ ان کے گرد شمال مغرب اور جنوب میں درویش خیل وزیر اور مشرق میں بھٹنی آباد ہیں۔ ان کی بیشتر آبادی گیارہ ہزار پانچسو فٹ اونچے کوہ پریغل کے دامن میں کانی گرم اور مکین کے آس پاس دیہات میں بسی ہوئی ہے۔ وہ الگ تھلگ رہتے ہیں اور اپنے وزیری بھائیوں سے مستقل جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ انہوں نے وزیریوں کی بہت سی زمینوں پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ جو لوگ ان دونوں قبیلوں سے واقف ہیں ان کی نظر میں ان کا فرق بھی واضح ہے۔ آپ کسی ایسی سڑک پر جائیں جس پر ان قبائل کے بہیر یعنی کارواں گزرتے ہوں تو انہیں پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ دونوں کا لباس تو

قریب قریب یکساں ہوتا ہے لیکن دونوں کے انداز میں ایسا فرق ہوتا ہے جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس فرق کو اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ محسود بھیڑیا ہے اور وزیر چیتا۔ دونوں شاندار جانور ہیں۔ چیتا زیادہ مکار زیادہ پھرتیلا اور زیادہ شاندار ہوتا ہے لیکن بھیڑیوں کا غول دھن کا پکا زیادہ متحد اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

اگرچہ تمام وزیر درویش خیل کہلاتے ہیں لیکن ان میں بھی تفریق ہے۔ اتمان زئی ٹوچی کے آس پاس اور شمال میں کرم کے قریب دوڑ قبیلہ کے ہمسایہ کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ احمد زئی وانا اور شکئی میں اور جنوب میں گومل تک آباد ہیں۔ نخلستان بنوں کے آس پاس اتمان زئی اور احمد زئی دونوں کی بستیاں بسی ہوئی ہیں۔ موسیٰ درویش وہ مقدس بزرگ ہیں جنہیں قبیلہ کی دونوں شاخیں اپنا مورث اعلیٰ مانتی ہیں وہ 'موسیٰ نیکۂ' یعنی موسیٰ دادا کہلاتے ہیں اور ان کا مزار احمد زئی علاقہ کے مغربی کنارے پر ڈیورینڈ لائن کے نزدیک واقع ہے۔ یہ مزار پاکستانی علاقہ میں اس سرحد سے صرف ایک میل اندر کی جانب ہے جو ۱۸۹۳ء میں کھینچی گئی تھی اور افغان حکمرانوں کی طرف سے اس مزار پر قبضہ کرنے کی کوشش ہو چکی ہے کیونکہ وہ ایک ایسی زیارت گاہ اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے ہیں جو اتنے اہم قبیلہ کا مرجع ہے۔

لیکن سرحد کی تاریخ پر سب سے گہرا نشان محسود قبیلہ نے چھوڑا ہے۔ یہ نشان مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ ہمیں ان کے وطن میں ان کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایولین ہاوول (Evelyn Howell) (۱) سے مدد لینی چاہئے جنہوں نے ان کے متعلق بہترین کتاب لکھی ہے۔ وزیریوں کی طرح محسود قبیلہ کی بھی ایک زیارت گاہ ہے یہ مبارک کا مزار ہے جو 'سروکے' قلعہ کے اوپر سے کوہان کی طرح اٹھے ہوئے نو ہزار فٹ اونچے پہاڑ کنڈی غر پر واقع ہے۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ کرزن کے زمانہ میں یہ تجربہ کیا گیا کہ قبائلی علاقہ میں پولیس کے فرائض انجام دینے کے لئے مقامی ملیشیا بھرتی کی جائے لیکن یہ تجربہ ناکام رہا۔ محسود ملیشیا نے

---

(۱) میز کے مصنف۔ جو وزیرستان میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک ریزیڈنٹ کے عہدہ پر فائز رہے۔ وہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک وائسرائے کے فارین سکرٹری کے عہدہ پر بھی کام کرتے رہے۔

پولیٹیکل ایجنٹ باؤرنگ (Bowring) اور اپنے کمانڈنٹ ھرمین (Harman) کو چند ھی مہینے بعد قتل کر دیا۔ اور فروری ۱۹۰۵ء میں ھاوول اس سنگین فیصلہ پر مجبور ھوئے کہ محسود دستہ سے ھتھیار رکھوا لئے جائیں اور اسے منتشر کر دیا جائے۔ دو مہینہ بعد انہیں شکار پر کنڈی غر جانے کا اتفاق ھوا۔ ان کی رائفل جو کبھی ان کے دوست ھرمین کے پاس تھی اس موقع پر محسود قبیلہ کا ایک لڑکا اٹھائے ھوئے تھا۔ جب یہ جماعت پہاڑ کی چوٹی پر مزار کے پاس پہنچی جہاں جھنڈے لہرا رھے تھے تو لڑکے نے مزار کی طرف منہ کر کے دعا مانگی ''اے نیکۂ بورک (۱) مجھے ایسی ھی ایک رائفل دلوادے خواہ اس کے لئے مجھے تین آدمیوں کو قتل کیوں نہ کرنا پڑے''۔ لیکن ھاوول بچ گئے۔

جب تک کان آشنا نہ ھوں وزیر اور محسود قبائل کا انداز گفتگو سمجھنا مشکل ھے اس کی یہ وجہ نہیں ھے کہ ان کی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ شامل ھیں جو میدانی علاقہ کے پشتو میں مستعمل نہیں ھیں۔ بلکہ ایک اور سبب وہ ھے جسے ماھر لسانیات حرف علت کی تبدیلی کہتے ھیں۔ یہ قبائل الف کو واؤ سے، واؤ کو ی سے اور ی کو واؤ سے بدل دیتے ھیں۔ مثال کے طور پر عام پشتو میں 'مور' ماں کو کہتے ھیں لیکن جب محسود مور کا لفظ استعمال کرتا ھے تو اس سے مراد ماں نہیں بلکہ سانپ ھوتا ھے (پشتو میں سانپ کو مار کہتے ھیں) وہ اپنی ماں کے لئے 'مور' یا 'میر' کہے گا۔ ایک سال پہلے میں میران شاہ میں اتمان زئی وزیر ملکوں کی ایک جماعت سے دلچسپ گفتگو میں مصروف تھا حالات حاضرہ پر بات چھڑ گئی گفتگو میں بار بار لفظ ریس آرھا تھا۔ ھندی میں ریس کے معنی ھیں رشک و حسد یا کھینچ تان کر برابری کے معنی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ھے میں نے سوچا کہ میرے دوست جو افراد کو زیادہ اھمیت نہیں دیتے مساوات پر بحث کر رھے ھیں۔ لیکن بات بنتی نظر نہیں آرھی تھی پھر ان کا کیا مطلب ھوسکتا ھے؟ اچانک بات میری سمجھ میں آگئی وہ روس کو ریس کہہ رھے تھے جو مساوات کا قائل نہیں لیکن جسے وزیرستان کے قبائل ھمیشہ ذھن میں رکھتے ھیں۔ اجنبی آدمی کے لئے ایسے ھی اور بہت سے الفاظ ھیں جن کا وہ صحیح مطلب نہیں سمجھ سکتا۔

---

(۱) بورک محسود پشتو میں مبارک کے لئے استعمال ھوتا ھے۔

جب ایک بار لب و لہجہ گوش آشنا ہو جائے تو ان لوگوں کی بات چیت سے بڑا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ تھوڑے عرصہ پہلے کی بات ہے ٹوچی میں ایک افسر اتمان زئی وزیر قبیلہ کی طاقتور شاخ توری خیل کے ایک جرگہ سے بات چیت کر رہا تھا۔ جرگہ کا ترجمان شاہ زر نامی ایک سفید ریش تھا جو جثہ کے اعتبار سے بڑا پر وقار لیکن مزاج کے اعتبار سے بڑا شوخ تھا اور ہم سب اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ جرگہ کوئی کام کرانا چاہتا تھا اور افسر مصلحتاً ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ شاہ زر کہنے لگا ''صاحب مجھے ایک کہانی یاد آگئی جو میں نے اپنی ماں سے بچپن میں سنی تھی۔ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس کا ایک وزیر تھا اور ہماری وادی کی طرح اس کی سلطنت ایک دریا کے کنارے واقع تھی اس لئے سلطنت میں ایک مچھیرا بھی تھا۔ ایک روز مچھیرے نے بہت بڑی مچھلی پکڑی اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن وزیر کو جیسا کہ وزیروں کا قاعدہ ہے، (۱) توقع تھی کہ درباری آداب کا خیال رکھا جائے گا، یہ بات پسند نہ آئی۔ مچھلی اس کی معرفت پیش ہونی چاہئے تھی اس لئے وہ مچھیرے سے ناراض ہوگیا۔ اس نے مچھیرے کو مصیبت میں پھنسانے کے لئے بادشاہ سے کہا ''بادشاہ سلامت مچھیرے سے دریافت کیا جائے کہ مچھلی نر ہے یا مادہ،، بادشاہ اس بات پر ہنس پڑا اور مچھیرے سے پوچھا کہ مچھلی نر ہے یا مادہ۔ مچھیرا تاڑ گیا کہ وہ مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ وہ مچھلی کو نر بتائے یا مادہ دونوں صورتوں میں اسے حکم دیا جائے گا کہ اس کا جوڑا پکڑ کر لاؤ۔ یہ بات اس کے بس کی نہیں کیونکہ یہ مچھلی دریا کی بہترین مچھلی ہے اور ایسی ہی اور مچھلی اس کے ہاتھ نہیں لگ سکتی۔ لہٰذا اس نے جواب دیا کہ بادشاہ سلامت مچھلی دو زوجیا ہے۔ آخر میں شاہ زر نے کہا کہ صاحب آپ کا جواب سن کر مجھے آج وہ مچھلی یاد آ گئی،،۔

مسلمانوں کے عہد کی تصنیفات میں وزیر قبائل کا تذکرہ سب سے

---

(۱) میرا خیال ہے اس موقع پر شاہ زر کا ارادہ ذو معنی لفظ استعمال کرنے کا نہیں تھا۔ لیکن یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ قصہ بھی وزیر کا تھا اور اس کے قبیلہ کا نام بھی وزیر تھا۔ اس طرح جس افسر کو یہ کہانی سنائی گئی اس پر یہ زبردست چوٹ تھی جسے افسر سمجھ نہیں سکا۔ دو زوجیے کے لئے پشتو میں نرښځے استعمال ہوتا ہے۔

پہلے قریبا ۱۷۸۰ء میں تیمور شاہ درانی کے عہد میں ملتا ہے۔ مصنف نے اس زمانہ میں چیتے اور بھیڑئے کا فرق محسوس نہیں کیا تھا لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اطلاق ان دونوں پر ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''وزیر افغان ایک بڑا اور طاقتور قبیلہ ہے جو قریباً ایک لاکھ خاندانوں پر مشتمل ہے اور وہ ایک وسیع لیکن دشوار گزار علاقہ میں رہتے ہیں۔ وہ جانوروں سے بہتر نہیں ہیں کیونکہ کھانے پینے، اپنے پہاڑی علاقہ میں گھومنے پھرنے راستوں پر اپنا شکار تلاش کرنے اور مر جانے کے سوا انہیں اور کچھ نہیں آتا..... یہ بڑا قبیلہ بالکل آزاد ہے وہ کسی قسم کا محصول ادا نہیں کرتا اور کسی کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتا۔ قبیلہ متعدد شاخوں میں منقسم ہے اس لئے کسی ایک خاندان یا سردار کو اپنا رہنما تسلیم نہیں کرتا البتہ قبیلہ میں متعدد ملک ہیں جو تھوڑے بہت اختیار کے مالک ہیں اور انہیں قبیلہ کی اس شاخ کی مرضی سے چنا جاتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں لیکن جب کوئی جنگی مہم درپیش ہو تو پھر ایک قائد چن لیا جاتا ہے جس کی اطاعت سب پر لازم ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ دوسرے قبائل کے مقابلہ میں وزیر قبائل میں آپس کے اختلافات بہت کم ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اتحاد کی وجہ سے بہت طاقتور ہیں۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ انہیں اپنی طاقت کا احساس ہے اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں''۔

آج کوئی محسود یا وزیر یہ بیان سن کر اندازہ لگالے گا کہ وہ کسی زمانہ میں کیا تھا وہ اس بات کا برا نہیں مانے گا کہ اس کے قبیلہ کو بھیڑیوں کا غول قرار دیا گیا ہے البتہ وہ یہ ضرور خیال کرے گا کہ مصنف کی نگاہ سطحی ہے اور وہ نفاست سے عاری ہے۔ اس کی نمایاں تصویر ایولین ھاوول نے پیش کی ہے یہ وہی ھاوول ہیں جو عہد شباب میں کنڈی غر کی چوٹی پر واقع زیارت پر گئے تھے اور جہاں سے واپسی پر انہوں نے اس دلکش اور کریست کو غیر فانی الفاظ کا جامہ پہنا دیا جو اس سرکش قوم سے واسطہ پڑنے پر ہر شخص کو محسوس ہوتی ہے۔ اب تک قبائل کے متعلق جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ھاوول کی کتاب 'میژ' سب سے زیادہ گہرائی کی حامل ہے۔ اس کتاب کے نام سے جس کا مطلب محسود پشتو میں 'ہم' ہے ظاہر کرتا ہے کہ کتاب کس رنگ میں لکھی گئی ہے۔ ھاوول جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس میں گہرا احساس

کارفرما ہوتا ہے وہ الفنسٹن کے مزاج کے آدمی ہیں اور ایک درباری ایک سپاہی اور ایک دانشور کی نگاہ زبان اور تلوار کے ملک ہیں۔ میں یہاں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ ان ہی کے خیالات کا معمولی خلاصہ ہے اور بعض جگہ ان ہی کے فقرے نقل کر دئے گئے ہیں کیونکہ ان سے بہتر لکھنا مشکل ہے اور ہر موقع پر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اصل خیال ان ہی کا ہے۔ محسود ہاوول کو بھولے نہیں ہیں اور ہاوول نے اپنی کتاب میں ان کی یادگار قائم کر دی ہے۔ یہ ایک ایسی تصویر ہے جس کے رنگ اس کے سایوں کے درمیان اتنی تابناکی کے ساتھ چمکتے ہیں کہ نگاہ محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ خیرہ ہو جاتی ہے۔ اس تصویر کے سایوں میں سے ایک ایسی شان فخر اور مردانگی جھلکتی ہے جو قابل احترام ہے اور جو محسود قبیلہ کی بقا کی ضامن ہے۔ اب تک دوسروں کے مقابلہ میں یہ قبیلہ یوں بھی زیادہ آزاد ہے۔

ہاوول نے خاص طور پر محسود یا میڑ درے مسیت، یعنی ہم تین محسود کے بارے میں لکھا ہے اس قبیلہ کے لوگ اپنے متعلق یہی فقرہ فخر سے دوہراتے ہیں ان کی مراد قبیلہ کی تین بڑی شاخوں سے علی زئی، شمن خیل اور بہلول زئی سے ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے برطانیہ عظمیٰ کا ایک باشندہ جسے اپنی اصل پر معمول سے زیادہ فخر ہو انگلستان سکاٹ‌لینڈ اور ویلز کو حب‌الوطنی کے واحد جذبہ میں تین برابر کے شریک قرار دے جس پر سب فخر کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ امتیاز کا بھی احساس رکھتے ہیں۔ یا کم تر درجہ پر محسود کا 'ہم، سکاٹ‌لینڈ کے باشندوں کے 'ہم، سے ملتا جلتا ہے۔ اس قوم میں بھی اسکاچ سے زیادہ انانیت پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسکاچ باشندوں اور دوسرے پٹھانوں کی طرح محسود بھی اپنی کمزوریوں پر مسکرا سکتا ہے بلکہ بعض حالات میں ان پر فخر بھی کر سکتا ہے۔ جب کوئی محسود اس بات پر افسوس ظاہر کرتا ہے کہ اپنی سرکشی کی وجہ سے اس کے ہم وطن فوجی ملازمت سے محروم کر دئے گئے ہیں کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا تو وہ بڑی پرمعنی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ ''میڑہ ڈیر بےاعتبورا خلق ئی،، ہم ایسی قوم ہیں جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جملہ کہتے وقت اس کا لہجہ بالکل ایسا ہوتا ہے گویا وہ کسی سازش کا انکشاف کر رہا ہے۔ یا وہ انتہائی کمینگی کی حرکت کا جواز پیش کرنے کے لئے کہے گا

کہ وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا ''دلے کسا پڑانگ دلے کسا کمر،، ایک طرف چیتا ہے اور دوسری طرف ڈھلوان پہاڑی۔ یا وہ اپنے قبیلہ کی ڈھیلی ڈھالی تنظیم کا جدید ریاست کے ڈھانچہ سے موازنہ کرتے ہوئے کہے گا '' توسے ُپخ دیوول استائے میژ لکه ڈنگئی،، تم سیمنٹ کی دیوار ہو اور ہم پتھروں سے بنائی ہوئی کھیت کی مینڈھ ہیں۔ یہ ایک ایسا موازنہ ہے جو اپنے ظاہری معنی سے کہیں زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ موجودہ ریاست خواہ وہ برطانیہ ہو یا پاکستان بہر صورت نظریہ کی یکسانیت اور حکمت عملی کے تسلسل پر کاربند نہیں رہ سکتی۔ دوسری طرف ابتدائی عہد کے معاشرہ کو وحشیانہ قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک سمجھدار محسود ملک یہی دلیل پیش کرے گا کہ ہر معاشرتی یا سیاسی نظام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بہترین افراد پیدا کئے جائیں۔ اور اس معیار کو سامنے رکھ کر محسود قبیلہ کا نظام بہترین ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں آزاد رہنا چاہئے اپنے قاعدہ قانون اور رسم و رواج کی پابندی کرنی چاہئے تاکہ ہم بھی اپنے اجداد کی طرح شاندار رہیں۔

سرحد میں انگریزوں کا دور اقتدار بنوں میں ہربرٹ ایڈورڈز کی آمد سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء میں اختیارات پاکستان کو منتقل ہونے تک ٹھیک ایکسو برس تک باقی رہا۔ اس صدی کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمال مغربی سرحد کے طول و عرض میں تمام پٹھان قبائل میں محسود بلا خوف تردید سب سے زیادہ ضد کے پکے ثابت ہوئے۔ ۱۸۶۰ء سے لے کر جب پہلی مرتبہ فوجی دستے ٹانک پر تین ہزار قبائل کے لشکر کے حملہ کی سزا دینے کے لئے پہلی مرتبہ محسود علاقہ میں داخل ہوئے ۱۹۱۹-۲۱ء میں گھمسان کی لڑائی تک جس کے نتیجہ میں محسود علاقہ پر فوجی قبضہ ہو گیا اور اس پورے علاقہ میں سڑکیں اور چوکیاں بنا دی گئیں۔ چھ بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ فوجی قبضہ بھی فیصلہ کن نہیں تھا۔ کیونکہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء اور پھر ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصہ میں ان قبائل کے ساتھ برابر جھڑپیں ہوتی رہیں۔ ۱۹۱۹-۲۱ء کی فوجی کارروائی امان اللہ کی تیسری افغان جنگ کے عواقب میں شامل تھی۔ دوسری جنگوں کے برخلاف افغان جنگیں ختم ہونے کے بعد سنگین صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ کم از کم برطانوی عہد میں یہ جنگیں اپنے عقب میں قبائلی بے چینی چھوڑ جاتی تھیں۔ اس

بے چینی کو عام طور پر وہی کابلی حکومت ہوا دیتی رہتی تھی جو برائے نام صلح کر لیتی تھی لیکن اس تاک میں رہتی تھی کہ سرحدی قبائل میں بے چینی پھیلا کر اور ان مجرموں کو جو سرحد کے پار قانون کی زد سے بچ کر آگئے ہیں پناہ دے کر اپنے سابقہ حریف کو پریشان کیا جائے۔ یہ وہ رجحان ہے جو مسلم مملکت پاکستان کے قیام کے بعد بھی قائم ہے کیونکہ کابلی حکومتیں برطانیہ کی طرح پاکستان کے خلاف بھی قبائل کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مسلسل ریشہ دوانیاں کرتی رہتی ہیں۔

لیکن محسود سر پھرے نہیں تھے۔ وہ ہم انگریزوں سے صرف اس لئے نفرت نہیں کرتے تھے کہ ہم مسلمان نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی ہم نے مضبوط قدم اٹھایا محسود قبائل نے ہمارا احترام کیا بلکہ بعض حالات میں وہ ہمیں پسند بھی کرتے تھے۔ محسود ہمارے اس لئے مخالف نہیں تھے کہ انہیں کابلی حکومت کی ہوس ملک گیری سے ہمدردی تھی یا یہ کہ افغانستان کی حکومت ان درانیوں کے ہاتھ میں تھی جو حنفی سنی اور افغان بھائی تھے۔ قبائل کے لئے اس یگانگت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ محسود قبائل نے جو کچھ بھی کہا اس پشت پر ان کی یہ جبلت کار فرما تھی کہ قبائل کو محکوم بنانے کی ہر کوشش کا ہر قیمت پر مقابلہ کیا جائے اور قبائل کا مخصوص نظام زندگی برقرار رکھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ایسی ہر امداد سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار رہتے تھے جو انہیں اپنے مقصد کے لئے مفید نظر آتی تھی مثلاً کابل کا پراپیگنڈا یا مالی اعانت یا دنیائے اسلام کے نام پر کفار کے مقابلہ کی اپیل۔ بہر حال میرا خیال ہے کہ اگر میں یہ کہوں کہ محسود سب سے پہلے محسود اور بعد میں مسلمان ہوتا ہے تو ہر محسود اسے نہ صرف درست قرار دے گا بلکہ اپنی تعریف پر محمول کرے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان بھائی ہونے کی وجہ سے پاکستانی حکام کو محسود یا افریدیوں جیسے قبائل کے ساتھ نپٹنے میں آسانیاں حاصل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس پاکستانی حکام کو زبردست آسانی حاصل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز بھی قبائل کے ہم مذہب ہوتے تو وہ اپنی بات زیادہ آسانی سے منوا سکتے تھے۔ البتہ جس طرح خوشحال خان اورنگ زیب کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اسی طرح محسود

کی نظر میں عزت حاصل کرنے کے لئے محض مسلمان ہونا کافی نہیں ہے محسود قبیلہ اب تک صرف اپنے نظریہ کا وفادار رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ 'درے مسیت'، کی مطلق العنان آزادی کو برقرار رکھا جائے۔ اگر پاکستان محسود قبائل کو اپنا وفادار بنا سکے تو یہ سیاست کے میدان میں بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور ایک طرح شیر شاہ کا یہ خواب پورا ہو جائے گا کہ ملک کے دفاع کے لئے روہ کے قبائل کو ایک مضبوط ڈھال بنایا جا سکتا ہے۔ یہ عظیم مقصد آزاد منش قبائل سے محض فوجی خدمات لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح نادر خان ۱۹۲۹ء میں قبائلی فوج کابل لے گئے تھے یا ۱۹۴۷ء میں قبائل کو کشمیر کے محاذ پر بھیجا گیا تھا۔ یہ ایسی مہمات تھیں جو عظیم مقصد سے کوئی تال میل نہیں رکھتیں۔ منصوبہ ایسا ہونا چاہئے جس میں قبائل عظیم تر پاکستان میں اپنا مناسب مرتبہ حاصل کر سکیں۔

جنگ اور مشاورت کے میدانوں میں محسود قبائل کے کئی لیڈر گزرے ہیں۔ لڑائی کے میدان میں بہلول زئی قبیلہ کے عبدالرحمان خیل کا جگڑ بہت مشہور تھا۔ اس نے ۱۸۹۴ء میں ایک روز صبح ہی صبح وانا کیمپ پر دو ہزار شمشیر زن قبائیل کے لشکر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ یہ کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ ۱۸۹۳ء میں ایک طرف امیر عبدالرحمان کے ساتھ ڈیورینڈ لائن کے متعلق معاہدہ ہوا اور دوسری طرف بروس پولیٹیکل ایجنٹ بن کر اس علاقہ میں آئے۔ وہ یہ خیال لے کر آئے تھے کہ اس علاقہ میں بلوچستان کے نمونہ کا نظم و نسق قائم کیا جائے۔ بروس جو سنڈیمان کے پکے شاگرد تھے اس بات کے قائل تھے کہ کوئٹہ میں بیٹھ کر جن اصولوں پر کامیابی کے ساتھ عمل کیا جا چکا ہے اور جن کا اطلاق پشین، ژوب اور لورا لائی کے پٹھانوں اور بلوچ قبائل پر ہو چکا ہے وزیرستان میں بھی اسی طرح موثر ثابت ہوں گے۔ بظاہر یہ اصول سیدھا سادہ اور دانشمندی پر مبنی تھا کہ قبائل کے معاملات میں کامیابی درکار ہو تو قبائلی تنظیم سے کام لیا جائے اور قبائلی رہنماؤں کو اپنے انداز میں کام کرنے دیا جائے ہ الفاظ دیگر یہ بالواسطہ حکومت کا اصول تھا۔ لہذا بروس نے ہدایت کی کہ قبائلی ملک آگے لائے جائیں۔ قبیلہ میں ملک پہلے سے موجود تھے۔

چونکہ ڈیورینڈ کے معاہدہ کے تحت یہ بات واضح طور پر تسلیم

کرلی گئی تھی کہ محسود قبیلہ انگریزوں کے دائرہ اثر میں شامل ہے اس لئے طے پایا کہ بالواسطہ حکومت کا طریقہ اس قبیلہ میں بھی رائج کیا جائے ان ہی دنوں محکمہ تعمیرات عامہ کے ایک افسر کیلی (Kelly) کو ژوب میں اور ایک سوار اور چار سپاهیوں کو درۂ گومل میں گوالیری کوتل کے قریب قتل کیا گیا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ ان دونوں واقعات کا ذمہ دار پانچ محسود قبائلیوں کا ایک گروہ ہے جس میں سے دو عبدالرحمان خیل اور تین عبدالٰہی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ طویل مذاکرات کے بعد جن کی پشت پر برمتہ اور ذاتی اثر بھی کارفرما تھا بروس پانچوں مجرموں کو مقدمہ کے لئے جرگہ کے سامنے لانے میں کامیاب ہوگیا۔ محسود قبائل کے ساتھ معاملات میں یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جب مجرموں نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا تو ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں سات سال تک قید کی سزائیں دی گئیں لیکن یہ کامیابی عارضی تھی۔ محسود قبیلہ میں جو عناصر اس کارروائی کے مخالف تھے انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ قانون کے آگے سر جھکانا آزادی سے محرومی کی ابتدا ثابت ہوگا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ میدان عمل میں ان کا رہنما جگڑ اور صلاح و مشورہ کے میدان میں ملا پاوندہ تھا جو شبی خیل محسود تھا جو اسی زمانہ میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا تھا وہی اس مخالفت کا روح رواں تھا۔ ژوب میں کیلی کے قتل میں جگڑ کا بھی ہاتھ تھا اور اس کی قیادت میں ان ملکوں کو جنہوں نے قتل کے پانچ مجرموں کو قانون کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا تھا پورے قبیلہ کے غم و غصہ کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ ان میں سے تین ملک قتل کر دئے گئے دو کو وطن سے نکال دیا گیا باقی اپنی جان کے ڈر سے روپوش ہوگئے۔

بالواسطہ حکومت اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے حکومت کی طرف سے حمایت حاصل ہو اور جو قبائلی لیڈر حکومت کی مرضی کی مطابق کوئی کارروائی کرے اس کی پوری حفاظت کی جائے۔ محض یہ انتظام کافی نہیں تھا کہ قبائلی معاملات طے کرنے کے لئے ملک مقرر کئے جائیں۔ بلوچستان میں سنڈیمان کے طریقہ کے نفاذ کے ساتھ ساتھ چھاؤنیاں قلعے اور سڑکیں بھی تعمیر کی گئی تھیں اور قبائلی حاکموں کی مدد کے لئے اہم مقامات پر فوج بھیجنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بلوچستان ایک مفتوحہ علاقہ تھا۔ لیکن اس زمانہ میں وزیرستان محض پہاڑیوں کا

مجموعہ تھا جن میں راہگزر تک کا نام و نشان نہیں تھا ۔ جگڑ کی حرکت کے پیش نظر حکومت پنجاب نے جسے اس بات کا تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ سنڈیمان کے طریقہ کے لوازم کیا ھیں یہ سفارش کی کہ مجرموں سے نپٹنے کے لئیے تعزیری کارروائی کی جائے لیکن حکومت ہند نے جسے اس وقت معاھدہ ڈیورینڈ کے تحت سرحد کی نشان بندی کی زیادہ فکر تھی سنی ان سنی کر دی ۔ بروس کو ھدایت کی گئی کہ ''ملکوں کے قاتلوں کو خود قبائل سے سزا دلوانے کے لئے جرگوں کے ساتھ مذاکرات جاری رکھے جائیں،، اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔ اور اس طرح سنڈیمان کے طریقہ کا محسود پر اطلاق کرنے کی کوشش رائگان ثابت ہوئی ۔

ساتھ ھی ساتھ حکمت عملی میں تلون کا ثبوت دیتے ھوئے فیصلہ کیا گیا کہ وانا پر مستقل قبضہ کر لیا جائے ۔ وانا محسود علاقہ سے باھر احمد زئی وزیر قبیلہ کے علاقے میں واقع ھے ۔ وانا جاتے ھوئے بروس کو ملا پاوندہ کے کئی خطوط ملے جن میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ پانچوں مجرموں کو رھا کر دیا جائے اور وانا میں فوج متعین نہ کی جائے ۔ بروس نے یہ سوچتے ھوئے کہ وانا محسود علاقہ میں نہیں ھے یہ جواب دیا کہ وہ ملکوں کے سوا اور کسی سے گفت و شنید کرنے کو تیار نہیں ھیں ۔ اس کے بعد دو ھزار محسود قبائل نے وانا کیمپ پر شبخون مارا ۔ شمشیر زن قبائل کا ایک طاقتور گروہ جس کی قیادت جگڑ کر رھا تھا کیمپ کے قلب تک پہنچ گیا اور اس نے بڑا نقصان پہنچایا یہاں تک کہ دست بدست لڑائی کے بعد اسے پیچھے دھکیل دیا گیا ۔ اس لڑائی میں جگڑ بھی زخمی ھوا ۔ صبح ھوتے ھی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا کیونکہ شہسوار فوج نے پسپا ھوتے ھوئے قبائل کو جا لیا اور ان میں سے بہت سوں کو ھلاک یا زخمی کر دیا ۔ اس کے بعد ۹۵-۱۸۹۴ء میں جنگی مہم ھوئی جس کے نتیجہ میں محسود علاقہ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روند ڈالا گیا ۔ محسود قبیلہ کو شرائط پیش کی گئیں اور منوائی گئیں ۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ ڈیورینڈ لائن کی نشان بندی تک ملا پاوندہ کو محسود علاقہ سے نکال دیا جائے ۔ لیکن قبائل سے ملکوں کے قتل کا کوئی قصاص نہیں لیا گیا اور محسود علاقہ پر مستقل قبضہ کے لئیے کوئی کارروائی نہیں کی گئی ۔

بعد میں جگڑ بڑی عاجزی کے ساتھ انگریز افسروں کے ساتھ صلح پر آمادہ ہوگیا - یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جگڑ کچھ انگریز افسروں کا بڑا احترام کرتا تھا - اس نے ایک روز ہاوول سے کہا ''فیصلہ ایک ہی ہوسکتا ہے - یا تو فیلڈ ہونے دیجئے (۱) اور ہم سب کو توپوں سے اڑا دیجئے یا اٹھارہ ہزار کے اٹھارہ ہزار قبائل کو نواب بنا دیجئے،، جگڑ کا مطلب یہ تھا کہ تمام قبائل مساوی حیثیت کے مالک ہیں - ہر قبائلی ایک ہی جیسا ہے دو ہی راستے ہیں یا تو سب مرجائیں یا پورا قبیلہ عظمت کا مالک بنے - یہ سوچنا غلط ہے کہ چند قبائلی سردار پورے قبیلہ کی ترجمانی کر سکتے ہیں - کوئی بھی سر پھرا نوجوان سرداروں کے فیصلہ پر پانی پھیر سکتا ہے - یہ تو محسود قبیلہ کے جنگی لیڈر کی ایک جھلک تھی - اب یہ دیکھنا ہے کہ صلاح و مشورہ میں ان کے لیڈر کیسے تھے -

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ملا پاوندہ سب سے زیادہ سربر آوردہ لیڈر تھے - وہ استونئے شاخ کے شبی خیل علی زئی تھے کیونکہ یوسف زئیوں کے برعکس محسود قبائل کسی دوسرے کی اطاعت قبول نہیں کرتے محسود قبیلہ کے مذہبی پیشوا بھی محسود ہی ہوتے ہیں - ملا پاوندہ پہلی جنگ عظیم شروع ہونے سے ایک سال پہلے ۱۹۱۳ء میں فوت ہو گئے لیکن قبائل نے انہیں فراموش نہیں کیا - اب حالات بدل رہے ہیں لیکن ملا پاوندہ کے بیٹے فضل دین نے جو برائے نام ہی سہی اپنے باپ کی صفات کے مالک ہیں اس بات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے کہ قبائل کو ملا پاوندہ کے کارنامے یاد ہیں انگریزوں کے عہد کے آخر تک فضل دین ان عناصر کے لیڈر سمجھے جاتے تھے جو حکومت کے ساتھ کسی بھی شکل میں قریبی تعلقات کے مخالف تھے - ملا پاوندہ اپنے زمانہ میں اس جماعت کے قائد تھے جو کابل گئی تھی اور جس نے اس زمانہ کے امیر کے بھائی نصراللہ سے اس وعدہ پر رقم اور ذاتی حمایت حاصل کی تھی کہ قبائلی علاقہ کو انگریزوں کے اثر سے محفوظ رکھا جائے گا - قبائل کو انگریز افسروں کے قتل پر اکسانا

---

(۱) محسود پشتو میں فیلڈ سے مراد جنگ ہے - ۱۷۶۰ء میں احمد شاہ کا یہ اندازہ تھا کہ محسود قبیلہ اٹھارہ ہزار سپاہی میدان میں لا سکتا ہے - اب محسود تیس ہزار سے زیادہ سپاہی میدان میں لا سکتے ہیں - اس علاقہ میں کبھی مردم شماری نہیں ہوئی -

ملا پاوندہ کی سرگرمیوں سے خارج نہیں تھا ۔ دوسری طرف انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں نے ملا کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بڑا متضاد مذبذب اور توہین آمیز تھا کیونکہ کبھی اس کی خوشامد کی جاتی تھی اور کبھی دھتکار دیا جاتا تھا ۔ ایسے حالات میں کوئی بھی طاقتور اور خود دار دشمن ملا پاوندہ کی طرح زبردست رد عمل پر مجبور ہوتا ۔ اور محسود کے نزدیک کسی کو قتل کر دینا شرم کی بات نہیں ہے ۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ابتدا میں جب ملا پاوندہ نے سلسلہ جنبانی کی تو انہیں یہ کہہ کر دھتکار دیا گیا کہ ان کے ساتھ براہ راست بات چیت نہیں کی جا سکتی اور انہیں قبائلی ملکوں کی معرفت رجوع کرنا چاہئے ۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے ۔ پھر حکومت کو خیال آیا کہ ملا کو نظر انداز کرنے کی پالیسی غلط تھی اس کے بعد مقامی افسروں کو پہلے کے مقابلہ میں بالکل متضاد رویہ اختیار کرنا پڑا اب انہیں یہ دیکھنا تھا کہ آیا ملا کو حکومت کا دوست بنایا جا سکتا ہے اور انہیں مواجب قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے ۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح ملا کی معاندانہ سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی ۔ کافی پس و پیش اور ترغیب کے بعد ملا نے پیغام بھیجا کہ مواجب قبول کر لیا جائے گا بشرطیکہ رقم کی ادائیگی خفیہ رکھی جائے ۔ یہ کہنا بھی پورا کر دیا گیا اور ملا کے لئے جو مواجب منظور کیا گیا وہ اس وقت کے کسی بھی قبائلی ملک کے مواجب سے بھی تین گنا زیادہ تھا ۔ چند سال بعد ایک بار پھر ملکوں کے منہ پر چپت رسید کی گئی اور جب بروس کی جگہ مرک (Merk) نے لی تو محسود قبیلہ کے متعلق حکومت کی پالیسی بالکل بدل گئی ۔ شملہ کی سکریٹیریئیٹ کی طرف سے بڑی شان کے ساتھ یہ لکھا گیا کہ ''حکومت ہند کا خیال ہے کہ ابھی یہ بات تجربہ کے دور سے گزر رہی ہے کہ وزیرستان کے پٹھانوں سے نپٹنے کا بہترین طریقہ کیا ہے،، اندازہ کیجئے کہ جب ملا کو یہ بات معلوم ہوئی ہوگی تو اسے کتنا غصہ آیا ہوگا ۔ بہر حال اس متبذل فقرہ کی آڑ لے کر ملکی طریقہ ختم کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ مواجب پورے قبیلہ کو ادا کیا جائے ۔ اس مواجب کا نام ءتمان رکھا گیا ۔

اس فیصلہ کا بدیہی نتیجہ یہ تھا کہ مرک بہ حیثیت مجموعی پورے قبیلہ کے ساتھ معاملات طے کرنا چاہتے تھے گویا پورے قبیلہ کا اجتماع پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اس خیال کے حسن اظہار کے لئے پورے قبیلہ کے اجتماع کو لوئے جرگہ کا خطاب دے دیا گیا۔ ایک مبہم خیال یہ تھا کہ بلوچ کے برعکس پٹھان ایک سردار یا سرداروں کی ٹولی پر عام اجتماع کو ترجیح دیتا ہے اور وہ اس جمہوری برتاؤ کو پسند کرے گا۔ یہ بات فراموش کر دی گئی تھی کہ محسود کا لوئے جرگہ جو ایک منتشر گروہ ہے جس میں حاضرین کی تعداد کبھی پانچ ہزار سے کم نہیں ہوتی اور کبھی یہ تعداد اس سے دوگنی ہو جاتی ہے۔ ایتھنز جیسی عظمت حاصل نہیں کر سکے گا البتہ ایتھنز کے عام اجتماع کی طرح افراط تفریط کا مظاہرہ ضرور کرے گا اور اس میں ایک کلیون کی بجائے کئی دیوتا پیدا ہو جائیں گے۔ وہاں کوئی لیونل کرٹس موجود نہیں تھا جو مرک کو یا کرزن کو جو مرک کی ناقابل عمل اسکیموں کے موئید تھے یہ سمجھاتا کہ موجودہ عہد میں جمہوریت قبائلی نظام سے کہیں آگے نکل چکی ہے اور جمہوریت پر صرف نمائندہ اداروں ھی کے ذریعہ عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ مرک اور کرزن میں سے کوئی بھی یہ بات نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ قبائلی مختار یا وکیل کی حیثیت سے حکومت کے ساتھ معاملات طے کرنے کے لئے کسی نہ کسی شکل میں ملکوں کی موجودگی ضروری تھی۔

چنانچہ یہی ہوا کہ مرک کی واپسی سے صرف تین ماہ بعد جانسٹن (Johnston) نے یہ رپورٹ لکھ بھیجی کہ ان کے اصول ناقابل عمل ہیں اور اس طرح مرک کی سکیم پیدا ہونے سے پہلے مرگئی۔ یہ غیر معمولی بات نہیں تھی کہ قبیلہ کے تمام سربرآوردہ لوگ مرک کے بندوبست سے بے تعلق رہے اور تھوڑے سے تجربہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ کئی ہزار افراد کے ایک غیر منظم گروہ سے معاملات طے کرنا مہنگا ھی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جرگہ کی روایت یہی ہے کہ صلاح مشورہ کے وقت نظم و ضبط کا خیال رکھا جاتا ہے اور اخلاق و آداب میں جدید پارلیمنٹ جرگہ سے سبق سیکھ سکتی ہے (۱) لیکن ٹانک جیسے مقام پر

---

(۱) اس موضوع پر الفنسٹن نے لکھا ہے "قبائلی ملک پشتو بول رہے تھے۔ ہر
باقی صفحہ ۵۶ کے فٹ نوٹ پر دیکھئے

ھزاروں مسلح قبائل کی آمد سے امن و امان کو خطرہ لاحق ھو جاتا تھا۔ جیسا کہ دستور ھے اور ضروری بھی ھے جرگہ سے پہلے تمام ھتھیار حکام کے پاس جمع کرا دئے جاتے ھیں۔ اتنے بڑے پیمانہ پر یہ انتظام مشکل تھا اگر یہ انتظام ھو بھی جاتا تو ایک ھی قبیلہ کی مختلف شاخوں میں زبانی تکرار بعض مرتبہ شدید جھگڑے اور خونریز فسادات کی شکل اختیار کر لیتی تھی چنانچہ ملک پھر مقرر کئے گئے ، لیکن یہ عجیب حماقت کی گئی کہ ملا پاوندہ جس کی زندگی کا مقصد ھی یہ معلوم ھوتا تھا کہ ملکوں کو نیچا دکھایا جائے اسے ھدایت کی گئی کہ وہ پولیٹیکل تحصیلدار کے ساتھ مل کر یہ مشورہ دے کہ کس کس کو ملک بنایا جائے۔

جو لوگ محسود قبائل سے بخوبی واقف ھیں انہیں یہ معلوم ھے کہ اس قبیلہ کی تنظیم بڑی گہری اور مفصل ھے اور اس تنظیم کی بنیاد میراث ھے جو نکات کہلاتی ھے۔ پشتو میں یہ لفظ جس لفظ کا مشتق ھے اس کے معنی دادا کے ھیں۔ نکات کے معنی آل و اولاد لئے جاتے ھیں۔ اس سے بقول ھاوول وہ اٹل یا بہت ھی آھستہ آھستہ بدلنے والا قانون مراد ھے جس کے تحت پورے قبیلہ کے ھر نفع اور ھر نقصان میں ھر خیل ھر شاخ یہاں تک کے ھر گھرانے کا حصہ متعین کیا جاتا ھے۔ اسی طریقہ سے جس کا دوسرا نام قبائلی سر رشتہ (۱) ھے منافع تقسیم کیا جاتا ھے اور تاوان وغیرہ کا بوجھ مقرر کیا جاتا ھے۔ اس طرح نکات کے ذریعہ حکومت سے ملنے والی رقم یا مال غنیمت تقسیم کیا جاتا ھے اور حکومت کے ساتھ کسی معاھدہ یا دو فریقوں کے درمیان سمجھوتہ کے تحت جو جرمانہ عائد ھوتا ھے اس کے حصے مقرر کئے جاتے ھیں۔ نفع و نقصان کے عوامل کی وجہ سے نکات کا تصور ختم نہیں ھوا۔ نکات کے تحت اس بات

بقیہ از گزشتہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۵۹

مقرر بڑے پر اثر انداز میں اپنی رائے ظاھر کرتا تھا اور ھاتھوں اور چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اپنی بات کو اور زور دار بناتا تھا۔ جب ایک بولتا تھا تو باقی سب مؤدب اور خاموش رھتے تھے۔ ان کے یہ طریقے کسی بھی سنجیدہ اسمبلی کے لئے نمونہ کا کام دے سکتے" جن لوگوں نے جرگوں میں شرکت کی ھے وہ اس بیان کی صداقت کی گواھی دے سکتے ھیں۔ لیکن جرگوں میں صرف قبیلہ کے ملکوں اور معتبروں کو شریک ھونا چاھئے۔

(۱) سر رشتہ فارسی لفظ ھے جس کا لفظی مطلب ھے پرونے والا دھاگہ۔ باھمی ربط وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ھوتا ھے۔ اس لفظ کا مفہوم مبہم ھے۔

کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی کہ خاندان کی بنیاد پر کسے کس پر فوقیت حاصل ہے اور ہر محسود خاندان کی اصل پوزیشن کیا ہے قبیلہ کی چھوٹی اور بڑی شاخوں سے اس کا تعلق کیا ہے۔ پورے قبیلہ کا اس کی شاخوں اور مختلف شاخوں کا پورے قبیلہ سے کیا تعلق ہے۔ نکات پہلے کی طرح اب بھی ایک طرح کا قبائلی شجرۂ نسب ہے جس کے ہر تنے ہر شاخ پر ڈالی بلکہ ہر پتہ سے قبیلہ کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ایک درخت کی طرح اس شجرہ کی بھی نشو و نما ہوتی ہے نئے پتے نکلتے ہیں اور پرانے پتے جھڑتے رہتے ہیں اور یہ نظام آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے لیکن یہ نظام اتنا مظبوط ہے کہ اس سے مفر ممکن نہیں ہے۔

ملاؤں اور حکومتوں کے دعوے خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں نکات کے تحت ملکوں کی موجودگی ضروری ہے اور انہیں نظر انداز کر دینا ناممکن ہے۔ مرک کے جانشین ملکوں کو بحال کرنے پر مجبور ہوگئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طریقہ میں ردو بدل کر دیا گیا تاکہ نمائندوں کی حیثیت سے ملک بھی برقرار رہیں اور عوام کے لئے تمان کا طریقہ بھی رائج رکھا جا سکے۔ بعد میں خاصہ دار یا قبائلی پولیس کی بھرتی کا مقصد ہی یہ تھا کہ قبیلہ میں نکات کی پابندی کرتے ہوئے امن و امان قائم رکھنے کا صلہ عام قبائلیوں کو ملکوں کی نگرانی میں پہنچایا جائے۔ یہ کوشش سرے سے ناکام نہیں ہوئی۔ لیکن ایک اور مشکل پیدا ہوگئی۔ خاندان کی بنیاد پر نفع و نقصان کے متعلق قبائل کا تصور اتنا منجمد ہے کہ اس سے انحراف ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو محض کارکردگی کی بنا پر ترقی یا انعام دینا یا نااہلی کی بنا پر جرمانہ کرنا ناقابل عمل ثابت ہوا۔ محسود قبائل کو باقاعدہ فوج میں بھرتی کرنے کی راہ میں یہی سب سے بڑی دشواری تھی۔ اگر کسی مستحق فرد کو اس کے نکات کی پروا کئے بغیر ترقی دی جاتی تو غم و غصہ پھیل جاتا اور اس کے نتیجہ میں جو شخص اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا وہ یا تو فوج سے فرار ہو جاتا یا پھر خون خرابہ کی نوبت آتی۔ ھاوول نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ انگریز افسروں کو شروع ہی سے اس دشواری کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ ''اس وقت کے پولیٹیکل افسر نے ہزار چاہا یا اس بات کی کوشش کی کہ کوئی فائدہ یا منافع پورے قبیلہ میں مناسب طریقہ سے تقسیم کیا جائے لیکن آخرکار اسے کم و بیش قبائلی تصور

کی پابندی پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح بیشتر حالات میں کارکردگی کا کوئی صلہ نہیں ملتا تھا اور عدم مساوات کا بول بالا رہا''۔

حکومت کی پالیسی صرف ملکوں ھی کے معاملہ میں متلون نہیں تھی۔ حکومت اس بات پر مطمئن نہ تھی کہ مقامی افسر اس کی رھنمائی کریں بلکہ بعض مواقع پر عملی کردار ادا کرنا چاھتی تھی۔ جب جانسٹن نے دوبارہ ملک مقرر کر دئے تو حکومت نے اس بات پر اصرار کیا کہ ملا پاوندہ کی سر پرستی کی جائے چنانچہ ملا کو نہ صرف فیاضانہ الاؤنس اور زمین دی گئی جس کا مقصد (حکومت کے دعوے کے مطابق) اس کے اثر کو زائل کرنا تھا بلکہ اسی زمانہ میں مجوزہ ملکوں کی فہرست بھی نظر ثانی کے لئے ملا کے حوالہ کر دی گئی۔ بعد میں پالیسی پھر تبدیل ھوئی اور ملا کو جو فوائد حاصل تھے وہ سب کے سب منسوخ کر دئے گئے۔ اس کے علاوہ اور بھی تبدیلیاں ھوئیں مثلاً باقاعدہ فوج کا انخلا ملیشیا کا قیام ملیشیا سے محسود سپاھیوں کا اخراج بحالی اور دوبارہ اخراج، باقاعدہ فوج کے ذریعہ اس علاقہ پر دوبارہ قبضہ۔ اسکاؤٹس نام کی ایک نئی بے قاعدہ فوج کا قیام جس میں مقامی عناصر شامل نہیں تھے اور خاصہ داروں کا رواج۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ موقع پرستی کے اس دور میں کوئی مرکز تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا اور حکومت پر اعتماد غیر یقینی تھا اور جو اعتماد پیدا ھو رھا تھا اس کی رفتار سست تھی۔ یہ مقامی افسروں اور ان کے معاونوں کا حوصلہ تھا جس کی بدولت کام چلتا رھا۔

دوسری طرف بدلتے ھوئے حالات کے اس دور میں صرف ایک ھی شخص تھا جو اپنے مقصد سے پوری طرح باخبر تھا۔ یہ شخص ملا پاوندہ تھا۔ انگریزوں کے نقطۂ نظر سے یہ بڑا مشکل ھے کہ سوائے اس کے کچھ اور سمجھا جائے کہ ملا ایک چالاک اور بے اصول شخص تھا جو خاص مقصد کے لئے کسی کے قتل سے بھی نہیں جھجھکتا تھا۔ لیکن وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ ھاوول لکھتے ھیں ''انگریزوں کے سامنے جو معیار ھے اس پر ملا کے کردار کو نہیں پرکھا جا سکتا۔ جو لوگ اس ماحول کو سمجھتے ھیں جس میں ملا زندگی بسر کر رھا تھا وہ اس کا احترام کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ملا مستقل مزاج ضرور تھا لیکن یکسوئی

کے ساتھ کام نہیں کر سکتا تھا وہ محب وطن اور اپنے قبیلہ کی آزادی کا شیدا تھا۔ تمام انگریز افسر جنہوں نے کبھی ملا سے ملاقات کی ہے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جو بھی اس سے ملتا تھا وہ اس کے پرجوش کردار، مرعوب کن شخصیت اور دل میں گھر کرنے والی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ باوجودیکہ ملا نہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا تھا نہ اس نے تعلیم پائی تھی پھر بھی سرحد کی تاریخ میں اس کا اتنا بڑا حصہ ہے بلکہ اس تاریخ کے کئی ابواب اسی کے سوانح حیات پر مشتمل ہیں۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کبھی کوئی محسود ایسا جوہر قابل پیش نہیں کر سکا تھا جو محنت سے نکھر سکتا ہو۔ اگر خوش قسمتی سے ملا پاونده کسی اچھے زمانہ میں اچھے مقام پر پیدا ہوا ہوتا تو اس کا شمار عظیم المرتبت انسانوں میں ہوتا۔

اپنے ہم وطنوں کے نام وداعی خط میں جو ان کی وفات کے بعد جرگہ میں پڑھ کر سنایا گیا ملا نے انہیں نصیحت کی تھی کہ وہ اپنی قومیت برقرار رکھیں انگریز یا امیر کو اپنے وطن پر قبضہ نہ کرنے دیں باھمی اختلافات ختم کردیں اور لوٹ مار چھوڑ دیں تاکہ حکومت کو محسود علاقہ پر قبضہ کا بہانہ ہاتھ نہ آئے۔ خوشحال خان بھی اپنے ہم وطنوں سے یہی کہہ سکتا تھا۔ یا اگر محسود بھی یوسف زئیوں کی صفات اور نفاست کے مالک ہوتے تو ایسے لیڈر کی قیادت میں وہ بھی میاں گل کے سوات جیسی مستحکم ریاست کی بنیاد ڈال دیتے۔

محسود قبائل نے دو قوموں پر اپنے ہمسایوں پر بہت گہرا اور نمایاں اثر ڈالا۔ پہلے ۲۱-۱۹۱۹ء میں جبکہ برطانوی حکومت نے وزیرستان میں رزمک اور دوسرے مرکزی مقامات پر قبضہ کرنے کے لئے قطعی اقدامات کئے اور پھر ۱۹۲۹ء میں جبکہ نادر خان نے ان کی مدد سے کابل فتح کیا بچہ سقہ کو تخت سے اتار دیا اور ایک نئے حکمراں خاندان کے بانی کی حیثیت سے تخت پر بیٹھا۔ ان دونوں موقعوں پر صف اول میں محسود قبائل ہی تھے لیکن وزیر قبائل کے بڑے بڑے لشکر بھی ان کے ساتھ تھے۔

۱۹۱۹ء کی مختصر اینگلو افغان جنگ کے بعد ایک افغان بریگیڈئیر شاہ دولہ وزیرستان آیا اور اس نے امیر امان اللہ کی طرف سے قبائل کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ برطانوی حکومت عنقریب دریائے سندھ کے اس پار

کے علاقہ سے دست بردار ہونے والی ہے اور ہر سچے قبائلی کا یہ فرض ہے کہ وہ امیر کے جھنڈے تلے جمع ہو جائے سترو کہ چوکیوں پر قبضہ کرلے اور جہاں تک ہوسکے انگریزوں کو پریشان کرے۔ قبائلی علاقہ میں مہمات کے دوران انگریزوں نے وانا سے واپسی ضروری سمجھی تھی کیونکہ وہاں قبائل نے جدید قسم کی تقریباً بارہ سو رائفلوں اوز قریباً دس لاکھ کارتوسوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ محسود اور دوسرے قبائل یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب وہ جو چاہیں کریں کوئی ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوگا۔ چھ ماہ کے عرصہ میں آس پاس کے علاقہ پر قبائل نے ایک سو سے زائد حملے کئے اور ان جرائم کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا جن کا تدارک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی اور جوابی کارروائی ضروری تھی۔

جب حکومت نے کارروائی کا قطعی فیصلہ کر لیا تو یہ منصوبہ بنایا گیا کہ سابقہ نظیروں پر عمل کرتے ہوئے وادی تکی زام میں اس جگہ تک پیش قدمی کی جائے جہاں دوا توئے (سنگھم) کے مقام پر بدر دریا آکر ملتا ہے اور پھر اس مرکز سے کانی‌گرم اور مکین کے آس پاس ان مرکزی مقامات پر دباؤ ڈالا جائے جو پریغل پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں اور ضرورت پڑے تو پہاڑی علاقہ کے وسط میں رزمک کی سطح محدب پر قبضہ کرلیا جائے۔ محسود نے پوری طاقت سے اس پیش قدمی کی مخالفت کی انہیں وانا کے احمدزئی وزیر قبائل کی حمایت حاصل تھی۔ انگریزوں کو اپنا مقصد حاصل کرنے میں دو مہینے لگے اور یہ مقصد بھی اس شدید لڑائیوں کے بعد حاصل ہوا کہ سرحد میں اس سے پہلے ایسی لڑائیاں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ انگریز فوجوں کے مقابلہ میں قبائل کے پاس ہتھیاروں کی بڑی کمی تھی جو قبائل نے لوٹ مار کے ذریعہ بڑی حد تک پوری کر لی۔ انہوں نے وانا کا قلعہ بھی لوٹ لیا اور دوربین جیسے آلات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اھنائی تنگی کے تنگ مقامات کے لئے پانچ روز تک لڑائی جاری رہی جس میں بار بار دست بدست لڑائی کی بھی نوبت آئی۔ اور محسود قبائل نے نہ صرف آتشیں اسلحہ کے مفید اور ماہرانہ استعمال کا مظاہرہ کیا بلکہ یہ بھی ثابت کردیا کہ نئے ہتھیاروں کی ایجاد کے باوجود دست بدست لڑائی میں شمشیرزنوں کی حیثیت سے ان کی روایتی بہادری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انگریز فوج کے دو ہزار

سپاہی ہلاک زخمی یا لاپتہ ہوئے ان میں ہلاک شدہ ۴۳ افسر بھی شامل ہیں۔ قبائل کا اندازہ ہے کہ ان کی طرف ہلاک زخمی اور لاپتہ ہونے والوں کی تعداد اس تعداد کے دوگنا سے بھی زیادہ ہے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر انگریز فوج نے ناکہ بندی کر لی اور بڑے لیت و لعل کے بعد صلح ہوگئی جس کے نتیجہ میں (اتمان زئی وزیریوں سے بات چیت کے ذریعہ) رزمک پر قبضہ ہوگیا اور پورے علاقہ میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا (۱)۔

اس کے بعد انگریزوں نے وانا پر دوبارہ قبضہ کر لیا یہ اقدام اس لئے اہم ہے کہ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ قبائل کے ذہن میں قبائلی اتحاد کا کیا مفہوم ہے۔ جب وانا کے وزیر قبائل نے محسوس کیا کہ اب ان کے علاقہ پر قبضہ کی باری ہے تو انہوں نے محسود سے گزارش کی کہ جس طرح ہم نے ضرورت کے وقت آپ کی مدد کی تھی اسی طرح اب آپ ہماری مدد کیجئے۔ اس درخواست کا جو جواب دیا گیا وہ محسود کے کردار کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وزیر قبائل ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو اہنائی تنگی کی لڑائی سے پہلے ہی ہم انگریزوں سے صلح کر لیتے اور اس طرح اتنا جانی اور مالی نقصان نہ ہوتا۔ اس لئے ہم پر وزیر قبائل کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ ہمیں تو ان سے گلہ ہے لہٰذا ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے یہ جواب منزئی علی زئی کے مل خیل ملک مہر دل نے دیا تھا جن کی عمر اس وقت اسی (۸۰) سال سے زائد ہے اور جو پاکستان کی پارلیمنٹ میں محسود قبیلہ کے پہلے نمائندہ ہیں۔ اپنی تمام خشونت کے باوجود یہ ایک ایسا جواب تھا جو اس وقت محسود نے جن کی ترجمانی مہردل نے کی تھی بہت پسند کیا اور غالباً وزیر قبیلہ کا وفد بھی جسے یہ جواب دیا گیا ہوگا زہرخند کئے بغیر نہ رہا ہوگا۔ یہ جواب اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس سے حقیقت پسندی اور موقع شناسی پوری طرح عیاں ہے۔

۱۹۲۹ء میں نادر کے ساتھ محسود اور وزیر قبائل کے جو لشکر کابل گئے تھے کئی اعتبار سے ان کی کارگزاریاں اس سے بھی زیادہ اہم

---

(۱) رزمک وزیر اور محسود قبائل کے علاقوں کی سرحد پر واقع تھا جس پر محسود قبضہ کر رہے تھے۔ اس طرح وزیریوں سے مذاکرات کرنے میں سہولت ہوگئی۔

هیں کیونکہ اس موقع پر وہ غیر ملکی طاقت کے مقابلہ پر اپنے وطن کا دفاع نہیں کر رہے تھے بلکہ افغانستان کی حدود میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ ۱۹۲۸ء میں امان‌اللہ کی معزولی کے بعد ایک طالع آزما تاجک حبیب‌اللہ عرف بچہ سقہ کے ہاتھ طاقت آ گئی تھی اور نادر خان محمد زئیوں کے لئے تخت حاصل کرنے کی غرض سے فرانس سے واپس آئے تھے۔ وہ اور ان کے دو بھائی ہاشم خان اور شاہ ولی خان متحد تھے اور یہ مشہور کیا گیا تھا کہ وہ امان‌اللہ کی طرف سے تمام کارروائی کر رہے ہیں حال آنکہ اس بات پر اس وقت بھی پوری طرح یقین نہیں کیا گیا تھا۔ امان‌اللہ کی طرف نادر خان بھی درانیوں کے بارک زئی قبیلہ کے محمد زئی تھے اور امان‌اللہ کی طرح پائندہ خان کے اخلاف میں سے تھے لیکن ان کا رشتہ براہ راست نہیں تھا کیونکہ وہ دوست محمد کی اولاد میں سے نہیں بلکہ سلطان محمد خان کی اولاد میں سے تھے۔ نادر خان سلطان محمد کے پڑ پوتے تھے۔

جب نادر خان سرحد میں وارد ہوئے تو سب سے پہلے وہ کرم پہنچے جہاں سے انہوں نے افریدیوں اور اورک زئیوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن حکومت ہند نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ کرم پر حکومت ہند کا قبضہ تھا اس لئے اس نے تیراہ کے قبائل کو افغان علاقہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ پھر نادر خان محسود اور وزیر قبائل کی طرف متوجہ ہوئے جن میں سے کچھ قبائل کو اس سے پہلے امان‌اللہ انگریزوں کی دشمنی پر ابھار چکے تھے اور جن کی زمینیں ڈیورینڈ لائن کے پار افغان علاقہ میں تھیں۔ یہاں نادر خان کامیاب ہوئے اور بڑے بڑے لشکر ان سے آ ملے ان میں وزیرستان میں رہنے والے دونوں قبیلے بھی شامل تھے۔ ایسے بھی بہت سے وزیر قبائل ہیں جن کی مستقل سکونت ڈیورینڈ لائن کے پار افغانستان میں بیرمل اور دوسرے مقامات پر ہے۔ جو قبائل اس لائن کے اس پار انگریزوں کے علاقہ میں رہتے تھے انہیں حکومت ہند نے بار بار متنبہ کیا تھا کہ وہ افغانستان کے معاملات میں دخل نہ دیں لیکن انہوں نے اس انتباہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ یہی لشکر نادر خان کی فوج کا ہراول تھا۔ ان ہی قبائل نے نادر کے لئے کابل فتح کیا اور درانی خاندان کو دوبارہ تخت پر بٹھادیا۔ درحقیقت وہ اپنے زمانہ کے بادشاہ‌گر تھے۔ اس موقع پر جو سبق حاصل

هوا اسے ان قبائل اور سرحد کے دوسرے قبائل نے ابھی تک فراموش نہیں کیا۔ وہ یہ کہ جو لوگ کسی کو بادشاہ بنا سکتے ہیں وہ اسے تخت سے اتار بھی سکتے ہیں۔

جس وقت نادر خان نے کابل پر قبضہ کیا اس وقت ان کے پاس رقم نہیں تھی اور وہ ان لوگوں کو مناسب صلہ نہیں دے سکتے تھے جنہوں نے انہیں کامیاب کرایا تھا۔ جب محسود اور وزیر قبائل نے شہر کا ایک بڑا حصہ لوٹ لیا تو نادر خان کے لئے چشم پوشی کے سوا چارہ نہ تھا۔ ان قبائل کو افغان فوج میں اعزازی لیکن خالی عہدے بھی دئے گئے۔ جن قبائل کو لوٹ میں سے اتنا حصہ نہیں ملا جتنا کہ وہ اپنا جائز حق سمجھتے تھے وہ نادر کی طرف سے انعام نہ ملنے پر بڑے سیخ پا ہوئے۔ بعد میں جب نادر خان کچھ دوسرے عناصر کے ایما پر تخت پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈال دی تو لوٹ مار سے محروم ان قبائل اور کچھ دوسرے لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ انہوں نے اعلانیہ شکایت کی کہ ہم نے تخت نادر کے لئے نہیں بلکہ امان اللہ کے لئے حاصل کیا تھا جو نادر کا دور کے رشتہ کا بھائی تھا اور جس نے ایک بار نادر خان کو جلاوطن کر دیا تھا۔

اس رویہ کے پیش نظر محسود اور وزیر دونوں قبائل دغا بازوں کے ہاتھ میں موثر ھتھیار بن گئے۔ جو عناصر امان اللہ کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کے حامی ہیں وہ کئی بار ان قبائل کو ترغیب دے چکے ہیں کہ انہیں ۱۹۲۹ء میں جو کامیابی ہوئی تھی اس کا ایک بار پھر مظاہرہ کیا جائے کابل چل کر یحییٰ خیل کو ھٹا کر تخت کے جائز حقدار امان اللہ کو تخت پر بٹھایا جائے۔ (نادر خان کا خاندان ان کے دادا کے نام پر مشہور ہے۔ یحییٰ خان سلطان محمد کے فرزند تھے) اور ایک بار پھر کثیر مقدار میں مال غنیمت لے کر وطن واپس آیا جائے۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ نادر خان حیات تھے ان دونوں قبیلوں کا ایک طاقتور لشکر سرحد پار کر گیا اور اس نے خوست کے علاقہ میں متون کا محاصرہ کر لیا۔ حکومت ھند نے سرحد پر فوج بھیج کر اس لشکر کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہا لیکن یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ھوا اور جب تک حکومت ھند نے ان لوگوں کے گھروں پر بمباری نہیں کی جو لشکر میں شامل

تھے اس وقت تک لشکر منتشر نہیں ہوا۔ بعد میں نادر کو ۱۹۳۳ء میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال پیش آئی۔

اس سال جبکہ ہٹلر جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا مشرق وسطیٰ میں اس کے ایجنٹ افغانستان اور اس کے ساتھ سرحد میں گڑ بڑ مچانے کی تدبیریں تلاش کر رہے تھے تاکہ برطانوی حکومت ان جھگڑوں میں الجھی رہے اور اسے اس علاقہ میں بڑی تعداد میں فوج متعین کرنی پڑے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سرحد کے لوگ ماسوائے چند مستثنیات کٹر حنفی ہیں۔ وہ بغداد کے شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار کو بڑا مقدس سمجھتے ہیں جیلانی خاندان جس سے بغداد کے نقیب الاشرف کا تعلق ہے پیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خاندان پورے مشرق وسطیٰ میں پھیلا ہوا ہے۔ شام سے لے کر پاکستان تک ہر مسلم ملک میں گیلانی جیلانی اور جلانی پائے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کے سابق مفتی الحاج امین الحسینی جیلانی خاندان کے بہت سے لوگ اور کچھ دوسرے لوگ ہٹلر کے ایجنٹ تھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ رشید علی بھی جنھوں نے ۱۹۴۱ء میں عراق میں بغاوت کی قیادت کی تھی اسی خاندان سے تھے۔ جیلانی خاندان کے ایک شامی نوجوان کو وزیرستان بھیجا گیا۔ یہ نوجوان پہلے تو ایک بار حالات کا جائزہ لینے اور پھر ۱۹۳۸ء میں امان اللہ کی بحالی کی تحریک چلانے کے لئے وزیرستان آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کافی نقدی لے کر آیا تھا۔ اس نے کانی گرم کے قریب سکونت اختیار کی جہاں سے اس نے تبلیغ شروع کی۔ جلد ہی اس تبلیغ نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا آخر وہ بہت سے محسود قبائل اور کچھ وزیر قبائل کو ایک بار پھر کابل پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دلانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس موقع پر حکومت ہند نے پیر کو گرفتار کر کے قبائلی علاقہ سے باہر بھیجنے اور اس منظم لشکر کو منتشر کرنے کے لئے جو کابل روانہ ہو چکا تھا بڑی ثابت قدمی کے ساتھ ایک طرف تشدد اور دوسری طرف خوشامد (۱) سے کام لیا۔

---

(۱) اس خوشامد میں پیر شامی کو ایک بہت بڑی رقم کی نقد ادائگی بھی شامل تھی۔ لیکن اس وقت جبکہ جنگ عظیم چھڑنے والی تھی یہ قیمت زیادہ نہیں تھی۔

یہ پیر قبائل میں شامی فقیر کے نام سے مشہور تھا۔ کانی گرم میں سکونت کے دوران وہ ایک سید کی عبا پہنتا تھا اس نے ڈاڑھی رکھ چھوڑی تھی اور حلیہ مقدس لوگوں جیسا بنا رکھا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس نے ڈاڑھی منڈوا دی اور مغربی طرز کا سوٹ پہن لیا جس کا وہ عادی تھا۔ اس شامی پیر کی دونوں تصویریں ایک دوسرے سے اتنی مختلف تھیں کہ یہ سوچنا بڑا مشکل تھا کہ یہ ایک ہی آدمی کی دو تصویریں ہیں۔ مغربی لباس میں وہ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقہ کا ایک نوجوان فربہ اور چالاک باشندہ معلوم ہوتا تھا اور عبا و قبا میں الازہر کا فارغ التحصیل عالم دین دکھائی دیتا تھا جس کی داڑھی کافی لمبی تھی۔ اصل چیز داڑھی ہے اور محسود قبائل پر اس داڑھی کا بڑا اثر ہوا تھا۔

کابل کی حکومت کو ہمیشہ اس یقین دہانی کی ضرورت لاحق رہے گی کہ قبائل کو اس کے خلاف نہ اکسایا جائے۔ اگر قبائلی تحریک کو بیرونی امداد حاصل نہ ہو تو وہ اتنی شدید نہیں ہوتی کہ اس پر قابو نہ پایا جا سکے۔ محسود اور وزیر قبائل نے موجودہ حکمران خاندان کو تخت پر بٹھانے میں جو کردار ادا کیا ہے اسے وہ بھولے نہیں ہیں۔ ان کا جوش اور غصہ پشتونستان کے ڈھونگ سے فرو نہیں ہوسکتا اور وہ وقت آئے گا جب قبائل کو قابو میں رکھنے کے لئے کابل کو کراچی کی حکومت کی خیرسگالی درکار ہوگی۔ یہ صحت مند عمل نہیں ہے کہ شطرنج کے اس پرانے کھیل میں جو بادشاہ گردی کہلاتا ہے قبائل کو مہرے بنایا جائے۔

محسود جنگ کی طرح بحث میں بھی بڑا تیز ہوتا ہے اور میدان جنگ کی طرح دوسرے میدانوں میں بھی اس سے نپٹنا مشکل ہے۔ وہی شخص جس نے تمام دن محسود مہمانوں کے دلائل سنے ہوں اندازہ لگا سکتا ہے کہ محسود کی درخواست نامنظور کرنے کی کوشش سے کتنی تھکن ہو جاتی ہے اس کی باتوں کا معقول جواب دینے اور اس کی چرب زبانی کا جواب پیدا کرنے کے لئے کتنی جد و جہد درکار ہوتی ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ میدان جنگ کے نظم و ضبط اور قبائلی سررشتہ کی پوری پابندی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ایک محسود اچانک آپے سے باہر ہو جائے اور اس بات کی کوئی پروا نہ کرے کہ اس کی کسی حرکت

کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ لیکن دفتر سے باہر پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے یا سڑک پر جاتے ہوئے محسود سے زیادہ خوش طبع ساتھی کوئی نہیں ہوتا۔ وہ وداعی چائے پارٹیاں کسے یاد نہیں جن میں وہی لوگ جنہوں نے ہماری زندگی مہینوں بلکہ سالوں تک اجیرن بنا رکھی تھی اچانک ہمارے گرد آ کر جمع ہوگئے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملانے لگے اور 'سفر بخیر، کی دعا دینے لگے۔ ایسے موقعوں پر کچھ لوگ آبدیدہ بھی نظر آتے تھے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ ہماری ڈیوٹی ناقابل برداشت نہیں تھی۔ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ان مواقع پر محسود اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ انگریز سے پیچھا چھوٹ گیا لیکن یہ خیال غلط ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور قائم ہے۔

ہاوول لکھتے ہیں کہ ''سرحدی علاقہ کی ایجنسی ایک ایسی ذمہ داری ہے جو اس علاقہ میں متعین ہونے والے افسروں پر نہ صرف بھاری جسمانی اور ذہنی بلکہ اخلاقی دباؤ بھی ڈالتی ہے۔ بہترین فوجی دستہ کا بھی ہر افسر اپنے مزاج کے اعتبار سے اس قابل نہیں ہوتا یا اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو حالات کے رنگ میں ڈھال کر یہ ذمہ داری پوری کر سکے''۔ جو معدودے چند افسر اس علاقہ میں متعین ہیں ان میں سے بھی چند ہی ایسے ہیں جو یہ بوجھ طویل عرصہ تک برداشت کر سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ محسود قبائل کی تاریخ حکومت ہند کی پالیسی میں اتنا تلون ظاہر کرتی ہے۔

اس معاملہ میں پاکستانی افسروں کو جو ہمارے جانشین ہیں ہمارے مقابلہ میں کئی بہتر مواقع حاصل ہیں۔ یہ سب افسر پٹھان نہیں ہیں لیکن جو پٹھان ہیں وہ اس تکلف اور جبر کے بغیر جس سے ایک غیر ملکی ماہر لسانیات کو کام لینا پڑتا ہے محسود اور وزیر قبائل کی کرخت اور مشکل پشتو سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن زبان سمجھنا زیادہ اہم نہیں ہے۔ ایک محسود عقیدہ کے لحاظ سے شاذ و نادر ہی لکیر کا فقیر ہوتا ہے لیکن جہاں تک اس کے انداز فکر میلانات اور مکروہات کا تعلق ہے انہیں مسلمان افسر ہم سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں۔ پاکستانیوں کا دعویٰ ہے کہ اب 'پہلی سی' بات نہیں رہی اور قبائلی باشندے' حکومت

پاکستان کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے تعلیم کی سہولتیں فراہم کردی ہیں اب پورے قبائلی علاقہ میں ہائی اسکول اور مڈل اسکول قائم ہوچکے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قبائلی باشندے تعلیم میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہم اس معاملہ میں اپنا فرض ادا نہیں کر سکے۔ لیکن سب سے زیادہ جرأت مندانہ تجربہ یہ ہے کہ قبائل کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں پارلیمانی نمائندگی دی گئی ہے۔ اس اقدام کی خوبی پر شبہات بھی ظاہر کئے گئے ہیں لیکن یہ واضح ہو چکا ہے کہ روش عام سے ہٹ کر نئی راہ تلاش کرنے کی اس کوشش کو خود قبائل نے پسند کیا ہے۔ اب انہیں یہ توقع ہے بلکہ ان کا یہ مطالبہ ہے کہ حکومت میں بھی ان کی آواز ہو۔ قبائلی نمائندے منتخب ہو چکے ہیں اور مجالس قانون ساز کی کارروائیوں میں حصہ بھی لے چکے ہیں۔ پھر بھی طریقۂ انتخاب محض تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ابھی یہ دیکھنا ہے کہ اسے کیسا ٹھوس شکل دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آباد ضلعوں میں انتخابی فہرستوں، پولنگ سٹیشنوں، بیلٹ بکسوں اور باقی جن ذرائع سے کام لیا جاتا ہے وہ ان لوگوں پر مسلط نہیں کئے جا سکتے جنہوں نے نظم و نسق کی پابندیاں کبھی برداشت نہیں کیں۔

اس سلسلہ میں جن دشواریوں کا سامنا ہو گا ان کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک دشواری تو یہی ہے کہ انتخابی حلقہ بندی کس طرح کی جائے گی۔ پہلے یہ خیال تھا کہ جنوبی وزیرستان میں جہاں محسود اور وانا وزیر قبائل رہتے ہیں پوری ایجنسی کو ایک انتخابی حلقہ بنا دیا جائے اور یہاں سے مغربی پاکستان کی اسمبلی کے لئے دو ممبر منتخب کئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ممبر محسود قبائل میں سے منتخب ہوگئے اور وانا کا کوئی وزیر انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے محسود نسبتاً زیادہ طاقتور اور با اثر قبیلہ ہے۔ وانا کے وزیریوں نے اس انتخاب کا نتیجہ ایسے صبر و شکر کے ساتھ نہیں سنا جس طرح ۱۹۲۰ء میں انہوں نے ملک مہر دل کو انگریزوں کے خلاف ان کی مدد کو آنے سے انکار کرتے سنا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ قبائلی علاقوں میں جہاں قبائلی جذبہ زندہ ہے جہاں تک ممکن ہو انتخابی حلقوں کی حدیں مختلف قبائل کے علاقوں کی حدود کے

ساتھ ساتھ ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ ان قبائل میں ووٹ کس طرح ڈالے جائیں گے جہاں کبھی مردم شماری نہیں ہوئی موت اور پیدائش درج نہیں کی گئی، خاصہ داروں کے سوا کوئی پولیس نہیں ہے اور انتخابی فہرستوں کے متعلق دعووں اور اعتراضات کی سماعت کے لئے غیر جانبدار حکام نہیں ہیں۔ اور ان انتخابات میں رائے دینے کا حق کس بنیاد پر دیا جائیگا۔ ایسی آبادی میں جس میں ہر بالغ مرد سر سے پاؤں تک مسلح ہو پرامن انتخاب کی کیا ضمانت۔ نئے تجربہ کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس قسم کی عملی دشواریاں دانشمندی کے ساتھ دور کر دی جائیں۔

یہ موقع ہے کہ قبائلی تنظیم کے متعلق پٹھانوں کے تصور کو نمائندہ اداروں کے متعلق مغرب کے تصور سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ جہاں کہیں قبائلی نظام رائج ہے اسے چلانے کے ذمہ دار ملک اور اکابر ہیں جو مجلس شوریٰ کی حیثیت سے جمع ہوتے ہیں اور ان کے گرد وہ تمام نوجوان جنگجو ہوتے ہیں جنہیں ان کی موجودگی یا شخصیت کی بنا پر کسی اعتراض کے بغیر مجلس میں بٹھا لیا جاتا ہے۔ اہم معاملات میں ایسی مجلس شوریٰ پورے قبیلہ کی نمائندگی کر سکتی ہے اور چھوٹے معاملات طے کرنے کے لئے اس کی نمائندگی ایک خیل یا اس کی بھی چھوٹی یا بڑی شاخ تک محدود ہوتی ہے۔ یہ اجتماع جرگہ کہلاتا ہے۔ مروجہ طریقہ یہ ہے کہ جرگہ جو فیصلے کرتا ہے ان کی مخالفت نہیں کی جا سکتی بلکہ ان کی پابندی سب پر لازم ہوتی ہے۔ اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کی بات سنی ضرور جاتی ہے لیکن جب تک اقلیت کی دلیل یا اس کے نمائندہ کی شخصیت اتنی بااثر نہ ہو کہ پورے جرگہ کو اپنا ہم نوا بنا لے مخالفانہ رائے کو جوش بیان، ایک طاقتور یا با اثر نمائندہ کی شخصیت کے اثر اور اگر ان ذرائع سے بھی کام نہ چلے تو طاقت یا طاقت کی دھمکی کے ذریعہ دبا دیا جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ سب کچھ برسر عام ہوتا ہے اور اس میں خفیہ طور پر رائے دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اگر ایک محسود جرگہ سے کہا جائے کہ وہ تھانہ میں آکر ووٹ دے یا ہاتھ اٹھا کر بتائے کہ ان میں کون ایک امیدوار کو

منتخب کرنا چاہتے ہیں اور کون دوسرے کو، تو پورا جرگہ پولنگ افسر کے لئے درد سر بن جائیگا۔ یہ طریقہ قبائلی رسم و رواج کے بھی منافی ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ قبائل کے رسم و رواج کو کام میں لایا جائے مطلب یہ ہے کہ پورے قبیلہ کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ اپنے طریقہ سے اپنے نمائندے منتخب کر لے۔ نمائندے منتخب کرنے کے بعد پورا قبیلہ واپس آ کر بتائے کہ "یہ ہمارا آدمی ہے" پہلے سال محسود علاقہ میں اسی سے ملتا جلتا طریقہ استعمال کیا گیا اور یہ کارگر ثابت ہوا۔ اس طریقہ سے ہر قبیلہ کی ذمہ داری طے ہو جائے گی۔ اس بات کا بھی بندوبست ہو جائے گا کہ صرف خاص عناصر کی بجائے پورے قبیلہ کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع ملے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر کوئی جھگڑا ہوا تو وہ انتخاب کے سوال پر نہیں ہوگا۔

ان تمام خطرات کے باوجود میرا یہ خیال ہے کہ قبائل کو نمائندگی دینے کی تجویز مستقل حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ معاملات ہیں جن میں کراچی کو کابل پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ افغانستان کی کوئی حکومت ایسا طریقہ رائج کرنے کا تصور کر سکتی ہے یا رائج کرنے کی اہمیت رکھتی ہے۔ افغانستان کا لوئے جرگہ ایک جاگیردارانہ اجتماع کا نام ہے۔ قبائل کو نمائندگی دینے کا تصور ایکسو سال تک مشرق اور مغرب کے خیالات کی باہمی اثر اندازی کا نتیجہ ہے اور یہ صورت ایکسو سال تک سرحد کے باشندوں کے ساتھ انگریزوں کے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ محسود جیسے قبائل ہمارے خلاف کتنی ہی بہادری سے کیوں نہ لڑے ہوں دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے لگاؤ اور یاد باقی ہے جو نیا دور شروع ہونے پر بھی ختم نہیں ہوئی۔ اس بنیاد پر پاکستان اور محسود اپنے وسائل سے کام لے کر شاندار عمارت بنا سکتے ہیں اور میرا خیال ہے یہ کام اتنے اعتماد سے ہوسکتا ہے جو غیر مسلموں کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے انہیں اپنے پیش رووں کی غلطیوں سے سبق لینا چاہئے اور پالیسی میں ایسا تلون نہ ہونے دیا جائے جو فوری فائدہ کی خاطر اصل مقصد کو نظر انداز کردے۔ ہاوول نے آخر میں کہا ہے کہ "ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ پتوار کو ذرا سا ادھر ادھر موڑنے سے جہاز کا رخ کتنا بدل جاتا ہے"۔

فصل بست و پنجم

شمال مغربی سرحدی صوبہ

جب ہم خود اپنے عہد کے قریب پہنچتے ہیں تو پوری صورت حال پر کماحقہ نظر ڈالنا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے یہی سوچتے ہوئے کہ آج کی تمام تحریکیں اور رجحانات پوری کہانی کے آخر میں بے ترتیبی کے ساتھ ذہن پر بوجھ نہ بنیں یہ مناسب سمجھا کہ کہانی کے ساتھ ساتھ موقع بہ موقع ان کا تذکرہ کرتا رہوں۔ لیکن ابھی ایک اعلیٰ اور اہم تصور باقی ہے جس کی طرف اس کتاب میں متعدد بار اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن جس پر براہ راست بحث نہیں کی گئی۔ اور وہ مسئلہ پٹھانوں کے قومی احساس کا ہے اور یہ ہے کہ سیاسی میدان میں اس کے اظہار کے لئے اسے کیا شکل دی جائے۔

۱۹۰۱ء میں پٹھانوں کا ایک علیحدہ صوبہ قائم کیا گیا اور ۱۹۵۵ء میں اسے ایک بار پھر ایک بڑی وحدت میں ضم کر دیا گیا۔ اس تضاد کو پس منظر میں رکھتے ہوئے ان تحریکوں، واقعات اور شخصیات کو جو ایک دوسرے سے الگ ہیں ہم ایک عظیم تر مقصد کا ہم آہنگ بنا سکیں گے اور گزشتہ نصف صدی کی پوری تصویر پر بہ یک وقت نظر ڈال سکیں گے۔

۱۸۹۹ء میں کرزن کے وائسرائے بن کر ہندوستان آنے سے بہت پہلے یہ محسوس کیا جا چکا تھا کہ شمال مغربی سرحد کو پنجاب میں شامل رکھنا متضاد رجحانات کا حامل تھا۔ اس لئے کہ دریائے سندھ کے پار کے علاقہ میں صرف آباد اضلاع ہی شامل نہ تھے جن کے متعلق یہ

دعویٰ کیا جا سکتا تھا کہ ان کا نظم و نسق اعلیٰ حکام کے ہاتھ میں رکھنا کئی اعتبار سے مفید ہے بلکہ اس میں قبائلی علاقہ بھی شامل تھا جہاں ایک غلط قدم اٹھانے سے نہ صرف ہندوستان کی مرکزی حکومت بلکہ لندن کی حکومت پر ذمہ داری عائد ہو جاتی تھی۔ ابتدا میں جب قبائل کے ساتھ تعلقات کی ذمہ داری افسران ضلع کے سپرد تھی اور بین الاقوامی سرحد کی وضاحت نہیں ہوئی تھی تو پالیسی کا یہ تضاد عیاں نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں بھی وسطی ایشیا میں روس کی پیش قدمی کے پیش نظر لٹن نے ۱۸۷۷ء میں ایک اسکیم تیار کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی حکومت کو سرحد کے نظم و نسق اور پالیسی کے متعلق براہ راست زیادہ اختیارات دئے جائیں اور قبائلی ہمسایوں کے ساتھ آباد اضلاع کے تعلقات بہتر بنائے جائیں۔ ایک موقع پر لٹن نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ پشاور سے ساحل سمندر تک ایک عظیم سرحدی صوبہ بنا دیا جائے۔

دوسری افغان جنگ کی وجہ سے یہ تجویزیں بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ لیکن جب بلوچستان پر قبضہ ہو گیا (کوئٹہ ابتدا ہی سے مرکز کے زیر نگرانی تھا) اور پھر اس کے بعد جب خیبر، کرم، وزیرستان کے کچھ حصوں اور مالاکنڈ پر بھی قبضہ ہوگیا تو برطانوی دماغ بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ سرحد کے متعلق پالیسی غیر منطقی اور بے ترتیب ہے۔ اس سے پہلے مالاکنڈ کی طرف بڑے پیمانہ پر پیش قدمی سے جو ریاستیں اور قبائل متاثر ہوئے تھے ۱۸۹۵ء میں ان کا نظم و نسق ایک ایسے افسر کے سپرد کیا گیا تھا جو براہ راست حکومت ہند کے تحت تھا پھر ۹۸-۱۸۹۷ء میں قبائل کی بغاوت کے دوران جو تجربات ہوئے ان سے منطقی پالیسی اختیار کرنے کے حامیوں کے دلائل اور وزنی ہوگئے۔ ۱۸۹۹ء میں کرزن کا انتھک اور جوان ذہن (اپنے تقرر کے وقت کرزن کی عمر صرف انتالیس سال تھی) اس مسئلہ میں الجھا ہوا تھا جسے ابھی تک حل نہیں کیا گیا تھا۔ اور ۹ نومبر ۱۹۰۱ء کو بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر شمال مغربی سرحدی صوبہ معرض وجود میں آ گیا (۱)۔ دریائے سندھ کے پار کے چار اضلاع پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان دریا کے دوسری

---

(۱) برطانوی حکومت نے ۱۹۰۰ء میں یہ اسکیم منظور کر لی تھی۔ اس علاقہ کی علیحدگی کی انتظامی تفصیلات طے کرنے میں قریباً ایک سال گزر گیا۔

طرف کے پانچویں ضلع ہزارہ کے ساتھ پنجاب سے الگ کر دئے گئے۔ نیا صوبہ ان ہی اضلاع پر مشتمل تھا۔ ان ہی اضلاع سے متصل اور ایک ہی حاکم کے تحت پانچوں پولیٹیکل ایجنسیاں اور ڈیورینڈ لائن تک دوسرے قبائلی علاقے بھی تھے جن کا انتظام اب تک انسران ضلع کے سپرد تھا۔ بلوچستان کی طرح نئے صوبہ کا نظم و نسق ایک چیف کمشنر کے سپرد کیا گیا جو بہ یک وقت ان ضلعوں کا بھی حاکم اعلیٰ تھا اور قبائلی علاقہ کا سیاسی کنٹرول بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ چیف کمشنر مرکزی حکومت کے تحت تھا۔ اس عہدہ کے لئے جس افسر کو چنا گیا وہ ہیرلڈ ڈین تھے جنھوں نے مالاکنڈ ایجنسی بنائی تھی۔

اس تبدیلی کا پٹھانوں پر جو اثر ہوا وہ زیادہ واضح نہیں ہے۔ لیکن انگریزوں کے لئے نئے صوبہ کا قیام آسان نہیں تھا۔ کرزن کے زمانہ میں صورت حال یہ تھی کہ ۱۸۹۷ء کی گڑ بڑ کے بعد برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ پنجاب کو تقسیم نہیں کیا جائیگا۔ حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ پشاور اور ڈیرہ جات کے کمشنر حکومت پنجاب کے تحت رہیں گے اور روز مرہ کے نظم و نسق کے بارے میں اسی حکومت سے ہدایات حاصل کر لیں گے لیکن آباد اضلاع سے آگے قبائل کے ساتھ تعلقات کے بارے میں کمشنر براہ راست مرکزی حکومت کے تحت کام کریں گے۔ کرزن اس پالیسی کو دانشمندی سے بعید سمجھتا تھا۔ وائٹ ہال (White hall) کے نام متعدد خطوط میں اور پھر ایک ایسی تفصیلی رپورٹ میں جیسی کسی اور گورنر جنرل نے نہیں لکھی کرزن نے ان لوگوں کے تمام دلائل پر پانی پھیر دیا جو صورت حال کو جوں کی توں قائم رکھنے کے حامی تھے۔

کرزن نے اپنا مقدمہ مخصوص انداز میں مرتب کیا۔ اس نے نشانہ کی سمت کا اندازہ کرنے کے لئے پہلا تیر چلایا پھر موقع بہ موقع نشانہ پر تیر مارے اور آخر میں تیروں کی بوچھار کر دی۔ اس نے ۵ اپریل ۱۸۹۹ء کو لکھا "وائسرائے فرنٹیر پالیسی کا ذمہ دار ہے لیکن وہ یہ پالیسی ان افسروں کے ذریعہ نہیں چلاتا جو براہ راست اسی کے تحت ہیں بلکہ باقاعدہ ایک صوبائی حکومت کے تحت چلاتا ہے جس کے نزدیک سرحد اور اس کے مسائل محض فروعی ہیں۔ یہ صوبائی حکومت بچولیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام حالات میں سرحد کا کام حکومت پنجاب

کرتی ہے اور مرکزی حکومت کی مداخلت کے بغیر خود ہی پالیسی چلاتی ہے لیکن غیر معمولی حالات میں سارا انتظام حکومت سنبھال لیتی ہے اور ان ایجنٹوں کے ذریعہ کام کرتی ہے جو اس کے اپنے نہیں ہیں۔ ایسے موقعوں پر حکومت پنجاب جس سے اختیار چھن جاتا ہے اور جو کبیدہ خاطر ہوتی ہے الگ تھلگ رہتی ہے اور حکومت ہند کے ہر اقدام پر نکتہ چینی کرتی ہے۔

کرزن کو اپنا مقدمہ مرتب کرنے میں پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر میک ورتھ ینگ (Mackworth Young) کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا (۱)۔ انہوں نے نومبر ۱۸۹۹ء میں شکایت کی ہے کہ میں نے واشگاف الفاظ میں پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر کو سرحد کے مسائل کے متعلق اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا ہے لیکن لفٹیننٹ گورنر نے جو کرزن کے تحت تھا جواب میں طویل اور بحث طلب دلائل پیش کئے تھے جس پر وائسرائے کو بڑا غصہ آیا وہ تلخی کے ساتھ لکھتے ہیں ''میں اس نظام کے تحت کام نہیں کر سکتا۔ میں اپنے لفٹیننٹ گورنروں کے ساتھ گھنٹوں یہ بحث نہیں کر سکتا کہ سرحد کے متعلق میری پالیسی کے چھوٹے سے چھوٹے پہلو کا اصل مطلب، مقصد، گنجائش، اصلیت نوعیت، ممکنہ پابندیاں اور قابل قیاس نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ جان بوجھ کر اس پالیسی کو سمجھنے سے انکار کردیں اور اس پر عملدرآمد میں پس و پیش اور بحث تکرار کریں تو پھر مجھے ایک ایسا ذہین افسر دیا جائے جو میرا مطلب سمجھ سکے اور میری بات ماننے کو تیار ہو،، وہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ''حکومت ہند نے اپنی ناواقفیت محسوس کرتے ہوئے کہ اس طرح خطرہ دوگنا ہو جائے گا اپنے اور سرحد کے درمیان حکومت پنجاب کو ڈال دیا ہے جو بیشتر حالات میں مرکزی حکومت کے مقابلہ میں کم واقفیت رکھتی ہے اور جو بیس سال سے تاخیر رکاوٹ اور کمزوری کا باعث بنی ہوئی ہے،،۔

اور اب ہم ۱۳ ستمبر ۱۹۰۰ء کی رپورٹ میں توپوں کی گھن گرج

---

(۱) ۱۹۲۰ء تک ہندوستان میں صرف مدراس بمبئی اور بنگال کے گورنر ہوتے تھے۔ پنجاب کا حاکم اعلیٰ لفٹیننٹ گورنر ہوتا تھا۔ اس کے بعد پنجاب سمیت تمام بڑے بڑے صوبوں کے گورنر مقرر کر دئے گئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے چیف کمشنر کو ۱۹۳۲ء میں ترقی دے کر گورنر بنایا گیا۔

سنتے ھیں۔ یہ تحریر بڑی دلکش ھے اور محض اسی نقطہ نظر سے اس پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ھے۔ مرعوب کن فقرے اس طرح شروع ھوتے ھیں ''مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دنیا میں کوئی اور ملک ایسا نہیں ھے جس نے نظریہ کے اعتبار سے اتنا غیر منطقی اور عمل کے اعتبار سے ایسا پیچیدہ نظام اختیار کیا ھو کہ اپنے وزیر خارجہ اور سرگرمیوں کے اھم ترین میدان کے درمیان نہ صرف ماتحت افسر کو بٹھا رکھا ھو بلکہ ماتحت حکومت محض اس جغرافیائی جواز کی بنیاد پر بٹھا رکھی ھو کہ یہ حکومت موقع محل کے قریب ھے۔ جب ھم اس حقیقت پر نظر ڈالتے ھیں کہ سال میں پانچ مہینے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کا صدر مقام ایک ھی شہر شملہ ھوتا ھے تو یہ جواز ختم ھو جاتا ھے''۔ اس کے بعد کرزن کے دلائل نقطۂ عروج پر پہنچتے ھیں۔ ''اس نظام میں ذمہ داریوں کو گھٹا کر ظاھر کیا گیا ھے لیکن اس سے حکومت ھند کی قطعی ذمہ داری کم نہیں ھوتی۔ اس میں تاخیر تو ھوتی ھے لیکن اس کے نتیجہ میں اصل اقدام کو تقویت نہیں پہنچتی اس میں وزیر خارجہ اور ماتحت ایجنٹوں کے درمیان کوئی سفیر وزیر یا کونسل مقرر نہیں ھے بلکہ ایک لوکل گورنمنٹ کی مکمل مشینری اور لفٹیننٹ گورنر کی اعلیٰ شخصیت حائل ھے۔ اس نظام پر بڑی وفاداری اور احساس فرض کے ساتھ عملدرآمد ھوتا رھا ھے پھر بھی یہ نظام رنجش، اختلاف رائے، پالیسی کے تلون، حد سے بڑھی ھوئی مرکزیت اور لامتناھی تاخیر کا باعث بنا رھا ھے''۔

اس زور بیان کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا برطانوی حکومت ان کی تاب نہ لا سکی۔ حکومت نے بڑے وقار کے ساتھ کرزن کی بات مان لی اور نئے صوبہ سرحد کے قیام کی منظوری دے دی۔ لیکن کرزن نے اپنی تجاویز سکرٹری آف اسٹیٹ کو بھیجنے سے پہلے سرکاری طور پر پنجاب کے گورنر سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ جیسا کہ ان کے سوانح نگار(۱) نے لکھا ھے انہیں یہ خیال ھی نہ آیا کہ بقول ان کے ''حریف کو بالکل پامال کرنے کا'' ایک حساس طبیعت پر کیا اثر ھوگا کرزن نے ایک موقع پر بڑے سرپرستانہ انداز میں میک ورتھ ینگ کے متعلق لکھا تھا کہ ''وہ بڑے باعزت اور ذھین ھیں ان میں احساس فرض کوٹ

(۱) THE LIFE OF LORD CURZON' By Ronaldshay

کوٹ کر بھرا ہے اور ان کے اطوار بڑے پسندیدہ ہیں''، لیکن انہوں نے گورنر کے خیالات معلوم کرنے اور انہیں قلم بند کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ میک ورتھ نے اس حرکت کو سوچی سمجھی توہین سمجھا اور وہ اس پر بہت خفا ہوئے۔ یہ بات آداب کے خلاف تھی کہ ایسی انقلابی تجویز متاثرہ صوبہ کے سربراہ سے مشورہ لئے بغیر اوپر بھیج دی جائے۔ انہوں نے لکھا ''آپ نے اس علاقہ میں سے جس کے نظم و نسق پر ہر میجسٹی نے مجھے مامور کیا ہے نئی انتظامی وحدت بنانے کے متعلق مجھ سے مشورہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کی''۔

اس واقعہ کو پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی جب پہلی مرتبہ پنجاب سے میرا رابطہ قائم ہوا وہاں ایسے بہت سے لوگ تھے جو اس معاملہ میں کرزن کے شدید مخالف تھے۔ جن دنوں یہ واقعہ پیش آیا ان دنوں جذبات اتنے برانگیختہ تھے کہ دھلی کے کمشنر فنشا (Fanshawe) نے اس بنیاد پر استعفا دے دیا کہ تنگ نظری سے کام لیتے ہوئے صوبائی حکومت کی ایسی توہین کی گئی ہے جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس افسر نے اپنی حکومت کی عزت کی خاطر اپنی ملازمت کو قربان کر دینا اپنا فرض سمجھا۔ بےرحم نقادوں نے اشارتاً الزام لگایا ہے کہ فنشا کے مستعفی ہونے کا سبب کچھ اور ہی تھا جو جذبۂ ایثار پر مبنی نہیں تھا لیکن ان نقادوں نے زیادتی کی ہے۔ اس وقت یہ شدید احساس پایا جاتا تھا کہ صوبائی حکومت کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور دھلی کے کمشنر نے اسی احساس کا اظہار کیا تھا۔

ہم لوگوں کے لئے جو آج زندہ ہیں اس واقعہ کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ نظم و نسق کے آداب کی خلاف ورزی کی گئی تھی یا اس کی وجہ سے دو اعلیٰ حکام کے درمیان رنجش پیدا ہوگئی تھی بلکہ اہمیت یہ ہے کہ اصل دلائل تفصیل کے ساتھ معرض تحریر میں لائے ہی نہیں گئے۔ مختصراً پنجاب سے سرحد کی علیحدگی کے حامیوں کی دلیل یہ تھی کہ سرحد اتنا اہم علاقہ ہے کہ اس کی ذمہ داری ایک ایسے صوبائی گورنر کے فرائض کا ایک حصہ نہیں بن سکتی جو عام طور پر اس علاقہ کی خصوصیات اور ضروریات سے ناواقف ہوتا ہے اور اس وقت جو نظام رائج تھا اس کی وجہ سے ان معاملات میں بھی تاخیر ہوتی تھی جن

میں تاخیر کی گنجائش نہیں تھی۔ اس دلیل کی پشت پر یہ احساس کارفرما تھا کہ قبائلی امور کا نظم و نسق خارجہ پالیسی اور نازک سرحدوں کے دفاع سے اس طرح وابستہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ میک ورتھ کی دلیل جو نظم و نسق کے آداب کی خلاف ورزی کی تہمت کی وجہ سے بودی ہو کر رہ گئی یہ تھی کہ آزمودہ نگرانوں کے فقدان کی وجہ سے سرحد کے نظم و نسق پر بڑا خرچ آئے گا اور کارکردگی ٹھیک نہیں ہو گی۔ اس کے علاوہ یہ رجحان پیدا ہو گا کہ قبائل اور افغانستان کے متعلق پالیسی کے تقاضوں کو آباد اضلاع کے حقوق سے زیادہ پیش نظر رکھا جائے گا۔

پنجاب کی طرف سے جو دلائل پیش کئے گئے تھے وہ یقیناً مبالغہ آمیز تھے۔ ان دلائل کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ نظم و نسق کے معاملہ میں پنجاب سے جو بھی علیحدگی اختیار کی جائے گی اس کا نتیجہ برا ہوگا اور نظم و نسق کا معیار گر جائیگا۔ اس رویہ سے خودپسندی کی بو آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ نئے نظم و نسق کے کاڈر مختصر تھے لیکن اس نقص کی تلافی بڑی حد تک اس طرح کر دی گئی تھی کہ یہ کاڈر پولیٹیکل سروس کے عام کاڈر میں شامل کر دئے گئے تھے (۱)۔ باقی دلائل کے جواب میں یہی بتا دینا کافی ہے کہ فرنٹیر سروس کی کشش نے نہ صرف پنجاب سے بلکہ دوسرے صوبوں اور ہندوستان کی دوسری سروسوں سے بہت سے بہترین آدمیوں کو کھینچ بلایا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اس زمانہ میں جب سرحد پنجاب سے الگ نہیں ہوا تھا سرحد میں گنتی کے ان ہی چند افسروں نے نام پیدا کیا۔ جو اپنی ملازمت کے دوران زیادہ عرصہ سرحد میں رہے اور جنہوں نے یہاں کے لوگوں کے طورطریقے اور زبان سیکھی۔ پنجاب کے برعکس نئی تنظیم میں ایسے تمام لوگ شامل ہوگئے جنہیں فرنٹیر سروس کا شوق تھا اور جو ملازمت کا پورا عرصہ نہیں تو زیادہ سے زیادہ عرصہ سرحد میں گزار سکتے تھے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ اتنا بڑا فائدہ تھا جو نظم و نسق کا معیار گر جانے کے اندیشہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وزنی تھا۔ اس زمانہ میں سرحد اتنا

---

(۱) انڈین پولیٹیکل سروس وائسرائے کی سفارتی کور تھی۔ اس سروس کے افسر ہندوستانی ریاستوں شمال مغربی سرحد بلوچستان خلیج فارس اور آس پاس کے ملکوں میں سفارت خانوں اور کونسل خانوں میں مقرر کئے جاتے تھے۔

چھوٹا علاقہ نہیں تھا کہ چند افسروں کی جاگیر بن جاتا۔ اور میرا خیال ہے کہ مرکزی اور صوبائی سروسوں کے جو افسر نئی سروس میں شامل ہوئے تھے ان کی کارکردگی دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں کم نہیں تھی (۱)۔

اس دلیل کا جواب اور بھی واضح ہے کہ قبائلی مفاد کے مقابلہ میں آباد اضلاع کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا جائیگا۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ۱۹۰۰ء سے پہلے ان دونوں علاقوں کے مفادات میں توازن پیدا نہ ہونے کی وجہ سے ایسی کشیدگی اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی جس کا واحد علاج یہ سوچا گیا تھا کہ ہر سال تعزیری مہم بھیجی جائے۔ اس طرح جو امتناعی تدبیر اختیار کی جاتی تھی اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جہاں تک سرحد کا تعلق ہے لاہور حکومت کا کارنامہ قابل فخر نہیں ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس وقت جو حالات کارفرما تھے ان میں کرزن حق بجانب تھے۔ هیرلڈ ڈین کے عہد میں یعنی نئے صوبہ کے قیام کے ابتدائی سات سال کے دوران محسودوں کے خلاف چند جوابی حملوں کے سوا جن کا مقصد مرک کا محاصرہ ختم کرنا تھا کوئی فوجی مہم نہیں بھیجی گئی۔ روس کیپل کے زمانہ میں جو هیرلڈ ڈین کے جانشین تھے اور گیارہ سال تک نئے صوبہ کے حاکم رہے یہ صوبہ پہلی جنگ عظیم کی آزمائشوں کے دوران مستحکم ثابت ہوا حالانکہ ترکی جسے پوری غیر عرب دنیائے اسلام میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ہمارے دشمنوں کی صفوں میں شامل تھا۔ یہ درست ہے کہ روس کیپل نے اپنا سرکاری دورہ دو چھوٹے فوجی اقدامات سے کیا۔ یہ فوجی اقدامات جس پیمانہ پر کئے گئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک اقدام هفتہوار ناغہ کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۱۷ء میں وزیرستان میں محسود کے خلاف بھی ایک مختصر مہم بھیجی گئی جو کامیاب رہی۔ لیکن وسیع معنی میں یہ کہنا صحیح ہے کہ سرحد میں جو دوسرا طوفان آیا وہ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۹ء میں آیا۔ یہ ہوا افغانستان کی طرف سے چلی تھی لیکن اس نے جو تیزی پکڑی وہ

---

(۱) میں نے یہ نتیجہ دونوں صوبوں میں ملازمت کے تجربہ کی روشنی میں اخذ کیا ہے۔

پنجاب اور پورے ہندوستان کے حالات کا نتیجہ تھی۔ یہ بغاوت مقامی نہیں تھی۔ ان حالات سے کرزن کے مخالفوں کے دلائل بےبنیاد ثابت ہوتے ہیں اور کرزن کے دلائل کی تائید ہوتی ہے۔

•

کرزن نے اپنی رپورٹ میں اپنے نقطۂ نظر کی کافی وضاحت کی لیکن ان کا مقدمہ پوری طرح منظر عام پر نہیں آیا۔ ایسی وجوہ موجود تھیں جو بعد کی تاریخ کی روشنی میں جو ہماری نظروں کے سامنے ہے دور رس تھیں اور جو اس وقت بھی اس تبدیلی کی حمایت میں جو تجویز کی گئی اور بعد میں عمل میں لائی گئی بطور حجت پیش کی جا سکتی تھیں۔ آج کا جو بھی قاری اس زمانے کی دستاویزات کا مطالعہ کرتا ہے اسے یہ بات بری طرح کھٹکتی ہے کہ اس تبدیلی کے متعلق متاثرہ آبادی کے جو خیالات تھے ان کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں جب متحدہ پنجاب کے حامی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ آباد اضلاع کے لوگوں کے حقوق پس پشت ڈال دئے جائیں گے تو اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے ذہن میں حقیقی مسئلہ کا احساس موجود ہے لیکن میرا خیال ہے انہوں نے جو نتائج اخذ کئے وہ صحیح نہیں تھے۔ کرزن کی تمام توجہ خارجہ پالیسی کے اہم تقاضوں کی طرف منعطف تھی اس نے وہ مدھم آواز سنی ان سنی کر دی جو طوفان گزرنے کے بعد سرحد کا دورہ کرنے والا کوئی بھی شخص سن سکتا تھا۔ اس آواز کو وہی سن سکتا تھا جو لوگوں کے جذبات سے واقف تھا لیکن اس کے مفہوم کو سمجھنا پھر بھی مشکل تھا۔ یہ آواز پٹھانوں کی غیرت کی آواز تھی۔ یہ پٹھانیت کا وہ احساس تھا جو قبیلوں کی تفریق سے بالا تر ہے اور اس وقت کے مدبر کا یہ فرض تھا کہ وہ اس جذبہ کو عظیم تر مملکت کے مفاد میں صحیح راستہ پر لگا دیتا۔ اس کے لئے ایک مرکزی نکتہ درکار تھا یہ حقیقت کہ نئے صوبہ کے قیام سے یہ مرکزی نکتہ مل گیا اس صوبہ کے قیام کا سب سے بڑا جواز تھا جو دفاع اور خارجہ پالیسی کے بظاہر اہم تقاضوں سے بھی زیادہ اہم تھا۔ اس لئے کہ وہی قوم جس کی امنگیں پاس کا شکار نہ ہوئی ہوں ایسے حالات پیدا کر سکتی ہے جن میں بھروسہ کے قابل دفاعی ڈھانچہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہر مرحلہ پر خواہ وہ نسب نامے ہوں، بابر سے

اورنگ زیب تک قبائل کے ساتھ مغلوں کے معاملات ہوں، خوشحال خان کی نظمیں ہوں یا الفنسٹن کی منظر کشی ہو ایک طرف درانیوں اور غلجیوں اور دوسری طرف ان قبائل کے درمیان امتیاز نظر آتا ہے جو سلسلہ کوہ سلیمان میں اور ان پہاڑوں اور دریائے سندھ کے درمیان میدانی علاقہ میں رہتے ہیں۔ کبھی یہ فرق مغربی اور مشرقی افغانوں کے بیچ یہ میں ظاہر ہوتا ہے کبھی کرلانی کی اولاد یعنی سفید کوہ ور کوہ سلیمان میں بسنے والے پہاڑی قبائل اور دوسرے قبائل کے درمیان اور کبھی روہ میں بسنے والوں اور درانیوں یا غلجیوں کے درمیان اور کبھی پختو یا پشتو بولنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان ظاہر ہوتا ہے جو مغرب میں آباد ہیں اور آدھے پختون اور آدھے فارسی وان ہیں۔ افغان اور پٹھان کا فرق واضح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یوسف زئی اور پشاور کے میدان میں بسنے والے دوسرے سر برآوردہ قبائل اس لقب پر کسی درانی یا غلجی سردار سے زیادہ نہیں تو کم از کم برابر کا حق ضرور رکھتے ہیں۔ عام طور پر یہ امتیاز مبہم ہے اور اسے کسی جغرافیائی یا ڈیورینڈ لائن جیسی سیاسی حدبندی سے واضح نہیں کیا گیا۔ لیکن اس علاقہ کے مشرق میں جہاں کوہ سلیمان سے گزرنے والے دریاؤں کا رخ بدلتا ہے بسنے والے بیشتر قبائل کے انگریزوں کے زیر نگین آنے سے پہلے یہ فرق موجود تھا مثال کے طور پر سوات یا دیر کے یوسف زئیوں اور سمہ کے مندڑ قبائل، خلیل، مہمند اور افریدی، خٹک بنوچی اور وزیر قبائل آپس میں گڈ مڈ ہوتے رہے ہیں درانیوں کے ساتھ ان قبائل کا اتنا زیادہ اختلاط نہیں ہوا۔ یہ روہ کے باشندے ہیں ان کے تصورات کا آپس میں کافی تبادلہ ہوتا رہا ہے اور لین دین بھی خاصہ ہوتا رہا ہے۔ یہ لوگ دریائے سندھ کے کنارے کی منڈیوں میں خرید و فروخت کرتے رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کا ایک وحدت کا تصور ہے جس کا ہمیشہ باشعور اظہار نہیں ہوا اور ان کا مفاد بھی ایک ہے جو قبائلی تصور سے بلند ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قیام اور قریباً پچاس سال تک اس کے باقی رہنے سے جو خاص مقصد حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ اس سے ابتدا میں ایک ایسی انتظامی اور پھر سیاسی فضا پیدا ہوگئی جس میں وحدت کا یہ تصور پروان چڑھ سکتا تھا اور قاعدہ سے اس کی پرورش کی جاتی تو بھر پور زندگی کا روپ اختیار کر سکتا تھا

نئے صوبہ کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب یہ معلوم نہیں تھا کہ سرحد کے لوگ کس کا ساتھ دیں گے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پورا علاقہ حملہ اور جوابی حملہ کے لئے گزرگاہ بن گیا تھا۔ درانیوں اور سکھوں کی فوجیں مدوجزر کی طرح اس علاقہ سے گزری تھیں لیکن صورت حال نے مستقل شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اور پھر جب ان غیر مستقل عناصر کی جگہ برطانوی حکمرانوں نے لے لی تو ابتدا میں یہی رجحان رہا کہ پٹھانوں کو محض ہندوستان کی چھوٹی سی جاگیر سمجھ لیا جائے حال آنکہ ان کی یہ حیثیت کبھی نہیں تھی۔ لودی، سُور، یوسف زئی اور اورک زئی خاندانوں نے ہندوستان پر حکومت کی تھی۔ کیا اب انہیں پنجاب کے ایک سرے پر ایسی معمولی حیثیت دی جا سکتی تھی جو درخور اعتنا نہیں تھی۔

اس وقت سرحد کی علیحدگی سے پٹھانوں کی اس حمیت کی تسکین ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی جدو جہد اور مہارت سے کام لیا گیا تھا اس لئے آباد اضلاع اور قبائلی علاقوں میں ایک حد تک یگانگت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ اس علاقہ کا نظم و نسق براہ راست مرکزی حکومت کی نگرانی میں تھا اس لئے اس ابتدائی دور میں پٹھانوں کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کے معاملات اور امنگیں صوبائی مفادات سے زیادہ اہم ہیں اس لئے مغلوں کے زمانہ سے مغرب کی بجاء مشرق سے آس لگانے کا جو رجحان چلا آرہا تھا اسے پھر تقویت حاصل ہوگئی۔ اور آخری بات یہ ہے کہ پٹھان کو ایک بار پھر پشاور ایک ایسا مرکز مل گیا تھا جو اسے عزیز بھی تھا اور جانا پہچانا بھی تھا۔ اور اب محض تفریح کے سوا لاہور جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر چند کہ کرزن نے اس طرف پوری توجہ نہیں دی تھی لیکن انہوں نے پٹھانوں کی خود پسندی کے لئے ایک مرکز فراہم کر دیا تھا اور اس طرح سرحد کو مستحکم کر دیا تھا۔

اس طرح ہمارے زمانہ کے پٹھانوں کے نشأۃ ثانیہ کے لئے میدان ہموار ہو چکا تھا۔

فصل بست و ششم

پٹھانوں کا نشاۃ ثانیہ

اس طرح جو اسٹیج تیار ہوچکا تھا اس پر حالات کا روپ بدلنے کے لئے ایسے پیش رو اشخاص کے نئے گروہ کی ضرورت تھی جو نہ صرف کرزن کا مطمح نظر سمجھ سکتے اور اس کی ہر بات کو عملی جامہ پہنا سکتے بلکہ خود اپنے علم اور مہارت سے کام لے کر دور اندیشی اور فراست کے ساتھ نئی عمارت بنا سکتے۔ آخرکار یہ اشخاص مل گئے۔ ان میں سے تین شخصیتیں یعنی ہیرلڈ ڈین، جارج روس کیپل اور صاحبزادہ عبدالقیوم زیادہ نمایاں ہیں اور کئی اعتبار سے ان تینوں میں اہم ترین شخصیت صاحبزادہ عبدالقیوم کی ہے۔ ان تینوں کو تاریخ کے صفحات پر جگہ مل چکی ہے ان تینوں نے حتیٰ کہ روس کیپل نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنی جانیں اپنے کام کے لئے وقف کردیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان کی یادگار قائم کی جائے۔

ہیرلڈ ڈین سب سے پہلے پشاور ضلع کی یوسف زئی سب ڈویژن کے اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے جبکہ ان کا ہیڈ کوارٹر مردان تھا۔ کئی سال بعد مردان علیحدہ ضلع بن گیا۔ سربرآوردہ منڈڑ یوسف زئی خاندانوں کے وطن کی حیثیت سے مردان ہمیشہ سے مشہور رہا ہے اس کے علاوہ اسی چھاؤنی میں گائڈ رسالہ بھی متعین تھا۔ میرے خیال میں یہ دعویٰ درست ہے کہ جو لوگ خود پٹھان نہیں تھے لیکن ذہنی اعتبار سے پٹھانوں سے قریب ترین تھے اور جنہیں پٹھان اب بھی یاد کرتے ہیں ان میں سے بیشتر وہی لوگ ہیں جو کبھی نہ کبھی علاقہ

مردان کے حاکم رہے ہیں (۱)- یوسف زئی سوسائٹی کے لیڈروں سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کا احترام کرنے اور اس سوسائٹی میں مشہور اور محبوب ہوجانے کا مطلب یہ تھا کہ انسان پٹھانوں کے خصوصی حلقہ میں شامل ہوگیا ہے اور ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں پٹھانوں کی روح کی لطافتیں اس پر واضح ہونے لگی ہیں- ڈین بھی ایک ایسے ہی انسان تھے-

هیرلڈ ڈین بڑے شاندار آدمی تھے- وہ دراز قد دبلے پتلے اور بارعب شخصیت کے مالک تھے ان کی گہری نیلی آنکھیں بڑی متجسس تھیں- وہ اس عزم محکم اور اعتماد کا مجسمہ تھے جو پٹھان ایک انسان میں تلاش کرتے ہیں وہ نڈر تھے اور اپنی بات پر قائم رہنا جانتے تھے- ان کے مزاج میں ظرافت تھی لیکن وہ دھن کے پکے تھے جس کی وجہ سے ان کی یاد عرصہ تک باقی رہی- یوسف زئی پٹھان مزے لے لے کر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے خان ہوتی خواجہ محمد خان سے ایک بات منوانے کےلئے جو وہ ماننا نہیں چاہتے تھے کیا ترکیب استعمال کی- ڈین اور خواجہ دس میل کی سیر کو روانہ ہوئے- خواجہ صاحب سیاہ پیٹنٹ چمڑے کا جوتا پہنے ہوئے تھے جس کا اس زمانہ میں رواج تھا- وہ چلتے رہے چلتے رہے یہاں تک کہ خواجہ صاحب کی تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی اور وہ ہر بات ماننے کو تیار ہوگئے- بعد میں ڈین پشاور کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے ان دنوں ضلع کا بندوبست اراضی لوئی ڈین کے سپرد تھا- لوئی ڈین بڑے ممتاز افسر تھے اور بعد میں پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے وہ ہمیشہ حسین مقامات ہی پر متعین ہوئے تھے- ڈین شملہ اور لاہور کے سکرٹیریٹ کا کام زیادہ پسند کرتے تھے- ایک روز پشاور کے ایک حجرہ میں ایک سیدھا سادہ خان جو دونوں ناموں کی مماثلت میں الجھ گیا تھا ایک خلیل ارباب سے پوچھنے لگا کہ ڈِین اور ڈُین میں کیا فرق ہے اسے جواب ملا کہ "وہی جو شِیر اور شُیر میں ہے البتہ یہ لف و نشر غیر مرتب ہے"- کیا عمدہ لطیفہ ہے-

ڈین نے مالاکنڈ ایجنسی قائم کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا- اس

---

(۱) اس کی واضح مثالیں SIR JOHN MAFFEY اور SIR RALPH GRIFFITH ہیں یہ دونوں بعد میں صوبہ کے گورنر بنا دئے گئے- پاکستان کے پہلے صدر اسکندر مرزا اور راقم الحروف کو بھی جو تین سال تک صوبہ کا گورنر رہا مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے-

علاقہ کے لوگ نسبتاً بہت سرکش تھے اس لئے یہ کارنامہ بلوچستان پر سنڈیمان کے قبضہ کے مقابلہ میں جسے بہت شہرت دی گئی ہے زیادہ اہم ہے۔ کرزن سے ڈین کی ملاقات اس وقت ہوئی جب کرزن پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے دورہ پر نکلے تھے اور کابل میں امیر عبدالرحمان سے ملنے کے لئے جاتے ہوئے پشاور سے گزرے تھے۔ وہ ڈین سے بہت متاثر ہوئے اور جب وائسرائے بنے تو انہوں نے بہت سے سینیر افسروں کو نظر انداز کرکے ڈین کو نئے صوبہ کا چیف کمشنر مقرر کردیا۔ ڈین کو پٹھانوں میں جو شہرت حاصل تھی انہوں نے چیف کمشنر کی حیثیت سے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور فوج کی تعزیری مہمات کا پرانا سلسلہ بند کردیا۔ قبائل خوب جانتے تھے کہ ڈین نڈر، ثابت قدم، دیانتدار اور دھن کے پکے ہیں اس لئے وہ صحیح معنی میں 'امن گر، بن گئے۔ جب امن نہیں ہوتا تھا تو وہ امن امن نہیں پکارتے تھے وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اس لئے ان کی بات کا اعتبار کیا جاتا تھا۔ کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا جس کا ان کی صحت پر برا اثر پڑا۔ ڈین کی طاقت نے فرائض کی بجا آوری کے دوران جواب دے دیا اور وہ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس پہنچتے ہی فوت ہوگئے۔

روس کیپل کو کرم اور خیبر میں شہرت ملی وہ دونوں مقامات پر کچھ عرصہ بہ یک وقت پولیٹیکل ایجنٹ اور مقامی ملیشیا کے کمانڈنٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ملی جلی ولندیزی سویڈ انگریز نسل سے تھے اور کیویگنری سے زیادہ انگریز شخصیت کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ملازمت کا آغاز ایک برطانوی رجمنٹ سے کیا تھا لیکن ان کی جوانی کا بیشتر حصہ سیر و سفر میں گزرا تھا۔ وہ مانے ہوئے ماہر لسانیات تھے اور سب سے بڑھ کر عالمگیر مزاج کے مالک تھے۔ وہ بات میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے بھی عادی تھے۔ جو لوگ خاندانی شرافت کو ذاتی اخلاق کا سرچشمہ نہیں سمجھتے انہیں یہ بتا دینا کافی ہے کہ روس کیپل نے یہ طور طریقے جان بوجھ کر اپنائے تھے وہ اپنے قول و فعل میں اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ انہیں انگریز نہ سمجھا جائے۔ انہیں ہمدردی کو لاتعلقی کے ساتھ تکبر کو ملنساری کے ساتھ اور کشادہ دلی کو ان لوگوں سے ناراضگی کے ساتھ ملانے میں بڑا لطف آتا تھا جو ان کی مرضی کے خلاف چلتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی ناراضگی کینہ پروری بن جاتی تھی۔ وہ بڑے مضبوط اخلاق کے مالک اور اپنے ساتھیوں میں سب سے بلند

تھے۔ وہ بڑے اچھے دوست لیکن بڑے خطرناک دشمن تھے۔ حکم چلانا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ انسانی کمزوریوں سے درگزر کرنا نہیں جانتے تھے اور دوسروں کے جذبۂ ایثار کی شاذونادر ہی قدر کرتے تھے۔ وہ بڑے گرانڈیل بھاری بھرکم اور طاقتور تھے اور ان کا گھور کر دیکھنے کا انداز سانپ کی طرح تھا۔ جوانی میں انہوں نے داڑھی بڑھائی تھی لیکن بعد میں انہوں نے ایڈورڈ کی طرح لمبی اور گھنی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ انہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی اور انہیں اپنے معتبر افسروں کا شادی کرنا بھی پسند نہیں تھا۔ ان کا یہ قول مشہور ہے کہ ''دودھ پینے کے لئے گائے پالنا ضروری نہیں ہے،، اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے متعلق محبت کے کئی افسانے مشہور ہوئے۔ ایسے شخص سے لوگ بے تکلف نہیں ہو سکتے۔ اکثر لوگ ان سے خوف کھاتے تھے اور شاید ہی کوئی ان سے بالکل مانوس ہوا ہو۔ لیکن انہوں نے بہت سے لوگوں کے دلوں میں احترام کا ایسا جذبہ پیدا کیا جو پرستش سے کچھ ہی کم ہے۔

مجھے روس کیپل کو صرف دوبار دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ایک بار اس وقت جبکہ وہ ایک افسر پر گرجے تھے جو پشاور شہر کے قریب کسی چوکی پر متعین تھا اور جس نے انہیں دیکھتے ہی سلام نہیں کیا تھا اور ایک بار اس وقت جب وہ وائسرائے کے ہاتھ سے بہادری کا گرانڈ کراس لے رہے تھے۔ ان کی موجودگی ایک ایسی بے رحم طاقت کا احساس دلاتی تھی جس کا سامنا کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان میں یہ شان محض ذاتی ترقی کے شوق کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ انہیں پٹھانوں کے معاشرتی اور سیاسی نظام میں ایک ایسے طرز زندگی کی جھلک نظر آئی تھی جو انہیں نہ صرف پسند تھی بلکہ جس کے سرے ان کی روح سے جا ملے تھے۔ انہیں پٹھانوں سے بڑا لگاؤ تھا وہ پٹھانوں کے لئے کام کرتے تھے اور ان کے ہر انداز کو سمجھتے تھے۔ وہ پشتو بڑی روانی سے بولتے تھے وہ اپنی بات منوانے کے لئے پشتو ضرب المثل بر محل استعمال کر سکتے تھے کسی واقعہ سے جو سبق مل سکتا ہے اسے واضح کر سکتے تھے اور پشتو شعرا کے اشعار موقع پر پڑھ سکتے تھے اور گھریلو استعارہ کو اس طرح بر محل استعمال کرتے تھے کہ سننے والا ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی پسند کی ہوئی اسٹیج پر ماہر ایکٹر تھے اور جیسا کہ متلون مزاج قوم سے نپٹنے والے حاکم کے لئے ضروری

ہے وہ ذرا سی دیر میں وقار سے ملنساری، محبت سے دھمکی اور حکمرانی سے التماس پر اتر آتے تھے۔ وہ نکتہ چینی سے بے نیاز تھے اور اپنے ماتحتوں پر بھروسہ کرنا اور ان سے بھروسہ کرانا جانتے تھے۔ اگر انہیں انگریز کہا جا سکتا ہے تو یہ حقیقت ہے کہ سرحد میں ان سے زیادہ کسی انگریز کو یاد نہیں کیا جاتا۔ وہ پٹھانوں میں پٹھان بلکہ ملکوں کے ملک مانے جاتے تھے حال آنکہ پٹھانوں میں خاص طور پر دوستوں میں جلد بے تکلفی بڑھ جاتی ہے لیکن روس کیپل بے تکلفی کو ہمیشہ سنجیدگی سے دبا دیتے تھے۔

وہ آر۔ کے۔ کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ ان کی بہت سی امنگیں تھیں جن میں سب سے بڑی امنگ اسلامیہ کالج کا قیام تھا جو آخرکار پورا ہو گیا۔ اپنی اس واحد تخلیقی جد و جہد میں اور خیبر کے افریدیوں کے ساتھ اپنے مربیانہ برتاؤ میں انہیں صاحبزادہ عبدالقیوم (۱) کی ہستی میں ایک ایسا مددگار میسر تھا جس نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ روس کیپل نے اپنے نصب العین کی وضاحت کے لئے صاحبزادہ کو منتخب کیا تھا جو کسی زمانہ میں ان ھی کی تصویر کا دوسرا رخ تھے۔ اس صدی کے دوسرے عشرہ میں روس کیپل کا نام لیتے ھی عبدالقیوم کا تصور آ جاتا تھا لیکن ان دونوں میں سے ایک بھی دوسرے کا پرتو نہیں تھا۔ دونوں متضاد شخصیتوں کے مالک تھے۔ ایک شخصیت میں جو کمی تھی وہ دوسری شخصیت سے پوری ہوگئی تھی۔ اپنے قائد کی طرح صاحبزادہ عبدالقیوم بھی جس کسی سے ملے اس پر اپنی بے پناہ طاقت کا اثر ضرور چھوڑا لیکن روس کیپل کے برخلاف صاحبزادہ صاحب بڑے ملنسار تھے۔ ان دونوں نے مل کر اسلامیہ کالج بنایا جس نے بڑھتے بڑھتے پشاور یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ان کی مشترکہ اور ٹھوس یادگار ہے اور ان کی دور اندیشی اور دانشمندی کے لئے خراج عقیدت ہے۔ ایک عظیم المرتبت شخصیت اور بلند پرواز ذہن ھی یہ جرأت کر سکتا تھا کہ ٹھیک اس جگہ جہاں اکبر خان اور ہری سنگھ میں جنگ ہوئی تھی کھیتوں کے کنارے اور خیبر کے خوفناک دھانہ کے سامنے جہاں حملہ آور پہنچ سکتے ہیں اتنی بڑی دانش گاہ قائم کر دے۔ روس کیپل اور صاحبزادہ عبدالقیوم نے یہی

---

(۱) یہ وہ عبدالقیوم کشمیری نہیں ہیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد کئی سال تک شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وزیر اعلیٰ رہے۔

کیا اور اس منصوبہ کو بڑی خوبصورت شکل دی۔ سفید مسجد جو سرخ عمارتوں کا مرکز ہے ایک ایسا حرم ہے جس میں کوئی حملہ‌آور قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ روس کیپل کے زمانہ سے یہ مسجد جو خیبر کا آخری موڑ مڑتے ہی نظر آنے لگتی ہے سرو اور دوسرے درختوں کی جھنڈ میں گھری ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی یہ مسجد اس تصور کی علامت ہے جس نے یونیورسٹی کو جنم دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روس کیپل کی حکومت نے پٹھانوں کا فخر اور شعور بڑھانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ دورے، جرگے، دربار، جنگ کے زمانہ میں متحدہ جدو جہد کا احساس پٹھان علاقہ کی جداگانہ وحدت جس کا حاکم اعلیٰ ایسی فوق‌البشر شخصیت کا مالک تھا ان تمام چیزوں نے ذہنوں کو نئی راہیں سمجھائیں اور لوگ اپنے اپنے قبیلہ کی تنگ حدود سے آگے کی باتیں سوچنے لگے۔ ان نئے رجحانات میں اسلامیہ کالج کے اثرات کا بڑا دخل ہے۔

روس کیپل کی کمزوری یہ تھی کہ اس نے یہ نہیں سوچا کہ حکومت کے لئے محض اتنا ہی کافی نہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی اسکیم تیار کردے یا اسے عملی شکل دے دے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے۔ کہ اعلیٰ دانش گاہ سے فارغ‌التحصیل ہو کر نکلنے والی پود کو رفتہ رفتہ کھپانے کا بھی بندوبست کرے۔ ان کی حکومت آباد اضلاع کی آبادی کے مقابلہ میں قبائلی علاقوں کے احساسات سے زیادہ مانوس تھی۔ وہ قبائلی روایات پر سختی سے قائم رہے اور انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مغربی طرز کی حکومت کے قیام سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے اضلاع پنجاب سے نزدیک تھے جہاں کافی عرصہ پہلے نمائندہ اداروں کے قیام کے لئے ابتدائی اقدامات کئے جا چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روس کیپل پنجاب کے حاکموں کے مقابلہ میں حقیر نظر آنے لگے۔ شاید انہیں ذاتی طور پر اس کی پروا نہیں تھی کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ پٹھانوں کا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔ مانٹینگو چیمسفورڈ Montangu-Chelmsford کی 'اصلاحات، سرحد میں نافذ کرنے کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ بارود میں چنگاری لگانا مناسب نہیں ہے۔ لیوفل کرٹس بھی جو ان اصلاحات کے نقیب اور بانی مبانی تھے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور ہوگئے اور روس کیپل

کی ترغیب میں آکر انہوں نے زبانی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ اس زمانہ میں نئی اصلاحات جو عرف عام میں ذمہ دار حکومت کے نام سے مشہور تھیں پٹھان ان کے لئے تیار نہیں ہے- یہی وجہ تھی کہ ۱۹۲۰ء میں جب پورا ہندوستان ذمہ دار حکومت کے قیام کے سلسلہ میں دو عملی تجربہ میں مصروف تھا- شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا- پٹھانوں کو نہ حق رائے دھی دیا گیا نہ یہاں انتخابات ہوئے اور نہ وزارت قائم ہوئی حتیٰ کہ بلدیات تک کے انتخابات نہیں ہوئے کیونکہ پچھلی صدی کے نویں عشرہ میں رپن نے جو اصلاحات کی تھیں وہ سرحد میں نافذ نہیں ہوئی تھیں- روس کیپل کے نزدیک یہ پورا نظام بے معنی تھا اگر انہیں ٹوکا جاتا تو وہ یہی جواب دیتے کہ پٹھانوں کا اپنا جمہوری نظام ہے جو ان کے مذاق سے زیادہ مطابعت رکھتا ہے- وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ پٹھانوں کے ذہن پر اعلیٰ تعلیم کا کیا اثر ہوگا انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر اہل سرحد کے فخر کو نئے سانچہ میں ڈھالنا ہے اور پورے برصغیر کی خدمت کے لئے تیار کرنا ہے تو یہاں کے عوام کو نئے زمانہ کا ساتھ دینے کی نہ صرف اجازت دی جائے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے- وہ ایک ہاتھ سے ایک عمارت کھڑی کر رہے تھے جس سے قبیلہ پرستی کا خاتمہ ہو رہا تھا لیکن انہوں نے دوسرے ہاتھ سے ایک ایسی وسیع تر عمارت بنانے کی ضرورت نہ سمجھی جس کی تکمیل میں تمام قبائل مصروف ہو سکتے- نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو ان کے خواب بکھر کر رہ گئے-

روس کیپل ۱۹۱۹ء میں ریٹائر ہوئے اور تھوڑے دنوں کے بعد فوت ہوگئے- صاحبزادہ عبدالقیوم نے مجھے کئی بار لندن میں روس کیپل سے مرض الموت کے دوران اپنی ملاقات کا حال بتایا اور کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ روس کیپل ملازمت سے سبکدوشی کے وقت احساس محرومی کا شکار تھے اور انہیں یہ احساس تھا کہ سرحد کے عوام سے جدا ہو کر ان کی زندگی بے مقصد ہو گئی ہے اس لئے انہیں موت نے جلد آ گھیرا- روس کیپل کے معاون صاحبزادہ عبدالقیوم ۱۹۳۷ء تک زندہ رہے اور ۱۹۳۲ء میں صوبہ کے پہلے وزیر بنے- ۱۹۱۹ء کے بعد بارہ سال روس کیپل کے جانشینوں کے عہد میں اس صوبہ کی سیاست بے جان رہی- اس کی نمائندگی یہاں کے صرف دو سرکردہ شہری کر رہے تھے جو دھلی میں

مرکزی مقننہ کے ممبر منتخب نہیں ہوئے تھے بلکہ نامزد کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحبزادہ عبدالقیوم اور دوسرے ہوتی کے ممبر محمد اکبر خان تھے۔

ان دونوں نوابوں یعنی عبدالقیوم اور اکبر خان ہوتی کا تذکرہ کئے بغیر دو عظیم جنگوں کے درمیانی زمانہ میں یوسف زئی سوسائٹی کا تصور کرنا ممکن نہیں ہے۔ عبدالقیوم جو روس کیپل سے زیادہ دور اندیش تھے وہ پٹھانوں اور انگریزوں کے نظام زندگی کے امتزاج کے اصل معمار ثابت ہوئے جس کی وجہ سے ایک ایسی سیاسی عمارت کی بنیاد پڑی جس میں آخرکار سرحد کو مغربی پاکستان کی ڈھال کی حیثیت سے اہم مقام حاصل ہوگیا۔ صاحبزادہ عبدالقیوم بڑی محترم اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ پشاور اور دہلی میں اور پھر گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں اپنے تمام ساتھیوں سے بلند رہے۔ وہ دیکھنے میں بڑے شاندار تھے۔ ان کا انداز پر وقار خدو خال واضح مونچھیں گھنی اور آنکھیں عقابی تھیں ان کی شخصیت قابل احترام تھی لیکن ان کے انداز اور اطوار ایسے دلکش تھے کہ ایک نوجوان بھی یہی سوچنے پر مجبور ہوتا تھا کہ صاحبزادہ نے اس سے برابری کے ساتھ بات کی ہے۔ وسیع النظری اور مستقل مزاجی میں پورے ہندوستان میں گنتی کے لوگ ان کے ہمسر تھے۔ یہ صاحبزادہ ہی تھے جنہوں نے چند سال کے مختصر عرصہ میں انگریزوں کی بے عمل حکومتوں سے اصلاحات کی دو ''قسطیں،، وصول کر لیں۔

صاحبزادہ ٹوپی کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ منڈڑ یوسف زئی علاقہ کے ایک سرے پر واقع ہے۔ ٹوپی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جہاں دریائے سندھ پہاڑی علاقہ سے نیچے اترتا ہے۔ والد کی طرف سے ان کے اسلاف لودی صاحبزادوں کی اولاد تھے یہ خاندان زیادہ ممتاز نہیں ہے لیکن ان کی دادی والدہ اور اہلیہ سب کی سب کوٹھا ملا خاندان کی تھیں۔ کوٹھا ملا بڑے مشہور حضرت (مقدس ہستی) تھے جو اخوند کے ہم عصر تھے اور ٹوپی گاؤں کے ساتھ دوسرے گاؤں کوٹھا میں رہتے تھے۔ جب عبدالقیوم دسمبر ۱۹۳۷ء میں فوت ہوئے تو ان کے جنازہ میں اتنی کثرت سے لوگ شریک ہوئے کہ اس علاقہ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ مسلمانوں کا جنازہ یوں بھی بڑا موثر ہوتا ہے۔ وقار، صبر و تحمل کے ساتھ اظہار غم اور سادگی ان سب کی اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے لیکن



نواب صاحبزادہ سر عبدالقیوم

یہ ایک گھرانے کا اجتماع نہیں تھا کیونکہ عبدالقیوم لاولد تھے نہ یہ ایک گاؤں یا قبیلہ کا خراج عقیدت تھا کیونکہ یہ حدود پہلے ہی عبور کی جا چکی تھیں بلکہ یہ ایک پوری قوم کا ماتم تھا جسے اپنے غم میں تھوڑا بہت یہ احساس تھا کہ آج ایک اتنی بڑی ہستی دنیا سے اٹھ گئی ہے جس کی عظمت سے قوم واقف نہیں تھی اور جس کی موت میں ایک بر تر قوت نے جنم لیا ہے۔

ہوتی کے اکبر خان جنھیں فوت ہوئے صرف تین سال ہوئے ہیں صاحبزادہ سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ان خواجہ کے فرزند تھے جنھیں ہیرلڈ ڈین نے چلا چلا کر تھکا دیا تھا اور اپنی بات منوا لی تھی وہ شہنشاہ اکبر کے اتالیق بیرم خان کی طرح خان خاناں تھے۔ وہ مدبر نہیں تھے بلکہ کھرے پٹھان تھے اور انتہائی دولت مند زمیندار طبقہ کی روایات کے حامل تھے۔ وہ دیو قامت اور بڑے طاقتور تھے اور گھوڑے کو اٹھا لیتے تھے۔ ان کا کلا ٹھلا بہت بڑا، بھوری نیلی آنکھیں اور رخساروں سے خون ٹپکتا تھا۔ وہ ملاؤں سے جنھیں وہ ہولی بولی کہتے تھے متنفر تھے اور صاحبزادہ کو اسی طبقہ میں شمار کرتے تھے۔ وہ اپنی گرجدار آواز میں کہتے تھے ”جناب یہ آدمی اصلی پٹھان نہیں ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا اصلی پٹھان دیکھا ہے جو ملا ہو (یوسف زئیوں کے متعلق یہ دعویٰ درست ہے)۔ سید۔ سید کون ہوتے ہیں؟ مجھے تو پٹھان چاہئیں“۔ آپ انہیں جواب دے سکتے تھے کہ ”نواب صاحب آپ اور صاحبزادہ صاحب دونوں پٹھانوں کے لیڈر ہیں آپ کے ذاتی احساسات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مفاد عامہ کی خاطر آپ مل جل کر کام کر سکتے ہیں“۔ وہ گرج کر جواب دیں گے ”یہ کام نہ میرے لئے ممکن ہے نہ ان کے لئے، میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ ہم پٹھان اپنی ذاتی رنجشیں سیاسی میدان میں بھی برقرار رکھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں“۔ پھر آپ کہیں گے۔ ”اچھا نواب صاحب آپ کی بات پکڑی گئی گویا آپ کو یہ اعتراف ہے کہ عبدالقیوم بہر حال پٹھان ہے“۔ اور وہ بچوں کی طرح آنکھیں جھپکا کر آپ کی طرف دیکھنے لگیں گے اور سانڈ جیسی گرجدار آواز کے ساتھ قہقہہ لگائیں گے۔ اکبر خان محض آواز ہی آواز نہیں تھے۔ تاریخ اور فلسفہ میں، جس میں اسلامی فلسفہ بھی شامل ہے، ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری غالباً دہلی کے شمال میں سب سے بڑی ذاتی لائبریری تھی۔

بظاہر وہ طاقتور اور ہر چیز کو سمیٹنے والے نظر آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا گھر مہمانوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا جیسا کہ ایک پٹھان کا گھر کھلا رہنا چاہئے اور وہ اکثر خلاف توقع غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتے تھے اور اپنی اس سخاوت کو لوگوں سے مخفی رکھتے تھے۔ جس طرح صاحبزادہ عبدالقیوم اسلامی اخلاق کا مجسمہ ہونے کی حیثیت سے قابل احترام تھے اس طرح اکبر خان ہوتی اپنی کمزوریوں کی وجہ سے پیار کے قابل تھے۔

ان دونوں نوابوں کا ایک اور ہمعصر بھی ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ یہ میاں گل، گل شہزادہ ہیں جو اخوند کے پوتے اور ریاست سوات کے بانی ہیں۔ ہم ان سے درۂ کڑاکڑ میں ملاقات کر چکے ہیں اور ان سے ۱۵۸۶ء میں اکبر کی فوج کی شکست کا حال سن چکے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جہاں بانی کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں سے کام لے کر وہ ایک ایسا کارنامہ سر انجام دینے میں کامیاب ہو گئے جس کی اس علاقہ میں متعدد لیڈروں نے کوشش کی لیکن ان میں سے کوئی شخصیت بھی اتنی عظیم نہیں تھی کہ یہ مقصد حاصل کر سکتی۔ انہوں نے یوسف زئیوں کے منتشر قبیلہ کو ایک سیاسی وحدت کی ایسی شکل دینے کے لئے جو بدلتے ہوئے زمانہ کے تھپیڑے کامیابی کے ساتھ جھیل چکی ہے نہ صرف دنیاوی قیادت کی خدمات، دور اندیشی اور مستقل مزاجی سے کام لیا بلکہ حقیقی روحانی برتری کا ثبوت دیا۔ میاں گل بھی شہنشاہ اکبر کی طرح سیاسی میدان میں لوگوں سے نپٹنے کے ماہر تھے۔ وہ میدان جنگ اور مجلس شوریٰ میں موقع سے پورا فائدہ اٹھانا خوب جانتے تھے۔ وہ عمل میں مضبوط پرہیزگر لیکن عقائد کے اختلافات سے بلند تھے۔ وہ اکبر ہی کی طرح ناخوانده لیکن زبردست حافظہ کے مالک تھے۔ انہوں نے قیادت کا ایک ایسا نمونہ قائم کیا جس کا ان کے وطن میں جواب نہیں ملتا اور یہ ایک ایسی قیادت ہے جس پر کسی بھی سر زمین کی تاریخ فخر کر سکتی ہے۔

پٹھان اپنے پیروں کے خاندان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ میاں گل اخوند کے پوتے تھے اس لئے انہیں سوات میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے سید اکبر شاہ ستانہ کے نواسے سید عبدالجبار کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا اور ان سے متصادم بھی ہوئے ہوں گے۔ اکبر شاہ سکھوں کے مقابلہ پر

پٹھانوں کے لیڈر اور سید احمد بریلوی کے مربی تھے وہ ۱۸۵۷ء میں فوت ہونے سے پہلے کافی عرصہ تک سوات کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے رہے۔ یہ ایک مبہم پوزیشن تھی جس کی بنیاد یہ تھی کہ بنیر کے پیر بابا کی طرح ان کے خاندان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ انہیں دنیاوی معاملات میں بھی تھوڑا بہت اقتدار حاصل تھا۔ ان کی وفات کے بعد جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں قبائل نے ان کے بیٹے کو ان کا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور بنیر میں نہیں تو کم از کم سوات میں تو یہ رجحان پیدا ہوگیا تھا کہ اخوند کو دوبارہ پیر تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن ۱۸۷۷ء میں اخوند کی وفات کے بعد ستانہ کے سادات کی پھر شہرت ہوگئی۔ ۱۹۱۵ء میں اکبر شاہ کے نواسے عبدالجبار کو سوات کے لوگوں نے بادشاہ کا خطاب دے کر اپنا قائد تسلیم کرلیا۔ انہیں دریائے سندھ کے مشرق میں امب (۱) کی طرف سے حریف طاقتوں کی حمایت حاصل تھی اس لئے وہ دو سال تک بادشاہ بنے رہے۔ وہ بڑے دانشمند اور دور اندیش تھے اور مقامی تاریخ اور واقعات پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ وہ کسی اور زمانہ میں ہوتے تو بڑی سے بڑی مشکل حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ لیکن وہ بیرونی تھے۔ انہیں ایسے عناصر کی حمایت حاصل تھی جو یوسف زئیوں کے لئے اجنبی تھے اور آخر میں وہ اپنے اس حریف کے مقابلہ پر میدان میں نہیں ٹھہر سکے جو اخوند کی اولاد میں سے تھا۔

تیس سال کی طویل مدت تک جس کے دوران سوات نے بڑی ترقی کی میاں گل ریاست کے حکمران رہے انہوں نے ریاست کے دروازے باہر سے آنے والوں کے لئے کھول دئے اور اس علاقہ میں جو صدیوں تک امن و امان سے محروم رہا تھا، امن قائم کردیا۔ انہوں نے پٹھانوں کا ویش کا وہ پرانا رواج ختم کردیا جس کے تحت تھوڑے عرصہ بعد زمین قبائل میں از سر نو تقسیم کردی جاتی تھی۔ میاں گل نے جگہ جگہ سکول اور ہسپتال بنوائے۔ اب وہ اپنی مرضی سے گوشہ نشیں ہوگئے ہیں اور ریاست کا

(۱) امب اور تناول کا نواب ضلع ہزارہ میں دربند کے مقام پر رہتا ہے۔ نواب اور اس کی رعیت پٹھان نہیں ہے اس لئے اس کتاب کے موضوع میں شامل نہیں ہے البتہ مہابن سے نیچے دریائے سندھ کے مغرب میں مختصر سے علاقہ پر امب کے نوابوں کا اقتدار ہے ماضی میں ان نوابوں کا بنیر پر اور وادی سندھ کے عیسیٰ زئی یوسف زئیوں پر بھی اثر رہا ہے۔

نظم و نسق اپنے فرزند کے حوالہ کر دیا ہے۔ ان کی دانشمندی اور مہارت کی وجہ سے یوسف زئیوں کا سرحدی علاقہ محفوظ ہوگیا ہے اور اس وادی کے باشندے جو دنیا کی حسین ترین وادیوں میں سے ہے خوشحال سے خوشحال تر ہوتے جا رہے ہیں۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ کے وجود میں آنے سے جو ولولہ انگیز حالات پیدا ہوئے تھے ان کی وجہ سے اس علاقہ اور یہاں کے لوگوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ صرف سوات یا سرحد کے کچھ حصوں تک محدود نہیں رہیں۔ ہر جگہ سرگرمیاں تیز ہو گئیں اور لوگوں کے احساسات ہی بدل گئے۔ پٹھانوں میں زندگی کی یہ لہر اس رفتار سے پیدا ہوئی جو ان کے حکمرانوں کے نزدیک بہت تیز تھی۔ ہر طرف بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ یہ بیداری اب بھی عیاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں انتقال اختیارات کے بعد یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ بیداری پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پھلنے لگی۔ ۱۹۲۵ء اور اس کے بعد جو خاکہ ابھرنے لگا تھا وہ ابھرتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ان دنوں اس خاکہ کی صرف دھندلی حدود نظر آنے لگی تھیں لیکن اب پوری تصویر واضح ہوگئی ہے اور اس میں رنگ بھر گئے ہیں۔ اس تصویر کے پرانے خطوط آج بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔

پٹھانوں کے اہم ذرائع معاش زراعت اور گلہ بانی ہیں۔ آبپاشی کی سہولتیں مہیا ہونے کے ساتھ ساتھ دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں کی زرخیزی بڑھ گئی۔ آسٹریلیا سے منگائے ہوئے غلہ کی بہترین قسمیں اس سرزمین میں جو ایشیا کی بہترین زمینوں میں سے ہے گنے اور تمباکو کی نقد فصلوں کی همسری کرنے لگیں۔ جن میدانوں میں کبھی بکری اور اونٹ کے چارے خاردار جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا وہاں اب میلوں تک کیا سردی کیا گرمی ہر موسم میں پھلوں کے باغیچے پھولتے پھلتے نظر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ سکھوں کی تباہ کاریوں کا اثر نہ صرف ذائل کر دیا گیا بلکہ تباہ کاری کو آبادکاری میں بدل دیا گیا۔ یہاں کی زمین نے اس سے پہلے کبھی اس طرح سونا نہیں اگلا تھا۔ اب موسم بہار میں خوبانی اور شفتالو کے باغیچے گلابی اور سفید پھولوں سے لدے نظر آتے ہیں اور بعد میں پھلوں سے لدی ہوئی ٹہنیاں جھومنے لگتی ہیں۔ ایک مہینہ بعد پوری

وادی مالٹرے کے پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے۔ یہ پھل موسم سرما کے وسط میں پکتے ہیں اور ھسپریڈیز کے سیب کی طرح سنہرے چراغ معلوم ہوتے ہیں۔ پشاور کی گنے کی فصل ہمیشہ مشہور رہی ہے اب یہاں بہترین قسم کا گنا پیدا ہوتا ہے۔ اور اب یہاں کے دیہات میں گڑ بنانے کی گھریلو صنعت نے اس علاقہ میں شکرسازی کے بڑے بڑے کارخانوں کی شکل اختیار کر لی ہے جنہیں پاکستان کی معیشت میں بڑا دخل ہے۔ تمباکو جو کبھی صرف نسوار کے لئے صوابی اور حضرو کی چاھی زمین پر پیدا ہوتا تھا اب نہری زمینوں میں دور تک کاشت کیا جاتا ہے اور اب اس کی پیداوار پر ایک بہت بڑی صنعت کا دارومدار ہے۔ کسان کی دولت میں اضافہ ہوا ہے اور چونکہ لگانداری کے طریقہ کی بنیاد قبائلی مساوات کے اصول پر قائم ہے جس سے خود کاشت کرنے والے زمیندار کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے یہ دولت چند ہاتھوں میں نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر وسیع پیمانہ پر منقسم ہے۔ آج پشاور، سوات، بنوں اور ایسے ہی دوسرے زرخیز علاقوں کی وادیاں شمالی علاقہ کے گلزار بنی ہوئی ہیں۔

زرعی ترقی میں جس شخص نے سب سے زیادہ مدد کی ہے اور جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا وہ کوتاہ قد اور چست و چالاک رابرٹسن براون ہے جو سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ وہ بیس سال سے زیادہ عرصہ تک آبادی سے دور ترناب فارم میں مقیم رہے۔ وہ کاشتکاروں کو یہ بتاتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے تھے کہ بہترین قسم کے بیج اور پودے استعمال کرنے سے غلہ اور پھل کتنا زیادہ پیدا ہوتا ہے اور مویشیوں کی نسل کس طرح بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ انہیں صرف ایک ہی دھن تھی وہ یہ کہ اس علاقہ کی زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ ان کی صرف ایک ہی تفریح تھی یعنی مویشیوں کے میلے، اور انہیں ایک سدھے ہوئے بیل سے بڑا لگاؤ تھا جسے وہ زراعتی فارم میں رکوٹوں پر کداتے تھے۔ ان کی یاد بھی لوگوں کے دلوں میں آج تک تازہ ہے۔

اس تمام عرصہ میں سکولوں اور کالجوں سے ایک روشن خیال طبقہ فارغ التحصیل ہو کر نکل رہا تھا پشاور کے اسلامیہ کالج اور ایڈورڈز کالج اپنے اپنے رنگ میں ایک نئی روایت کے علم بردار تھے صاحبزادہ کی یاد

اور خیبر کے دھانہ پر اسلامیہ کالج کے وجود سے پٹھان قومیت کا جو احساس بیدار ہوا تھا اسے اس وسیع النظری نے متوازن کردیا تھا جو ان کلاسوں میں سکھائی جاتی تھی جہاں ہربرٹ ایڈورڈز کی یاد تازہ تھی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ سرحد کی صوبائی سروس میں جو لوگ کلیدی عہدوں پر فائز ہوئے ان میں سے بیشتر اسلامیہ کالج کے فارغ التحصیل تھے جبکہ ڈاکٹر خان صاحب جو کل ہند نظریہ کے حامی تھے اور شیرشاہ کے پرستار تھے ایڈورڈ کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ ان دونوں رجحانات کی ضرورت تھی ایک سے تو پٹھان احیا کے لئے تعلیمی پس منظر فراہم ہو رہا تھا اور دوسرے رجحان سے یہ پتہ چلتا تھا کہ بر صغیر کی ترقی میں پٹھان کیا حصہ لے سکتے ہیں۔

ان دو کالجوں کے ساتھ اور کالج بھی قائم ہوگئے اور پہاڑوں کے دامن تک ہائی مڈل اور پرائمری سکولوں کا جال بچھا دیا گیا۔ وظائف اور دوسری سہولتوں نے سرحد پار کے قبائل کو بھی جدید تعلیم کا شوق دلایا (۱)۔ ہر سال جوں جوں یہ سہولتیں بڑھتی رہیں شمال مغربی سرحد کے پٹھانوں میں ایک للکار اور ترقی کے موقع کا احساس بڑھتا گیا۔ اس کے لئے ایک ایسی وسیع النظری کی ضرورت تھی جس کا ہلکا سا احساس پہلے سے موجود تھا لیکن جسے کبھی ٹھوس شکل نہیں ملی تھی۔ نوجوانوں کی نگاہیں ترقی اور روزگار کے پھیلتے ہوئے افق کی طرف اٹھنے لگیں اب وہ قبائلی تفریق کی زنجیروں کے پابند نہیں رہ سکتے تھے اور انہیں کابل کی اس حکومت سے نفرت پیدا ہوگئی جو درانیوں کی خاندانی حکومت کے دور اقتدار میں کنویں کا مینڈک بنی ہوئی ہے۔

احیا کا سلسلہ جاری تھا اور نئی شراب کو زیادہ دنوں پرانی بوتلوں میں بند نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ جوش جو قریب قریب سو فیصدی صحت مند تھا کلاسوں میں بہت سے استادوں کا پیدا کردہ تھا اور ایک لحاظ سے پٹھانوں کے ذہن میں انگریزوں کے نفوذ کا نتیجہ تھا۔ ہمیں اتنا تو معلوم ہے کہ پٹھان اور انگریز ذہنیتوں کا آپس میں امتزاج ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ سیاسی میدان میں اس علاقہ کی ترقی کے ذمہ دار تھے ان کے مقابلہ میں پٹھانوں

---

(۱) ۱۹۴۷ء کے بعد حکومت پاکستان نے قبائلی علاقہ میں بے شمار اسکول کھول دئے ہیں اور تعلیمی وظائف پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کر رہی ہے۔

کی امنگیں میدان جنگ میں لڑنے والے سپاهیوں اور تعلیم گاهوں میں پڑھانے والے اساتذہ کے ذهن میں زیادہ واضح تھیں۔ انگریز حکام پٹھانوں کے نوزائیدہ فخر و مباهات کو بروقت محسوس نہیں کرسکے۔ آئینی میدان میں ترقی کو دور اندیشی کی بھینٹ چڑھادیا گیا اور سیاسی امنگوں کو پورے هندوستان کے لئے وضع کی هوئی حکمت عملی اور دفاع کا پابند بنا دیا گیا۔ سائمن کمیشن کے زمانہ تک (۱۹۲۹ء) تمام فیصلے اس نظریہ کی بنیاد پر کئے جاتے تھے کہ صوبہ سرحد بارود خانہ هے جس میں چنگاری دکھانا مناسب نہیں هے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک سیاسی افق کو وسیع تر کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اور غم و غصہ کی آگ سلگتی رهی اور بھڑکتی رهی۔

صاحبزادہ عبدالقیوم وقتاً فوقتاً اپنی یہ بات منوانے کی کوشش کرتے رهے کہ اگر صوبہ سرحد کو پورے هندوستان کی سیاست کا ایک حصہ بن کر رهنا هے تو اسے بھی دوسرے علاقوں کی طرح نمائندہ حکومت کے قیام کا موقع دیا جائے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے رهے کہ جہاں تک سیاسی اور جمہوری شعور کا تعلق هے سرحد کے لوگ هندوستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں سے پیچھے نہیں بلکہ آگے هیں۔ ان کا اپنا نظام هے جس کے تحت وہ اپنے نمائندہ ادارے منتخب کرتے هیں۔ اور اپنا کام چلاتے هیں۔ اور جب برطانوی حکومت نے یہ خیال ظاهر کیا کہ صوبہ سرحد" اتنا چھوٹا هے کہ وهاں نمائندہ ادارے قائم نہیں کئے جا سکتے تو انھوں نے اپنے یکتا انداز میں جواب دیا کہ پسّو ایک چھوٹی سی چیز هوتی هے لیکن میرے وطن والے تو یہی سمجھتے هیں کہ وہ شلوار میں گھس کر بڑا تنگ کرتا هے۔

برطانوی حکومت نے صوبہ سرحد میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی منظوری دینے میں جس بے عملی کا ثبوت دیا اس سے کچھ ایسی طاقتیں حرکت میں آگئیں جن کے بغیر عبدالقیوم کے لئے بھی گول میز کانفرنسوں کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ ایک غیور قوم کی امنگوں کو نظرانداز کرنا کتنا خطرناک هو سکتا هے۔ دیہات میں ایک نئی سیاسی جماعت نے سر ابھارا۔ یہ ایک ایسی جماعت تھی جو انتخابات یا پارلیمانی نمائندگی کے کسی اور طریقہ کی غیر موجودگی میں پہلے تو اس مقصد سے بنائی گئی تھی کہ اس کے ذریعہ دباؤ ڈالا جائے پھر اسے لگا بندھا نظام درهم برهم

کرنے کے لئے عوامی تحریک کی شکل دے دی گئی۔ ایشیائی سیاست میں تضاد کی مثالیں بہت ملتی ہیں یہ بھی ایک سیاسی تضاد تھا کہ یہ جماعت بھی جو قریب قریب سو فیصد مسلم آبادی کی نمائندگی کا خواب دیکھ رہی تھی ہندوستان کی کانگریس پارٹی سے وابستہ ہو گئی جس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ غیر فرقہ دارانہ جماعت ہے لیکن جس کے بیشتر لیڈر ہندو ہیں اور جس کے انداز فکر پر بھی ہندومت چھایا ہوا ہے۔ لیکن ابتدا میں اس کی مجلس منتظمہ جو علاقائی بنیاد پر قائم کی گئی تھی صوبہ سرحد میں افغان جرگہ کے نام سے مشہور تھی اور اس کے معتبر رضاکار مسلح تو نہیں لیکن باوردی ضرور تھے اور خدائی خدمت گار کہلاتے تھے۔ چونکہ یہ خاکسار کتھئی رنگ کے کپڑے پہنتے تھے اس لئے جلد ہی انہیں سرخ پوش کا لقب مل گیا۔

اس پارٹی کے لیڈروں کی حیثیت سے دو شخصیتیں ابھریں جن کے لئے سرحد سے زیادہ وسیع علاقہ میں شہرت مقدر ہو چکی تھی۔ یہ دو حضرات ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالغفار خان ہیں۔ یہ دونوں ضلع پشاور کے علاقہ ہشت نگر کے گاؤں اتمان زئی کے ایک محمد زئی جان کے بیٹے ہیں۔ یہ دونوں ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور عام طور پر خان برادران کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑے بھائی ڈاکٹر خان نے ولایت سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ایک انگریز عورت سے شادی کی اور انڈین میڈیکل سروس میں بھرتی ہو گئے۔ وہ کسی زمانہ میں گائڈز کی ایک بٹالین کے میڈیکل افسر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے بھائی نے جداگانہ راستہ اختیار کیا۔ وہ تمام عمر لباس اور وضع قطع سے پرانے طرز کے دیہاتی پٹھان بنے رہے۔ وہ انگریزی سمجھتے ہیں لیکن بولتے نہیں۔ ان دونوں میں بہت سی باتیں مشترکہ ہیں پھر بھی دونوں بھائی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بڑا بھائی بے تکلف اور بچوں کی طرح فراخ دل ہے وہ بڑھاپے میں بھی تندرست اور ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ اس کے مسکرانے کا خاص انداز ہے جو لوگوں کو گرویدہ کر لیتا ہے چھوٹا بھائی نسبتاً دراز تر دبلا پتلا اور ڈاڑھی بڑھائے ہوئے ہے لیکن اس کی باتوں میں دیہاتیوں کے لئے بڑی کشش اور اثر ہے البتہ آنکھوں سے ذہانت اور مسرت ٹپکتی ہے دونوں بھائی اپنی اپنی جگہ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ لیڈر ہیں اور اپنے مخالفوں تک کو متاثر کر

سکتے ھیں۔ اصلی پٹھان میں یہی کمال ھوتا ھے۔

انڈین کانگرس جس کے لیڈر گاندی اور نہرو تھے کم از کم ظاھری طور پر فرقہ وارانہ بنیاد پر تنظیم کی مخالف تھی اور مسلم ثقافت کے قدیم مرکزوں مثلاً دھلی اور لکھنئو کے کچھ مسلمانوں کو اپنا ھمنوا بنانے میں کامیاب ھوگئی تھی۔ لیکن ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ صوبہ سرحد میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ سرخ پوش تحریک کے متعدد محرکات تھے لیکن اس تحریک کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ملی تھی کہ ۱۹۲۰ء میں جب ھندوستان کے دوسرے صوبوں میں ذمہ دار حکومتیں قائم کی گئی تھیں پٹھانوں کے صوبہ کو اس سے محروم رکھا گیا تھا۔ اس طرح روشنیہ تحریک اور سید احمد بریلوی کے مجاھدین کے عہد کی طرح ایک بار پھر ایک تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس بار جب پٹھانوں کی قومی امنگیں پوری نہ ھوئیں تو انہوں نے انڈین کانگرس کا سہارا لیا جو اس وقت ھندوستان میں واحد باثر سیاسی جماعت تھی۔ کانگرس نے جو متحدہ ھندوستان کے لئے جدوجہد کر رھی تھی اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی اس لئے اس علاقہ پر ھندوؤں کے غلبہ کا کوئی خطرہ نہیں تھا اور کانگرس پٹھانوں کو وہ سب کچھ دے سکتی تھی جو انہیں درکار تھا یعنی اپنے حقوق کی خاطر انگریزوں سے لڑنے کے لئے مالی اور تنظیمی اعانت۔ اس طرح شروع میں فرقہ پرستی کا کوئی خطرہ نہیں تھا اور پٹھان کانگرس کے حلیف بن گئے۔

مقامی طور پر سرخ پوش تحریک کا ایک اور بھی رخ تھا۔ ھر پٹھان معاشرہ دوھری خرابیوں کا شکار ھوتا ھے۔ اول تو پورے قبیلہ اور قوم کو چھوڑ کر خود ایک ھی خاندان میں باھمی چشمک ھوتی ھے۔ سربرآوردہ خوانین کے خود ان ھی کے طبقہ میں بہت سے ایسے دشمن تھے جو انہیں نیچا دکھانے کے موقع کی تاک میں رھتے تھے۔ اس رجحان کا خوشحال خان خٹک نے اپنی شاعری میں بڑا رونا رویا ھے اس کے متعلق پشتو میں ایک ضرب المثل بھی ھے کہ ایک کتے کو ھڈی مل جاتی ھے تو باقی تمام کتے اسے چھیننے کو دوڑ پڑتے ھیں۔ دوسری خرابی یہ ھے کہ ھر گاؤں میں پٹھان زمینداروں سے نیچے اھل حرفت اور نوکر پیشہ

لوگوں کا طبقہ پایا جاتا ہے مثلاً بڑھئی بھشتی وغیرہ۔ یہ طبقہ عام طور پر زمانۂ سابقہ میں مفتوحہ آبادی کے اخلاف پر مشتمل ہے اس کی زبان اور بودو باش کا طریقہ زمینداروں جیسا ہے لیکن معاشرے میں اسے زمینداروں کے مساوی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ نئی تحریک جس کی قیادت چھوٹے خوانین کے ھاتھ میں تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ نچلے طبقہ کو بڑے خوانین کے خلاف منظم کیا جائے۔ اور عام انتخاب کے سلسلہ میں پوری آبادی کو مساوات حاصل ہو جانے سے اس تحریک کو بڑی تقویت ملی۔ اس لئے جب آخرکار سرحد میں بھی نمائندہ ادارے قائم ہوئے اور وسیع آبادی کو ووٹ دینے کا حق ملا تو کانگریس نے انتخاب جیت لئے۔

ایک زمانہ میں سرحد کانگرس نے اضلاع میں ایک طرح کی متوازی حکومتیں قائم کر لی تھیں چنانچہ اس پر پابندی لگانی پڑی اور خان برادران کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن تحریک اپنا کام کر چکی تھی چنانچہ ۱۹۳۲ء میں صوبہ سرحد کو چیف کمشنری سے ترقی دے کر گورنر کا صوبہ بنا دیا گیا اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے برابر سیاسی اختیارات دے دئے گئے اور یہاں بھی ویسے ھی ادارے قائم کر دئے گئے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم اس صوبے کے پہلے وزیر بنے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں پٹھانوں کے صوبہ نے بھی دوسرے صوبوں کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت حکومت خود اختیاری کی جانب ایک اور قدم اٹھایا۔ اس نئی ترقی اور صاحبزادہ عبدالقیوم کی وفات کا وقت قریب قریب ایک ھی تھا (۱) ساتھ ھی ساتھ ڈاکٹر خان صاحب وسیع پیمانہ پر انتخابات کی بنیاد پر کامیاب ہو کر صوبہ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے برسراقتدار آ گئے۔ ان کے بھائی ہندوستان میں گاندھی کی طرح وزارت سے الگ رہے لیکن دیہات میں فرنٹیر کانگرس کے معتمد لیڈر بنے رہے۔ انہوں نے حکومت کی ذمہ داری سنبھالے بغیر برسراقتدار رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں وہ وجوہ بتا چکا ہوں جن کی بنا پر بہت سے بااثر پٹھان ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصہ میں انڈین کانگرس کے حلیف بننے پر آمادہ

---

(۱) سر عبدالقیوم نئی اصلاحات کے تحت صرف چھ مہینے وزیر رہے اور اپنی جگہ ڈاکٹر خان صاحب کے وزیر بننے سے تھوڑے دنوں بعد وفات پا گئے۔

ہوگئے تھے۔ پھر بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ پٹھان روایتی طور پر کس طرح طویل عرصہ تک ہندوؤں کی قیادت تسلیم کر سکتے تھے۔ یہ وہی ہندو لیڈر تھے جنھیں بیشتر پٹھان ڈڑھ منڈھے، ظاہردار اور بے ایمان سمجھتے تھے۔ پٹھان نے کبھی اپنے آپ کو ہندوستانی نہیں سمجھا وہ آئے دن ہندوستان جانے اور ہندوستان سے آنے کا تذکرہ کرتا رہتا تھا۔ اس کے تصور میں ہندوستان وہ ملک تھا جس کی سرحد درہ مارگلہ کے پار کسی جگہ شروع ہوتی تھی۔ پھر وہ کس طرح اس جماعت میں شامل رہ سکتا تھا جو نہ صرف ہندوستانی بلکہ برھمن ذہن کی پیداوار تھی۔

اس کا جواب صاف ہے۔ کانگریس کے ساتھ مل جانے میں کچھ عارضی فوائد تھے جو پہلے ہی بیان کئے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ بات فرنٹیر کانگرس کے لیڈروں تک کے ذہن میں بھی نہیں تھی کہ ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ایک ایسی حکومت جس پر ہندوؤں کا غلبہ ہو پٹھانوں پر حکم چلائے گی۔

خوشحال خان خٹک پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ ع

میں نے بہلول اور شیر شاہ کی کہانی سنی ہے
کسی زمانہ میں پٹھان ہندوستان کے بادشاہ تھے۔

شیر شاہ صرف ڈاکٹر خان صاحب کا نہیں بلکہ تمام اصلی پٹھانوں کا تاریخی ہیرو تھا۔ پٹھانوں نے یہی سوچا کہ اچھا زمانہ آنے پر جب انگریز چلے جائیں گے تو پٹھان پھر غالب ہوں گے اس لئے کانگرس کے روپیہ اور سمجھ بوجھ سے فائدہ اٹھانے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہی سوچتے ہوئے بہت سے لوگوں نے اپنے ضمیر کو سُلا دیا۔

غیر منقسم ہندوستان میں ایک واضح مسلم تحریک آہستہ آہستہ شروع ہوئی اور ابتدا میں اس تحریک کا انجام یقینی نہیں تھا۔ جب تک ہندوستان سے دست بردار ہونے کے متعلق انگریزوں کی تیاریاں اتنی واضح نہیں ہوگئیں کہ جنہیں پہلے یقیں ہی نہیں آتا تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دیں گے وہ بھی نوشتۂ دیوار سمجھنے لگے (حال آنکہ وہ یہ تیاریاں پسند نہیں کرتے تھے) اس وقت تک دو قوموں کے نظریہ نے عملی سیاست

کی شکل اختیار نہیں کی۔ پاکستان کا تصور سب سے پہلے ہندوستان کے ان علاقوں کے مسلمانوں کو پسند آیا جہاں مسلمان ثقافتی اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم تھے۔ جناح کراچی میں پیدا ہوئے تھے لیکن انہوں نے بمبئی کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اسی طرح لیاقت علی خان بھی وسط ہند میں اس ضلع کے رہنے والے تھے جو دھلی کے قریب تھا۔ کئی سال تک پنجاب کے مسلمانوں نے جو ہندوؤں اور سکھوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں برائے نام اکثریت میں تھے جناح کی قیادت قبول نہیں کی اور مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے۔ سرحد میں جہاں کی ۹۳ فیصد آبادی مسلمان تھی ڈاکٹر خان صاحب جو کانگرسی تھے انتخابات میں بھی کامیاب ہوگئے اور بدستور برسر اقتدار رہے۔ دو قوموں کا نظریہ اب بھی ڈانواڈول تھا اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اسے تسلیم کر لیا جائے گا

جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت مستحکم رہی اور ۱۹۴۳ء تک جبکہ جنگ کا پانسہ محوری طاقتوں کے خلاف پلٹ چکا تھا صوبہ سرحد یا شمالی ہند کے کسی اور علاقہ میں کسی کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار اس قدر جلد ختم ہونے والا ہے۔ ۱۹۱۹ء کی طرح اس بار بھی جنگ میں فتح پاتے ہی گرفت ڈھیلی کر دی گئی۔ لندن میں ایک ایسی حکومت برسراقتدار آئی جو ہندوستان میں ذمہ داری سے دست بردار ہونے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ چنانچہ ہر طرف سے یہی آواز آنے لگی کہ انگریزوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے۔ جب یہ حقیقت عیاں ہونے لگی کہ انگریز ہندوستان سے دست بردار ہونے کا منصوبہ بنا چکے ہیں تو صوبہ سرحد کے لیڈر اس سوچ میں پڑ گئے کہ ان کا کیا بنے گا۔ اب جبکہ نئی سرحدیں قائم کی جا رہی ہیں تو کیا وہ بدستور سرحد میں ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے قبائلی اور خاندانی جھگڑوں کو شہ دے سکیں گے۔ وہ شش و پنج میں پڑگئے اور نہرو جو نئے وزیر خارجہ تھے اور جن کے عہدہ کی اہمیت کی وجہ سے ان کی بات میں وزن تھا اپنے حامیوں کو یکجا کرنے کے لئے پشاور آئے۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا لیکن دور اندیشی سے بعید تھا اور اس کی ناکامی لازم تھی۔ یہ دورہ ان لوگوں کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہوا جو متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے۔ پٹھانوں کی اکثریت یہ سوچ رہی تھی کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ ناممکن ہے یعنی افغان ایک برھمن کے اشاروں پر ناچنے



آفریدی جرگہ - پاکستان میں شمولیت

لگیں جو دوسرا بیربل ہے بلکہ بیربل سے بھی زیادہ خودسر ہے۔ وہ میدانی یا پہاڑی علاقہ میں یہ صورت حال برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اسلام کے پرچم لہرائے گئے اور جناح اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر خان اور ان کے بھائی سے اقتدار چھن گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو رائے شماری کے بعد صوبہ سرحد پاکستان مین شامل ہوگیا۔ یہ قدم اٹھاتے وقت ہر ممکن جوش و خروش سے مظاہرہ کیا گیا۔ اسی سال نومبر میں اس اقدام کے نمونہ پر ڈیورینڈ لائن تک تمام قبائل اور سرحد کی چار ریاستوں دیر، سوات، چترال اور امب کے والیوں نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کردیا۔ قبائل نے جرگوں میں اور والیان ریاست نے الحاق کے کاغذات پر دستخط کر کے اپنی شمولیت کا اعلان کیا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاهئے کہ جس وقت سب کی نظریں پورے ہندوستان میں سیاسی اور آئینی تبدیلیوں پر لگی ہوئی تھیں سرحد پار کے قبائل یا ان کے سردار بے خبر بیٹھے تھے۔ وہ فرنٹیر کانگرس کی ریشہ دوانیوں سے متاثر نہیں ہوئے تھے اور انہیں کانگریس کا هم نوا بنانے کی جو کوششیں وقتاً فوقتاً کی گئیں تھیں ان کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ قبائل کا جو کچھ بھی اثر تھا وہ جناح کی اس سادہ اپیل کے حق میں استعمال ہوا کہ اسلام خطرہ میں ہے۔ قبائل کی نظر میں عبدالغفار خان کے نظریات مبہم اور ناقابل فہم تھے یا پٹھانوں کی ان روایات کے خلاف تھے جن کا تقاضا یہ ہے کہ اتحاد اسلامی کی حمایت کی جائے۔ اضلاع میں بھی یہی احساسات کارفرما تھے اور عرصہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ حالات نیا رخ اختیار کریں۔ ساتھ هی ساتھ کابلی حکومت نے ایک ڈرامائی قدم اٹھایا جو اس سیاسی نظریہ کے منظر عام پر آنے کا اصل سبب بنا جو پختونستان یا پٹھانستان کے نام سے مشہور ہے۔

کابل اور پشاور میں بیٹھ کر پختونستان کے بالکل دو مختلف معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ درانی بادشاہ امان‌الله اپنے دور حکومت میں پٹھانوں جیسا لباس پہنتے تھے اور جرگوں کے سامنے پشتو میں تقریر کرتے تھے جو اسی موقع کے لئے رٹی ہوئی ہوتی تھی۔ ان کے زمانہ میں پشتو کو افغانستان کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا تھا (حالآنکہ کابل میں معدودے چند حضرات هی یہ زبان بول یا سمجھ سکتے تھے) بعد میں

نادر اور ان کے جانشینوں نے قبائل کے ساتھ اپنے تعلقات کی وجہ سے فائدہ بھی اٹھایا اور نقصان بھی۔ یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ کابل کا موجودہ حکمران خاندان براہ راست پشاوری سرداروں کی اولاد ہے۔ موجودہ فرماں روا ظاہر شاہ اور ان کے سر کردہ وزرا سلطان محمدخان کے پوتے ہیں۔ پشاور میں ان کے لئے زبردست کشش ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اختیارات کی منتقلی سے پہلے افغان حکومت نے اس خواہش کو باقاعدہ دعوے کی شکل دی اور مطالبہ کیا کہ انگریز برصغیر سے دست بردار ہونے کی صورت میں دریائے سندھ کے کنارے تک پٹھان آبادی کا پورا علاقہ افغانستان کے حوالہ کر دیں۔

بعد میں اس دعوے کو نئے رنگ میں ڈھال دیا گیا۔ اب افغانستان کی طرف سے باقاعدہ جو مطالبہ کیا جاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ پٹھانوں کا جداگانہ ملک قائم کیا جائے۔ بظاہر یہ ملک پاکستان کے علاقہ میں سے بنایا جائیگا۔ اس مفروضہ مملکت اور کابل کے درمیان برادرانہ تعلقات ہوں گے لیکن ابھی تک واشگاف الفاظ میں پٹھانستان کو افغانستان میں شامل کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ افغان حکومت کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ برصغیر سے انگریزوں کے دست بردار ہوجانے کے ساتھ ساتھ ڈیورینڈ لائن ختم ہو چکی ہے اور ایسی صورت میں مفروضہ پختونستان کی مغربی سرحد متعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس دعوے کی پشت پر جو حقیقی خواہش کارفرما ہے وہ اس بات سے جھلکتی ہے کہ کابلی حکومت اس سوال پر بالکل خاموش ہے کہ آیا اس پختونستان میں افغانستان کے وہ علاقے بھی شامل ہوں گے یا نہیں جہاں پختو یا پشتو بولی جاتی ہے۔ ان تمام نکات پر بہ یک وقت غور کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ افغانستان کے مطالبہ کی آڑ میں اصل کی طرف مراجعت کی خواہش کارفرما ہے۔ بین الاقوامی سطح پر ان مطالبات کے جواب میں حکومت پاکستان کی دلیل یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے حقوق اور ذمہ داریوں کی وارث ہے۔ اس دلیل کی برطانوی حکومت برملا تائید کر چکی ہے۔

پاکستان کی حدود میں پٹھان مملکت کا قیام جس کا مطالبہ عبدالغفار خان اور ان کے حامی کرتے ہیں بالکل مختلف ہے۔ یہ مطالبہ بالکل واضح نہیں ہے

لیکن اس کا خلاصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پٹھان مملکت داخلی طور پر خود مختار ہو گی اور کابل کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بنے گی لیکن پٹھانوں کے قومی شعور کی تسکین کر سکے گی جو اپنے اظہار کے لئے جداگانہ تنظیم کا متقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نمونے کا پختونستان اپنے مشرق کی جانب پاکستان یا ہندو مسلمان یا دونوں سے تعلقات قائم رکھے گا۔ جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں وہ یۂ نہیں سوچتے کہ ایسی مملکت کس طرح برقرار رہ سکتی ہے۔ سرحد ہمیشہ اس بڑی وحدت کی مالی اور دوسری اعانت کا محتاج رہا ہے جس کے لئے یہ علاقہ دفاعی ڈھال بنا رہا ہے۔ لیکن اس علاقہ کے باشندون کا خلوص قابل احترام ضرور ہے۔ شیر شاہ کی تلوار اور خوشحال خان کے جوشیلے اشعار پٹھانوں کو جداگانہ تقدیر کا مالک بننے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ اور اب نہ صرف یہ نصب العین خواب بن کر رہ گیا ہے بلکہ شمال مغربی سرحدی صوبہ جو ان کے لئے مختصر سا اسٹیج تھا ان کی نظر میں اپنی حیثیت کھو چکا ہے اور بڑی وحدت میں ضم ہو گیا ہے(۱)۔ انفرادیت پسند جوشیلے پٹھانوں کے لئے ایک یونٹ کا نعرہ کوئی کشش نہیں رکھتا۔ پشاور یا پٹھانوں کی زبان میں خار (شہر) اب دارالحکومت نہیں ہے۔ اور اب پٹھانوں کی کیا حیثیت ہے؟۔ عبدالغفار خان جیسے لوگوں کے لئے موجودہ صورت حال بڑی تلخ ہے۔ رونق ختم ہو چکی ہے اور عظمت رخصت ہو چکی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پٹھانوں کی کیا حیثیت ہے؟ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ۱۹۰۰ء میں کرزن حق بجانب تھے۔ وہ پورے مسئلہ کو ذہن میں لائے بغیر عام پٹھانوں کے شعور کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک زبردست طاقت کو برصغیر کی تعمیر کے لئے استعمال کرنے کا بڑا کارنامہ انجام دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کرزن نے اپنے زمانہ میں جو کچھ کیا اسے ان بدلے ہوئے حالات میں بھی جوں کا توں رہنے دیا جائے جو نصف صدی بعد درپیش ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پٹھان جن میں صرف اضلاع کے باشندے ہی شامل

---

(۱) اکتوبر ۱۹۵۵ء میں سندھ کے طاس کے تمام صوبوں کو جن میں شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی شامل ہے ضم کر کے مغربی پاکستان کی وحدت بنا دی گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک یونٹ ہمیشہ قائم رہے گی۔ پٹھانوں کی غیرت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نہیں ہیں تعلیم ملازمت اور زندگی کی دوسری اعلیٰ چیزوں کے لئے مشرق کی طرف آس لگانے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ وہ درانیوں کے معاشرتی معاشی اور سیاسی نظریات کو فرسودہ سمجھنے لگے ہیں۔ ان کے نزدیک کابل کی اصل کی طرف مراجعت کی تحریک بے معنی ہے۔ اور اگر کبھی سیاسی انضمام ہوا تو اس کی شکل بالکل مختلف ہو گی۔ پشاور کابل کو اپنے اندر سمولے گا۔ کابل پشاور کو نہیں سمو سکے گا۔ اس کے علاوہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ابتدا میں اس لئے اہم ضرور تھا کہ اس کے ساتھ پٹھانوں کی وفاداریاں وابستہ تھیں لیکن نمائندہ حکومت کے تمام لوازم کی وجہ سے اس چھوٹے سے صوبہ کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ اس کے علاوہ صوبہ کی سیاست پر صوبہ پرستی اور علاقہ پرستی کا رنگ غالب آگیا تھا۔ یہ بات بھی غورطلب ہے کہ پٹھان عام طور پر اپنے وطن سے باہر ہی اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ پٹھانوں نے دور دراز علاقوں میں بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی حیثیت سے ایسا نام روشن کیا ہے جس کی چمک خود ان کے وطن کو تابناک بنا گئی ہے۔ سرحد پر لٹیرا بننے میں اتنی عزت نہیں جتنی دریائے سندھ کے پار کا حاکم بننے میں ہے۔ کم از کم ڈاکٹر خان صاحب کا یہی خیال ہے اور وہ اس سوال پر اپنے بھائی سے الگ ہوگئے ہیں۔

پٹھانوں کا مستقبل غیر یقینی نہیں ہے البتہ ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ مستقبل وادی سندھ کے باشندوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ پٹھانوں کی اخلاقی طاقت پٹھان سپاہی کی بہادری، سیاست کو سمجھنے میں پٹھان ذہن کی رسائی یہ سب صفات اس سے پہلے بھی اس قوم کے بزرگوں کو ان کے وطن سے دور اعلیٰ مرتبہ تک پہنچا چکی ہیں آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا اور اب یہ مرحلہ آسان ہے کیونکہ پٹھانوں کے اپنے وطن میں نشأۃ ثانیہ کا دور دورہ ہے اور پٹھان کہیں بھی ہو اپنے وطن سے ضرور لگاؤ رکھتا ہے۔ انہیں یہ اندیشہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ایک یونٹ میں اپنی بات نہیں منوا سکیں گے وہ برطانیہ عظمیٰ میں اسکاٹلینڈ کے باشندوں کی طرح ہیں۔ دوسرے پہاڑی باشندوں کی طرح پاکستان کے پٹھان بھی مستقبل قریب میں بڑی حد تک اپنے ملک کی تقدیر کے مالک بن جائیں گے۔ نئے صوبہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر سب سے پہلے ڈاکٹر خان صاحب کا

فائز ہونا پٹھانوں کے لئے نیک فال ہے (۱)۔

لیکن اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ سرحد میں کسی بھی اقدام کی خواہ وہ آگے کی طرف ہو یا پیچھے کی طرف قطعی ذمہ داری مملکت کی حفاظت کی خاطر مرکزی حکومت ہی پر عائد ہوتی ہے۔ قبائل کے روز مرہ کے کام کراچی یا لاہور میں بیٹھ کر نہیں چلائے جا سکتے۔ ان شہروں میں بیٹھے ہوئے حاکم سرحد کے عوام سے بہت دور ہیں اور وہ یہاں کے ماحول سے بھی بے تعلق ہیں۔ سرحد کے مسائل کو مضبوطی کے ساتھ بر وقت حل کرنے کے لئے اختیارات کی مرکزیت کسی حد تک ختم کرنا ضروری ہے۔

اور اب دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ کا جائزہ لینے کے بعد میں یہ بحث ختم کرتا ہوں۔ میرے لئے یہ احساس بڑا خوش آئند ہے کہ انگریزوں کی آخری ٹکڑی نے غریب لوگوں کی خدمت کی قبائل سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کی یہاں تک کہ آخر میں انگریز قبائل کو اتنی اچھی طرح جان گئے کہ اس سے پہلے کسی نے نہیں جانا تھا۔ ان میں سے بہت سے انگریز افسر میرے دوست ہیں اور ابھی حیات ہیں اس لئے میں ان کے متعلق اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا کہ وہ ہر حیثیت سے اخوت کے رشتہ میں منسلک تھے۔ ان میں سے ہر شخص کے دل میں اتنے ہی جذبات موجود ہیں جتنے وہ ظاہر کر چکا ہے بلکہ دل میں چھپے ہوئے جذبات زیادہ ہیں۔

اختیارات کی منتقلی سے پہلے ان میں سے آخری افسر راقم السطور تھا اور یہ کتاب اس کی شہادت ہے۔

---

(۱) مئی ۱۹۵۸ء میں جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ رہا تھا ڈاکٹر خان صاحب کو لاہور میں قتل کر دیا گیا۔ وہ کھرے پٹھان تھے انہوں نے اپنے قاتل کو پکڑ لیا اور مرنے سے پہلے اسے گرفتار کرا دیا۔

ضمیمے

ضمیمہ الف

سرحد کے حکمران خاندان

مندرجہ ذیل گوشوارہ میں ان حکمران خاندانوں کے نام درج ہیں جو گندھارا (وادی پشاور) میں برسراقتدار رہے ہیں یا جن کی رعایا میں افغان اور پٹھان شامل ہیں۔ صرف ان ہی حکمرانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے اس علاقہ کی تاریخ پر اثر ڈالا ہے۔

امیّہ اور عباسی خلفا کا اقتدار ھلمند سے مشرق کی طرف نہیں پہنچ سکا تھا اس لئے انہیں اس گوشوارہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح دھلی کے حکمران افغان خاندانوں خلجی، لودی اور سُور کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ ان خاندانوں نے دریائے سندھ کے مغرب میں کبھی حکومت نہیں کی۔ محمد زئی اور بارک زئی خاندانوں کا کبھی پشاور پر قبضہ نہیں رھا لیکن انہیں گوشوارہ میں شامل کرلیا گیا ہے کیونکہ ان کی بہت سی رعایا افغان اور پٹھان ہے۔

(گوشوارۂ ذیل میں مقامی صدر مقام (LOCAL CAPITAL) کے لئے م ص م استعمال ہوا ہے)

حکمران خاندان	صدر مقام	عہد	حکمرانوں کے نام	کیفیت
۱) اخامنشی (ایرانی)	سوسہ، اصطخر م ص م پشکا پوروس (پشاور) اور پشکلاوتی (چارسدہ)	۵۵۰-۳۳۱ ق م	کسریٰ دارائے اعظم کیخسرو دارائے ثانی	اس فہرست میں سے بہت سے بادشاھوں کے نام حذف کردئے گئے ہیں۔

حکمراں خاندان	صدر مقام	عہد	حکمرانوں کے نام	کیفیت
۲) مقدونی (یوریی)	PELLA پیلا۔ بابل سوسہ، م ص م پشکلاوتی (چارسدہ)	۳۲۷-۳۰٦ ق م	سکندر اعظم سلوکس	سلوکس ۲۸۰ ق م تک زندہ رہا لیکن اسے ۳۰۵ ق م میں گندھارا سے نکال دیا گیا تھا۔
۳) موریہ (هندوستانی)	پاٹلی پترا (پٹنہ)	۳۲۳-۱۹۰ ق م	چندر گپت اشوک	اشوک جو بودھ مت کا پیشوا بھی تھا ۲٦۴ ق م سے ۲۲۷ ق م تک حکمراں رہا۔
۴) یونانی باختری۔ (ایرانی نسل جس نے یونانی اثرات قبول کر لئے تھے۔	ٹیکسیلا	۱۸۵-۹۷ ق م	ڈمیٹریس مغانڈر	باختری خاندان کی ابتدا ۲۰٦ ق م میں ہوئی اس خاندان نے ۱۸۵ ق م میں گندھارا فتح کیا۔
۵) ساکا (ایرانی)	ٹیکسیلا ۔	۹۷ ق م تا ۵ عیسوی	ماویس آئیس اول	ستھی خانہ بدوش جو پارتھیوں کے قرابت دار تھے۔
٦) هندی پارتھی۔ (ایرانی)	ٹیکسیلا	۷ تا ۵۷ عیسوی	گنڈو فیرس	ایران کے اس حکمراں خاندان کی شاخ جو ۲۴۹ ق م سے ۲۲۵ء تک حکمراں رہا۔
۷) کشان (ایرانی نسل جس نے بعد میں هندوستانی اثرات قبول کر لئے تھے)۔	پرشا پورا (پشاور)	٦۰ تا ۲۲۵ء	کاڈفیس اول و دویم کنشک، واسشکا هوبشک، واسودیو	کنشک بودھ مت کا دوسرا بڑا اوتار تھا۔ بعد میں یہ خاندان برهمن هو گیا۔

حکمراں خاندان	صدر مقام	عہد	حکمرانوں کے نام	کیفیت
۸) ساسانی الف (ایرانی)	اسطخر م ص م پشکیبوره (پشاور)	۲۳۰ تا ۳۶۵ء	اردشیر، شاپور (۲۴۰ تا ۳۷)	یہ خاندان چارسو سال سے زائد عرصہ تک (۲۲۶ تا ۶۴۲ء) ایران پر حکمراں رہا۔ دو مختلف عرصوں میں اس کا اقتدار دریائے سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔
۹) کداری (ایرانی)	نامعلوم	۳۶۵ تا ۴۵۵ء	کدارا	۱۰ء تک باختر سے نکال دیا گیا۔
۱۰) سفید ھن یا ھفتالی (ترک)	بلخ م ص م سکالا (سیالکوٹ)	۴۵۵ تا ۵۵۰ء	تورا مینا مہرا گلا	باختر میں ۵۶۸ء تک حکمراں رہے پھر ساسانیوں سے شکست کھا گئے۔
۱۱) ساسانی ب (ایرانی)	اصطخر م ص م نامعلوم	۵۶۸ تا ۶۴۲ء	خسرو اول خسرو دویم یزدگرد	عربوں نے نہاوند کے مقام پر ۶۴۲ء (۲۱ ھجری) میں شکست دی۔
۱۲) (الف) کابل شاھی (ب) رتبیل یا زنبیل (ترک ایرانی)	(الف) کابل غزنی کے (ب) قریب کسی جگہ جس کا تعین نہیں کیا جا سکتا	۶۵۰ تا ۸۷۰ء	(الف) سپالاپتی (کلر) (ب) رتبیل لقب ہے نام معلوم نہیں	غالباً کشان اور ہیتال خاندانوں کا میل تھا جس نے ہندوستانی اثرت قبول کر لئے تھے یہ خاندان مسلمان نہیں تھا۔

حکمراں خاندان	صدر مقام	عہد	حکمرانوں کے نام	کیفیت
۱۳) صفاری (ایرانی نسل مسلمان)	زرنج (سیستان)	۸٦۱ تا ۹۰۰ء	یعقوب لیس عمرو لیس	یعقوب نے ۸۷۰ء میں کابل شاھوں سے کابل چھین لیا اور غزنی کی بنیاد ڈلی۔ اس نے کبھی گندھارا پر حکومت نہیں کی۔
۱۴) ہندو شاھیہ (ترک ایرانی خاندان جو ہندوستانی ہوگیا تھا)	اوھند (ہنڈیا لاھور جو گندھارا میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے)	۸۷۰ تا ۱۰۲۱ء	سمند، کمالو، بھیم، جے پال انند پال	غالباً یہ بھی کابل شاھی خاندان تھا۔ اس علاقہ میں ہندو حکمرانوں کا یہ آخری خاندان تھا۔
۱۵) غزنوی (ترک مملوک)	غزنی	۹٦۰ تا ۱۱۵۰ء	سبکتگین، محمود مسعود	گندھارا پر حکومت کرنے والا پہلا مسلمان خاندان۔
۱٦) غوری (غالباً تاجک یا ایرانی)	فیروز کوہ، غزنی دھلی	۱۱۸۱ تا ۱۲۰٦ء	علاوالدین جہاں سوز معزالدین	پشاور پر حکومت نہیں کی البتہ یہاں سے راستہ نکالا۔
۱۷) خوارزم شاہ (سلجوق ترک)	ارغنچ	۱۲۱۰ تا ۱۲۲۰ء	محمد جلال الدین	غزنی پر حکومت کی۔ پشاور میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی یہاں تک کہ چنگیز نے پورا علاقہ تاخت تاراج کر دیا۔

حکمران خاندان	صدر مقام	عہد	حکمرانوں کے نام	کیفیت
۱۸) چنگیزی (منگول)	الممالک	۱۲۲۰ تا ۱۳۶۹ عیسوی	چنگیز ۱۲۲۷ء میں فوت ہوا چغتائی ۱۲۴۱ میں مر گیا۔ ان کے جانشین اہمیت حاصل نہ کر سکے	اس عرصہ میں پشاور اور پورے افغان علاقہ میں طوائف الملوکی پھیلی رہی دہلی کے حکمراں بھی صورت حال پر قابو نہ پا سکے۔
۱۹) تیموری (ترک ایرانی منگول)	سمرقند م ص م کابل قندھار، ھرات	۱۳۸۰ تا ۱۵۰۱ء	تیمور لنگ جو ۱۴۰۳ میں فوت ہوا شاہ رخ ابوسعید الغ بیگ ثانی (۱۳۶۹-۱۵۰۱ء) ھرات اور قندھار کا حاکم حسین باقرا	اس زمانہ میں بھی افغانوں اور پٹھانوں کے علاقہ میں طوائف الملوکی پھیلی رہی۔ الغ بیگ ثانی کابل کا حکمراں تھا۔
۲۰) مغل	دہلی۔ آگرہ علاقائی صدر مقام کابل، پشاور	۱۵۲۶-۱۷۳۹ء	بابر، ھمایوں، اکبر، جہانگیر، شاھجہان، اورنگزیب	بابر کے چچا الغ بیگ ثانی کی نسل میں ہونے کی وجہ سے حکومت کے دعویدار بنے۔ حکمرانوں کے چھوٹے بھائیوں کو ۱۵۸۱ تک کابل اور پشاور جاگیر کے طور پر ملتے رہے۔
۲۱) افشار (ترکمان)	اس کی زین اس کا تخت تھا	۱۷۳۹-۱۷۴۷ء	نادر شاہ	نادر نے سندھ پار کا علاقہ مغلوں سے چھین لیا۔

حکمراں خاندان	صدر مقام	عہد	حکمرانوں کے نام	کیفیت
۲۲) درانی، سدوزئی پوپل زئی (افغان)	قندھار کابل م ص م پشاور	۱۷۴۷-۱۸۱۸ء	احمد شاہ تیمور شاہ شاہ زمان شاہ محمود شاہ شجاع	پہلا حکمراں افغان خاندان۔
۲۳) سکھا شاہی (پنجابی)	لاھور	۱۸۲۳-۱۸۴۶ء	رنجیت سنگھ جو ۱۸۳۹ء میں فوت ہوا۔	رنجیت قریباً ۱۸۰۰ میں برسراقتدار آیا لیکن پشاور پر اس کا قبضہ ۱۸۲۳ء میں ہوا۔
۲۴) درانی، محمد زئی بارک زئی اول (افغان)	کابل	۱۸۲۶-۱۹۲۸	دوست محمد شیر علی عبدالرحمان حبیب اللہ امان اللہ	ان حکمرانوں نے کبھی پشاور پر حکومت نہیں کی لیکن ان کی قریباً نصف رعایا افغان یا پٹھان ہے۔
۲۵) بارک زئی دویم (افغان)	کابل	۱۹۲۹	نادر شاہ ظاھر شاہ	
۲۶) انگریز	کلکتہ۔ دھلی م ص م پشاور	۱۸۴۶-۱۹۴۷	۱۸۵۸ تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت پھر تاج برطانیہ نے اقتدار سنبھال لیا۔	سکھوں کی لڑائیوں کے بعد سکھوں سے اقتدار حاصل کر لیا۔

۲۷) ۱۴ اگست ۱۹۴۷ سے اب تک حکومت پاکستان۔

ضمیمہ ب

ڈیورینڈ لائن

الف۔ معاہدۂ ڈیورینڈ سے اقتباسات

(اس معاہدہ پر کابل میں امیر عبدالرحمان نے
۱۲ نومبر ۱۸۹۳ء کو دستخط کئے)

۱۔ ہز ہائنس کی مملکت کی مشرقی اور جنوبی سرحدیں وخن سے ایران کی سرحد تک معاہدہ کے ساتھ منسلکہ نقشہ میں دکھائی ہوئی سطر کے ساتھ ساتھ ہوں گی۔

۲۔ حکومت ہند کسی بھی وقت ان علاقوں میں مداخلت نہیں کرے گی جو اس لائن کے پار افغانستان میں واقع ہیں۔ اسی طرح ہز ہائنس کسی وقت بھی ان علاقوں میں مداخلت نہیں کریں گے جو اس لائن کے پار ہندوستان میں واقع ہیں۔

۴۔ اما بعد جہاں جہاں قابل عمل اور مناسب ہوگا سرحد کی تفصیلی نشان بندی کی جائے گی۔ یہ کام مشترکہ اینگلو افغان کمشنر کریں گے جن کا نصب العین یہ ہوگا کہ باہمی مفاہمت کے ذریعہ ایسی سرحد متعین کریں جو معاہدہ کے ساتھ منسلکہ نقشہ میں دکھائی ہوئی لائن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو....

نوٹ۔ معاہدہ کا باقی حصہ ان علاقوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے جس پر ایک یا دوسرا فریق اپنے دعوے سے دست بردار ہو گیا تھا مثلاً امیر اس بات پر رضامند ہو گئے تھے کہ وہ سوات، باجوڑ اور چترال اور

اسی طرح وزیر اور دوڑ قبائل کے علاقہ میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اور انگریز بیرمل میں مداخلت نہیں کریں گے۔ معاھدہ کے تحت امیر کی مالی اعانت میں بھی اضافہ کردیا گیا۔

دو مستثنیات سے قطع نظر جو علاقے بھی قابل گزر تھے (شمالی پہاڑوں پر گزر ممکن نہیں تھا) سطح زمین پر سرحد کی نشان بندی کر دی گئی تھی اور سرحد کے ستون نصب کردئے گئے تھے۔ اب یہ ستون غائب ھو چکے ھیں۔ چترال کی سرحد پر سرحد کی نشان بندی کا جو کام پہلے چھوڑ دیا گیا تھا دوسری جنگ عظیم کے دوران پورا کردیا گیا۔

دوسرا استثنا سرحد کا وہ حصہ ھے جو نواسر (کونڑ اور باجوڑ کو تقسیم کرنے والے سلسلہ کوہ پر واقع) سے سکارام کی چوٹی (سفید کوہ کے مغربی سرے پر پیواڑ کوتل کے اوپر) تک پھیلا ھوا ھے۔ سرحد کا یہ حصہ مہمند علاقہ سے گزرتا ھے (اور اس علاقہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ھے) اور اس میں افغانستان کی طرف خیبر اور افریدی علاقہ کی سرحد بھی شامل ھے۔ اس کے ایک چھوٹے سے حصہ کی جو درۂ خیبر کے مغربی دھانہ پر واقع ھے تیسری افغان جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں نشان بندی کی گئی تھی۔ باقی سرحد کی سطح زمین پر کبھی نشان بندی نہیں کی گئی جہاں تک دس ھزار فٹ سے سولہ ھزار فٹ تک اونچے سلسلہ کوہ سفید کا تعلق ھے جو بدیہی طور پر افریدی علاقہ اور افغانستان کی درمیانی سرحد کا کام دیتا ھے سرحد کی نشان بندی نہ ھونا زیادہ اھم نہیں ھے۔ لیکن دریائے کابل کے شمال میں مہمند علاقہ میں جہاں یہ سرحد بیچ سے ھوکر گزرتی ھے اس کی وجہ سے جھگڑے پیدا ھوگئے ھیں۔

ان جھگڑوں کے تصفیہ کی نیت سے حکومت ھند نے امیر کو مہمند علاقہ سے گزرنے والی ایک متبادل سرحد کی پیشکش کی تھی جو نقشہ میں دکھائی ھوئی سرحد سے مشرق کی طرف واقع تھی اور جسے مفروضہ سرحد کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے تحت بوھائی ڈاگ وادی افغانستان کا حصہ بن جاتی۔ اس پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

ب۔ اینگلو افغان معاہدہ ۱۹۰۵ء سے اقتباس

(اس معاہدہ پر اپریل ۱۹۰۵ء میں امیر حبیب اللہ اور اس برطانوی مشن نے دستخط کئے جس کے قائد سرلوئی ڈین تھے)

ہرمیجسٹی بذریعہ ہذا اقرار کرتے ہیں کہ میرے والد مرحوم امیر عبدالرحمان نے برطانوی حکومت کے ساتھ جس معاہدہ پر دستخط کئے تھے اور جس کے وہ پابند رہے تھے اس معاہدہ کے اصولوں اور اضافی اہمیت کے معاملات کے پیش نظر ہم بھی ان تمام معاہدوں اور ذمہ داریوں کے پابند تھے پابند ہیں اور پابند رہیں گے اور ہم کسی طرح ان کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔

ج۔ معاہدہ راولپنڈی ۱۹۱۹ء سے اقتباس

(اس معاہدہ پر ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو اس افغان مشن نے دستخط کئے جو تیسری افغان جنگ باقاعدہ ختم کرنے کے لئے راولپنڈی بھیجا گیا تھا)

۵۔ افغان حکومت ہندوستان اور افغانستان کی اس درمیانی سرحد کو تسلیم کرتی ہے جسے امیر حبیب اللہ مرحوم نے تسلیم کیا تھا۔

نوٹ:۔ اس معاہدہ کے تحت یہ بھی طے پایا تھا کہ خیبر کے مغربی سرے پر سرحد کی نشان بندی کی جو تجویز ہے اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ چنانچہ اس سرحد کی نشان بندی بھی کر دی گئی تھی۔ معاہدہ کی اس شق کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاہدۂ ڈیورینڈ کے تحت جو سرحد متعین کی گئی تھی اور ۱۹۰۵ء میں جس کی تائید کی گئی تھی اسے ۱۹۱۹ء میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔

ان دنوں امان اللہ کابل کے امیر تھے۔

د۔ اینگلو افغان معاہدہ ۱۹۲۱ء سے اقتباس

(اس معاہدہ پر ڈابس مشن نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو کابل میں دستخط کئے)

۲۔ مذاکرات کرنے والے اعلیٰ اختیارات کے دونوں فریق باہم اس ہند افغان سرحد کو تسلیم کرتے ہیں جسے افغان حکومت

۸ اگست ۱۹۱۹ء کو طے پانے والے معاہدہ کی پانچویں شق کے تحت تسلیم کر چکی ہے...

۱۱۔ مذاکرات کرنے والے اعلیٰ اختیارات کے دونوں فریق ایک دوسرے کی خیر سگالی اور خاص طور پر متعلقہ سرحدوں کے قریب رہنے والے قبائل کے متعلق مربیانہ عزائم کے پیش نظر یہ اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ کسی فریق کی سرحد کے قریب بسنے والے قبائل میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے بڑے پیمانہ پر فوجی کارروائی کی نوبت آئی تو متعلقہ فریق اس کارروائی کے آغاز سے پہلے دوسرے فریق کو اس کے متعلق مطلع کرے گا۔

افغان وزیر خارجہ کے نام برطانوی نمائندہ کا ضمنی مکتوب:

چونکہ حکومت افغانستان کو دونوں حکومتوں کے سرحدی قبائل کے حالات سے دلچسپی ہے میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ تمام سرحدی قبائل کے متعلق برطانوی حکومت کی نیت نیک ہے اور حکومت ان قبائل کے ساتھ فیاضانہ سلوک کا ارادہ رکھتی ہے بشرطیکہ وہ ہندوستان کے باشندوں کو ستانے سے باز رہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ مکتوب آپ کی تسلی کا باعث ہوگا۔

نوٹ:۔ امان‌اللہ اس وقت تک امیر ہی کہلاتے تھے انہوں نے بعد میں شاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ افغان حکومتوں کا یہ دعویٰ کہ وہ ڈیورینڈ لائن کے دونوں جانب بسنے والے تمام قبائل کی ترجمان ہے خاص طور پر معاہدہ ۱۹۲۱ء کی گیارھویں شق میں مندرجہ شرائط اور معاہدہ کے ضمنی مکتوب کی بنیاد پر ہے۔

ل۔ ۶ مئی ۱۹۳۰ء کو ہر میجسٹی کی حکومت کے سیکرٹری برائے امور خارجہ اور لندن میں افغان وزیر کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس کے اقتباسات

I ۔ ہماری رائے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہز میجسٹی شاہ محمد نادر شاہ کے سریر آرائے سلطنت افغانستان ہونے کے پیش نظر یہ اعلان کیا جائے کہ وہ معاہدہ اب بھی قائم ہے جو ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو کابل میں طے پایا تھا... میں یہ بات معرض تحریر میں لانا چاہتا ہوں کہ ہم اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ معاہدے بدستور پوری طرح قائم اور نافذ ہیں۔

II - میں جواباً یہ بات معرض تحریر میں لاتا ہوں کہ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ معاہدے بدستور قائم اور نافذ ہیں۔

و۔ ہر میجسٹی کے سکرٹری برائے تعلقات دولت مشترکہ مسٹر نوئل بیکر کی اس تقریر سے اقتباس جو انہوں نے ۳۰ جون ۱۹۵۰ء کو دارالعوام میں کی۔

برطانیہ عظمیٰ میں ہز میجسٹی کی حکومت اس بات کو افسوس کی نظر سے دیکھتی ہے کہ شمال مغربی سرحدی علاقوں کی حیثیت کے متعلق پاکستان اور افغانستان کی حکومتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ہز میجسٹی کی حکومت کی رائے یہ ہے کہ پاکستان بین الاقوامی قانون کے مطابق ان علاقوں میں سابقہ حکومت ہند اور برطانیہ عظمیٰ کی ہز میجسٹی کی حکومت کے حقوق اور ذمہ داریوں کا وارث ہے اور ڈیورینڈ لائن بین الاقوامی سرحد ہے۔

ز۔ ہنسرڈ مورخہ یکم مارچ ۱۹۵٦ء سے اقتباس۔
(مسٹر موٹ ریڈکلف کے ایک سوال کے جواب میں)

وزیر اعظم :- ہر میجسٹی کی حکومت کا نقطۂ نظر درج ذیل ہے۔ ہماری پیش رو حکومت کا بھی یہی نقطہ نظر تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان دولت مشترکہ کے ایک نئے خودمختار اور آزاد ممبر کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ ہر میجسٹی کی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ آباد اضلاع اور قبائلی علاقہ میں پشتو بولنے والوں کی بھاری اکثریت کی رضامندی سے پاکستان نے برصغیر کی شمال مغربی سرحد پر ان اختیارات کے استعمال کرنے کا حق حاصل کر لیا ہے جو پہلے تاج برطانیہ کو حاصل تھا۔ جہاں تک ڈیورینڈ لائن کے مشرق میں واقع علاقوں پر خودمختاری قائم کرنے اور ڈیورینڈ لائن کو افغانستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد قرار دینے کا تعلق ہے برطانیہ عظمیٰ میں ہر میجسٹی کی حکومت پاکستان کی حکومت کی پوری طرح حمایت کرتی ہے۔ ہر میجسٹی کی حکومت کو یقین ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان کوئی ایسا تنازعہ نہیں ہے جو اس قانونی پوزیشن کے تحت جو میں بیان کر چکا ہوں پرامن طریقہ سے طے نہ کیا جا سکے۔ ہر میجسٹی کی حکومت اس سلسلہ میں حکومت پاکستان سے برابر مشورہ کرتی رہی ہے اور اسے یقین ہے کہ پاکستان پرامن تصفیہ کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔

مسٹر موٹ ریڈکالف :- کیا میں اپنے معزز دوست سے دریافت کر سکتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں اختیارات کی منتقلی کے بعد قبائلی رہنماؤں کی اکثریت نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں پوری طرح پاکستان کا حصہ سمجھا جائے اور ان کے علاقہ کا برائے نام نظم و نسق پاکستان کے حوالہ کیا جائے۔

وزیراعظم :- مجھے اپنے معزز دوست کے ضمنی سوال کے آخری حصہ کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے جو پاکستانی باشندوں کے طور پر اپنی موجودہ حیثیت سے مطمئن نہ ہو۔ ہمیں جو شہادتیں ملی ہیں وہ اس کے برعکس ہیں۔

مسٹر گیٹسکل :- محترم کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں اور میرے رفقا بھی اس بیان کی تائید کرتے ہیں جو جیسا کہ وزیر اعظم نے فرمایا ہے لیبر حکومت کی پالیسی کے مطابق ہے؟

وزیر اعظم :- محترم میں آپ کا شکرگزار ہوں۔

نوٹ :- ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت اور امیر عبدالرحمان کے درمیان ڈیورینڈ لائن کے متعلق جو معاہدہ طے پایا تھا اسے نادر شاہ تک جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی افغانستان کا ہر حکمران تسلیم کرتا آیا ہے۔ اس معاہدہ سے ہٹ کر دو ہی باتیں بیان کی جا سکتی ہیں

۱ ڈیورینڈ لائن کے اس حصہ پر جو مہمند علاقہ سے گزرتا ہے نظر ثانی کی پیش کش۔ اس پیشکش پر توجہ نہیں دی گئی

۲ ہمسایوں کی طرح یہ وعدہ کہ ڈیورینڈ لائن کے قریب فوجی کارروائی کی پیشگی اطلاع دی جائے گی اور جذبۂ خیر سگالی کے ساتھ قبائل کے مفادات کا خیال رکھا جائے گا۔

اقتباسات نمبر و - ز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پاکستان کی جانشین مملکت کی حیثیت کے متعلق ہر میجسٹی کی حکومت کا نقطۂ نظر کیا ہے۔

ڈیورینڈ لائن کے جنوب اور مشرق میں بسنے والے قبائل کے معاملات سے افغان حکومت کی دلچسپی کا اعتراف اسی مکتوب میں کیا گیا ہے جو معاہدہ ۱۹۲۱ء کے ساتھ منسلک ہے۔

ضمیمہ ج

شمال مغربی سرحدی صوبہ کے سربراہ

۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک

چیف کمشنر

سر ہیرلڈ ڈین	۱۹۰۱-۸ء
سر جارج روس کیپل	۱۹۰۸-۱۹ء
سر ہمیلٹن گرانٹ	۱۹۱۹-۲۱ء
سر جان میفے (لارڈ رگبی)	۱۹۲۱-۲۳ء
سر نارمن بولٹن	۱۹۲۳-۳۰ء
سر اسٹیوارٹ پییرز	۱۹۳۰-۳۱ء
سر رالف گرفتھ	۱۹۳۱-۳۲ء

گورنر

سر رالف گرفتھ	۱۹۳۲-۳۷ء
سر جارج کننگھم	۱۹۳۷-۴۶ء
سر اولف کیرو	۱۹۴۶-۴۷ء

ضمیمہ د

ارمون

مصنف نے یہ قصہ نظر ثانی کے بعد میگزین آف ایما نیوئل کالج کیمبرج سے نقل کیا ہے جس کے لئے اسے سر ایولین ھاوول نے لکھا تھا۔

اس کہانی میں وزیرستان کا فروری ۱۹۰۵ء کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جب کہ جنوبی وزیرستان ملیشیا کی محسود کمپنیوں کو جو ان ھی دنوں قائم کی گئی تھیں توڑ دینا پڑا تھا۔ یہ کہانی اس زمانہ کا آئینہ ہے اور اس پر المیہ رنگ غالب ہے۔

ستمبر ۱۹۰۴ء میں جنوبی وزیرستان ملیشیا کے ایک نوجوان محسود نے جنوبی وزیرستان کے پولیٹیکل ایجنٹ کپتان بورنگ کو رات کے وقت سروکے کی چوکی میں سوتے ہوئے قتل کر دیا۔ بظاہر قتل کا کوئی سبب نظر نہیں آتا تھا۔ اس وقت اس ملیشیا کی کمان لفٹننٹ کرنل رچرڈ ھرمین کے ھاتھ میں تھی جو ایک ممتاز افسر تھے۔ وہ کور کے قیام کے آغاز ھی سے اس کے ساتھ تھے اور مقامی قبائل اور ان کی بولیوں اور حالات سے بخوبی واقف تھے۔ جن دنوں یہ قتل ھوا ان دنوں ھرمین چھٹی پر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ چند ھفتہ بعد جب وہ ملازمت پر واپس آئے تو یہ طے پایا کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے چیف کمشنر نے جس شخص کو بورنگ کا مستقل جانشین نامزد کیا ہے جب تک وہ یہاں نہ آئیں ھرمین بہ یک وقت ملیشیا کے کمانڈنٹ اور پولیٹیکل ایجنٹ کے دوھرے فرائض انجام دیتے رہیں۔ لیکن تھوڑے ھی دنوں یہ دوھرے فرائض انجام دینے کے بعد ھرمین کو یہ محسوس ھونے لگا کہ انہوں نے محسود اور وزیر قبائل کی ھٹ دھرمی اور مستقل مزاجی کا غلط اندازہ لگایا تھا

چنانچہ انہوں نے درخواست پیش کی کہ کمی کو پورا کرنے کے لئے کوئی اور پولیٹیکل افسر بھیجا جائے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جنوری ۱۹۰۵ء میں راقم السطور کو جو ان دنوں ایک جونیر پولیٹیکل افسر تھا اچانک بتایا گیا کہ تمہیں دو تین سو میل دور جنوبی وزیرستان میں پولیٹیکل ایجنٹ کے فرائض سنبھالنے ہیں۔ چنانچہ میں ایک ہفتہ بعد اپنے گھوڑوں سازو سامان اور نوکروں چاکروں سمیت مرتضیٰ پہنچ چکا تھا جو ان دنوں جنوبی وزیرستان کا دروازہ تھا۔ یہ جگہ میدان میں اس مقام پر واقع ہے جہاں دریائے گومل پہاڑیوں سے نیچے آتا ہے۔ ہمارا سامان اونٹوں پر اور ملازم گھوڑوں اور خچروں پر قبائلی محافظ دستہ کی حفاظت میں آگے جا چکے تھے اور ہم یعنی میں اور چھ شہسوار ملیشیا کے سپاہی آگے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارا دستہ قریباً دس میل تک وادی میں سے گزرتا تھا اور پھر دائیں طرف مڑ کر سروکے تک پندرہ میل تک ایک ڈھلوان چڑھائی تھی۔ اس چڑھائی کے سرے پر ملیشیا کی وہ چوکی تھی جہاں بےچارے بورنگ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وادی گومل سے اوپر پگڈنڈی پر تین ہزار فٹ کی چڑھائی بڑے جوکھوں کا کام تھا۔ اس میں دیر بھی بہت لگی اور انسان اور چوپائے تھک کر چور ہوگئے۔ چنانچہ جب ہم چوٹی پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ وہاں پولیٹیکل محکمہ کے ایک چھوٹے افسر نے ہمارا استقبال کیا جسے ہرمین نے چند محسود اور وزیر ملکوں کے ساتھ ہماری پیشوائی کے لئے بھیجا تھا۔ یہ ملک بڑے عیار تھے ان کے چہرے عقابی اور داڑھیاں کتری ہوئی تھیں لیکن وہ بڑے خوش اخلاق اور چرب زبان تھے۔ ہمارا جلدی سے تعارف کرایا گیا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت دو محسود ملک مجھ سے مصافحہ کر رہے تھے (وہ شخص بھی محسود ہی تھا جس نے چند ماہ پیشتر بورنگ کو قتل کیا تھا) تو ان میں سے ایک ملک نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''ہمیں بڑی خوشی ہے کہ نیا پولیٹیکل ایجنٹ آگیا ہے کیونکہ جب کوئی پولیٹیکل ایجنٹ نہیں ہوتا تو ہم یتیم ہوتے ہیں''۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ بات اوپری دل سے کہہ رہے ہیں وہ سب بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے تھے لہٰذا وہ بڑے اچھے رفیق سفر ثابت ہوئے۔ پانچ چھ میل تک ہلکی ہلکی اترائی تھی ہمارا راستہ ایک پہاڑی علاقہ سے گزرتا

تھا جہاں کہیں کہیں جنگلی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ہم سورج ڈوبنے سے ذرا دیر پہلے سروکے کے پرانے قلعہ کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ جو ایک بڑے پہاڑ کے شانہ پر واقع تھا اس پہاڑ کی چوٹی برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہرمین جو شام کے وقت تیتر کے شکار کے لئے نکلے تھے بندوق اور کتے کے ساتھ دروازہ کے پاس کھڑے ہوئے چوکی کے کمانڈنٹ سے باتیں کر رہے تھے جو افریدی قبیلہ کا تھا اور جنگجو تھا۔ وہ اس ماحول میں بڑے شاندار نظر آرہے تھے۔ میں گھوڑے سے اترا اور ہم نے مصافحہ کیا اور افسروں کے کواٹروں کی طرف چل دئے جو عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھے۔ میں آتشدان میں بھڑک کر جلتی ہوئی لکڑیوں کے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگا اور سفر کی ساری تکان بھول گیا۔ چنانچہ میں نے اپنی دانست میں معقول سوالات شروع کر دئے اور ہرمین نے جو جواب دئے ان سے مقامی حالات کا اندازہ لگانے لگا۔ میں جس دنیا میں آیا تھا وہ طلسماتی دنیا تھی جس پر ملاپاوندہ کی شیطانی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جہاں قتل اور غارتگری کا دور دورہ تھا جہاں انسانی زندگی کی قیمت سرکاری رائفل کے مقابلہ میں بہت کم تھی اور ایک عورت یا ایک ہندو کو آدھا انسان سمجھا جاتا تھا۔ جہاں لوٹ مار سب سے بڑا ذریعہ معاش تھا اور پیشہ ور قاتل سوسائٹی کا معزز ممبر تھا اور جہاں انگریز افسر گاف کھیلتے تھے تو گیند اٹھانے والے لڑکوں کی جگہ مسلح محافظ رکھتے تھے کیونکہ اندیشہ تھا کہ خندق میں جہاں کل کا لٹیرا آج کا سپاہی اور کل کا سپاہی آج کا لٹیرا بن سکتا تھا گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ میں انسانوں اور مقامات کے نامانوس ناموں میں الجھ کر رہ گیا اور جب نہانے اور رات کے کھانے کے لئے لباس تبدیل کرنے کا وقت آیا تو یک گونہ اطمینان محسوس کرنے لگا۔ جب میں بیٹھک میں دوبارہ داخل ہوا جہاں ہماری غیر موجودگی میں میز لگا دی گئی تھی تو ہرمین پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ وہ اپنی رجمنٹ کے میس کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ میں اپنے پرانے لائن کاب کا ڈنر جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کی جیب پر کاڑھا ہوا بھڑکیلا نشان ابھی دھندلایا نہیں تھا۔ اس پر ہرمین کی نظر پڑی کیونکہ ان کی نظروں سے کوئی چیز نہیں بچتی تھی۔ انہوں نے کہا، میرا خیال تھا ہم جلد ہی کوئی باہمی تعلق ڈھونڈ نکالیں گے۔ میں بھی ایما نویل کالج میں تھا اور لائن کاب کا ممبر رہا ہوں۔ شاید

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ شام کا باقی حصہ کس طرح گزرا اور ہماری کیا باتیں ہوئیں۔

اگلے روز ہم وانا پہنچے جو وزیر علاقہ میں واقع ہے۔ وانا ایک کھلے میدان میں واقع ہے جس کے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ یہاں ایجنسی اور ملیشیا کے ہیڈکواٹر اور دوسرے انتظامی محکموں کے دفتر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق، ایک دو جملوں سے پوری بات واضح ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو پولیٹیکل ایجنٹ ہوتا ہے اس کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ تمام قبائلی امور میں حکومت کی پالیسی واضح کرے اور اس پر عملدرآمد کرائے قبائل کے ساتھ معاملات طے کرے اور قبائل بیرونی دنیا کے خلاف جن جرائم کے مرتکب ہوں ان کا جرمانہ وصول کرے پولیٹیکل ایجنٹ کا یہ بھی کام تھا کہ وہ اپنے اعلیٰ افسروں کو قبائل کے رویہ اور عزائم سے باخبر رکھے۔ مختصر یہ کہ پولیٹیکل ایجنٹ کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ہر شخص اور ہر چیز سے واقف ہو۔ قبائل کے کسی اقدام سے پہلے ان کا ارادہ بھانپ لے اور انہیں کوئی ایسا قدم نہ اٹھانے دے جو حکومت کی پالیسی کے خلاف ہو۔ وہ اپنے احکام ضرورت پڑنے پر طاقت کے ذریعہ منوانے کے لئے ملیشیا سے کام لیتا تھا۔ ملیشیا میں کوئی ۱۷۰۰ جوان تھے جو سب کے سب پٹھان تھے ان میں سے نصف تعداد مقامی باشندوں کی تھی جو قبائلی کمپنیوں کی شکل میں منظم کی گئی تھی۔ ہر کمپنی کے اپنے جمعدار اور صوبیدار تھے اور صرف چار انگریز افسر تھے۔ قریباً دو تہائی ملیشیا سروکے اور ایسی ہی دوسری بیرونی چوکیوں میں پڑی تھی۔ اور باقی ملیشیا جس میں ریکروٹ بھی شامل تھے ہیڈکواٹر میں تھی۔ پولیٹیکل اسٹاف ملیشیا اور مقامی آبادی کے علاج کے لئے ایک ڈاکٹر متعین تھا جسے اس علاقہ میں رہ کر گولی کے زخموں کا علاج کرنے کی خوب مشق ہو گئی تھی۔ رائل انجنیرس کا ایک افسر بھی متعین تھا جو سڑکوں اور عمارتوں کا نگراں تھا۔ ملیشیا کے افسروں میں سے ایک دو افسر ہمیشہ بیرونی چوکیوں کے دورہ پر ہوتے تھے پولیٹیکل ایجنٹ، ایجنسی سرجن اور انجنیر اپنے اپنے فرائض کی بجاآوری کے سلسلہ میں آتے جاتے رہتے تھے۔ وانا میں ہم سب کے سب قلعہ میں رہتے تھے جو دو منزلہ عمارت تھی اور ایک صحن کے گرد بنی ہوئی تھی جس کے بیچ میں کنواں تھا۔ قلعہ میں اسلحہ خانہ، خزانہ حوالات اور ملیشیا کے

اسٹور تھے جو ایک کواٹر گارڈ کی نگرانی میں رہتے تھے۔ اس گارڈ میں مختلف کمپنیوں کے جوان شامل ہوتے تھے اور باری باری آدھی کمپنی کواٹر گارڈ ڈیوٹی پر متعین کی جاتی تھی۔ اس عمارت تک بیرونی قلعہ سے پہنچا جا سکتا تھا جو ایک بہت بڑی چار دیواری تھی اور جس کے چاروں کونوں پر برج بنے ہوئے تھے۔ اس میں الگ الگ بہت سی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جہاں انگریز افسروں کا میس اور ان کے کواٹر اور سپاہیوں کی بارکیں واقع تھیں۔ اسلحہ خانہ، خزانہ اور حوالات کو چھوڑ کر پورا قلعہ اور اس کے اندر کی ہر چیز مٹی کی بنی ہوئی تھی۔

ان دنوں وانا تک ایسی سڑک بنائی جارہی تھی جس پر موٹریں چل سکیں۔ یہ سڑک سروکے سے نہیں گزرتی تھی بلکہ وادی گومل کے اوپر سے جاتی تھی اور اس کی تعمیر کا کام سنبھالنے کے لئے رائل انجنیرس کا ایک اور افسر بھیجا گیا تھا۔ اس افسر کو وہی رہنا پڑتا تھا جہاں سڑک بن رہی تھی۔ اس لئے سڑک کے سرے پر قلعہ بند کیمپ قائم کرنا اور اس کی حفاظت کے لئے ملیشیا کے ایکسو جوانوں کا متعین کرنا ضروری ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہیڈکواٹر میں سپاہیوں کی تعداد اور بھی کم رہ گئی اور وانا میں رات کے حفاظتی انتظام کے لئے ہر مین اس بات پر مجبور ہو گئے کہ سنتریوں کی تعداد گھٹا دی جائے اور اس کی جگہ قلعہ کے اندر گشت کا بندوبست کیا جائے۔

میرے وانا پہنچنے سے چند روز بعد سردی کی لہر آ گئی۔ وہاں شدید برفباری ہوئی اور زمین پر برف کے انبار لگ گئے۔ اس کے بعد کئی روز تک سورج نظر نہ آیا اور پہاڑوں کی طرف سے برفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ (وانا خود بھی سطح سمندر سے قریباً چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے) ایک رات پارہ نقطۂ انجماد سے ۱۳ درجہ تک نیچے اتر گیا اور ۴۵ درجہ پالا پڑا۔ ایسی حالت میں جب یہ تار موصول ہوا کہ چیف کمشنر ٹانک آرہے ہیں جو وزیرستان کی پہاڑیوں کی ترائی میں چھوٹا سا قصبہ ہے تو ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ چیف کمشنر کا حکم تھا کہ میں اور ہر مین ٹانک میں ان سے ملیں انہیں مقامی صورت حال سے مطلع کریں اور ملیشیا کی حالت بتائیں جو کمانڈر انچیف کی نہیں بلکہ چیف کمشنر ہی کی کمان میں تھی۔ میں اس سفر کی سردی کبھی نہیں

بھول سکتا ۔ لیکن ہم بخیریت منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ ٹانک پہنچ کر ہم نے رپورٹ پیش کر دی ۔ مقامی سیاسی صورت حال اس عجیب و غریب شخصیت کے ہاتھ میں تھی جس کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں اور جو ملاپاوندہ کے نام سے مشہور تھا۔ اسے سرداری وراثت میں نہیں ملی تھی لیکن وہ مضبوط شخصیت کا مالک تھا اور پیر ہونے کا مدعی تھا وہ ایک ایسے ذریعہ سے جس کا نام میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا بار بار مالی مدد لے کر محسود قبیلہ میں سب سے زیادہ طاقتور سردار بن بیٹھا تھا۔ جو لوگ قبائلی سیاست میں کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے تھے انہیں اچانک ختم کر دیا جاتا تھا اور اس قسم کے واقعات متعدد بار ہو چکے تھے جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ مخالفت قریب قریب ختم ہوگئی۔ اس نے قاتلوں اور بدمعاشوں کا ایک گروہ اکٹھا کر رکھا تھا جن کی حرکتوں سے وہ خود بھی بےخبر نہ ہو گا۔ ان میں سے کوئی بدمعاش جب چھاپہ مارنے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو مال غنیمت میں سے ملاپاوندہ کو بھی حصہ ملتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر سرکاری فوجوں کے خلاف مسلح قبائل کی قیادت کی تھی اور کئی مرتبہ وطن سے فرار ہونے پر مجبور ہوا تھا۔ لیکن بادل چھٹتے ہی وہ پھر آ موجود ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر امن اور صلح اس کے ورد زبان ہوتا تھا اور اس کا منشی (ملا پاوندہ خود ناخواندہ تھا) پولیٹیکل ایجنٹ کو آئے دن غیر شستہ فارسی میں لکھے ہوئے مودبانہ خطوط بھیجتا رہتا تھا جن میں اپنے مالک کی خواہش ارادے اور تجاویز درج ہوتی تھیں ۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی تربیت کے مطابق مخلص لیکن بےاصول محب وطن تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ لارڈ کرزن نے ملیشیا کی بھرتی اور سڑکوں کی تعمیر کے احکام صادر کر کے اس کے قبیلہ کی آزادی کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا اس نے ان اسکیموں کو خاک میں ملانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے طریقوں میں بڑی چالبازی تھی۔ وہ کھلم کھلا ملیشیا میں بھرتی کی مذمت نہیں کرتا تھا لیکن دوسرے ملاؤں کو اس بات پر اکساتا تھا کہ جو لوگ سرکاری ملازمت میں ہوتے ہوئے ہلاک یا فوت ہوں ان کی نماز جنازہ نہ پڑھائی جائے۔ وہ ایک طرف تو مذہبی جوشیلے نوجوانوں کو جو اس کے زیر اثر تھے ملیشیا میں بھرتی کی ترغیب دیتا تھا اور دوسری طرف پولیٹیکل ایجنٹ کو خطوں کے ذریعہ خبردار کرتا تھا کہ جو محسود بھرتی کئے گئے ہیں ان پر

بھروسہ نہ کیا جائے۔ یہ خطوط عام جملوں پر مشتمل ہوتے تھے اس لئے ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ اس نے باؤزنگ کے قتل سے پہلے بھی ایک ایسا ہی خط بھیجا تھا اور بعد میں یہ جتایا تھا کہ میں نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ ہرمین کی اور میری اس مسئلہ پر کئی مرتبہ بات ہو چکی تھی اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ جب محسود ملیشیا میں بھرتی ہو جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جائے یا کوئی ایسی حرکت کی جائے جس سے ظاہر ہو کہ ہمیں ان پر اعتماد نہیں ہے۔ پھر بھی ہم موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں تھے اور ایک اسکیم پر غور کر رہے تھے جس کے تحت یہ لازم قرار دیا جائے کہ جو محسود بھرتی ہوں ان کے چال چلن کی تصدیق قبیلہ کے ان سرداروں اور ملکوں سے جنہیں ہم بھی جانتے ہوں فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر کرائی جائے۔ اسی اثنا میں ہرمین ان رنگروٹوں کو چھانٹ رہے تھے جن کا ریکارڈ ہماری دانست میں مشتبہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ وقت ملتا تو یہ تدابیر کارگر ثابت ہوتیں۔ شاید ملاپاوندہ کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ اس نے بھی یہی بات ذہن میں رکھ کر اپنا لائحۂ عمل تیار کیا۔ ہم نے چیف کمشنر سرھیرلڈ ڈین کے سامنے پوری صورت حال تفصیل کے ساتھ بیان کی۔ انہوں نے ہماری بات ہمدردی سے سنی اور ہمارے عام طریقۂ کار سے اتفاق کیا۔ ٹانک میں چند روز قیام کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے اور دونوں نے مختلف راستے اختیار کئے۔ ہرمین وادی گومل کے راستہ روانہ ہوئے تاکہ کیمپ اور زیادہ سے زیادہ چوکیوں کا معائنہ کر سکیں۔ میں مختصر راستہ سے آیا جو عام طور پر انگریز افسروں کے لئے بند رہتا تھا۔ میں نے یہ سفر قبائل کے وعدہ پر کیا چنانچہ انہوں نے مجھے اپنے علاقہ سے بحفاظت باہر پہنچا دیا۔ آخرکار میں ہرمین سے ایک روز پہلے وانا پہنچ گیا۔ مجھے یاد ہے یہ جمعہ کا دن تھا اور تاریخ ١٠ فروری ١٩٠٥ء تھی۔ یہ تاریخ بعد کے واقعات کی وجہ سے میرے ذہن میں پیوست ہوگئی ہے اور یوں بھی ١٢ فروری میری تاریخ پیدائش ہے۔ اگلے دن شام کے وقت میں چند آدمیوں کو لے کر اس سرغابی کے شکار کے لئے گیا جو قلعہ کے پاس چشمہ پر اڑتی نظر آیا کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح وہ منظر یاد ہے جب سخت سردی میں جبکہ چاروں طرف برف پڑی ہوئی تھی اور مغرب کی طرف آسمان پر چمک

نظر آ رهی تهی میں نے هرمین اور اس کے محافظوں کو دریا کی پتهریلی گزرگاہ پر آتے دیکها اور ان کے گهوڑوں کی ٹاپیں دریا کے کنارے پڑی هوئی برف سے ٹکرا کر بجتی هوئی سنیں۔ میں هرمین سے ملنا چاهتا تها لیکن جب تک روشنی رهی میں نے قلعه میں واپس جانے کے لئے کوئی جلدی نہیں کی۔ میرا خیال تها کہ آج شام کهانے کے بعد اور پهر کل سارا دن هرمین سے باتیں کرنے کے لئے کافی وقت پڑا ہے۔

اس رات صرف هم چار کهانے کی میز پر اکهٹے هوئے۔ هرمین، میں، ملیشیا کے سیکنڈ ان کمانڈ پلانٹ اور انجنیرٹرنر۔ ڈاکٹر بهی وانا هی میں تها لیکن اسے ملیریا هوگیا تها اس لئے وہ شام هی سے بستر پر دراز تها۔ میس میں تینوں فوجی افسر وردی پہنے هوئے تهے۔ میں مفتی میں تها اور ڈنر کی جیکٹ کی جگه کوٹ پہن رکها تها جس پر لائن کاب کا طغرا بنا هوا تها۔ هم میں سے کسی کے پاس کوئی هتهیار نہیں تها کیونکه هم یه ظاهر کرنا چاهتے تهے که همیں اپنے آدمیوں پر بهروسه ہے۔ هم مزے مزے کهانا کهاتے رہے اور اس انداز کے ساتھ جو میس میں هفته کی رات کو دیکهنے میں آتا ہے شیریں قاب کی باری آنے هی والی تهی کہ شیشہ ٹوٹ کر زمین پر گرنے کا چهناکا هوا۔ میں میز پر اس طرح بیٹها تها کہ میرا شانہ اس دروازہ کے ساتھ اور اسی کی طرف تها جس سے کهانا کهلانے والے آدمی باهر پینڑی سے آ جا رہے تهے۔ پینڑی کے دونوں طرف روغنی شیشه کے دروازہ تهے جو صحن میں کهلتے تهے۔ هرمین میرے سامنے بیٹهے تهے پلانٹ میز کی نمایاں نشست پر دروازہ کے مقابل اور ٹرنر پلانٹ کے مقابل بیٹهے تهے۔ کهڑکا سنتے هی میں نے نگاہ اوپر اٹهائی تو دروازہ میں ملیشیا کا ایک نوجوان سپاهی وردی پہنے کهڑا تها۔ اس کے کوٹ پر پیٹی بندهی هوئی تهی جیسا کہ قلعه میں گشت کرنے والے سپاهی باندهتے هیں۔ اس کے هاتھ میں اس کی رائفل تهی جس پر سنگین چڑهی هوئی تهی اور نالی اوپر کی طرف تهی۔ وہ مجهے اور میں اسے دیکھ رها تها۔ ایک سیکنڈ کے بعد میں اٹھ کر کهڑا هوگیا۔ یه بات بڑی عجیب معلوم هوتی ہے لیکن یه واقعہ ہے کہ یه بات فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی تهی کہ وهاں اس کے کهڑے هونے کا کیا مطلب ہے۔ میرے ذهن میں ایک ریکروٹ کا واقعه گهوم گیا جو مجهے کسی نے سنایا تها۔ یه ریکروٹ میس کے ساتھ والے کمرہ

میں آ کھڑا ہوا تھا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو تو کہنے لگا میں تو تماشا دیکھنے آیا تھا۔ میں سمجھا کہ اس نوجوان کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے۔ جب میں میز کے پاس اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس نے اپنی رائفل کی نالی نیچے جھکا لی لیکن رائفل کا کندا شانے پر نہیں رکھا۔ شاید یہ تمام باتیں چشم زدن میں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ہرمین میز کے پایوں کا چکر لگا کر اس آدمی کے پیچھے جھپٹ رہے ہیں اور پلانٹ پیچھے پیچھے ہیں۔ اسی وقت وہ آدمی پیچھے ہٹ کر پینٹری میں گھس گیا جہاں کچھ اندھیرا تھا۔ (اس زمانہ میں لیمپ اور موم بتی کا رواج تھا) ہرمین اور پلانٹ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ میں اور ٹرنر بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے مجھے پینٹری کی مدھم روشنی میں یہ نظر آیا کہ پلانٹ سپاہی سے رائفل چھین رہے ہیں اور ہرمین سامنے کی دیوار کے ساتھ سہارا لئے کھڑے ہیں۔ میں اور ٹرنر بھی پلانٹ کی امداد کو پہنچ گئے۔ سپاہی پر فوراً قابو پا لیا گیا اس سے رائفل چھین لی گئی اور ہم نے اسی کی پگڑی سے اس کی مشکیں کسنا شروع کر دیا۔ ہم ابھی اس کام میں مصروف تھے کہ ہرمین نے پکار کر کہا ”کوئی زخمی تو نہیں ہوا“؟ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر جواب دیا ’جی نہیں لیکن کرنل آپ تو زخمی نہیں ہوئے‘۔ انہوں نے کہا ’ہاں‘۔ وہ یہ کہتے ہوئے آہستہ آہستہ جھکے اور زمین پر دراز ہوگئے۔ اتنے میں میس کے ایک ملازم نے باہر کے دروازہ سے سر باہر نکالا کسی نے اس سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ میں اور ٹرنر تو ہرمین کے پاس پہنچ گئے اور پلانٹ نے قیدی کو سنبھال لیا اور میس کے اردلی کو جو وہاں پہنچ گیا تھا مسلح گارڈ بلانے کے لئے بھیجا اور گارد کے ساتھ قیدی کو حوالات لے گئے جو قلعہ میں واقع تھی۔ ڈاکٹر شب خوابی کا لباس پہنے ہی پہنے چلا آیا اور آتے ہی ہرمین پر جھک گیا۔ اتنے میں ہرمین کچھ کہنے لگے جو ان کے آخری الفاظ تھے۔ ”انہوں نے مجھے مار دیا۔ میں جانتا تھا وہ مجھے مار دیں گے“۔ میں نے ڈاکٹر کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہرمین کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے لیکن پھر بھی ہم نے اسٹریچر منگایا اور ہرمین کو اس پر ڈال کر ان کے کوارٹر کی طرف لے چلے۔ میرا اور ان کا کوارٹر ساتھ ساتھ تھا۔ ڈاکٹر نے مریض کا پھر معائنہ کیا اور اعلان کر دیا کہ مریض ختم ہو چکا ہے۔

ہرمین کے دل میں سنگین گھونپ دی گئی تھی اور یہ ان کی ہمت تھی کہ وہ اتنی دیر تک ہوش میں رہے۔ ڈاکٹر کو وہاں چھوڑ کر میں چاندنی رات میں برف کے انبار کے درمیان پتلی سی پگڈنڈی پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا میس پہنچا اور چیف کمشنر کو تار لکھنے بیٹھ گیا۔ میں نے تار میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ میں نے تار لکھ کر میس کے ایک ملازم کے حوالہ کیا کہ اسے تارگھر لے جاؤ جو میس کے ساتھ ہی تھا۔ اتنے میں پلانٹ آ گئے۔ وہ کہنے لگے ''وہ آدمی محسود تھا۔ میں آپ کو مجبور نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے لیکن یہاں محسود کی نصف کمپنی ہے۔ غالباً وہ آدمی بھی اسی کمپنی کا تھا۔ یہ نصف کمپنی قلعہ میں ڈیوٹی پر ہے اور میں سمجھتا ہوں اس سے ہتھیار رکھوانا ضروری ہے،،۔ ''کیوں،،؟ میں نے دریافت کیا۔

'بات یہ ہے کہ جب ہم قیدی کو لے کر قلعہ کے پھاٹک، پر پہنچے اور کواٹر گارڈ نے ہمارے لئے پھاٹک کی کھڑکی کھولی تو میں جوں ہی صحن میں داخل ہوا تو میں نے کوئی ایک درجن سپاہیوں کو ادھر ادھر کھڑے دیکھا۔ وہ رائفلیں اور سنگینیں لئے ہوئے تھے۔ یہ ایسی رات نہیں ہے کہ کوئی آدمی بستر پر ہونے کی بجائے ادھر ادھر گھومتا پھرے تاوقتیکہ اس کا کوئی خاص ارادہ نہ ہو۔ میں نے انہیں پکارا اور وہ میری آواز سنتے ہی اپنی بارکوں میں جا چھپے۔ میں نے قیدی کو حوالات میں بند کیا کواٹر گارڈ کو خبردار کر دیا اور یہاں چلا آیا۔ میں نے صوبیدار میجر کو بلا بھیجا ہے اور کہدیا ہے کہ جن لوگوں کو رات کے وقت گشت کے لئے کہا گیا ہے ان میں سے جتنے آدمی ہو سکیں ساتھ لے آئے۔

''کیا صوبیدار میجر یہاں آ گیا ہے،،؟ میں نے دریافت کیا

وہ فوراً ہی وہاں پہنچ گیا۔ وہ جہاندیدہ نڈر اور جانباز تھا لیکن اس وقت وہ شب خوابی کے لباس پر اور کوٹ پہنے ہوئے تھا اور مسخرہ معلوم ہو رہا تھا۔

'کیا کرنل صاحب فوت ہو گئے ہیں'۔ اس نے دریافت کیا

'' ہاں وہ فوت ہو گئے ہیں،،۔ میں نے جواب دیا ایک محسود نے انہیں قتل کر دیا۔ اسے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ قلعہ میں جو محسود ہیں ان کا کیا کیا جائے؟ کیا تمہیں اس سے اتفاق ہے کہ ان سے ہتھیار رکھوا لئے جائیں۔

'ہاں ایسا ہی ہونا چاہئے، اس نے جواب دیا ''لیکن اس میں گڑ بڑ ہوگی۔ آپ کو چیف کمشنر سے اجازت حاصل کر لینی چاہئے''۔

''اگر ہتھیار رکھوانے ہیں تو ابھی رکھوا لینے چاہئیں'' میں نے کہا اور پلانٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

پلانٹ بتانے لگے کہ قلعہ میں پچاس محسود ہیں اور رات کے وقت دروازہ اندر سے بند رہتا ہے۔ وہ کوارٹر گارد پر قابو پا سکتے ہیں حوالات کھول کر قیدی کو چھڑا سکتے ہیں اور اسلحہ خانہ اور خزانہ پر قبضہ کر سکتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور بیرونی قلعہ کی ایک بارک میں ایک اور پوری محسود کمپنی پڑی ہے۔ ابھی مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ قاتل کون سی کمپنی کا تھا۔ لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ اس اثنا میں کوئی اور بھی گڑ بڑ نہیں ہوئی تو جب دوسری کمپنیوں کو معلوم ہوگا کہ ہرمین کو ایک محسود نے قتل کر دیا تو وہ محسود پر گولیاں چلانا شروع کر دیں گی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ رات کے وقت سب سپاہیوں کے پاس رائفلیں اور سو سو کارتوس رہتے ہیں''۔

میں سمجھ گیا کہ پلانٹ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ہم نے تیزی کے ساتھ یہ سوچنا شروع کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس اثنا میں صوبیدار میجر کو محسود کے سوا دوسری کمپنیوں سے جتنے بھی آدمی مل سکے وہ انہیں ساتھ لے آیا۔ ہمیں جتنی بھی رائفلیں مل سکیں اٹھا لیں اور برج کی طرف چل دئے مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرا دھیان اپنے شام کے لباس خاص طور پر پمپ شو کی طرف تھا جو اس موقع کے لئے بالکل موزوں نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ٹرنر نے التجا کی کہ اسے بھی ساتھ لے لیا جائے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ برج کے اندر کیا ہونے والا ہے اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ جہاں ہے وہیں رہے۔ لہٰذا میں نے اس کی التجا منظور نہیں کی۔ کوارٹر گارڈ نے ہمارے لئے پھاٹک کی کھڑکی کھول دی اور ہم کسی کھٹکے کے بغیر ایک ایک کر کے برف پر دبے اندر پہنچ گئے۔ صحن میں سناٹا تھا اور ادھر ادھر کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ابھی پلانٹ اپنے آدمیوں کی صفیں بنا رہے تھے کہ میرا محسود اردلی جس کا نام ماوی تھا اور جو ملیشیا میں نہیں تھا آخری سپاہی کے ساتھ کھڑکی

سے برج میں داخل ہوا اور مجھے میرا ریوالور پکڑا دیا جو وہ میرے کواٹر سے لایا تھا۔ اس اثنا میں ہمارے کچھ سپاہی ایک طرف چھت پر بھیج دئے گئے تھے جہاں سے وہ صحن کے پار بارکوں پر گولیاں برسا سکتے تھے اور ایک اور دستہ کو صحن میں ترچھی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا یہ دستہ بھی چھت والے سپاہیوں کے نشانہ کی راہ میں حائل ہوئے بغیر بارکوں پر گولیاں چلا سکتا تھا۔ ان سب کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں اور وہ سب کے سب تیار تھے۔ لالٹینیں کنویں کی مینڈھ کے ساتھ اس طرح رکھ دی گئیں کہ ہمارے سپاہی اندھیرے میں رہے اور روشنی بارک کے دروازوں پر پڑنے لگی۔ یہ سارا کام بہت ہی پھرتی سے کیا گیا۔ جب سب تیاریاں ہو چکیں تو پلانٹ نے جو میرے ساتھ فائرنگ کے لئے تیار کھڑی ہوئی نکڑیوں کے درمیانی زاویہ میں کنویں کی مینڈھ کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے پکار کر کہا۔ 'جمعدار سلیم'!

سلیم محسود نصف کمپنی کا نگراں جمعدار تھا اور وہ ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ پکار کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے کواٹر میں جو بارک کے ساتھ ہی تھا اس کی تلاش کی گئی اور وہ ڈرتے ڈرتے باہر آیا۔

جاؤ اور اپنے آدمیوں سے کہو، پلانٹ نے کہا ''کہ اگر انہوں نے حکم مان لیا تو انہیں کچھ نہیں کہا جائیگا۔ وہ باہر نکل کر بارک کے سامنے دو قطاریں بنا لیں۔ انہوں نے حکم نہ مانا تو انہیں گولی مار دی جائیگی''

جمعدار نے سلام کیا اور صحن پار کر کے بارک میں پہنچا۔ اندر سے کانا پھوسی کی آواز آنے لگی لیکن بڑی دیر تک کچھ نہ ہوا۔ پھر جمعدار تنہا باہر نکلا۔

''وہ میری بات نہیں سنتے'' اس نے کہا ''اگر صاحب خود ان سے بات کریں تو شائد''

ہو سکتا تھا کہ یہ چال ہو اور مجھے معلوم نہیں کہ اس بارے میں پلانٹ کا کیا خیال تھا۔ میں دل پر جبر کر کے آگے بڑھا اور بارک کے ایک دروازہ پر پہنچ گیا۔ پلانٹ دوسرے دروازہ پر پہنچے۔ ہم چاند کی روشنی میں تھے اور لالٹینیں ہمارے عقب میں تھیں۔ بارک کے اندر اندھیرا اور خاموشی تھی۔ جب میں دروازہ کے قریب پہنچا تو وہی محسود اردلی جس نے مجھے ریوالور لا کر دیا تھا اور اس وقت سے اب تک مرغی کی طرح میرے آگے پیچھے پھر رہا تھا میرے برابر آ کر کھڑا

ھوگیا بلکہ اس نے قریب قریب اپنے شانہ سے مجھے پرے دھکیل دیا۔ صوبیدار میجر اور ملیشیا کا ایک اور پٹھان افسر پلانٹ کے ساتھ تھے۔ ''باھر نکلو،، ھم دونوں چلائے اور ھم نے وھی بات دوھرائی جو پلانٹ جمدار سلیم سے کہہ چکے تھے۔ بارک میں دیر تک سناٹا رھا۔ پھر یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ سپاھی باھر آنے لگے۔ جب سب باھر آگئے تو پوری مشکل حل ھوگئی۔ ان کے جمعدار نے ھماری نگرانی میں انہیں احکام دئے جو فوری طور پر بجا لائے گئے۔ سپاھی دو قطاروں میں کھڑے ھو گئے رائفلیں برف پر رکھ دیں پیچھے مڑے اور چار قدم آگے بڑھ گئے۔ ایک دستہ نے جسے اس کام پر متعین کیا گیا تھا برف پر پڑے ھوئے ھتھیار سمیت لئے اور اسلحہ خانہ میں پہنچا کر تالا لگا دیا اور پہرہ بٹھا دیا۔ یہ کام بھی بڑی پھرتی سے ھوا۔ محسود سپاھیوں کو مارچ کراتے ھوئے ان کی بارک میں پہنچا دیا گیا جہاں انہیں صبح تک کے لئے بند کر دیا گیا۔ چھت پر جو دستہ متعین تھا اس کے ایک حصہ کو ایک معتبر پٹھان افسر کی نگرانی میں وھیں چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ یہ خیال رکھے کہ احکام پورے کئے جارھے ھیں۔ اس کے بعد ھم نے آخری بار صحن کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔ جب ھم اسلحہ خانہ کے قریب پہنچے تو صوبیدار میجر نے پلانٹ سے سرگوشی میں کہا کہ اسلحہ خانہ کا پہرہ دار وزیر ھے اسے بدل دیا جائے کیونکہ محسود اور وزیر اصل میں ایک ھی قبیلہ ھے۔ اس نے یہ بات پشتو میں اتنے زور سے کہی تھی کہ پہرہ دار نے بھی سن لی ھو گی۔ اس شام کئی موقعوں پر میں پلانٹ کے برتاؤ کو بہت پسند کر چکا تھا لیکن اس موقع پر تو اس نے واقعی حد کر دی۔ اس نے سنتری پر ایک نگاہ ڈالی اور اسے پہچان لیا۔

''وزیر،، اس نے سوچتے ھوئے یہ لفظ دوھرایا۔ ''وہ وزیر تو ھے لیکن وہ سرباز خان ھے میں اس پر کسی بھی حالت میں بھروسہ کر سکتا ھوں،،۔

سنتری نے اچانک اپنا سینہ چوڑا کر لیا اور اکڑ اکڑ کر اسلحہ خانہ کے سامنے ٹہلنے لگا گویا وہ بکنگھم محل پر پہرہ دے رھا ھو۔ ھم نے محسوس کیا کہ اس پر بھروسہ کر کے اسے تنہا چھوڑا جا سکتا ھے۔ وھاں سے ھم میس پہنچے جہاں ٹرنر اور ڈاکٹر کوکس (DR. COX) ھمارا انتظار کر رھے تھے۔

اب بھی ہماری پوزیشن خطرہ سے خالی نہیں تھی۔ اب بھی وانا کے بیرونی قلعہ میں پوری مسلح محسود کمپنی موجود تھی اور دوسرے قبیلہ کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد چار سو سے زائد نہیں تھی ان میں سے بھی قریباً ایک چوتھائی وزیر تھے۔ کئی دوسری چوکیوں پر اور کیمپ میں بھی یہی پوزیشن تھی۔ ہمیں یہ طے کرنا تھا کہ ہیڈکواٹر میں کیا کیا جائے اور چوکیوں پر کیا احکام بھیجے جائیں۔ تھوڑی دیر تک بحث کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہونے تک وانا میں کچھ نہ کیا جائے اور برج کے اندر ہمارے پاس جو دستہ تھا اسے واپس بھیج دیا گیا۔ صبح کے وقت ملیشیا کے قاعدہ کے مطابق ان سپاہیوں کے سوا جو دن کو ڈیوٹی پر ہوتے تھے باقی سب کے ہتھیار کمپنی کے اسلحہ خانہ میں جمع کرا لئے جاتے تھے اور شام تک وہیں مقفل رکھے جاتے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ جو قاعدہ ہے اسی کو برقرار رکھا جائے۔ اور صبح کو جب ہتھیار واپس آجائیں تو جہاں جہاں محسود سپاہی ہوں انہیں الگ کر دیا جائے اور ایک ماہ کی چھٹی پر گھر بھیج دیا جائے۔ البتہ برج کے اندر نصف کمپنی کو نظر بند رکھا جائے۔ چنانچہ تمام چوکیوں کے کمانڈروں کو بذریعہ تار صورت حال سے مطلع کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ تمام افسر موقع کے اہل ثابت ہوئے مختصر یہ کہ تمام محسود سپاہی جو پوری ملیشیا کا قریباً ایک چوتھائی تھے نہتے کر کے گھر بھیج دئے گئے اور ایک گولی چلنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔ کسی جگہ بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ ایک دورافتادہ برج سے دو محسود اپنی رائفلوں سمیت فرار ہو گئے۔ یہ رائفلیں بھی جن میں سے ہر ایک کی قیمت محسود علاقہ میں چند سو روپے تھی چند روز بعد ایک قبائلی ملک نے لوٹا دیں جو ہمارا دوست تھا۔

لیکن اس رات ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ حالات اتنی خوبی سے سدھر جائیں گے۔ نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ مقامی سیاست پر ہمارے سخت اقدامات کا کیا اثر پڑے گا۔ محسود یہ ذلت کس طرح برداشت کریں گے اور وزیر جن کی تعداد ہماری کور میں دو سو کے قریب تھی کیا کردار ادا کریں گے۔ یہ عین ممکن تھا کہ ایسی حالت میں جبکہ ہماری تعداد بہت کم رہ گئی تھی ہر جگہ مشتعل قبائل ہمیں آ کر گھیر لیں۔ لہذا ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ باقاعدہ فوج کی ایک بٹالین

کو وانا واپس بھیجنے اور ڈیرہ جات کے ایک ہلکے فوجی کالم کو تیار رہنے کے لئے کہا جائے۔ ہمیں اور بھی بہت کچھ کرنا تھا۔ جب میں اور پلانٹ شراب کی تلچھٹ پی کر چند گھنٹہ کی نیند لینے کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو صبح کے تین بج چکے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ تمام واقعات ہفتہ کی رات کو رونما ہوئے۔ سوموار کو ایک تابوت جس میں رچرڈ ہرمین کی میت رکھی ہوئی تھی محافظ دستہ کی معیت میں پورے احترام کے ساتھ ڈیرہ اسماعیل خان روانہ کیا گیا جہاں اسے فوجی اعزاز کے ساتھ دفنا دیا گیا۔ میں ان دنوں ایجنسی میں واحد مجسٹریٹ تھا اور مجھے قتل کے مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ میں نے حتی المقدور غیر جانبداری کے ساتھ مقدمہ کی سماعت کی۔ قاتل نے اپنے ساتھیوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا لیکن وہ اپنا کارنامہ فخر کے ساتھ بیان کرتا رہا۔ اس نے کہا میں نے تو ملازمت ہی اس لئے کی تھی (اسے ملازمت میں آئے ہوئے بہ مشکل تین مہینے ہوئے تھے) اور میس میں اس لئے داخل ہوا تھا چہ غلو زۂ مرکوم (سب کو قتل کر دوں) اور کابل کے مقابلہ جس نے بورنگ کو قتل کیا تھا میری بہادری کے زیادہ اچھے گیت گائے جائیں اسے اسی شام پھانسی دے دی گئی اور اس نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی موت کا سامنا کیا۔ حقیقتاً اس پر کیف طاری تھا اور اس نے اپنی زندگی کا آخری نصف گھنٹہ کوٹھری میں اپنی آنکھوں کو کاجل سے سنوارنے میں گزارا جیسا کہ محسود بانکوں کا قاعدہ ہے اور جنت کی حوروں کے انتظار میں بناؤ سنگار کرتا رہا۔

وہ قبیلہ کی اس شاخ سے تعلق رکھتا تھا جو ملا پاوندہ کے خاندان کی قرابت دار تھی اور جس سے برج میں نظر بند نصف کمپنی کا بھی تعلق تھا۔ بعد میں تحقیقات سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ وہ محض آلۂ کار تھا اور اس کی پشت پر پوری سازش کارفرما تھی۔ وہ اپنی بھری ہوئی رائفل لے کر گولی چلانے کے ارادہ سے میس میں داخل ہوا تھا۔ گولی کی آواز کو اس کی سازشی ساتھیوں نے جو برج میں تھے اشارہ قرار دے رکھا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ گولی کی آواز سنتے ہی وہ کواٹر گارڈ پر حملہ کر کے اسلحہ خانہ اور خزانہ پر قبضہ کر لیں گے اور تمام انگریز

افسروں کو ختم کر کے افراتفری پھیلا دیں گے اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر جو چاہیں گے کریں گے۔ وانا میں جب ۱۹۱۹ء میں محسود کی بجائے وزیر قبیلہ نے سازش کی تو یہی سب کچھ ہوا۔ لیکن اس تمام سازش کی قانونی شہادت فراہم کرنا ممکن نہیں تھا اور زیادہ سے زیادہ اسی پر اکتفا کیا گیا کہ درجن بھر آدمیوں کو خفیف الزامات کی بنا پر سزائیں دی گئیں۔ جمعدار سلیم کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ساری سازش سے باخبر تھا۔ اس کے بعد کوئی قبائلی بغاوت نہیں ہوئی اور اگرچہ لارڈ کرزن نے اس بات سے اتفاق کیا کہ جو کچھ کیا گیا وہ حالات کے تقاضے کے عین مطابق تھا لیکن ان کی رائے میں ابھی ملاپاوندہ سے کھلم کھلا دشمنی مول لینے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ایسی صورت میں محسود علاقہ میں ایک اور جنگی مہم کا انتظام کرنا پڑتا۔

قاتل نے اپنے مقدمہ کے دوران بیان دیا کہ اس نے اپنی رائفل کا گھوڑا دبا دیا لیکن کارتوس خراب نکلا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ میں نے خود رائفل میں سے کارتوس نکالا جو مارٹنی ہنری تھا۔ انٹریکٹر نیچے نہیں تھا اور کارتوس کی ٹوپی بھی پٹخی ہوئی نہیں تھی۔ میرے خیال میں وہ پینٹری میں داخل ہو کر غلط سمت میں مڑ گیا اور دوسرے روغنی دروازہ پر جا پہنچا جس میں اس نے اپنی سنگین گھونپ دی۔ اپنی غلطی سے پریشان ہو کر وہ الٹے پاؤں مڑا اور اپنی رائفل کی نالی اوپر کئے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے جوش میں آ کر جب رائفل کی نالی سیدھی کی تو لبلبی کی بجائے ٹریگرگارڈ دبا دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میری بجائے کوئی اور یہ کہانی بیان کرتا۔ وہ محض ہرمین کی حاضر دماغی اور بہادری کی وجہ سے اپنی غلطی کی تلافی نہیں کر سکا۔

چند روز بعد بوڑھے صوبیدار میجر نے ہرمین کی وفات پر ایک نوحہ موزوں کیا 'ہائے ہائے ارمان ارمان'، اس نے بظاہر مجھے اور پلانٹ کو مخاطب کرتے ہوئے اور درحقیقت اپنے دل سے باتیں کرتے ہوئے کہا

ھائے ایسا بہادر صاحب اس طرح مارا جائے اگر یہ صاحب (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) یا وہ صاحب (پلانٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مارا جاتا تو حکومت دوسرا صاحب بھیج سکتی تھی لیکن ھرمین صاحب ھائے ھائے ارمون، ارمون !

ضمیمہ ھ

خوشحال خان خٹک کی ایک غزل

نن د وار دے

ساقی راکړه وما مے　　　یو څو جامه پیا پئ

دا هم ظلم دے که ګورے　　　چه بے میو څی پسرلئ

هغه ځائے چه ګل و مل وی　　　ورع څو کاندے سړئ

ګوره څه وائی پړے غوږ کړه　　　چه آواز کړه چنګ و نئ

بیا به تیر ساعت را نۀ شی　　　آه، ارمان ارمان، هے هے

د دنیا ژوندون هم ښۀ دے　　　که تر تلو همیش وئ

چه تر تلو همیش نۀ دے　　　نورئ و ګڼړه لا شئ

ډیر میئن ئ وبله تیر کړل

فلک نۀ لری زړۀ سوئ

اردو ترجمہ

مے پلا دے مرے ساقی مجھ کو
دیکھئیو، ظلم ہے کیسا کہ بہار
گل و مل جس جگہ میسر ہوں
دیکھئیو! کہہ رہے ہیں کیا یارو
وقت جب بیت گیا، بیت گیا
زندگی سے بھی لو لگا لیتے
زندگی، جب کہ آنی جانی ہے

چند اک جام، پیاپے، بھرپور
بے مئے ناب پئے بیت چلی
مے سے پرہیز بھلا کون کرے
چنگ و نے کی صدا پہ کان دھرو!
ہائے افسوس! وائے ناکامی!
کاش یہ عمر جاوداں ہوتی!
پھر اسے ہیچ ہی نہ سمجھیں کیوں؟

کتنے محبوب اس نے چھین لئے
کیسا بے رحم ہے فلک، افسوس!

English Version

CARPE DIEM

Roses, wine, a friend to share —
Spring sans wine I will not bear,
Abstinence I do abhor,
Cup on cup, my Saqi* pour.

Hark ! the lute and pipe ! Give ear !
What says music to our cheer ?
Time once flown returneth never,
Idle moments gone for ever,
  Wouldst recall them ? Call in vain.

Life, our mortal life, hath sweetness,
As its sweetness, so its fleetness,
  Count it nothing, 'tis no gain.

Doth time tarry for thy prizing,
Or make speed for thy despising ?
  Time hath all young lovers slain,
Time is heedless, time is heartless —
  Saqi, fill and fill again.

**Saqi* means Cup-bearer.

اشاریہ

● پ

● ت

● ٹ

● ج

● ح

● د

● ذ

● ر

ز

● ش

● ص

● ط

ع

غ

● ف

● ق

● ک

نوٹ : زمان خان خٹک کے اشعار
جس میں کشمیر کا ذکر ہے
ہم یہاں درج کرتے ہیں ۔

سہ

دا مثال دے چه کشمیر جنت نظیر دے
لیکن نن خود دشمن په لاس اسیر دے
دا ارضی جنت تهٔ پاک کړه له مشرکو
حقیقی جنت که غواړے دا تعبیر دے

"کشمیر جنت نظیر" بطور مثال مشہور ہے
لیکن آج دشمنوں کے ہاتھ میں (اسیر) ہے
اس جنت ارضی کو تم مشرکوں سے پاک کرلو
اگر حقیقی جنت چاہتے ہو تو یہ تعبیر ہے

ل

ن

● و

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۴	نامایوس	نامانوس
٦	۱۴	اصلاحیں	اصطلاحیں
۵۱	۲۰	لٹ	الٹ
۵۳	۲۱	سوغویانا	سوغدیانا
۵۴	۱٦	گیمبیس	گیمبیسس
۵۵	۴	مارگیسٹرین	مارگنسٹائرن
۷۵	۲۸	ضروت	ضرورت
۷۹	۹	حالاآنکہ	حالانکہ
۸۴	۲۲	پہنچے گئے	پہنچ گئے
۸٦	۲۳	پہنچانے	پہچاننے
۹۵	۱۰	چلا جائے	چلایا جائے
۹۷	۱	جو دو سال	جو دو سو سال
۱۰۰	۲۰	بودھ مت	گوتم بودھ
۱۰۴	۱۷ - ۲۴	مارجنسٹیرن	مارگنسٹائرن
۱۱۰	٦	صرف	حرف
۱۲۱	۳	کہ ہے	ہے کہ
۱۲٦	٦	انگاریہ	زنگاریہ

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۱۲۶	۶	بسنے هن	بسنے والے هن
۱۲۷	۱۹	۳۲۵ء	۳۶۵ء
۱۳۲	۲	شالی هند	شمالی هند
۱۲۵	۱۳	طرر	طور
۱۴۰	۲۴	الظاکیه	انطاکیه
۱۴۲	۵	زیاد	زیاده
۱۷۲	۶	ور	اور
۱۹۹	۲۳	لینا	(یه لفظ یہاں زائد ہے)
۱۹۹	۲۴	ضروری ہے	لینا ضروری ہے
۲۰۰	۱۱	موخوں	مؤرخوں
۲۰۴	۱	(پوری عبارت یوں پڑھی جائے)	جس پر سب کو بھروسہ تھا قبائلی جھگڑے پھر سر آٹھاتے ھیں -
۲۰۹	۲۶	دهنے	رهنے
۲۱۶	۵	سجھ	سمجھ
۲۱۶	۲۸	یوردپ	یورپ
۲۲۱	۲	بڑتے	بڑے
۲۳۱	۱	۱۵۰۹ء	۱۵۱۹ء
۲۳۲	۱	۱۵۰۷ء	۱۵۱۷ء
۲۴۵	۱۵	هی	وهی
۲۵۳	۱۲	موگره	موره
۲۵۶	۱	سرے	سیرئے
۲۵۶	۱۰	امبہار	امبار
۲۵۶	۱۲	هی	بھی

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۵۷	۱۱	انی	اتنی
۲۵۸	۲۹	یقین	تعیّن
۲۹۵	۳۰	نمودار	نو وارد
۳۰۰	۹	صحولتیں	صعوبتیں
۳۱۶	۸	زمانه	زنانه
۳۳۱	۱۲	مسجدوں	سجدوں
۳۳۳	۲	مراه	گمراه
۳۵۰	۵	صنعت	صفت
۳۶۲	۲	(یہاں جمله یوں پڑھا جائے)	اور تیمور کی چہیتی ملکه تھی -
۳۷۸	۲۶	ھر دورانی	بر درانی
۴۱۳	۴	نہڈ	ھنڈ
۴۵۷	۶ - ۹	شادی بگیاه	شادی بگیاڑ
۴۶۴	۸	مصنف مزاج	منصف مزاج
۴۶۶	۲	نہری لارنس	ھنری لارنس
۴۶۶	۷	نو دارد	نو وارد
۵۰۹	۲۶	ھی نہیں تھی	ھی نہیں کی تھی
۵۲۵	۲۵	قبائیت	قبائلیت
۵۳۱	۷	موجرد	موجود
۵۴۳	۱۴	جنوت	جنوب
۵۴۴	۷	محرومه	محروسه
۵۵۱	۲	ملک	مالک
۵۵۱	۸	چھمکتے	چمکتے
۵۵۹	حاشیه	الفنسٹن	ایڈورڈ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۷۴	۲۳	وصائل	وسائل
۵۷۴	۱۶	ھفدوستان	ھندوستان
۶۳۰	۱۲	وھی	وھیں
۶۳۳	۱۸	پینڑی	پینٹری
۶۳۴	۸-۱۱	,,	,,
۶۳۶	۱۰	سمیت	سمیٹ
۶۳۷	۱۱	نکڑیوں	ٹکڑیوں

پښتو اکېډمي پېښور يونيورسټي